ہندوستان کی معاشی تاریخ

(جلد دوم)

رمیش دت

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی

ہندوستان کی معاشی تاریخ

(جلد دوم)

رمیش دت

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

ہندوستان کی معاشی تاریخ

جلد دوم

وکٹوریہ کے عہدِ حکومت میں 1900ء ـ 1837ء

از

رمیش دت

مترجم

غلام ربانی تاباں

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل حکومت ہند
ویسٹ بلاک 1، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی 110066

Hindustan ki Maashi Tareekh- Vol. II

by

Romesh Dutt

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سنہ اشاعت:

پہلا اڈیشن	:	1979
دوسرا اڈیشن	:	2004، تعداد 500
قیمت	:	-/216
سلسلۂ مطبوعات	:	1182

اس کتاب کا اردو ترجمہ انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ، نئی دہلی سے حاصل ہوا

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-I، آر. کے. پورم، نئی دہلی 66

طابع: فہمی کمپیوٹرس اینڈ پرنٹرس، 900 دین دنیا ہاؤس، جامع مسجد، دہلی 110006

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے اُن اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جاسکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدا رسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لئے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے مؤثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لئے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے کونسل نے مختلف

النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لئے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم وفنون کی جو کتابیں شائع کی ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے اب ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا پروگرام شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کردی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

ڈائرکٹر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند، نئی دہلی

مقدمہ

چھ سال ہوئے لندن میں ایک تقریب منائی گئی جس نے برطانوی سلطنت کے اتحاد کی ایک جیتی جاگتی تصویر پیش کر دی عظیم ملکہ کے دورِ حکومت کے ساٹھ سالہ جشن میں حصّہ لینے کے لیے تمام برطانوی نوآبادیات و مقبوضات سے لوگ آئے تھے۔ ہندوستان کے دیسی حکمران کناڈا کے وفادار لوگوں اور آسٹریلیا کے جفاکش باشندوں کے شانوں سے شانے ملائے کھڑے تھے۔ ان مظاہروں میں اتنا جوش تھا کہ انگلستان میں اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ اس نے اصحابِ فکر کو جراُت مندانہ اقدامات، خطرناک جد و جہد اور دانش مندانہ سمجھوتوں کی وہ طویل تاریخ یاد دلائی جس نے ایک عالمگیر سلطنت میں ہم آہنگی اور یک جہتی پیدا کر دی مختلف خطّوں اور مختلف ملکوں میں رہنے والی قوموں نے اُن جشنوں میں حصّہ لیا جو اس تقریب کے شایانِ شان تھے۔

لیکن ایک تکلیف وہ احساس لوگوں کی پریشانی کا باعث تھا سلطنت کے تمام حصّوں میں ترقّی و خوشحالی نظر آ رہی تھی اور اُن کے درمیان غربت و افلاس کے منظر صرف ہندوستان پیش کر رہا تھا۔ 1897ء میں اتنے وسیع پیمانے پر اور اتنا شدید قحط پڑا تھا جس کی مثال تاریخ نہیں پیش کر سکتی تھی سلطنت کا سب سے کثیر آبادی رکھنے والا حصّہ اُس کی خوشحالی میں شریک نہیں تھا۔ انگلستان کے ماتحت ملکوں میں ہندوستان سب سے بڑا ملک تھا مگر وہ بڑھتی ہوئی دولت، ترقّی پذیر صنعتوں اور فروغ پاتی ہوئی زراعت کے فوائد سے محروم تھا۔

قحط کا سلسلہ 1898ء تک جاری رہا۔ 1899ء میں دم لینے کی فرصت ملی۔ 1900ء میں ایک اور قحط پڑا جس نے زیادہ بڑے علاقہ کو متاثر کیا اور زیادہ مدّت تک جاری رہا۔ اس آفت کا سلسلہ تین سال تک چلتا رہا اور لاکھوں انسان اُس کی نذر ہو گئے جنوری 1903ء میں ہونے والے دہلی دربار کے وقت بھی ہزارہا لوگ کیمپوں میں پڑے ہوئے تھے۔

وہ معاشی خلیج جو ہندوستان اور سلطنت کے دوسرے حصّوں کے درمیان حائل ہے ادھر کچھ برسوں میں وسیع تر ہوگئی ہے۔ کناڈا اور دوسری نوآبادیات میں فی کس سالانہ آمدنی 48 پونڈ ہے۔ برطانیہ میں یہ آمدنی فی کس 42 پونڈ ہے۔ ہندوستان میں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق فی کس سالانہ آمدنی 2 پونڈ ہے۔ برٹش ایسوسی ایشن کے پچھلے اجلاس کے موقع پر برطانیہ کے عظیم ماہر معاشیات سر رابرٹ گیفن (Sir Robert Giffen) نے کہا تھا کہ سلطنت کے لیے "ایسی سخت اور مشکل دشواری ہے کہ جیسے جیسے سلطنت کے اتحاد کو حرکی طاقت بنانے کا تصوّر فروغ پائے گا ویسے ویسے ہمارے مدبروں کو اس مسئلہ پر زیادہ غور کرنا ہوگا"۔ سلطنت کی $\frac{5}{6}$ آبادی کے بڑھتے ہوئے افلاس و انحطاط کی بنیاد پر سلطنت کے اتحاد کی عمارت نہیں بنائی جاسکتی ہے۔

حالانکہ قحطوں میں لاکھوں انسانی جانیں جاتی ہیں پھر بھی وہ تو ایک زیادہ مہلک بیماری کی علامتیں ہیں۔ اصل بیماری تو ہندوستان کے لوگوں کا دائمی افلاس ہے جس سے کسی حالت میں اُن کا پیچھا نہیں چھوٹتا۔ ایسے حالات کبھی پیدا نہیں ہوئے جب مجموعی اعتبار سے ہندوستان میں غذا کی قلت ہوئی ہو۔ 1897ء اور 1900ء میں بھی ہندوستان میں اتنی غذائی اجناس پیدا ہوتی تھیں کہ وہ پوری آبادی کی ضروریات پوری کرسکتی تھیں۔ لیکن لوگوں کے پاس اتنے وسائل بھی نہیں، وہ اتنی رقم بھی پس انداز نہیں کرسکتے کہ جب ایک علاقے میں فصلیں خراب ہوجائیں تو وہ قرب و جوار کے اُن علاقوں سے غذائی اجناس خرید سکیں جہاں فصلیں اچھی ہوئی ہوں۔ بارش نہ ہونے کی صورت میں تو کسی مخصوص علاقے کی فصلیں خراب ہوتی ہیں۔ لیکن شدید قحط پڑنے کی وجہ تو لوگوں کا افلاس ہے۔

اس کے ثبوت میں بہت سے واقعات پیش کیے جاسکتے ہیں جن کا ہندوستان کے حکّام کو بھی تجربہ ہے۔ میں صرف ایک واقعہ پر اکتفا کروں گا۔ ستائیس سال ہوئے مشرقی بنگال پر ایک تباہ کن آفت آئی۔ 1876ء میں طوفان آیا اور ایک بڑے علاقے میں سمندر کی لہر نے لوگوں کے مکان تباہ کردیئے اور فصلیں برباد کردیں۔ ایک نوجوان افسر کی حیثیت سے مجھے وہاں بھیجا گیا تاکہ میں وہاں کے نظم و نسق کی ازسرِنو تنظیم کروں اور جن علاقوں میں سب سے زیادہ تباہی ہوئی تھی وہاں کے لوگوں کی امداد کروں۔ وہاں کے کسان نسبتاً کم لگان ادا کرتے تھے اور اسی لیے عام حالات میں خوشحال رہتے تھے۔ اپنی کفایت شعاری اور جُزرسی کی بنا پر، جو ہندوستانی کسانوں کی عادت میں داخل ہیں، انھوں نے کچھ روپیہ پس انداز کرلیا تھا۔ اس سال انھوں نے اپنے پس انداز کیے ہوئے روپے سے بہت بڑی

مقدار میں چاول خرید لیا۔ وہاں نہ عام قحط پڑا نہ بڑے پیمانے پر ہمیں ملی امداد دینی پڑی۔ خوشحال کسانوں نے جس طرح اپنی مدد آپ کی اُسے دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ اگر مشرقی بنگال کے کسانوں کی طرح ہندوستان کے دوسرے کسان بھی خوشحال ہوتے تو فصلیں خراب ہو جانے کی صورت میں بھی قحط شاذ ہی پڑتے لیکن مشرقی بنگال کے مقابلے میں مغربی بنگال میں لگان کی شرح پیداوار کے تناسب سے زیادہ ہے اور مدراس، بمبئی اور دوسرے علاقوں میں زمین کے محصول کی شرح تو بنگال کی شرح سے بھی زیادہ ہے۔ اس لیے لوگ بھی معاشی اعتبار سے نسبتاً کم حیثیت ہیں جس کی وجہ سے قحط بھی بار بار پڑتے ہیں اور ان میں جانی نقصان بھی زیادہ ہوتا ہے۔ لوگوں کا افلاس قحط کی شدت میں اضافہ کر دیتا ہے۔

کسی قوم کی دولت کے ذرائع زراعت، تجارت، صنعت و حرفت اور صحت مند مالیاتی نظام ہوا کرتے ہیں۔ انگریزی راج نے ہندوستان میں امن قایم کیا لیکن اس نے ہندوستان کی قومی دولت کے ذرائع کی ترقی یا توسیع نہیں کی۔

تجارت، صنعت و حرفت کے متعلق کچھ کہنے کا یہ موقع نہیں۔ اٹھارھویں صدی اور انیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں برطانیہ عظمیٰ نے ہندوستان کی طرف جو تجارتی پالیسی اختیار کی تھی اس کی روداد میں ایک اور کتاب میں بیان کر چکا ہوں[1]۔ اس زمانے میں انگلستان آئرلینڈ اور دوسری نوآبادیات کے تعلق سے جس پالیسی پر عمل کرتا تھا وہی ہندوستان کے لیے بھی اختیار کی گئی۔ ہندوستانی مصنوعات کی ہمت شکنی اور برطانوی مصنوعات کی ہمت افزائی کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس میں انھیں ہلاکت آمیز حد تک کامیابی ہوئی اور ہندوستان کی صنعتیں تباہ ہو گئیں۔ ہندوستانی صنعتوں پر امتناعی محاصل لگا کر اُنھیں یورپ جانے سے روکا گیا۔ برطانوی مصنوعات پر برائے نام محاصل عائد کیے گئے اور اس طرح ہندوستان میں ان کی درآمد کی ہمت افزائی کی گئی۔ انگلستان کی ابتدائی تجارتی پالیسی کے دو مقصد تھے برطانوی صنعتوں کے لیے ہندوستان میں خام مال پیدا کیا جائے اور برطانوی مصنوعات کی ہندوستان میں کھپت ہو۔ بقول مورخ ہوریس ہیمین ولسن (Horace Hayman Wilson) برطانوی صنعت کاروں نے "اُس حریف کو دبانے اور بالآخر اُس کا گلا گھونٹنے کے لیے سیاسی ناانصافی سے کام لیا جس سے وہ برابر کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے"۔

1837ء میں جب ملکہ وکٹوریہ تخت پر بیٹھی، تو یہ خرابی جڑ پکڑ چکی تھی مگر پہلے جس پالیسی پر

---

[1] انگریزی راج کا ابتدائی دور 1757ء ——— 1837ء۔

عمل ہو رہا تھا اس میں ذرا بھی ترقی نہ آئی۔ ہندوستان کے بنے ہوئے ریشمی رومالوں کی اس وقت بھی یورپ میں مانگ تھی۔ اس لیے ہندوستان میں بنے ہوئے ریشمی کپڑے پر بھاری محصول قایم رکھا گیا۔ پارلیمنٹ نے اس امر کی تحقیقات تو کی کہ برطانوی کرگوں کے لیے ہندوستان میں کپاس کس طرح پیدا کی جاسکتی ہے لیکن اس نے ہندوستانی کرگوں کو ترقی دینے کے سوال پر غور کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی بیلیکٹ کمیٹیوں نے یہ پتا لگانے کی تو کوشش کی کہ ہندوستان میں برطانوی مصنوعات کی فروخت کس طرح ہو سکتی ہے لیکن اس کو نظر انداز کر دیا کہ ہندوستانی مصنوعات کی تجدید کس طرح ہو سکتی ہے۔ 1858ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ختم ہونے سے بہت پہلے ہندوستان اپنی صنعتی اہمیت کھو چکا تھا۔ قوم کی گزربسر کا انحصار بڑی حد تک صرف زراعت پر تھا۔

1858ء کے بعد بھی ہندوستان کے محاصل درآمد و برآمد پر برطانوی تاجر نگرانی کا اختیار رکھتے تھے۔ محاصل درآمد میں تخفیف کر کے برطانوی مال ہندوستان میں درآمد کرنے کے لیے سہولتیں مہیا کی جاتی تھیں بمبئی میں کرگے لگائے گئے یا کپڑے کے مل بنائے گئے تو انگلستان میں جذبِ حسد پیدا ہو گیا۔ 1879ء میں پارلیمنٹ نے مطالبہ کیا کہ ہندوستان کے محاصل درآمد میں مزید تخفیف کی جائے حالانکہ اُس سال ایک قحط پڑا تھا، ہندوستان کو ایک جنگ کے مصارف برداشت کرنے پڑے تھے اور اس کے بجٹ میں خسارہ ہوا تھا اور پھر 1882ء میں نمک اور شراب کے علاوہ تمام محاصل درآمد ختم کر دیے گئے۔

لیکن اس تخفیف کا خراب اثر ہندوستان کی مجموعی آمدنی پر پڑنے لگا۔ کسانوں پر نئے محاصل لگائے گئے، زراعت پر نئے بار ڈالے گئے پھر بھی ہندوستان کی مالی حالت خراب رہی۔ 1894ء میں تھوڑی بہت ترمیم کے ساتھ ہندوستان کے پُرانے محاصل درآمد کی تجدید کی گئی۔ ہندوستان آنے والے سوتی کپڑے اور سوت پر پانچ فیصدی محصول عائد کیا گیا۔ ہندوستان کے ایسے سوتی کپڑوں کی قیمتوں پر بھی جو باہر سے آنے والے کپڑوں کا مقابلہ کر سکتے تھے توازن پیدا کرنے کے لیے پانچ فیصدی ڈیوٹی لگائی گئی۔ 1896ء میں سوت کو محصول سے مستثنیٰ قرار دیا گیا لیکن ہندوستان آنے والے سُوتی کپڑے پر $3\frac{1}{2}$ فیصدی محصول لگایا گیا اور ہندوستان کے کارخانوں میں بُننے والے ہر قسم کے مال پر $3\frac{1}{2}$ فیصدی اکسائز ڈیوٹی لگائی گئی۔ نفیس کپڑوں کے ساتھ ہندوستان کے بنے ہوئے ان موٹے جھوٹے کپڑوں پر بھی محصول لگایا گیا جو کسی طرح لنکا شائر کے کپڑوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے ایک حسد رکھنے والی حکومت نے ڈھائی شلنگ روزانہ سے بھی کم کمانے والے بدبخت ہندوستانی

مزدوروں کے موٹے اچھوتے کپڑوں پر بھی محصول لگادیا۔ بمبئی کے نوزائیدہ کارخانوں کی ہمت افزائی کے بجائے ان پر ایسی اکسائز ڈیوٹی کا بار ڈال دیا گیا جس کی مثال متمدن دُنیا کے کسی دوسرے حصے میں نہیں ملتی۔ پچھلی ڈیڑھ صدی میں ہندوستان کے انگریز حلمرانوں کی تجارتی پالیسی کا تعین ہندوستانی کے صنعت کاروں کے مفادات نے نہیں بلکہ برطانوی صنعت کاروں کے مفادات نے کیا ہے۔ مصنوعات کی وہ بڑی مقدار داستان پارینہ بن چکی ہے جو سترھویں اور اٹھارھویں صدیوں میں پرتگال اور ہالینڈ کو ہندوستان سے برآمد کی جاتی تھی یا عرب اور انگریز تاجر لے جایا کرتے تھے۔ اب ہندوستان کی برآمدات زیادہ تر خام مال تک محدود رہیں۔ اُس کا بڑا حصہ غذائی اجناس پر مشتمل ہوتا ہے۔ قومی آمدنی کے ایک ذریعے کی حیثیت سے صنعتوں کی اہمیت کم ہو گئی ہے۔

اب رہ گئی زراعت۔ انگریزی راج میں امن اور تحفظ نصیب ہوا جس کی وجہ سے کاشت میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا لیکن جو لوگ کسانوں کی حالت سے واقف ہیں وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ کاشت میں اضافے کی وجہ سے قوم زیادہ خوشحال ہو گئی، اس کے وسائل میں اضافہ ہو گیا یا قحطوں کے خطرے سے اب وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ محفوظ ہیں۔

ہندوستان کے نظام مالگزاری کی تاریخ بے حد دلچسپ ہے۔ ایک ایسی قوم کی مادّی خوشحالی سے اس کا قریبی تعلق ہے جس کا انحصار زراعت پر ہے۔ انگریزی راج کے ابتدائی دور میں ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان کو ایک وسیع و عریض ذاتی جاگیر سمجھتی تھی۔ اس کے خیال میں اُسے حق حاصل تھا کہ زمین کی تمام پیداوار پر قبضہ کرے اور کسانوں اور زمینداروں کے لیے صرف اتنا چھوڑ دے جس سے وہ عام حالات میں بس زندہ رہ سکیں۔ یہ پالیسی کمپنی کی آمدنی کے لیے تباہ کن ثابت ہوئی اور اصلاحات کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ اس کے بعد کمپنی نے محسوس کیا کہ سمجھ داری کا تقاضا ہے کہ زمینداروں کو مستقبل میں زراعت سے ہونے والے منافع کی ضمانت دی جائے۔ چنانچہ لارڈ کارنوالس نے 1793ء میں بنگال میں بندوبست استمراری نافذ کیا۔ زمینداروں سے 90 فیصدی لگان کا مطالبہ کیا گیا لیکن انھیں یقین دلادیا گیا کہ آیندہ سرکاری مطالبے میں اضافہ نہیں کیا جائے گا۔ حالانکہ حکومت کا مطالبہ بہت زیادہ تھا لیکن 1893ء کے بعد زراعت میں جو توسیع اور لگان میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اس کا فائدہ کسانوں اور زمینداروں کو پہنچا۔ آج بنگال کے کسانوں کی حالت بہتر ہے اور ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے کسانوں کے مقابلے میں وہ قحطوں کے بدترین اثرات سے زیادہ محفوظ ہیں۔

اس کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کی پالیسی میں ایک تبدیلی آئی۔ وہ دوسرے صوبوں میں بندوبست استمراری کی توسیع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے لگان کے ایک مناسب حصّے کو سرکاری مطالبہ قرار دینے کی کوشش کی تاکہ لگان کے ساتھ مالگزاری میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ شمالی ہندوستان میں اُس نے سرکاری مطالبہ لگان کا 83 فیصدی مقرر کیا۔ پھر اُسے 75 فیصدی کر دیا۔ کچھ مدّت بعد سرکاری مطالبہ 66 فیصدی کر دیا گیا۔ لیکن یہ مطالبہ بھی عملاً بہت زیادہ معلوم ہوا اور بالآخر 1855ء میں اس نے سرکاری مطالبہ لگان کا 50 فیصدی مقرر کیا۔ 1864ء میں مالگزاری کی یہ شرح جنوبی ہند میں بھی نافذ کر دی گئی۔ زراعت کی آمدنی میں 50 فیصدی محصول بہت زیادہ ہے۔ متمدّن دُنیا کے کسی ملک میں مالگزاری کی تشخیص کی یہ شرح نہیں ہے لیکن جہاں تک ہندوستان کا تعلّق ہے اگر اس بھاری شرح تشخیص میں اضافہ نہ کیا جائے تو اسے ہندوستان کی خوش قسمتی سمجھنا چاہیے۔

1858ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا دورِ حکومت ختم ہو گیا ملکہ کی حکومت قایم ہونے کے بعد شروع میں جو وائسرائے ہوئے وہ صدقِ دل سے چاہتے تھے کہ زرعی خوشحالی کو ترقی دی جائے اور ہندوستان کی زرعی دولت کے ذرائع کی توسیع کی جائے۔ سر چارلس وُڈ (Sir Charles Wood) اور سر اسٹیفورڈ نارتھ کوٹ (Sir Stafford North cote) جیسے مدبّر اور لارڈ کیننگ اور لارڈ لارنس جیسے وائسرائے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جد وجہد کرتے رہے۔ وہ چاہتے تھے کہ سرکاری مطالبے کا تعیّن اس طرح کر دیا جائے کہ قوم خوشحال ہو، ایک وفادار اور طاقتور درمیانی طبقہ وجود میں آجائے اور اس کے مفادات اُسے ہندوستان کے انگریزی راج سے منسلک کر دیں۔ اگر ان کی صحت مند پالیسی پر عمل کیا جاتا تو قومی دولت کے ایک ذریعے کی توسیع ہو جاتی۔ آج قوم میں زیادہ خود اعتمادی ہوتی اور اس کے پاس زیادہ وسائل ہوتے۔ قحط شاذ ہی پڑتے لیکن شاہی ملازمین کی پہلی نسل ختم ہونے کے بعد قوم کی خوشحالی کی کوششیں بھی بے جان ہو کر رہ گئیں۔ سامراج کے ارتقا کے ساتھ مزید آمدنی اور مزید اخراجات کے مسئلے اُن کی توجہ کے مرکز بنتے گئے۔ کیننگ اور لارنس کی تجاویز 1883ء میں مسترد کر دی گئیں۔

قارئین اُن دو اصولوں کو اچھی طرح سمجھ جائیں گے جن پر مختلف مکاتیبِ خیال سے تعلّق رکھنے والے حکّام کاربند تھے۔ ایک مکتبِ خیال وہ تھا جس سے لارڈ کیننگ، لارڈ لارنس، لارڈ ہیلی فکس، (Lord Halifax) اور لارڈ اِوس لے (Lord Iddesleigh) متعلق تھے۔ یہ لوگ چاہتے تھے کہ مالگزاری کا بندوبست استمراری کیا جائے۔ اُن کے علم میں یہ بات تھی کہ ہندوستان

میں زمین زمینداروں کے بجائے قوم کی ملکیت سمجھی جاتی ہے، ہر کاشتکار کو اپنی جوت میں موروثی حقوق حاصل ہوتے ہیں اور مالگزاری کے دائمی تعین سے زمینداروں کے طبقے کے بجائے پوری قوم کو فائدہ ہوگا۔ دوسرا مکتب خیال اُن لوگوں پر مشتمل تھا جو چاہتے تھے کہ تھوڑی تھوڑی مدت بعد بندوبست کر کے مالگزاری کے سرکاری مطالبے میں اضافہ کرتے رہیں۔ سرکاری مطالبے میں اضافہ کرنے کا اختیار کلی طور پر بندوبست کے حکام کو دے دیا جائے۔

1880ء سے 1884ء تک لارڈ رپن ہندوستان کے وائسرائے کے فرائض ادا کرتا رہا۔ اس نے دونوں مکاتیب کی رایوں کے درمیان ایک صحت مند سمجھوتا تجویز کیا۔ اس نے ریاست کے اس حق پر اصرار کیا کہ وہ قیمتوں میں اضافے کی معقول بُنیاد پر مالگزاری کے سرکاری مطالبے میں اضافہ کر سکتی ہے۔ اس نے ہندوستان کے کسانوں کو یقین دلایا کہ جب تک قیمتوں میں اضافہ نہیں ہوگا۔ اس وقت تک سرکاری مطالبے میں بھی اضافہ نہیں کیا جائے گا اس طرح اس نے ریاست کا یہ حق تسلیم کر لیا کہ قوم کی خوشحالی میں اضافہ ہو تو مالگزاری میں اضافہ ہونا چاہیے۔ قیمتوں میں اضافے کو اس نے بڑھتی ہوئی خوشحالی کا ثبوت قرار دیا۔ اس نے کسانوں کو یہ یقین بھی دِلا دیا کہ سرکاری مطالبے کا دائمی تعین کر دیا گیا ہے اور مطالبے کا تعین کھیت کی پیداوار کے اس تناسب کی بُنیاد پر کیا جائے گا جو زمین کے محصول کے طور پر وصول کی جانی چاہیے۔ لارڈ رپن کی اسکیم میں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ ریاست کے مطالبے کا تعین کر دیا گیا تھا اور کاشتکاروں کے ان حقوق کا تحفظ بھی کر دیا گیا تھا جن کے بغیر دُنیا کے کسی حصے میں زراعت فروغ نہیں پا سکتی ہے۔ لیکن لارڈ رپن دسمبر 1884ء میں ہندوستان سے واپس چلا گیا اور سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا نے جنوری 1885ء میں اس کے دانش مندانہ انتظام کو مسترد کر دیا۔ وہ سمجھوتا جو کئی سال کی تحقیقات اور تشویش آمیز غور و فکر کے بعد ہوا تھا وائٹ ہال نے رد کر دیا اور ایک زراعت پیشہ قوم کو ایک دفعہ پھر سرکاری مطالبے کے تعلق سے اُن غیر یقینی حالات کا سامنا کرنا پڑا جو زراعت کے لیے سم قاتل کا حکم رکھتے ہیں۔

نظری اعتبار سے نصف لگان کا ضابطہ برقرار رہا۔ لیکن عملاً اس کی خلاف ورزی کی گئی۔ غدر کی جنگوں سے ہندوستان کی مالی حالت خراب تر ہو گئی تھی اور محاصل میں اضافہ ضروری ہو گیا تھا۔ انگریز تاجروں اور برطانوی رائے دہندگان کی مرضی کے خلاف تجارت پر محصول عائد نہیں کیا جا سکتا تھا اس لیے زراعت کو مزید محصول کا بار اُٹھانا پڑا۔ چنانچہ 1871ء میں مالگزاری کے علاوہ زمین پر کچھ اور محاصل بھی تشخیص کیے گئے۔ مالگزاری تو لگان کی 50 فیصدی تھی لیکن نئے محاصل

کو شامل کر کے زمین کے مجموعی محاصل لگان کے 56 فیصدی یا 58 فیصدی بلکہ کچھ صورتوں میں 60 فیصدی ہو گئے۔ ہندوستان کے لوگ سوچتے تھے کہ زراعت پر اگر مزید محاصل کا بار ڈالنا ہی تھا تو مالگزاری کی حد قایم کرنے سے کیا حاصل ہوا۔

1875ء میں مرحوم لارڈ سیلس بری سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا تھا۔ لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جن باتوں پر اس نے توجہ مرکوز کی ان پر اس کی نظر کتنی گہری تھی۔ اس نے 1875ء میں ایک روداد لکھی تھی جس میں ہندوستان کی مالیاتی پالیسی کی کمزوریوں اور یک رُخے پن کی مذمت کی تھی۔ اس روداد کا اکثر ذکر کیا جاتا ہے۔ لارڈ سیلس بری نے لکھا تھا "میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کے مالیاتی نظام میں جہاں تک ممکن ہو مجموعی قومی اخراجات کی رقم کا کثر حصّہ کسانوں سے وصول کیا جائے۔ یہ کفایت شعاری کی پالیسی نہیں ہے کہ آمدنی کا بڑا حصّہ دیہات سے وصول کیا جائے جہاں سرمائے کی قلت ہوتی ہے اور شہری آبادی کو اس بار سے محفوظ رکھا جائے جہاں سرمائے کی افراط ہوتی ہے اور وہ آرائش و آسایش پر برباد کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کی آمدنی چونکہ ملک کے باہر چلی جاتی ہے اور اسے کوئی معاوضہ نہیں ملتا ہے اس لیے یہ خرابی زیادہ شدید صورت اختیار کر لیتی ہے۔ چونکہ ہندوستان کا خون نچوڑنا ضروری ہے نشتر اُن مقامات پر لگایا جانا چاہیے جہاں خون کی افراط ہو یا کم از کم کافی خون مل سکے۔ اُن مقامات پر نشتر مارنے سے کیا فائدہ جو خون کی کمی کی وجہ سے خود بھی قوت کھو چکے ہیں"۔

لارڈ سیلس بری کی بات سنی اَن سنی کر دی گئی۔ جب سے روپیہ کی قیمت ایک شلنگ چار پنس مقرر کر دی گئی ہے ہم بھرے پُرے بجٹ اور بار بار ہونے والی بچتوں کی داستانیں سُنا کرتے ہیں۔ لیکن اس نام نہاد خوشحالی سے فائدہ اُٹھا کر کسانوں کی دشواریاں دور کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ 1871ء کے بعد مالگزاری کے علاوہ زمین پر جو خصوصی محاصل لگائے گئے تھے اُن میں سے ایک بھی منسوخ نہیں کیا گیا۔

ان واقعات سے جو میں نے مختصراً بیان کیے ہیں یہ ظاہر ہو جائے گا کہ قومی آمدنی کے ایک ذریعے کے طور پر انگریزی راج میں زراعت کو توسیع نہیں دی گئی۔ ان علاقوں کو چھوڑ کے جہاں بندوبست استمراری ہو چکا ہے ہر بیس سال یا تیس سال کے وقفے کے بعد بندوبست کے موقع پر مالگزاری پر نظرِثانی کی جاتی ہے۔ کہا تو یہ جاتا ہے کہ لگان یا معقول لگان کا 50 فیصدی بطور مالگزاری وصول کیا جاتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ بمبئی اور مدراس میں اس کی شرح زیادہ ہے۔ مالگزاری کے

علاوہ زمین پر دوسرے خصوصی محاصل بھی لگائے جاتے ہیں۔ اُن میں ریاست حسب مرضی جتنا چاہے اضافہ کرسکتی ہے۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ زمین کے محاصل کی شرح تشخیص زیادہ بھی ہے اور غیر یقینی بھی۔ دُنیا کے کسی بھی ملک میں اس قسم کے ضابطے نافذ کردیے جائیں تو وہاں کی زراعت دم توڑ دے گی۔ ہندوستان کے کسان کفایت شعار، جفاکش اور امن پسند ہیں۔ اس کے باوجود تباہ حال و بے وسیلہ ہیں اور قحط اور بھک مری کی زد پر رہتے ہیں۔ ان حالات پر کوئی انگریز بجا طور سے فخر نہیں کرسکتا ہے۔ ہندوستان میں اسی قسم کے حالات پائے جاتے ہیں جن کے تدارک کی کوششیں وہ آئرلینڈ میں کررہے ہیں۔ یہ وہ حالات ہیں جن سے اگر وہ پوری طرح واقف ہوجائیں تو وہ انھیں ہندوستان میں بھی برداشت نہ کریں۔

اگر ہم دولت کے ذرائع سے ہٹ کر دولت کی تقسیم پر غور کریں اور ہندوستان کے مالیاتی نظام پر نظر ڈالیں تو اتنی ہی افسوسناک صورتِ حال سامنے آتی ہے۔ ملکہ کے دورِ حکومت کے آخری دس سال میں — 92-1891ء لغایت 1900-1ء — ہندوستان کی مجموعی آمدنی 647 ملین پونڈ ہوئی۔ چنانچہ سالانہ اوسط 65 ملین سے کچھ کم آتا ہے جس میں ریلوں، آبپاشی کے ذریعوں اور دوسرے ذرائع سے ہونے والی آمدنی بھی شامل ہے۔ ان دس برسوں میں انگلستان میں جو رقم خرچ کی گئی وہ مجموعی طور پر 159 ملین پونڈ ہوتی ہے جس کا سالانہ اوسط تقریباً 16 ملین پونڈ ہوا۔ چنانچہ ہندوستان کی مجموعی سالانہ آمدنی کا چوتھائی حصّہ گھریلو اخراجات کے لیے انگلستان بھیج دیا جاتا ہے۔ اگر اس رقم میں ہم انگریزی حکّام کی تنخواہوں کے وہ حصّے بھی شامل کرلیں جو ہر سال ہندوستان سے انگلستان بھیجے جاتے ہیں تو ہر سال ہندوستان سے انگلستان جانے والی رقم 20 ملین سے زیادہ ہوجاتی ہے۔ دُنیا کا سب سے دولت مند ملک اس قدر گر گیا ہے کہ دُنیا کے غریب ترین ملک سے ہر سال یہ رقم وصول کرتا ہے۔ وہ لوگ جن کی فی کس آمدنی 42 پونڈ ہے ان لوگوں سے دس شلنگ فی کس وصول کرتے ہیں جن کی سالانہ آمدنی 2 پونڈ فی کس ہے۔ برطانیہ کے لوگ جو دس شلنگ فی کس وصول کر رہے ہیں اس سے ہندوستان کے لوگ تباہ ہو رہے ہیں ہندوستان کے لوگوں کی تباہی ہندوستان کے ساتھ برطانوی تجارت کو تباہ کر رہی ہے۔ وصول ہونے والی رقم سے برطانوی تجارت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا جب کہ اس رقم کی صورت میں ہندوستان کا خون مسلسل نچوڑا جا رہا ہے۔

ملک سے وصول ہونے والے محاصل اگر اسی ملک میں خرچ کیے جائیں تو روپیہ لوگوں

میں گردش کرتا ہے، جس کی وجہ سے تجارت، صنعت اور زراعت بارور ہوتی ہیں اور کسی نہ کسی صورت میں لوگوں کو واپس مل جاتا ہے۔ لیکن جب ایک ملک سے وصول ہونے والے محاصل دوسرے ملک کو بھیج دیے جاتے ہیں تو وہ رقم ہمیشہ کے لیے کھو جاتی ہے۔ اس سے نہ اس کی تجارت و صنعت کو فائدہ پہنچتا ہے نہ وہ کسی صورت میں لوگوں کو واپس ملتی ہے۔ ہندوستان کی آمدنی میں سے 20 ملین پونڈ سے زیادہ ہر سال باہر چلے جاتے ہیں۔ ایک معجزہ ہوگا اگر یہ طریقہ مدتوں تک جاری رہے اور دُنیا کی دولت مندترین قوم تباہ نہ ہو جائے۔

1900-1ء میں ہندوستان کی مجموعی مالگزاری ½17 ملین پونڈ تھی۔ اور اس سال گھریلو اخراجات کی مجموعی رقم 17 ملین پونڈ تھی۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستان کے تمام صوبوں سے وصول ہونے والی مجموعی مالگزاری کے بقدر رقم گھریلو اخراجات کے لیے ہر سال انگلستان بھیجی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ انگریزی حکام اپنے نجی حساب میں کئی ملین پونڈ ہر سال بھیجتے ہیں۔ چونکہ ان کی تنخواہیں ہندوستان کی قومی آمدنی میں سے ادا کی جاتی ہیں اس لیے جُوں جُوں ہندوستان میں انگریز حکام کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے اس کی مناسبت سے باہر بھیجی جانے والی رقم میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔

گھریلو اخراجات کے لیے جو 17 ملین پونڈ انگلستان بھیجے گئے وہ مندرجہ ذیل مدوں پر خرچ کیے گئے (1) ہندوستان کے قرض کا سود (2) ریلوں کا سود (3) سول اور فوجی اخراجات۔ اس رقم کا ایک چھوٹا سا حصّہ تقریباً ایک ملین پونڈ ہندوستان کو بھیجے جانے والے فوجی اور دوسرے سامان پر خرچ کیا گیا۔

انگلستان کے زیادہ تر لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ہندوستان کا تمام تر قرض اس برطانوی سرمائے کی نمائندگی کرتا ہے جو ہندوستان میں ترقیاتی کاموں پر صرف کیا گیا۔ اس کتاب کے صفحات پر دکھایا گیا ہے کہ ہندوستان کے سرکاری قرض کی حقیقی بُنیاد وہ سرمایہ نہیں ہے۔ 1858ء میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا دورِ حکومت ختم ہوا اس وقت ہندوستان پر 70 ملین پونڈ قرض ہو چکا تھا۔ اس دوران اس نے ہندوستان سے 150 ملین سے زیادہ رقم بطور خراج وصول کی تھی جس کی وصولی انصاف پر مبنی نہیں تھی۔ اس رقم میں سود شامل نہیں ہے۔ اس نے افغانستان کی جنگوں، چین کی جنگوں اور دوسری جنگوں کے اخراجات بھی ہندوستان سے وصول کیے۔ حالانکہ یہ جنگیں ہندوستان کی سرحد کے پار لڑی گئی تھیں۔ انصاف کی رُو سے اگر دیکھا جائے تو کمپنی کی

حکومت ختم ہوتے وقت ہندوستان کی طرف کوئی رقم واجب الادا نہیں تھی۔ ہندوستان کے سرکاری قرضے کی حیثیت ایک افسانہ سے زیادہ نہ تھی، ہندوستان سے جو رقمیں حاصل کی جا چکی تھیں ان میں سے سو ملین اس کو واپس ملنے چاہیے تھے۔

ملکہ کی حکومت کے پہلے اٹھارہ سال میں ہندوستان کا سرکاری قرض دُگنا ہو گیا۔ 1877ء میں جب ملکہ نے قیصرِ ہند کا لقب اختیار کیا تو قرض کی رقم 140 ملین پونڈ ہو چکی تھی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ غدر کی جنگوں پر خرچ ہونے والی رقم کا بار جو تقریباً 40 ملین پونڈ تھی ہندوستان کو اُٹھانا پڑا تھا۔ اس کے علاوہ 1867ء کی جنگ حبش کے اخراجات کے سلسلے میں ہندوستان کو ایک بھاری رقم ادا کرنی پڑی تھی۔

1877ء اور 1900ء کی درمیانی مدّت میں سرکاری قرض 139 ملین سے بڑھ کر 224 ملین ہو گیا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ضمانت شدہ کمپنیوں نے اور ریاست نے ہندوستان کی ضرورت اور اس کے وسائل سے زیادہ روپیہ ریلوں کی تعمیر پر خرچ کر دیا۔ اس کی ایک اور بڑی وجہ 1878ء اور 1897ء میں افغانستان سے لڑی جانے والی جنگیں تھیں۔ ہندوستان کے سرکاری قرض کی تاریخ حماقتوں اور ناانصافیوں کی ایک افسوسناک داستان ہے اور ہر غیر جانبدار قاری خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ اس قرض کے کتنے حصّے کی ادائیگی کی اخلاقی ذمّہ داری ہندوستان پر عائد ہوتی ہے۔

گھریلو اخراجات کی آخری مد سول اور فوجی مصارف ہیں۔ اس پر نظرِ ثانی ہونی چاہیے اگر ہندوستان میں انگریزی راج قایم ہونے سے انگلستان اور ہندوستان دونوں مستفید ہوئے ہیں تو انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ اس شاندار عمارت کو بحال و برقرار رکھنے کے اخراجات صرف ہندوستان کو نہیں برداشت کرنے چاہئیں یہ بات انصاف سے بعید ہے کہ انگلستان میں ہونے والے وہ تمام اخراجات ہندوستان برداشت کرے جن میں انڈیا آفس پر ہونے والے مصارف کے ساتھ وائٹ ہال کے کمرے صاف کرنے والی عورت کی اُجرت تک شامل ہے۔ چالیس سال سے زیادہ ہوئے جب ہندوستان کے ایک عظیم حاکم نے ایک منصفانہ سمجھوتے کی تجویز پیش کی تھی۔ 1809ء میں شایع ہونے والی کتاب Our Financial Relations with India میں سر جارج ونگیٹ (Sir George Wingate) نے مشورہ دیا تھا کہ ہندوستان میں جو سول اور فوجی اخراجات ہوں انھیں خود ہندوستان برداشت کرے اور انگلستان میں ہونے والے اخراجات کی ذمّہ داری انگلستان قبول کرے جس طرح وہ نوآبادیات کے سلسلے میں کیا کرتا ہے۔ کیا اب بھی

اس قسم کا منصفانہ سمجھوتہ ہو سکتا ہے۔ ہندوستان سول اور فوجی مدات میں جو روپیہ انگلستان میں خرچ کرتا ہے اس کی مجموعی رقم 6 ملین پونڈ ہوتی ہے۔ اس رقم میں خاصی کمی کی جا سکتی ہے اگر اس کی ادائیگی کی ذمہ داری برطانوی محصول دہندگان قبول کریں۔ کیا یہ توقع بہت زیادہ ہے کہ انگلستان اتنا بار اٹھائے جبکہ ہندوستان ان سول اور فوجی مصارف کو برداشت کرنے کے لیے تیار ہے جو ہندوستان میں کیے جاتے ہیں۔

ہندوستان میں جو معاشی حالات پائے جاتے ہیں ان کی حقیقت یہ ہے کہ ان حالات میں کوئی بھی زرخیز، جفاکش اور پُرامن قوم ان مصائب سے دوچار ہو سکتی ہے جن کا آج ہندوستان کو سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اگر صنعتیں ختم کر دی جائیں زراعت پر بھاری محصول عائد کر دیا جائے اور قومی آمدنی کا ایک تہائی حصّہ ملک سے باہر بھیج دیا جائے تو دُنیا کا ہر ملک دائمی افلاس اور بار بار پڑنے والے قحطوں کا شکار ہو سکتا ہے۔ ایشیا ہو یا یورپ معاشی قوانین یکساں ہوا کرتے ہیں۔ آج ہندوستان کا افلاس معاشی اسباب کی بنا پر ہے۔ اگر ان حالات میں ہندوستان خوشحال ہوتا تو یہ معاشی معجزہ ہوتا۔ لیکن سائنس کی دُنیا میں معجزے نہیں ہوا کرتے ہیں۔ معاشی قوانین اٹل ہیں اور یکساں انداز سے اپنا کام کیا کرتے ہیں۔ ہر خرابی میں اس کے تدارک کی تدبیر مضمر ہوا کرتی ہے۔ ہندوستان کی مشینی صنعتوں پر لگنے والا ایکسائز محصول منسوخ کر دینا چاہیے اور جس طرح ہر متمدن ملک کی حکومت اپنے ملک کی صنعتوں کی مدد کرتی ہے ہندوستان کے لوگوں کی خوشحالی کے پیش نظر حکومتِ ہند کو جرأت کے ساتھ ہندوستانی صنعتوں کی امداد کرنی چاہیے۔ مالگزاری کے علاوہ زمین پر لگنے والے تمام محاصل منسوخ کر دیے جانا چاہیں اور مالگزاری کی تشخیص میں اعتدال کے ساتھ ضبط و نظم سے بھی کام لیا جانا چاہیے۔

سرکاری قرضہ ابتدا میں لاکھ غیر منصفانہ سہی لیکن اب ایک مسلّمہ حقیقت بن چُکا ہے۔ پھر بھی شاہی ضمانت شرح سود میں کمی کر سکتی ہے اور ایک ذخیرہ ادائی کے ذریعہ رفتہ رفتہ اس کو کم کیا جا سکتا ہے۔ انگلستان میں ہونے والے سول اور فوجی اخراجات انگلستان برداشت کرے یا کم از کم جس طرح وہ نوآبادیات کے اخراجات کا ایک حصّہ ادا کرتا ہے اسی طرح ہندوستان کے اخراجات کے ایک حصّے کی ذمّے داری قبول کرے۔ ہندوستانیوں کو زیادہ ملازمتیں دے کر سول اخراجات میں کمی کی جائے۔ ہندوستان میں فوجی اخراجات کو سختی کے ساتھ کم کیا جائے۔ ہندوستان صرف اتنی فوج کے اخراجات برداشت کرے جتنی اس کے لیے ضروری ہے۔ سرکاری قرضوں سے یا محاصل کی بنیاد

پر سود کی ضمانت کرکے ریلوں کی مزید تعمیر روک دی جائے۔ جہاں تک ممکن ہو معمولی قومی آمدنی کے روپے سے آبپاشی کے ذرائع کی توسیع کی جائے۔ ہندوستان سے ہونے والے سالانہ دولت کے نکاس کو رفتہ رفتہ کم کیا جائے۔ ان مالیاتی اصلاحات کو نافذ کرنے کے لیے ہندوستان کے لوگوں یعنی محصول دہندگان کا اشتراک و تعاون حاصل کیا جائے۔ ہر ملک میں صرف محصول دہندگان اخراجات کی کمی میں حقیقی دلچسپی رکھتے ہیں۔

جان اسٹورٹ مل نے لکھا ہے "حکومت خود اختیاری کا تو ایک مفہوم ہے اور اس کی ایک حقیقت ہے لیکن ایسی حکومت نہ ہوتی ہے نہ ہو سکتی ہے جس میں ایک قوم دوسری قوم پر راج کرے۔ ایک قوم دوسری قوم کا استحصال کر سکتی ہے اور اس کو جانوروں کی پرورش کے لیے مرکز کے طور پر استعمال کر سکتی ہے جہاں خود اپنے باشندوں کے فائدے کے لیے دولت حاصل کر سکے"۔ اس بیان میں ایک گہری صداقت ہے۔ زیادہ تر لوگ عام طور سے دوسروں کے مفادات کا خیال نہیں کیا کرتے۔ برطانوی رائے دہندگان اس حد تک انصاف پسند ہیں جس حد تک دوسرے ملکوں کے رائے دہندگان ہوا کرتے ہیں۔ لیکن اُنھیں کون برطانوی رائے دہندگان کہے گا اگر وہ معمولاً اپنے مفادات کا پاس نہ کریں اور اپنے فائدے نقصان پر نظر نہ رکھیں۔ پارلیمنٹ رائے دہندگان کے احکام کی پابند ہے۔ سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا جو برطانوی کابینہ کا رکن ہوتا ہے وزرا کی مشترک خواہشات کے خلاف نہیں جا سکتا۔ کاونسل کے اراکین سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا مقرر کرتا ہے۔ ان کے متعلق کسی طرح نہیں سمجھا جا سکتا کہ وہ ہندوستان کے لوگوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ہندوستان کا وائسرائے خود سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کا ماتحت ہوتا ہے۔ ہندوستان پر حکومت کرنے کا اختیار وائسرائے کی عام کاونسل کو حاصل ہوتا ہے جو بقول سر ولیم ہنٹر "چند سری حکومت" کے مترادف ہے اور ہندوستان کے لوگوں کی نمائندگی نہیں کرتی۔ گورنر جنرل کی کونسل کے اراکین عام طور سے ان محکموں کے سربراہ ہوا کرتے ہیں جنھیں اخراجاتی محکمے کہنا چاہیے۔ جیسا کہ سر ڈیوڈ باربور (Sir David Barbour) نے ہندوستان کے اخراجات کا جائزہ لینے والے کمیشن (Indian Expenditure Commission) کے سامنے شہادت دیتے ہوئے کہا تھا "عام طور سے رُجحان یہ ہے کہ محکمہ مالیات پر زیادہ روپیہ خرچ کرنے کے لیے زور ڈالا جاتا ہے۔ اس کو زور ڈالنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ دوسرے محکمے زیادہ روپیہ خرچ کرنے پر برابر اصرار کرتے رہتے ہیں۔ ان کے مطالبے مسلسل جاری رہتے ہیں"۔ ہندوستان کی حکومت کی مشینری میں ایسے عناصر کا فقدان ہے جو اخراجات میں کمی کے خواہشمند ہوں اور ایسی کوئی آواز نہیں جو محصول

دہندگان کی نمائندگی کرے۔ موجودہ آئین میں مالیاتی اصلاحات کی کوئی گنجائش نہیں۔ اگر اخراجات میں کمی کرنی ہے تو آئین میں ایسی گنجائش نکالنی ہوگی کہ محصول دہندگان کے مفادات کی نمائندگی ہو سکے۔

تاریخ ہندوستان کی سلطنت کو جدید دَور کا سب سے شاندار انسانی ادارہ قرار دے گی۔ لیکن آئندہ کے مورّخ نہایت افسوس کے ساتھ لکھیں گے کہ انگریزی راج نے ہندوستان کے لوگوں کو امن کی دولت تو دی مگر ان کے افلاس کو دُور نہ کر سکا، صنعت کاروں کی صنعتیں چھِن گئیں، کسان بھاری اور غیر یقینی محاصل کے بوجھ کے نیچے دب گئے جس کی وجہ سے ان میں اتنی سکت بھی نہ رہی کہ تھوڑا بہت روپیہ پس انداز کر سکیں، قومی آمدنی کا بڑا حصّہ انگلستان جانے لگا اور بار بار پڑنے والے تباہ کُن قحطوں نے لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اس کے برعکس خود انگریزوں کو اطمینان قلب حاصل ہو جائے گا اگر وہ کہہ سکیں کہ انگلستان جس طرح آئرلینڈ میں پچھلی غلطیوں کی تلافی کر چکا ہے۔ اسی طرح اس نے بیسوَیں صدی میں ہندوستان کے تعلق سے ہونے والی پچھلی غلطیوں کی تلافی کر دی۔ اُس نے مالگزاری کی شرح کم کر دی، صنعتوں کو دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا کر دیا، ہندوستان کے لوگوں کو نمائندگی کا حق دے دیا اور وہاں کے لوگوں کے مفاد میں ہندوستان پر حکومت کی جس کی بنا پر وہاں کے لوگ محسوس کرنے لگے کہ وہ ایک عظیم و متحدہ سلطنت کے شہری ہیں۔

لندن — رمیش دت

اگست سنہ ۱۹۰۶ء

مندرجات

مقدمہ	5

حصہ اول

کمپنی کے عہد میں۔ 1838ء تا 1858ء	23-250
1 آکلینڈ اور ایلن برا	23
2 ہارڈنگ اور ڈلہوزی	54
3 شمالی ہندوستان کے بندوبست	51
4 بمبئی کے بندوبست	68
5 مدراس کے بندوبست	84
6 پنجاب کے بندوبست	98
7 خام مال اور مصنوعات	115
8 کافی، شکر اور کپاس	140
9 چائے، نمک اور افیم	158
10 محاصل، برآمدات و درآمدات	170
11 آب رسانی کے ذرائع اور ریلیں	182
12 نظم ونسق	194
13 ہندوستان کی مالیات عامہ، ہندوستان کے قرض کی ابتدا	223
14 کمپنی کی حکومت کا اختتام	227

دوسرا حصہ

ملکہ کے عہد میں۔ 1858ء تا 1876ء 253-422

1 کیننگ، ایلگن اور لارنس 253

2 میو اور نارتھ بروک 265

3 شمالی ہندوستان میں زرعی اصلاحات 276

4 ہندوستان کے لیے بندوبست استمراری کی تجویز 285

5 صوبجات متوسط کے بندوبست 301

6 مدراس کے بندوبست 317

7 بمبئی کے بندوبست 331

8 تجارت وصنعت 340

9 ریلیں اور آب رسانی کے ذرائع 361

10 مالیات اور ہندوستان کا قرض 378

11 زمین کے مقامی محاصل 395

12 محاصل درآمد و برآمد کی تاریخ 408

حصہ سوم

قیصر ہند کے عہد میں۔ 1877ء تا 1900ء 425-615

1 لٹن اور رپن 425

2 ڈفرن اور لینس ڈاؤن 445

3 ایلگن اور کرزن 455

4 شمالی ہندوستان کا انتظام آراضی 462

5 صوبجات متوسط کا انتظام آراضی 473

6 بمبئی اور مدراس کے انتظام آراضی 489

7 رپن اور کرزن کی زرعی تجاویز 503

8 تجارت وصنعت 516

9 محاصل درآمد و برآمد کی تاریخ 533

10 ریلیں اور آب رسانی کے ذرائع 543
11 اخراجات کا جائزہ لینے کے لیے رائل کمیشن کا تقرر 553
12 ہندوستانی کرنسی کی کمیٹی 575
13 مالیات عامہ اور ہندوستان کا قرض 593
14 ہندوستان بیسویں صدی میں 600

حصّہ اوّل

سنہ 1858ء سنہ 1838ء

باب 1

آکلینڈ اور ایلن برا

لارڈ ولیم بینٹنک 1835ء میں ہندوستان سے واپس گیا۔ اس کا سات سالہ دورِ حکومت امن و امان، اخراجات میں کمی اور اصلاحات کا دور تھا۔ اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضات میں امن قایم کیا اور دیسی حکمرانوں کے ساتھ دوستانہ مراسم پیدا کیے۔ اس کے زمانے میں سرکاری قرضے میں تخفیف ہوئی، سالانہ اخراجات میں کمی ہوئی اور خسارے کے بجائے بچت ہونے لگی۔ اس نے شمالی ہند میں مالگزاری کا ترمیم شدہ بندوبست شروع کیا جس سے زمینداروں اور کاشتکاروں کی دشواریاں کچھ کم ہوگئیں۔ اس نے ہندوستان کے تعلیم یافتہ لوگوں کو مال اور عدالت کے محکموں میں اعلا عہدے دیے۔ اس نے ستی کی رسم کو ختم کیا اور ٹھگوں کی سرکوبی کی۔ اس نے ہندوستان میں انگریزی کی تعلیم کو فروغ دیا اور اس اصول پر عمل کرنے کی کوشش کی کہ ہندوستان کے نظم ونسق کا اصل مقصد ہندوستانیوں کے مفادات کا تحفظ ہے۔ اس کا جانشین سر چارلس مٹکاف بھی اسی مکتب خیال سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے بھی ان اصولوں پر عمل کیا۔ اس نے ہندوستان کے اخبارات کو آزادی دی اور ایک فیض رساں حاکم کی حیثیت سے بڑی شہرت پائی۔

اگست 1834ء میں جب ڈائرکٹروں کو لارڈ ولیم بنٹنک کا استعفیٰ موصول ہوا تو اس وقت ہنری سینٹ جارج ٹکر (Henry St George Tucker) کورٹ آف ڈائرکٹرز کا صدر تھا۔ ٹکر خود بھی ہندوستان میں شاندار خدمات سر انجام دے چکا تھا اور ویلزلی اور منٹو کے زمانوں میں نہایت قابلیت کے ساتھ مالیات کا انتظام کر چکا تھا۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی وہ ہندوستان کے لوگوں کے مفادات سے دلچسپی رکھتا تھا۔ بینٹنک کا استعفیٰ موصول ہوا تو اس نے کوشش کی

کربینٹنک کے جانشین کی حیثیت سے ایسے آدمی کا تقرر کیا جائے جو اس اعلا عہدے کا واقعی اہل ہو۔ وہ ماونٹ اسٹورٹ الفنسٹن اور سر چارلس مٹکاف میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا چاہتا تھا۔ الفنسٹن بمبئی سے واپس آچکا تھا اور مٹکاف اس وقت تک بنگال میں تھا۔ الفنسٹن ادبی کاموں میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ اس نے ہندوستان واپس جانے اور پُرآشوب حالات میں کام کرنے سے انکار کر دیا۔ کورٹ آف ڈائریکٹرز نے بڑی اکثریت کے ساتھ صدر کی اس تجویز کو منظور کر لیا کہ سر چارلس مٹکاف کو ہندوستان کا گورنر جنرل بنایا جائے۔ لیکن کابینہ کے اراکین نے اس سے اختلاف کیا۔ کورٹ آف ڈائریکٹرز کی تجویز موصول ہونے کے بعد بورڈ آف کنٹرول نے اعلان کیا کہ کمپنی کا نامزد کیا ہوا شخص اس عہدے کے لیے موزوں نہیں۔ ان کی دلی خواہش یہ تھی کہ اس اعلا عہدے پر ایسے آدمی کا تقرر کیا جائے جو ان کی پارٹی سے تعلق رکھتا ہو۔

انگلستان کی حکومت میں تیزی کے ساتھ بڑی بڑی تبدیلیاں ہوئیں۔ 1834ء کے ختم ہوتے ہوتے وہ لبرل وزارت ٹوٹ گئی جس نے سر چارلس مٹکاف کی تقرری کی منظوری دینے سے انکار کر دیا تھا۔ سر رابرٹ پیل نے ٹوری حکومت بنائی اور اس نے سر چارلس مٹکاف کے بجائے ایک کنزرویٹو لارڈ کا انتخاب کیا۔ جنوری 1835ء میں لارڈ ہیٹس بری (Lord Heytesbury) کا تقرر عمل میں آیا۔ فروری میں شاہی منظوری حاصل ہو گئی۔ مارچ میں اس کو الوداعی دعوت دی گئی۔ اس دعوت میں سر رابرٹ پیل، ڈیوک آف ولنگٹن اور دوسری کنزرویٹو مقتدر و ممتاز شخصیتوں نے شرکت کی۔ لارڈ ہیٹس بری کے ہندوستان روانہ ہونے سے پہلے اپریل میں کنزرویٹو حکومت ختم ہو گئی۔ اس کی جگہ لبرل حکومت بنی جس نے کنزرویٹو لارڈ کی تقرری کو منسوخ کر دیا اور ایک لبرل لارڈ کو ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر کر دیا۔ قرعہ فال لارڈ آکلینڈ کے نام پڑا۔ اس نے سر چارلس مٹکاف کی جگہ، جو لارڈ ولیم بینٹنک کے ہندوستان سے روانہ ہونے کے بعد قایم مقام گورنر جنرل کے فرائض ادا کر رہا تھا، حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کارروائیوں سے کنزرویٹو پارٹی کی زیادہ بدنامی ہوئی یا لبرل پارٹی کی لیکن یہ ظاہر ہے کہ دونوں پارٹیاں حکومتِ ہند کے مفادات پر اپنی پارٹی کے مفادات کو ترجیح دینا چاہتی تھیں۔

ہندوستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے لارڈ آکلینڈ کے تقرر کی ایک اور اہمیت بھی تھی۔ اس کے معنی تھے کہ ہندوستان کی خارجہ پالیسی کے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ وہ انگلستان کی خارجہ پالیسی کے مطابق خود کو ڈھالے۔ 1830ء میں انگلستان کی لبرل پارٹی نے شاندار فتح پائی تھی

اور 35-1934ء کے موسمِ سرما میں ایک چھوٹے سے وقفے کے علاوہ گیارہ سال تک حکومت اُس کے ہاتھ میں رہی۔ اس زمانے میں لبرل حکومت کی سب سے بااثر شخصیت وزیرِ خارجہ لارڈ پامرسٹن (Lord Palmerston) کی تھی اور اس کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ روسیوں کو مشرق کی طرف بڑھنے سے روکا جائے۔ 1833ء میں اس نے ترکی کی حمایت کی اور اُسے تقویت پہنچائی۔ 1840ء میں اس نے ترکی کی حمایت میں فوجی کاروائی کرنے کا معاہدہ یورپ کی تین حکومتوں کے ساتھ کیا۔ 1841ء میں اس نے ایک دفعہ پھر مصر پر ترکی کا اقتدارِ اعلا تسلیم کر لیا۔ یہ بات آسانی سے سمجھی جا سکتی ہے کہ ہندوستان میں لارڈ آکلینڈ کے تقرر کا مقصد یہ تھا کہ روس کے خلاف انگلستان کی سامراجی پالیسی کو عملی شکل دی جا سکے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے متعلق اکثر کہا جاتا ہے کہ اس نے علاقے فتح کرنے اور مقبوضات کو توسیع دینے کے لیے جنگیں لڑیں مگر پہلی جنگِ افغانستان کی ذمہ داری اس پر عائد نہیں کی جا سکتی۔ یہ جنگ اس کی اجازت اور منظوری کے بغیر شروع کر دی گئی تھی۔ ہنری سنیٹ جارج ٹکر نے، جو اس وقت کورٹ آف ڈائریکٹرز کا صدر تھا، 1835ء میں بورڈ آف کنٹرول کو یہ اصول تسلیم کرنے پر آمادہ کر لیا تھا کہ روسیوں کو آگے بڑھنے سے روکنے کے لیے ایران کے ساتھ سفارتی تعلقات کو ہندوستانی مسئلے کے بجائے ایک یورپی مسئلہ سمجھنا چاہیے۔ لیکن اس "افسوسناک کمینے پن" کے ساتھ، جو انگلستان اور ہندوستان کے درمیانی لین دین کی بُنیاد بن گئی تھی، یہ فیصلہ کیا گیا کہ ایران میں قایم ہونے والے سفارت خانے کے اخراجات کے لیے ہندوستان بارہ ہزار پونڈ سالانہ ادا کرے لیکن تہران میں مقیم برطانوی سفیر پر اور ایران کی سیاست پر کلی اختیار برطانوی وزارت کو حاصل ہوگا۔ جس وقت روسی ایرانی سوال کو ایک یورپی مسئلہ قرار دیا جا رہا تھا اس وقت کسی نے یہ نہیں سوچا کہ اس کو حل کرنے کے لیے ہندوستانیوں کا خون بہے گا اور ان کی دولت خرچ ہوگی۔

ڈاکٹر میک نیل (Dr. MacNeill) کو ایران میں سفیر مقرر کیا گیا۔ اس نے وزیرِ خارجہ لارڈ پامرسٹن سے راست سلسلہ مراسلت قایم کر لیا۔ فروری 1837ء میں اس نے لارڈ پامرسٹن سے شکایت کی کہ قندھار کے ایجنٹ نے روسی وزیر سے ملاقات کی مگر برطانوی سفیر سے وہ ملنے نہیں آیا۔[1]

---

[1] خط مورخہ طہران، 20 فروری 1837ء

اسی مہینے میں اس نے لارڈ پامرسٹن کو ایک اور خط لکھا جس میں ہرات پر شاہ ایران کے آئندہ حملے کو حق بجانب قرار دیا۔

"ہرات کے متعلق ایران کے اقتدار اعلا کے دعوؤں سے قطع نظر، اور اس کو ایک ایسا مسئلہ سمجھنے کے باوجود جو دو آزاد حکمرانوں کے درمیان اُٹھ کھڑا ہوا ہے، میرا خیال ہے کہ حکومت ہرات کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے جارحانہ کارروائی میں پہل کی ہے"۔

"ایرانیوں نے افغانستانوں کے خلاف ایسا کوئی قدم نہیں اُٹھایا ہے جس کو جارحیت پر محمول کیا جا سکے لیکن مرحوم شاہ کے انتقال کے بعد ہرات نے ترکمان اور ہزارہ قبائل کے لوگوں کے ساتھ مل کر ایرانی علاقوں پر چھاپے مارے اور ایرانی رعایا کو گرفتار کر کے لے گئے تاکہ اُنھیں غلاموں کی حیثیت سے فروخت کر سکیں"۔

"میں بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ ان حالات میں شہزادہ کامران کے خلاف فوجی کارروائی کرنے میں شاہ ایران حق بجانب ہے[1]"۔

آخرکار ایران نے ہرات پر حملہ کر دیا۔ افغانستان کے امیر دوست محمدؐ نے شاہ ایران کا ساتھ دیا۔ دوست محمدؐ نے رنجیت سنگھ سے پشاور چھیننے کی بھی کوشش کی تھی اور ایک روسی سفیر کو کابل آنے کی اجازت دی تھی۔ ان غیر معقول اسباب کی بنا پر لارڈ آکلینڈ نے، جو اب ہندوستان کا گورنر جنرل تھا، افغانستان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔

لاکھ عذر کرنے کے بعد بھی لارڈ آکلینڈ کے اس اعلان[2] کی کوئی حقیقی وجہ نہیں معلوم ہوتی جس نے ہندوستان کو ایک غیر ضروری جنگ میں مبتلا کر دیا۔ مانا کہ دوست محمدؐ نے رنجیت سنگھ سے پشاور چھیننے کی کوشش کی تھی مگر اُسے اس کوشش میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ یوں بھی رنجیت سنگھ اپنے علاقے کے دفاع کی پوری صلاحیت رکھتا تھا۔ یہ بھی مانا کہ دوست محمدؐ نے ہرات پر حملے کے وقت ایران کا ساتھ دیا تھا لیکن ڈاکٹر میک نیل کے 1837ء کے مندرجہ بالا خط کے مطابق ہرات کے گورنر کی سازشوں کی بنا پر شاہ ایران کا یہ اقدام "حق بجانب" تھا۔ اس حملے کی اصل وجہ یہ تھی کہ دوست محمدؐ کی طرح کے ایک طاقتور، لائق اور دوستانہ مراسم رکھنے والے حکمراں

---

[1] خط مورخہ طہران، 24 فروری 1837ء۔

[2] اعلان از رائٹ آنریبل گورنر جنرل برائے ہندوستان مورخہ یکم اکتوبر 1838ء۔

کو تخت سے اُتار دیا جائے اور اس کی جگہ برطانیہ کے ایک آورد ے کو افغانستان کا امیر بنا دیا جائے۔ لارڈ پامرسٹن انگلستان کے عظیم رقیب سے مشرق میں برسرِ پیکار تھا اور لارڈ آکلینڈ اس پر تیار ہو گیا تھا کہ جنگ کے مصارف ہندوستان کے محاصل کی آمدنی میں سے ادا کیے جائیں۔ سنیٹ جارج ٹکر نے لکھا تھا "واقعہ یہ ہے کہ ملکۂ معظمہ کی حکومت کا فائدہ اس میں ہے کہ بحر بالٹک اور بحر اسود میں اپنا بیڑہ بھیجنے کے بجائے روسیوں کے خلاف فوجی کاروائی کے اخراجات ہندوستان پر ڈالے لیکن ہمیں ہندوستان کے وسائل کے غلط استعمال کی اس کوشش کی مزاحمت کرنی پڑے گی"[1]

ایرانی فوج نے بالآخر ہرات کا محاصرہ اُٹھا لیا۔ اس کے بعد افغانستان کے معاملات میں مداخلت کی جو تھوڑی بہت وجہ تھی وہ بھی ختم ہو گئی۔ اب بھی موقع تھا کہ افغانستان سے جنگ کا ارادہ ترک کر دیا جائے۔ ڈیوک آف ولنگٹن کا بھی خیال تھا، جو ہر قیمت پر امن کا حامی نہیں تھا، کہ حملے کا ارادہ ترک کر دینا چاہیے۔ اُس نے سنیٹ جارج ٹکر کو لکھا تھا "میرا خیال تھا کہ ہرات کا محاصرہ اُٹھنے کے بعد دریائے سندھ کی طرف بڑھنے کا خیال ترک کر دیا جائے گا۔ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو میں اس کو بدقسمتی سے تعبیر کروں گا۔ دریائے سندھ پار کر کے افغانستان میں حکومت بنانے کے معنی یہ سمجھے جائیں گے کہ ہم نے اس ملک پر ہمیشہ کے لیے قبضہ کر لیا"[2]

لیکن لارڈ آکلینڈ کچھ اور سوچ رہا تھا۔ اس نے کورٹ آف ڈائریکٹرز کی خفیہ کمیٹی کو لکھا تھا "جب اس خبر کی تصدیق ہو گئی کہ شاہ ایران نے ہرات کا محاصرہ ترک کر دیا ہے تو میں نے عام اعلان کر دیا کہ حالات میں سدھار ہونے کے باوجود میں وہ اقدامات کرنے کا پکّا ارادہ رکھتا ہوں جو مستحکم بنیادوں پر ہندوستان کی مغربی سرحد پر امن و امان قایم کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اُدھر سے ہونے والے حملے کا دائمی سدِباب کر دیا جائے"۔ ساٹھ سال کے تجربے کے بعد ہم یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ڈیوک آف ولنگٹن کا خیال درست تھا یا لارڈ آکلینڈ کا۔ ہمیں یہ بھی سوچنا پڑتا ہے کہ افغانستان کے داخلی معاملات میں مداخلت کر کے ہم نے حملے کے خلاف "مدافعت کا دائمی سدِباب کیا" یا موجودہ مدافعتی انتظامات کو بھی درہم و برہم کر دیا اور اس ملک سے "دائمی جھگڑا مول لے لیا"۔

جنگ ہوتی رہی۔ چونکہ رنجیت سنگھ نے انگریزی فوجوں کو پنجاب سے گزرنے کی اجازت نہیں

---

[1] Life and Correspondence of Henry St. George Tucker. صفحہ 511۔

[2] خط مورخہ 12 دسمبر 1838ء۔

دی اس لیے انھیں سندھ کا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ اپریل 1839ء میں قندہار پر قبضہ کر لیا گیا۔ جولائی میں غزنی فتح ہو گیا۔ اگست میں انگریزی فوجیں کابل میں داخل ہو گئیں۔ دوست محمّد بخارا کی طرف بھاگ گیا۔ شاہ شجاع کو افغانستان کا امیر بنا دیا گیا۔ انگلستان میں بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ مقامی اداکاروں نے ایسی شیخی بگھارنی شروع کر دی جس کی مثال برطانوی سپاہی یا مدبر نہیں پیش کر سکتے۔ غزنی پر قبضہ کرنے کے بعد سر جان کین (Sir John Keane) نے لارڈ آکلینڈ کو لکھا تھا "جس فوج کی کمان میرے ہاتھ میں ہے اُس نے اتنے شاندار کارنامے سرانجام دیے ہیں کہ میری 45 سال کی ملازمت کے دوران دُنیا کے کس حصّے میں میری نظر سے نہیں گزرے"[1]۔ لارڈ آکلینڈ نے ڈائرکٹروں کی خفیہ کمیٹی کو لکھا تھا "دوست محمّد خان بھاگ گیا اور ہز مجسٹی شاہ شجاع الملک لوگوں کے مبارک وسلامت کے نعروں کے درمیان کابل میں داخل ہوئے"۔ شاہ شجاع الملک نے ملکہ وکٹوریہ کو لکھا "مجھے یقین ہے کہ میری ہمشیرہ عالی وقار میری خواہشات کا احترام کریں گی"۔ وہ چاہتا تھا کہ درانی سلطنت ایک اعلا اعزاز کا سلسلہ شروع کرے اور اس سلسلے کے سب سے بڑے اعزاز سے لارڈ آکلینڈ، سر جان کین اور کچھ دوسرے لوگوں کو نوازے[2]۔

موجود کتاب کا مقصد جنگِ افغانستان کی تاریخ بیان کرنا نہیں۔ یہ کہانی اسکولوں میں پڑھائی جانی والی تاریخ کی ہر کتاب میں مل جائے گی۔ اس کے علاوہ ایک غیر جانب دار انگلو انڈین مورّخ نے بڑی حقیقت نگاری کا ثبوت دیتے ہوئے پوری کہانی بیان کر دی ہے[3]۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ افغانستان کے معاملات میں بدیسیوں کی مداخلت وہاں کے لوگوں کو ناگوار گزری۔ برطانوی سفیر کے اختیارات نئے امیر شاہ شجاع کے لیے تکلیف دہ تھے۔ کابل کے ملاؤں نے شاہ شجاع کے نام کا خطبہ پڑھنے سے انکار کر دیا اور اعلان کر دیا کہ وہ آزاد بادشاہ نہیں ہے۔ جب ہندوستان سے ملنے والے روپے میں کمی ہونے لگی تو مختلف قبائل کے سردار اور ملک بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ 2 نومبر 1841ء

---

[1] خط مورخہ 24 جولائی 1839ء۔

[2] جنگِ افغانستان کے متعلق سرکاری کاغذات جو ہاؤس آف کامنز کے حکم سے 21 جنوری 1840ء کو شایع کیے گئے۔ کاغذ نمبر 24۔

[3] سر جان کین کی کتاب 'History of the war in Afghanistan'۔ اگر حماقت وتباہی کی تاریخ نہ ہوتی تو برطانوی قاری اس سے زیادہ واقف ہوتے اور اُس کے سستے اڈیشن شایع ہو جاتے۔

کو کابل میں شورش پھوٹ پڑی اور سر الگزینڈر برنس (Sir Alexander Burnes) کو قتل کر دیا گیا۔
23 دسمبر کو دوست محمدؐ کے بیٹے اکبر خاں نے ایک جلسہ عام میں برطانوی سفیر میک ناٹن (MacNaghten) کو قتل کر دیا۔ جنوری 1842ء میں چار ہزار برطانوی فوج اور بارہ ہزار دوسرے لوگوں کی کابل سے واپسی شروع ہوئی۔ اس سفر میں جھڑپیں بھی ہوتی رہیں اور مذاکرات کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اکبر خاں کا مطالبہ تھا کہ زیادہ تر برطانوی لوگ یرغمال کے طور پر اس کے سپرد کر دیے جائیں جن میں انگریز افسروں کی بیویاں اور بچے بھی شامل ہوں۔ اس کی سپاہ نے پہاڑوں میں رہنے والے غازیوں کے ساتھ مل کر پیچھے ہٹتی ہوئی فوج پر آگ برسانی شروع کر دی۔ تمام کے تمام سولہ ہزار آدمی افغانوں کی گولیوں کا نشانہ بن گئے یا سردی اور فاقوں کے شکار ہو گئے۔ صرف ڈاکٹر بریڈن بچ کے نکل سکا۔

1842ء میں لارڈ آکلینڈ کی جگہ لارڈ ایلن برا ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر ہوا۔ انگلستان میں لبرل وزارت ختم ہو گئی تھی اور اس کی جگہ کنزرویٹو پارٹی کی حکومت بن گئی تھی۔ اس احمقانہ اور تباہ کن جنگ کی ذمہ داری نئی وزارت پر نہیں تھی۔ وہ بجا طور سے اس کی ذمہ داری اپنے پیش روؤں پر ڈال سکتے تھے۔ لوگوں کو توقع تھی کہ وہ ہندوستان کے ساتھ انصاف کریں گے اور جنگ کے اخراجات سے اس کو بچائیں گے۔ لیکن برطانیہ کے وزیر چاہے وہ لبرل ہوں یا کنزرویٹو اس کے لیے تیار نہیں ہوا کرتے ہیں کہ اپنے انتخاب کنندگان کے سامنے ایک ناکامیاب جنگ کے اخراجات کا مطالبہ پیش کریں۔ کورٹ آف ڈائرکٹرز نے اپنا مطالبہ سختی کے ساتھ پیش کرنا شروع کر دیا۔ کورٹ آف پروپرائٹرز (Court of Proprietors) نے بھی اس سلسلہ میں اسی قدر سختی کا مظاہرہ کیا۔ ہندوستان کے لوگوں نے ایک ایسی جنگ کے اخراجات برداشت کرنے کو ناانصافی سے تعبیر کرنا شروع کیا جو ہندوستان کی سرحد کے پار لڑی گئی تھی۔ لیکن تمام احتجاج بے سود ثابت ہوا۔ پہلی جنگ افغانستان پر پندرہ ملین پونڈ صرف ہوئے تھے۔ یہ رقم ہندوستان کو ادا کرنی پڑی۔ برطانیہ نے ایک پیسہ بھی نہیں دیا۔

فروری 1842ء میں لارڈ ایلن برا کلکتہ پہنچا۔ وہ انڈیا بورڈ آف کنٹرول (India Board of Control) کے صدر کے فرائض ادا کر چکا تھا اور اس لیے ہندوستان پر حکومت کرنے کا اہل تھا۔ اس نے داخلی چنگی کو ختم کرنے میں مدد دی تھی جس کی وجہ سے ہندوستان کی داخلی تجارت میں رکاوٹیں پڑتی تھیں۔ ہندوستان کی پیداوار اور مصنوعات کے متعلق تحقیقات کرنے کے لیے ہاؤس آف لارڈز نے جو سلیکٹ کمیٹی مقرر کی تھی لارڈ ایلن برا اس کا بھی صدر رہ چکا تھا۔ لیکن ہندوستان پہنچنے کے بعد اس کو سب سے پہلے مسئلہ افغانستان پر توجہ کرنی پڑی۔

جون 1839ء میں رنجیت سنگھ کا انتقال ہو چکا تھا۔ اب اگر برطانوی فوجیں پنجاب سے گزرنا چاہتیں تو انھیں روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ جنرل پلک (General Pollock) پنجاب کے راستے جلال آباد پہنچا اور اس پر قبضہ کر لیا۔ اس نے اکبر خاں کو شکست دی اور ستمبر 1842ء میں کابل میں داخل ہو گیا۔ کابل کا بڑا بازار جو ایشیا کا بہترین بازار تھا بارود سے اُڑا دیا گیا اور ظفریاب فوج نے کئی اور انتقامی کاروائیاں کیں۔

لارڈ آکلینڈ کے اعلان جنگ کے پورے چار سال بعد یکم اکتوبر 1842ء کو اس کے جانشین نے کہا کہ فتح یاب برطانوی فوج افغانستان سے واپس آجائے گی۔ اس اعلان کے کچھ حصّے ایسے ہیں جن کے متعلق شبہ ہوتا ہے کہ ڈیوک آف ولنگٹن کے ایماں پر لارڈ لارنس نے لکھے تھے۔ یہ ٹکڑے ہر دور میں صحیح سمجھے جائیں گے۔

"کسی کو لوگوں کی مرضی کے خلاف حکمراں بنانا جس طرح برطانوی حکومت کے مقاصد کے منافی ہے اُسی طرح یہ بات اس کی پالیسی کے بھی منافی ہے کہ لوگوں کے اسلحہ جات اور اُن کے وسائل پہلے حملہ آور کے سپرد کر دیے جائیں اور ایسے حکمراں کی امداد کی ذمّہ داری قبول کی جائے جس سے معاہدہ کر کے کوئی فائدہ نہیں حاصل کیا جا سکتا۔"

"گورنر جنرل بڑی خوشی سے ایسی حکومت کو تسلیم کرے گا جس کو افغانوں کی حمایت حاصل ہو اور جس کے متعلق یہ سمجھا جائے کہ وہ قابلِ قبول ہے اور اپنے پڑوسی ممالک سے دوستانہ مراسم رکھنے کی اہل ہے۔"

"سلطنت کی قدرتی سرحدوں پر قانع رہتے ہوئے حکومت ہند پوری پوری کوشش کرے گی کہ امن برقرار رہے، اس سے دوستانہ مراسم رکھنے والے حکمراں اور سردار محفوظ رہیں اور اس کی وفادار رعایا مسرّت و خوشحالی سے ہمکنار ہو۔[1]"

یہ الفاظ لارڈ ایلن برا کی سمجھ داری اور سیاسی سوجھ بوجھ کو ظاہر کرتے ہیں لیکن اس نے ایک کمزور اور قریبی پڑوسی کی طرف جو پالیسی اختیار کی اس نے اس کے دامن کو داغدار بنا دیا۔ 1838ء میں سندھ کے امیروں نے انگریزی فوج کو اپنے علاقے سے گزرنے کی اجازت دی تھی اور اس زمانے سے مغربی ایشیا کو جانے والے راستے کی حیثیت سے صوبہ سندھ کی اہمیت بڑھ گئی

---

[1] اعلان مورخہ یکم اکتوبر 1842ء۔

تھی۔ افغانستان پر برطانوی قبضے کے دوران جن امیروں نے حکومتِ ہند کی بڑی خدمت کی تھی۔ ہمیں یہ بات افسوس کے ساتھ کہنا پڑتی ہے کہ جنگ افغانستان کے ختم ہونے کے فوراً بعد حکومتِ ہند نے اُن کے علاقے پر قبضہ کرلیا۔

میجر آوٹ رم (Major Outram) سندھ میں مدّتوں برطانیہ کے پولیٹیکل ایجنٹ کے فرائض ادا کر چکا تھا۔ وہ امیروں کے ساتھ سختی و سخت گیری کے ساتھ اس مروّت و شرافت سے پیش آتا تھا جو اس کے مزاج میں داخل تھی۔ اکتوبر 1842ء میں اس کے اختیارات سر چارلس نیپیر (Sir CharlesNapier) کو منتقل کر دیے گئے جو ایک بہادر اور ممتاز سپاہی تھا مگر نہایت تحکم پسند اور جھگڑالو انسان تھا۔ دیسی حکمرانوں کے ساتھ معاملات طے کرنے کا کام ایسے شخص کے سُپرد نہیں کیا جانا چاہیے تھا۔[1] نیپیر کو اس امر کا یقین بڑی آسانی سے ہوگیا کہ کچھ امیر برطانوی حکومت کے خلاف ہیں۔ اس نے ان امیروں کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ فروری اور مارچ 1843ء میں امیروں کو میانی اور حیدر آباد کے مقامات پر شکستیں ہوئی اور لارڈ ایلن برانے، جو ایشیا میں امن قایم کرنے کے دعوے کیا کرتا تھا، سندھ پر قبضہ کرنے کے احکامات جاری کر دیے۔

دوستانہ مراسم رکھنے والی ایک ریاست پر اس قسم کے الزامات لگا کر قبضہ کرنا، جو کبھی ثابت نہ کیے جا سکے، حق بجانب نہیں قرار دیا جا سکتا۔ تمام غیر جانب دار مورخوں نے اس کی مذمت کی ہے۔ کورٹ آف ڈائریکٹرز کی تعریف کرنی پڑتی ہے کہ اس نے اگست 1843ء میں ایک باضابطہ تجویز کے ذریعے اعلان کیا کہ امیروں کے خلاف کی جانے والی کاروائی غیر منصفانہ، سیاسی طور سے نامناسب اور حکومتِ ہند کے مفادات کے منافی ہے۔ جس طرح افغانستان کے معاملے میں لارڈ آکلینڈ نے لبرل وزارت کی منظوری کے بعد فوجی کاروائی کی تھی ایسے ہی غالباً سندھ کے معاملے میں لارڈ ایلن برانے کنزرویٹو وزارت کی منظوری کے بعد یہ قدم اُٹھایا تھا لیکن کورٹ آف ڈائریکٹرز کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ گورنر جنرل کو وقت سے پہلے واپس بُلا لے۔ چنانچہ کنزرویٹو وزیروں کے احتجاج کے باوجود صرف

---

[1] 1818ء میں اسے سی فیلونیہ کا گورنر مقرر کیا گیا تھا لیکن انتہائی جھگڑالو ہونے کی وجہ سے انگلستان کے صاحبانِ اقتدار سے اس کے اختلافات ہوگئے۔ سندھ کی فتح کے بعد اس نے اپنے خطوط میں انگریز حکّام کے خلاف الزامات لگانے شروع کیے۔ کچھ مدّت بعد وہ پھر ہندوستان آیا اور کمانڈر ان چیف بنا دیا گیا۔ لیکن لارڈ ڈلہوزی سے اس کا جھگڑا ہوا اور وہ 1851ء میں ہندوستان سے واپس چلا گیا۔

دو سال ہندوستان میں گزارنے کے بعد لارڈ ایلن برا کو 1844ء میں واپس بلا لیا گیا۔

سندھ پر قبضہ کرنے کے سلسلے میں ایک اور دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ یہ واقعہ تاریخی دلچسپی کے بجائے ادبی دلچسپی کا حامل ہے۔ سندھ کے فاتح سر چارلس نیپیر کا ایک چھوٹا بھائی تھا جو اچھا سپاہی ہونے کے ساتھ اچھا ادیب بھی تھا۔ ولیم نیپیر جزیرہ نما کی جنگ میں ڈیوک آف ولنگٹن کے ماتحت کی حیثیت سے حصہ لے چکا تھا۔ اس کی لکھی ہوئی اس جنگ کی تاریخ کا شمار انگریزی زبان کے کلاسک میں ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے وہ بہادر سپاہی اور ممتاز مورّخ بھی اپنے بھائی کی وجہ سے میجر آؤٹ رم کے ساتھ جھگڑ بیٹھا۔ "جزیرہ نما کی جنگ" کے مصنف نے 1845ء میں "فتح سندھ" شایع کی۔ اس نے نہ صرف اپنے بھائی کی حمایت کی بلکہ میجر آؤٹ رم پر الزام لگائے کہ وہ فوجی صلاحیت نہیں رکھتا تھا، ان اقدامات کے خلاف تھا جو ہندوستان کو متمدّن بنانے کے لیے ضروری تھے اور انگریزی فوجوں کی تباہی کی تجاویز کی وکالت کرتا تھا۔ دونوں بھائیوں نے، جو فوجی اور ادبی شہرت کے مالک تھے، کوشش کی کہ اپنے اختیارات سے کام لے کر ایک نسبتاً کم عمر اور غیر معروف سپاہی کو کچل دیں۔ اس کے ثبوت میں کہ آئندہ آنے والی نسلیں کبھی کبھی شریف اور دیانت دار لوگوں کے ساتھ انصاف کیا کرتی ہیں یہ واقعہ پیش کیا جا سکتا ہے کہ اس نامناسب برتاؤ کے باوجود فاتح سندھ کے مقابلے میں جیمس آؤٹ رم کو ہندوستان میں زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ اس نے سیدھے سادھے انداز میں ولیم نیپیر کی کتاب کے جواب میں ایک کتاب لکھی۔ اس کی کتاب آج بھی مقبول ہے جب کہ ولیم نیپیر کی کتاب کو لوگ بھول چکے ہیں۔ اس کے اعلاکردار اور دلیری کی بنا پر ملازمت کے ابتدائی دور میں اُسے "ہندی سورما" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ 1857ء کے غدر میں اس نے نمایاں خدمات سرانجام دیں اور اگلے سال اسے سر کے خطاب سے نوازا گیا جب ہندوستان کی حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی سے ملکہ انگلستان کو منتقل ہو گئی تو وہ 1860ء میں پہلے وائسرائے لارڈ کیننگ کی کاؤنسل کا رکن مقرر کیا گیا۔

سندھ کی فتح کے متعلق جیمس آؤٹ رم نے جو بات کہی تھی وہی بات کورٹ آف ڈائرکٹرز نے بھی کہی۔ غیر جانب دار مورّخ بھی اس سے متفق ہیں۔ "پہلے تو انھیں (امیروں کو) معاہدے کرنے پر مجبور کیا گیا اور پھر ان معاہدوں کو ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیا گیا جب ہم پر وقت پڑا تھا اس وقت انھوں نے دوستی اور شرافت کا مظاہرہ کیا تھا۔ ہم اس کو بھی

بھول گئے۔ ان پر جھوٹے الزام لگائے گئے، انھیں مزاحمت کرنے پر مجبور کیا گیا اور ایک بے درد و بے وفا دوست کی خون آشام تلوار نے ان کی تباہی مکمل کر دی[1]"

---

[1] لیفٹیننٹ کرنل آؤٹ رم، Conquest of Sindh (لندن، 1846ء) صفحہ 485۔

باب 2

ہارڈنگ اور ڈلہوزی

موجودہ کتاب کا مقصد جنگوں اور علاقے حاصل کرنے کی داستان بیان کرنا نہیں ہے۔ ایک ایسے مصنف کے لیے جو عوام کی معاشی حالت کی روداد بیان کرنا چاہتا ہے آکلینڈ اور ڈلہوزی کی وہ جنگیں اور علاقوں پر قبضہ کرنے کے وہ طریقے موضوع کی حیثیت سے کوئی کشش نہیں رکھتے جو تلخ بحثوں کا موضوع بن گئے تھے لیکن جنگوں پر خرچ ہونے والی بے اندازہ رقموں اور سلطنت میں ہونے والے اضافوں کا حوالہ دیے بغیر ہندوستان کی معاشی تاریخ نامکمل رہے گی۔ چنانچہ جس طرح پچھلے باب میں ہم نے آکلینڈ اور ایلن برا کے دورِ حکومت کے خاص خاص واقعات کا ذکر کیا تھا اسی طرح اس باب میں ہم ہارڈنگ اور ڈلہوزی کے زمانہ حکومت کے اہم واقعات کا اجمالی ذکر کریں گے۔

1844ء میں جب لارڈ ایلن برا ہندوستان سے واپس بلایا گیا تو اس کے جانشین کی حیثیت سے سر ہنری ہارڈنگ کا انتخاب عمل میں آیا، اور واقعہ یہ ہے کہ اس سے بہتر انتخاب نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ہارڈنگ ایک بہادر سپاہی تھا اور تمام حقیقی سپاہیوں کی طرح ایک امن پسند انسان تھا۔ اس نے نپولین کی سپاہ کے خلاف جزیرہ نما کی جنگ میں شاندار کارنامے سرانجام دیے تھے اور کورونا (Corunna) کے میدانِ جنگ میں جب سر جان مُور کے مہلک زخم آیا تو وہ اس کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ اس کے بعد اس نے البیورا (Albuera) کی خونریز لڑائی میں حصّہ لیا اور وٹوریا (vittoria) کے مقام پر زخمی ہوا۔ وہ واٹرلو (Water loo) کی جنگ میں شریک ہوا تھا اور لگنی (Ligny) کی لڑائی کے وقت وہ مارشل بلوچر (Marshal Blucher) کے ساتھ تھا۔ اسی لڑائی میں

ایک توپ کے گولے سے اس کا بایاں ہاتھ چُور چُور ہوگیا تھا اور اسے کاٹنا پڑا تھا۔

نپولین کی جنگوں کے خاتمے کے بعد ہارڈنگ پارلیمنٹ کا رکن منتخب ہوا اور بیس سال سے زیادہ پارلیمنٹ کا ممبر رہا۔ 1821ء میں اس نے لارڈ کیسل رے (Lord Castlereagh) کی بہن سے شادی کر لی اور 1828ء میں لارڈ پامرسٹن کی جگہ سکریٹری آف اسٹیٹ برائے جنگ ہوگیا۔ وہ نہایت ثابت قدمی کے ساتھ کنزرویٹو پارٹی میں شامل رہا اور 1841ء میں جب سر رابرٹ پیل کے ہاتھ میں اقتدار آیا تو وہ ایک دفعہ پھر سکریٹری آف اسٹیٹ برائے جنگ بنا دیا گیا۔ وہ 1844ء تک سکریٹری آف اسٹیٹ برائے جنگ کے فرائض ادا کرتا رہا۔ 1844ء میں جب وہ عمر کی ساٹھویں سال میں تھا اسے لارڈ ایلن برا کی جگہ ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر کیا گیا۔ ہارڈنگ کی طرح کی نمایاں حیثیت رکھنے والے ایک وزیر کے لیے گورنر جنرل کا عہدہ کوئی اعزاز نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ دو سال بعد سر رابرٹ پیل نے سچ ہی کہا تھا کہ سر ہنری ہارڈنگ نے گورنر جنرل کا عہدہ قبول کر کے "قومی فرض شناسی کی بنا پر بہت بڑی قربانی دی"۔

ہارڈنگ کو کلکتہ پہنچے مشکل سے اٹھارہ مہینے گزرے تھے کہ ایک جنگ لڑنے پر اسے مجبور ہونا پڑا جس کی ابتدار اس کی طرف سے نہیں ہوئی تھی۔ پنجاب کے عظیم حکمراں رنجیت سنگھ کا انتقال 1839ء میں ہوا۔ اس کے مرتے ہی اس کی ساختہ و پرداختہ سکھوں کی شاندار فوج من مانی کرنے لگی۔ قدیم روم کے پریٹورین محافظ دستوں (Pretorian Guards) کی طرح وہ بے قابو ہوگئی۔ ہر رجمنٹ میں پنچائتیں قایم کر لی گئیں اور کسی اور کا حکم ماننے سے انکار کر دیا گیا۔ فوج نے جس کو چاہا اقتدار و اختیار سونپ دیا اور جس سے چاہا چھین لیا۔ بار بار ہونے والے انقلابوں کی وجہ سے نراج پھیل گیا۔ رنجیت سنگھ کی بیوہ کے بھائی پر فوجی پنچایت میں مقدمہ چلایا گیا اور اسے گولی سے اڑا دیا گیا۔ اس شاندار مگر گمراہ سکھ فوجی نے جو 60,000 سپاہیوں، 40,000 مسلح متعلقین اور 150 توپوں پر مشتمل تھی نومبر 1845ء میں ستلج پار کیا اور برطانوی ہند پر حملہ کر دیا۔

سکھوں کی فوج کا سالار لال سنگھ غدار تھا اور غالباً چاہتا تھا کہ پوری کی پوری فوج تباہ ہو جائے۔ انگریزوں سے پہلی لڑائی مڈکی کے مقام پر ہوئی۔ لڑائی شروع ہوتے ہی لال سنگھ میدان چھوڑ کر بھاگ گیا جس کی وجہ سے اس کی فوج کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ دوسری لڑائی جو فیروز شہر کے مقام پر لڑی گئی بڑی گھمسان کی لڑائی تھی۔ ایک چشم دید گواہ کا کہنا ہے کہ انگریزوں کی توپیں گاڑیوں سے گرا دی گئیں، گولہ بارود کا ذخیرہ اُڑا دیا گیا اور برطانوی دستوں کو آگے بڑھنے

سے روک دیا گیا۔ ایک کے بعد ایک دستے کی صفوں میں انتشار پڑتا گیا اور انھیں پیچھے ہٹنے پر مجبور ہونا پڑا۔ سورج غروب ہونے کے بعد بڑی مشکل سے سکھوں کی کچھ چوکیوں پر قبضہ کیا جا سکا[1] صبح کے وقت پھر لڑائی شروع ہوئی مگر لال سنگھ کی غداری یا بزدلی کی بنا پر سکھوں کی فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ انگریزوں نے علی وال کے مقام پر تیسری لڑائی بھی جیت لی۔ لیکن وہ فیصلہ کن لڑائی جس نے جنگ کو ختم کر دیا۔ ۱۰ فروری 1846ء کو سوبراں کے مقام پر ہوئی۔ سکھوں نے مجاہدوں کی شجاعت اور سورماؤں کی ثابت قدمی کا ثبوت دیا لیکن سکھوں کا سالار تیج سنگھ حملہ ہوتے ہی بھاگ کھڑا ہوا۔ اس نے ستلج کا پُل توڑ دیا تاکہ اس کی فوج بچ کے نکل نہ سکے۔ انگریزوں نے فیصلہ کن فتح حاصل کر لی۔ مگر انھیں اُس کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ دو ہزار سے اوپر برطانوی سپاہی مارے گئے یا زخمی ہوئے۔ لارڈ ہارڈنگ کے لڑکے کا کہنا ہے، جس نے اس لڑائی میں حصہ لیا تھا، کہ دریا میں آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے جو اپنی جانیں بچانے کے لیے ہاتھ پیر مار رہے تھے۔ ان توپوں نے قتل عام مکمل کر دیا جو اب دریا کے کنارے لائی جا چکی تھیں۔ صرف تھوڑے سے سکھ سپاہی بچ کے نکل سکے مگر کسی نے ہتھیار نہیں ڈالے۔ سکھوں نے اس بے جگری کے ساتھ حالات کا مقابلہ کیا جو اُن کی نسل کی نمایاں خصوصیت ہے[2]۔

ہارے ہوئے لوگوں کے سامنے جو شرائط پیش کی گئیں ان سے فاتح کی اعتدال پسندی کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ سکھوں کی سلطنت کے ٹکڑے کر دیے گئے تاکہ وہ آئندہ برطانوی سلطنت کے لیے خطرے کا باعث نہ بن سکے لیکن اس شرط کے ساتھ لارڈ ہارڈنگ نے (جس کو اب لارڈ کا خطاب مل چکا تھا) پنجاب کی آزادی کو تسلیم کر لیا۔ مارچ 1846ء کے معاہدے کی رو سے سکھ دربار ستلج اور بیاس کے دوآبے میں واقع پنجاب کے کچھ مشرقی علاقے سے دست بردار ہو گیا۔ اس نے ڈیڑھ ملین پونڈ یا اس مالیت کا علاقہ انگریزوں کے حوالے کرنے کا وعدہ کیا، فوج میں تخفیف کرنے اور پچیس بٹالین پیدل فوج اور بارہ ہزار رسالے سے زیادہ نہ رکھنے کی شرط قبول کی اور تمام وہ توپیں انگریزوں کے حوالے کر دیں جو برطانوی فوج کے خلاف استعمال کی گئی تھیں۔ سکھ دربار معینہ رقم ادا نہ کر سکا اس لیے اسے مزید علاقہ انگریزوں کے حوالے کرنا پڑا۔ چنانچہ کشمیر کو پنجاب سے علاحدہ کر کے ساڑھے سات لاکھ

---

[1] کننگھم کی لکھی ہوئی سکھوں کی تاریخ (History of Sikhs)۔

[2] لارڈ ہارڈنگ (Viscount Hardinge) جو اس کے بیٹے چارلس، دوم وائی کاؤنٹ لارڈ ہارڈنگ نے لکھی تھی جو ہندوستان میں اس کا پرائیویٹ سکریٹری تھا۔

پونڈ کے عوض گلاب سنگھ کے حوالے کر دیا گیا۔

یہ معاہدہ جو مارچ 1846ء میں ہوا تھا پنجاب میں امن برقرار رکھنے میں ناکام ہوا۔ سکھ دربار نے خواہش ظاہر کی تھی کہ حکومت کے تحفظ کے لیے لاہور میں ایک برطانوی فوجی دستہ رکھا جائے۔ چنانچہ دسمبر 1846ء میں لاہور کا دوسرا معاہدہ کیا گیا۔ رنجیت سنگھ کی بیوہ سے تمام اختیارات چھین لیے گئے جو بڑی لائق مگر سازشی عورت تھی۔ اس کا پندرہ ہزار پونڈ سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا گیا۔ مہاراجہ دلیپ سنگھ نابالغ تھا۔ اس وقت تک کے لیے جب تک وہ سن بلوغ کو نہ پہنچ جائے ایک مجلس تولیت (Council of Regency) مقرر کر دی گئی جو آٹھ سرداروں پر مشتمل تھی۔ ایک انگریز ریذیڈنٹ بھی مقرر کیا گیا جس کو دربار کے کاموں کی نگہداشت کرنے اور اس کی رہنمائی کرنے کے غیر محدود و غیر مشروط اختیارات حاصل تھے۔ حکمراں کی نابالغی کے زمانے میں ایک برطانوی فوجی دستہ پنجاب میں رکھا گیا۔ معاہدے کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ پنجاب پر قبضہ رکھنے کے اخراجات کے لیے برطانوی حکومت کو ہر سال دو لاکھ بیس ہزار پونڈ ادا کیے جائیں۔

اس معاہدہ کے پانچ دن بعد گورنر جنرل نے خفیہ کمیٹی کو لکھا تھا "ان شرائط کی رو سے مہاراجہ کی نابالغی کے دوران برطانوی ریذیڈنٹ کو داخلی انتظامات اور خارجہ اُمور کے تمام معاملات میں غیر محدود اختیارات حاصل ہو گئے ہیں[لہ]" 20 اگست 1874ء کو لارڈ ہارڈنگ نے جو عام اعلان کیا تھا اس میں کہا گیا تھا کہ اسے "نو عمر شاہزادے کی تعلیم و نگرانی میں ایسی دلچسپی ہے جیسی کہ ایک باپ کو ہونی چاہیے[شہ]"

پہلے ریزیڈنٹ کی حیثیت سے میجر ہنری لارنس کا تقرر ہوا۔ وہ جس قدر بہادر افسر تھا اُتنا ہی بامروت اور بااخلاق انسان بھی تھا۔ اگر لارڈ ہارڈنگ پانچ سال اور ہندوستان میں گزار سکتا اور ہنری لارنس مزید پانچ سال تک ریزیڈنٹ کے فرائض ادا کر سکتا تو ممکن تھا کہ پنجاب ایک طاقتور، دوستانہ مراسم رکھنے والی اور ترقی یافتہ دیسی ریاست ہوتا۔ لیکن عام اعلان کے چھ مہینے کے اندر لارڈ ہارڈنگ کی جگہ لارڈ ڈلہوزی کو گورنر جنرل مقرر کر دیا گیا۔ خرابی صحت کی بنا پر میجر ہنری لارنس کو بھی ہندوستان سے رخصت ہونا پڑا اور اس کی جگہ سر فریڈرک کوری (Sir Frederick Currie)

لہ پارلیمانی کاغذات۔ لاہور دربار سے معاہدے کی دفعات، 1874ء، ص 24۔

شہ پارلیمانی کاغذات پنجاب 1849ء، ص 53۔

ریذیڈنٹ بنادیا گیا۔

لارڈ ڈلہوزی اسکاٹ لینڈ کے طبقۂ اشراف سے تعلق رکھنے والا ایک نوجوان تھا۔ 1838ء میں وہ ارل (Earl) بنا تھا۔ میل بورن (Melbourne) کی وزارت کے ختم ہونے کے بعد جب سر رابرٹ پیل کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور آئی تو 1843ء میں اس نے لارڈ ڈلہوزی کو بورڈ آف ٹریڈ کا نائب صدر مقرر کر دیا۔ بورڈ کا صدر گلیڈسٹن (Gladstone) تھا۔ دو سال بعد نوجوان لارڈ ڈلہوزی گلیڈسٹن کی جگہ صدر ہو گیا۔ بورڈ کے صدر کی حیثیت سے لارڈ ڈلہوزی کو نئی نئی تعمیر ہونے والی ریلوں کے مسائل سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ بات اہم ہے کہ اس نے ریلوں کو ایک قومی مسئلہ سمجھنے اور انھیں پوری طرح ریاست کے اختیار میں رکھنے کے متعلق ایک اسکیم وزیر اعظم کے سامنے پیش کی۔ سر رابرٹ پیل نے بجا طور سے انگلستان کی ریلوں کو ریاست کے انتظام میں رکھنے کے تصور کو مسترد کر دیا۔ طبقۂ اشراف سے تعلق رکھنے والے اس جفاکش نوجوان نے لارڈ جان رسل کو بہت متاثر کیا تھا۔ جب لبرل پارٹی کے ہاتھ میں اقتدار آیا تو لارڈ جان نے بڑی فراخ دلی سے کام لیتے ہوئے اس کنزرویٹو لارڈ کو ہندوستان کے گورنر جنرل کے عہدہ کی پیش کش کی۔ لارڈ ڈلہوزی نے اس پیش کش کو قبول کر لیا اور صرف پینتیس سال کی عمر میں اس نے جہاں دیدہ لارڈ ہارڈنگ کے جانشین کی حیثیت سے 1848ء میں گورنر جنرل کا عہدہ سنبھال لیا۔

لارڈ ہارڈنگ نے پنجاب میں امن قایم کرنے اور وہاں کے نظم و نسق کو سدھارنے کے لیے ہر قسم کی پیش بندی کر لی تھی۔ برطانوی ریذیڈنٹ کو "ہر محکمے کی کارکردگی پر نظر رکھنے اور اس کی رہنمائی کرنے کے پورے اختیارات" دے دیے گئے تھے۔ "مہاراجہ کے تحفظ کے لیے اور ملک میں امن برقرار رکھنے کے لیے" لاہور میں ایک برطانوی فوجی دستہ رہا کرتا تھا۔ برطانوی حکومت کو اختیار حاصل تھا کہ "دارالسلطنت کے دفاع اور ملک میں امن کے استحکام کے لیے" اس راج کے کسی قلعے یا فوجی چوکی پر قبضہ کر لے۔" فوجی دستے پر ہونے والے اخراجات کے لیے اور دوسرے ایسے مصارف کے لیے جن کا بار برطانوی حکومت کو اٹھانا پڑتا تھا 220,000 پونڈ ادا کرنے کی ذمہ داری ریاست نے قبول کی تھی۔ ان انتظامات کے متعلق قرار پایا تھا کہ یہ اس وقت تک جاری رہیں گے جب تک مہاراجہ سن بلوغ کو نہ پہنچ جائے اور "جب ہز ہائنس 16 سال کی پختہ عمر کو پہنچ جائیں یا 14 ستمبر 1854ء کو یہ انتظامات ختم کر دیے جائیں[1]۔"

برطانوی حکومت مہاراجہ دلیپ سنگھ کے اتالیق کے فرائض ادا کرنے لگی۔ اس کی شخصیت کو بنانے،

---

[1] 16 دسمبر 1846ء کے معاہدے کی دفعات 6، 7، 8، 9 اور 10۔

اس کے ملک کے نظم و نسق کی دیکھ بھال کرنے اور وہاں امن قایم کرنے کی ذمّہ داری برطانوی حکومت نے قبول کرلی تھی۔ لارڈ ہارڈنگ نے برطانوی حکومت کی اس ذمّہ داری کو پورا کرنے کے لیے مناسب اقدام کیے تھے۔ پچاس ہزار سپاہی جن کے پاس ساٹھ توپیں تھیں ستلج کے دفاع پر مامور تھے۔ نو ہزار سپاہیوں کی ایک فوج مستقل طور سے لاہور کی نگرانی کرتی تھی۔ فیروز پور میں ایک اور چھاونی تھی جس میں اسی قدر فوج رہتی تھی جو پیدل رسالے اور توپ خانے پر مشتمل تھی۔ کسی ناگہانی صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے ہر سپاہی ساز و سامان سے لیس تھا۔

پھر بھی لارڈ ہارڈنگ کے ہندوستان سے رخصت ہونے کے فوراً بعد جب شورش شروع ہوئی تو ضروری کاروائی نہیں کی جاسکی۔ دیوان مول راج کے والد نے قریب قریب ایک آزاد حکمراں کی حیثیت سے ملتان پر تیس سال تک حکومت کی تھی۔ جب انگریز ریذیڈنٹ نے مول راج سے اس کے صوبے کے حسابات طلب کیے تو اس نے حسابات داخل کرنے میں تاخیر کی اور یہ ظاہر کیا کہ وہ مستعفی ہونا چاہتا ہے۔ اس کی بات کا یقین کر لیا گیا اور دو انگریزوں یعنی وانس اگنیو (Vans Agneo) اور کرنل ہنڈرسن (Colonel Henderson) کی حفاظت میں اس کا جانشین ملتان بھیج دیا گیا۔ پہلے تو قلعہ ان کے حوالے کر دیا گیا لیکن اس کے کچھ دن بعد اگنیو اور ہنڈرسن کے ساتھ دغابازی کی گئی اور انھیں قتل کر دیا گیا۔ مول راج نے دوبارہ قلعے پر قبضہ کر لیا۔ برطانوی ریذیڈنٹ سر فریڈرک کیوری نے کمانڈر ان چیف (Commander in chief) لارڈ گف سے درخواست کی کہ وہ برطانوی فوج کے ساتھ فیروز پور کی طرف سے حملہ کرے اور بغاوت کو فرو کر دے لیکن لارڈ گف نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور لارڈ ڈلہوزی نے لارڈ گف کے فیصلے کی حمایت کی چنانچہ تاخیر کی بنا پر بغاوت کی آگ پھیل گئی۔

ایک انگریز افسر نے بروقت کاروائی کی اور خوبی سے اپنا فرض ادا کیا۔ انگریز افسروں کے قتل اور مول راج کی بغاوت کی خبر لفٹنٹ ایڈورڈس نے اس وقت سُنی جب وہ دریائے سندھ کے کنارے خیمہ زن تھا۔ چار سو سپاہیوں کے ساتھ وہ تیزی سے ملتان کی طرف بڑھا لیکن قلعے کی حفاظت کرنے والی چار ہزار فوج اور بڑی بڑی آٹھ توپوں کے خلاف وہ کوئی موثر کاروائی نہیں کر سکا۔ گرمیوں کی دُھوپ اور لُو میں اس نے وہ سب کچھ کیا جو کسی انگریز افسر کے لیے ممکن خیال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس نے بھاول پور کی ریاست سے کمک حاصل کی، جون اور جولائی میں مول راج کو دو لڑائیوں میں شکستیں دیں اور اسے قلعے میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ اگر حکّام بالا اُسے لاہور اور فیروز پور سے کمک بھیج دیتے،

جیساکہ دسمبر 1846ء کے معاہدے کی رو سے اُن کے لیے ضروری تھا، تو ملتان کی شورش فرو ہو سکتی تھی اور بقول لیفٹننٹ ایڈورڈس "اگر ملتان کی شورش دبادی جاتی تو وہ سکھوں کی عام بغاوت کی شکل اختیار نہ کر سکتی"۔[1]

ایک طرف تو مقامی شورش کو فرو کرنے کے لیے بر وقت کار روائی نہیں کی گئی دوسری طرف برطانوی ریذیڈنٹ نے ایسے اقدامات کیے جن سے سکھوں میں عام بے چینی پھیل گئی۔ رنجیت سنگھ کی بیوہ، جو مہاراجہ دلیپ سنگھ کی ماں تھی، بڑی سازشی خاتون تھی لیکن حکومت کے کاموں میں اب اُسے دخل نہیں تھا۔ وہ شیخو پور بھیج دی گئی تھی اور اس کی طرف سے کوئی خطرہ باقی نہیں رہا تھا۔ بقول لیفٹننٹ ایڈورڈس "رانی جھنڈا، جس کی دانش مندی اور بہادری کی مثال اس کی قوم کا کوئی مرد بھی نہیں پیش کر سکتا تھا، افواہیں پھیلاتے پھیلاتے اور اشتعال انگیز خطوط لکھتے لکھتے تھک چکی تھی ..... پنجاب میں ایک آدمی بھی اس کے کہنے پر بندوق اُٹھانے کے لیے تیار نہیں تھا۔"[2] ان حالات میں ریذیڈنٹ کے اُس حکم کی افادیت مشکوک معلوم ہوتی ہے جس کے تحت رانی کو پنجاب سے ملک بدر کر کے بنارس بھیجا گیا لیکن سکھ فوج پر اس کا فوری اثر پڑا۔ 25 مئی کو ریذیڈنٹ نے لکھا تھا "راجہ شیر سنگھ کے کیمپ سے آنے والی اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ رانی کو بنارس بھیجنے کی خبر نے خالصہ فوج میں بے چینی پھیلا دی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ رانی خالصہ کی ماں ہے۔ وہ ملک بدر کی جا چکی ہے اور نو عمر دلیپ سنگھ ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ اب وہ کس کے لیے تلوار اُٹھائیں اور کس کو اپنا سردار سمجھیں؟"[3]

مہاراجہ کی شادی کو ملتوی کرنا بھی ایک ایسا ہی اقدام تھا جس نے لوگوں پر بُرا اثر ڈالا۔ لیفٹننٹ ایڈورڈس نے اس کو محسوس کیا اور 28 جولائی کو ریذیڈنٹ کو لکھا "یہاں ایک افواہ پھیل گئی ہے جسے بدطینت لوگ ہوا دے رہے ہیں کہ فوج میں پھیلی ہوئی بدنظمی اور حالیہ شورشوں کی بنا پر انگریز پنجاب پر قبضہ کرنے کے سوال پر غور کر رہے ہیں ..... میرے خیال میں یہ مناسب ہوگا کہ نو عمر مہاراجہ کی شادی کی تیاریاں شروع کر کے لوگوں کو انگریزوں کی نیک نیتی اور معاہدے پر قایم رہنے کے ارادے کا یقین دلا دیا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ اس سے لوگ مطمئن ہو جائیں گے۔"[4] لیکن اس دانش مندانہ

---

[1] پنجاب کی سرحد پر گزرا ہوا ایک سال (A year on the Punjab Frontier) از میجر ایڈورڈس۔ سی۔ بی۔

[2] پنجاب کے کاغذات، 1849ء، ص ص 168 اور 179۔

[3] پنجاب کے کاغذات، 1849ء، ص 171۔

مشورے کو نظر انداز کر دیا گیا۔

آخری بات جس نے لوگوں کو مشتعل کر دیا سردار چتر اسنگھ کے ساتھ کیا جانے والا سلوک تھا جس کی بیٹی مہاراجہ دلیپ سنگھ سے منسوب تھی۔ چتر اسنگھ ہزارا کے صوبے کا گورنر تھا۔ وہاں کی آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی جو جنگ جو تھے اور مشکل سے کسی کے قابو میں آتے تھے۔ ریذیڈنٹ کے ایک نائب کیپٹن ایبٹ (Captain Abbot) کو اُس کا مشیر مقرر کیا گیا تھا لیکن اس نے ابتدا سے سردار کی اعلانیہ مخالفت شروع کر دی۔ کیپٹن ایبٹ کی شہ پر ہزارا کے پہاڑیوں نے اگست 1848ء میں دروں کو بند کر دیا اور اس شہر کا محاصرہ کر لیا جہاں چتر اسنگھ رہتا تھا۔ سردار نے شہر کے محافظ دستوں کو حکم دیا کہ وہ قلعے کی توپوں کے سائے میں مورچہ سنبھال لیں۔ لیکن کرنل کنورا (Colonel Canora) نے شہر سے باہر آنے سے انکار کر دیا اور اعلان کر دیا کہ جو شخص قریب آئے گا اس پر گولی چلائی جائے گی۔ چتر اسنگھ نے توپوں پر قبضہ کرنے کے لیے سکھوں کی پیدل فوج کی دو کمپنیاں بھیجیں۔ کنورا نے توپوں کو فتیلہ دکھایا مگر رنجک اُڑ گئی اور توپیں نہ چل سکیں۔ اس کے فوراً بعد وہ پیدل فوج کی گولیوں کا نشانہ بن گیا۔ کیپٹن ایبٹ نے اس حادثے کو چتر اسنگھ کی شہ پر کنورا کے قتل سے تعبیر کیا۔ ریذیڈنٹ نے بجا طور سے اس کی سرزنش کی۔ اس نے لکھا تھا "میں نے آپ کو فوج بھرتی کرنے اور تنخواہ پانے والے سپاہیوں کے گروہوں کی تنظیم کرنے کا اختیار نہیں دیا ہے..... یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ آپ نے ناظم (چتر اسنگھ) کا قرب حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے خود آپ کو قریب رہنے کے مشورے دیے اور پیش کش کی مگر آپ نے اس کو رد کر دیا.... جو اطلاعات اب تک موصول ہوئی ہیں ان سے یہ ثابت نہیں ہوتا ہے کہ کمیدان کنورا قتل کیا گیا نہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس حادثے کے پیچھے سردار چتر اسنگھ کا ہاتھ تھا۔"۶ پھر بھی اگست میں کیپٹن ایبٹ کو سزا دینے کے بجائے چتر اسنگھ کو گورنر کے عہدے سے ہٹا دیا گیا، اس کی جاگیر ضبط کر لی گئی اور سکھوں کی نظروں میں اس شخص کو ذلیل کیا گیا جس کی بیٹی راجہ سے منسوب تھی۔

ان غیر دانش مندانہ حرکتوں کی بنا پر سکھ قوم مشتعل ہو گئی اور ملتان کی بغاوت پھیلنے لگی۔ چتر اسنگھ کا بیٹا شیر سنگھ پانچ ہزار سکھ سپاہیوں کے ساتھ مول راج سے جا ملا اور برطانوی فوج کو ملتان کا محاصرہ اُٹھانے پر مجبور کر دیا گیا۔ قریب قریب تمام سردار بغاوت میں شامل ہو گئے اور تقریباً پورا علاقہ اُن

---

۵ پنجاب کے کاغذات، 1849ء، ص 271۔

۶ پنجاب کے کاغذات، 1849ء، ص 316۔

کے ہاتھوں میں آگیا۔

بالآخر ملتان کی بغاوت کے سات مہینے بعد یعنی نومبر 1848ء میں لارڈ گف اپنی شاندار فوج کے ساتھ آگے بڑھا لیکن چناب کے کنارے واقع رام نگر کے مقام پر ہونے والی پہلی جنگ میں اُسے بڑا نقصان اُٹھانا پڑا۔ سادولاپور کے مقام پر لڑی جانے والی جنگ کو بھی اس کی فتح مشکل سے کہا جاسکے گا۔ اور چیلیان والا کی تیسری لڑائی تو تباہ کُن ثابت ہوئی تھی۔ برطانوی پیادہ فوج نے جب حملہ کیا تو وہ ہلکان ہو چکی تھی اور قریب قریب دم توڑ چکی تھی۔ سکھوں نے اسے پیچھے ڈھکیل دیا۔ برطانوی رسالہ توپوں کی مدد کے بغیر آگے بڑھا۔ اسے بھی پیچھے ہٹنا پڑا اور تھوڑی دیر بعد بھگدڑ مچ گئی۔ سکھوں نے تین رجمنٹوں کے جھنڈوں اور چار توپوں پر قبضہ کرلیا۔ بغیر سمجھے بوجھے جلدی میں حملہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ کل 89 افسر اور 2350 سپاہی ان لڑائیوں میں کام آئے۔ لارڈ ڈلہوزی نے سرکاری مراسلات میں تو اس کو فتح سے تعبیر کیا لیکن ایک نجی خط میں رام نگر، سادولاپور اور چیلیاں والا کی "مسلسل ناکامیوں" پر افسوس کا اظہار کیا تھا۔

جب اس آخری لڑائی کی خبر انگلستان پہنچی تو لوگوں کے غم وغصے کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ لارڈ گف کو واپس بُلا لیا گیا اور سر چارلس نیپیر کمانڈر ان چیف مقرر کر دیا گیا۔ لیکن نئے کمانڈر ان چیف کے آنے سے پہلے لارڈ گف نے 20/فروری 1849ء کو گجرات کے مقام پر فیصلہ کن فتح حاصل کر کے اپنا کھویا ہوا وقار پھر حاصل کرلیا۔ انگریز جنوری میں ملتان پر قبضہ کر چکے تھے۔ گلبرٹ نے جو "ہندوستان کا بہترین شہ سوار تھا" ملتان کی جنگ میں شکست کھانے والی سکھ فوج کا پیچھا پنجاب کے میدانوں میں کیا اور 21/مارچ کو راولپنڈی کے مقام پر سکھوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ ملتان کی پہلی شورش کے ایک سال کے اندر پھر سے امن قایم کر دیا گیا۔

دسمبر 1846ء کے معاہدے کی رو سے برطانوی حکومت نے پنجاب کی شورشوں کو کچلنے اور نابالغ مہاراجہ دلیپ سنگھ کی حفاظت کی ذمّہ داری قبول کی تھی۔ لارڈ ڈلہوزی کی منظوری کے بعد نومبر 1848ء میں ایک اعلان جاری کیا گیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ برطانوی فوج "آئینی حکومت کے دُشمن کی حیثیت سے لاہور میں داخل نہیں ہوئی ہے۔ اس کا مقصد امن قایم کرنا اور لوگوں کی اطاعت حاصل کرنا ہے"۔ اس کے باوجود امن قایم ہوتے ہی آئینی حکومت موقوف کر دی گئی۔ مہاراجہ کو گدّی سے اُتار دیا گیا اور پنجاب برطانوی سلطنت میں شامل کرلیا گیا۔ سر ہنری لارنس نے جو دسمبر 1846ء کے معاہدے کے بعد پہلا ریذیڈنٹ مقرر کیا گیا تھا۔ اس کے خلاف احتجاج کیا اور اپنے

عہدے سے استعفیٰ دے دیا لیکن لارڈ ڈلہوزی جانتا تھا کہ تالیف قلوب کی اس میں کتنی صلاحیتیں ہیں اور اُسے استعفیٰ واپس لینے پر آمادہ کرنے میں وہ کامیاب ہوگیا۔ جب ہم پنجاب کے نظم و نسق کا جائزہ لیں گے اس وقت اس عظیم اور باصلاحیت سپاہی کا ذکر پھر کیا جائے گا۔

تین سال بعد لارڈ ڈلہوزی کو ایک اور جنگ ہندوستان کی سلطنت کی مشرقی سرحد پر لڑنی پڑی۔ ین ڈبو (Yandobo) کے معاہدے کے باوجود برما میں بدیسی تاجروں سے مختلف رقمیں وصول کی جاتی تھیں اور برما کے لوگوں کے ساتھ تجارت کرنے میں دشواریوں اور خطروں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ 1840ء کے بعد سے آوا (Ava) کے دربار میں برطانوی حکومت کا کوئی ایجنٹ مامور نہیں کیا گیا تھا۔ ستمبر 1851ء کو رنگون میں کاروبار کرنے والے انگریز تاجروں نے لارڈ ڈلہوزی سے شکایت کی جو پہلے سے بھرا بیٹھا تھا۔ گورنر جنرل نے شکائتوں کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے ایک بحری افسر کو روانہ کیا، تاجروں کے نقصان کے معاوضے میں نو سو پونڈ طلب کیے اور رنگون کے برمی گورنر کو برخاست کرنے کا مطالبہ کیا۔ ایک سال پہلے یونان میں مالٹا کے ایک یہودی کے نقصان کے سلسلے میں لارڈ پامرسٹن جو اقدام کر چکا تھا اس کو اب ایشیا میں دُہرایا جا رہا تھا۔ لارڈ ڈلہوزی کے مطالبات پورے نہیں کیے گئے اور اس نے جنگ کا اعلان کر دیا۔ رنگون پہر دم (Rhome) اور پیگو (Pego) پر قبضہ کر لیا گیا اور 20 دسمبر 1852ء کو لارڈ ڈلہوزی نے زیریں برما کو برطانوی سلطنت میں شامل کرنے کے اعلان کے ساتھ جنگ ختم کر دی۔

لارڈ ڈلہوزی کے زمانۂ حکومت میں لاوارث دیسی حکمران کی ریاستوں کے الحاق کی تاریخ اُس کی فتوحات کی تاریخ سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اگر کسی ہندو کے اولاد نہ ہو تو قدیم قانون کی رو سے وہ بچے کو گود لے سکتا تھا اور اسے اپنا وارث قرار دے سکتا تھا۔ قانون کی نظر میں حقیقی بیٹے اور متبنیٰ بیٹے میں کوئی فرق نہیں تھا۔ شمالی ہندوستان میں مسلمانوں نے پانچ سو سال حکومت کی مسلمان بادشاہوں اور شہنشاہوں نے ہندوؤں کے اس حق پر کبھی اعتراض نہیں کیا۔ ایک راجہ کی موت کے بعد اس کا بیٹا چاہے وہ حقیقی ہو یا متبنیٰ شہنشاہ وقت سے نئی سند حاصل کر لیتا تھا اور گدی پر بیٹھ جایا کرتا تھا۔ دوسری طرف اس قسم کے شہنشاہ بھی تھے جو بغیر کسی پس و پیش کے ریاستیں فتح کر لیا کرتے تھے چاہے حکمران جیتا ہو یا مر چکا ہو اور چاہے اس کا بیٹا حقیقی ہو یا متبنیٰ ہو لیکن انگریزی راج میں اس طریقے کو رواج دیا گیا کہ کوئی ہندو حکمران کسی بچے کو گود لینا چاہے تو حکومت سے اس کی اجازت حاصل کرے۔ جب اس رواج کو تسلیم کرا لیا گیا تو کمپنی نے محسوس کیا کہ گود لینے کی اجازت نہ دے کر سلطنت میں توسیع کی جا سکتی ہے چنانچہ کورٹ آف ڈائرکٹرز نے 1834ء میں اعلان کیا تھا کہ گود لینے کی اجازت صرف

خاص حالات میں دی جانی چاہیے اور حکومتِ ہند نے 1841ء میں فیصلہ کیا تھا کہ "باعزت طریقے سے علاقہ یا آمدنی حاصل کرنے کے ہر موقع سے فائدہ اُٹھانے کی صاف اور سیدھی کوشش بہرحال جاری رکھی جائے۔ اس "باعزت اور منصفانہ" اصول کو عملی شکل دینے کا کام لارڈ ڈلہوزی کے حصے میں آیا۔ دو ایک غیر اہم ریاستوں کو چھوڑ کر جن کا الحاق میں پہلے کیا گیا تھا اس پالیسی پر ڈلہوزی کے عہدے قبل کبھی عمل نہیں ہوا تھا۔

اس پالیسی کا پہلا شکار ستارا کا شاہی خاندان ہوا۔ ستارا کا راجہ مرہٹوں کی سلطنت کی بُنیاد ڈالنے والے عظیم شیواجی کے خاندان کی نمائندگی کرتا تھا۔ دکن کے آخری پیشوا کی مرہٹہ سلطنت پر قبضہ کرنے کے وقت لارڈ ہیسٹنگز نے اس ریاست کی بُنیاد ڈالی تھی۔ ایک پیڑی گزرنے کے بعد ستارا کے آخری راجہ نے اپنے ملک اور اپنی نسل کے قانونوں کے مطابق ایک لڑکے کو گود لیا تھا۔ 1848ء میں راجہ کا انتقال ہوگیا۔ راجہ کے انتقال کے بعد بمبئی کے گورنر سر جارج کلرک نے سفارش کی کہ راجہ کے وارث کو ستارا کی گدّی پر بیٹھنے کی اجازت دی جائے لیکن گورنر کی کاونسل کے اراکین نے گورنر کی مخالفت کی، اس کے جانشین نے اس کی رائے سے اختلاف کیا اور لارڈ ڈلہوزی نے نہایت تنگ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے ریاست کو برطانوی سلطنت میں شامل کر لیا۔ یہ معاملہ کورٹ آف ڈائرکٹرز کے سامنے پیش ہوا۔ بزرگ ڈائرکٹر ہنری سنیٹ جارج ٹکر نے، جس کا ذکر پچھلے باب میں کیا جاچکا ہے اور ان صفحات میں کیا جاتا رہے گا، اس کی مخالفت کی لیکن فیصلے کے متعلق کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں تھی۔ کورٹ نے بھاری اکثریت کے ساتھ ریاست کو برطانوی سلطنت میں شامل کرنے کی منظوری دے دی۔

اس کے بعد کرولی کی ریاست کا سوال اٹھا۔ کرولی کے راجہ کا انتقال اسی سال ہوا تھا جس سال ستارا کا راجہ مرا تھا۔ اُس نے بھی ستارا کے راجہ کی طرح مرنے سے پہلے ایک لڑکے کو گود لے لیا تھا۔ لارڈ ڈلہوزی کی نظر میں ستارا اور کرولی میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وارث نہ ہونے کی وجہ سے کرولی کی ریاست بھی برطانوی سلطنت میں شامل ہوگئی ہے لیکن کورٹ آف ڈائرکٹرز نے فیصلہ کیا کہ کرولی چونکہ ایک "ماتحت ریاست" کے بجائے "ایک دوست ریاست ہے جس کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کی گئی ہے" اس لیے اُسے سلطنت میں شامل نہ کیا جائے جن بُنیادوں پر کورٹ آف ڈائرکٹرز نے لارڈ ڈلہوزی سے اختلاف کیا تھا وہ اس کے مراسلے مورخہ 26/جنوری 1853ء میں درج ہے۔

کرنل لو (Colonel Low) کی رائے تھی کہ گود لیے ہوئے لڑکے کو تسلیم کر لیا جائے اور مسٹر فریڈرک کیوری نے اس کی تجویز کی حمایت کی۔ گورنر جنرل کا خیال تھا کہ ریاست کے برطانوی سلطنت

میں شامل ہونے کا اعلان کیا جائے مسٹر لووس (Mr. Lowis) گورنر جنرل سے متفق تھا۔

"گورنر جنرل نے نہایت دیانت داری اور غیر جانب داری کے ساتھ اس اہم سوال کے دونوں پہلوؤں کے متعلق دلیلیں پیش کر دی ہیں۔ اس معاملے کے تمام پہلوؤں پر پوری طرح غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ نرسنگھ پال کے پسر متبنّٰی کی حیثیت سے بھارت پال کو کرولی کی گدّی پر بیٹھنے کی اجازت دی جائے۔"

"یہ فیصلہ اُن اصولوں کی خلاف ورزی نہیں قرار دیا جا سکتا جو ستارا کے مقدمے کے سلسلے میں ہم نے مراسلہ مورخہ 24 جنوری 1846ء میں درج کیے تھے.... ہمارا خیال ہے کہ ستارا اور کرولی کے معاملوں میں بہت فرق ہے۔ گورنر جنرل نے اپنی روداد میں اس فرق کو ملحوظ نہیں رکھا ہے۔ ستارہ کی ریاست کچھ مدّت پہلے وجود میں آئی تھی اور برطانوی حکومت کی ساختہ و پرداختہ تھی لیکن کرولی ایک قدیم راجپوت ریاست ہے اور ہندوستان میں برطانوی اثر و اقتدار شروع ہونے سے بہت پہلے سے اس خاندان کے حکمران کرولی پر حکومت کرتے رہے ہیں[1]۔"

ڈائرکٹروں کے خط سے کمپنی کی اعتدال پسندی کے اسباب پر روشنی پڑتی ہے۔ ستارا ایک چھوٹی سی مرہٹا ریاست تھی۔ اس پر قبضہ کرنے میں کوئی سیاسی خطرہ نہیں تھا لیکن کرولی کا حکمراں راجپوت تھا۔ اس کو سلطنت میں شامل کیا جاتا تو تمام راجپوتانہ متاثر ہوتا۔ کرولی پر قبضہ کرنے کی ناعاقبت اندیشانہ پالیسی پر ہندوستان میں اصلاح کی خواہاں انڈین ریفارم ایسوسی ایشن (Indian Reform Association) نے لوگوں کو توجہ دلائی جس کا رہنما مسٹر ڈکنسن (Mr. Dickinson) تھا جو صحیح معنی میں ہندوستان کا بے لوث دوست تھا۔ مسٹر بلیکٹ (Mr. Blackett) نے ہاؤس آف کامنز میں ایک تجویز پیش کرنے کی دھمکی دی۔ حکومت وقت بدنامی اور رسوائی سے بچنا چاہتی تھی اس لیے اس نے گورنر جنرل کو ریاست میں دخل اندازی کرنے سے روک دیا۔

صوبہ متوسط کی ایک بڑی ریاست سنبل پور کے راجہ کے انتقال کے بعد جو لاولد تھا اور جس نے کسی بچّے کو گود نہیں لیا تھا وہ ریاست بھی برطانوی سلطنت میں شامل کر لی گئی لیکن جلد ایک اہم اور تاریخ ساز مقدمہ زیر غور آیا۔ جھانسی کا راجہ گنگا دھر راؤ نومبر 1853ء میں انتقال کر گیا۔ مرنے سے پہلے اس نے ایک لڑکے کو گود لے لیا تھا جس نے دمودا گنگا دھر راؤ کا نام اختیار کیا۔ قریب المرگ راجہ نے اُن

---

[1] کرولی کے متعلق نیلی کتاب، 1855ء، ص ص 3 اور 4۔

دو انگریز افسروں کی موجودگی میں لڑکے کو گود لینے کا اعلان کر دیا تھا جو جھانسی میں مقیم تھے۔ ان دونوں افسروں میں ایک پولیٹیکل ایجنٹ تھا اور دوسرا برطانوی فوجی دستے کا کمیدان۔ اس نے متعلقہ حکّام کے لیے انھیں خط دیے اور اپنی بیوہ اور پسر متبنّٰی کو برطانوی حکومت کی امان میں دے دیا۔ لارڈ ڈلہوزی نے فیصلہ کیا کہ پسر متبنّٰی ذاتی حقوق تو حاصل کر سکتا ہے لیکن وہ راج گدّی کا حقدار نہیں"۔ اور اس نے ریاست کو برطانوی سلطنت میں شامل کر لیا۔

جھانسی کی ریاست نے ابتدائی زمانے میں انگریزی راج کی بے مثل خدمت کی تھی۔ جھانسی کے راجہ نے 1825ء میں کالپی کا دفاع کیا تھا۔ 1832ء کے دربار کے موقع پر لارڈ ولیم بین ٹنک نے اس کی بڑی تعریف کی تھی اور جذبہ احسان مندی کا اظہار کیا تھا۔ اس نے راجہ کے خطابات میں "فدوی بادشاہ جان و جاہ انگلستان" اضافہ کیا تھا۔

ریاست پر قبضہ کیے جانے کے بعد بیوہ رانی نے برطانوی حکومت سے اپیل کی اور اپنے خاندان کی وفاداری کا واسطہ دیا۔ جھانسی کے پولیٹکل ایجنٹ میجر مالکم نے اس کے بیان کی تائید کی "میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس زمانے میں جب ہمیں موجودہ اختیار و اقتدار حاصل نہیں تھا جھانسی کی ریاست نے ہماری حکومت سے جس وفاداری اور اطاعت گزاری کا مظاہرہ کیا تھا اس کے بیان میں بائی نے کسی مبالغے سے کام نہیں لیا ہے۔ یہ وفاداری ایسے حالات میں دکھائی گئی تھی جن سے فائدہ بھی اُٹھایا جا سکتا تھا۔" خود بیوہ رانی کے لیے مالکم نے لکھا تھا "وہ اعلا کردار رکھنے والی خاتون ہیں اور جھانسی میں ہر شخص ان کی بڑی عزت کرتا ہے[1]۔" لیکن ڈلہوزی نے نہ ریاست کی گزشتہ تاریخ کا پاس کیا نہ موجودہ رانی کی حیثیت و صلاحیت کا اور اپنے فیصلہ پر قایم رہا۔

اس نامناسب اقدام نے جھانسی کی وفادار اور دوستانہ مراسم رکھنے والی ریاست کو دشمن بنا دیا اور ایک اعلا کردار رکھنے والی خاتون کو بے درد اور انتقام پسند عورت میں تبدیل کر دیا۔ جھانسی کی رانی نے 1857ء کے غدر کے لیے میدان تیار کیا، اس کی حمایت کی اور اس میں حصّہ لیا۔ غدر کے زمانے کا بدترین قتلِ عام اس کی اجازت سے جھانسی میں ہوا۔ اس نے مردانہ کپڑے پہنے اور برطانوی فوجوں کے خلاف لڑنے لگی اور میدانِ جنگ میں لڑتے ہوئے ہلاک ہوئی۔ وہ اپنی نسل کی بہادر ترین سپاہی ثابت ہوئی۔ ہندوستان کی جدید تاریخ میں نظر آنے والی بہت سی دوسری ہند و خواتین کی طرح جھانسی کی

---

[1] جھانسی کی نیلی کتاب، ص ص، 24 اور 28۔

رانی بھی زندہ رہ سکتی تھی اور ایک فیض رساں حکمراں کی طرح اپنی چھوٹی سی ریاست پر حکومت کر سکتی تھی لیکن اس کی قسمت میں یہ المیہ لکھا تھا۔ جدید ہندوستان کے رومان میں اس نے جون آف آرک کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔

یکے بعد دیگرے چھوٹی موٹی ریاستیں سلطنت برطانیہ میں شامل کی جاتی رہیں لیکن اس اصول کے تحت سلطنت برطانیہ میں شامل ہونے والی آخری اور اہم ترین ریاست ناگپور کی سلطنت تھی۔ ناگپور کے راجہ رگھوجی بھونسلا کا انتقال ۱۱/دسمبر 1853ء کو ہوا۔ اس کی ایک بیوہ نے اپنے ایک نوعمر عزیز کو گود لے لیا جو آپا صاحب کے لقب سے مشہور ہوا۔ ہندوؤں کے قانون کے مطابق اس کو گود لینے کا حق حاصل تھا۔ پولیٹکل ایجنٹ مسٹر مینسل (Mr. Mansel) نے مستقل منصبی احکامات کی تعمیل کی۔ نہ اس نے گود لینے کی ممانعت کی نہ اس کی ہمت افزائی کی لیکن اس نے سفارش کی کہ گود لیے ہوئے لڑکے کو راجہ تسلیم کر لیا جائے۔ 28/جنوری 1854ء کو لارڈ ڈلہوزی نے اپنا فیصلہ صادر کر دیا اور اس بڑی اور کثیر آبادی رکھنے والی سلطنت کو برطانوی سلطنت میں شامل کر لیا گیا[1]

بڑے پیمانے پر بیش بہا کپاس پیدا کرنے والے علاقے برار پر ایک اور بہانے سے قبضہ کیا گیا۔ وہ امدادی فوج جو حیدرآباد میں مقیم تھی اور جس کے اخراجات حیدرآباد کے نظام کو برداشت کرنے پڑتے تھے ضرورت سے زیادہ تھی۔ نظام کی طرف 7,50,000 پونڈ بقایا تھے۔ گورنر جنرل نے نظام کو بتایا کہ وہ اس قرض کے عوض اور آئندہ فوجی اخراجات کی ادائیگی کی ضمانت کے طور پر برار اور کرشنا اور تنگبھدرا کے درمیان واقع زرخیز علاقہ قبول کرے گا۔ جب معاہدے کا مسودہ نظام کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے احتجاج کیا لیکن اس کا احتجاج بے سود ثابت ہوا۔ اس نے کہا کیا یہ ساٹھ سالہ دوستانہ مراسم کا نتیجہ ہے؟۔ اس نے عاجزی سے کہا کہ اس کی سلطنت کا ایک تہائی حصہ اگر اس سے چھین لیا گیا تو وہ اپنی رعایا کی نظروں میں ذلیل ہو جائے گا۔ اس کی عرضداشتوں پر کسی نے کان نہ دھرا۔ اس نے معاہدے پر دستخط کر دیے اور اس کے کچھ دن بعد اس کا انتقال ہو گیا[2]

---

[1] ناگپور کی پہلی نیلی کتاب، ص 56۔

[2] کئی دفعہ یہ تجویز پیش کی گئی کہ نظام تمام قرض ادا کر دے اور برار اس کو واپس کر دیا جائے۔ لیکن ان کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ابھی کچھ دن پہلے برار ہمیشہ کے لیے حکومت ہند کو پٹّے پر دے دیا گیا ہے۔ اس کے کچھ دن بعد نواب

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

اب صرف لارڈ ڈلہوزی کا ایک کارنامہ اور بیان کرنا ہے یعنی اودھ کی سلطنت کے الحاق کی داستان۔ اودھ کی بدانتظامی کی بنا پر یہ قدم اُٹھایا گیا تھا۔ جس شخص نے بھی اس موضوع پر سرکاری دستاویزات کا مطالعہ کیا ہے اور اس ناقابل تردید شہادت پر غور کیا ہے، جس میں سلی مین اور آؤٹ رم جیسے گواہوں کی شہادت بھی شامل ہے، جو اودھ کے حکمراں سے ہمدردی رکھتے تھے، وہ ایک لمحے کے لیے بھی اودھ کی بدنظمی کے متعلق شک و شبہ کا اظہار نہیں کرسکتا ہے۔ پھر بھی اس بدنظمی کو دُور کیا جاسکتا تھا۔ جنرل سر ولیم سلی مین نے، جو 1840ء سے 1854ء تک لکھنؤ میں ریذیڈنٹ کے فرائض ادا کرتا رہا تھا، حکومتِ ہند کے سامنے اودھ کے نظم و نسق میں اصلاح کرنے کی اسکیم پیش کی اور ان اقدامات کے لیے اپنی شہرت کو خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار ہو گیا لیکن لارڈ ڈلہوزی سلطنت کی اصلاح کے بجائے اس پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ اس موضوع کے متعلق اس نے اپنی ایک مشاورتی روداد میں لکھا تھا کہ برطانوی حکومت اگر ایک دیسی ریاست کی اصلاح کی ذمّہ داری لے، محنت کرے اور خطرہ مول لے تو اسے اجازت ہونی چاہیے کہ وہ اس علاقے کی مزید آمدنی اپنے استعمال میں لائے[1]۔ علاقہ حاصل کرنے کے اس جذبے نے لارڈ ڈلہوزی کو کئی خرابیوں کو دُور کرنے سے باز رکھا یہاں تک کہ خرابیوں میں اضافہ ہوگیا اور اُسے ریاست پر جھپٹنے اور اُسے کمپنی کے علاقے میں شامل کرنے کا موقعہ مل گیا۔

لارڈ ڈلہوزی نے اودھ کے متعلق تین اسکیمیں بورڈ کے سامنے پیش کیں پہلی تجویز یہ تھی کہ اودھ کا بادشاہ ایک معینہ مدّت کے لیے اپنا صوبہ حکومتِ ہند کے حوالے کر دے۔ دوسری تجویز یہ تھی کہ اس کی شاہانہ حیثیت برقرار رکھی جائے لیکن سلطنت کا انتظام ہمیشہ کے لیے کمپنی کے سُپرد ہو جائے۔ آخری تجویز یہ تھی کہ ریاست پوری طرح اور باضابطہ طریقے سے سلطنت برطانیہ میں شامل کر لی جائے۔ بین ٹنک کی طرح کا گورنر جنرل پہلی اسکیم پر عمل کرتا، لارڈ ڈلہوزی نے دوسری اسکیم کی وکالت کی لیکن کورٹ آف ڈائرکٹرز نے تیسری اسکیم کو منظور کیا۔ 21/ نومبر 1855ء کے مراسلے کے ذریعے جسے "اہم ہدایتیں جاری کرنے کا ایک ایسا نمونہ جس میں ذمّہ داری سے دامن بچایا جائے" کہا جاتا تھا ڈائرکٹروں نے

(صــــ سے آگے)

کو۔جی۔سی۔بی۔ کا خطاب ملا جس کو حیدرآباد کے مسخروں نے "کرزن کو بار دیا" (Gave Curzon Beran) کے مترادف گردانا۔

[1] اودھ کے متعلق کاغذات، 1856ء۔

ودھ کے الحاق کے احکامات جاری کر دیے۔ اُنھوں نے اپنی اس خواہش کا بھی اظہار کیا کہ لارڈ ڈلہوزی ہندوستان سے رُخصت ہونے سے پہلے ان احکامات پر عمل کرے۔ ہندوستان میں آٹھ سال تک مسلسل کام کرنے کی وجہ سے لارڈ ڈلہوزی کی صحت خراب رہنے لگی تھی۔ تینتالیس سال کی عمر میں اس پر بڑھاپا آگیا تھا، وہ کئی بیماریوں میں مُبتلا تھا اور چلنے میں بھی اسے تکلف ہوا کرتا تھا۔ اس کے باوجود اس نے کورٹ آف ڈائرکٹرز کے فیصلے پر عمل کرنے کا وعدہ کیا تھا اور اس نے وعدہ پورا کر دیا۔ 13/ فروری 1856ء کو اعلان کر دیا گیا کہ اودھ کا صوبہ برطانوی سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ فروری کی آخری تاریخ کو لارڈ ڈلہوزی نے ہندوستان کے گورنر جنرل کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ اس نے اپنے معالج سے کہا تھا "اچھا یہ ہے کہ اس مہینے میں صرف اُنتیس دن ہیں۔ میرے لیے مزید دو دن کام کرنا بھی مشکل ہوتا۔"

پچھلے صفحات میں ہم نے لارڈ ڈلہوزی کی فتوحات اور سلطنت کی توسیع کی تاریخ اجمالاً بیان کر دی ہے۔ اپنے آٹھ سالہ زمانہ حکومت میں اُس نے آٹھ بڑی بڑی سلطنتوں یا ریاستوں کو برطانوی سلطنت میں شامل کر لیا۔ ان علاقوں پر قبضہ کرنے کے مختلف اسباب بتائے گئے تھے۔ پنجاب کے الحاق کی وجہ یہ تھی کہ اس علاقے میں شورش پھوٹ پڑی تھی۔ نابالغ حکمراں سے جو معاہدہ کیا گیا تھا اس کے رو سے اس قسم کی شورش کو فرد کرنے کی ذمہ داری خود برطانوی حکومت نے قبول کی تھی۔ زیریں برما پر قبضہ کرنے کی وجہ وہاں تجارت کرنے والے انگریز تاجروں کی شکایتیں تھیں۔ چونکہ نظام اپنا قرض نہیں ادا کر پایا اس لیے برار کو برطانوی سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ اودھ کی سلطنت کا الحاق وہاں کے بدانتظامیوں کی وجہ سے کیا گیا۔ سمبل پور کا راجہ لاوارث مرا اس لیے اس پر قبضہ کر لیا گیا۔ ستارہ، جھانسی اور ناگپور کے الحاق کی وجہ یہ تھی کہ لارڈ ڈلہوزی نے اُن وارثوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جنھیں وہاں کے حکمرانوں نے گود لیا تھا۔

یہ اقدامات جن ناخوشگوار مباحث کا موضوع بنے ہم ان میں نہیں پڑنا چاہتے۔ کسی غیر جانب دار مورّخ نے لارڈ ڈلہوزی کی پالیسی اور اس کے اقدامات کو انصاف پر مبنی نہیں قرار دیا ہے اور اس کی حمایت نہیں کی ہے۔ وکٹوریہ کے زمانے کے صرف ایک صاحب فکر مصنّف نے لارڈ ڈلہوزی کے جرائم کا پروشیا کے فریڈرک اعظم کے جرائم سے مقابلہ کیا ہے اور اس کو قابل معافی قرار دیا ہے[1] لیکن یہ مقابلہ دُرست نہیں۔

---

[1] سیلی (Seeley) "انگلستان کی توسیع" (Expansion of England) تاریخ میں خصوصاً لارڈ ڈلہوزی کو فریڈرک اعظم کے قبیل کے حکمراں کی حیثیت حاصل ہے۔ اس نے اس قسم کے کام کیے ہیں جنھیں سائیلیشیا (Silesia) پر قبضے

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

فریڈرک نے برابر کے دشمنوں سے جنگیں لڑیں۔ اس کے علاوہ اس کے پیشِ نظر ایک اعلا مقصد تھا۔ وہ یورپ کی بڑی قوموں میں اپنے ملک کے لیے جگہ بنانا چاہتا تھا۔ ان باتوں کی وجہ سے اس کے جرائم بڑی حد تک قابلِ معافی قرار دیے جا سکتے ہیں۔ ڈلہوزی نے ان پر ہاتھ اُٹھایا جو اپنا تحفظ نہیں کر سکتے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمدنی اور وسیع سلطنت میں اضافہ کرنے کے لیے اُس نے ایک قدیم قانون کو غلط معنی پہنانے کی مذموم حرکت کی۔

لارڈ ڈلہوزی قدیم سامراجی مکتبِ خیال سے تعلق رکھنے والا آخری حکمران تھا جن کا خیال تھا کہ ہندوستان کے لوگ صرف اسی وقت ترقی کر سکتے ہیں جب اُن کی آزادی اور خود مختاری پوری طرح ختم کر دی جائے۔ ہندوستان سے واپس جانے کے بعد وہ زیادہ نہیں جیا پھر بھی اس کی زندگی میں ہی وہ مکتبِ خیال بدنام و رسوا ہو گیا، ایسٹ انڈیا کمپنی ختم ہو گئی اور ملکہ نے اصول الحاق کو نامنظور کر دیا بلکہ کی براہِ راست حکومت کے ابتدائی دَور میں اعتماد ظاہر کیا گیا تھا کہ ہندوستان کے لوگ خود اپنی کوششوں سے ترقی کر سکیں گے۔ اسی زمانے میں ایک کنزرویٹو سکریٹری آف اسٹیٹ سر اسٹیفورڈ نارتھ کوٹ نے فیصلہ کیا کہ میسور کی ریاست دیسی حکمران کو واپس کر دی جائے اور ایک دوسرے کنزرویٹو سکریٹری آف اسٹیٹ لارڈ سیلس بری نے بدانتظامی اور جرائم کی بنا پر بڑودا کا الحاق کرنے سے انکار کر دیا۔ ہندوستان کے تعلق سے برطانوی وزیروں نے جو سیاسی اقدامات کیے ہیں اُن میں سب سے زیادہ میسور کے حکمران کی بحالی اور بڑودا کے لیے ایک نئے اور باصلاحیت حکمران کا انتخاب اُن کی دانش مندی اور کشادہ دلی کی غمازی کرتے ہیں اور ہندوستان کے کسی حصے کے نظم و نسق کے مقابلے میں ان ریاستوں کا انتظام بہتر ہے جن پر یہ راجہ حکومت کرتے ہیں۔

(ص ــــ سے آگے)

اور پولینڈ کی تقسیم کی طرح حق بجانب ثابت کرنا مشکل ہے۔ ان اقدامات کو اگر جرائم قرار دیا جائے تو ان جرائم کی نوعیت میں اور فریڈرک کے جرائم کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں۔ ان جرائم کو اولوالعزمی کے جرائم کہنا پڑے گا۔"

باب 3

شمالی ہندوستان کے بندوبست

وارن ہیسٹنگز اور لارڈ ویلزلی کے زمانۂ حکومت میں بنگال کے اس برطانوی صوبے کے علاقے میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہوتا رہا جس کی داغ بیل لارڈ کلائیو نے ڈالی تھی۔ 1775ء میں اودھ کے نواب کے انتقال کے بعد وارن ہیسٹنگز نے اس کے جانشین سے ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے بنارس اور کچھ ملحقہ اضلاع انگریزوں کو مل گئے۔ لارڈ ویلزلی کے دباؤ میں آکر اودھ کے نواب نے 1801ء میں الہ آباد اور کچھ دوسرے قریبی اضلاع انگریزوں کے حوالے کر دیے تھے جو شمولہ صوبجات کہلاتے تھے۔ لارڈ ویلزلی کے زمانۂ حکومت ہی میں مرہٹوں سے 1803ء میں دہلی، آگرہ اور گنگا کی وادی چھین لی گئی اور اس علاقے کو مفتوحہ صوبجات کا نام دیا گیا۔

بنارس میں زمین کی پیداوار میں سرکاری مطالبے کا استمراری تعین 1795ء میں کر دیا گیا۔ شمولہ اور مفتوحہ صوبجات کے مالکان اراضی سے بھی 1803ء اور 1805ء میں بندوبست استمراری کا وعدہ کیا گیا تھا لیکن یہ وعدہ پورا نہیں کیا گیا۔ اسی کی وجہ یہ تھی کہ آر۔ ڈبلیو۔ کاکس اور ہنری سینٹ جارج ٹکر نے، جو اسپیشل کمشنر مقرر کیے گئے تھے، ان صوبجات میں فوری طور سے بندوبست استمراری کرنے کی مخالفت کی۔[1]

---

[1] ہنری سینٹ جارج ٹکر جس کا ذکر پچھلے ابواب میں آچکا ہے، ہندوستان میں زمین کے محصول کے بندوبست استمراری کا پُرجوش حامی تھا۔ 1808ء میں اس نے بندوبست کا خیال ترک کرنے کے بجائے اس کو ملتوی کرنے کی سفارش کی تھی۔ اس نے کئی سال بعد لکھا تھا "1807ء میں مجھے ایک ایسے کام پر مامور کیا گیا تھا جس کے متعلق کئی حاکم بار بار

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

طویل بحث و مباحثے کے بعد 1821ء میں کورٹ آف ڈائرکیٹرز نے شمالی ہندوستان میں بندوبست استمراری کرنے کے خلاف قطعی فیصلہ صادر کر دیا۔ 1822ء کا ریگولیشن نمبر 7 منظور کیا گیا جس میں کہا گیا تھا کہ ریاست کسی زمینداری کے مجموعی لگان کا 83 فیصدی حصّہ وصول کرنے کی حقدار ہے اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بندوبست پر نظرثانی کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔

اس بھاری شرحِ تشخیص میں کمی کرنے اور طویل المدّت بندوبست رائج کرنے کا سہرا لارڈ ولیم بینٹنک کے سر ہے۔ اُس نے 1833ء میں ایک کانفرنس الٰہ آباد میں منعقد کی جس کا نتیجہ 1833ء کے ریگولیشن نمبر 9 کی صورت میں برآمد ہوا جو شمالی ہندوستان کے بندوبستوں کی بنیاد تھا۔ سرکاری مطالبہ گھٹا کر لگان کا 66 فیصدی کر دیا گیا اور بندوبست کی مدّت تیس سال کر دی گئی۔

بندوبست کرنے کا کام رابرٹ مرٹنس برڈ (Robert Merttins Bird) کے سپرد کیا گیا۔ اُس نے اپنے کام میں اُسی قسم کی شرافت اور انسانیت کے جذبے کا مظاہرہ کیا جو لارڈ ولیم بینٹنک کی پالیسی کی بنیاد تھی۔ کئی سال بعد اس نے اپنے طریقہ کار پر اس وقت روشنی ڈالی جب وہ ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کے سامنے بطور گواہ پیش ہوا تھا۔ پہلا کام تو وہ یہ کرتا تھا کہ کسی مالی حلقے میں شامل کل اراضی کا ایک تخمینی خاکہ تیار کر لیتا تھا۔ اس کے بعد وہ نقشہ بنایا کرتا تھا جس میں ہر کھیت دکھایا جاتا تھا۔ تیسرا مرحلہ پیمائش تھا جس میں مزروعہ اور غیر مزروعہ زمین کی نشان دہی کی جاتی تھی۔ پھر کل مالی رقبے پر زمین کا محصول معیّن کر دیا جاتا تھا۔ پانچواں اور آخری کام یہ تھا کہ محصول کی مجموعی رقم اس مالی رقبے میں شامل

(صـــ سے آگے)

کہہ چکے تھے کہ ملک کی خوشحالی کے لیے ضروری ہے۔ اگرچہ مجھے اس رائے سے پورا اتفاق تھا کہ یہ اقدام دانشمندی پر مبنی اور مفید ہے اور اس کی اساس ایک ایسا اصول ہے جس سے متوقع فوائد حاصل ہو سکیں گے لیکن اس وقت ہم اتنا بڑا کام شروع کرنے اور اس کو کامیابی کے ساتھ سرانجام دینے کے لیے تیار نہیں تھے اس لیے میں نے بندوبست ملتوی کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ یہ اصول ترک کر دیا جائے گا یا یہ کہ وہ مالکان اراضی جن سے ہم نے نہایت باضابطہ انداز سے حتمی وعدہ کیا تھا وہ موعودہ فوائد سے محروم کر دیے جائیں گے اور آخر میں انھیں غیر ضروری بار سمجھ کر زمین پر پٹک دیا جائے گا۔ حالانکہ ابھی تک وہ وعدہ پورا نہیں ہوا ہے پھر بھی ہم وعدہ شکنی کے مرتکب نہیں ہو سکتے۔" ے ی ہنری سینٹ جارج ٹکر کی سوانح اور مکتوبات (Life and correspondence of Henry St. George Tucker) ص 222.

گانوؤں پر تقسیم کر دی جائے۔

ہر شخص یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ آخری دو کاموں یعنی پرگنے یا مالی رقبے کا لگان مقرر کرنے پر اور اس پرگنے میں شامل گانوؤں پر وہ رقم تقسیم کرنے پر کسانوں کی نگاہ رہا کرتی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس پورے نظام کا کمزور ترین حصہ تشخیص مالگزاری کا طریقہ تھا۔ حالانکہ اصول تو یہ تھا کہ مالگزاری مجموعی لگان کی 66 فیصدی ہو لیکن لگان کا تعین صرف بر بنائے قیاس کیا جاتا تھا۔ اس کا اطلاق خاص طور سے گانو کی پنچایتی اراضی پر ہوتا تھا۔ مرٹنس برڈ نے کہا تھا "اس کے بعد ہم اس اراضی پر سرکاری محصول تشخیص کرنے کی کاروائی شروع کر دیتے تھے۔ جہاں تک ممکن ہوتا تھا ہم پچھلی ادائیگیوں، لوگوں کے بیانوں فصل اور زمین کی نوعیت اور دوسرے ایسے طریقوں کی بنا پر، جن کا ہمیں تجربہ تھا، یہ فیصلہ کیا کرتے تھے کہ اس اراضی پر حکومت کا مناسب مطالبہ کتنا ہونا چاہیے[1]۔"

اس طریقے میں حاکم بندوبست کو بڑے اختیارات حاصل تھے اور کسان کے پاس معلوم کرنے کا کوئی طریقہ نہیں تھا کہ اس پر کتنا بار ڈال دیا جائے گا۔ سماعت کے دوران جو واقعات سامنے آتے تھے وہ اتنے غیر واضح ہوتے تھے کہ اُن کی بنا پر کوئی دو حکام بندوبست یکساں فیصلہ نہیں صادر کر سکتے تھے۔ ایک بندوبست کے وقت جو تشخیص ہوئی تھی اسے دوسرے بندوبست کے وقت تبدیل کر دیا جاتا تھا اور عام طور سے اس میں اضافہ ہو جاتا تھا جب زراعت پر عائد ہونے والا محصول اتنا غیر یقینی ہو تو زرعی خوشحالی کس طرح ممکن ہو سکتی تھی۔ بندوبست استمراری کی وکالت کرنے والوں کا خیال تھا کہ لوگ کچھ دولت جمع کر سکیں گے لیکن ان حالات میں دولت کیسے جمع کی جا سکتی تھی جب دولت اور خوشحالی کے محض شبے پر آئندہ بندوبست میں شرح تشخیص بڑھا دی جاتی تھی۔

اس خرابی کے باوجود 1833ء میں شروع ہونے والے بندوبست میں زیادہ ہمدردی اور انسانیت کے جذبے سے کام لیا گیا اور اس سے شمالی ہندوستان کے اُن کسانوں کے دکھوں میں کچھ کمی ہو گئی جو انگریزی راج کے پہلے تیس سال میں تھوڑی تھوڑی مدت کے بعد ہونے والے بندوبستوں اور بھاری شرح تشخیص کی بنا پر سخت تکلیفوں میں مبتلا ہو گئے تھے۔ مرٹنس برڈ نے نو سال تک انتہائی محنت و جانفشانی کے ساتھ کام کیا اور ہندوستان چھوڑنے سے پہلے 1842ء میں بندوبست کے نتائج کے متعلق ایک تفصیلی رپورٹ پیش کی جو اب ختم ہونے کے قریب تھا۔

---

[1] سلیکٹ کمیٹی کی چوتھی رپورٹ، 1853ء، ص 30۔

بندوبست استمراری کا خیال ترک کر دیا گیا تھا۔ اس کے باوجود وہ بڑھ چاہتا تھا کہ ان اضلاع کی حد تک جہاں زیادہ تر قابل زراعت زمین زیرِ کاشت آچکی تھی اُس کے کیے ہوئے بندوبست کو استمراری بندوبست سمجھا جائے۔ اُس کی واضح رپورٹ سے ہمیں مندرجہ ذیل واقعات معلوم ہوتے ہیں۔

دہلی کی کمشنری

اس کمشنری کے کچھ حصّوں میں جہاں نہروں سے آبپاشی ہوتی ہے خاصی آبادی ہے اور لوگ خوشحال ہیں۔ کچھ صورتوں میں بھاری مالگزاری لگائی گئی تھی۔ اب بوجھ کم کر دیا گیا ہے۔ اب جو مالگزاری تشخیص کی گئی ہے وہ مناسب ہے۔ باقی حصّوں میں جہاں آبپاشی کا کوئی انتظام نہیں ہے پیداوار بہت کم ہوتی ہے۔

"میرا خیال ہے کہ حکومت جب تک نئی نہر تعمیر نہ کرے اس وقت تک بندوبست کی نظرثانی میں دہلی کے علاقے سے زیادہ رقم کی توقع نہیں رکھنی چاہیے"۔

73 پونڈ گیہوں کی اوسط قیمت دو شلنگ ہے۔

میرٹھ کی کمشنری

ضلع سہارنپور ـــــ "اس ضلع کے کچھ حصّوں میں مالگزاری کی شرح بہت زیادہ ہے اور مالگزاری کی وصولیابی میں غیر قانونی اور سخت طریقے استعمال کیے جاتے ہیں۔ کچھ قوموں کو جو جفاکش طبقوں پر مشتمل ہیں بڑی بے دردی کے ساتھ کچلا گیا ہے۔ مطالبے میں یکسانیت پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی جن میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔ لیکن اب بھی قابل لحاظ حد تک نابرابری پائی جاتی ہے"۔ بندوبست ختم ہونے کے بعد اس ضلع کے کچھ گاؤوں کی مالگزاری میں اضافہ کیا جاسکتا ہے" لیکن قابل زراعت زمین کے پانچویں حصّے کو ہمیشہ محصول سے مستثنیٰ رکھا جائے تاکہ اس میں جانوروں کے لیے گھاس یا دوسرا چارا پیدا کیا جاسکے اور پرتی چھوڑنے یا کسانوں کی کوتاہیوں کی وجہ سے ہونے والے خسارے کو پورا کیا جاسکے"۔ ہردوار سے الہ آباد جانے والی نہر بن جانے کے بعد سرکاری مطالبے میں تھوڑے بہت اضافے کی توقع کی جاسکتی ہے۔

80 پونڈ گیہوں کی اوسط قیمت دو شلنگ تھی۔

ضلع مظفرنگر ـــــ جن علاقوں میں شرح مالگزاری کم تھی وہاں اگلے بندوبست کے وقت مالگزاری

میں کچھ اضافہ کیا جاسکے گا لیکن" کسی ایسے موضع کی مالگزاری میں اضافہ نہیں کیا جانا چاہیے جہاں قابل زراعت اراضی کا نصف حصہ اس حالت میں ہو جس کے لیے اس ضلع میں "عیسم" کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے اور اس کے لیے جو معیاری شرح مقرر کی گئی ہے اس کے مطابق مالگزاری ادا کی جاتی ہو۔"

75 پونڈ گیہوں کی اوسط قیمت دو شلنگ تھی۔

ضلع بلند شہر —— پچھڑا ہوا علاقہ ہے۔ مالگزاری کی شرح کم ہے۔ نہر بن جانے، زیر کاشت رقبے میں اضافے ہونے اور شرح مالگزاری کو لوچدار کرنے کی صورت میں سرکاری مطالبے میں اضافے کی توقع کی جاسکتی ہے۔

66 پونڈ گیہوں کی اوسط قیمت دو شلنگ تھی۔

ضلع میرٹھ —— بہت زرخیز ضلع ہے۔ زراعت کی توسیع کی بنا پر اگلے بندوبست کے موقع پر سرکاری مطالبے میں اضافے کی توقع کی جاسکتی ہے "لیکن شرح مالگزاری میں اضافے کی گنجائش نہیں۔ صرف نہر کا محصول لگا کر مجموعی رقم میں کچھ اضافہ کیا جاسکتا ہے"۔

66 پونڈ گیہوں کی اوسط قیمت دو شلنگ تھی۔

ضلع علی گڑھ —— ایک خوشحال ضلع ہے۔ زیادہ تر رقبہ زیر کاشت ہے۔ صرف اُن چھ پرگنوں کی حد تک جن کے نام درج کیے جارہے ہیں آئندہ مالگزاری میں اضافے کی توقع کی جاسکتی ہے۔ دوسرے پرگنوں میں صرف نہر کا محصول لگا کر مطالبے میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ اس ضلع کے دیہاتیوں نے نیل کا کاروبار کرنے والے مارٹن اینڈ میک کلنٹاک (Morton and MacClintock) سے بڑی بڑی رقمیں پیشگی وصول کر لی ہیں۔ اس کے علاوہ دیسی بنک کاروں سے بھی اُنھوں نے پیشگی روپیہ لیا ہے۔ اس کی وجہ سے بڑے ہنگامے ہوئے اور جو زمینیں قرضوں میں مکفول کی گئیں تھیں ان کے بکنے کی نوبت آئی۔

78 پونڈ گیہوں کی اوسط قیمت دو شلنگ تھی۔

آگرہ کی کمشنری

ضلع آگرہ —— آراضی پوری طرح زیر کاشت آچکی ہے اور اس پر مالگزاری تشخیص کی جاچکی ہے "اس ضلع کی مالگزاری میں آئندہ کسی اضافے کی توقع نہیں جمع بندی کی موجودہ رقم کو ہمیشہ کے لیے معیّن کر دینا چاہیے۔ پیداوار یا طریقۂ کاشت میں ترقی یا ذرائع آب رسانی میں اضافے کی توقع صرف اس صورت میں کی جاسکتی ہے جب کاشتکاروں کو یقین ہو جائے کہ ان کی محنت اور لاگت کا پورا فائدہ

اُن کو پہنچے گا۔[1]"

ضلع متھرا ـــــ اس ضلع کا بھی تمام رقبہ زیرِکاشت آچکا تھا۔" مالگزاری کی موجودہ شرح تشخیص کو استمراری قرار دیا جائے جب تک لوگوں کو یقین نہ دلایا جائے کہ تمام فوائد اُن کو حاصل ہوں گے آئندہ کسی ترقی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔"

ضلع فرخ آباد ـــــ ضلع کے کچھ حصّوں میں تمام رقبہ زیرکاشت آچکا ہے لیکن دوسرے حصّوں میں آئندہ بندوبست کے موقع پر مالگزاری میں اضافہ کیا جاسکتا ہے جس کی بنیاد زیرکاشت رقبے کے ساتھ شرح تشخیص میں اضافہ ہوسکتی ہے۔ آبپاشی کے لیے اگر نہر بنائی جاسکے تو اس سے بھی مالگزاری بڑھ سکتی ہے۔

ضلع مین پوری ـــــ ضلع کے حصّوں میں تمام رقبہ زیرِکاشت آچکا ہے اور ان پر مالگزاری تشخیص کی جاچکی ہے۔ دوسرے حصّے پچھڑے ہوئے ہیں۔

ضلع اٹاوہ ـــــ تمام رقبہ زیرِکاشت آچکا ہے اور اس پر مالگزاری تشخیص ہوچکی ہے۔" جب تک آبپاشی کے لیے نہریں نہ تعمیر کی جائیں آئندہ کسی اضافے کی توقع نہیں کی جاسکتی ہے۔ اس شرط کے ساتھ موجودہ تشخیص کو مستقل تصور کرنا چاہیے"۔

روہیلکھنڈ کی کمشنری

ضلع بجنور ـــــ ضلع میں شرح تشخیص بہت زیادہ ہے اور کچھ سابق افسران مال نے لوگوں کے ساتھ بڑی بے رحمی کا سلوک کیا ہے۔" اُن لوگوں نے خریداروں اور قرض خواہوں کو بالجبر جائیدادیں منتقل کیں، حکم عدولی کرنے والے بنک کاروں سے زبردستی روپیہ قرض لیا، جن موضعوں کے لوگ بھاگ گئے تھے اور جن کا انتظام سرکاری افسروں کے ہاتھوں میں تھا اُن میں کاشت کرنے کے لیے مزدور پکڑ کر لائے گئے۔ اُن کے علاوہ طرح طرح کے اور مظالم بھی کیے گئے۔" اب ان خرابیوں کو دُور کردیا گیا ہے اور مناسب مالگزاری تشخیص کردی گئی ہے لیکن اب بھی شرح تشخیص میں یکسانیت نہیں ہے۔

---

[1] برڈ کی رپورٹ کا پیراگراف نمبر 87۔ لارڈ کارنواس سے لارڈ ویلزلی تک، بشمول ہیسٹنگز اور منٹو، بندوبست استمراری کے تمام وکالت کرنے والوں نے یہ دلیل استعمال کی تھی۔ اہم بات یہ ہے کہ 1821ء میں حالانکہ ڈائرکٹروں نے بندوبست استمراری کے تصور کو مسترد کردیا تھا پھر بھی رابرٹ برڈ نے 1842ء میں اصرار کیا کہ شمالی ہندوستان کے ان اضلاع میں بندوبست استمراری نافذ کیا جائے جہاں تمام رقبہ زیرِکاشت آچکا تھا۔ اس کے خیال میں آئندہ زراعت کو ترقی دینے کا یہ واحد طریقہ تھا۔

ضلع مراد آباد ــــ معلومات حاصل نہیں کی جاسکیں۔
ضلع بریلی ــــ اس ضلع میں شرح تشخیص بہت زیادہ تھی اور 1837ء کے قحط سے اس کے کچھ حصے بُری طرح متاثر ہوئے تھے۔ فاقوں کے مارے لوگوں نے گروہ بنا لیے تھے اور لُوٹ مار کیا کرتے تھے بہت سے کسان اپنا گھر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ موجودہ بندوبست کے موقع پر شرح تشخیص کے تعین میں اعتدال سے کام لیا گیا ہے۔
ضلع بدایوں ــــ بندوبست کے وقت ضلع بڑی تکلیفوں اور دُکھوں کے دَور سے گزر رہا تھا۔ بندوبست ایسے زمانے میں ہوا تھا "جب بھاری شرح تشخیص کا رُجحان ختم نہیں ہوا تھا" اور اس لیے بار بار نظرِ ثانی کی ضرورت پڑی۔ اب بھی وہاں کے لوگوں کے دُکھ پوری طرح دُور نہیں کیے جاسکتے ہیں۔ "اس سے بہت فائدہ ہوگا اگر حکومت اور سرکاری ملازمین کو اس امر کا یقین ہوجائے، جیسا کہ میرے خیال میں وہ اب محسوس کرنے لگے ہیں، کہ ضرورت سے زیادہ شرح تشخیص کی بنا پر واقعی مالی نقصان ہوتا ہے اور جیسا کہ اس بندوبست کے موقع پر پہلی دفعہ کیا گیا ہے وہ آئندہ بھی اعتدال سے کام لیں۔"
ضلع شاہجہانپور ــــ پچھلے بندوبستوں کے موقع پر بھاری شرح مالگزاری کے دُکھوں سے یہ ضلع محفوظ رہا۔ موجودہ بندوبست میں شرح تشخیص کم رکھی گئی اس لیے ضلع پھل پھُول رہا ہے۔
ضلع پیلی بھیت ــــ گذشتہ موقعوں پر ضلع کے نصف حصے میں مالگزاری کی بھاری شرح تشخیص کی گئی تھی لیکن اب اس میں خاصی کمی کر دی گئی ہے دوسرے حصے کا بندوبست راجہ گرنام سنگھ کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ضلع کی آب و ہوا صحت کے لیے سخت مضر ہے۔
53 پونڈ گیہوں کی اوسط قیمت دو شلنگ تھی۔

الہ آباد کی کمشنری

ضلع کانپور ــــ پہلے شرح تشخیص بہت زیادہ تھی۔ اب اس میں کمی کر دی گئی ہے۔ ضلع کے زیادہ تر حصوں میں تمام رقبہ زیر کاشت آچکا ہے اور اس پر مالگزاری تشخیص ہو چکی ہے۔ آبپاشی کے لیے نہریں بن جائیں تو سرکاری مطالبے میں کچھ اضافہ ہوسکتا ہے ورنہ "کانپور کے سرکاری مطالبے کے متعلق یہ سمجھنا چاہیے کہ اس میں اضافے کی گنجائش نہیں اور اسے مستقل قرار دے دینا چاہیے۔"
ضلع فتح پور ــــ ان باتوں کا اطلاق فتح پور پر بھی ہوتا تھا۔ "نہروں کے ذریعے آبپاشی کا رواج ہونے کی بنا پر جو اضافہ ہوسکتا ہے اس کو چھوڑ کے ضلع کے متعلق سمجھنا چاہیے کہ اس کا ہمیشہ کے لیے

بندوبست کر دیا گیا ہے"۔

ضلع الٰہ آباد ــــ گزشتہ زمانے میں مالگزاری کی بھاری شرح تشخیص سے محفوظ رہا۔ صرف نہریں تعمیر ہونے کی صورت میں اضافہ ہو سکتا ہے ورنہ "موجودہ بندوبست میں جو شرح مقرر کی گئی ہے اُس کو مستقل سمجھنا چاہیے"۔

بنارس کی کمشنری

ضلع اعظم گڑھ ــــ ایک زرخیز ضلع جہاں آبپاشی کا بڑا اچھا انتظام ہے اور زیادہ تر رقبہ زیرِ کاشت ہے۔ ضلع کے کچھ حصّوں میں مالگزاری کی تشخیص پوری طرح کی جا چکی ہے اور وہاں آئندہ اضافے کی کوئی گنجائش نہیں۔ بقیہ حصّوں میں "موجودہ بندوبست کی مدّت کے خاتمے کے وقت زیرِ کاشت علاقے میں جتنا اضافہ ہو چکا ہو گا اس کی مناسبت سے مالگزاری میں اضافہ کیا جا سکے گا۔ شرح تشخیص میں اضافہ نہیں کرنا چاہیے"۔

59 پونڈ گیہوں کی اوسط قیمت دو شلنگ تھی۔

ضلع گورکھپور ــــ ایک زرخیز ضلع جہاں حالات بہت اچھے ہیں۔ امید ہے کہ آئندہ زراعت میں توسیع اور شرح تشخیص میں اضافے کی بنا پر سرکاری مطالبے میں اضافہ ہو سکے گا۔

63 پونڈ گیہوں کی اوسط قیمت دو شلنگ تھی۔

برڈ کے بندوبست کے نتائج مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ اعداد و شمار اُن نقشوں سے لیے گئے ہیں جو اس کی رپورٹ کے ساتھ منسلک تھے۔ ایک پونڈ کو دس روپے کے برابر تسلیم کیا گیا ہے۔

کمشنری	ضلع	مجموعی رقبہ ایکڑ میں	مجموعی زیرِ کاشت رقبہ ایکڑ میں	برڈ کی تشخیص کردہ مالگزاری پونڈ میں
دہلی				
	دہلی	3,64,534	1,74,605	36,337
	رہتک	8,44,666	4,74,465	62,831

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

کمشنری	ضلع	مجموعی رقبہ	مجموعی زیرکاشت رقبہ	برٹش تشخیص کردہ مالگزاری
	گڑگاؤں	11,60,437	6,47,353	1,01,424
	حصار	16,57,975	6,96,147	38,020
میرٹھ	سہارنپور	10,18,705	6,06,847	1,00,558
	مظفرنگر	6,91,706	3,92,377	67,274
	میرٹھ	17,76,430	10,34,016	2,81,561
	بلندشہر	10,25,096	5,92,630	85,168
	علی گڑھ	11,18,238	9,00,562	1,96,448
روہیلکھنڈ	بجنور	10,27,533	4,59,409	1,12,237
	مرادآباد	نامعلوم	نامعلوم	66,870
	بدایوں	14,50,418	7,52,103	1,10,306
	پیلی بھیت	نامعلوم	نامعلوم	39,049
	بریلی	11,16,174	6,39,579	1,26,345
	شاہجہانپور	13,09,211	6,51,548	1,02,707
آگرہ	متھرا	10,16,153	نامعلوم	1,55,728
	آگرہ	9,35,825	6,46,818	1,39,297
	فرخ آباد	12,47,288	6,14,253	1,49,575
	مین پوری	12,80,927	6,13,422	1,36,238
	اٹاوہ	10,71,756	4,77,901	1,31,093
الہ آباد	کانپور	14,97,795	7,82,276	1,41,893

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

کمشنری	ضلع	مجموعی رقبہ	مجموعی زیر کاشت رقبہ	بمد کی تشخیص کردہ مالگزاری
بنارس	فتح پور	9,90,584	5,06,905	1,41,893
	الہ آباد	17,90,244	9,97,508	2,15,650
	گورکھپور	45,60,049	19,27,234	2,08,354
	اعظم گڑھ	16,52,293	7,73,616	1,51,788

جب وہ کام جو نو سال کی محنت و جانفشانی کے بعد مرٹنس برڈ نے قریب قریب ختم کر دیا تھا صوبے کے لفٹیننٹ گورنر کے سامنے پیش ہوا تو اس نمایاں حیثیت رکھنے والے افسر نے 15/اپریل 1842ء کو ایک پر مغز روداد لکھی اس نے تسلیم کیا کہ بندوبست نیک نیتی ہمدردی اور صحت نظر کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس نے یہ بھی تسلیم کیا کہ اس بندوبست کا مقصد مالگزاری میں اضافہ کرنا نہیں تھا۔ اس نے چار قسطوں میں سالانہ مالگزاری ادا کرنے کے طریقے کو پسند کیا۔ اس نے جمع بندیوں اور سرکاری کاغذات کی درستیوں کو بھی پسند کیا۔ مگر اسے شبہ تھا کہ گاؤں کے لوگ ایک تنخواہ والے چوکیدار کا تقرر پسند کریں گے۔ چھوٹے موٹے افسروں نے معافی کی آراضی پر مالگزاری لگانے میں جو غیر ضروری جوش دکھایا تھا اور سختی برتی تھی اس کی لفٹیننٹ گورنر نے سخت مذمت کی۔

"افسر بندوبست نے بغیر کسی تحقیقات کے معافی کی زمین کے ایسے چھوٹے چھوٹے قطعوں کو بھی ختم کر دیا جن کی رجسٹری نہیں ہوئی تھی۔ دس بیگھے سے کم کے ٹکڑے بھی نہیں چھوڑے گئے جنھیں بعد میں ایک حکم کے ذریعے مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا جو اس وقت تک جاری نہیں ہوا جب تک کہ معافیوں پر قبضہ نہ ہو گیا۔ ایک ضلع یعنی فرخ آباد میں ایک معاہدے کے شرائط اور حکومت کے راست احکامات کو بھی اہمیت نہیں دی گئی اور بہ اعتبار مجموعی وارن ہیسٹنگز اور لارڈ لیک جیسے لوگوں کے کارناموں کو نظر انداز کرنے کا رویہ اختیار کیا گیا۔[1]"

موروثی مالکان اراضی کے حقوق میں جس طرح دخل اندازی کی گئی تھی لفٹیننٹ گورنر نے اس کی اور زیادہ مذمت کی۔ جو مثالیں پیش کی گئی تھیں ان میں سے ایک مندرجہ ذیل ہے۔

---

[1] پیراگراف-16-

"مین پوری کے راجہ کو، جس کے بزرگوں نے اس وقت برطانوی حکومت سے وفاداری کا ثبوت دیا تھا جب 1804ء میں ہلکر کی فوجوں نے اس ضلع پر قبضہ کر لیا تھا، حکومت کی اجازت کے بغیر، جو حق تعلق داری کا ایک جز تھی، اس کے وارثوں کے ساتھ، تعلق داری کے 158 گانوؤں میں سے 116 گانوؤں پر ہر قسم کے اختیار سے محروم کر دیا۔ یہ گاؤں اس نے انگریزی راج سے پہلے باضابطہ طور سے ترکے میں پائے تھے[1]۔"

ہر گانو کے معاملات میں مسلسل دخل اندازی کو بھی لفٹیننٹ گورنر ناپسندگی کی نظر سے دیکھتا تھا۔ "ہر کھیت کے متعلق پوری پوری معلومات حاصل کرنے اور اس کا ریکارڈ تیار کرنے کے لیے عدالتوں کو ہر گانو کے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہر گانو والے کے معاملات میں مسلسل دخل اندازی کرنی ہوگی جس کو کوئی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ میرا خیال ہے کہ ہندوستان کے لوگوں کے لیے تو وہ بہر حال ناقابلِ برداشت ثابت ہوگی۔" گورنر جنرل کا خیال تھا کہ عام طور سے اس قسم کے اقدامات کیے جا رہے ہیں "جن سے لوگ برابر ہو جائیں۔ ان کا مقصد ہے کہ سماج کی سطح کو ہموار کر دیا جائے تاکہ حکومت اور کسانوں کے درمیان باحیثیت عناصر باقی نہ رہیں۔ کسی ایسے طبقے کی مدد کے بغیر جو مقامی لوگوں پر مشتمل ہو حکومت کا کام چلانے کی کوشش کرنا ایک خطرناک تجربہ ہے۔ اس وقت جو اقدامات کیے جا رہے ہیں اُن کے متعلق میرا خیال ہے کہ ان میں اس قسم کے حالات پیدا کرنے کا رُجحان پایا جاتا ہے[2]۔"

یہ باتیں ہر دَور میں مفید تصوّر کی جائیں گی۔ شمالی ہندوستان کے زراعت پیشہ لوگوں کو جو فائدے پہنچے اس کے لیے برڈ کے بندوبست کی ہمیشہ تعریف کی جائے گی اور واقعہ یہ ہے کہ اس نے قابلِ تعریف کام کیا ہے۔ برطانوی حکومت کے پہلے تیس سال میں بہت زیادہ مالگزاری لگائی گئی تھی جس سے لوگ بڑی تکلیفوں میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اُس نے تشخیص مالگزاری میں اعتدال سے کام لیا۔ اس کے علاوہ بندوبست کی مدّت میں اضافہ کر کے کسی حد تک لوگوں کی پریشانیاں کم کر دیں۔ اسی کے ساتھ ہمیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ برڈ نے صاف صاف کہا تھا کہ جہاں اراضی پوری طرح زیرِ کاشت آ چکی ہے اور اس پر مالگزاری تشخیص ہو چکی ہے وہاں تشخیص شدہ مالگزاری کو دائمی حیثیت دے دی جائے۔ مگر اس کے بعد آنے والے حاکموں نے اس کی رائے کو نظر انداز کر دیا۔ اس کی یہ خواہش بھی پوری نہیں

---

[1] پیراگراف 18۔

[2] پیراگراف 26، 29، 30۔

کی گئی کہ دوسرے اضلاع میں جُوں جُوں زراعت ترقی کرتی جائے وہاں بھی اس اصول پر عمل کیا جاتا رہے۔ اس کے برعکس ان اقدامات کی سب کو برابر کرنے والی وہ نوعیت، جس کی مذمت ٹی بی۔ رابرٹسن نے 842؛ ء میں کی تھی، ساٹھ سال گزرنے کے بعد زیادہ نمایاں ہو گئی ہے۔ آج شمالی ہند میں سرکاری تنخواہ پانے والا پٹواری سیاہ وسفید کا مالک ہوتا ہے۔ وہ اختیارات اس کے سُپرد کر دیے گئے ہیں جو اصل میں لوگوں کے نمائندوں یعنی گانو کے زمیندار یا گانو پنچایت کو حاصل ہونے چاہیے۔ ہندوستان کی حد تک اسی پالیسی کو دانشمندی پر مبنی نہیں قرار دیا جا سکتا کہ "سماج کی سطح کو ہموار کر دیا جائے تاکہ حکومت اور کسانوں کے درمیان باحیثیت عناصر باقی نہ رہیں"۔

شریف النفس اور رحمدل جیمس ٹامسن (James Thomason) 1843ء میں رابرٹسن کی جگہ شمالی ہندوستان کا لفٹیننٹ گورنر مقرر ہوا۔ اس نے دس سال تک حکومت کی۔ اس کی ماتحتی میں جان لارنس (John Lawrence)، رابرٹ منٹگمری (Robert Montgomery) اور ولیم میور (William Muir) جیسے قابل افسروں نے تربیت حاصل کی جنھوں نے لوگوں کے ساتھ ہمدردی کے علاوہ اپنی انتظامی صلاحیتوں کی بنا پر ہندوستان کی تاریخ میں ایک نمایاں حیثیت حاصل کر لی ہے۔ خود ٹامسن ہندوستان کا ایک ممتاز و نمایاں حاکم مال تھا۔ ایک طرف تو اُس نے کسی حد تک ان خرابیوں کو دور کیا جن کی طرف اس کے پیش رو نے اشارہ کیا تھا۔ دوسری طرف اُس نے 1849ء میں بندوبست ختم کر کے مرٹنس برڈ کے شروع کیے ہوئے کام کی تکمیل کر دی۔ چار سال بعد اس عظیم اور نیک سرشت انسان کا انتقال اسی دن ہوا جس دن ملکہ وکٹوریہ نے اس کو ترقی دے کر مدراس کا گورنر مقرر کرنے کے حکم پر دستخط کیے یعنی 27/ستمبر 1853ء کو۔ مدراس ایک ایسے حاکم سے محروم ہو گیا جس کی انسان دوستی کی پالیسی کی سب سے زیادہ ضرورت اس صوبے کو تھی۔

لفٹیننٹ گورنر مقرر ہونے کے بعد ٹامسن نے پہلا اہم کام یہ کیا کہ 844اء میں "ہدایات برائے حکام بندوبست" تیار کی۔ یہ ہندوستان میں تیار ہونے والا بندوبست کا پہلا مکمل ضابطہ تھا۔ اس میں 195 پیراگراف تھے اور وہ اصول اور کام کے طریقے بیان کیے گئے تھے جن سے شمالی ہندوستان کے بندوبست میں کام لیا جاتا تھا۔ اس میں جو ہدایات دی گئی تھیں ان میں سے کچھ ذیل میں دی جاتی ہیں۔" 52۔ زیادہ پسندیدہ امر یہ ہے کہ بندوبست کے زمانے میں مالک اراضی کی متوقع خالص آمدنی کے دو تہائی سے زیادہ کا مطالبہ نہ کیا جائے اور ایک تہائی اس کے منافع کے طور پر اور اخراجات وہ دنیاوی کی کفالت کے لیے اس کے پاس چھوڑ دیا جائے۔ خالص پیداوار کے معنی وہ فاضل

پیداوار ہے جو زراعت کے اُن تمام اخراجات کی منہائی کے بعد باقی بچے جس میں سامان زراعت کا کرایہ اور مزدوروں کی اُجرتیں شامل ہیں۔ اس کا اطلاق اُن زمینداریوں کی حد تک جن کے مالک کاشت کرتے ہیں، ان کی خود کاشت کے منافع پر ہوگا، لیکن جن زمینداریوں کے مالک خود کاشت نہیں کرتے ہیں اور اپنی زمینیں ایسے آسامیوں کو اُٹھا دیتے ہیں جو ایک معینہ شرح سے لگان ادا کرتے ہیں اس کا اطلاق لگان کی مجموعی رقم پر ہوگا۔"

"128۔ شرح معین آسامیوں کو کھیتوں پر قبضہ و دخل رکھنے کا حق حاصل ہے اور جب تک وہ معینہ لگان ادا کرتے رہیں انھیں بے دخل نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اگر وہ قانونی مطالبہ ادا کرنے سے قاصر رہیں تو مالک آراضی کو چاہیے کہ بقایا رقم کی وصولیابی کے لیے دعویٰ دائر کرے۔ اگر ڈگری حاصل کرنے کے بعد بھی وہ بقایا رقم وصول نہ کر پائے تو اُسے آسامی کی بے دخلی اور اس کی زمین پر قبضہ و دخل دلانے کی درخواست کلکٹر کی عدالت میں پیش کرنی چاہیے۔"

"129۔ غیر دخیل کار آسامیوں کو اس سال کے علاوہ جس سال وہ زمین پر کاشت کرتے ہیں کوئی حق حاصل نہیں ہوگا۔"

"154۔ جب کئی حصہ دار ہوں (جیسے کہ گاؤں کی مشترکہ کاشت) تو عام طور سے اُن میں سے ایک یا ایک سے زیادہ کا انتخاب کر لیا جاتا ہے اور یہ انتظام کیا جاتا ہے کہ دوسرے حصے داران کے ذریعے سرکاری مالگزاری ادا کریں۔ تمام حصے دار مالگزار یا پٹی دار ہوتے ہیں لیکن جن پر مالگزاری ادا کرنے کی ذمہ داری ڈالی جاتی ہے وہ صدر مالگزار ہوتے ہیں اور عام طور سے انھیں نمبردار کہا جاتا ہے[1]۔"

"159۔ اب صرف یہ بتانا رہ گیا ہے کہ خسرہ کس طرح تیار کیا جائے .... یہ دستاویز مستقل ہوتی ہے۔ اس کو ایک قسم کی سند استحقاق سمجھنا چاہیے۔ تمام وہ لوگ جن کا مفاد زمین سے وابستہ ہے، یا جو اس قسم کا مفاد حاصل کرنا چاہتے ہیں، انھیں حق ہے کہ اس دستاویز کو بطور سند پیش کریں۔ تمام سرکاری افسروں کو جن میں کلکٹر، مجسٹریٹ اور سب سے بڑھ کر جج شامل ہیں لوگوں کے معاملات طے کرتے وقت اس دستاویز سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔"

ہندوستان کے حکام ان قاعدوں میں کچھ ایسے اصول پائیں گے جنھیں ہندوستان کے مختلف صوبوں کے قوانین مال میں شامل کر لیا گیا ہے۔

---

[1] یہ انگریزی کا لفظ نمبر ہے۔ کلکٹر کے رجسٹر میں ان لوگوں کے نام علاحدہ نمبر پر درج کیے جاتے تھے۔

شمالی ہندوستان کا بندوبست جو 1849ء میں مکمل ہو چکا تھا۔ بالآخر کورٹ آف ڈائرکٹرز کے سامنے پیش کیا گیا۔ ڈائرکٹروں نے اپنے اہم مراسلے مورخہ 13/اگست 1851ء میں اس عظیم کارنامے پر تبصرہ کیا۔ مرٹنس برڈ کے ہندوستان سے واپس جانے کے بعد بہت سی معافیوں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا اور اس کی تشخیص کردہ مالگزاری پر نظرثانی کی گئی تھی اور اس میں تخفیف کر دی گئی تھی۔ ڈائرکیٹروں کے مراسلے میں جو اعداد و شمار دیے گئے ہیں وہ برڈ کی رپورٹ سے اخذ کیے ہوئے مندرجہ بالا اعداد و شمار سے بہت مختلف ہیں۔

ہم کورٹ آف ڈائرکٹرز کے مراسلے میں دیے ہوئے اعداد و شمار ذیل میں پیش کر رہے ہیں۔ ایک پونڈ کو دس روپے کے برابر تسلیم کیا گیا ہے۔

ضلع	مجموعی مالگزاری پونڈ	ضلع	مجموعی مالگزاری پونڈ
سہارنپور	90,443	بریلی	1,00,706
مظفرنگر	67,274	شاہجہانپور	1,02,702
آگرہ	1,55,401	کانپور	2,18,154
بجنور	82,755	فتح پور	1,39,767
مرادآباد	1,33,463	الہ آباد	2,18,995
پیلی بھیت	37,589	اعظم گڑھ	1,35,741
فرخ آباد	92,173	دہلی	35,794
مین پوری	1,38,213	پانی پت	38,020
اٹاوہ	1,31,103	حصار	38,020
جون پور	1,23,133	رہتک	62,831
بنارس	81,607	گڑگانو	1,08,848
مرزاپور	67,068		

آگرہ، مرادآباد، الہ آباد اور گڑگانو کی مالگزاری اس مالگزاری سے بہت زیادہ ہے جو برڈ نے

اپنی رپورٹ میں دکھائی تھی۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ برڈ نے جس وقت اپنی رپورٹ پیش کی تھی اُس وقت تک بندوبست مکمل نہیں ہو پایا تھا۔ کچھ اضلاع مثلاً شاہجہانپور، فرخ آباد، بجنور، پیلی بھیت، بریلی اور فتح پور میں مالگزاری میں خاص کمی ہوئی تھی۔

بندوبست کی مدّت کے آخری دس سال میں شمالی ہندوستان میں مالگزاری کے مجموعی مطالبے اور وصولیابی کے اعداد و شمار ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں۔

سال	مطالبہ پونڈ	وصولیابی پونڈ
1838-39ء	45,54,899	36,30,215
1839-40ء	41,30,668	35,65,281
1840-41ء	37,64,261	34,70,402
1841-42ء	41,61,903	38,83,357
1842-43ء	43,91,890	40,48,812
1843-44ء	43,49,415	41,10,514
1844-45ء	43,45,882	41,28,744
1845-46ء	43,01,837	42,00,341
1846-47ء	43,07,700	42,32,122
1847-48ء	42,92,166	42,48,582

اس بندوبست کے صحت مند اثرات ایک نظر میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ مدّت بھاری مطالبے سے شروع ہوئی اور تقریباً دس لاکھ پونڈ بقایا رہے لیکن اس مدّت کے آخری برسوں میں مطالبہ کم ہو گیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریب قریب پورا مطالبہ وصول ہو سکا۔

ان اعداد و شمار پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈائرکٹروں نے اس شاندار کارنامے پر ہندوستان کے سول ملازمین کی تعریف کی اور رابرٹ مرٹنس برڈ کے لیے لکھا کہ "وہ خصوصیت کے ساتھ ہماری پسندیدگی و استحسان کا مستحق ہے۔"

مرٹنس برڈ اور سول حکام کی تعریف بجا تھی لیکن ابھی کام ادھورا تھا۔ اس عمارت کی بُنیاد مضبوط نہیں تھی۔ پورے پرگنے پر زمین کا محصول محض بربنائے قیاس مقرر کیا جاتا تھا۔

لیکن زمین کا محصول صرف غیر یقینی ہی نہیں تھا بلکہ شرح تشخیص بھی بہت زیادہ تھی۔ ٹامسن کی مندرجہ بالا ہدایتوں کے ضابطے نمبر 52 کی رو سے حکومت کا مطالبہ خالص پیداوار کے دو تہائی تک ہو سکتا تھا۔ نسبتاً یہ ضابطہ زیادہ ہمدردانہ تھا۔ برطانوی حکومت 1822ء میں پیداوار کے 83 فیصدی کا اور 1833ء میں 75 فیصدی کا مطالبہ کر چکی تھی۔ لیکن حقیقت میں یہ مطالبہ بھی بہت زیادہ تھا۔ اس نے شمالی ہندوستان کے مالکان اَراضی اور کسانوں کو بالکل قلاش کر دیا۔ 1851ء کے مراسلے پر ڈائرکٹروں نے نہایت اطمینان کے ساتھ دستخط تو کر دیے تھے لیکن اس کے کچھ سال کے بعد یہ تکلیف دہ حقیقت اُن پر روشن ہو گئی۔

نیا بندوبست شروع کرنے کا وقت آ رہا تھا۔ خالص پیداوار میں مالکان اراضی اور حکومت کے متناسب محصول کے سوال پر پھر سنجیدگی کے ساتھ غور کیا جانے لگا۔ تجربے نے ثابت کر دیا تھا کہ 66 فیصد محصول بہت زیادہ تھا جس کا مطالبہ حکومت کرتی تھی۔ ٹامسن کا ضابطہ نمبر 52 بھی بہت تباہ کن ثابت ہوا تھا۔ اس کی وجہ سے مالکان اراضی اور کسانوں کی زمینوں کی قیمتوں میں اضافہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ٹامسن کی ہدایتوں پر نظر ثانی کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ چنانچہ 1855ء میں نئے ضابطے بنائے گئے "تا کہ وہ اُن اُمور میں کلکٹر کی رہنمائی کریں جو "ہدایت برائے حکام بندوبست" میں شامل ہونے سے رہ گئے تھے یا جن کی پوری تشریح نہیں کی گئی تھی یا جن کے متعلق حکومت نے ضابطہ بندوبست میں مندرج ضابطوں سے مختلف ضابطے بعد میں بنائے"۔ چونکہ نئے ضابطے ضلع سہارنپور کے دوبارہ بندوبست کے سلسلے میں جاری کیے گئے تھے اس لیے وہ "سہارنپور کے ضابطے" کے نام سے مشہور ہو گئے۔

سہارنپور کے ضابطوں میں ضابطے نمبر 36 کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے جس کی رو سے زمین کا محصول خالص آمدنی یا زمینداری کے خالص مجموعی لگان کے 66 فیصدی سے کم کر کے 50 فیصدی کر دیا گیا تھا۔ وہ ضابطہ ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔

"کسی زمینداری کے املاک واجب الوصول کے متعلق پوری معلومات حاصل کرنا دشوار ہوا کرتی ہے پھر بھی اوسط خالص املاک واجب الوصول کے متعلق پہلے کے مقابلے میں اب زیادہ آسانی سے معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اس کی وجہ سے شرح تشخیص میں ضرورت سے زیادہ اضافے کا خطرہ رہا کرتا ہے۔ اس امر میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ دو تہائی یا 66 فیصدی کسی حقیقی اوسط املاک واجب الوصول کا ایسا بڑا حصّہ ہے جو عام حالات میں مالکان یا شراکت دار زیادہ مدّت

تک ادا نہیں کر سکتے ہیں۔ اس لیے حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ "ہدایات برائے حکام بندوبست کے پیراگراف 52 میں جو ضابطہ شامل ہے اس کو ترمیم کرے تاکہ زمینداری کا مطالبہ اوسط خالص املاک واجب الوصول کے 50 فیصدی تک محدود رہے۔ اس کے معنی یہ نہیں سمجھے جائیں گے کہ ہر زمینداری کی جمع بندی خالص اوسط املاک واجب الوصول کی نصف مقرر کی جانی چاہیے۔ لیکن دوسرے اُمور کے ساتھ املاک واجب الوصول پر غور کرتے وقت کلکٹر اس بات کو دھیان میں رکھے گا کہ ایسے خالص املاک واجب الوصول پر جن کی پوری تحقیقات کی جا چکی ہو، سرکاری مطالبہ دو تہائی کے بجائے نصف مقرر کیا جائے بلکہ کلکٹر کو وہ احتیاطیں برتنی چاہییں جن کا ذکر مذکورہ کتاب کے پیراگراف 47 تا 51 میں کیا گیا ہے اور اس کو زیرِ بندوبست زمینداریوں کے واقعی اوسط خالص املاک واجب الوصول کے متعلق تفصیلی اور غالباً بے سود معلومات حاصل کرنے میں اپنا وقت برباد نہیں کرنا چاہیے۔"

اس ضابطے کو ہندوستان کی موجودہ تشخیص مالگزاری کی بُنیاد کہا جا سکتا ہے۔ نصف صدی کی صریح غلطیوں اور بار بار زیادہ مالگزاری تشخیص کرنے کے بعد برطانوی حکومت نے فیصلہ کیا کہ سرکاری مطالبے کو زمین کی خالص پیداوار یا لگان کے نصف تک محدود رکھا جائے اور رفتہ رفتہ یہ شرح تشخیص ہندوستان کے اُن حصوں میں بھی نافذ کر دی گئی جہاں مالگزاری کا بندوبست استمراری نہیں ہوا تھا۔ اس شرح تشخیص کو ہندوستان کے صوبجات متوسط، اودھ اور پنجاب میں بھی ان کے الحاق کے بعد رائج کر دیا گیا۔ سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا نے 1864ء کے مراسلے کے ذریعے اس کو بمبئی اور مدراس جیسے صوبوں کے لیے منظور کر لیا جہاں مالکان آراضی بیچ میں نہیں تھے اور عام طور سے کسان براہِ راست حکومت کو مالگزاری ادا کیا کرتے تھے۔

باب 4

بمبئی کے بندوبست

لارڈ ہیسٹنگز کے زمانے میں برطانوی ہند کی مغربی سرحد میں تیزی کے ساتھ تبدیلیاں ہوئیں اور 1817ء میں مرہٹوں کے ساتھ آخری جنگ کے بعد دکن کے تمام علاقے پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ پہلے ماؤنٹ اسٹورٹ الفنسٹن نے 1819ء میں اس کے بعد چیپلن (Chaplin) نے 1821ء اور 1822ء میں نئے حاصل ہونے والے علاقے کے متعلق بیش بہا رپورٹیں پیش کیں۔ ان رپورٹوں سے مرہٹوں کے زمانۂ حکومت میں زراعت کی کیفیت اور کسانوں کی حالت پر بہت روشنی پڑتی ہے۔

الفنسٹن نے لکھا تھا کہ دکن میں مرہٹوں کی حکومت کی پہلی اور اہم ترین خصوصیت یہ تھی کہ انھوں نے ملک کو قصبوں اور گاؤں میں تقسیم کر دیا۔ "ان بستیوں میں ایک ریاست کی تمام خصوصیتیں چھوٹے پیمانے پر پائی جاتی ہیں اور اگر تمام حکومتیں ختم ہو جائیں پھر بھی وہاں کے رہنے والوں کے تحفظ کے لیے وہ بستیاں کافی ہیں۔"[1] پونا کے کیپٹن رابرٹسن نے لکھا تھا کہ گاؤں کا پٹیل یا سربراہ "پہلے کی طرح اب بھی مجسٹریٹ کے اختیارات رکھتا ہے اور اُس کا تقرر بستی کے لوگوں کی مرضی اور حکومت کی منظوری سے عمل میں آتا ہے۔ وہ اُن ضابطوں کی پابندی کروایا کرتا ہے جنھیں انگلستان میں بلدیہ کے ضابطے کہا جائے گا۔ بلدیہ کے اخراجات کی کفالت کے لیے، اور اُس کے سربراہ کی حیثیت سے خود اپنے وقار کو برقرار رکھنے کے لیے، پہلے وہ چندہ سے ایک رقم جمع کرتا تھا۔ وہ ایسی ترقیوں کی سفارش کیا کرتا تھا جس سے بستی کو فائدہ پہنچے اور امن برقرار رکھنے کے لیے وہ لوگوں سے مدد لیا کرتا تھا۔ جو لوگ اس کو ثالث مقرر کرنے

---

[1] الفنسٹن کی رپورٹ، مورخہ 25 اکتوبر 1819ء۔

اور اس کا فیصلہ ماننے کو تیار ہوتے تھے وہ ایک شفیق باپ کی طرح ان کے دیوانی مقدمات پہلے بھی فیصل کیا کرتا تھا اور آج کل بھی کرتا ہے یا وہ اُن کی صدارت کے فرائض ادا کرتا ہے جنھیں وہ خود یا فریقین جھگڑے چکانے کے لیے ثالث مقرر کرتے ہیں[۱۵]۔"

مرہٹوں کے عہد کی ایک اور اہم سماجی خصوصیت یہ تھی کہ زمین کا مالک کسان ہوا کرتا تھا جو میراث دار یا کھیت کا موروثی مالک کہلاتا تھا۔ الفنسٹن نے لکھا ہے "زیادہ تر کسان اپنی زمینوں کے مالک ہیں۔ صرف انھیں زمین کا معینہ محصول حکومت کو ادا کرنا ہوتا ہے۔ ان کی زمین موروثی ہوتی ہے اور بیع کی جا سکتی ہے۔ جب تک وہ محصول ادا کرتے رہیں انھیں بیدخل نہیں کیا جا سکتا ہے"۔ کیپٹن رابرٹسن نے لکھا تھا "جوت کی ابتدائی نوعیت کی رو سے، جس کی تشریح مذکورہ حوالے میں کی گئی ہے، اس کی حیثیت کسی طرح انگلستان میں اراضی کی ملکیت میں مطلق حق رکھنے والوں سے کم نہیں"۔ چیپلن نے لکھا تھا کہ میراثی کسان "مفتوحہ علاقے کے اس حصے میں عام طور سے پائے جاتے ہیں جو کرشنا سے گھاٹ کی پہاڑیوں تک پھیلا ہوا ہے"۔ مسٹر چیپلن نے مزید لکھا تھا کہ "کلکٹر (پونا کا) بجا طور سے میراثیوں کے حقوق کو بحال رکھنے کی وکالت کرتا ہے۔ اُس نے کئی موقعوں پر اس پالیسی کی زوردار الفاظ میں سفارش کی ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ کوئی شخص ان کے حقوق کو ختم کرنا نہیں چاہتا ہے اس لیے اس مسئلے پر مزید بحث فضول ہے[۱۶]۔"

افسوسناک بات یہ ہے کہ مفتوحہ علاقے میں برطانوی حکّام کی پہلی نسل ابھی اپنا کام ختم بھی نہیں کر پائی تھی کہ یہ دونوں قدیم ادارے یعنی میراثی کسان اور گانو پنچایتیں قریب قریب ختم ہو گئیں۔ ہر کسان کے ساتھ علاحدہ علاحدہ تصفیہ کرنے اور ان پر ایسا محصول عائد کرنے کے مصمّم ارادے نے جس پر ہر بندوبست کے موقعے پر نظر ثانی کی جا سکے گانو پنچایتوں کو کمزور اور میراثی حقوق کو ختم کر دیا۔ کوئی غیر جانب دار مورّخ مرہٹوں کی حکومت اور اُن کی جنگوں کے لامتناہی سلسلے کا مقابلہ انگریزی راج اور اُس امن و امان سے نہیں کرتا ہے جو اُس راج میں لوگوں کو نصیب ہے۔ اس کے ساتھ ہی کوئی غیر جانب دار مورّخ اس بات پر بھی افسوس ظاہر کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ حکومت خود اختیاری کے پُرانے ادارے ختم ہو گئے، کسانوں کے قدیم حقوق چھن گئے اور اس کے نتیجے میں زمین پر زیادہ بوجھ پڑنے لگا۔ یہ سب کچھ ہندوستان میں قایم ہونے والے انگریزی راج کے نتیجے میں ہوا۔ کسی ملک کے حکومت خود اختیاری کے مقامی اداروں کو ختم کرنا غیر

---

[۱۵] کیپٹن رابرٹسن کی رپورٹ، مورخہ ۱۰/ اکتوبر 1821ء۔

[۱۶] چیپلن کی رپورٹ، مورخہ ۲۰/ اگست 1822ء۔

دانشمندی ہے۔ اور یہ پالیسی خاص طور پر احمقانہ ہوگی اگر اس پر ایک ایسی بدیسی حکومت عمل کرے جو لوگوں کے قدرتی رہنماؤں اور نمائندوں کے ذریعے اُن سے رابطہ قایم کرسکتی ہے۔ دکن کی فتح کو بیاسی سال گزر چکے ہیں مگر اس دیہی حکومت خود اختیاری کے طریقے کے بجائے جس کی نمائندگی گانو پنچایتیں کرتی تھیں کسی دوسرے طریقے کو رواج نہیں دیا جاسکا ہے۔

دکن کی فتح کے فوراً بعد مختلف اضلاع میں عارضی بندوبست کیے گئے بمبئی سول سروس سے تعلق رکھنے والے پرنگل (Pringle) نے 1824ء اور 1828ء کی درمیانی مدت میں باضابطہ پیمائش کی بُنیاد پر بندوبست شروع کیا۔ لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کی تشخیص کی بُنیاد کھیتوں کی پیمائش اور مختلف قسم کی زمینوں کی پیداوار کا تخمینہ تھا۔ حکومت کا مطالبہ پیداوار کا 55 فیصدی مقرر کیا گیا تھا لیکن پیمائش ٹھیک ڈھنگ سے نہیں کی گئی تھی، پیداوار کا تخمینہ غلط تھا، شرح مالگزاری بہت زیادہ تھی اور اس بندوبست نے لوگوں کے دُکھوں میں اضافہ کر دیا تھا۔ تباہ حال کسانوں سے زیادہ سے زیادہ وصولیابی کے لیے ہر قانونی اور غیر قانونی طریقہ استعمال کیا جاتا تھا۔ اگر وہ مطالبہ پورا نہیں کرتے تھے یا نہیں کرسکتے تھے تو ان کو جسمانی سزائیں دی جاتی تھیں۔ بہت سے کسان اپنا گھر بار چھوڑ کر بھاگ گئے اور پڑوس کی دیسی ریاستوں میں امان لی۔ بڑے بڑے علاقے بنجر ہوگئے اور بعض اضلاع میں قابلِ کاشت زمین کا مشکل سے ایک تہائی حصہ زیرِ کاشت رہ گیا[1]۔"

1835ء میں گولڈس مِڈ (Golds Mid) اور لفٹیننٹ ون گیٹ (Lieutenant Wingate) نے دوبارہ پیمائش شروع کی اور اُنھوں نے اُس طریقے کی بُنیاد ڈالی جس پر آج بھی بمبئی کا نظام مالگزاری قایم ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح 1833ء سے شمالی ہندوستان کا موجودہ طریقہ مال گزاری شروع ہوتا ہے اسی طرح بمبئی کا موجودہ طریقہ 1835ء سے شروع ہوتا ہے۔ ان تاریخوں سے بمبئی اور شمالی ہندوستان میں تیس سال کی طویل مدت کے لیے بندوبست کیے جانے لگے۔

گولڈس مِڈ اور ون گیٹ نے ایک سیدھا سادھا طریقہ اختیار کیا تھا۔ اُنھوں نے زمین کی نوعیت کے اعتبار سے اس کو نو درجوں میں بانٹ دیا تھا۔ وہ ضلع کے حالات اور اس کی گذشتہ تاریخ کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے بعد مالگزاری کی تشخیص کیا کرتے تھے۔ مالگزاری تشخیص کرنے کے بعد وہ مجموعی مطالبے کو ضلع کے گانوؤں اور کھیتوں پر تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ اس کے بعد ہر کھیت کے مالک سے کہا

---

[1] بمبئی کے نظم ونسق کی رپورٹ برائے 73-1872ء ص 41۔

جاتا تھا کہ وہ کھیت پر تشخیص ہونے والے زمین کے محصول کی ادائیگی کے بعد اپنے کھیت میں کاشت کر سکتا ہے۔" حاکم پیمائش کسان کو عذر داری کا موقع دیے بغیر مالگزاری کا تعین کر دیا کرتا تھا اور جب وہ شرح تشخیص نافذ ہو جایا کرتی تھی تو کلکٹر ہر کھیت کے مالک کو طلب کرتا تھا اور بتاتا تھا کہ آئندہ اس کے کھیت پر اس شرح کے مطابق تشخیص مالگزاری کی جائے گی۔ اگر وہ ان شرائط پر کھیت اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا تو رکھ سکتا تھا۔ شرائط منظور نہ کرنے کی صورت میں وہ اس سے دست بردار ہو سکتا تھا۔[1]"

اس سیدھے سادے طریقے سے یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ دکن کی گانو پنچایتیں بالکل نظر انداز کر دی گئی تھیں اور میراثیوں کا یہ حق چھن گیا تھا کہ وہ معینہ مالگزاری ادا کرنے کی صورت میں موروثی زمین پر قابض و دخیل رہ سکتے ہیں۔ برطانوی حکّام نے ہر کسان سے انفرادی طور پر بندوبست کرنا مناسب سمجھا اور انھوں نے ہر کھیت پر اپنی مرضی کے مطابق زمین کا محصول عائد کیا۔ مالگزاری کی نئی تشخیص بھی کسی نہ کسی حد تک قیاسی اور غیر یقینی تھی۔ اس میں بھی وہ عناصر موجود تھے جنھوں نے شمالی ہندوستان کے طریقہ بندوبست کو ناکام بنا دیا تھا۔ حاکم بندوبست کی سخت گیری یا اعتدال پسندی کی بنیادوں پر اس میں تبدیلیاں ہو سکتی تھیں۔ قلّت کے زمانے میں ایک بندوبست میں اعتدال سے کام لیا جا سکتا تھا لیکن خوشحالی کی ہلکی سی جھلک دوسرے بندوبست کے موقع پر سختی کا باعث بن سکتی تھی۔ جب تک حکّام بندوبست کو بار بار ہونے والے بندوبستوں کے موقعوں پر اپنی صوابدید پر زمین کے محصول میں تبدیلی کرنے کا اختیار حاصل تھا اس وقت تک زرعی دولت پس انداز کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ جب سرکاری مطالبے میں من مانے اضافے کے خلاف کسان کا تحفّظ نہ کیا جا سکا تو ان کی حالت میں کسی سُدھار کی توقع کس طرح کی جا سکتی تھی۔

مالگزاری کے صدر بورڈ (Sadar Board of Revenue) اور حکومتِ ہند نے رعیت داری بندوبست کے طریقے کی اس خرابی کو محسوس کیا جس کی بدترین صورت مدراس میں دیکھی جا سکتی تھی۔ سر ٹامس منرو کے انتقال کے دس سال بعد مدراس میں بڑا انتشار پھیل گیا تھا۔ شرح تشخیص میں اضافہ کیا گیا، اس کے بعد کمی کی گئی اور پھر اضافہ کیا گیا۔ ایک تو غیر یقینی حالات اور پھر اس میں بھاری شرح تشخیص کی خرابی شامل ہو گئی تھی۔ مالگزاری کا بھاری مطالبہ پورا نہیں کیا جا سکتا تھا اور کبھی پورا کیا بھی نہ جا سکا۔ کسان پس کے رہ گئے تھے اور علاقے میں بڑے پیمانے پر بے چینی پھیل گئی تھی۔ اسی طریقے کے خلاف

---

[1] گولڈس مڈ کی شہادت ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کی چوتھی رپورٹ، 1853ء، ص 141۔

مالگزاری کے صدر بورڈ نے آواز اُٹھائی۔

صدر بورڈ کے مراسلے کی ایک نقل بمبئی بھیجی گئی۔ حالانکہ اس میں ذکر تو مدراس میں پائی جانے والی خرابیوں کا تھا مگر رعیت واری طریقے پر بھی تنقید کی گئی تھی چونکہ گولڈسمڈ اور ونگیٹ رعیت واری طریقے کو بمبئی میں رائج کر رہے تھے اس لیے انھوں نے اس کی حمایت کی۔ 17/اکتوبر 1840ء کو انھوں نے ایک خط لکھا جس میں نہایت قابلیت کے ساتھ ثابت کر دیا تھا کہ مدراس کی خرابیوں کی بُنیاد رعیت واری طریقے کے بجائے محصول کی بھاری شرح تھی۔ انھوں نے نہایت وثوق کے ساتھ کہا تھا کہ رعیت واری طریقے پر اگر ٹھیک سے عمل کیا جائے تو وہ لوگوں کے لیے اُتنا ہی مفید ثابت ہو سکتا ہے جتنا مرٹنس برڈ کا وہ طریقہ جس کو اس نے شمالی ہندوستان میں رائج کیا تھا۔ اس اہم خط کے کچھ اقتباسات سے شمالی ہندوستان، مدراس اور بمبئی کے مالگزاری کے ان طریقوں پر روشنی پڑتی ہے جو اس وقت تشکیلی دَور سے گزر رہے تھے۔

"شمالی مغربی صوبجات میں زمین کا محصول زمینداریوں پر تشخیص کیا جاتا ہے جو متعدد کھیتوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اس کے برخلاف یہاں تشخیص علاحدہ علاحدہ کھیتوں پر کی جاتی ہے۔ زمینداری ایک گانو پر یا، جیسا کہ عام طور سے دیکھنے میں آتا ہے، گانو کے ایک حصّے پر یا کئی گانوؤں یا کئی گانوؤں کے حصّوں پر مشتمل ہو سکتی ہے۔ یہ زمینداری کسی ایک فرد کی ملکیت ہونے کے بجائے عام طور سے کئی افراد کی ملکیت ہوتی ہے جو مشترکہ طور سے زمین کے محصول کی ادائیگی کے ذمّہ دار ہوتے ہیں۔ یہ محصول پوری زمینداری پر تشخیص کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس دکن میں اس وقت زمین اوسط رقبہ کے کھیتوں میں بٹی ہوئی ہے جن پر ایک آدمی آسانی سے کاشت کر سکتا ہے ہم نے کھیتوں کی تقسیم کے اس طریقے کو بندوبست میں برقرار رکھا ہے اور علاحدہ علاحدہ ہر کھیت پر محصول تشخیص کیا ہے۔"

"..... ہمارا خیال ہے کہ زمین پر حق ملکیت کو ختم کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ مالگزاری اتنی زیادہ تشخیص کی جائے کہ وہ پورے لگان پر مشتمل ہو۔ اگر مالگزاری سے لگان کی رقم زیادہ ہوگی تو لگان کا باقی ماندہ حصّہ زمین کی قیمت بڑھا دے گا اور مالک اُسے بٹائی پر دے سکے گا یا فروخت کر سکے گا جس کے لیے وہ مالکانہ حیثیت حاصل کرتا ہے۔ ہم اس امر کی تحقیقات کو ضروری نہیں سمجھتے ہیں کہ سر ٹامس منرو نے حقیقی مالکان کے حقوق کو نظر انداز کیا یا نہیں۔ نہ ہمیں اس امر کی تحقیقات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس نے اُن لوگوں کے نام زمین درج کر دی جو واقعی اس پر قابض تھے اور اس طرح مالگزاری کی ادائیگی کی ذمّہ داری ان پر عائد ہو گئی۔ لیکن ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ

ہمارے بند وبست میں تمام موجودہ حقوق ملکیت کو تسلیم کیا گیا ہے اور مالک کو پوری آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنی شرائط پر زمین شکمی کو اُٹھادے اور مالک اپنے اس حق کو ہر جگہ استعمال کرتے ہیں"۔

"11۔۔۔۔۔ دکن کے ان حصوں میں جہاں بند وبست کا کام ہو رہا ہے ہم نے زمین کو نو درجوں میں تقسیم کرنے کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ اُن میں سے ہر ایک کی بُنیاد زمین کی مختلف خصوصیت قرار دی گئی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ درجہ بندی کافی ہے"۔

"15۔۔۔۔۔ کسانوں کی موجودہ حالت گانوؤں کی کیفیت، حکومت کے مطالبے کی وصولی، پیداوار کی قیمتیں اور اسی قسم کے دوسرے اُمور کا گذشتہ برسوں سے مقابلہ کرکے[1] ہم نے آئندہ کام کے لیے میدان تیار کرلیا اور اس کی بُنیاد پر ہم نے موجودہ جمع بندی میں اس حد تک تخفیف یا اضافہ کیا جس کو ہم نے معقول اور اطمینان بخش سمجھا"۔

"39۔ بورڈ نے اپنے مراسلے کے آخر میں رعیت داری طریقے کی ان خرابیوں کا مفصّل ذکر کیا ہے جو اس کی رائے میں اس طریقے کا لازمی جُز ہیں اور جن کا ثبوت مدراس کے تباہ حال اضلاع پیش کرتے ہیں۔ اس نے ان اضلاع کا مقابلہ شمال مغرب صوبجات کی خوشحالی سے کیا ہے جو اسے حالیہ بند وبست کے تحت حاصل ہے۔ ان اُمور کی بنا پر وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ گانو کے ساتھ بند وبست کرنے کا طریقہ بدرجہا بہتر ہے۔ لیکن ہماری حقیر رائے میں شمالی مغربی صوبجات کی خوشحالی کی وجہ یہ ہے کہ سرکاری مطالبہ مقرر کرنے میں اعتدال سے کام لیا گیا ہے۔ مدراس کی بدحالی، جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، بھاری اور غیر منصفانہ شرح تشخیص کا نتیجہ ہے"۔

"44۔ ہمارا یہ بھی خیال ہے کہ قومی خوشحالی کے بہت سے اہم عناصر کا تحفظ وہ بند وبست کرتا ہے جس کو دکن میں رواج دیا جا رہا ہے۔ ذیل میں اُن کی تفصیل پیش کی جا رہی ہے۔ مالگزاری کی ساوی شرح اعتدال پر مبنی ہے جس کی بنا پر لگان کا ایک متناسب حصّہ مالک یا قابض کو ملتا ہے۔ بند وبست تیس سال کے لیے کیا گیا ہے۔ بند وبست کی مدّت کے دوران کسی بنا پر مطالبے میں اضافے کے خلاف

---

[1] کسانوں کو دولت پس انداز کرنے اور خوشحال زندگی گزارنے سے محروم رکھنے کا اس سے بہتر کوئی اور طریقہ نہیں ہو سکتا تھا کہ افسران بند وبست کو اس امر کا مجاز کر دیا جائے کہ وہ "کسانوں کی موجودہ حالت وغیرہ" کی بنا پر مالگزاری میں تخفیف یا اضافہ کر سکیں۔ جب بھی خوشحالی کے آثار نظر آتے تھے تو مالگزاری میں اضافہ کر دیا جاتا تھا۔ ایسی حالت میں زمین کو ترقی دینے یا دولت پس انداز کرنے کا کوئی محرک یا امکان تھا ہی نہیں۔

کسان کا تحفظ کیا گیا ہے۔ اس کا انتظام کیا گیا ہے کہ زمین کی ترقی کے فائدے ترقی دینے والوں کو حاصل ہوں مشترک ذمہ داری کو اُن چند صورتوں تک محدود کر دیا گیا ہے جہاں کھیت کی ملکیت مشترک ہو اور شرکا نے اس کا بٹوارہ کر لیا ہو۔ زمین کی ملکیت کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ مالکان کو شکمیوں سے لگان طے کرنے اور زمین فروخت کرنے کی پوری آزادی دی گئی ہے۔ زمین کو بیع یا ہبہ کرنے کی سہولت مہیا کرنے کے لیے کھیتوں یا زمین کے ایسے چھوٹے چھوٹے قطعوں پر مالگزاری تقسیم کر دی گئی ہے جو اس ملک کے مالکان آراضی کے حالات کے مطابق اسی طرح منتقل کیے جا سکتے ہیں۔ صرف مزروعہ آراضی پر مالگزاری لگائی گئی ہے اور اس طرح کسان کو موقع دیا گیا ہے کہ اپنے وسائل کے پیش نظر وہ اور زمین حاصل کرے اور اس پر کاشت کرے۔ اس ملک میں اس قسم کے حق کو بڑی اہمیت حاصل ہے جہاں کسان کے ہاں نہ صرف سرمائے کی کمی ہے بلکہ جو کچھ ہے وہ بھی غیر یقینی موسموں کی بنا پر کم زیادہ ہوتا رہتا ہے[1]۔"

اس رپورٹ اور اسی قسم کی دوسری رپورٹوں کی بُنیاد پر جان ویبارٹ (John Vibart) نے حکومت بمبئی کو ایک خط لکھا جس میں بمبئی کے طریقے پر بورڈ آف ریونیو کے عائد کردہ الزامات کی تردید کی گئی تھی۔ ویبارٹ یہ بات آسانی سے ثابت کر سکا کہ تشخیص مالگزاری میں بمبئی کے حکام نے اُنہی اصولوں پر عمل کیا ہے جن پر شمالی ہندوستان کے افسروں نے عمل کیا تھا[2]۔ واقعہ یہ ہے کہ ان خطوط کو پڑھنے کے بعد قاری کے ذہن پر پہلا اثر یہ پڑتا ہے کہ بمبئی میں تشخیص مالگزاری اگر بربنائے قیاس کی گئی تھی تو شمالی ہندوستان میں بھی تشخیص کی بُنیاد قیاس پر قایم تھی شمالی ہندوستان کی بمبئی سے برہمی ایسی تھی۔ جیسے شیطان گناہ کی مذمت کرے۔ اس کے باوجود ان دونوں میں ایک بُنیادی فرق بھی تھا شمالی ہندوستان میں مالگزاری کی تشخیص پوری زمینداری یا گانو پر کی گئی تھی اور زمینداری کے مالک یا گانو کے رہنے والے قیاسی تشخیص غلط ثابت ہونے کی صورت میں اس کے خلاف مشترکہ احتجاج کر سکتے تھے لیکن بمبئی میں علاحدہ علاحدہ کھیتوں پر مالگزاری تشخیص ہوئی تھی۔ حاکم بندوبست کا قیاس غلط ثابت ہونے کی صورت میں ایک کھیت جوتنے والا بیچارہ کسان دادرسی کی توقع کس طرح کر سکتا تھا۔

قارئین ان دونوں صورتوں کے باہمی فرق کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ ایک صوبے میں گانو پنچایتیں

---

[1] ایچ۔ ای۔ گولڈسمڈ اور جی۔ وِن گیٹ کا خط پونا کے ریونیو کمشنر جان ویبارٹ کے نام، مورخہ 17 / اکتوبر 1840ء۔

[2] ویبارٹ کا خط حکومت بمبئی کے نام، مورخہ 15 / فروری 1841ء۔

اور موروثی زمینداری کے قدیم اداروں کو برقرار رکھا گیا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ بڑی حد تک مخلوج ہو گئے تھے۔ دوسرے صوبے میں انھیں حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا گیا تھا یا نظر انداز کیا گیا تھا اور ایک مطلق العنان حکومت ہر کھیت جوتنے والے کے ساتھ تصفیہ کرنا چاہتی تھی۔ کم نظر مصنفین عام طور سے ہندوستان کے زمینداروں کو زمین کے بوجھ سے تعبیر کیا کرتے ہیں لیکن وہ اہلِ فکر حضرات مختلف رائے ظاہر کرتے رہے ہیں جنھوں نے ہندوستان کے معاشی اور سماجی حالات کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ ایک بدیسی حکومت اور ایسی زراعت پیشہ قوم کے درمیان جسے نمائندگی حاصل نہ ہو، ایک با اثر طبقے کی موجودگی کے سیاسی فوائد کے علاوہ ملک سے تعلق رکھنے والے اُن لوگوں کی رائے اور اُن کا اثر نظم و نسق کو سدھار سکتا ہے، اس کی غلطیوں کا تدارک کر سکتا ہے، اس کی مطلق العنانیت میں مزاحم ہو سکتا ہے اور اس کے اور عام لوگوں کے درمیان رابطہ پیدا کر سکتا ہے۔ بمبئی اور مدراس کے مقابلے میں شمالی ہندوستان کا نظام مالگزاری زیادہ کامیاب تھا اور وہاں شرح تشخیص کم تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شمالی ہندوستان میں با اثر رہنما اور طبقے موجود تھے۔ اُنھوں نے اپنی بات حکومت تک پہنچائی، اس پر اثر انداز ہوئے اور محصول کی مناسب شرح مقرر کروائی۔ مدراس اور بمبئی میں نہایت افسوسناک غلطی یہ کی گئی کہ نظم و نسق کو بہتر بنانے کے لیے گانو پنچایتوں، پولی گروں اور جاگیرداروں کی حمایت حاصل کرنے کے بجائے یا تو انھیں نظر انداز کیا گیا یا صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا۔

گولڈس بڈ اور وِن گیٹ نے خود کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے کہا تھا "مالگزاری ادا کرنے کی مشترک ذمہ داری اور گانو کا مشترک انتظام غالباً دکن میں عام طور سے پایا جاتا تھا لیکن ہمیں مشترک ملکیت کا کوئی ثبوت نہیں ملا"۔ اس سے برطانوی حکومت کو بہت فائدہ پہنچتا اگر گانو پنچایتوں کے ذریعہ وہ "گانو کا مشترک انتظام" برقرار رکھا جاتا جو دکن میں عام طور سے پایا جاتا تھا اور اس کو ترقی دی جاتی۔ سر جارج وِن گیٹ جیسے عظیم اور نیک طبیعت انسان کی تعریف تاریخ کا ہر طالب علم کرتا ہے پھر بھی یہ افسوسناک واقعہ کسی سے چھپا ہوا نہیں ہے کہ اس نے گانو پنچایتوں کو نظر انداز کر کے اور لاکھوں کسانوں کے ساتھ لاکھوں کھیتوں کا بندوبست کر کے ایسی غلطی کی جس کے نتائج خطرناک ثابت ہوئے۔ مدراس کے ریونیو بورڈ نے اس کے خلاف 1818ء میں مدراس میں احتجاج کیا تھا مگر وہ بے سود ثابت ہوا تھا۔ صدر بورڈ نے ایک دفعہ پھر 1836ء میں اس کے خلاف احتجاج کیا مگر یہ احتجاج بھی بے سود ثابت ہوا۔

اس واقعہ کے پندرہ سال بعد ایک بڑے حاکم یعنی بمبئی کے ایک گورنر کو ہاؤس آف لارڈز اور ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹیوں کے سامنے شہادت دینی پڑی۔ اس نے بڑی جرأت سے کام لیتے ہوئے اپنے بیان میں کہا تھا کہ جہاں جہاں گانو پنچایتوں اور زمینداروں کو ختم کر کے رعیت واری طریقہ رائج کیا

گیا ہے وہاں کے کسان تباہ ہو گئے ہیں۔ سرجارج کلرک (Sir George Clerk) کی شہادت اتنی واضح اور مدلل ہے کہ اس کے کچھ اقتباسات پیش کرنا ضروری ہے۔

سوال ـــ عام لوگوں کے لیے زمین کے انتظام کا کون سا طریقہ زیادہ مفید ہے ـــ کسانوں کے ذریعے یا زمینداروں کے ذریعے۔

جواب ـــ دونوں کے اپنے اپنے فائدے ہیں لیکن رعیت واری طریقہ ملک کے لیے تباہ کن ہے۔

سوال ـــ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہماری سلطنت کی زیادہ تر آبادی مفلس ہے ...؟

جواب ـــ یوں کہنا چاہیے کہ صرف ان علاقوں میں جہاں رعیت واری بندوبست کیا گیا ہے۔

مندرجہ بالا شہادت 1852ء میں ہاؤس آف لارڈز کی کمیٹی کے سامنے دی گئی تھی۔ اسی گواہ نے اگلے سال ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کے سامنے رعیت واری طریقے کی خرابیاں زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیں۔

سوال ـــ کیا آپ رعیت واری طریقے کا اصول چند الفاظ میں بیان کر سکتے ہیں؟

جواب ـــ اس طریقے میں تمام تفصیلات پر غور کرنے کے بعد انفرادی کسانوں کی زمینوں پر مالگزاری تشخیص کی جاتی ہے۔ یہ مالگزاری براہ راست حکومت تشخیص کرتی ہے جس کی وجہ سے، جیسا کہ ہمارے علم میں ہے، وہ ابھی تک مفلس ہیں۔ اُن کے اور حکومت کے درمیان کوئی اور نہیں ہوتا۔

سوال ـــ تو رعیت واری طریقے کے متعلق آپ کا خیال ہے کہ اس سے نہ حکومت کو فائدہ پہنچتا ہے اور نہ دیسی لوگوں کو؟

جواب ـــ اس میں کوئی شک نہیں۔ اُن میں کوئی مالکان اراضی نہیں ہیں جو سرمایہ اکٹھا کر سکیں۔ اُن لوگوں کا تعلق اس طبقے سے ہے جو کسی ملک میں دولت پس انداز نہیں کرتا ہے۔ وہ محض کسان ہیں۔

سوال ـــ شمال مغربی صوبجات میں مالگزاری کا کون سا طریقہ رائج ہے؟

جواب ـــ وہاں نیا بندوبست ہوا ہے جس میں مختلف حیثیتوں کے زمینداروں کو طویل المدّت پٹّے دیے گئے ہیں۔ کچھ مُسلم گاؤں پٹّے پر دیے گئے ہیں۔ دوسروں کو مشترکہ طور پر گاؤں پٹّے پر اُٹھائے گئے ہیں۔

سوال ـــ کیا وہ بندوبست اس اصول کے مطابق ہوا ہے جس کی سفارش مسٹر برڈ نے کی تھی؟

جواب ـــ جی ہاں لیکن یہ اصول نیا نہیں ہے۔ یہ مسٹر برڈ سے بہت پہلے بھی موجود تھا۔ ہندوستان میں تشخیص مالگزاری کا یہ قدیم طریقہ تھا۔

سوال ـــ کیا آپ کے خیال میں اُس میں کامیابی ہوئی ہے؟

جواب ـــــ میرے خیال میں یہ طریقہ اُس صورت میں بہت کامیاب ثابت ہوتا ہے جب آپ گانوؤں کے سربراہوں کے ساتھ مالگزاری کی تشخیص کا ٹھیکہ کرتے وقت زمینداروں کے حقوق کی خلاف ورزی نہ کریں۔

سوال ـــــ فصلیں خراب ہو جانے کی صورت میں کیا زمیندار عام طور سے کسانوں کی امداد کیا کرتے ہیں؟

جواب ـــــ جی ہاں۔

سوال ـــــ وہ کس طرح اُن امداد کرتے ہیں؟

جواب ـــــ وہ انھیں روپیہ دیتے ہیں یا بیج، غلّہ اور بیل مہیّا کیا کرتے ہیں۔ گانو یا زمینداری بندوبست سے یہ فائدہ ہے۔

سلیکٹ کمیٹی کے ممبروں میں کابڈن اور جوزف ہیوم جیسی نمایاں شخصیتیں شامل تھیں۔ گواہ نے اُن لوگوں کے سوالوں کے جواب میں جو بیان دیے اُن کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

مسٹر کابڈن ـــــ آپ نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ بمبئی کے رعیت واری طریقے کی ایک دشواری یہ ہے کہ دیسی لوگ عام طور سے بد دیانت ہوتے ہیں اور یہ خرابی بڑے پیمانے پر پائی جاتی ہے اور یورپین حکام کی خدمات حاصل نہ ہونے کی صورت میں قابلِ اعتماد افسر میسّر نہیں آتے ہیں۔ کیا آپ اپنے اس بیان میں اور اس بیان میں مطابقت پیدا کرسکتے ہیں جو آپ نے شہادت کے ابتدائی حصّے میں دیا تھا اور جس میں ہندوستانیوں کے عام اخلاق اور ان کی راست بازی کا ذکر کیا تھا۔

جواب ـــــ میں نے یہ نہیں کہا ہے کہ بد دیانتی بڑے پیمانے پر پائی جاتی ہے۔ میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا۔ میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ روپیہ کم ہونے کی وجہ سے دوسرے افسروں کی خدمات حاصل نہ کرسکنے کی صورت میں ہمیں کم تنخواہ پانے والے جن دیسی لوگوں کو استعمال کرنا پڑتا ہے اُن پر مالگزاری کی رقم کے جائز استعمال اور رعیت واری طریقے کی جزویات کے عمل درآمد کے سلسلے میں اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

سوال ـــــ اگر عام لوگ راست گو اور ایماندار ہیں تو دیانت دار کارکن تلاش کرنے میں آپ کو کیا دشواری پیش آتی ہے؟

جواب ـــــ آپ اُن پر بہت زیادہ ذمّہ داریاں ڈال دیتے ہیں جن کی وجہ سے انھیں بہت محنت کرنی پڑتی ہے لیکن اُنھیں ایسی معقول تنخواہیں نہیں دیتے ہیں جو اُن کی گزر بسر کے لیے کافی ہوں۔

مسٹر ہیوم ـــــ آپ کا کہنا ہے کہ موجودہ رعیت واری طریقے نے کسانوں کو بھیک مانگنے پر مجبور کر دیا ہے لیکن گانو کے طریقے کو اپنانے کے بارے میں آپ نے شکوک کا اظہار کیا ہے۔ کیا بمبئی کے کسانوں کی حالت سدھارنے کے لیے آپ کسی دوسرے طریقے کی سفارش کرسکتے ہیں۔

جواب ـــــ میرا خیال ہے کہ میں نے گانو کے طریقے کے متعلق شکوک کا اظہار نہیں کیا ہے۔ میں نے ہمیشہ اس طریقے کی وکالت کی ہے اور اس پر عمل کیا ہے[1]۔

بمبئی میں رعیت واری بند وبست ہوتا رہا۔ 1847ء میں ایچ۔ ای۔ گولڈس مڈ، کیپٹن ون گیٹ اور کیپٹن ڈیوڈسن کے دستخطوں سے وہ رپورٹ پیش کی گئی جو "مشترکہ رپورٹ" (Joint Report) کہلاتی ہے۔ اس میں بند وبست کے ضابطوں کو قطعی شکل دے دی گئی تھی۔ جس طرح شمالی ہندوستان کے بند وبست کی اساس ٹامسن کی "ہدایات برائے حکام بند وبست" تھی، جو 1844ء میں شایع ہوئی تھی، اسی طرح بمبئی کے بند وبست کی بُنیاد 1847ء کی مشترکہ رپورٹ پر قایم تھی۔

مشترکہ رپورٹ میں بمبئی کے بند وبست کے جو اصول بیان کیے گئے تھے ان میں پہلا اصول یہ تھا کہ اس بند وبست میں علاحدہ علاحدہ تشخیص مالگزاری کی گئی ہے۔

دوسری بات یہ کہی گئی تھی کہ اس بند وبست میں تیس سال کی طویل مدّت کے لیے پٹّے کیے گئے ہیں۔ تیسرا اصول یہ تھا کہ پیداوار کے تخمینے کا طریقہ ترک کر دیا گیا ہے اور زمین کی قیمت کی بُنیاد پر مالگزاری تقسیم کی گئی ہے۔

"جب تک کسان معینہ مالگزاری ادا کرتا ہے کھیت پر قبضہ رکھنے کا حق اُس سے نہیں چھینا جا سکتا حالانکہ اسے ہر کھیت کے پٹّے کی تجدید سال بہ سال کرنی ہوگی۔ اس کی تمام تر زمین کے بجائے ہر کھیت پر علاحدہ علاحدہ مالگزاری تشخیص کی گئی ہے تاکہ جب بھی حالات کے پیش نظر اس امر کی ضرورت محسوس ہو تو وہ اپنے کھیت سے دست بردار ہو سکے یا ایسے کھیت پر قبضہ کر سکے جس پر کوئی اور قابض نہ ہو اور اس طرح اپنی ذمّہ داریوں اور اُن کو پورا کرنے کے وسائل میں مطابقت پیدا کر سکے۔ تیس سال کی مدّت کے لیے کھیت کے معینہ لگان سے، جس کی بُنیاد ہماری پیمائش ہے، کسان کو تیس سال کے پٹّے کے تمام فوائد حاصل ہو گئے ہیں اور اس پر اس شرط کے علاوہ اور کوئی بار نہیں ڈالا گیا ہے کہ وہ جس سال کا معاہدہ کرے اُس سال کا سرکاری مطالبہ ادا کر دے۔ چنانچہ اسے وہ تحفظ تو حاصل ہو گیا جو طویل ترین مدّت کے پٹّے سے حاصل ہو سکتا ہے لیکن وہ اس بار او خطرے سے محفوظ رہا جن کا مقابلہ کرنے کے لیے اس کا محدود سرمایہ اور غیر یقینی حالات ناکافی ہیں[2]۔"

---

[1] ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کی پہلی رپورٹ، 1853ء، ص ص 184- 197۔

[2] مشترکہ رپورٹ، پیراگراف 9۔

زمین کی قیمت کا تخمینہ لگانے کے لیے تمام اراضی کو جن نو درجوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ وہ درجہ بندی مندرجہ ذیل نقشے میں دکھائی جا رہی ہے[1]۔

کھیتوں کی اس درجہ بندی کے بعد پورے ضلع کے لیے سرکاری مطالبے کا تعین کیا گیا تاکہ وہ مطالبہ اُن کھیتوں اور گانووں پر تقسیم کر دیا جائے جن پر ضلع مشتمل تھا۔

قسم	آنے یا روپے کے سولھویں حصّے میں قسم کی متناسب قیمت	درجہ اوّل جس کی ساخت یکساں اور نفیس ہو۔ اور گہرے سیاہ سے لے کر گہرے اودے تک رنگ ہو۔	درجہ دوم جس کی ساخت یکساں مگر ادنا قسم کی ہو اور رنگ ہلکا ہو جو عام طور سے سُرخ ہوتا ہے۔	درجہ سوم جس کی ساخت ادنا اور کنکریلی ہو یا جو آسانی سے توڑی جا سکے اور رنگ ہلکے اودے سے خاکستری تک ہو۔
		گہرائی ہاتھوں میں (ایک ہاتھ = $1\frac{1}{2}$ فٹ)	گہرائی ہاتھوں میں (ایک ہاتھ = $1\frac{1}{2}$ فٹ)	گہرائی ہاتھوں میں (ایک ہاتھ = $1\frac{1}{2}$ فٹ)
1	16	$1\frac{3}{4}$	$1\frac{3}{4}$	
2	14	$1\frac{1}{2}$	$1\frac{1}{2}$	
3	12	$1\frac{1}{4}$	$1\frac{1}{4}$	
4	10	1	1	
5	8	$\frac{3}{4}$	$\frac{3}{4}$	
6	6	$\frac{1}{2}$	$\frac{1}{2}$	1
7	$4\frac{1}{2}$	$\frac{1}{4}$	$\frac{1}{4}$	$\frac{3}{4}$
8	3			$\frac{1}{2}$
9	2			$\frac{1}{4}$

[1] مشترکہ رپورٹ، پیراگراف 42۔

"بندوبست کو مکمل کرنے کے لیے اب پورے (ضلع) پر تشخیص ہونے والی مالگزاری کی رقم کا تعین کرنا ہے۔" پیمائش کے سلسلے کا سب سے اہم اور دشوار کام رقم متعین کرنا ہے۔ اُن افسروں کو جن پر اس کام کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے بہت سوچ بچار کے بعد اور بڑی احتیاط کے ساتھ قدم اُٹھانا چاہیے۔ سب سے پہلے اُنھیں ضلع کے گذشتہ انتظامات کی نوعیت اور اُن کے اثرات کا بھرپور جائزہ لینا چاہیے۔ اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ سال بسال ہونے والے زیادہ سے زیادہ بندوبستوں کے قابل اعتماد اعداد و شمار جمع کیے جائیں اور ان کی بُنیاد پر تحقیقات کی جائے اور تقابلی مطالعہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ پیمائش کے دوران مقامی لوگوں سے بھی پوچھ تاچھ کی جائے۔"

"اس کے علاوہ گانو کی بدحالی یا ایسے علاقوں کی بدحالی کا سبب معلوم کرنے کے لیے جو کئی گانوؤں پر مشتمل ہوں سال بسال ہونے والے ہر گانوؤں کے بندوبستوں کی سالانہ روداد تیار کی جائے . . ."

"آخری بات ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس اہم موضوع کے متعلق پوری معلومات فراہم کرنے کے لیے اعداد و شمار پر مشتمل ایسی روداد تیار کی جائے جس میں اس گانو کی ہر قسم کی اراضی سے تا حال ہونے والی آمدنی کا ذریعہ اور رقم دکھائی جائے جس کی مالگزاری زیرِ تشخیص ہو، چاہے وہ زمین سرکاری ہو یا غیر سرکاری۔"

"اس طرح حاصل ہونے والی معلومات اور مقامی تحقیقات کی بنا پر ضلع کی گزشتہ تاریخ کے متعلق حاصل ہونے والی معلومات اُن وجوہ کو دریافت کرنے میں معاون ثابت ہوں گی جن کی وجہ سے گزشتہ دَور میں گانو کے حالات متاثر ہوئے تھے۔ اس قسم کی معلومات حاصل کرنے کے بعد ہمیں ضلع کی پیداواری صلاحیتوں کا مقابلہ آس پاس کے ضلعوں سے کرنا چاہیے۔ اس طرح ہم مالگزاری کی رقم کا تعین اطمینان بخش انداز سے کرسکیں گے[1]۔"

ان ضابطوں سے یہ بات اچھی طرح ذہن نشین ہوجائے گی کہ ضلع کی مالگزاری متعین کرنے کا کام کس حد تک حکّامِ بندوبست کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ نرم دل افسر کو اس کے پورے مواقع حاصل تھے کہ وہ تشخیص میں نرمی برتے اور سخت گیر افسر انتہائی سختی برت سکتا تھا۔ لاکھوں کسانوں کی قسمت کا فیصلہ مقررہ قاعدوں کے بجائے مختلف افسروں کے اختیاراتِ تمیزی پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ ضلع کی تاریخ کی بُنیاد پر ہونے والی تشخیص میں خوشحالی کے بعد مالگزاری میں اضافہ ضروری ہو جایا کرتا تھا۔

---

[1] مشترکہ رپورٹ، پیراگراف 69، 70، 72، 75 اور 76۔

زرعی خوشحالی پر زیادہ سے زیادہ محصول عائد کرنے کی صورت میں کسانوں کے لیے یہ بات ممکن نہیں رہی تھی کہ وہ زمین کو مستقل بنیادوں پر ترقی دے سکیں۔

حکومت بمبئی نے تشخیص مالگزاری کی ان خرابیوں کو محسوس کیا۔ بمبئی کے گورنر نے 16/نومبر 1847ء کی روداد میں لکھا تھا کہ "مجھے یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ اس وقت ہمیں اپنے سپرنٹنڈنٹوں کے اختیارات تمیزی پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ ہمیں ان پر آئندہ بھی اس وقت تک بھروسہ کرنا پڑے گا جب تک ریونیو کمشنر اپنے دفتری طریقے نہ بدلیں۔ ابھی تک ان کے دفتر ہمارے اور سپرنٹنڈنٹوں کے درمیان مراسلت کا صرف ایک ذریعہ ہیں"۔ لیکن اس معاملے میں ریونیو کمشنر بے بس تھے۔ بمبئی کا ونسل کے ایک رکن آنریبل مسٹر ریڈ (Hon. Mr. Read) نے 16/مئی 1848ء کی روداد میں بڑے مدلل انداز میں لکھا تھا "مجھے آنریبل صدر کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ پیمائش کے سپرنٹنڈنٹوں کو ایک حد تک اپنی صوابدید سے کام لینے کی اجازت دی جائے۔ ہمیں ان پر پورا بھروسہ کرنا پڑے گا۔ میرے خیال میں ہم کمشنروں سے اس سے زیادہ توقع نہیں کر سکتے ہیں کہ وہ ان کے کام کی عام نگرانی کرتے رہیں۔ بہت کم ریونیو کمشنروں کو ضروری معلومات حاصل ہیں اور ان میں سے کوئی اُتنا وقت نہیں دے سکتا ہے جو سپرنٹنڈنٹوں کے کام کے تفصیلی جائزے کے لیے ضروری ہے"۔

ون گیٹ کی تعریف کرنی پڑتی ہے کہ اس نے اپنے غیر محدود اختیارات کے استعمال میں اعتدال، مصلحت اور ہمدردی سے کام لیا۔ تشخیص کے سلسلے میں اس نے قیاس سے کام لینے میں بہت احتیاط برتی۔ اس کے بندوبست نے دکن کے کسانوں کو اُن بدانتظامیوں اور مظالم سے نجات دلائی جن کے وہ بیس سال شکار رہ چکے تھے۔ جس طرح شمالی ہندوستان میں رابرٹ مرٹنس برڈ کو اور مدراس میں سر ٹامس منرو کو یاد کیا جاتا ہے اسی طرح بمبئی میں سر جارج ون گیٹ کو یاد کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان کے بندوبستوں میں کوئی خرابیاں نہیں تھیں بلکہ انھوں نے ایک ایسے طریقے کی داغ بیل ڈال کر جس پر آج بھی عمل ہو رہا ہے، بدنظمیوں اور بدانتظامیوں کی جگہ ضبط و نظم قایم کیا۔

بمبئی میں انگریز افسروں کی تشخیص کردہ مالگزاری کے مالیاتی نتائج اعداد و شمار کے ذریعے زیادہ بہتر انداز سے ظاہر کیے جا سکتے ہیں۔ 18-1817ء میں پیشوا کی ریاست پر قبضے کے بعد سے 1836ء کے بندوبست تک، جو ون گیٹ نے شروع کیا تھا، بمبئی کے صوبے کے برطانوی علاقے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے باوجود فتح کے فوراً بعد مالگزاری میں اضافہ ہو گیا تھا۔

	پونڈ
1817-18ء میں مالگزاری تھی	8,68,047
1818-19ء میں مالگزاری تھی	11,43,041
1819-20ء میں مالگزاری تھی	10,78,164
1820-21ء میں مالگزاری تھی	18,18,314

دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فتح کے چار سال کے اندر صوبے کی مالگزاری، جس میں مفتوحہ علاقے کی مالگزاری بھی شامل تھی، دوگنی سے زیادہ ہوگئی تھی۔

ونگیٹ کا بندوبست جو 1836ء میں شروع ہوا تھا 1873ء میں قریب قریب مکمل ہوگیا اور مالگزاری میں (اس میں پونا اور کچھ دوسرے اضلاع کی مالگزاری شامل نہیں ہے۔ وہاں نظرثانی شدہ بندوبست کیا جا چکا تھا) 32 فیصدی اضافہ ہوا یعنی 15,34,000 پونڈ سے بڑھ کر 20,32,000 پونڈ ہوگئی۔ مختلف اضلاع کے اعداد و شمار درج ذیل ہیں۔

ضلع	بندوبست سے پہلے کی مالگزاری	بندوبست کے تحت مالگزاری
	پونڈ	پونڈ
تھانہ	1,66,287	2,11,037
خاندیش	2,15,946	3,07,869
رتناگیری	46,440	46,572
احمد آباد	53,752	90,474
کیرا	1,44,886	1,88,752
سُورت	1,74,081	2,40,134
بروچ	88,984	1,12,564
پنچ محل	4,825	8,155
کراچی	19,404	31,676
حیدرآباد	63,330	77,353

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

ضلع	بندوبست سے پہلے کی مالگزاری	بندوبست کے تحت مالگزاری
شکارپور	1,23,931	1,59,263
دھاروار	1,13,039	1,56,562
بیلگام	1,30,744	1,57,026
کرشناگیری	30,555	58,283
ستارا	1,43,656	1,58,543
کنارا	14,850	27,788
میزان[1]	15,34,710	20,32,051

[1] بمبئی انتظامی رپورٹ سے مرتب کیے گئے، برائے 73-1872ء، ص ص 49 اور 50- ایک پونڈ کو دس روپے کے برابر تسلیم کیا گیا۔

باب 5

مدراس کے بندوبست

ایسٹ انڈیا کمپنی کا 1792ء میں بارہ محل کے اضلاع پر قبضہ ہوگیا تھا کیپٹن ریڈ اور ٹامس منرو نے ان اضلاع میں رعیت واری بندوبست یا زمین جوتنے والوں سے مالگزاری کا بندوبست کیا۔ رفتہ رفتہ یہ بندوبست صوبہ مدراس کے دوسرے حصّوں میں بھی رائج ہوگیا۔ پہلے پہل مالگزاری کی تشخیص میں بڑی سختی برتی گئی تھی۔ سرکاری مطالبہ کھیت کی تخمینی پیداوار کا نصف مقرر کیا گیا تھا۔ یہ مطالبہ ملک میں پائے جانے والے معقول لگان سے بھی زیادہ تھا۔ ٹامس منرو نے اس کو محسوس کیا اور 1807ء میں سفارش کی کہ سرکاری مطالبے میں کمی کرکے اسے پیداوار کا ایک تہائی کر دیا جائے۔ حکومت مدراس نے اس تجویز کی معقولیت کو تسلیم کیا لیکن چونکہ کمپنی کے ڈائرکٹرز روپے کا مطالبہ کر رہے تھے اس لیے وہ اس تجویز پر عمل نہ کر سکی۔ انگلستان سے احکام صادر ہوئے کہ ایک ملین پونڈ کی مزید رقم وہاں بھیجی جائے۔ ڈائرکٹروں نے یہ دھمکی بھی دی تھی کہ حکم عدولی کی صورت میں مطلے میں تخفیف کرنے کے سلسلے میں وہ اپنے اختیارات خصوصی استعمال کریں گے۔ چنانچہ مدراس کے کسانوں کا بوجھ ہلکا نہیں کیا جا سکا۔

1808ء اور 1818ء کی درمیانی مدّت میں مدراس کے ریونیو بورڈ نے صوبے کی گانو پنچایتوں کو تسلیم کرنے کی دانشمندانہ تجویز پیش کی۔ اُس نے سفارش کی کہ ہندوستان کے قدیم رواج کے مطابق ان اداروں کے ساتھ مالگزاری کا بندوبست کیا جانا چاہیے۔ اُس نے اپنے تجربے کی بنا پر بتایا کہ گانو کا بندوبست جہاں جہاں کیا گیا ہے وہاں اُسے کامیابی حاصل ہوئی ہے اور انفرادی کسانوں کے ساتھ بندوبست ہمیشہ ناکام رہا ہے۔ لیکن کمپنی کے مطلق العنان حکومت نمائندہ حیثیت رکھنے والی گانو پنچایتوں کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ ڈائرکٹروں نے فیصلہ کیا کہ کسی درمیانی شخص یا اشخاص کی وساطت کے بغیر کسانوں

ے انفرادی بُنیاد پر تصفیہ کیا جائے۔ اسی تاریخ سے مدراس کی قدیم گانو پنچایتوں کا زوال شروع ہوگیا۔

1820ء سے 1827ء تک سر ٹامس منرو مدراس کا گورنر رہا اور اس زمانے میں صوبہ مدراس کے ان حصوں میں رعیت واری بندوبست رائج کر دیا گیا جہاں زمینداروں کے ساتھ بندوبست استمراری نہیں ہوا تھا۔ منرو اپنی پہلی تجویز کی حد تک سرکاری مطالبے میں تخفیف کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کے اس ہمدردانہ اقدام اور اُن تھک نگہداشت نے بہت سی خرابیوں کی اصلاح کر دی۔

لیکن سر ٹامس منرو کا تخفیف شدہ مطالبہ بھی بہت زیادہ سمجھا گیا۔ بہت سے کھیتوں اور گانوؤں کی حد تک کھیت کی پیداوار کا ایک تہائی حصّہ تمام معقول لگان کی نمائندگی کرتا تھا۔ سالانہ پیداوار یا اس زمانے کی قیمتوں پر غور کیے بغیر مالگزاری ایک معینہ رقم کی صورت میں طلب کی جاتی تھی۔ مالگزاری کی وصولی بھی گانو کے بزرگوں یا گانو کے اداروں کے بجائے کم تنخواہیں پانے والے سرکاری ملازموں کے ذریعے کی جاتی تھی جن کی سختی اور بددیانتی کسانوں کے دُکھوں میں اضافہ کر دیتی تھی اور جب سر ٹامس منرو کو جس نے ہر کام میں نظم و ضبط پیدا کر دیا تھا اور جو ہر چیز پر نظر رکھا کرتا تھا موت کے ظالم ہاتھوں نے منظرِ عام سے ہٹا دیا تو اس طریقے کی دشواریاں زیادہ محسوس کی جانے لگیں تیس سال تک مدراس کے کسانوں کو ایسے دُکھ جھیلنے پڑے جن کی مثال خود اس دَور کا ہندوستان بھی نہیں پیش کر سکتا۔

اضلاع کے کلکٹروں نے اُن دُکھوں کی شہادت دی جو اُن کے گرد و پیش پھیلے ہوئے تھے۔ اُن کی رپورٹوں[1] کے کچھ اقتباسات سے لوگوں کی حالت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ضلع کڈپا ـــــ کلکٹر نے 1828ء میں بورڈ آف ریونیو کو لکھا تھا "کسان کس حد تک تاجروں کے جال میں پھنس چکے ہیں اس بات کو شاید آپ سُننا بھی پسند نہیں کریں گے . . . . . کسان اتنے غریب ہیں کہ وہ تقاوی کی مدد سے بھی صرف اس صورت میں کاشت جاری رکھ سکتے ہیں جب انھیں کسی بڑے نقصان کا سامنا کرنا پڑے۔ اگر اُن کا جانور مرجائے یا اسی قسم کا کوئی دوسرا نقصان ہوجائے تو اس کی تلافی تقاوی کی مدد کے بغیر ممکن نہیں ہوتی ہے"۔

ضلع بلیری ـــــ کلکٹر نے 1845ء میں لکھا تھا "ہر کسان شاکی ہے اور اپنی جوت کا رقبہ کم کرنے کی درخواستیں پیش کرتا رہتا ہے۔ اس سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہوجاتی ہے کہ زراعت منافع بخش

---

[1] یہ اقتباسات ایس۔ ایس۔ رگھوا اینگر کی کتاب مدراس کے صوبے کی ترقی کی روداد (Memorandum of the Progress of Madras Presidency) (1893)، ص ص 27 — 32 -

نہیں ہے۔ کسان جو پہلے خوشحال تھے، زمین میں روپیہ لگا سکتے تھے، اپنی ریاست کا مطالبہ ادا کر سکتے تھے اور اپنی پیداوار کو اس وقت تک فروخت نہیں کرتے تھے جب تک بہتر قیمت نہ ملے اب قرض کی دلدل میں پھنس گئے ہیں جس پر انھیں بھاری سود ادا کرنا ہوتا ہے اور قرض خواہوں کے رحم وکرم پر ہیں۔ اگر کلکٹر اپنے نائبین کے ذریعے ان کی مدد نہ کرتا تو وہ اُس اراضی کے نصف یا کم از کم ایک تہائی حصّے سے ضرور دست بردار ہو جاتے جس پر بھاری مالگزاری عائد کی گئی ہے۔ کاشت پر پوری توجہ نہیں دی جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے اتنی پیداوار نہیں ہوتی ہے جتنی ہونی چاہیے۔ پٹے داروں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا ہے لیکن وہ لوگ غریب ہیں اور کاشت کے ذریعے اپنی گزر بسر کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کا مقابلہ اُن خوشحال کسانوں سے کسی طرح نہیں کیا جا سکتا ہے جو دشواریوں میں مبتلا ہو گئے ہیں اور ضلع کے لگان داروں کی فہرست میں اب شامل نہیں ہیں۔ جہاں تک اُن کی غذا اور پوشاک کا تعلق ہے ان میں سے زیادہ تر لوگوں کو نہ ڈھنگ کا کپڑا نصیب ہوتا ہے نہ ڈھنگ کا کھانا۔ ہمیں مجبوراً اس نتیجے پر پہنچنا پڑتا ہے کہ اس کی وجہ اُن کا افلاس ہے۔"

سر ہنری منٹگمری کی 1844ء کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا تھا کہ راجہ مندری، جو بعد میں ضلع گوداوری کے نام سے مشہور ہوا، تباہی کی حدوں کو چھو رہا تھا۔ 1830ء اور 1831ء میں وہاں قحط پڑ چکے تھے۔ 1835ء، 1836ء اور 1837ء میں موسم ناموافق رہا تھا اور 1838ء، 1839ء اور 1840ء میں موسم نے تباہی پھیلا دی تھی۔ آبادی جو 1830ء میں 6,95,016 تھی 1840ء میں گھٹ کر 5,33,836 رہ گئی تھی۔

گنتور اور مسالی پٹم —— 1833ء کا قحط، جو قحط گنتور کے نام سے مشہور رہے، ان علاقوں میں پڑنے والا شدید ترین قحط تھا۔ ایک چشم دید گواہ کیپٹن والٹر کیمپبیل (Captain Walter Campbell) نے لکھا تھا "صبح اور شام سواری کرتے وقت ہمیں روزانہ جو خوفناک مناظر دیکھنے پڑتے ہیں اُن کے مقابلے میں کورنتھ کے محاصرے (Siege of Corinth) کا یہ بیان کرکتے انسانی کھوپڑیاں چباتے تھے اپنی شدت کھو دیتا ہے۔ . . . یہ دیکھ کر عبرت ہوتی ہے کہ انسان پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے کیا کچھ نہیں کھا سکتا ہے۔ یہ فاقوں کے مارے بدبخت مرے ہوئے کتّے اور گھوڑے بھی کھا جاتے ہیں۔ کچھ دن پہلے ایک بدقسمت گدھا قلعے کے باہر نکل گیا۔ لوگ اس پر بھیڑیوں کی طرح جھپٹے، اس کے ٹکڑے کر دیے اور وہیں پورا گدھا کھا گئے۔" ضلع کرشنا کے اس حصّے میں جو گنتور کہلاتا ہے ایک تہائی سے نصف تک آبادی موت کے گھاٹ اتر گئی۔ سال بھر بعد ایک وبا پھیلی اور "صحت مند انسان مشکل ہی

سے کہیں نظر آتا تھا"

ضلع نیلور ـــــ منڈیوں میں غلّے کی کم قیمت ملنے کی وجہ سے کسان تباہ ہوگئے تھے۔ 1801ء میں مجموعی زیرکاشت اراضی 2,44,319 ایکڑ تھی جو 1850ء میں بڑھ کے 3,89,802 ایکڑ ہوگئی تھی۔ چونکہ مالگزاری زیادہ تھی اس لیے قیمتیں گرنے کے بعد لوگوں نے باغ لگانا چھوڑ دیے تھے۔

شمالی ارکاٹ ـــــ کلکٹر نے لکھا تھا "کسانوں کی جو حالت اس صدی کے ابتدائی زمانے میں تھی اب اس سے بدتر ہوگئی ہے۔ اس کی جو بھی وجہ ہو بہرحال اُن کی موجودہ حالت کے متعلق بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ وہ انتہائی سقیم ہے اور اس کو سدھارا جانا چاہیے۔ ان میں زیادہ تر بلاشبہ غریب ہیں۔ وہ موٹا جھوٹا کھاتے ہیں پھر بھی انھیں کافی غذا نہیں ملتی۔ اُن کے پھٹے پُرانے کپڑے بھی تن چُھپانے کو کافی نہیں ہوتے ہیں۔ ان کے مکان انتہائی تنگ و تاریک ہوتے ہیں۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ وہ انتہائی جاہل ہیں۔"

جنوبی ارکاٹ ـــــ کلکٹر کی رپورٹ کے مطابق آبادی میں بھی اضافہ ہوا تھا اور مزدوروں کی اُجرت بھی بڑھی تھی۔ اسے گاڑیوں، کپڑوں اور مکانوں میں بہتری کے آثار بھی نظر آئے تھے لیکن غیرمساوی اور بھاری مالگزاری کی وجہ سے زراعت پچھڑی ہوئی تھی اور قابل زراعت اراضی کا دو تہائی حصّہ بنجر پڑا تھا۔

ذرائع نقل و حمل اور ذرائع آب رسانی میں ترقّی کی وجہ سے ضلع تنجور کو زراعت کی سردبازاری کی بنا پر اس حد تک تکالیف کا سامنا نہیں کرنا پڑا جس حد تک دوسرے اضلاع کو کرنا پڑا تھا۔

ضلع کوئمبٹور ـــــ کلکٹر نے 1840ء میں لکھا تھا کہ دس برسوں میں سے نو برس ایسے تھے جن میں فصلیں خراب ہوگئیں۔ اس کی وجہ سے مالگزاری بقایا ہے۔ بمبئی کو برآمد ہونے والے ادنا قسم کے مال کا کاروبار بڑھ گیا ہے لیکن برطانوی مصنوعات نے نفیس سامان کی تجارت کو ختم کر دیا ہے۔ بار بار فصلیں خراب ہونے کی وجہ سے غلّوں کی قیمتیں بڑھ گئی ہیں۔

سالم، مدورا اور ٹینی ویلی کے اضلاع ـــــ کوئمبٹور، سالم، مدورا اور ٹینی ویلی میں بننے والے کپڑے کی برآمد میں خاصا اضافہ ہوگیا تھا۔ زراعت میں اضافے کے ساتھ مزدوروں کی اُجرتوں میں اضافہ نہیں ہوا تھا۔ کلکٹر نے لکھا تھا کہ کم قیمتوں کی وجہ سے آرایش و آسایش کے سامان کی کھپت بڑھ گئی تھی۔

مدراس کے کسانوں کی عام حالت ـــــ مختلف ضلعوں کے حالات کے بارے میں ان بیانات کے بعد ہم مدراس کے کسانوں کی عام حالت کی طرف توجہ کرتے ہیں جو اس زمانے کے مدراس کے

ایک مشہور ترین حاکم نے بیان کی ہے[1]۔ بورڈیلن (Bourdillon) آرکاٹ میں اور دوسرے اضلاع میں کلکٹر رہ چکا تھا جن لوگوں کے درمیان وہ رہا تھا اُن لوگوں کے متعلق اس نے پوری پوری معلومات حاصل کر لی تھیں اور سر آرتھر کاٹن اور دوسری نمایاں شخصیتوں کے ساتھ تعمیرات عامہ کے کمیشن (Public Works Commission) کا ممبر مقرر کیا گیا تھا جس نے 1853ء میں اپنی بیش بہا رپورٹ پیش کی تھی۔ اُس نے 1853ء میں مدراس کے کسانوں کے متعلق سنجیدہ اور مفکرانہ خیالات ظاہر کیے تھے۔ اُس نے مبالغے سے کام نہیں لیا تھا مگر کسانوں کے افلاس کی تکلیف دہ تفصیلات بیان کر دی تھیں۔

کسانوں کا ایک چھوٹا سا حصہ خوشحال تھا اور تیس سے چالیس شلنگ ماہوار کی آمدنی کی بنا پر انھیں کھاتا پیتا سمجھا جاتا تھا۔ یہ وہ کسان تھے جن پر کم مالگزاری تشخیص ہوئی تھی یا معافی دار تھے یا انھیں دوسری خصوصی مراعات حاصل تھیں۔ لیکن اس طبقے میں بھی تین پونڈ سے پانچ پونڈ تک کی ماہوار آمدنی دیکھنے میں نہیں آتی تھی۔

پھر بھی کسانوں کی بڑی تعداد ہمیشہ افلاس اور قرض کا شکار رہا کرتی تھی۔ "اس طبقے کا کسان روز کنواں کھودتا اور روز پانی پیتا ہے۔ روپیہ وہ صرف اس وقت دیکھتا ہے جب چیٹی (ساہوکار) سے قرض لے کر وہ سرکاری قسط ادا کرتا ہے۔ گانوؤں میں اشیا کا تبادلہ بہت کم ہوتا ہے۔ اگر ہوتا بھی ہے تو اشیا کے تبادلے میں اشیا دی جاتی ہیں۔ اس کے ہل میں چلنے والے جانور بہت کم حیثیت ہوتے ہیں جن کی قیمت 3½ روپے سے 6 روپے تک ہوتی ہے (7 سے 12 شلنگ) اور وہ بھی شاید اس کے نہیں ہوتے ہیں اس لیے کہ وہ اُن کی قیمت بھی ادا نہیں کر پاتا ہے۔ اس کے کمزور اور بھونڈے ہل کی قیمت، اگر نیا خریدا جائے، دو یا تین شلنگ سے زیادہ نہیں ہوتی ہے۔ کاشت کے دوسرے اوزار بھی قدیم طرز کے اور ناکارہ ہوتے ہیں۔ اس کا گھر ایک مٹی کی بنی ہوئی جھونپڑی ہوتی ہے جس پر چھپر پڑا ہوتا ہے اور وہ مذکورہ بالا کھاتے پیتے کسانوں کے مکانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ بدنما، چھوٹی اور ٹوٹی پھوٹی ہوتی ہے اور اس میں اگر کوئی کھاٹ پیڑھی ہوتی بھی ہے تو وہ اور زیادہ شکستہ حالت میں ہوتی ہے۔ اس کا کھانا جزوی طور سے ایک قسم کے دلیے پر مشتمل ہوتا ہے جو چنے کے لئے کو پانی میں اُبال کر بنایا جاتا ہے اور جزوی طور سے اُبلے چاولوں اور چٹنی پر۔ عام طور سے کھانا پکانے اور کھانا کھانے کے برتن مٹی کے بنے ہوئے اور ادنا قسم کے ہوتے ہیں۔ انگلستان کی بنی ہوئی اینٹ یا

---

[1] مدراس کے کسانوں کے حالات جو مسٹر بورڈیلن (Mr. Bourdillon) نے 1853ء میں بیان کیے۔

کھپریل سے بھی ادنا تر۔ روغن بھی اُن پر نہیں ہوتا ہے۔ پیتل کے برتن اگرچہ اس طبقے کے لیے بالکل نئے نہیں لیکن بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں۔

"سب سے کم حیثیت کسان وہ ہوتا ہے جس کے پاس زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہوتا ہے جس پر وہ کبھی کبھی دوسروں کے جانور مانگ کر کاشت کر لیا کرتا ہے لیکن اس کی گزر بسر کا اصل ذریعہ محنت مزدوری ہوتا وہ یا تو کھیتوں میں مزدوری کرتا ہے یا لکڑیاں کاٹ کر قریب کے شہروں میں بیچا کرتا ہے"۔

"مزدوروں کا طبقہ ان سے بھی کم حیثیت ہوتا ہے لیکن ان دونوں طبقوں کی حالت میں کوئی بہت بڑا فرق نہیں ہے۔ کھیت مزدور کی مجموعی آمدنی کسی طرح 20 روپے سالانہ (40 شلنگ) سے زیادہ نہیں ہوتی ہے۔ یہ اُجرت بھی رقم کے بجائے جنس کی صورت میں ادا کی جاتی ہے"۔

"اگر زیادہ سے زیادہ شرح اُجرت یعنی بیس روپیہ سالانہ کی بنیاد پر اس کی یافت کا حساب لگایا جائے تو مندرجہ بالا تقابلی معیار کی رو سے اس کی حقیقی قیمت انگلستان میں ہونے والی دس پونڈ سالانہ کی آمدنی کے برابر ہوگی[1]"

"ایک انگریز کھیت مزدور کی سالانہ اوسط اُجرت 28 پونڈ سے کم نہیں ہوتی ہے جس میں فصل کاٹنے کے زمانے کی مزید یافت بھی شامل ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسے کھیت مزدوروں کی حقیقی اُجرت جو مستقل ملازم ہوتے ہیں اور زندگی کی وہ ضروریات اور آسائشیں جو ان کو میسّر ہوتی ہیں اس ملک میں انگلستان کے مقابلے میں ایک تہائی سے کم ہوتی ہیں"۔

"ہم رعیت واری طریقے کے حقیقی عمل درآمد کے متعلق ایک اور نمایاں حیثیت رکھنے والے حاکم کی شہادت پیش کریں گے۔ اس نظام مالگزاری میں ضلع کلکٹروں کی ذمّہ داری تھی کہ وہ ضلع کے لاکھوں کسانوں سے نا قابل وصول مالگزاری وصول کریں۔ جارج کیمپ بیل نے، جو بعد میں سر جارج کیمپ بیل کے نام سے مشہور ہوا، بنگال کے لیفٹننٹ گورنر کے عہدے پر فائز رہا اور اس وقت پارلیمنٹ کا ممبر تھا، 1852ء میں مدراس کے طریقے کے متعلق مندرجہ ذیل خیالات ظاہر کیے تھے"۔

"سوچیے ایک کلکٹر کو 50,000 ,1 کسانوں سے نبٹنا پڑتا ہے جن میں کوئی پٹے دار نہیں ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر کسان اپنی کاشت اور پیداوار کی مناسبت سے مالگزاری ادا کرتا ہے جس کا حساب لگاتے

---

[1] دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے کہ 1840ء میں ایک ہندوستانی گانو میں بیس روپے یا دو پونڈ کی وہی حیثیت تھی جو انگلستان میں دس پونڈ کی تھی۔

وقت اس کے جانوروں، بھیڑوں اور بچوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اگر ان میں کوئی مالگزاری میں چھوٹ کی معقول وجہ پیش کرسکتا ہے تو اس کو چھوٹ دی جاتی ہے۔ اگر انگلستان یا کسی دوسرے ملک میں یہ طریقہ رائج کیا جائے تو لوگ کاشت کی دشواریوں اور بڑے بڑے خاندانوں کے متعلق کتنی چیخ پکار کریں۔ کیا کوئی کسان کبھی یہ بات تسلیم کرسکتا ہے کہ اس کے کھیت میں کچھ پیدا ہوا ہے یا اس کے جانور نے بچہ دیا ہے۔ یا اس کی بیوی نے خاندان میں اضافہ نہیں کیا ہے۔ اگر کلکٹر بنی بھی ہو اور ایک ہی ضلع میں حضرت خضر کی عمر کو پہنچ جائے پھر بھی وہ اپنے فرائض بحسن و خوبی ادا نہیں کرسکتا ہے۔ لیکن وہ تو ایک معمولی انسان اور اجنبی ہوتا ہے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر اس کے دیسی نائبین من مانی نہ کریں اور اپنے اختیارات سے ناجائز فائدہ نہ اُٹھائیں تو تعجب ہوگا۔ چنانچہ اس بلت پر سب کو اتفاق ہے۔ کہ اس نظام میں اور خصوصیت کے ساتھ چھوٹ دینے کے طریقے میں بڑی دیانتی سے کام لیا جاتا ہے۔ قانونی حیلہ سازیوں اور سازشوں کی کوئی انتہا نہیں۔ مدراس کا کلکٹر مخبروں پر بھروسہ کرتا ہے لیکن اس سے حالات سدھرتے نہیں[1]۔

اس پالیسی کے ابتدائی نتائج یہ تھے جس میں گاؤں پنچایتوں کو نظر انداز کیا گیا تھا اور ہر چھوٹے موٹے کسان سے ناقابل وصول مالگزاری وصول کرنے کا طریقہ رائج کیا گیا تھا۔ ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ تباہ حال کسانوں سے وقت پر تشخیص شدہ مالگزاری وصول کرنے کے لیے اس صوبے میں جسمانی اذیتوں کا چلن عام تھا۔ اس شرمناک طریقے کی خبریں انگلستان پہنچیں۔ پارلیمنٹ کے ایک ممبر مسٹر بلیکٹ (Mr. Blackett) نے، جو نیوکاسل کی نمائندگی کرتا تھا، 1854ء میں ایک تجویز پیش کی کہ مدراس کے نظام مالگزاری کے متعلق تحقیقات کرنے کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا جائے۔ اس تجویز پر بحث کرتے ہوئے اس نظام کو نہایت شرمناک قرار دیا اور کہا کہ مالگزاری کا ایسا بھاری مطالبہ لوگوں کو جسمانی اذیت پہنچائے بغیر وصول نہیں کیا جاسکتا ہے۔ بلڈر جان برائٹ (John Bright) نے اس بحث میں حصہ لیا اور نہایت خطیبانہ انداز میں مدراس کے کسان کی حالت اور اس کے ساتھ ہونے والے سلوک پر روشنی ڈالی جس سے ملک میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔

اس بحث کے بعد حکومتِ ہند کو بھی کچھ اقدامات پر مجبور ہونا پڑا حالانکہ اصلاحات کے معاملے میں وہ سست روی کی قائل تھی۔ شہادت لینے کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا گیا اور کمیشن کو اس تحقیقات کا

---

[1] جارج کیمپبل جدید ہندوستان (Modern India)، لندن، 1852ء۔

مجاز بنانے کے لیے ایک ایکٹ منظور کیا گیا۔ مدراس کی عدالت خفیفہ کا جج ایلیٹ، مدراس کا ایک بیرسٹر نارٹن اور اسٹوکس، جو رعیت واری طریقے کا بڑا حامی تھا، اس کمیشن کے اراکین مقرر کیے گئے۔ اس کمیشن نے محتاط رپورٹ پیش کی۔ اس نے تسلیم کیا کہ سرکاری مطالبہ وصول کرنے کے لیے جسمانی اذیتیں پہنچانے کا رواج صوبے میں پایا جاتا ہے۔ اُس نے یہ بھی تسلیم کیا کہ مظلوموں کو دادرسی کے مواقع حاصل نہیں ہیں۔ لیکن اس نے حکومت کے یورپین افسروں پر الزام عائد کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیا۔ اُس کی رائے میں اس بات کو تسلیم کرنے کی وجوہ نہیں پائی جاتی تھیں کہ "عام طور سے لوگوں کا خیال ہے کہ حکومت کے یورپین ملازمین ان کے ساتھ ہونے والی بدسلوکی کی حمایت کرتے ہیں یا اس کو روا و جائز سمجھتے ہیں[1]"

عام طور سے جو جسمانی اذیتیں پہنچائی جاتی تھیں ان میں مندرجہ ذیل شامل تھیں۔ کسان کو دھوپ میں بٹھانا، کھانے یا دوسرے حوائج ضروری کی اجازت نہ دینا، نظر بند کرنا، اس کے جانوروں کو چراگاہ میں داخل نہ ہونے دینا، اس کے گھر چپراسی تعینات کرنا، اُسے جھکا کر رسی سے جکڑ دینا، اس کی انگلی پر انگلی چڑھا کر دابنا، چٹکی لینا، تھپڑ مارنا، گھونسے یا کوڑے مارنا، دوڑانا، کان کھینچنا، ران اور پنڈلی میں اینٹیں داب کر بٹھانا، چھوٹی ذات کے لوگوں کو اس کی پیٹھ پر بٹھانا، دو بقایا داروں کے سروں کو آپس میں ٹکرانا یا ان کی چٹیاں باندھ دینا، اس کے گلے میں ہڈیوں یا دوسری نجس اور قابل نفرت چیزوں کے ہار ڈالنا۔ کبھی کبھی اس سے زیادہ سخت سزائیں بھی دی جاتی ہیں لیکن ایسی صورتیں کم ہی پیش آتی ہیں[2]۔"

اس تحقیقات نے ایک بات واضح کر دی۔ جہاں زمین پر علاحدہ علاحدہ مالگزاری تشخیص ہوئی تھی وہاں جسمانی اذیتوں کے واقعات زیادہ پیش آتے تھے۔ کمیشن نے لکھا تھا "ہمیں معلوم ہوا ہے کہ کنارا اور مالابار میں زمین کے محصول کی شرح کم ہے۔ وہاں کے لوگ خوشحال ہیں اور آسانی سے بلکہ بخوشی مالگزاری ادا کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ ان میں جھگڑا عام طور سے اس بات پر نہیں ہوتا ہے کہ سرکاری مطالبہ کس کو ادا کرنا چاہیے۔ وہ اس پر لڑتے ہیں کہ سرکاری مطالبہ کون ادا کرے گا۔ زمین کی قیمت بڑھ گئی ہے اور لوگ بنجر حاصل کرنے کے خواہش مند رہا کرتے ہیں۔ اس پر کوئی تعجب نہیں کہ اس خوش قسمت علاقے میں رہنے والے تمام یورپی لوگوں کا کہنا ہے کہ مالگزاری وصول کرنے کے لیے

---

[1] کمیشن کی رپورٹ، مورخہ 16 اپریل 1855، پیراگراف 70۔

[2] کمیشن کی رپورٹ، پیراگراف 61۔

جسمانی اذیتیں پہنچانے کا طریقہ وہاں نسبتاً کم پایا جاتا ہے[1]۔"

شمالی آرکاٹ کے کلکٹر بورڈیلین (Bourdillon) نے لکھا تھا کہ مالگزاری کے لیے جسمانی اذیتوں کا طریقہ اب تک ختم ہو چکا ہوتا لیکن زمین کے بھاری مطالبے اور صوبے کے نظام مالگزاری کی کچھ خصوصی نوعیتوں کی بنا پر ختم نہ ہو سکا۔ اگر شرح تشخیص میں اعتدال سے کام لیا جاتا تو زمین کی قیمت بڑھ گئی ہوتی۔ ایسی صورت میں کوئی کسان زمین کو ہاتھ سے دینے کے لیے تیار نہ ہوتا۔ بلکہ قلت کے زمانے میں بھی اس کے پاس اتنے وسائل ہوتے کہ وہ سرکاری مطالبہ ادا کر سکتا۔ اس کے علاوہ مالگزاری کی شرح کم ہوتی تو یہ واقع از خود لوگوں میں اعلا صفات پیدا کرنے کے لیے ایک محرک کا کام دیتا جب لوگوں کے پاس دولت ہوتی ہے تو اُن میں خودداری بھی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ ان طریقوں سے بھی واقف ہو جاتے ہیں جن کے ذریعے وہ دوسروں سے اپنا احترام کرا سکیں۔ ایسے لوگ ذلتوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوا کرتے[2]۔

حکومتِ ہند رعیت واری طریقہ کی اُن تمام خرابیوں سے واقف تھی جس میں مدراس میں پائی جانے والی بھاری شرح تشخیص بھی شامل تھی۔ اس طریقے کے خلاف بہت احتجاج کیا گیا تھا جو شمالی ہندوستان کے طریقے کے مقابلے میں ناقص تھا۔ جیسا کہ پچھلے باب میں کہا جا چکا ہے مالگزاری کے صدر بورڈ نے ہندوستان کے گورنر جنرل کو ایک سخت خط لکھا تھا[3] جس میں مدراس کے طریقے کی مذمت کی گئی تھی۔ اس نے کم تنخواہ پانے والے سرکاری ملازمین کے مظالم اور ان کی بے ایمانیوں پر روشنی ڈالی تھی اور کسانوں کی مالی حالت کے متعلق تفتیش کرنے اور انھیں طرح طرح سے پریشان کرنے کے خلاف اظہارِ افسوس کیا تھا۔ اُس نے مزید لکھا تھا کہ یہ طریقہ بدترین افلاس کو جنم دینے اور دوسروں پر بھروسہ کرنے کی عادت ڈالنے کے لیے رائج کیا گیا ہے۔" ہر شخص خود اپنی نظروں میں حقیر ہو جائے اور اس منزل کو پہنچ جائے جس کو دوامی نابالغی کے نام سے یاد کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد اس میں کبھی وہ مردانہ خصوصیتیں پیدا نہیں ہوں گی جو اپنی محنت پر بھروسہ کرنے والوں کی خصوصیت ہوا کرتی ہیں۔ اس کے بعد وہ پھر کبھی ایک ایسے باعزت اور خوددار انسان کی طرح

---

[1] کمیشن کی رپورٹ، پیراگراف 58۔

[2] کمیشن کی رپورٹ، ضمیمہ c۔

[3] خط مورخہ 20/ مارچ 1838ء۔

سر نہیں اُٹھا سکے گا جو اپنے سے بڑوں کی مہربانیوں یا نا مہربانیوں کی پرواہ نہیں کرتا ہے"۔ لیکن صدر بورڈ کی مذمتیں اور کلکٹروں کی مسلسل آنے والی رپورٹیں حکومت مدراس کو اس تباہ کُن نظام مالگزاری میں اصلاح کرنے پر آمادہ نہ کرسکیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ دوسرے صوبوں میں برڈ اور ورن گیبٹ جیسے لوگوں نے بڑی بڑی اصلاحات کیں لیکن مدراس کی حکومت نے کوئی بڑا اصلاحی قدم نہیں اُٹھایا، خرابیوں کو دور کرنے کی کوئی تدبیر نہیں کی اور لوگوں کی حالت سدھارنے کی مدبرانہ پالیسی اختیار نہیں کی۔ مدراس کو اکثر ہندوستان کے ظلمت زدہ صوبے کے نام سے پکارا گیا ہے اور انیسویں صدی کے نصف اوّل میں مدراس واقعی ظلمت زدہ صوبہ کہلانے کا سب سے زیادہ مستحق تھا۔ ہندوستان میں آہستہ آہستہ پھیلنے والی روشنی ساحل کارومنڈل کے گہرے اندھیرے میں نفوذ نہ کرسکی۔ اس زمانے کی سرکاری دستاویزات کا دفتر کا دفتر ہمارے پیشِ نظر ہے۔ ہم اُن میں مدراس کے تعلق سے اصلاحات کے تصوّرات یا لوگوں کی خوشحالی کے اقدامات کا سراغ لگانے کی بے سود کوششیں کیا کرتے ہیں۔

مدراس کے صاحبان اقتدار اب بھی اس طریقے پر کاربند تھے۔ مگر جب ایسی زمینداریاں بقایا مالگزاری ادا نہ کرسکنے کی وجہ سے فروخت ہونے لگیں جن میں بند وبست استمراری ہوچکا تھا تو حکام نے رعیت واری طریقے کو توسیع دینا شروع کردیا اور ان زمینداریوں میں بھی وہ طریقہ رائج کردیا گیا۔ انیسویں صدی کے وسط میں اس پالیسی پر عمل کرنے میں کتنا انہماک دکھایا جاتا تھا اس کا حال اس زمانے کے ایک افسر نے بیان کیا ہے: "رعیت واری علاقے کے کسی کلکٹر سے اس کے گھر میں، اس کے وسیع دسترخوان پر ملیے تو وہ تسلیم کرے گا کہ حال میں جس بڑی زمینداری کو فروخت کروانے میں اس نے کامیابی حاصل کی ہے اُس میں اسے سوچی سمجھی تدبیروں سے کام لینا پڑا۔ وہ بتائے گا کہ مالک آراضی کو عمداً اس امر کا موقع دیا گیا کہ وہ کلکٹر کے جال میں خود کو اس طرح پھانس لے کہ اس سے رہائی حاصل کرنا اس کی قوت کے باہر ہوجائے۔ وہ یہ بھی تسلیم کرے گا کہ زمینداری کو فروخت ہونے سے بہ آسانی بچایا جاسکتا تھا بلکہ وہ یہاں تک تسلیم کرے گا کہ اس کو فروخت کرنا ضروری نہیں تھا"۔ اس مصنّف نے ایسی مثالیں دی ہیں جن کو پڑھ کر تکلیف ہوتی ہے۔[1]

---

[1] مدراس اور اس کا سول نظم و نسق (Madras, Its civil Administration) از پی بی اسمولیٹ (P. B. Smollett)، لندن، 1858ء۔

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

رعیت واری طریقے کے حقیقی معمار ٹامس منرو کے وہم و گمان میں بھی وہ طریقے نہیں ہوں گے جن پر اس نظام مالگزاری میں عمل کیا جانے لگا تھا۔[10] اس نے 1813ء میں ہاؤس آف کامنز کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہا تھا: "رعیت واری کا اصول یہ ہے کہ تمام علاقے کی اراضی پر مالگزاری تشخیص کی جاتی ہے، یہ تشخیص استمراری ہوتی ہے، ہر کسان کو جو مقبوضہ اراضی کا مالک بھی ہوتا ہے، اس امر کی اجازت دی جاتی ہے کہ جب تک وہ چاہے معینہ مالگزاری کی بنیاد پر زمین پر قابض و دخیل رہے۔ مزید تشخیص کے بغیر وہ اس اراضی پر ہمیشہ قابض رہ سکتا ہے۔"

لیکن شرح تشخیص بہت زیادہ مقرر کی گئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کی حالت اور غیر یقینی موسم کی بنا پر سرکاری مطالبے میں تخفیف کی گئی، اس کو پھر بڑھایا گیا اور پھر کم کیا گیا۔ صوبے کی تیس سال کی تاریخ بار بار بدلنے والی شرح تشخیص کی تاریخ تھی۔ شرح تشخیص میں ترمیم کرنے کے لیے روزنئے حکم نامے جاری کیے جاتے تھے۔ قحط یا قلت کی بنا پر تخفیف کر دی جاتی تھی۔ خوشحالی کے آثار اضافے کا باعث ہوتے تھے۔ جدید تاریخ اس قسم کے انتظامات کی نظیر پیش نہیں کر سکتی ہے جس میں ایک جفاکش اور متمدن آبادی کو اس قابل نہیں رہنے دیا گیا تھا کہ وہ اپنی حالت سدھار سکے یا زرعی دولت پس انداز کر سکے۔ اس کے لیے تشخیص مالگزاری کا ایسا طریقہ استعمال کیا گیا تھا جس سے سال بہ سال ملک کی زیادہ سے زیادہ دولت چھینی جا سکتی تھی۔

(صـــ سے آگے)۔

ضلع ٹینی ویلی کی ایک قدیم جاگیر جو کم پٹی کا مالک کلکٹر کے پاس آیا اور اپنی جاگیر کی بقایا مالگزاری کی ادائیگی کا انتظام کرنے کے متعلق اس سے بات کرنا چاہی لیکن اس کو ایک غیر مطمئن اور خطرناک انسان قرار دے کر گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے خلاف کوئی فرد جرم نہیں پیش کی گئی بلکہ ایک سیاسی مجرم کی حیثیت سے نظر بند کر دیا گیا اور اس کی جاگیر ضبط کر لی گئی۔ ضلع نیلور میں اودے گری کے مسلمان جاگیردار کو بغیر مقدمہ چلائے مبینہ بغاوت کے الزام میں حبس دوام کی سزا دی گئی اور اس کی جاگیر بھی ضبط کر لی گئی۔ ضلع گنتور میں واسی ریڈی کی بڑی جائیداد جس پر وہ 60,000 پونڈ سالانہ مالگزاری ادا کرتا تھا، وہ بقایا مالگزاری وصول کرنے کے لیے 500 پونڈ میں بیچ دی گئی جو سرکاری حکام کی تولیت کے زمانے میں ادا نہیں ہوئی تھی۔ ضلع مسولی پٹم میں نداداول کی جاگیریں، جن کی سالانہ آمدنی 3,000 پونڈ تھی، 1,200 پونڈ میں فروخت کر دی گئیں۔ ضلع وزاگاپٹم کی قدیم گول گنڈا زمینداری، جس کی سالانہ آمدنی 1,000 پونڈ تھی، دس پونڈ میں فروخت کر دی گئی۔ یہ اور دوسری زمینداریاں جوں جوں فروخت ہوتی گئیں ان میں رعیت واری طریقہ نافذ ہوتا گیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے چارٹر کی تجدید سے پہلے 1852ء اور 1853ء میں جو پارلیمانی تحقیقات ہوئی تھی اس میں اس طریقے کی خرابیاں سامنے آگئی تھیں۔ اس تحقیقات کے دوران مدراس کے حکام کی شہادتیں قلمبند کی گئی تھیں اور ان لوگوں نے صاف صاف بیان دیے تھے۔

مالکم لیون (Malcolm Lewan) نے، جو ہندوستان میں پچیس سال تک کلکٹر، جج اور کاؤنسل کے ممبر کے فرائض ادا کرچکا تھا، ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہا تھا "میرا خیال ہے کہ ملک کی اخلاقی حالت کا قریبی تعلق نظام مالگزاری سے ہے۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ مدراس کا موجودہ نظام مالگزاری ملک کو مادی طور سے تباہ کرنے کے ساتھ اس کے اخلاق کو بھی تباہ کر رہا ہے"۔ اُس نے مزید کہا "تحصیلدار، جو موقع پر معلومات حاصل کرنے کے لیے دورے کرتے رہتے ہیں، رعیت واری ضلعوں میں سرکاری مطالبے کی تشخیص کا پورا پورا اختیار رکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب وہ کسی گانو میں پہنچتا ہے تو اس گانو کے لوگ اس کو خریدنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ اُن پر کم مالگزاری تشخیص کی جائے۔[1]"

جیمس ولیم۔ بی۔ ڈائکس (James William B. Dykes) نے، جو ضلع سالم کے محکمہ مالگزاری میں کام کرچکا تھا، ہاؤس آف کامنز میں بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ پورے صوبے میں رعیت واری طریقے کی مندرجہ ذیل خرابیاں پائی جاتی تھیں۔ (1) تشخیص بے ضابطہ تھی۔ زمین کو ترقی دینے کی صورت میں کسان کو زیادہ مالگزاری ادا کرنی پڑتی تھی۔ (2) لگان داری غیر یقینی تھی۔ (3) مالگزاری کے ضابطے غیر واضح تھے اور جاہل کسانوں کو کبھی سمجھائے نہیں جاتے تھے۔[2]

جس طرح شمالی ہند میں 1833ء میں اور بمبئی میں 1835ء میں مالگزاری کی خامیاں دُور کی گئی تھیں اسی طرح 1865ء میں حکومت مدراس بھی خرابیوں کو دُور کرنے کے لیے ضروری اقدامات کرنے پر مجبور ہوگئی۔ حکومت مدراس کے مشہور حکم نامے میں، جو 1855ء میں جاری کیا گیا تھا، یہ توقع ظاہر کی گئی تھی کہ اس بندوبست کے نتائج اچھے ہوں گے۔

"صحیح صحیح پیمائش اور بندوبست میں برتی جانے والی احتیاط خرابیوں کو دُور کردے گی۔ ادائگی میں کوئی ردو بدل نہیں کی جائے گی۔ عام طور سے چھوٹ نہیں دی جائے گی جس کے لیے سازشیں کی

---

[1] ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی پہلی رپورٹ، 1853ء، ص 286۔

[2] چوتھی رپورٹ، ص 124۔

جاتی ہیں اور رشوت دی جاتی ہے۔ اس طرح ایک طرف تو خوشامد اور رشوت سے کام لینے کا اور دوسری طرف بددیانتی کرنے کا امکان کم ہو جائے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس طریقہ کار سے موجودہ وصولی کے مقابلے میں زیادہ مالگزاری وصول کی جاسکے گی اور لوگوں کو غیر ضروری پریشانی بھی نہیں اُٹھانا پڑے گی۔ صرف اتنا ہی نہیں ہوگا کہ سرکاری افسروں کو دی جانے والی رشوت کی رقم بچے گی بلکہ محصول کی مساوی تقسیم کی وجہ سے اُن لوگوں کو سہولت مل سکے گی جن پر محصول کا زیادہ بار پڑ رہا ہے اور ان لوگوں پر زیادہ محصول عائد کیا جاسکے گا جو ابھی تک اپنی بے ایمانی کی بنا پر اس سے بچے ہوئے ہیں۔ اخلاقی طور سے یہ بات یقینی معلوم ہوتی ہے کہ مناسب اور معینہ تشخیص کی صورت میں لوگ تیزی کے ساتھ زمینوں پر قبضہ کرنے لگیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں اس وقت زمین کے بلاواسطہ بھاری محاصل کی بنا پر زراعت کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ محصول کا بار کم ہو جانے کی صورت میں نہ صرف کسان اپنی جوت میں اضافہ کریں گے بلکہ تجارتی طبقے سے تعلق رکھنے والے بہت سے لوگ اپنی بچت زراعت میں لگانے کو تیار ہو جائیں گے۔

"اس کے علاوہ یہ بات بھی وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ بھاری شرح تشخیص اور صحیح صحیح حسابات نہ رکھے جانے کی وجہ سے دھوکہ دہانی اور کاشت کو ظاہر نہ کرنے کے واقعات میں اضافہ ہو گیا ہے۔ کبھی کبھی اس قسم کے بہت سے واقعات سامنے آجاتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خرابیاں حقیقت میں پائی جاتی ہیں۔ تمام حکام مال اُن سے اچھی طرح واقف ہیں لیکن چھوٹے چھوٹے افسر رشوتیں لے کر اُن پر پردہ ڈالا کرتے ہیں۔ شرح تشخیص کم ہو جانے کی صورت میں بددیانتی کے مواقع کم ہو جائیں گے۔ لوگوں کو اس کی ضرورت باقی نہیں رہے گی کہ پردہ پوشی کے لیے رشوتیں دیں۔ اس کے علاوہ صحیح پیمائش اور قابل فہم حسابات کی صورت میں اس طرح دھوکہ دینے کی کوشش مشکل بھی ہو گی اور خطرناک بھی"۔

"اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ابھی بہت سی قابلِ زراعت زمین اُفتادہ پڑی ہے۔ لوگ امن پسند اور جفاکش ہیں۔ خوراک اور روزگار کی اتنی کمی ہے کہ وہ لوگ اپنی طبیعتوں پر جبر کر کے روزگار کی تلاش میں سمندر پار جاتے ہیں۔ سڑکوں اور نقل و حمل کے دوسرے ذرائع کی ہر سال توسیع ہو رہی ہے۔ ان حالات میں اس امر کی توقع بیجا نہیں ہو گی کہ شرح تشخیص میں ایسی تخفیف کی صورت میں، جس سے زراعت منافع بخش ہو جائے، کاشت میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہو گا۔ ان توقعات کے علاوہ ایک توقع اور بھی ہے جو خود غرضی پر مبنی ہے۔ شرح تشخیص میں کمی کے بعد ہم ان وسیع علاقوں پر بھی مناسب مالگزاری عائد کر سکیں گے جو ابھی تک زیرِ کاشت نہ ہونے کی وجہ سے اس سے مستثنیٰ ہیں۔

آخر میں یہ بتادینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مجوزہ اقدامات کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کافی وقت لگے گا۔ کوئی شخص یہ توقع نہیں کرسکتا ہے کہ اس وسیع پریسی ڈنسی میں پیمائش اور بندوبست کا کام پندرہ یا بیس سال سے پہلے پورا کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر سال پریسی ڈنسی کی مجموعی مالگزاری کے پندرھویں یا بیسویں حصّے کا بندوبست کیا جائے گا اور نئے اقدامات کے صحت بخش عناصر کو وجود میں لانے اور اپنا کام کرنے کے لیے کافی وقت مل سکے گا۔ بہر حال پریسی ڈنسی کی موجودہ بدحالی کے پیش نظر یہ توقع بیجا نہیں معلوم ہوتی کہ ان اقدامات کے نتیجے کے طور پر مالگزاری کم ہونے کے بجائے بڑھ جائے گی۔ جہاں تک مالگزاری ادا کرنے والوں کا اور عام لوگوں کا تعلق ہے ان کو اس سے بہت زیادہ فائدہ پہنچے گا۔ موجودہ وسائل کے دُگنے یا تگنے وسائل پر مالگزاری عائد کی جاسکے گی اور لوگ نسبتاً زیادہ آسانی سے اس کی ادائیگی کرسکیں گے اور موجودہ تکلیفوں سے نجات پالیں گے[1]۔"

چونکہ اس دستاویز نے مدراس کے نظام مالگزاری کی تاریخ میں ایک نیا باب شروع کیا ہے اس لیے ہم نے اس کا طویل اقتباس پیش کیا۔ اس پیمائش اور بندوبست کے نتائج کا ذکر ایک اگلے باب میں کیا جائے گا جس کی سفارش 1855ء میں کی گئی تھی۔

---

[1] حکم نامہ نمبر 951، مورخہ 14 اگست 1856ء۔

باب 6

پنجاب کے بندوبست

سِکھوں کی پہلی جنگ کے بعد لارڈ ہارڈنگ 1846ء میں پنجاب کا ایک حصّہ برطانوی علاقے میں شامل کرلیا تھا۔ سِکھوں کی دوسری جنگ کے بعد لارڈ ڈلہوزی نے 1849ء میں بقیہ حصّے پر بھی قبضہ کرلیا۔ پنجاب کے نظم و نسق کے متعلق تیار کی جانے والی پہلی رپورٹ میں (First Punjab Administrative Report) جو 1852ء میں شایع ہوئی تھی، گزشتہ سکھ حکمرانوں کے زمانے میں اور انگریزی راج میں صوبے کی حالت بڑی صراحت و وضاحت سے بیان کی گئی تھی۔

عظیم حکمراں رنجیت سنگھ کے دور حکومت میں، جس نے پنجاب کے صوبے کو ایک مستحکم اور طاقتور سلطنت میں تبدیل کر دیا تھا، ایسے لوگوں کو دُور دراز کے اضلاع میں مالگزاری وصول کرنے کے لیے بھیجا جاتا تھا جنھوں نے اپنی بہادری یا صلاحیتوں کی بنا پر نمایاں حیثیت حاصل کر لی تھی۔ انھیں صوبہ دار، فوجی سالار اور مجسٹریٹ کے اختیارات حاصل ہوتے تھے۔ ان لوگوں میں جنرل اوی ٹابل (Avitabile) بھی شامل تھا جس نے سختی کے ساتھ پشاور کو قابو میں رکھا تھا۔ دوسرا شخص ہری سنگھ تھا جو بڑا بہادر تھا۔ اُس نے ہزارا کے تندخو اور شورش پسند پہاڑی لوگوں کو اطاعت پر مجبور کر دیا تھا۔ اُن اضلاع میں جو لاہور سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھے مالگزاری کارداروں کے ذریعے وصول کی جاتی تھی۔ لاہور کی وزارت کو اختیار حاصل تھا کہ ان کے کاموں پر نظرثانی کرے۔

وہاں کوئی تحریری قانون نہیں تھا لیکن سختی کے ساتھ سیدھا سادھا انصاف کیا جاتا تھا۔ زمین کو ذاتی ملکیت سمجھا جاتا تھا۔ مالکان اراضی اور کسانوں کے حقوق کا پاس کیا جاتا تھا۔ گانو پنچایت کی مشترک نوعیت کو تسلیم کیا جاتا تھا۔ مقامی حاکموں کی زیر ہدایت عام طور سے پنچ فیصلے ہوا کرتے تھے۔ یہ ثالث

حقیقی اور ذاتی جائیداد کے نہایت پیچیدہ مسائل پر اپنے فیصلے صادر کیا کرتے تھے۔ . . . مہاراجہ اپنے علاقہ کا برابر دورہ کرتا رہتا تھا۔ وہ راستے میں لوگوں کی شکایتیں سُنتا تھا اور جس گورنر کے صوبے میں زیادہ شکایتیں سُننے میں آتی تھیں اس سے باز پرس کیا کرتا تھا۔ دربار میں بھی وہ انفرادی درخواستیں قبول کیا کرتا تھا[1] محاصل بھاری تھے: "لیکن حکومت ایک ہاتھ سے جو لیتی تھی وہ کچھ صورتوں میں دوسرے ہاتھ سے واپس کر دیتی تھی۔ سرکاری ملازمین کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ فوج کے لیے سپاہی ہر گانو سے بھرتی کیے جاتے تھے جو اپنی پس انداز کی ہوئی رقم اپنے گھروں کو بھیجا کرتے تھے۔ بہت سے ایسے گانو جنھیں بھاری مالگزاری ادا کرنی ہوتی تھی آدھی مالگزاری فوج کی کمائی سے ادا کرتے تھے۔ اس طرح روپیہ مسلسل گردش میں رہتا تھا[2]"

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ حکومت میں نظری طور سے زمین کا محصول مجموعی پیداوار کا نصف سمجھا جاتا تھا لیکن عملاً "وہ مجموعی پیداوار کے $\frac{2}{5}$ سے $\frac{1}{3}$ تک ہوا کرتا تھا۔ یہ تناسب اُن تمام صوبوں میں رائج تھا جن پر سکھوں نے پورا قبضہ حاصل کر لیا تھا اور جہاں کافی کاشت کی جاتی تھی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس صوبے کے علاوہ جس کا صوبیدار دیوان مول راج تھا دریائے سندھ کے ادھر کے تمام مقبوضات میں یہ طریقہ رائج تھا۔ سندھ پار کے علاقے میں فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے پوری نگرانی نہیں کی جا سکتی تھی، وہاں کے لوگ جلدی مشتعل ہو جاتے تھے، جائیداد کا تحفظ نہیں کیا جا سکتا تھا اور آبادی کم تھی اس لیے وہاں کے لوگوں پر مالگزاری کا بوجھ نسبتاً کم تھا[3]"

محصول کی شرح کچھ سہی لیکن محصول رقم کے بجائے جنس کی صورت میں وصول کیا جاتا تھا۔ اس لیے فصل چاہے اچھی ہو یا بُری لیکن کھیت کی پیداوار سے اس کا تناسب برقرار رہتا تھا۔ اس نظام میں فصل خراب ہونے کی صورت میں کسان کو ایک معینہ اور مقررہ رقم ادا کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا نہ مندے کی صورت میں ان سے زیادہ قیمتوں کی بُنیاد پر زیادہ مالگزاری کا مطالبہ کیا جا سکتا تھا۔

1846ء کے دوسرے معاہدے کی رو سے، جو اس سال دسمبر میں کیا گیا تھا، طے پایا تھا کہ پنجاب کے فوجی اور سول انتظامات کی ذمہ داری ایک برطانوی ریذیڈنٹ کے سُپرد ہو گی اور ہنری لارنس پہلا

---

[1] پنجاب کے نظم و نسق کی رپورٹ، 1862ء، پیراگراف 28۔

[2] پنجاب کے نظم و نسق کی رپورٹ، 1852ء، پیراگراف 31۔

[3] ایضاً پیراگراف 233۔

ریذیڈنٹ مقرر کیا گیا تھا اس زمانے کے قابل حاکموں اور بہادر سپاہیوں میں ہنری لارنس کا نام سب سے نمایاں ہے جس کو نقیب امن کا لقب دیا گیا تھا۔ وہ 1806ء میں پیدا ہوا تھا۔ 1825ء میں اس نے برما کی پہلی جنگ میں حصہ لیا تھا۔ 1842ء میں اس نے پشاور کے سکھ سرداروں کو قابو میں رکھا اور افغانستان پر حملہ کرنے میں پولک (Pollock) کی مدد کی۔ فروری 1846ء میں اس نے سبراؤن کی لڑائی میں حصہ لیا جس کے بعد سکھوں سے ہونے والی پہلی جنگ ختم ہو گئی۔ اس زمانے میں سکھوں کے متعلق سب سے زیادہ واقفیت ہنری لارنس کو حاصل تھی اور سب سے زیادہ اثر بھی اس کا تھا سکھوں کے اوصاف کا سب سے بڑا قدردان بھی وہی تھا اور اُن کی حیثیت، وقار اور آزادی کو برقرار رکھنے کی سب سے زیادہ خواہش اس کے دل میں تھی۔

ریذیڈنٹ کی حیثیت سے ہنری لارنس عملاً پنجاب کا حکمراں بن گیا تھا اور اس نے اپنی اصلاحات کے لیے آٹھ سکھ سرداروں پر مشتمل کاؤنسل آف ریجنسی (Council of Regency) کی منظوری حاصل کر لی تھی۔ ایک اصلاح اس نے ایسی بھی کی جس کے متعلق یقین سے نہیں کہا جا سکتا اس سے لوگوں کو فائدہ پہنچا یعنی جنس کی صورت میں مالگزاری ادا کرنے کے پُرانے طریقے کو بدل کر اس نے رقم کی صورت میں مالگزاری ادا کرنے کا برطانوی طریقہ رائج کر دیا۔ سرکاری مطالبے میں کسی قدر کمی کر دی گئی لیکن انگریز افسروں کے سر پر بندوبست اور اُن کی تشخیص کردہ رقم سے لوگوں کو کوئی خاص سہولت نہیں ملی۔ لیکن دوسرے معاملات میں لارنس نے سکھوں کے اداروں سے تعلق برقرار رکھا اور وہاں میں زیادہ کامیاب ہوا۔ سردار لہنا سنگھ کی نگرانی میں پچاس منتخب گانوؤں کے سربراہوں نے سکھوں کے رسم و رواج کی بُنیاد پر ایک سیدھا سادہ ضابطہ قانون تیار کیا۔ ظالمانہ محاصل اور حکومت کی اجارہ داری ختم کر دی گئی۔ ہنری لارنس نے لائق اور محنتی افسروں کا انتخاب کیا جنھوں نے اس کے تصوّرات کو عملی شکل دی اور صوبے کے مختلف حصّوں کا انتظام سنبھالا۔ سرداروں، مالکان اراضی اور عام لوگوں نے اس کے انتظامات کی داد دی اور عظیم نقیب امن کی حکومت کو تسلیم کر لیا۔

بد قسمتی سے کچھ مدّت بعد وہ دونوں شخص ہندوستان سے رُخصت ہو گئے جنھوں نے پنجاب میں امن قایم کیا تھا۔ 1847ء کی آخر میں ہنری لارنس کی خرابی صحت کی بنا پر ملک چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ 1848ء کے ابتدائی دنوں میں لارڈ ہارڈنگ نے حکومت کی باگ ڈور لارڈ ڈلہوزی کے سُپرد کر دی۔ ان لوگوں کے ہندوستان سے رُخصت ہونے کے کچھ دن بعد جو ہنگامے شروع ہوئے انھیں بڑھنے کا موقع مل گیا اور آخر میں ان کا نتیجہ سکھوں کی دوسری جنگ کی صورت میں نمودار ہوا جس کا

ذکر ایک پچھلے باب میں کیا جاچکا ہے۔

ہنری لارنس نے، جو بہت نمایاں خدمات کی بنا پر اب سر کے خطاب سے نوازا جاچکا تھا، جب ان ہنگاموں کی خبر سُنی تو فوراً ہندوستان آیا اور جنوری 1849ء میں لارڈ ہیوز کے ساتھ چلیان والا کی خون ریز لڑائی میں شریک ہوا۔ دوسری لڑائی گجرات کے مقام پر ہوئی جس نے سکھوں کی طاقت کو ختم کر دیا اور پنجاب کی قسمت کے آخری فیصلے کا وقت آگیا۔ ہنری لارنس الحاق کے خلاف تھا۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ اس کا بھائی جان لارنس الحاق کے حامیوں میں تھا۔[1] 29/مارچ 1849ء کو اعلان جاری کیا گیا کہ پنجاب کی حکومت ملکہ انگلستان نے اپنے ہاتھ میں لے لی ہے۔

جب سر ہنری لارنس نے الحاق کی خبر سُنی تو اس نے اپنا استعفےٰ پیش کر دیا۔ اس استعفےٰ کی جزوی وجہ تو یہ تھی کہ وہ الحاق کو انصاف سے بعید سمجھتا تھا لیکن اصل وجہ یہ تھی کہ اس کا خیال تھا کہ اس انتظام میں مفتوح لوگوں کے ساتھ سختی برتی جائے گی۔ لیکن لارڈ ڈلہوزی نقیب امن کی قدر و قیمت سے واقف تھا اور اس کا استعفےٰ منظور کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے اپنے سکریٹری کو سر ہنری کے پاس بھیجا اور اس سے پنجاب میں نمایاں حیثیت سے بدستور کام کرتے رہنے کی درخواست کی "اس کو محض اس وجہ سے کام کرنا چاہیے کہ اس طرح اس کو اپنا مقصد پورا کرنے کے مواقع مل سکیں گے یعنی وہ مفتوح لوگوں کے ساتھ انصاف اور مہربانی کا سلوک کر سکے گا۔ ان بہادر اور خوددار دشمنوں کو اطاعت کے جو زخم سہنے پڑیں گے ان پر مرہم لگا سکے گا۔ وہ ان کے سرداروں سے سب سے زیادہ واقف ہے اور اُن کی اعلیٰ صفات کا بڑا مداح ہے۔"[2]

ان دلیلوں نے سر ہنری کو مجبور کر دیا۔ لارڈ ڈلہوزی نے پنجاب کا انتظام ایک بورڈ کے سپرد کر دیا جو سر ہنری لارنس، اس کے بھائی جان لارنس اور چارلس مینسل پر مشتمل تھا جس کی جگہ جلد رابرٹ منٹگمری نے لے لی۔ سر ہنری لارنس اس بورڈ کا صدر تھا۔ سر ہنری نے سیاسی کام اپنے ذمے لیا۔ جان لارنس نے سول

---

[1] اس بات کو عام طور سے تسلیم کیا جاتا ہے مگر اٹھارہ سال بعد جان لارنس نے اس کی تردید کی تھی۔ اس نے سر اسٹیفورڈ نارتھ کورٹ، سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا، کو مندرجہ ذیل تحریر بھیجی تھی "حقیقت یہ ہے کہ پنجاب کے علاوہ الحاق کے کسی واقعہ سے میرا زیادہ تعلق نہیں رہا ہے۔ پنجاب میں بھی الحاق کی پالیسی سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا میں نے تو صرف اس پالیسی پر عمل کیا تھا۔" خط مورخہ 25/جون 1869ء۔ مندرج باسورتھ اسمتھ، لارڈ لارنس کی سوانح (Life of Lawrence) (1885ء)، جلد 2، ص 365۔

[2] لیفٹیننٹ جنرل ایم لیوڈ انس (M.Leod Innes)، سر ہنری لارنس نقیب امن (بقیہ اگلے صفحہ پر)

...رمال کے انتظامات کی ذمہ داری لی مینسل اور اس کے جانشین منٹگمری نے محکمہ انصاف سنبھالا۔

بورڈ میں یک جہتی نہیں تھی اور جلد جھگڑے شروع ہوگئے۔ اپنی نیک نفسی کی بنا پر ہنری لارنس چاہتا تھا کہ نئے برطانوی صوبے میں بدبخت سرداروں کی اعلا حیثیت اور مناصب کو برقرار رکھا جائے اور قدیم دستور کے مطابق انھیں طبقہ اشراف سمجھا جائے۔ جان لارنس چاہتا تھا کہ لارڈ ڈلہوزی کے تنگ دلانہ تصورات پر عمل کیا جائے یعنی سردار گزربسر کے علاوہ کسی چیز کے مستحق نہیں ہیں اور کسی کو عام لوگوں اور ان کے بدیسی حکمرانوں کے درمیان دخل اندازی نہیں چاہیے۔ ہنری لارنس لوگوں کے قدرتی اور باثر رہنماؤں کو تسلیم کرنے کی مسلسل کوشش کرتا رہا۔ جان لارنس، جس کے پاس مالگزاری کا محکمہ تھا، یہ چاہتا تھا کہ کسانوں کے ادا کردہ زمین کے محصول پر سخت گرفت رکھی جائے۔ اس کا خیال تھا کہ پرانے سرداروں کو اگر تسلیم کر لیا گیا تو مالگزاری کا جو روپیہ حکومت کے پاس آنا چاہیے وہ سرداروں کی جیبوں میں جانے لگے گا۔

حالانکہ دونوں بھائیوں کے آپس میں بڑے اچھے تعلقات تھے اور وہ ایک دوسرے کا بہت لحاظ کرتے تھے لیکن امور منصبی کی حد تک ان کے تعلقات خراب ہوگئے تھے جس کا اثر سرکاری کاموں پر پڑتا تھا۔ جان لارنس نے گورنر جنرل کے سکریٹری کو لکھا تھا "پہلے کی طرح اب بھی مجھ میں اور میرے بھائی میں اختلافات ہیں اور ہم مل کر فرائض منصبی بحسن وخوبی ادا نہیں کر سکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے اختلافات میں اضافہ ہوگیا ہے۔ اب ہم ملتے بھی بہت کم ہیں اور سرکاری معاملات پر گفتگو تو اور بھی کم کرتے ہیں۔۔۔ میرے خیال میں اصل خرابی یہ ہے کہ ایسے دو آدمیوں کو مل کر کام کرنا پڑ رہا ہے جو مضبوط ارادے اور متضاد خیالات کے حامل ہیں اور جن کے طبائع اور طریقۂ کار میں ہم آہنگی نہیں ہے[ا]۔"

دونوں بھائیوں نے استعفے پیش کر دیئے۔ لارڈ ڈلہوزی کو ان دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ اس کے لیے اُسے زیادہ سوچ بچار نہیں کرنا پڑا۔ اس نے انتظامی بورڈ کو موقوف کر دیا، جان لارنس کو پنجاب کا چیف کمشنر بنا دیا اور سر ہنری لارنس کو راجپوتانہ کے ایجنٹ کے نسبتاً ادنا عہدے پر مقرر کر دیا۔

(صے سے آگے)

(Sir Henry Lawrence, the Pacificator)، (1889ء) ص 113۔

[ا] 5 دسمبر 1852ء کا خط، لارنس کی سوانح (Life of Lawrence) از باسورتھ اسمتھ (1885ء)، جلد 1، ص 336۔

"لارڈ ڈلہوزی کا یہ فیصلہ پنجاب کے لیے ایک ناگہانی مصیبت ثابت ہوا۔ سب کے چہروں سے غم کے آثار نمایاں تھے۔ بڈھے اور جوان، امیر اور غریب، فوجی اور غیر فوجی، انگریز اور ہندوستانی سب کو محسوس ہوا کہ وہ ایک دوست سے محروم ہو گئے ہیں۔ ہربرٹ اڈورڈس جیسا مضبوط انسان، جو ان سب میں ایک نمایاں حیثیت رکھتا تھا، بچوں کی طرح رونے لگا۔ جب جدائی کا لمحہ آیا اور 20/جنوری 1853ء کو ہنری لارنس اپنی بیوی اور بہن کے ہمراہ ہمیشہ کے لیے لاہور اور پنجاب سے رخصت ہونے لگا تو مقامی سرداروں کا ایک پورا قافلہ اس کے ساتھ چلا۔ کوئی پانچ میل تک اس کے ساتھ گیا، کوئی دس میل تک چلا، کچھ لوگ تو بیس پچیس میل تک ساتھ چلتے رہے۔ یہ وہ لوگ تھے جنھیں اس سے اب کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ کم سے کم پنجاب کی حد تک سر ہنری لارنس کے اقتدار کا سورج ہمیشہ کے لیے غروب ہو چکا تھا۔ لیکن وہ اس حقیر مظاہرے سے اپنے غم، اپنے جذبہ احسان مندی اور اپنی تحسین و توصیف کا ثبوت دینا چاہتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لوگ ایک زندہ جنازے کے ساتھ چل رہے ہیں۔ لاہور سے قریب قریب امرتسر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ رابرٹ نیپیر، جو لب ماگ والا کے لارڈ نیپیر کے نام سے مشہور رہے، اس کو اپنے بھائی سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ سب کے آخر میں اس نے خدا حافظ کہا۔ جب نیپیر بھاری دل کے ساتھ لاہور واپس جانے لگا تو ہنری لارنس نے اپنی بہن سے کہا آگے بڑھ کے اس کا بوسہ لو۔ یہ شخص میرا بہترین اور عزیز ترین دوست ہے۔ جب وہ امرتسر پہنچا تو وہاں کے ڈپٹی کمشنر چارلس سانڈرس (Charles Sanders) کے گھر پر غمزدوں کا ایک اور ہجوم اس کا منتظر تھا اور ایک دفعہ پھر کہرام مچ گیا۔ امرتسر سے ہنری لارنس راجپوتانہ کی طرف روانہ ہو گیا[1]"

اس کتاب میں سر ہنری لارنس کا ذکر پھر کئے گا۔ 22/جولائی 1857ء کو، جب شمالی ہندوستان میں ہونے والی ایک بڑی بغاوت کی بنا پر انگریزی راج کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا اور یہ محسوس کیا جاتا تھا کہ لارڈ کیننگ کی موت یا استعفےٰ کی صورت میں ہندوستان میں رہنمائی کرنے والا کوئی باقی نہیں رہے گا، کورٹ آف ڈائریکٹرز نے یہ مناسب سمجھا کہ عارضی طور سے گورنر جنرل کے فرائض ادا کرنے کے لیے کسی کو نامزد کر دیا جائے۔ قرعہ فال اس شخص کے نام پڑا جو جنگ میں ایک بہادر سپاہی اور زمانہ امن میں ایک ہمدرد حاکم ثابت ہو چکا تھا۔ بورڈ نے فیصلہ کیا "لارڈ کیننگ کی موت، استعفےٰ یا ہندوستان سے واپس آنے کی صورت میں اس وقت تک کے لیے سر ہنری منٹگری لارنس کے سی۔ بی۔ کو ہندوستان

---

[1] لارڈ لارنس کی سوانح عمری (Life of Lord Lawrence) از باسورتھ اسمتھ (1885ء) جلد اول ص 336-325

کا عارضی گورنر جنرل مقرر کیا جائے جب وقت تک لارڈ کیننگ کا جانشین انگستان سے نہ آ جائے۔ لیکن یہ اعزاز بعد از وقت ثابت ہوا۔ 4/جولائی کو سر ہنری لارنس لکھنؤ میں ہلاک ہو چکا تھا۔ اس عظیم انگریز کے بعد جس کا جانشین اس کو بنایا گیا تھا وہ ہندوستان کا سب سے زیادہ فراخ دل حاکم تھا۔

ہنری لارنس کی نجی زندگی کی کہانی بھی بہت دلچسپ ہے لیکن ہندوستان کے حکام کے لیے اس کی وہ پالیسی دوامی دلچسپی کا باعث ہے جو اس نے سرکاری معاملات میں اختیار کی۔ اپنے زمانے میں وہ حکام کے ایک خصوصی مکتب خیال کی نمائندگی کرتا تھا۔ وہ مکتب خیال جس کی بنیاد گزشتہ دور میں الفنسٹن اور بین ٹنک ڈال چکے تھے اور جو آکلینڈ اور ڈلہوزی کی سامراج پسندی کے زمانے میں قریب قریب نیست و نابود ہو چکا تھا۔ جنرل ایم لیو ڈانس نے لکھا تھا "یہ مکتب خیال دیسی لوگوں کے احساسات رسم و رواج اور اندازِ فکر کا خاص طور سے پاس کرتا تھا، دیسی ریاستوں کے حقوق کو منصفانہ طور سے تسلیم کرنے کا مطالبہ کرتا تھا اور لوگوں کے قدرتی رہنماؤں کے ساتھ سمجھداری کا اور اچھا سلوک کرنے پر اصرار کرتا تھا۔[1]"

لارڈ ڈلہوزی نہ کبھی اس مکتب خیال کو پوری طرح سمجھ سکا اور نہ کبھی اس نے اس کی قدر کی۔ وہ سامراج پسند تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بدیسی حکمرانوں کی راست حکومت ہندوستان کے لوگوں کے لیے بہتر طرزِ حکومت ہے اور درمیان میں حائل ہونے والے دیسی سردار اور رہنما انتظامات میں بیجا مداخلت کرتے ہیں اور اصلاحات کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں۔ اس نے وہی غلطی کی جو ہندوستان کے برطانوی حکمران بار بار کرتے رہے ہیں یعنی پُرانے رہنماؤں اور پُرانے اداروں کو نظر انداز کیا اور اُن کی جگہ انگریزی حکام کے راست اور ذاتی انتظامات کو رواج دینے کی کوشش کی۔ سر ہنری لارنس کو پنجاب سے ہٹا کر لارڈ ڈلہوزی نے اس کی پالیسی کو قریب قریب ختم کر دیا، لوگوں کے قدرتی رہنماؤں کو اُٹھا کر ایک طرف پھینک دیا اور ایک زراعت پیشہ قوم پر براہ راست حکومت کرنے لگا۔ یہ پالیسی سمجھداری پر مبنی نہیں تھی۔ پچاس سال میں اس لیے نظم و نسق میں سُدھار نہ ہو سکا ہے۔

قومی ادارے قومی ضرورتوں کے نتائج اور اُن ضرورتوں کا خارجی اظہار ہوا کرتے ہیں۔ ہندوستان کے لوگوں نے پنچایتوں کو جنم دیا اور پولی گروں اور زمینداروں کی، جاگیرداروں اور تعلق داروں کی اور سرداروں اور پنچایتوں کی ماتحتی قبول اس لیے کی کہ انھیں ان کی ضرورت تھی۔

---

[1] سر ہنری لارنس، نقیب امن (Sir Henry Lawrence, the Pacificator) از لیفٹیننٹ جنرل ایم لیو ڈانس، (1898ء)، تعارف۔

اُن کی سماجی ضرورتوں نے اُن کے سماجی اداروں کی بُنیاد ڈالی۔ وہ اپنی دیہی پنچایتوں اور قدرتی رہنماؤں کے سائے میں خود کو محفوظ سمجھتے تھے اور پُرمسرت زندگی گزارتے تھے۔ اس قسم کے انتظامات میں مداخلت حکمرانوں کے لیے مناسب نہیں۔ بدیسی حکمرانوں کے لیے یہ بڑی غیر دانشمندی کی بات ہوگی اگر وہ لوگوں کے منظّم اداروں کو نظر انداز کریں۔

اس طرح جو جگہ خالی ہو گئی ہے وہ ابھی تک پُر نہیں کی جا سکی ہے۔ پُرانی گانو پنچایتوں کی جگہ کوئی ایسے مناسب ادارے وجود میں نہیں آسکے جو اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں۔ مدراس، بمبئی اور پنجاب کی حکومتوں نے ایسا کوئی انتظام نہیں کیا ہے کہ لوگوں کے قدرتی رہنما مناسب انداز میں لوگوں کی خواہشات و خیالات حکومت تک پہنچا سکیں۔ بنگال کی حکومت کے مقابلے میں، جہاں لارڈ کارنوالس نے سماج کو انتشار سے محفوظ رکھا تھا، ان حکومتوں کو رائے عامہ سے متاثر و مستفید ہونے کے مواقع کم حاصل ہیں۔ مدراس اور بمبئی میں چونکہ گانو پنچایتیں اور زمیندار موجود نہیں تھے اس لیے وہاں زیادہ مالگزاری تشخیص بھی ہوئی اور اس میں زیادہ سختی بھی برتی گئی۔ پنجاب میں پچاس سال پہلے چونکہ لوگوں کے قدرتی رہنماؤں کو غیر دانشمندانہ طور پر نظر انداز کیا گیا تھا اس کی وجہ سے وہاں کے مالکان اراضی جو خود کاشت کرتے ہیں، خوشحال نہ ہو سکے اور اس وقت حکومت کو انھیں رہنماؤں کے ایک نئے طبقے یعنی سٹے بازوں، صرافوں اور ساہوکاروں سے محفوظ رکھنے کے لیے اپنی پوری کوشش کرنی پڑ رہی ہے۔ یہ طبقہ وہ بدترین طبقہ اشراف ہے جس کے لیے کسی ملک میں گنجائش نہیں ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ یورپ کی طرح ایشیا میں بھی کسی نہ کسی قسم کی نمائندگی اور کسی نہ کسی قسم کی حکومت خود اختیاری کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے تاکہ قوم کے مفادات کا تحفّظ اور اس کی خوشحالی میں اضافہ کیا جا سکے۔ حکومت خود اختیاری کے جو طریقے ہندوستان میں رائج تھے ان سے انگریز واقف نہیں تھے۔ لیکن وہ ہندوستان کے لیے کارآمد تھے۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ اُن کو ترقّی دی جاتی، اُن کی اصلاح کی جاتی اور اُنھیں زیادہ کارآمد بنایا جاتا۔ لیکن ہوا یہ کہ ان کو مٹا دیا گیا اور ان کی جگہ پُر نہ کی گئی۔ بحرانی دَور میں ان کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ انگریزی راج لوگوں کی حمایت حاصل کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ سامراج کو کوئی قومی اساس نصیب نہیں ہو سکی ہے۔ جنرل ایم لیو ڈانس نے مذکورہ بالا کتاب میں لکھا ہے کہ غدر کے مایوس کُن ایام میں ستلج کے ادھر رہنے والے سکھوں نے اور ملتان اور سرحد کے مسلمانوں نے اپنے سرداروں کی ہدایت کے مطابق مضبوط فوجی دستے مہیا کیے اور بیش بہا خدمات سر انجام دیں۔ لیکن پنجاب کے سکھ، جن کے رہنما باقی نہیں رہے تھے، دہلی کی فتح سے پہلے کوئی خدمت نہ کر سکے۔

ہندوستان کے حکّام زمانہ امن میں بھی اس کی ضرورت اسی حد تک محسوس کرتے ہیں جس حد تک جنگ کے دوران محسوس کی گئی تھی۔ بدیسی حکومت کو ہر دل عزیز اور موثر بنانے کے لیے تعاون کی ضرورت اب بھی محسوس کی جاتی ہے۔

جان لارنس نے لارڈ ڈلہوزی کی پالیسی پر عمل کیا۔ اس نے نکلسن (Nicholson) کو لکھا تھا "شرح تشخیص کم رکھو تاکہ زمین پر قابض و دخیل کسان کے لیے معقول و مناسب حصہ بچ رہے۔ اس صورت میں وہ زیادہ کاشت کریں گے اور مالگزاری پر فصلیں خراب ہونے کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ درمیانی لوگوں کو منہ نہ لگاؤ۔ وہ لوگ ہر ملک کے لیے لعنت ہوا کرتے ہیں[1]۔"

لیکن شرح تشخیص کم نہیں تھی۔ ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی طرح انگریزوں کا قبضہ ہونے کے بعد تیزی سے اس میں اضافہ کیا گیا۔ 48-1847ء میں پنجاب کی مالگزاری 8,20,000 پونڈ تھی۔ الحاق کے تین سال کے اندر مالگزاری بڑھ کر 10,60,000 پونڈ ہو گئی تھی۔ کسانوں کو چونکہ مالگزاری رقم کی صورت میں ادا کرنی ہوتی تھی اس لیے قیمتیں گرنے کی وجہ سے اُن کے دکھوں میں اضافہ ہو گیا۔ 1851ء میں کسانوں نے بڑی چیخ پکار کی "کسان عام طور سے مطالبہ کرتے ہیں کہ جنس کی صورت میں مالگزاری ادا کرنے کا طریقہ پھر رائج کیا جائے اور ہر سال پیداوار کی متناسب تقسیم کو پھر رواج دیا جائے۔ بورڈ اس مطالبے کو منظور کرنے کے لیے تیار نہیں ہے لیکن اس نے ہدایت جاری کر دی ہے کہ جہاں مناسب سمجھا جائے مالگزاری کی وصولی ملتوی کر دی جائے[2]۔"

نظم و نسق کے متعلق پنجاب کی پہلی رپورٹ سے مختلف اضلاع کے متعلق مندرجہ ذیل اعداد و شمار اخذ کیے گئے ہیں۔

کمشنری	ضلع	مالگزاری 1850-51ء پونڈ	مالگزاری 1851-52ء پونڈ
لاہور	لاہور	38,060	40,614
	امرتسر	86,872	1,02,473

[1] لارڈ لارنس کی سوانح (Life of Lord Lawrence) از باسورتھ اسمتھ (1885ء) جلد ا، ص 341

[2] پنجاب کے نظم و نسق کی رپورٹ، 1862ء، پیراگراف 264، 266 اور 270۔

کشنری	ضلع	مالگزاری 51-1850ء	مالگزاری 52-1851ء
	دینانگر	89,927	94,041
	وزیرآباد	1,08,338	1,14,018
	سیخ پورہ	31,916	38,322
جہلم	گجرات	59,382	59,859
	جہلم	96,548	72,091
	راولپنڈی	82,481	82,056
	شاہپور	41,231	34,381
لیا	لیا	48,444	54,357
	خون گرلھ	49,534	48,463
	ڈیرہ غازی خاں	45,574	47,280
	ڈیرہ اسمٰعیل خاں	48,968	50,656
ملتان	ملتان	56,430	60,359
	جھنگ	27,878	34,962
	پاک پٹن	25,757	38,312
	پشاور	89,307	71,929
	ہزارا	18,854	16,815
میزان[1]		10,18,502	10,60,989

[1] 1863ء کی پنجاب کے نظم ونسق کی رپورٹ، پیراگراف 274۔

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

زمین کا انتظام کرنے کے سلسلے میں جان لارنس نے سب سے پہلے اس اصول پر عمل کیا کہ "شرح تشخیص کم رکھی جائے"۔ اسے جلد محسوس ہوگیا کہ مجموعی پیداوار کے ایک تہائی کا مطالبہ کسانوں کے لیے بہت زیادہ ہے جو رقم کی شکل میں ادا کرنا ہوتا تھا۔ کچھ برسوں میں حکومت پنجاب نے اس غلطی کا ازالہ کر دیا۔ پنجاب میں زمین کا محصول کم کر کے مجموعی پیداوار کا چوتھائی اور اس کے بعد چھٹا حصہ کر دیا گیا۔ زراعت کی توسیع، مالگزاری کے اضافے اور زیادہ وصولیابی نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ اقدام سمجھداری پر مبنی تھا۔

1856-57ء اور 1857-58ء کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا اعداد و شمار کے مقابلے میں مالگزاری بہت بڑھ گئی تھی اور وصولیابی کی شرح قابل اطمینان تھی[1]

1856-57ء	14,85,000 پونڈ	14,52,000 پونڈ
1857-58ء	14,65,000 پونڈ	14,52,000 پونڈ

پنجاب کے الحاق کے فوراً بعد باضابطہ بند و بست شروع کر دیا گیا تھا اور مکمل ہی ہونے والا تھا

(صـــ سے آگے)

پنجاب کی پہلی رپورٹ جس کے متعدد اقتباسات پچھلے صفحات میں دیے گئے ہیں سر رچرڈ ٹمپل کی آسان نویسی کا نمونہ تھی جو ہندوستان میں کلاسیکی کہلاتا تھا۔ حالانکہ جان لارنس بڑا اچھا منتظم تھا لیکن تحریر کا کچا تھا اور اپنی اس کمی سے واقف تھا جب وہ 1851ء میں رچرڈ ٹمپل سے پہلی دفعہ شملہ میں ملا اور بند و بست کے متعلق اس کی کچھ رپورٹیں دیکھیں تو بہت خوش ہوا۔ اس نے اپنے ایک دوست سے کہا تھا "یہ آدمی سکریٹری کے عہدے کے لیے بہت موزوں ہے۔ وہ میری بات سمجھ سکتا ہے اور اس کو اچھے انداز میں لکھ سکتا ہے"۔ اس کے فوراً بعد ٹمپل کے سپرد اس رپورٹ کو لکھنے کا کام کر دیا گیا جس کا مسودہ جزوی طور سے ہنری لارنس اور جان لارنس تیار کر چکے تھے لیکن نئے سکریٹری نے پوری رپورٹ از سر نو لکھی۔ اس لیے پنجاب کی پہلی رپورٹ ہندوستان کی تمام رپورٹوں سے مختلف ہے اور ایک ایسی دستاویز ہے جس کو دلچسپی کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے۔ 1854ء میں جب ٹمپل انگلستان سے واپس آیا اور اپنا کام شروع کیا تو جان لارنس پنجاب کا چیف کمشنر مقرر کیا جا چکا تھا۔ اس نے ٹمپل سے کہا "مجھے خوشی ہے اب آپ کو اپنی حیثیت کا اندازہ ہوگیا۔ مجھے آپ کی رائے پسند ہے اور آپ کا قلم پسند ہے لیکن اس بات کو یاد رکھیے کہ آپ کو میری پالیسی اور میرے تصورات کو پیش کرنا ہوگا۔ اپنی پالیسی اور اپنے تصورات کو نہیں۔ ایک زمانہ ایسا بھی آسکتا ہے جب آپ کی پالیسی کو تسلیم کیا جائے لیکن ابھی تو میرا زمانہ ہے۔ ہر شخص کا زمانہ ہوا کرتا ہے"۔ لارنس کی سوانح (Life of Lord Lawrence) از باسورتھ اسمتھ۔

[1] پنجاب کے نظم و نسق کی رپورٹ برائے 1856-57ء اور 1857-58ء، پیراگراف 37۔

کہ 1858ء ایسٹ انڈیا کمپنی ختم ہو گئی۔ لاہور اور امرتسر اضلاع کے بندوبست میں جو 1860ء اور 1872ء کی درمیانی مدت میں ہوئے تھے، سرکاری مطالبہ مجموعی پیداوار کا چھٹا حصہ مقرر کیا گیا تھا۔ لیکن بعد میں بننے والے ضابطوں کی رو سے، جو 1871ء کے مالگزاری ایکٹ (1871ء Land Revenue Act) کے تحت بنائے گئے تھے، حکومت نے غیر دخیل کار آسامیوں کے اس حقیقی لگان کا نصف، جو وہ عام حالات میں ادا کرتے تھے، سرکاری مطالبے کے طور پر طلب کرنا شروع کر دیا۔

ہم باری باری شمالی ہندوستان، بمبئی، مدراس اور پنجاب کا ذکر کر چکے ہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے نظام مالگزاری کے آخری نتائج پر طائرانہ نظر ڈالنے کے لیے ہم اپنے قارئین کی توجہ ایک دستاویز کی طرف دلائیں گے جو نہایت دقت نظر کے ساتھ تیار کی گئی تھی یعنی انڈیا ہاؤس کی وہ رپورٹ جو 1857ء میں پیش کی گئی تھی[1]۔ اس پر جان اسٹورٹ مل کے دستخط ہیں جو اس زمانے میں انڈیا آفس کی خط و کتابت کا نگران تھا۔ غالباً رپورٹ تو کسی کلرک نے تیار کی ہو گی لیکن اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے مل نے فلسفیانہ انداز میں نوک پلک درست کی ہے اور جزویات کی صحت کا خیال رکھا ہے۔ اس کے کچھ اقتباسات ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔

ہندوستان کے نظام مالگزاری کے متعلق جان اسٹورٹ مل کے خیالات۔

بنگال ـــــ "بنگال پریسی ڈنسی کے زیریں حصّے میں زمین کے مالک زمیندار ہیں جو سالانہ ایک رقم ادا کرتے ہیں جس کا استمراری تعیّن کر دیا گیا ہے۔ 1845ء کے ایکٹ نمبر ا کی دفعات کی رو سے ادائیگی وقت پر نہ ہونے کی صورت میں ان کی جائیداد فروخت کی جا سکتی ہیں۔ حکومت کے قبضہ و تصرف میں صرف وہ زمینداریاں ہیں جو مالگزاری وقت پر ادا نہ ہونے کی وجہ سے فروخت کی گئیں اور سرکاری روپے سے خریدی گئیں۔ زمین کے محصول کی شرح ہمیں معلوم نہیں ہے لیکن خیال ہے کہ یہ رقم عام طور سے مجموعی لگان کی نصف ہوا کرتی ہے۔"

شمالی ہندوستان ـــــ "پہلی بات تو یہ ہے کہ ایسے تمام علاقے جہاں آبادی پائی جاتی ہے حصّوں میں بٹے ہوئے ہیں جن کی سرحدوں میں تبدیلی نہیں ہوتی ہے۔ ان کو محال یا زمینداری کہا جاتا ہے۔

---

[1] وہ رپورٹ جو ہاؤس آف کامنز کے حکم مورخہ 9 جون 1857ء کی تعمیل میں پیش کی گئی تھی اور جس میں دکھایا گیا تھا کہ ہندوستان کی مختلف پریسی ڈنسیوں میں لگان داری کی کیا شرائط تھیں اور زمین کا کتنا محصول ادا کرنا پڑتا تھا۔

ہر محال پر بیس سال یا تیس سال کی مدت کے لیے ایک رقم تشخیص کی جاتی ہے۔ رقم تشخیص کرتے وقت اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ زمین کی خالص آمدنی کے علاوہ مناسب منافع بھی کسان کو ملے۔ وقت پر ادائیگی کے لیے یہ سمجھا جاتا ہے کہ زمین ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حکومت کے پاس رہن ہے۔

"دوسری بات یہ ہے کہ اس شخص یا اشخاص کا تعین کیا جاتا ہے جو منافع پانے کے حقدار ہیں۔ اس حق کو موروثی اور قابل انتقال قرار دیا گیا ہے۔ جس شخص یا اشخاص کو یہ حق حاصل ہوتا ہے وہ زمین کے مالک سمجھے جاتے ہیں اور ان سے محال پر تشخیص ہونے والے سرکاری مطالبے کی رقم وصول کی جاتی ہے"۔

"تیسری بات یہ ہے کہ محال کے تمام مالکان پر، انفرادی اور مشترکہ طور سے، ان کی ذات اور جائیداد کی حد تک، محال پر تشخیص ہونے والے سرکاری مطالبے کی رقم کی ادائیگی کی ذمہ داری ہے۔ جب مالکان کی تعداد ایک سے زیادہ ہوتی ہے۔ تو اس امر کا فیصلہ کیا جاتا ہے کہ کس اصول کے مطابق منافع تقسیم کیا جائے گا یا جائیداد کا نقصان پورا کیا جائے گا۔ اگر مالکان کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے تو ان میں کچھ کے سپرد یہ کام کیا جاتا ہے کہ خود اپنی طرف سے اور دوسرے مالکان کے نمائندوں کی حیثیت سے وہ محال کا انتظام کریں اور اس پر تشخیص ہونے والی رقم ادا کریں"[1]۔

"ابتدا میں شرح تشخیص محال یا جائیداد کی خالص پیداوار کے دو تہائی حصے تک محدود تھی لیکن یہ فیصلہ کیا جا چکا ہے کہ تیس سال گزرنے کے بعد، جو بندوبست کی پہلی مدت کار تھی، نظر ثانی کے وقت، جو جلد ہونے والی ہے، سرکاری مطالبے کو کم کر کے اوسط خالص پیداوار کا نصف کر دیا جائے"[2]۔

مدراس — "مدراس پریسی ڈنسی میں مالگزاری کے جو طریقے رائج ہیں وہ ہیں زمینداری، گانو کے مشترک لگان کا طریقہ، رعیت واری اور الانگو"۔

"زمینداری کا طریقہ زیادہ تر شمالی سرکاروں میں رائج ہے حالانکہ دوسرے اضلاع مثلاً مدورا، نلور، شمالی آرکاٹ وغیرہ میں بھی بڑی بڑی زمینداریاں پائی جاتی ہیں"۔

"گانو کی لگان داری کے طریقے میں گانو کے لوگ زمیندار کی جگہ لیتے ہیں اور حکومت سے مشترکہ پٹا کرتے ہیں۔ پوری آبادی یا اس کے ایک حصے کو، ایک معینہ مدت کے لیے، گانو لگان پر اٹھا دیا جاتا

---

[1] یہ تین قاعدے ٹامسن کی کتاب "ہدایات برائے حکام بندوبست" سے لیے گئے ہیں جن کا ذکر ایک پچھلے باب میں کیا جا چکا ہے۔

[2] 1855ء کے سہارنپور کے ضابطوں کی رو سے۔

ہے۔ وہ براہِ راست سرکاری مطالبہ ادا کرتے ہیں، اپنے داخلی معاملات میں کنڈ ہوستہ رہتے ہیں دو بکشت کے لیے زمین آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔"

"رعیت داری طریقے میں جس شخص کا نام کاغذات میں قابض کی حیثیت سے درج ہوتا ہے وہ زمین کا مالک سمجھا جاتا ہے اور سرکاری مطالبہ براہِ راست ادا کرتا ہے۔ اس کو حق حاصل ہوتا کہ وہ اپنے کھیت کو شکمی کو اٹھائے یا ہبہ اور بیع کرے یا رہن رکھے۔ جب تک وہ معینہ مالگزاری ادا کرتا رہے اس کو بے دخل نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اُسے یہ بھی حق حاصل ہوتا ہے کہ ہر سال وہ اپنی جوت میں اضافہ و تخفیف کر سکے یا اس سے دست بردار ہو جائے۔ فصل خراب ہونے کی صورت میں پوری پیداوار یا اس کے ایک جز کے نقصان کی بنا پر چھوٹ دی جاتی ہے۔ مالگزاری رقم کی شکل میں تشخیص ہوتی ہے اور ہر سال اس میں تبدیلی نہیں کی جا سکتی ہے۔ صرف ان صورتوں میں پانی کی مزید رقم حکومت کو ادا کرنی ہوتی ہے جب حکومت کے تعمیر کردہ ذرائع آبپاشی سے پانی لے کر بارانی زمین کو سینچائی کی زمین میں یا ایسی زمین میں تبدیل کیا جائے جس میں دو فصلیں ہو سکیں۔ اگر کسان اپنے خرچ سے زمین کو ترقی دے تو اس کی بنا پر مالگزاری میں اضافہ نہیں کیا جاتا ہے۔ اس طریقے میں کسان اپنی زمین کا قریب قریب مالک ہوتا ہے اور اس کی یہ حیثیت ایک سیدھے سادے مگر مکمل حق کی بنا پر ہوتی ہے۔ اس کو استمراری پٹے کے تمام فوائد حاصل ہوتے ہیں لیکن اس کی ذمّہ داریوں سے محفوظ رہتا ہے۔ وہ جب چاہے اپنی زمین سے دست بردار ہو سکتا ہے لیکن جب تک وہ سرکاری مطالبہ ادا کرتا رہے اس کو کوئی بے دخل نہیں کر سکتا۔ فصل کی خرابی کی صورت میں اس کی مدد کی جاتی ہے اور اس کے پڑوسی اگر مالگزاری ادا نہ کریں تو ادائیگی کی ذمّہ داری اس پر نہیں ڈالی جاتی . . . رعیت داری طریقے میں سال بہ سال ہونے والے بندوبستوں کے متعلق لوگوں میں غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ اس بات کی صراحت کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہر سال کسان اپنی جوت میں جو اضافہ یا کمی کرتے ہیں اُن بنیادوں پر حقوق کا تعیّن کرنے کے لیے یہ بندوبست ضروری ہیں۔ ان بندوبستوں کا مقصد تشخیص تو نہیں ہوتا ہے۔ ان کا مقصد تو صرف اس مالگزاری کا تعیّن کرنا ہوتا ہے جو کسان کو اپنی جوت پر ادا کرنی چاہیے۔ جہاں کسان کی جوت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ہے وہاں نیا پٹا کرنا ضروری نہیں ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں سال بہ سال ہونے والے بندوبستوں کا کوئی اثر فریقین پر نہیں پڑتا ہے اور ان کسانوں کے لیے حاضری دینا ضروری نہیں ہوتا ہے۔"

"اُنگولگان داری کا طریقہ صرف تنجور اور ٹنی ویلی میں پایا جاتا ہے اور وہاں بھی وہ عام

نہیں ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ سرکاری مطالبے کا تعین منڈی میں ملنے والی قیمتوں کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ جب یہ طریقہ شروع کیا گیا تھا اس وقت ہر گانو پر غلے کی کچھ مقدار تشخیص کی گئی تھی اور غلے کی قیمت مقرر کر دی گئی تھی۔ اس قیمت کی بنا پر غلے کو رقم میں تبدیل کر لیا جاتا تھا لیکن یہ بھی طے پایا تھا کہ کسی سال میں اگر مقررہ قیمت میں دس فیصدی کا اضافہ یا پانچ فیصدی کی تخفیف ہوگئی تو کسان کے بجائے حکومت نفع لینے کی اور نقصان برداشت کرنے کی ذمہ دار ہو گی۔ اس طریقے کا فائدہ یہ ہے کہ نفع کی صورت میں حکومت کے ساتھ کسان بھی منافع میں شریک ہوتا ہے لیکن قیمتیں گرنے کی صورت میں کسان نقصان سے محفوظ رہتا ہے۔ لیکن اس طریقہ کی خرابی یہ ہے کہ منڈی کی صحیح صحیح قیمتیں معلوم کرنے میں دشواریاں پیش آتی ہیں۔ ان قیمتوں کے متعلق سال بھر تفتیش و تحقیقات کرنی پڑتی ہے۔"

بمبئی ——"بمبئی پریسی ڈنسی کے نظام مالگزاری کو عام اصطلاح میں رعیت واری کہا جا سکتا ہے۔ اس کو یوں سمجھئے کہ عام طور سے حکومت کی زمین[1] پر قبضہ رکھنے والے بغیر کسی کو بیچ میں ڈالے سرکاری افسروں سے اس زمین کی مالگزاری یا لگان کا تصفیہ کر لیا کرتے ہیں لیکن اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ پوری پریسی ڈنسی میں اس قسم کی مثالیں عام طور سے ملتی ہیں کہ مالکان اعلا مختلف ناموں سے پورے گانو کا پٹا اپنے حق میں کر لیتے ہیں یا کئی مالکان اعلا مشترک طور سے گانو کا پٹا حاصل کر لیتے ہیں۔"

"پوری پریسی ڈنسی میں مالگزاری کی تشخیص نو ہو رہی ہے۔ اس بند و بست میں ہر کھیت پر سرکاری مطالبے کا تعین اس کی نوعیت کے اعتبار سے کیا جا رہا ہے۔ جو رقم اس وقت مقرر کی جائے گی اس میں تیس سال تک کوئی تبدیلی نہیں ہو گی۔"

پنجاب ——"پنجاب میں زمین کا مالک ہی عام طور سے اس کو جوتتا بھی ہے حالانکہ کبھی کبھی کچھ کھیت آسامیوں کو بھی اٹھا دیے جاتے ہیں۔ ان کو لگان نہیں دینا ہوتا، صرف کاشت کی لاگت اور سرکاری مطالبے کا انتظام کرنا ہوتا ہے۔ اپنی بقیہ آمدنی وہ اپنے خاندان کی گزر بسر پر خرچ کر سکتا ہے یا پس انداز کر سکتا ہے۔ لیکن یہ لوگ جو انفرادیت پسند ہوتے ہیں ابھی تک گانو پنچایتیں بنانے میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔ پنجاب کا گانو ایسے کسانوں پر مشتمل نہیں ہوتا ہے جن کا ایک دوسرے سے تعلق نہ ہو۔ اس کے رہنے والے عام طور سے ایک خاندان کے ہوتے ہیں جس کی وجہ سے گانو کی حیثیت ایک بڑے کنبے کی

---

[1] "حکومت کی زمین" کہنا صحیح نہیں ہے۔ مدراس کی طرح بمبئی میں بھی زمین پر قبضہ رکھنے والے بلاشبہ اس کے مالک رہا کرتے تھے حکومت صرف زمین کا محصول وصول کرنے کی حقدار تھی جو کھیت کی پیداوار کے ایک حصّے پر مشتمل ہوتا تھا۔

کی ہو جاتی ہے جس کا ایک سربراہ ہوتا ہے، وہ مل جُل کر کام کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی امداد کرتے ہیں۔"

"برطانوی حکومت نے شروع سے طے کر لیا تھا کہ رقم کی صورت میں محصول کئی سال کے لیے تشخیص کیا جائے گا۔ ایک معینہ مدّت کے لیے مالکان اراضی کسان حکومت کے ساتھ تصفیہ کر لیتے ہیں۔ اس تشخیص اور تصفیے کے لیے بندوبست کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے لیکن یہ مالکان آراضی حکومت سے علاحدہ علاحدہ تصفیہ نہیں کیا کرتے ہیں۔ بیک وقت پورے گانو سے تصفیہ کیا جاتا ہے۔ گانو میں رہنے والی برادری اپنے سربراہ یا نمائندے کے ذریعہ فیصلہ کرتی ہے کہ کتنے برسوں تک اتنی رقم ادا کرتی رہے گی۔ اس کے بعد وہ اس رقم کو آپس میں بانٹ لیتے ہیں اور ہر ایک کا حصّہ مقرر کر دیا جاتا ہے۔ اصل میں تو ہر شخص کی جوت جُدا ہوتی ہے اور وہ اپنے حصّے کی رقم ادا کرتا ہے لیکن اس پر اپنے ساتھیوں کی ادائیگی کی ذمّہ داری بھی ہوتی ہے اور ان پر اس کی ادائیگی کی ذمّہ داری ہوتی ہے۔ اس طرح مشترک ذمّہ داری نے اُن میں ہم آہنگی پیدا کر دی ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ پنجاب کا طریقہ زمینداری کی تعریف میں آتا ہے اور زرعیت داری کی اُسے گانو کا طریقہ کہنا چاہیے۔ پہاڑوں پر اور شاذ شاذ دوسرے مقامات پر بھی زمینداری طریقہ پایا جاتا ہے اور ملتان کے قریب ایسا طریقہ پایا جاتا ہے جو رعیت واری طریقے سے ملتا جُلتا ہے۔ لیکن عام طور سے اور خصوصیت کے ساتھ اہم اضلاع میں گانو کا طریقہ رائج ہے۔"

خلاصہ ـــــ مندرجہ بالا واقعات کا خلاصہ چند لفظوں میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ بنگال میں زمین کے مالک زمیندار ہوتے تھے جو حکومت کو اس قسم کا زمین کا محصول ادا کیا کرتے تھے جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی تھی۔ شمالی ہندوستان میں زمین عام طور سے زمینداروں کی ملکیت ہوتی تھی۔ وہ زمین کا محصول ادا کرتے تھے جس پر ہر نئے بندوبست میں نظرِ ثانی کی جاتی تھی۔ بمبئی اور مدراس میں عام طور سے زمین کے مالک کسان ہوا کرتے تھے وہ بھی زمین کا محصول ادا کیا کرتے تھے جس پر ہر بندوبست میں نظرِ ثانی کی جاتی تھی۔ پنجاب میں عام طور سے زمین کسانوں کی ملکیت ہوا کرتی تھی جو گانوؤں میں مشترک زندگی گزارا کرتے تھے۔ ہر گانو مشترکہ طور سے زمین کا محصول ادا کیا کرتا تھا جس پر ہر نئے بندوبست میں نظرِ ثانی کی جاتی تھی۔

زمین کے محصول کے ان مختلف انتظامات نے کم از کم نظری اعتبار سے، رفتہ رفتہ شرحِ تشخیص میں یکسانیت پیدا کر دی تھی۔ انیسویں صدی کے وسط میں بنگال کی حد تک شرحِ تشخیص مجموعی لگان کی نصف تھی۔ شمالی ہندوستان میں 1855ء کے سہارنپور ضابطوں نے مجموعی لگان کی نصف شرحِ تشخیص مقرر کر دی تھی۔ بمبئی اور مدراس میں سر چارلس وُڈ نے زمین کے محصول کی شرح مناسب لگان کی نصف مقرر

کی تھی۔ پنجاب میں سرکاری مطالبہ کم کر کے اس لگان کا نصف کر دیا گیا تھا جو شکمی کاشتکار عام طور سے ادا کیا کرتے تھے۔

اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان میں زمین کے محصول کا اصول یہ ہے۔ جہاں زمین کے محصول کا استمراری تعین نہ ہو وہاں حقیقی یا مناسب لگان کا نصف مالگزاری کے طور پر وصول کیا جا سکتا ہے۔

لیکن جیسا کہ آئندہ ابواب میں دکھایا جائے گا عملاً یہ اصول نظر انداز کیا جاتا ہے۔ شمالی ہندوستان اور صوبجات متوسط میں، جہاں مالگزاری عام طور سے مالکان اراضی سے وصول کی جاتی ہے، حکومت حقیقی لگان کے نصف سے کہیں زیادہ وصول کر لیتی ہے۔ بمبئی اور مدراس میں، جہاں عام طور سے مالگزاری براہ راست کسانوں سے وصول کی جاتی ہے، حکومت مناسب لگان کی تمام تر رقم وصول کر لیتی ہے اور کسانوں کو اُن کی محنت کی اُجرت کے علاوہ کچھ نہیں ملتا ہے۔

باب 7

خام مال اور مصنوعات

1833ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے چارٹر کی تجدید کے وقت فیصلہ کیا گیا تھا کہ آئندہ کمپنی "تمام تجارتی کاروبار کا سلسلہ منقطع کر دے اور اس میں حصہ نہ لے" اور صرف ہندوستان کے منتظم اور حاکم کے فرائض ادا کرے۔ ابھی زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ اس اقدام کے مفید نتائج ظاہر ہونے لگے۔ جب ہندوستان کی تجارت و صنعت سے کمپنی کا مقابلہ نہیں رہا تو اس نے اُن میں زیادہ دلچسپی لینا شروع کر دی۔ 11/ فروری 1840ء کو کمپنی نے پارلیمنٹ کے سامنے ہندوستان کی صنعتوں پر لگنے والے ایسے غیر منصفانہ محصولوں کے خلاف ایک درخواست پیش کی جن سے اُن کی ہمت شکنی ہوتی تھی۔

اس درخواست کے متعلق رپورٹ پیش کرنے کے لیے ہاؤس آف کامنز کی ایک سلیکٹ کمیٹی مقرر کی گئی۔ اس کا صدر لارڈ سیمور (Lord Seymour) تھا اور اس کا ایک رکن مسٹر گلیڈسٹن تھا جو اس وقت تیس سال کا نوجوان اور پکا اور انتہائی مستقل مزاج ٹوری تھا۔ اس کمیٹی کا ایک اور رکن مسٹر بروکل ہرسٹ (Mr. Brocklehurst) تھا جو میکلس فیلڈ (Macclesfield) سے منتخب ہوا تھا اور برطانوی صنعت کاروں کے مفاد کی نمائندگی کرتا تھا۔ ہندوستان کی صنعت و حرفت کے متعلق بیش بہا شہادت قلمبند کی گئی جو چھ سو صفحات پر مشتمل ایک جلد میں شائع کر دی گئی ہے۔ جگہ کی قلت کے پیش نظر ہم اس شہادت کے صرف وہ حصے پیش کر سکیں گے جن کا تعلق موجودہ کتاب سے ہے۔

جے۔سی میلول (J.C.Melvill)

فوجی اور گھریلو اخراجات ——— میلول نے بیان دیتے ہوئے کہا کہ ہندوستان میں مقیم ملکہ معظمہ کی فوج پر

کمپنی 14,00,000 پونڈ خرچ کرتی ہے۔ اور کمپنی اس پر آمادہ ہوگئی ہے کہ حسب ضرورت مزید فوجی دستے بھرتی کرے اور اُن کے مصارف برداشت کرے تاکہ ہندوستان میں ہر وقت 20,000 جنگی خدمات کے قابل فوج موجود رہے۔ ہندوستان کی قومی آمدنی کا جو حصہ انگلستان میں خرچ کیا جاتا ہے اس کا اوسط 32,00,000 پونڈ سالانہ ہوتا ہے۔ یہ رقم کمپنی کے حصے داروں کے منافعوں، قرض کے سود، چھٹیوں کے بھتے پنشن اور بورڈ آف کنٹرول اور کورٹ آف ڈائریکٹرز اور ان کے عملے پر صرف کی جاتی ہے۔

افیم —— افیم کی کاشت برطانوی علاقے میں بنارس اور پٹنہ میں ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ مالوا کی دیسی ریاست میں بھی افیم پیدا ہوتی تھی۔ بنارس اور پٹنہ میں پیدا ہونے والی افیم پر کمپنی کی اجارہ داری تھی۔ اس اجارہ داری کی بنا پر حکومت بنگال کو بڑی آمدنی ہوا کرتی تھی۔ مالوا کی افیم جب باہر بھیجنے کے لیے برطانوی علاقے میں لائی جاتی تھی تو اس پر 12 پونڈ 10 شلنگ فی پیٹی وہ افیم کی فروخت پر دو سو فیصدی منافع کمایا کرتی تھی کی بھاری چُنگی لگتی تھی جس سے حکومت بمبئی کو خاصی آمدنی ہوا کرتی تھی۔ دونوں قسم کی افیم کینٹن کی منڈی جاتی تھی اور چین کے ہاتھ فروخت کی جاتی تھی۔

نمک —— کمپنی کے علاقے میں بننے والے نمک سے اس کو بڑی آمدنی ہوا کرتی تھی۔ دیسی ریاستوں کا نمک جب برطانوی علاقے میں آتا تھا تو اس پر بھاری محصول لگتا تھا۔ افیم کی طرح نمک پر بھی کمپنی کی اجارہ داری تھی۔

شکر —— 1836ء میں پارلیمنٹ نے ایک ایکٹ منظور کیا تھا جس کی رو سے ہندوستان کی شکر بھی انگلستان میں درآمد کی جا سکتی تھی اور اس پر بھی اُتنا ہی محصول لگتا تھا جتنا جزائر غرب الہند کی شکر پر لگتا تھا یعنی 24 شلنگ فی ہنڈرڈ ویٹ۔ قانون کا اصول یہ تھا کہ ہندوستان کی شکر آسکتی ہے بشرطیکہ جہاں سے وہ شکر برآمد کی جائے وہاں باہر سے شکر نہ منگائی جائے۔ گورنر جنرل نے بنگال میں شکر کی درآمد ممنوع قرار دے دی تھی اس لیے بنگال کی شکر 24 شلنگ فی ہنڈرڈ ویٹ محصول ادا کر کے انگلستان جانے لگی۔ 1835ء میں 1,01,000 ہنڈرڈ ویٹ شکر انگلستان گئی تھی لیکن 1839ء میں برآمد ہونے والی شکر کی مقدار بڑھ کے 5,19,000 ہنڈرڈ ویٹ ہوگئی تھی۔ 1839ء میں گورنر جنرل نے ایک ایکٹ کے ذریعے مدراس میں بھی شکر کی درآمد ممنوع قرار دے دی اور بنگال کی طرح مدراس کو بھی انگلستان شکر بھیجنے کا حق حاصل ہوگیا۔ اس وقت یہ ممکن نہیں تھا کہ بمبئی کو بھی یہ حق حاصل ہوسکے۔

رم —— ہندوستان سے انگلستان جانے والی رم پر 15 شلنگ فی گیلن محصول ادا کرنا پڑتا تھا

جب کہ جزائر غرب الہند کی رم پر 9 شلنگ فی گیلن محصول ادا کیا جاتا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ آخر الذکر رم زیادہ تیز ہوتی تھی۔

تمباکو ــــ انگلستان میں درآمد ہونے والی ہندوستانی تمباکو پر 3 شلنگ فی پونڈ محصول عائد کیا جاتا تھا جب کہ جزائر غرب الہند کی تمباکو پر 3 شلنگ 9 پینس فی پونڈ محصول ادا کیا جاتا تھا۔ اس فرق کی وجہ سے بڑی دشواریاں پیدا ہو گئی تھیں۔ لوگوں کا خیال تھا کہ محصول میں اگر یکسانیت پیدا کر دی جائے تو ہندوستانی تمباکو کی کھپت بہت بڑھ سکتی ہے۔

کافی ــــ 1835ء میں ہندوستانی کافی پر لگنے والے محصول اور جزائر غرب الہند کی کافی کے محصول میں یکسانیت پیدا کر دی گئی یعنی دونوں پر 6 پینس فی پونڈ محصول عائد کیا جانے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگلستان میں ہندوستان کی کافی کی مانگ بہت بڑھ گئی۔

سُوتی، ریشمی اور اونی کپڑے ــــ ہندوستان آنے والے برطانیہ کے سُوتی اور ریشمی کپڑوں پر، جو برطانوی جہازوں کے ذریعے آتے تھے، ½3 فیصدی محصول اور برطانوی اونی کپڑے پر صرف 2 فیصدی محصول لگایا جاتا تھا لیکن انگلستان میں درآمد ہونے والے ہندوستانی سُوتی کپڑے پر 10 فیصدی، ریشمی کپڑے پر 20 فیصدی اور اونی کپڑے پر 30 فیصدی محصول لگایا جاتا تھا۔

چونکہ ہندوستان سے انگلستان کو سُوتی کپڑے کی برآمد ختم ہو چکی تھی اس لیے روئی کی برآمد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ 1813ء میں ختم ہونے والے پانچ سال میں ہر سال اوسطاً 93,68,000 پونڈ روئی ہندوستان سے برآمد کی گئی اور 1838ء میں ختم ہونے والے پانچ سال کا سالانہ اوسطاً 4,83,29,660 پونڈ تھا۔ میلول سے پوچھا گیا "کیا دیسی صنعت کاروں کی جگہ برطانوی صنعت کاروں نے لے لی ہے؟"

"جی ہاں۔ بڑی حد تک" اُس نے جواب میں کہا۔

"اچھا کب سے"؟

"میرے خیال میں 1814ء کے بعد سے"

"کیا برطانوی صنعت کاروں نے اس حد تک ہندوستانی صنعت کاروں کو صنعت کے میدان سے بے دخل کر دیا ہے کہ اب ہندوستان کو ان اشیاء کی رسد کے لیے برطانوی صنعت کاروں کا دست نگر ہونا پڑے"؟

"میرا تو یہی خیال ہے"

"کیا بنیادی ضرورت کے مال یعنی خام مال کی پیداوار کے اضافے نے دیسی صنعت کاروں کے نقصان کی کسی حد تک تلافی کی ہے؟"

"ہندوستانی مصنوعات کی برآمد بڑی حد تک ختم ہوجانے کے بعد خام مال کی برآمد میں اضافہ ہوگیا ہے لیکن میں یہ نہیں بتاسکتا کہ اس کا تناسب کیا ہے۔"

"کیا ہندوستان کے لوگ مثلاً بُنکر بے روزگار ہوجانے کے بعد اس ملک کے لوگوں کی طرح دوسرے کاموں کی طرف توجہ کرسکتے ہیں یا مختلف ذاتوں کے لوگوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ کوئی مخصوص کاروبار ہی کریں؟"

"میرا خیال ہے کہ ہر ذات کے لیے ایک کام مقرر ہے اور وہ صرف اپنا کام کرسکتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے جب برطانوی صنعت کاروں نے پہلے پہل ان کے کاموں میں دخل اندازی کی تو اس کے نتیجے میں اُن لوگوں کو بڑی تکلیفیں اُٹھانی پڑیں۔"[1]

چائے — 1788ء ہی میں کورٹ آف ڈائرکٹرز کے علم میں یہ بات آگئی تھی کہ چائے کا پودا ہندوستان کی دین ہے لیکن اس وقت چائے کی کاشت کی ہمّت افزائی کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ 1835ء میں لارڈ ولیم بینٹنک نے کورٹ کی توجہ اس امر کی طرف دلائی کہ آسام کی آب و ہوا چائے کے پودے موافق ہے اور ہندوستان کے دوسرے حصّوں میں بھی اس کی کاشت کی جاسکتی ہے۔ کورٹ نے تجربے کے طور پر آسام میں چائے کی کاشت اور اس کی تیاری کی اجازت دے دی۔ آسام کی چائے کی پچانویں پیٹیاں لندن پہنچی تھیں جن میں تقریباً 4,000 پونڈ چائے تھی۔ اس کے متعلق لوگوں نے اچھی رائے ظاہر کی تھی۔ اس پر بہت سے لوگوں نے مل کر ایک کمپنی بنالی۔ اُنھوں نے کورٹ آف ڈائرکٹرز کو جو درخواست پیش کی تھی وہ حکومتِ ہند کو بھیج دی گئی۔ اس طرح 1840ء سے آسام میں ہونے والی چائے کی کاشت میں نجی سرمایہ لگنے لگا اور وہ نجی ہاتھوں میں آگئی۔

انڈریو سیم (Andrew Sym)

اس گواہ کے پاس ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی دی ہوئی زمین تھی جس کا رقبہ 60,000 انگریزی ایکڑ کے برابر تھا۔ اس نے گنّے کی کاشت اور شکرسازی کے متعلق شہادت دی۔ کسان گنّا پیدا

---

[1] سوال نمبر 577، 578، 583، 584 اور 633۔

کیا کرتے تھے، اس کا رس نکالتے تھے، اس کو اُبالا کرتے تھے اور پھر اس کے کارخانے کے ہاتھ بیچ دیا کرتے تھے۔ کارخانے میں مشینوں کے ذریعے اس کی کھانڈ بنائی جاتی تھی۔ اس کھانڈ کا شربت بنا کر خوب اُبالا جاتا تھا تا آنکہ پانی جل جاتا تھا اور چینی تہہ میں رہ جاتی تھی۔

سی۔ای۔ٹریویلین (C.E. Trevelyan)

ایک زیادہ اہم گواہ سر چارلس ٹریویلین تھا جس نے لارڈ ولیم بینٹنک کے زمانے میں ہندوستان میں نمایاں خدمات سرانجام دی تھیں اور اس وقت انگلستان کے محکمہ خزانہ میں اسسٹنٹ سکریٹری کے عہدہ پر فائز تھا۔[1]

برطانوی ہند کی آبادی ـــــ عام طور سے بنگال کی آبادی 30 ملین سمجھی جاتی تھی۔ شمالی ہندوستان کے اس حصّے کی آبادی بھی 30 ملین سمجھی جاتی تھی جو انگریزوں کے قبضے میں تھا۔ مدراس کی آبادی 14 ملین اور بمبئی کی 3 ملین سمجھی جاتی تھی۔ اس طرح برطانوی ہند کی کُل آبادی 77 ملین ہوئی۔ معمولاً مزدور کو 2 آنے یا 3 شلنگ یومیہ مزدوری ملتی تھی۔ بنگال میں زمین وہ کسان جوتتے تھے جو زمینداروں کے آسامی تھے۔ "ہندوستان کی زراعت کا اصول یہ ہے کہ کسان، جو زمین پر قابض ہوتا ہے، جب تک اپنے ضلع کے دستور کے مطابق معینہ لگان ادا کرتا رہے اس کو بیدخل نہیں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن عام طور سے اس دستور کے خلاف ورزی ہوتی رہتی ہے۔"[2] "جو یورپین ہندوستان میں زمینوں پر قابض ہیں اُن پر کوئی بندشیں نہیں لگائی جاتی ہیں اور ہمیں توقع تھی کہ یورپین زمین خریدیں گے اور ہندوستان میں آباد ہوں گے۔" "لیکن ہماری اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔ وہاں کی آب و ہوا اُن کو راس نہیں آتی ہے۔ وہ لوگ وہاں اپنی پوری زندگی گزارنا نہیں چاہتے ہیں۔"[3]

---

[1] اس کے بعد 1859ء میں وہ مدراس کا گورنر مقرر ہوا لیکن 1860ء میں نئے محاصل کے خلاف احتجاج کرنے کی وجہ سے واپس بُلا لیا گیا۔ لارڈ ایلگن اور لارنس کے زمانہ حکومت میں 1862ء سے 1865ء تک ہندوستان کے وزیر مالیات کے فرائض ادا کیے۔ اس نے میکالے کی بہن سے شادی کی تھی۔ اس کے لڑکے نے لارڈ میکالے کی سوانح اور اس کے مکاتیب (Life and Letters of Lord Macaulay) نامی کتاب لکھی تھی۔

[2] سوال نمبر 1624

[3] سوال نمبر 1513

شکر اور رم ـــــ شکر کے محصول میں یکسانیت پیدا کرنا اس وقت تک فضول ہوگا جب تک رم کے محصول میں بھی یکسانیت نہ پیدا کر دی جائے۔" یہ تو مذاق ہوا کہ صرف ایک چیز میں یکسانیت پیدا کی جائے۔ دونوں کو ایک سطح پر لانے کے لیے ضروری ہے کہ گنے سے بننے والی ہر چیز پر یکساں محصول عائد کیا جائے۔[1]"

رم پر لگنے والی ڈیوٹی کی نابرابری یوں بھی شکر اور رم کی صنعت کے لیے مضر تھی۔ اس کے علاوہ اس نے ہندوستان کے لوگوں میں یہ خیال پیدا کر دیا تھا کہ دوسرے ملکوں کی خاطر ان کے مفادات کو قربان کیا جا رہا ہے۔

مسٹر گلیڈسٹن ـــــ جب آپ دیسی لوگوں کی بے چینی کا ذکر کرتے ہیں تو کیا اس کے معنی یہ سمجھے جائیں کہ آپ کا مقصد کسانوں یا عام لوگوں سے نہیں ہے بلکہ آپ کا اشارہ ان کی طرف ہے جن کو کاروباری طبقہ کہا جا سکتا ہے؟

مسٹر ٹریویلین ـــــ میرا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کو شکایت ہے جو ہندوستان از انگلستان کے ناتے کو سمجھتے ہیں۔ ان میں کاروباری طبقہ اور کلکتے کے تعلیم یافتہ لوگ بھی شامل ہیں۔ مقامی لوگوں کی شکایتوں میں ایک اور شکایت کا اضافہ ہوتا ہے۔ اس قسم کے جذبات باخبر لوگوں سے عام لوگوں تک پہنچتے ہیں جو اُن کی وجوہ سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے ہیں۔[2]

اپنے بقیہ بیان میں گواہ نے کہا کہ گنگا کی وادی میں پیدا ہونے والی بنگال کی شکر کی خود ملک میں بڑی مانگ ہے۔ بنگال کی 30 ملین آبادی، برطانوی شمالی ہند کے 30 ملین لوگ اور ان کے علاوہ 40 ملین دوسرے لوگ بنگال کی شکر استعمال کرتے ہیں۔ گواہ کا خیال تھا کہ وسط ایشیا کے لوگ بھی اس وقت تک گنگا کی وادی کی شکر استعمال کرتے رہے جب تک روس سے چقندر کی شکر نہیں آنے لگی تھی۔[3]

سوتی کپڑا ـــــ انگریز صنعت کاروں نے سوتی کپڑے کے ہندوستانی صنعت کاروں کو بیدخل کر کے بڑی حد تک ان کی جگہ لے لی تھی۔ گزشتہ زمانے میں بنگال میں پیدا کی جانے والی وہ نرم و ملائم روئی اب دیکھنے میں نہیں آتی جس سے ڈھاکہ کی ململ بنائی جاتی تھی۔ ڈھاکہ کی آبادی 50,000 سے کم ہو کر 30,000 یا 40,000 رہ گئی ہے اور بڑھتے ہوئے جنگل اور ملیریا تیزی کے ساتھ شہر کو ویران

---

[1] سوال نمبر 1499

[2] سوال نمبر 1789

[3] سوال نمبر 1699

کر رہے ہیں۔ اب صرف نہایت ادنا قسم کا سوتی کپڑا ہندوستان میں بنایا جاتا ہے اور بہت غریب طبقے کے علاوہ پورے ہندوستان میں لوگ عام طور سے انگلستان کا بنا ہوا سوتی کپڑا استعمال کرتے ہیں۔۔۔ ڈھاکہ جس کو ہندوستان کا مانچسٹر کہا جاسکتا تھا اپنی خوشحالی کھو چکا ہے اور ایک چھوٹے سے غریب شہر میں تبدیل ہو چکا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہاں کے لوگوں کو بڑے دُکھ جھیلنے پڑے ہیں[1]

چائے ـــــ آسام میں پہلے حکومت نے تجربے کے طور پر چائے کی کاشت شروع کی اس کے بعد سے نیو آسام کمپنی کاشت کر رہی ہے۔ مقامی مزدوروں کی کمی تھی اس لیے کمپنی نے پہاڑی قلیوں کو بھرتی کرنا شروع کیا جو آسام میں کام کرنے کے لیے دُور دراز مقامات سے لائے جاتے تھے۔ گواہ کا خیال تھا کہ اُن سے تین سال کا معاہدہ کیا جاتا تھا لیکن وہ وثوق سے یہ بات نہیں کہہ سکتا تھا۔

"جس طرح آئرلینڈ کے لوگ فصل کٹنے کے زمانے میں یہاں آیا کرتے ہیں"

نیل ـــــ ہر سال پہاڑی قُلی روزگار کی تلاش میں بنگال آیا کرتے تھے اور نیل کی کوٹھیوں میں نیل بنانے کا کام کیا کرتے تھے۔ قُلی اپنے بیوی بچّوں کو ساتھ نہیں لاتے تھے اور نیل کا موسم ختم ہو جانے کے بعد اپنے گھروں کو واپس چلے جاتے تھے۔

دریا میں چلنے والی دخانی کشتیاں ـــــ تمام دخانی کشتیاں اسٹیٹ انڈیا کمپنی کی تھیں۔ استعمال ہونے والی کشتیاں بہت چھوٹی تھیں جن کے لیے دو فٹ سے کم گہرے پانی کی ضرورت ہوتی تھی۔ ایک اسٹیم ٹگ کمپنی (Steam Tug Company) بھی تھی جو ہگلی میں جہازوں کو اِدھر اُدھر کھینچ کرلے جایا کرتی تھی اور اس کام میں بہت منافع کماتی تھی۔

سڑکیں ـــــ خاص خاص سڑکوں کے علاوہ مرمت شاید ہی کی جاتی تھی لیکن برسات کے علاوہ ایسا کوئی زمانہ نہیں آتا تھا کہ ان پر دیہاتی گاڑیاں نہ گزر سکتی ہوں جو بہت مضبوط ہوتی تھیں۔

خام مال ـــــ مسٹر ٹریولین نے سفارش کی کہ برطانوی منڈیوں میں ہندوستان کا خام مال تمام غیر مساوی محاصل سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ "ہم نے ان کے مصنوعات ختم کر دیئے ہیں۔ اب اُن کی گزر بسر کا ذریعہ صرف اُن کی زمین کی پیداوار ہے۔ اگر انگلستان کی منڈیوں میں انہیں مساوی حقوق نہ دیے جائیں تو میرے خیال میں یہ بہت بڑی ناانصافی ہوگی[2]"

---

[1] سوالات نمبر 1824 اور 1825

[2] سوال نمبر 1950

ہنری گوجر (Henry Gouger)

ہنری گوجر ایک تاجر تھا جو ایک مدت ہندوستان میں گزار چکا تھا۔ کلکتہ کے قریب واقع سوتی دھاگہ بنانے، رم کشید کرنے، تلہن کا تیل نکالنے، لوہے کا سامان بنانے اور کاغذ بنانے کے کارخانوں کا وہ مالک تھا اس لیے اس کی شہادت بڑی اہمیت رکھتی تھی۔

سُوتی دھاگہ ـــــ 20 سے لے کر 50 نمبر تک کا 200,000 پونڈ سوتی دھاگہ ہر سال کاتا جاتا تھا۔ دھاگہ بنانے کے لیے جو روئی استعمال ہوتی تھی وہ ہندوستان میں پیدا ہوتی تھی اور مشینوں پر ہندوستانی مزدور کام کرتے تھے جن کی نگرانی یورپین کیا کرتے تھے۔ بھاپ سے چلنے والے سو کرگے تھے لیکن اُن پر کام روک دیا گیا تھا تاکہ بھاپ سُوت بنانے کے لیے استعمال کی جا سکے جو زیادہ منافع بخش تھا کم نمبر کے سُوت کی مانگ انگریزی سُوت کے مقابلے میں زیادہ تھی لیکن زیادہ نمبر کے سُوت کی مانگ اتنی تھی جتنی انگریزی سُوت کی۔ مگر مجموعی اعتبار سے اس کاروبار میں منافع لاگت کی مناسبت سے کم تھا۔ گواہ نے کہا "سُوت کاتنے کے موجودہ کارخانوں کو ترقی دینے پر جو خرچ آ رہا ہے اس کے پیشِ نظر میرا خیال ہے کہ آئندہ کوئی کارخانہ نہیں لگایا جائے گا۔"[1]

کوئلہ ـــــ گواہ کی ایک کوئلے کی کان بردوان میں تھی۔ وہ اپنے کارخانوں میں اس کان کا کوئلہ استعمال کیا کرتا تھا۔ کلکتہ میں کوئلے کی قیمت سوا شلنگ فی ٹن تھی۔ انگریزی کوئلے کے مقابلے میں یہ کوئلہ ادنا قسم کا تھا لیکن سستا ہونے کی وجہ سے دخانی کشتیوں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ کلکتہ میں بردوان کے کوئلے کی قیمت 12 یا 13 شلنگ فی ٹن تھی لیکن نیوکاسل کے کوئلے کی قیمت 25 شلنگ فی ٹن تھی۔

شکر ـــــ کسان گنے کے رس کو جوش دے کر گُڑ بنایا کرتے تھے شکر بنانے کے لیے یہ گُڑ کارخانوں کے ہاتھ بیچ دیا جاتا تھا۔ بنارس کی نفیس شکر 11 یا 12 روپے میں 80 پونڈ فروخت ہوتی تھی۔ ڈیوٹی میں یکسانیت ہونے سے پہلے قیمت کم تھی شکر جہازوں پر لاد کر انگلستان لے جائی جاتی تھی اور اس کا کرایہ 4 پونڈ دس شلنگ فی ٹن تھا۔

رم ـــــ جزائر غرب الہند سے آنے والی رم پر انگلستان میں 9 شلنگ فی گیلن محصول درآمد لگتا تھا جب کہ ہندوستان کی رم پر 15 شلنگ فی گیلن ڈیوٹی لگائی جاتی تھی۔ ہندوستان میں رم گُڑ سے بنائی

---

[1] سوال نمبر 1981۔

جاتی تھی اور شیرے سے بھی جو شکر سازی کے بعد بچ رہا کرتا تھا۔ لندن کے معیار کے مطابق 80 پونڈ شیرے سے 3½ گیلن رم کشید کی جاتی تھی۔ لیکن 80 پونڈ گڑ سے اس سے کہیں زیادہ رم بنائی جا سکتی تھی۔ کلکتہ میں ایک گیلن رم کی قیمت 10 آنے یا ایک شلنگ 3 پینس تھی۔

زیادہ منافع بخش طریقہ یہ ہے کہ پہلے گڑ کی شکر بنائی جائے اور جو شیرا بچے اس کی رم بنائی جائے لیکن عام طور سے لوگ اس پر عمل نہیں کرتے تھے۔

ریشم ــــ بنگال کا خام ریشم جب انگلستان میں درآمد کیا جاتا تھا تو 16 شلنگ فی پونڈ کے حساب سے فروخت ہوتا تھا۔ کورا یا ہندوستان کا بنا ہوا ریشمی کپڑا 16 شلنگ یا 17 شلنگ فی پونڈ کے حساب سے فروخت ہوا کرتا تھا۔ انگلستان میں ہندوستان سے خام ریشم کی درآمد کم ہوتی جا رہی تھی 29-1828ء میں 9,20,000 پونڈ کا خام ریشم درآمد ہوا۔ 30-1829ء میں 8,00,000 پونڈ کا۔ 31-1830ء میں 7,20,000 پونڈ کا۔ 32-1831ء میں صرف 5,40,000 پونڈ کا۔ غالباً ہندوستان میں ریشمی کپڑا زیادہ بننے لگا تھا اور ہندوستان سے ریشمی کپڑے کی برآمد میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔

جی۔جی۔ڈی۔ایچ۔ لارپینٹ (G.G.De.H Larpent)

اس کے بعد لارپینٹ کا بیان ہوا جو اس زمانے میں ایسٹ انڈیا اور چائنا ایسوسی ایشن (East India and China Association) کا صدر تھا۔ اس ایسوسی ایشن کا قیام 1836ء میں عمل میں آیا تھا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ ایسٹ انڈیا اور چین سے تجارت کرنے والے فریقین کی حمایت کرے۔ اس نے دوسرے ملکوں سے انگلستان آنے والی شکر اور رم کے متعلق تفصیلی بیان دیا اور ہندوستان کی سوتی اور ریشمی کپڑے کی صنعت کے زوال کا ذکر زوردار الفاظ میں کیا۔

سوتی کپڑا ــــ مسٹر لارپینٹ نے انگلستان میں ہندوستان سے درآمد ہونے والے سوتی کپڑے اور ہندوستان میں انگلستان سے درآمد ہونے والے سوتی کپڑے کے مندرجہ ذیل تقابلی اعداد و شمار کمیٹی کو مہیا کیے۔

انگلستان میں ایسٹ انڈیز سے درآمد ہونے والا سوتی کپڑا

1814ء	12,66,608 تھان
1821ء	5,34,495 تھان
1828ء	4,22,504 تھان

1835ء	3,06,086 تھان

ہندوستان میں انگلستان سے درآمد ہونے والا سُوتی کپڑا

1814ء	8,18,208 گز
1821ء	1,91,38,726 گز
1828ء	4,28,22,077 گز
1835ء	5,17,77,277 گز

ہندوستانی صنعت کے زوال اور برطانوی کپڑے کی درآمد میں اضافے کے باوجود ہندوستان میں برطانوی سُوتی کپڑے کی درآمد پر بنگ کی رو سے 3½ فیصدی محصول عائد کیا جاتا تھا جب کہ انگلستان جانے والے ہندوستانی سوتی کپڑے پر از روئے بنگ دس فیصدی ڈیوٹی ادا کرنی پڑتی تھی۔ مسٹر شور کی تحریر کا ایک حصہ گواہ نے پڑھ کے سُنایا "برطانوی صنعت کاروں کے لیے دیسی لوگوں کو بیدخل کرنے کے اس واقعہ کو برطانوی ہُنر مندی کی دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اس کو برطانوی مظالم کی ایک مثال کے طور پر پیش کیا جانا چاہیے کہ انگلستان کے مفاد کے تحفّظ کی غرض سے محاصل اور ڈیوٹی کا ایک ایسا تکلیف دہ طریقہ اختیار کیا گیا جس نے ہندوستان کو تباہ کر دیا۔" مسٹر لارپینٹ کو اس معاملے میں مسٹر شور سے پورا پورا اتفاق نہیں تھا لیکن مندرجہ بالا الفاظ سے نمایاں حیثیت رکھنے والے کمپنی کے ایک ملازم کے جذبات ظاہر ہوتے تھے اور اس کا امکان تھا کہ اس قسم کے جذبات ہندوستان کے لوگوں میں بھی پائے جاتے ہوں[1]۔

ریشمی کپڑا — برطانوی سُوتی کپڑا جب کلکتہ آتا تھا تو اس پر 3½ فیصدی محصول ادا کرنا ہوتا تھا لیکن انگلستان میں درآمد ہونے والے ہندوستان کے ریشمی کپڑے پر 20 فیصدی محصول درآمد عائد کیا جاتا تھا۔ کورا یا خاکستری رنگ کا ہندوستانی ریشمی کپڑا انگلستان میں محض اس لیے درآمد کیا جاتا تھا کہ وہاں اس کو چھاپ کر دوسرے یورپی ممالک کو برآمد کیا جائے۔ انگلستان میں درآمد ہونے والے کورا کے متعلق مندرجہ ذیل اعداد و شمار پیش کیے گئے تھے۔

	اپنی ضرورت کے لیے تھان	باہر بھیجنے کے لیے تھان
1838ء	16,000	3,10,000
1839ء	38,000	3,52,000

---

1 سوال نمبر 2743 -

بندانا ہندوستان کے چھپے ہوئے رومال بڑی تعداد میں انگستان میں درآمد کیے جاتے تھے۔ مسٹر لارپینٹ نے زوردار الفاظ میں وکالت کی کہ جہاں تک ریشمی کپڑوں کا تعلق ہے انگلستان اور ہندوستان کے محاصل درآمد میں یکسانیت پیدا کر دی جائے کمیٹی کا ایک رکن مسٹر بروکل ہرسٹ ریشم کے برطانوی صنعت کاروں کی نمائندگی کرتا تھا اور ظاہر ہے کہ اس کی خواہش تھی کہ غیر مساوی محاصل درآمد برقرار رکھے جائیں جو انگلستان کے لیے مفید تھے۔

مسٹر بروکل ہرسٹ ——— رائے دیتے وقت غالباً آپ نے یہ نہیں سوچا تھا کہ برطانوی صنعت پر اس کا کیا اثر پڑے گا؟

مسٹر لارپینٹ ——— اس ملک کی کسی نوآبادی کے پاس اتنی صنعتیں نہیں ہیں کہ ہمیں اس کی فکر کرنی پڑے۔ ہندوستان کی صنعتوں کو ہم ختم کر چکے ہیں۔ (اس کے بعد گواہ نے کورٹ آف ڈائرکیٹرز کے وہ خیالات پیش کیے جو لارڈ ولیم بین ٹنک کی 30 مئی 1829ء کی روداد میں شامل تھے" بورڈ آف ٹریڈ کی اس رپورٹ نے ہمیں متاثر کیا ہے جس میں اس تجارتی انقلاب کے خراب اثرات کی مایوس کُن تصویر پیش کی گئی ہے جس نے ہندوستان کے لاتعداد لوگوں کو ایسے دُکھوں میں مبتلا کر دیا ہے جس کی مثال تجارت کی تاریخ نہیں پیش کر سکتی[1]"

لیکن یہ جواب مسٹر بروکل ہرسٹ کو مطمئن نہیں کر سکا۔ اس کو اس امر نے روحانی تکلیف میں مُبتلا کر رکھا تھا کہ ہندوستان کے ریشمی رومال انگلستان میں استعمال ہوتے ہیں۔ وہ بار بار اس موضوع پر واپس آتا تھا۔

مسٹر بروکل ہرسٹ ——— کیا آپ کے علم میں یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان کے بنے ہوئے رومالوں نے اس ملک کے رومالوں کی جگہ اس حد تک لے لی ہے کہ اب کوشش کی جا رہی ہے کہ ان کے بجائے کچی ریشم کے بنے ہوئے مصنوعی رومال رائج کیے جائیں۔

مسٹر لارپینٹ ——— میں نے سُنا ہے کہ ایک چیز کا رواج بڑھ رہا ہے جو بھی کچی ریشم سے بنائی جاتی ہے اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں اس مال کو بنانے والے اپنی اُپج اور کاریگری کی بنا پر سستی اشیاء کی بڑی مقدار انگلستان کی منڈیوں میں لے آئیں گے جن کا استعمال عام ہو جائے گا۔

مسٹر بروکل ہرسٹ ——— اس طرح وہ لوگ برطانوی صنعت کاروں کو مجبور کریں گے کہ وہ اُن

---

[1] سوالات نمبر 2750 اور 2761۔

سے مقابلہ کرنے کے لیے ادنا قسم کا مال پیدا کریں۔

مسٹر لار پنیٹ ـــــ جن اشیاء کا حوالہ دیا گیا ہے وہ انگلستان میں بن رہی ہیں اور برطانوی صنعت کار انھیں بنا رہے ہیں۔

مسٹر بروکل ہرسٹ ـــــ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہندوستان خام مال پیدا کرے اور یہ ملک اس خام مال کو مصنوعات میں تبدیل کر کے اپنی ہنرمندی کا مظاہرہ کرے؟

مسٹر لار پنیٹ ـــــ ہندوستان میں جو حالات پائے جاتے ہیں اُن کا نتیجہ بلاشبہ یہی ہوگا۔ ہم نے جن واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے اُن کی بنا پر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کی زرعی پیداوار کے سلسلے میں ہمیں زیادہ سے زیادہ امداد دینی چاہیے[1]۔ لیکن میری مودبانہ گذارش ہے کہ ہندوستان کی مٹتی ہوئی صنعتوں میں چونکہ یہ آخری صنعت ہے اس لیے ہمیں اس امر کا پورا موقع دینا چاہیے کہ ہندوستان کے یہ مصنوعات یہاں رواج پا سکیں اور برطانوی صنعت کاروں کو فائدہ پہنچانے کے لیے اس پر 20 فیصدی محصول کا بار نہیں ڈالنا چاہیے۔

منٹگمری مارٹن (Montgomery Martin)

منٹگمری مارٹن نے ہندوستان کی زیادہ وکالت کی۔ اُس نے اپنے خرچے پر دس سال تک برطانوی نوآبادیات کا سفر کیا تھا، واقعات و اعداد و شمار جمع کیے تھے اور پانچ جلدوں میں برطانوی نوآبادیات کی مکمل تاریخ لکھی تھی۔ وہ ہندوستان بھی آیا تھا اور اپنے قیام کے دوران ہندوستان کے مسائل کا مطالعہ کیا تھا۔ مشرقی ہندوستان کے متعلق اس نے ڈاکٹر فرانسس بکانن کے ضخیم مسودے کی تدوین کی تھی جس میں بیش بہا اعداد و شمار پیش کیے گئے تھے۔

اس نے کہا "میں نے کئی سال تک بڑی دقت نظر کے ساتھ ہندوستان کی تجارت کا جائزہ لیا ہے۔ ان تمام دستاویزات کے مطالعہ کے بعد، جن تک میری رسائی ایسٹ انڈیا ہاؤس کے عزت مآب کورٹ آف ڈائریکٹرز کی قدیمی فراخ دلی کی بنا پر ہوئی، میں نے بڑی جانفشانی کے بعد صحیح نتائج اخذ کیے

---

[1] سوالات نمبر 2763، 2764 اور 2771 "ہندوستان کی آخری مٹتی ہوئی صنعت بچائی نہیں جا سکی۔ ہندوستان اس وقت 7 ملین پونڈ مال برآمد کرتا ہے جس کا بڑا حصہ خام ریشم پر مشتمل ہوتا ہے۔ صرف ایک لاکھ پونڈ سے کچھ زیادہ ریشمی مصنوعات ہوتے ہیں۔

ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تجارت کے معاملہ میں ہندوستان کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک کیا گیا ہے جس کی وجہ سے اسے بڑا نقصان اُٹھانا پڑا، چونکہ انگلستان نے آزاد تجارت کے لیے چیخ پکار کی لیکن ہندوستان کو آزاد تجارت کا موقع نہیں دیا اس لیے نہ صرف انگلستان بلکہ دوسرے ملکوں کے ساتھ بھی اس کی تجارت کو نقصان پہنچا۔" اس نے مزید کہا "اُن اشیاء کے علاوہ جن کی صنعتوں پر مقامی صنعت کاروں کو بے دخل کر کے ہم قابض ہو گئے ہیں تجارت کم ہوتی جا رہی ہے اور اس طرح ملک کو تباہ کیا جا رہا ہے۔[1]"

سُوتی کپڑا ——— 1815ء میں 3,00,000 1 پونڈ کی مالیت کا سوتی کپڑا ہندوستان سے برآمد کیا گیا تھا۔ 1832ء میں برآمد ہونے والے سوتی کپڑے کی قیمت 1,00,000 پونڈ سے کم تھی۔ 1815ء میں انگلستان سے ہندوستان میں درآمد ہونے والے سُوتی کپڑے کی مالیت 26,300 پونڈ تھی۔ 1832ء میں 4,00,000 پونڈ سے زیادہ کی مالیت کا سُوتی کپڑا انگلستان سے آیا۔" ہم نے چوتھائی صدی میں ہندوستان کو مجبور کر دیا کہ وہ ہمارے مصنوعات درآمد کرے۔ ہمارا اُونی کپڑا محصول سے مستثنیٰ ہے، سوتی کپڑے پر $2\frac{1}{2}$ فیصدی محصول لگتا ہے اور دوسری اشیاء کے محصول کا بھی یہی تناسب ہے۔ لیکن اسی دوران ہم مقبوضات کے مصنوعات پر ایسا محصول لگاتے رہے جس کو امتناعی محصول کہا جا سکتا ہے یعنی 10 فیصدی سے لے کر 20، 30، 50، 100، 500 اور 1,000 فیصدی تک۔ چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آزاد تجارت پر اصرار محض انگلستان کی تجارت کے لیے تھا، ہندوستان اور انگلستان کے درمیان ہونے والی تجارت کے لیے نہیں تھا ..... سورت، ڈھاکہ اور مرشد آباد کی تباہی، جو مقامی صنعتوں کے اہم مراکز تھے، اتنا تکلیف دہ واقعہ ہے کہ اس کو بیان کرنا بھی مشکل ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تباہی منصفانہ تجارت کا نتیجہ نہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ نتیجہ ہے ایک کمزور فریق پر ایک طاقتور فریق کے غلبہ پالینے کا۔[2]"

اس طرح کا بیان گواہ اور مسٹر برو کل ہرسٹ کے درمیان، جو برطانوی صنعت کاروں کا نمائندہ تھا، تلخ بحث کا باعث بن گیا۔

مسٹر برو کل ہرسٹ ——— اس واقعے سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بُنکروں کے مفادات کی قربانی ضروری ہے، چاہے وہ کسی ملک سے تعلق رکھتے ہوں۔ ہندوستان کے بُنکر ختم ہو چکے ہیں۔ کیا اب

---

[1] سوال نمبر 3876

[2] سوالات نمبر 3877 اور 3878

آپ اس ملک کو نقصان پہنچا کر ہندوستان کی دست کاریوں کی تجدید کرنا چاہتے ہیں۔

مسٹر مارٹن ——— میں ان کی تجدید نہیں کرنا چاہتا لیکن میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ ہندوستان کو پہنچنے والے مسلسل نقصان کا تدارک کیا جائے۔ اگر اس ملک میں ہندوستان کے بُنکروں کو انگلستان کے بُنکروں سے مقابلہ کرنے کی اجازت دی جائے تو اس کا لازمی نتیجہ انگلستان کے بُنکروں کی تباہی نہیں ہوگی۔ ہندوستان کے لوگوں کے پاس بھاپ سے چلنے والے کرگے نہیں ہیں نہ وہ اس حد تک تکنیکی معلومات اور سرمایہ رکھتے ہیں جس حد تک گلاسگو اور مانچسٹر کے صنعت کاروں کو نصیب ہے۔

مسٹر بروکل ہرسٹ ——— اس وقت جو سوال کیے گئے تھے ان کا تعلق محض نفیس کپڑے سے ہے جو بھاپ سے چلنے والے کرگوں سے نہیں بنایا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم اس ملک میں نفیس کپڑے سے دست کش ہو جائیں یا اسے بنائیں۔

مسٹر مارٹن ——— اگر انگلستان میں نفیس کپڑا صرف اس صورت میں تیار کیا جا سکتا ہے جب کہ ہندوستان کے ساتھ ناانصافی کی جائے تو میرا جواب یہ ہے کہ نتیجے سے بے نیاز ہو کر انگلستان کو انصاف سے کام لینا چاہیے۔ انگلستان کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے فائدے کے لیے، یہاں کے مٹھی بھر لوگوں کے فائدے کے لیے، ایک ایسے ملک کے لوگوں کو تباہ کر دے جس کو وہ فتح کر چکا ہے۔

مسٹر بروکل ہرسٹ ——— 1833ء[1] میں جب ہندوستان اس ملک کی حکومت کو منتقل کیا گیا اس وقت ہندوستان میں کپڑا بنانے کی صنعت ختم ہو چکی تھی اس لیے اس وقت صنعت کی تباہی کا مسئلہ زیرِ غور نہیں ہے۔ وہ تو تاریخ کا جزو بن چکا ہے۔ ہمارے سامنے اس قسم کی شہادت پیش کی گئی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان صنعتی ملک ہونے کے بجائے ایک زراعتی ملک ہے اور پُرانے دست کار اب کھیتی باڑی کا کام کر رہے ہیں۔ کیا آپ کے خیال میں یہاں کی صنعتیں ختم ہو جانے کی صورت میں یہاں کے لوگ بھی زراعت کا پیشہ اختیار کر سکتے ہیں؟

مسٹر مارٹن ——— مجھے اس بات سے اتفاق نہیں کہ ہندوستان ایک زرعی ملک ہے۔ ہندوستان

---

[1] ہندوستان کا انتظام حکومت برطانیہ کو 1833ء میں منتقل نہیں ہوا تھا۔ برطانوی حکومت نے 1833ء سے نصف صدی پہلے 1784ء کے پٹ کے انڈیا ایکٹ کی رو سے ہندوستان کے نظم و نسق پر اختیار حاصل کر لیا تھا۔ 1833ء میں ایک نیا ایکٹ منظور کیا گیا تھا جس کی رو سے کمپنی کے چارٹر کی تجدید ہوئی تھی لیکن اس کی تجارت ممنوع قرار دی گئی تھی۔

جس حد تک زرعی ہے اس حد تک صنعتی بھی ہے۔ جو شخص اس کو محض زرعی ملک بنانے کی کوشش کرتا ہے وہ جدید تہذیب میں اس کی حیثیت کم کرنا چاہتا ہے۔ میرے خیال میں ہندوستان کبھی بھی انگلستان کا ایک زراعتی فارم نہیں بن سکے گا۔ وہ ایک صنعتی ملک ہے۔ صدیوں سے وہاں مختلف قسم کا سامان بنایا جاتا رہا ہے۔ جب بھی تجارت میں انصاف سے کام لیا گیا ہے تو کوئی قوم اس سے مقابلہ نہیں کر سکی ہے۔ میں اس وقت ڈھاکہ کی ململ اور کشمیر کی شالوں کا ذکر نہیں کر رہا ہوں۔ میں اُن مختلف اشیاء کا ذکر کر رہا ہوں جو دُنیا کے کسی حصّے میں بننے والی اشیاء سے بہتر ہوا کرتی تھیں۔ اس کو محض زرعی ملک بنا دینا ہندوستان کے ساتھ ناانصافی ہو گی[1]

اُونی کپڑا — پچیس سال سے برطانوی اُونی کپڑا بغیر کوئی محصول ادا کیے ہندوستان برآمد کیا جا رہا ہے لیکن بکری کی اُون کے بنے ہوئے ہندوستانی کپڑے پر چنگی کی رو سے 30 فیصدی محصول عائد کیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ 1828ء اور 1838ء کی درمیانی مدّت میں ہندوستان سے درآمد ہونے والے تمام اُونی کپڑے کا سالانہ اوسط 8,000 پونڈ سے زیادہ نہیں۔ اُونی کپڑے پر پابندی عائد کرنے سے برطانوی صنعت کاروں کو کوئی فائدہ بھی نہیں پہنچتا ہے۔ انگلستان کی شالیں زیادہ تر یورپ کے دوسرے ملکوں میں بنتی ہیں[2]

جہاز سازی — ہندوستان میں اب بہت کم جہاز بنائے جاتے ہیں۔ 96-1795ء میں کلکتہ میں چھ جہاز بنائے گئے تھے جو مجموعی طور سے 4105 ٹن سامان لے جا سکتے تھے اور 500 سے 600 ٹن تک سامان لے جانے والے چھ بڑے جہاز زیرِ تعمیر تھے۔ 98-1797ء میں کلکتہ کی گودی سے کئی جہاز سمندر میں اُتارے گئے۔ لیکن اب (1840ء) کلکتہ میں جہاز سازی ختم ہو چکی ہے۔ بمبئی کے پارسیوں نے ایک گودی تعمیر کی تھی اور تین نسلوں تک بمبئی کی شاندار گودی پارسیوں کے زیرِ انتظام رہی۔ نوروجی جمشید جی نے ایشیا نامی ایک نفیس جہاز بنایا تھا اور انگلستان کی گودیوں میں پارسی جہاز سازی کا کام سیکھ رہے تھے۔ اس کے باوجود انگلستان کے بنے ہوئے ایسے جہاز جن کے ملّاح ہندوستانی ہوتے تھے جب ان ملکوں کے بندرگاہوں میں پہنچتے تھے جن سے انگلستان کے معاہدے تھے تو ان کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا جاتا تھا جو برطانوی جہازوں کے ساتھ کیا جانا چاہیے تھا۔ ہندوستان کی جہاز سازی

---

[1] سوالات نمبر 3918، 3919 اور 3920۔

[2] سوال نمبر 3957۔

کے راستے میں یہ بہت بڑا روڑا ثابت ہوا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے 1833ء کے چارٹر میں کہا گیا تھا کہ ہندوستان کے رہنے والے برطانوی رعایا ہیں لیکن ان کے ساتھ بہت بڑی ناانصافی یہ کی جاتی تھی کہ جہاں تک تجارتی جہازوں کا تعلق تھا انھیں برطانوی رعایا نہیں سمجھا جاتا تھا جس کی وجہ سے انھیں طرح طرح کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا[1]

گھریلو اخراجات ——— گواہ نے گھریلو اخراجات یا ہندوستان کی قومی آمدنی کی اس رقم کے متعلق جو انگلستان میں خرچ کی جاتی تھی ایک نقشہ پیش کیا جس میں 1813ء میں تجدید ہونے والے کمپنی کے چارٹر سے لے کر 1833ء[2] میں تجدید ہونے والے چارٹر تک کے بیس سال کے اخراجات دکھائے گئے تھے۔ بقیہ پانچ سال کی یعنی 1834ء سے 1838ء تک کی رقمیں ایک اور رپورٹ سے اخذ کی گئی ہیں[3]۔ ہندوستان کی آمدنی کے اعداد و شمار پارلیمنٹ[4] میں پیش کی جانے والی ایک رپورٹ سے اخذ کیے گئے ہیں۔ ہم نے جو نقشہ تیار کیا ہے اس میں اس بیس سال کی مجموعی آمدنی میں گھریلو اخراجات کا تناسب دکھایا گیا ہے جو ملکہ وکٹوریہ کی تخت نشینی کے سال پر ختم ہوتے ہیں۔

سال	گھریلو اخراجات پونڈ	ہندوستانی آمدنی پونڈ
1814-15ء	24,46,016	1,72,97,280
1815-16ء	20,48,030	1,72,37,819
1816-17ء	20,42,809	1,80,77,578

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

[1] سوالات نمبر 3987 اور 3982۔

[2] ضمیمہ نمبر 60

[3] ضمیمہ نمبر 1

[4] 1792ء کے بعد سے ہندوستان کی مجموعی آمدنی وغیرہ کے متعلق رپورٹ جس کی اشاعت ہاؤس آف کامنز کے زیر حکم ہوئی، 22/جون 1856ء۔

سال	گھریلو اخراجات	ہندوستانی آمدنی
1817-18ء	20,23,996	1,83,75,820
1818-19ء	23,68,947	1,94,59,017
1819-20ء	18,61,381	1,92,30,462
1820-21ء	23,06,187	2,13,52,241
1821-22ء	32,03,611	2,18,03,108
1822-23ء	33,26,406	2,31,71,701
1823-24ء	20,27,420	2,12,80,384
1824-25ء	21,82,132	2,07,50,183
1825-26ء	23,62,360	2,11,28,388
1826-27ء	29,75,141	2,23,83,497
1827-28ء	26,94,219	2,28,63,263
1828-29ء	27,18,579	2,27,40,691
1829-30ء	26,13,527	2,16,95,208
1830-31ء	23,99,573	2,20,19,310
1831-32ء	24,75,569	2,83,17,237
1832-33ء	22,33,559	1,84,77,924
1833-34ء	20,53,141	1,82,67,368
1834-35ء	30,63,322	2,68,56,647
1835-36ء	29,59,975	2,01,48,125
1836-37ء	30,90,582	2,08,99,130
1837-38ء	29,79,514	2,08,58,820

ان گھریلو اخراجات کا ایک چھوٹا سا حصہ، جو $\frac{1}{8}$ سے زیادہ نہیں ہوتا تھا، ہندوستان کو بھیجے جانے والے سامان کی خرید پر خرچ کیا جاتا تھا۔ بقیہ رقم کے بیے منٹگمری مارٹن نے کہا "یہ ہندوستان کی

آمدنی کا وہ حصہ ہے جس کے معاوضے میں اُسے کچھ نہیں ملتا .... اگر برطانوی ہند سے حاصل کی جانے والی رقم کا اوسط تین ملین پونڈ سالانہ رکھا جائے تو تیس سال کی رقم 12 فیصدی سود در سود سے (یہ شرح سود ہندوستان میں رائج تھی) 72، 39، 87، 970 پونڈ ہوئی۔ اگر ہم دو ملین سالانہ کا اوسط تسلیم کریں اور پچاس سال کا حساب لگائیں تو ہندوستان سے جانے والے اس سرمائے کی ناقابلِ یقین رقم جو وہاں بارور ہو سکتا تھا، 8، 40،00،00،000 پونڈ ہوئی۔[1]

ریشمی مصنوعات ——— ہندوستان کے ریشم کے مصنوعات کو انگلستان میں لگنے والے غیر مساوی محصول درآمد سے مستثنیٰ قرار دیا جانا چاہیے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہندوستانی ریشم کے مصنوعات انگلستان یا دوسرے کسی ملک کے مصنوعات سے مقابلہ نہیں کرتے ہیں۔[2]

الگزینڈر راجرس (Alexander Rogers)

اسی اور سن ——— الگزینڈر راجرس کے ہندوستان میں کئی کارخانے تھے۔ ہندوستان کے لوگ اسی کے پودے کی کاشت اس کے بیجوں کے لیے کیا کرتے تھے مگر اُس نے اُس کے ریشے کے لیے کاشت شروع کی۔ ہندوستان کی اسی کے پودے کے کچھ نمونے 10 جون 1840ء کو آنے والے تھے۔ "اگر ہم اسی کی کاشت میں کامیاب ہو گئے تو اسی اور سن کی کاشت کے طریقوں میں اتنی مماثلت ہے کہ سن کی کاشت میں بھی کوئی دقت نہیں ہوگی۔"[3]

ریشم ——— گو وہ ہندوستان کا ریشم بڑی مقدار میں انگلستان منگایا کرتا تھا۔ برطانیہ کے بنے ہوئے ریشمی کپڑے پر ہندوستان میں ½3 فیصدی محصول لگتا تھا لیکن ہندوستان کے ریشمی کپڑے پر انگلستان میں 20 فیصدی اور اس سے زیادہ بھی محصول عائد کیا جاتا تھا۔ اس امتیازی سلوک نے ہندوستان کی ریشمی کپڑے کی صنعت کو مفلوج کر دیا تھا۔ جس طرح فرانس کے بنے ہوئے ریشمی کپڑے پر محصول کم ہو جانے کا کوئی اثر برطانوی صنعت پر نہیں پڑا تھا اسی طرح ہندوستانی مصنوعات پر محصول میں تخفیف کا بھی کوئی اثر پڑنے کا امکان نہیں تھا۔ ہندوستانی

---

1. سوال نمبر 4137
2. سوال نمبر 4162
3. سوال نمبر 4256

ریشم کے تھان جو انگلستان جاسکتے تھے اور کورا کہلاتے تھے بھاری اور دبیز ہوا کرتے تھے۔ انگلستان میں اس قسم کا کپڑا بہت کم بنتا تھا۔ اس کے علاوہ "انگلستان کو یہ فائدہ بھی ہوگا کہ وہ ہندوستان کے لوگوں کو مالی اعتبار سے اس قابل بنا دے گا کہ وہ دگنا یا تگنا برطانوی مال خرید سکیں۔"[1]

شکر ــــ گواہ نے جیسور ضلع کے سیری کول مقام پر اپنی نیل کی کوٹھی کے قریب 2,700 پونڈ کی لاگت سے ایک شکر کا کارخانہ قایم کیا تھا۔ چونکہ دونوں جگہ شکر اور رم ایک ہی قسم کے گنّے سے بنائی جاتی تھی اس لیے گواہ کو توقع تھی کہ اُن کی ڈیوٹی میں یکسانیت پیدا کر دی جائے گی اور اس کو منافع ہوگا۔ اس کو 11½ فیصدی منافع ہوا تھا جس سے وہ مطمئن نہیں تھا۔ ہندوستان میں بغیر کسی قسم کا خطرہ مول لیے نقد قرض دینے کی صورت میں دس فیصدی سود آسانی سے مل جاتا تھا اور سود در سود کی شرح تو اس سے کہیں زیادہ ہوتی تھی۔ اگر رم کی ڈیوٹی میں یکسانیت پیدا کر دی گئی تو اس کا منافع بڑھ جائے گا۔ اگر یکسانیت پیدا نہ کی جاسکی تو وہ شکر کا کاروبار چھوڑ دے گا۔

جے۔ ایم۔ ہیتھ (J. M. Heath)

لوہا ــــ جس جماعت سے گواہ کا تعلق تھا اس نے مدراس سے جنوب کی طرف 120 میل کے فاصلے پر واقع پورٹو نوو (Porto Novo) کے مقام پر ایک مشینی بھٹی تعمیر کی اور مشورتی لوہا بنانے کا کام شروع کیا۔ اس کا کاروبار بہت ترقی کر گیا تھا۔ انگلستان کے لوہے سے فولاد نہیں بنایا جاسکتا تھا۔ فولاد سازی کے لیے لوہا سویڈن اور روس سے منگایا جاتا تھا۔ ہندوستان کا لوہا فولاد سازی کے لیے موزوں تھا اور وہ انگلستان کو لوہا مہیا کر سکتا تھا۔ گواہ نے ہندوستان سے خام لوہا منگایا تھا تاکہ انگلستان میں اس کی سلاخیں بنائی جاسکیں۔ لیکن انگلستان درآمد کیے جانے والے خام لوہے پر امتناعی محصول عائد کیا جاتا تھا۔ "ایک ٹن خام لوہے پر 5 شلنگ محصول ادا کرنا ہوتا ہے۔ لوہے کی ایک ٹن وزن کی سلاخیں بنانے کے لیے تقریباً دو ٹن خام لوہا درکار ہوتا ہے۔ لوہے کی ایک ٹن سلاخوں پر 2 شلنگ 6 پنس محصول لگتا ہے لیکن ایک ٹن سلاخیں بنانے کے لیے جتنے خام لوہے کی ضرورت پڑتی ہے اس پر 10 شلنگ محصول ادا کرنا ہوتا ہے۔ انگلستان سے ہندوستان جانے والا لوہا محصول سے مستثنیٰ تھا۔"[2]

---

[1] سوالات نمبر 4384، 4385، 4388، 4415 اور 4418۔

[2] سوالات نمبر 4610 اور 4676۔

ہورس ہے مین وِلسن (Horace Hayman Wilson)

کتابیں ـــــ سنسکرت کا ممتاز عالم اور مستشرق چوبیس سال ہندوستان میں گزار چکا تھا۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا لائبریرین اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں سنسکرت کا پروفیسر مقرر ہوگیا تھا۔ اس نے اپنے بیان میں کہا کہ ہندوستان میں شائع ہونے والی کتابوں پر 2 پونڈ 10 شلنگ فی ہنڈرڈ ویٹ محصول لگتا ہے اور کتابوں کو محصول سے مستثنیٰ قرار دینے کی درخواست کی۔

جوزف ٹکر (Joseph Tucker)

ریشم کے مصنوعات ـــــ جوزف ٹکر نے، جو ریشمی کپڑے چھاپنے اور ریشمی رومالوں کا کاروبار کرنے والی لندن کی ایک کمپنی سے تعلق رکھتا تھا، خیال ظاہر کیا کہ برطانوی صنعت کے تحفظ کے لیے ضروری ہے کہ ہندوستان سے درآمد ہونے والے ریشمی کپڑے پر 20 فیصدی ڈیوٹی لگائی جائے۔ اس نے کہا کہ انگریز تو اب بھی صرف برطانوی مصنوعات استعمال کرتے ہیں لیکن فرانس کے لوگ ہندوستانی مال کو ترجیح دیتے ہیں۔ فرانس کو برطانیہ کے ریشمی کپڑے کی برآمد کم ہو رہی ہے اور ہندوستان کے بندانا اور دوسری قسم کے ریشمی رومالوں کی مانگ بڑھ رہی ہے۔ اس نے پارلیمنٹ کے سامنے گزاری جانے والی ایک رپورٹ کے مندرجہ ذیل اعداد و شمار پیش کیے۔

انگلستان سے فرانس برآمد کیے گئے

سال	برطانیہ کے بنے ہوئے ریشم کے مصنوعات۔ پونڈ	ہندوستان کے بنے ہوئے بندانا اور دوسرے رومال پونڈ
1832ء	50,600	29,500
1833ء	36,300	60,400
1834ء	32,700	77,700
1835ء	16,800	1,14,400

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

سال	برطانیہ کے ریشم کے مصنوعات	ہندوستان کے بنے ہوئے بندانا اور دیگر ریشمی مال
1836ء	15,600	1,07,600
1837ء	10,000	1,74,500
1838ء	9,400	2,02,200
1839ء	5,500	1,68,500

گواہ نے مزید کہا کہ "جس وقت انگریزی مال پہلے پہل فرانس گیا تو اس وقت وہاں ہندوستانی مال کی درآمد ممنوع تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس کے صارفین نے برطانوی مال کو ترجیح دی۔ غالباً یہ وجہ تھی زیادہ مال فرانس جانے کی۔ جب ہندوستان کے مال کے درآمد کی اجازت دی گئی بلکہ اس سے بھی کچھ پہلے سے، ہماری تجارت متاثر ہونے لگی۔ مگر ہندوستانی مال کے درآمد کی اجازت کے بعد تو برطانوی تجارت بالکل ختم ہو گئی[1]"

یورپ کی صرف ایک قوم نے ہندوستان کی بنی ہوئی صرف ایک چیز کو ترجیح دی تھی لیکن انگلستان کے تاجر اور صنعت کار اس کو بھی برداشت نہ کر سکے۔ ان چار آخری گواہوں کے بیانات سے جو ظاہر ہوتا ہے جو ریشم کا کاروبار کرتے تھے اور جن کے بیانات سلیکٹ کمیٹی کے سامنے ہوئے تھے۔ اب ہم ان کے بیانات کا جائزہ لیں گے۔

ٹامس کوپ (Thomas Cope)

ریشم کی مصنوعات ــــ میکلس فیلڈ (Maccles field) کے ریشمی کپڑا بُننے والے ٹامس کوپ نے اپنے بیان میں بڑی صاف گوئی سے کام لیا اور دوسرے گواہوں کے مقابلے میں زیادہ کھُل کر بات کی۔

مسٹر بروکل ہرسٹ ــــ اگر ہندوستان سے آنے والے ریشمی کپڑے پر 20 فیصدی سے گھٹا کر $3\frac{1}{2}$ فیصدی محصول کر دیا جائے تو آپ کی تجارت کے اس شعبے پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔

مسٹر کوپ ــــ میرے خیال میں اس سے ہماری تجارت کا یہ شعبہ تباہ ہو جائے گا۔ اگر ایسا کیا گیا تو

---

[1] سوال نمبر 6379۔

مذکورہ بالا لوگوں کا روزگار ختم ہو جائے گا اور وہ لوگ اپنے خون پسینے کی کمائی سے ایمانداری کے ساتھ زندگی گزارنے کے قابل نہیں رہیں گے۔ بے روزگاری انہیں سنجیدگی اور متانت سے محروم کر دے گی اور وہ اس سماج کے لیے ایک بار بن جائیں گے جو پہلے ہی بھاری بوجھ کے نیچے دبی ہوئی ہے۔ اس کی وجہ سے سرمائے کا ایک بڑا حصّہ استعمال نہیں کیا جا سکے گا اور جو روزگار ہمیں ملنا چاہیے وہ بدیسیوں کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گا۔

مسٹر ہاگ — کیا آپ کے خیال میں ریشم کا کاروبار کرنے والے انگریزوں کے ساتھ انصاف کا تقاضہ ہے کہ دوسرے ملکوں کے ریشم کے مصنوعات کو انگلستان کی منڈیوں میں آنے کی اجازت نہ دی جائے؟

مسٹر کوپ — میرے خیال میں انگریز کاروباری طبقے کے ساتھ انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ درآمد ہونے والے مال پر ڈیوٹی لگائی جائے تاکہ ہم اس سے برابر کا مقابلہ کر سکیں۔ اگر ایک ہندوستانی ½1 یا 2 پینس یومیہ میں اپنی گزر بسر کر سکتا ہے اور ایک انگریز اگر 2 شلنگ یومیہ سے کم میں گزارا نہیں کر سکتا ہے تو ہماری رائے میں یہ امر نا انصافی پر مبنی ہے کہ ہندوستانی بُنکر اپنا مال یہاں لائے اور ہم سے نامناسب شرائط پر مقابلہ کرے۔

مسٹر ایلیٹ — کیا آپ کے خیال میں اس ملک کے ایک مزدور کو جو بہتر غذا حاصل کر سکتا ہے یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ ہم ہندوستان کے مزدور کو اس حالت میں رکھیں گے جس میں اس کو چاول کے علاوہ کچھ اور نصیب نہ ہو؟۔

مسٹر کوپ — مجھے ہندوستانی مزدور سے ہمدردی ضرور ہے لیکن اس کے خاندان کے مقابلے میں مجھے اپنے خاندان کی زیادہ فکر ہے۔ چونکہ ہندوستانی مزدور کی حالت مجھ سے زبوں تر ہے اس لیے اس کی خاطر میں اپنے خاندان کے آرام و آسائش کو قربان کر دوں یہ بات میرے خیال میں درست نہیں۔ میں اس قانون کو بھی صحیح نہیں سمجھتا جو ہم سے ہمارا کام چھین کر ہندوستان کے مزدور کو دینا چاہتا ہے کیونکہ اس کی حالت ہم سے زیادہ خراب ہے۔[1]

یہ بتانا ضروری نہیں ہے کہ کوپ کی قسم کے صنعت کار ہندوستان کے تعلق سے برطانوی پالیسی کی تشکیل کرتے تھے۔ برطانوی پارلیمنٹ اور حکومتِ ہند دونوں برطانیہ کے صنعت کاروں اور رائے دہندگان کے حکم کے بندے تھے۔

---

[1] سوالات نمبر 6483، 6577 اور 6582۔

جان پراؤٹ (John Prout)

ریشم کے مصنوعات ـــــ جان پراؤٹ بھی میکلس فیلڈ کا ریشم کا صنعت کار تھا اور برطانیہ کے ریشم کے صنعت کاروں کے نقطۂ نظر کی نمائندگی کرتا تھا۔

مسٹر ہروکل ہرسٹ ـــــ کیا آپ کے خیال میں ہندوستان کے ریشمی کپڑے اور بندانا پر لگنے والی ڈیوٹی میں کمی آپ کی تجارت کے لیے نقصان کا باعث ہوگی؟

مسٹر پراؤٹ ـــــ میرے خیال میں بڑے نقصان کا باعث ہوگی۔ یہی خیال میکلس فیلڈ کے دوسرے تاجروں کا بھی ہے۔ یہ ایسی پالیسی ہے جس سے بدیسی ہماری منڈیوں پر قبضہ کر لیں گے اور خود ہماری صنعت تباہ ہو جائے گی[1]

جان فرانسس (John Francis)

ریشم کے مصنوعات ـــــ فاروچ کا ریشم کا صنعت کار جان فرانسس بھی ہندوستان کے ریشم کے سامان کے اتنا ہی خلاف تھا اس لیے کہ وہ برطانوی مصنوعات سے کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر رہے تھے۔ اُس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف نہایت تلخ لہجہ اختیار کیا جس نے یکساں ڈیوٹی کی درخواست کی تھی۔

مسٹر ابلیٹ ـــــ کیا یہ واقعہ ہے کہ آپ ریشم کے سامان کی تجارت کیا کرتے تھے جو آپ نے اب ترک کر دی ہے؟ کیا آپ نے ریشم کی تجارت محض تجارتی صورتِ حال کی بنا پر ترک کی تھی یا اس کی اور بھی وجوہ تھیں؟

مسٹر فرانسس ـــــ صرف تجارتی صورتِ حال کی بنا پر میں نے ریشم کی تجارت ترک کی ہے۔ جس زمانہ میں انڈیا ہاؤس میں کورا فروخت ہوتا ہے میں وہاں سے ایک تھان اس سے بہت کم قیمت میں خرید سکتا ہوں جتنے میں کورا بنانے کے لیے ایک پونڈ ریشم ملتا ہے۔

مسٹر اورنگ ـــــ آپ کے خیال میں اس کی وجہ کیا ہے؟

مسٹر فرانسس ـــــ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہندوستانی مال زیادہ محصول ادا کیے بغیر یہاں آجاتا ہے۔

---

[1] سوال نمبر 6630۔

مسٹر بروکل ہرسٹ ـــ کیا آپ کے خیال میں ان حالات کا بہترین علاج یہ نہیں ہے کہ خام مال بھیجنے کے لیے ہندوستان کی ہمّت افزائی کی جائے تاکہ برطانوی صنعت اس کو استعمال کرسکے ؟ ۔

مسٹر فرانسس ـــ یقیناً۔

گواہ نے مزید بتایا کہ چالیس سال پہلے (تقریباً ۱۸۰۰ء) ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان سے خام ریشم لایا کرتی تھی اور انگلستان کے صنعت کاروں کے ہاتھ بیچا کرتی تھی۔ اب کمپنی کو" برطانوی صنعت سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی ہے" اور زیادہ بہتر طریقے سے ریشم سے بیجا چھڑانے کے لیے ہندوستان میں ریشم کا کپڑا بنانے کی اجازت دے دی ہے۔[1] مسٹر بروکل ہرسٹ نے گواہ سے یہ بھی کہلوانے کی کوشش کی کہ ہندوستان کے دست کار اچھی حالت میں ہیں۔ وہ خام مال بھی پیدا کرتے ہیں ½ ۱ شلنگ یومیہ بھی کماتے ہیں۔

مسٹر بروکل ہرسٹ ـــ آپ کا یہ خیال تو نہیں ہے کہ وہ لوگ تکلیف میں مبتلا ہیں۔ وہ اسی انداز سے رہتے ہیں جس انداز سے رہنے کے عادی ہیں

مسٹر فرانسس ـــ میں نہیں سمجھتا کہ انھیں کوئی تکلیف ہے۔

مسٹر بروکل ہرسٹ ـــ اگر وہ بہتر معیارِ زندگی سے واقف نہیں ہیں تو وہ آرام سے ہوں گے۔

مسٹر فرانسس ـــ ہوسکتا ہے کہ فاقوں میں بھی انسان مطمئن ہو لیکن میں اس سے متفق نہیں۔

جان پوئٹن (John Poyton)

آخری گواہ جس کا بیان سلیکٹ کمیٹی کے سامنے ہوا اسپٹل فیلڈس کا ریشم کا صنعت کار جان پوئٹن تھا۔

ریشم کے مصنوعات ـــ اسپٹل فیلڈس میں بہت کم بندانا بنائے جاتے تھے۔ اس میدان میں اسپٹل فیلڈس اور ہندوستان کے درمیان کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ پھر بھی گواہ کو اس پر اعتراض تھا کہ ہندوستان کے ریشم کے مصنوعات پر لگنے والی ڈیوٹی میں تخفیف کی جائے کیونکہ "اگر ڈیوٹی میں کمی کی گئی تو ملک میں بندانے بننا کم ہو جائیں گے اور جو لوگ اس وقت بندانے بنا رہے ہیں وہ دوسرا کام شروع کر دیں گے اور اس طرح وہ اس مال کی حد تک جو ہم اس وقت بنا رہے ہیں ہمارے

---

[1] سوالات نمبر 6814، 6815، 6836، 6852، 6863 اور 6854۔

مقابلے میں اُتر آئیں گے۔[1]"

ہمیں یہ بات نہیں معلوم ہو سکی کہ اس شہادت کی بنا پر ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی نے کوئی خاص سفارشیں پیش کیں یا نہیں۔ لیکن ہاؤس آف لارڈز کی سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ ہمارے پیش نظر ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے چونکہ دونوں ایوانوں میں درخواستیں پیش کی تھیں اس لیے ہاؤس آف لارڈز کی سلیکٹ کمیٹی نے بھی میل ول، لارپنٹ اور ٹریولین کے علاوہ کچھ دوسرے گواہوں کے بیانات لیے تھے جو ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کے سامنے مندرجہ بالا بیانات دے چکے تھے۔ لارڈ ایلن برا، جو کچھ مدت بعد ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر کیا گیا تھا، ہاؤس آف لارڈز کی سلیکٹ کمیٹی کا صدر تھا۔ اس کی رپورٹ میں ہندوستانیوں کے ساتھ ہمدردی تو بہت دکھائی گئی تھی لیکن انصاف نہیں کیا گیا تھا۔ لارڈ ایلن برا نے حسب معمول اپنے آراستہ و پیراستہ انداز میں ہندوستانیوں کی داد طلبی اور پارلیمنٹ کی فراخ دلی کا ذکر کیا تھا۔

"ہندوستان کی آبادی انگلستان کی آبادی کی چار گُنا ہے اور دُنیا میں پھیلی ہوئی برطانوی سلطنت کی مجموعی آبادی سے زیادہ ہے۔ ہندوستان سول انتظامات اور فوجی دفاع کے تمام اخراجات خود اپنے وسائل سے ادا کرتا ہے۔ تمام اعلا، زیادہ منفعت بخش اور باعزّت عہدوں پر انگریزوں کا قبضہ ہے۔ اس کے بعد بھی ہندوستان کو ہر سال اس ملک کو دو اور تین ملین پونڈ کے درمیان رقم بھیجنی پڑتی ہے جس کا تھوڑے سے فوجی سامان کے علاوہ، اس کو کوئی معاوضہ نہیں ملتا ہے۔[2]"

فصاحت و بلاغت کے اس مظاہرے کے بعد لارڈ ایلن برا نے سفارش کی کہ ہندوستان اور جزائر غرب الہند سے آنے والی تمباکو کی ڈیوٹی مساوی کر دی جائے لیکن رم کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ سُوتی کپڑے کی ہندوستانی دست کار پہلے ہی ختم ہو چکے تھے۔ اس لیے لارڈ ایلن برا نے سفارش کی انگلستان کے سوتی کپڑے اور ہندوستان کے سوتی کپڑے پر عائد ہونے والے محصول کی نابرابری ختم کر دی جائے۔ چونکہ ہندوستان کا ریشمی کپڑا اب بھی انگلستان کے ریشمی کپڑے کا مقابلہ کر سکتا تھا اس لیے لارڈ ایلن برا نے ریشمی کپڑے پر لگنے والی ڈیوٹی میں یکسانیت کی سفارش نہیں کی۔ جس کو "ہندوستان کی مرتی ہوئی صنعتوں میں آخری صنعت" کہا جا سکتا ہے۔

---

[1] سوال نمبر 4946

[2] ہاؤس آف لارڈز کی سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ، ص 18

باب 8

کافی، شکر اور کپاس

یورپ کی قوموں کے لیے 1848ء سیاسی انقلابوں کا سال تھا۔ فرانس نے اپنے بادشاہ کو ملک بدر کر دیا اور جمہوریہ روم کا قیام عمل میں آیا۔ جرمنی کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا اور چھوٹے موٹے حکمرانوں کی مطلق العنانیت کے خلاف شورشیں پھوٹ پڑیں۔ ان کے نتیجے میں اہم دستور وجود میں آ گئے۔ اٹلی نے قبل از وقت آسٹریا کے خلاف اعلان جنگ کر دیا، مازینی کے تصورات کی بنیاد پر روم میں جمہوری حکومت قائم کر لی گئی اور قومی آزادی حاصل کرنے کے لیے پہلی دفعہ ایک بڑا قدم اٹھایا گیا جس میں اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ آسٹریا میں ویانا کے لوگوں نے بغاوت کی اور بہادر قوم پرست کوستھ (Kossuth) کی رہنمائی میں ہنگری نے بغاوت کر دی۔ آئرلینڈ کی متحدہ حکومت کے خلاف چلنے والی تحریک نے بغاوت کی شکل اختیار کر لی۔ ہر طرف ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پرانے ادارے ختم ہو رہے ہیں اور عوامی ادارے اور عوامی طاقت ابھر رہی ہے۔

ان سیاسی تحریکات کے ساتھ یورپ میں تجارتی اور زرعی پریشان حالی بڑھتی جا رہی تھی۔ انگلستان کے مالکان اراضی غلّے کی قیمت زیادہ رکھنا چاہتے تھے صنعت کار اور مزدور خواہشمند تھے کہ انھیں کم قیمت پر روٹی مل سکے۔ آخر 1846ء میں غلّے کے قانون (Corn Laws) منسوخ کر دیے گئے۔ اس طرح برطانوی صنعت کاروں کو ایک محرک مل گیا اور لوگوں نے ایک خود کفیل سلطنت کے مبہم خواب دیکھنے شروع کر دیے۔ کیا یہ ممکن تھا کہ انگلستان کو کسی دوسری قوم پر انحصار نہ کرنا پڑے؟ کیا یہ ممکن تھا کہ انگلستان اپنی ضرورت کی تمام اشیاء اپنے مقبوضات سے حاصل کر سکے؟ ہندوستان کی چائے رفتہ رفتہ چینی چائے کی جگہ لے رہی تھی کیا ہندوستان ضرورت کے مطابق کافی پیدا کر سکتا تھا؟

غلاموں کی آزادی کے بعد جزائر غرب الہند میں گنے کی کاشت کم ہو گئی تھی۔ کیا ہندوستان ضرورت کے مطابق شکر انگلستان کو مہیا کر سکتا تھا؟ لنکا شائر کے کارخانوں کے لیے روئی امریکہ سے آتی تھی کیا ہندوستان ضرورت کے مطابق روئی مہیا کر سکتا تھا۔ ان سوالوں کے جواب معلوم کرنے کے لیے پارلیمانی تحقیقات کی گئی۔

شکر اور کافی کی کمیٹی

1848ء میں ہاؤس آف کامنز کی ایک سلیکٹ کمیٹی مقرر کی گئی جس کا صدر لارڈ جارج بینٹنک تھا۔ اس کمیٹی کے سپرد "ملکہ معظمہ کے مغربی اور مشرقی مقبوضات اور ماریشس میں شکر اور کافی کی پیداوار" کی موجودہ حالت اور آئندہ امکانات کے تحقیق و تفتیش کا کام کیا گیا تھا۔ کمیٹی نے کئی گواہوں کے بیانات لیے اور اُن کی شہادت اپنی آٹھ رپورٹوں کے ساتھ ایوان کے سامنے پیش کر دی جو دو ہزار سے زیادہ صفحات پر مشتمل تھی۔ سب سے پہلے لارڈ ہارسٹن کا بیان ہوا تھا لیکن وہ ہندوستان کی تجارت سے متعلق کچھ زیادہ نہ کہہ سکا۔ اسی دن پارلیمنٹ کے ایک رکن جان باگ شا (John Bagshaw) کا بھی بیان ہوا تھا۔ اس نے اُن نقصانات کا ذکر کیا جو برطانیہ کے دوسرے مقبوضات سے مقابلہ کرنے کے سلسلے میں ہندوستان کو اُٹھانا رہا تھا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے گھریلو اخراجات کے لیے ہر سال ہندوستان کی قومی آمدنی میں سے تین ملین پونڈ بلکہ اس سے بھی زیادہ رقم لے لی جاتی ہے اور اس رقم کا عوض ہندوستان کو کچھ نہیں ملتا ہے۔"

"دوسری بات یہ ہے سول اور فوجی افسر جو رقم پس انداز کرتے ہیں وہ ہندوستان میں شاذ ہی رہتی ہے۔ ہر سال وہ انگلستان آجاتی ہے اور اس طرح ہندوستان کے وسائل سے انگلستان اپنے سرمائے میں اضافہ کر رہا ہے۔

"تیسری بات یہ ہے کہ یہ واقعہ سب کے علم میں ہے کہ برطانوی ہند کی آمدنی کا زیادہ حصہ زمین سے آتا ہے جس کی بنا پر اس کی پیداوار متاثر ہوتی ہے۔ زمین کے محصول کی مجموعی رقم تقریباً ساڑھے تیرہ ملین پونڈ ہوتی ہے۔

"چوتھی بات یہ ہے کہ انگلستان کے کسٹم کے دفاتر جس انداز سے محصول وصول کرتے ہیں اس

کی بنا پر مال درآمد کرنے والوں کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے[1]۔"

جان باگ شا نے بڑے افسوس کے ساتھ کہا کہ پچھلے تیس سال میں ہندوستانی سوتی کپڑے کی صنعت ختم ہو گئی۔ 1816-17ء میں ہندوستان نہ صرف اپنی کثیر آبادی کے لیے کپڑا تیار کرتا تھا بلکہ 16,59,438 پونڈ کی مالیت کا کپڑا برآمد بھی کیا کرتا تھا۔" تیس سال بعد برآمدات ختم ہو چکے ہیں اور ہندوستان چار ملین پونڈ کا کپڑا درآمد کر رہا ہے۔" ہندوستان کے لوگ وہاں درآمد ہونے والا برطانوی کپڑا 2½ فیصدی محصول ادا کر کے خرید سکتے ہیں لیکن امتناعی محاصل لگا کر ہندوستان کے صنعت کاروں کے لیے اس ملک کی مانگ کو پورا کرنا ناممکن بنا دیا گیا ہے۔"

چونکہ انگلستان میں شکر پیدا نہیں ہوتی تھی اس لیے شکر کی حد تک ڈیوٹی میں کچھ صحت مند تبدیلیاں کی گئی تھیں۔ اس کا واضح نتیجہ فوری طور سے سامنے آگیا۔ باگ شا نے ایک ہندوستانی اخبار کا اقتباس پیش کرتے ہوئے کہا "پچھلے برسوں میں کسی تجارتی شے کی حد تک اس فروغ کی مثال نہیں ملتی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو اس فروغ کے مقابلے میں ہندوستان کے وسائل میں کوئی ترقی نظر نہیں آتی۔ پچھلے سال ہم نے (ہندوستان نے) انگلستان کی ضرورت کی چوتھائی شکر مہیا کی۔ ہمیں یقین ہے کہ رفتہ رفتہ ہندوستان اس قابل ہو جائے گا کہ انگلستان کی ضرورت کی تمام شکر مہیا کر سکے۔" یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ امید کبھی پوری نہ ہو سکی اور انیسویں صدی کے نصف آخر میں تمام دوسری صنعتوں کی طرح شکر کی صنعت کا بھی زوال ہو گیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک ممتاز ڈائرکٹر کرنل سائیکس (Colonel Sykes) نے ہندوستان کے حالات کا بڑے غور سے مطالعہ کیا تھا۔ اس نے 33,00,000 پونڈ سے 37,00,000 پونڈ سالانہ تک ہندوستان سے ہونے والے دولت کے نکاس کا ذکر کیا اور بڑی حقیقت پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے کہا "ہندوستان یہ خراج صرف فاضل برآمدات کی شکل میں ادا کر سکتا ہے"۔ ہنری سنیٹ جان ٹکر نے، جو اس زمانے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا صدر تھا، کہا کہ دولت کے نکاس میں برابر اضافہ ہوتا رہے گا۔" اس لیے کہ ہمارے گھریلو اخراجات ہر سال بڑھتے جا رہے ہیں[2]۔" کمپنی کے صدر نے جس طرح اظہارِ افسوس کیا تھا وہ یقینی اس کے دل کی آواز تھی لیکن اس سے ہندوستان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔

---

[1] پہلی رپورٹ۔

[2] پہلی رپورٹ۔

کہنے کو تو کوئی طنزاً یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ ہندوستان سے جتنی زیادہ دولت انگلستان جاتی تھی انگلستان اتنی ہی زیادہ ہمدردی اور افسوس کا اظہار کر کے وہ قرض چکا دیا کرتا تھا۔

مشرق سے تجارت کرنے والے ایک تاجر نیتھینل الگزینڈر (Nathaniel Elexander) نے انگلستان میں ہندوستانی شکر کی زیادہ کھپت کا ذکر کیا لیکن آئندہ کے امکانات کے متعلق بہت محتاط بیان دیا۔ 1846ء سے پہلے ہندوستانی شکر کی تجارت فائدہ مند تھی لیکن اس کے بعد منافع بخش نہیں رہی تھی۔ اگر یہ تجارت کم ہو گئی تو انگلستان کے لیے ہندوستان سے سالانہ خراج وصول کرنا مشکل ہو جائے گا۔ گواہ نے بیان جاری رکھتے ہوئے کہا "میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ 1847ء تک ہندوستان کے درآمدات 60,00,000 پونڈ کی مالیت کے اور برآمدات 95,00,000 پونڈ کی مالیت کے ہوتے تھے۔ ان دونوں کا فرق یعنی 40,00,000 پونڈ وہ خراج تھا تو کمپنی ہندوستان سے وصول کرتی تھی۔[1]

الگزینڈر اور سر جارج لارپینٹ، جس کا ذکر ہم پچھلے باب میں کر چکے ہیں، دونوں نے کمیٹی کی توجہ اس امر پر دلائی کہ جزائر غرب الہند اور ماریشش زیادہ تر شکر پیدا کرتے ہیں اور ہندوستان میں شکر کی بڑی کھپت ہے اور وہ سالانہ پیدا ہونے والی شکر کا صرف تھوڑا سا حصہ برآمد کر سکتا ہے اس لیے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ ہندوستان شکر برآمد کرنے میں زیادہ مدت تک دوسرے ملکوں کا مقابلہ کر سکے گا۔ لارپینٹ نے کہا۔

" 1836ء میں محاصل کی یکسانیت سے فائدہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ جزائر غرب الہند سے آنے والی شکر کی مقدار بہت کم ہو گئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ 1831ء میں 2,00,000 ٹن شکر وہاں سے آئی تھی اور 1840ء اور 1841ء میں اس کی مقدار گھٹ کر 1,10,000 ٹن رہ گئی تھی۔ یہ وجہ تھی کہ ہندوستان سے زیادہ شکر آئی اور اسے زیادہ منافع ہوا۔ ہندوستان سے شکر کی برآمد صرف ایک صورت میں منافع بخش ہو سکتی ہے اور وہ صورت یہ ہے کہ انگلستان میں شکر کی قیمت

---

[1] پہلی رپورٹ ــــ پچاس سال پہلے یہ بات سب کے ذہن نشین ہو گئی تھی کہ گھریلو اخراجات کے لیے ہندوستان سے ہونے والا سالانہ دولت کا نکاس ہندوستان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ درآمد سے زیادہ مال برآمد کرے۔ ہندوستان اور انگلستان کے درمیان ہونے والی تجارت فطری قوانین کے مطابق نہیں تھی بلکہ اس میں مجبوری کا عنصر شامل تھا۔ نصف صدی کے بعد اب حالات بدتر ہو گئے ہیں۔ ہندوستان کی صنعتوں کا زوال ہو چکا ہے اور گھریلو اخراجات 3 ملین سے بڑھ کر 17 ملین پونڈ ہو گئے ہیں۔ ہندوستان لوگوں کی غذا یعنی گیہوں اور چاول برآمد کر کے اس سالانہ مطالبے کو پورا کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ غربت میں اضافہ ہو رہا ہے اور بار بار پڑنے والے قحطوں کی تعداد بڑھ گئی ہے۔

بڑھ جائے گی[15]"

ایک سے زیادہ گواہ نے اپنے بیان میں اس پر زور دیا کہ زمین کی تخمینی قیمت کے تناسب سے مالگزاری تشخیص کرنے کے طریقے نے شکر کی طرح کی قیمتی پیداوار کی کاشت پر بُرا اثر ڈالا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے صدر ہنری سینٹ جان ٹکر نے کہا "سر ٹامس منرو چاہتا تھا کہ اس ملک سے زیادہ سے زیادہ مالگزاری وصول کرے۔ اس لیے اس نے پیدا ہونے والی مختلف اشیا کی تخمینی قیمت کے تناسب سے مالگزاری تشخیص کی۔ ایسی چیزوں پر اس نے زیادہ مالگزاری لگائی جن کی زیادہ پیداوار متوقع تھی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوا یا ناکام رہا۔ پیداوار کی کمی کے دوسرے وجوہ بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ گنے پر مالگزاری کی تشخیص کے نتیجے میں مدراس کے علاقے میں اس کی کاشت کم ہو گئی[16]"

رابرٹ کرسچین (Robert Christian) نے، جو لنکا میں کافی کی کاشت کرتا تھا، اُس جزیرے میں کافی کی کاشت شروع کرنے کی دلچسپ روداد سُنائی۔

"ہم نے 1837ء میں کاشت شروع کی۔ جزائر غرب الہند میں کافی کی پیداوار کم ہو گئی تھی، بھاری محصول لگا کر برطانوی بلغات کی کافی کا تحفظ کیا جا رہا تھا۔ اور اس کی وجہ سے کافی اچھی قیمت اُٹھاتی تھی۔ ان واقعات نے محرک کا کام کیا۔" اس سے پہلے لنکا کے لوگ کافی کی کاشت کیا کرتے تھے اور یورپین صرافے کی امداد اور ان کی وساطت کے بغیر اس کو برآمد کیا کرتے تھے۔ 1838ء میں لنکا نے 2,500 ٹن کافی انگلستان کو برآمد کی تھی۔ یہ کافی لنکا کے لوگوں نے خود پیدا کی تھی۔ نو سال بعد 1847ء میں 12,482 ٹن کافی پیدا ہوئی۔ اس میں 7,173 ٹن لنکا کے لوگوں نے پیدا کی تھی اور 5,309 ٹن یورپین باغداروں نے[17]

کمیٹی نے آخری رپورٹ میں میں غلاموں کے آزاد ہو جانے اور آزاد مزدور نہ ملنے کی وجہ سے شکر کی کاشت کو ہونے والے نقصان کا ذکر کیا تھا اور کاشتکاروں کی تکلیفوں کا رونا رویا تھا۔ اُنھوں نے سفارش کی تھی کہ شکر پر جو برطانوی مقبوضات کی پیداوار ہے، دس شلنگ کا امتیاری محصول

---

[15] دوسری رپورٹ۔

[16] پہلی رپورٹ۔

[17] چھٹی رپورٹ۔

عائد کیا جائے۔

روئی کی کمیٹی

ہندوستانی کپاس کی ترقی کے متعلق تحقیقات کرنے کے لیے اُسی سال ایک زیادہ اہم سلیکٹ کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ زمانہ قدیم سے ہندوستان اپنے سوتی کپڑوں کے لیے مشہور تھا جو ایشیا اور یورپ کی منڈیوں کو برآمد کیے جاتے تھے۔ حالانکہ انگلستان نے بھاپ سے چلنے والے کرگھوں اور حفاظتی محاصل کی مدد سے اس صنعت کو تباہ کر دیا تھا پھر بھی خیال تھا کہ ہندوستان لنکاشائر کے کارخانوں کے لیے خام مال پیدا کرتا رہے گا۔ انگلستان چاہتا تھا کہ خام مال اور صنعت دونوں پر اس کو دسترس حاصل ہو اور اُسے امریکہ اور دوسرے بیرونی ممالک پر انحصار نہ کرنا پڑے۔ اس لیے ہندوستانی کپاس کی کاشت کو توسیع و ترقی دینے کی کوششیں کی گئیں۔ 1848ء میں مقرر ہونے والی سلیکٹ کمیٹی کے سپرد بڑا اہم کام کیا گیا تھا اور انگلستان کی ایک نمایاں و ممتاز شخصیت جان برائٹ (John Bright) کو اس کمیٹی کا صدر مقرر کیا گیا تھا۔ غلّے کے قانونوں کی تنسیخ کی تحریک میں کابڈن کے ایک ساتھی کی حیثیت سے جان برائٹ ایک نمایاں حیثیت حاصل کر چکا تھا۔ اس تحقیقات کے دوران اس نے ہندوستان کے متعلق وہ معلومات حاصل کر لی تھیں جو آخر عمر تک اس کی تقریروں کی نمایاں خصوصیت بنی رہیں۔ ہم بلا مبالغہ کہہ سکتے ہیں کہ انیسویں صدی کے وسط میں جان برائٹ نے ہاؤس آف کامنز میں وہ حیثیت حاصل کر لی تھی جو اٹھارھویں صدی کی آخری دہائیوں میں ایڈمنڈ برک کی تھی۔ انہوں نے ایک مشرقی ماتحت ملک کے ساتھ انصاف کروانے کے لیے جدوجہد کی تھی۔ ان کی یادیں انگلستان کی سلطنت کے ختم ہو جانے کے بعد بھی انسانی ذہنوں میں محفوظ رہیں گی۔ جب موجودہ انگریزی زبان بات چیت کی زبان نہ رہ جائے گی اس وقت بھی ان کی مطبوعہ تقریریں انگریزی نثر کے بہترین نمونوں کے طور پر پڑھی جاتی رہیں گی۔

کپاس کی کاشت کے متعلق سلیکٹ کمیٹی ابھی زیادہ بیانات قلمبند نہیں کر پائی تھی کہ اُسے مجبوراً تشخیص مالگزاری کے متعلقہ سوال پر غور کرنا پڑا۔

فرانسس ولیم پیری ڈے (Francis William Prideaux) نے، جو اس وقت ہندوستان سے مراسلت کا نائب نگراں تھا، تشخیص مالگزاری کے موضوع پر مانچسٹر کے چیمبر آف کامرس کی درخواست کے کچھ حصے پڑھ کر سنائے کہ کپاس کی بہتر کاشت کے راستے میں سب سے بڑی رُکاوٹ زمین کا محصول

لگان داری کا طریقہ اور سڑکوں اور دوسرے ذرائع نقل وحمل کی کمی ہے۔ سائلوں کو یقین ہے کہ آنریبل کورٹ خود اس امر سے متفق ہے کہ کپاس پیدا کرنے والے اضلاع میں زمین کے محصول کا طریقہ ناقص ہے اور اس نے کئی دفعہ اصلاحات کرنی چاہیں لیکن اصلاحات کا کام شروع ہوتے ہی ترک کر دیا گیا۔ جب تک دوسری اشیاء کے مقابلے میں کپاس پر نسبتاً زیادہ مالگزاری تشخیص کرنے کا غیر منصفانہ طریقہ ترک نہ کیا جائے اور لگان داری میں زیادہ سمجھ داری اور انصاف سے کام نہ لیا جائے اس وقت تک کپاس کو اتنی ترقی دینے کی تمام کوششیں بے سود ثابت ہوں گی کہ اس کی زیادہ قیمت مل سکے اور زیادہ کاشت کی کسانوں کو ترغیب دی جا سکے[1]۔"

برطانوی صنعت کاروں کے اثر و رسوخ کی بنا پر بنگال سے انگلستان برآمد کی جانے والی روئی 1836ء میں محصول سے مستثنیٰ قرار دی جا چکی تھی، 1838ء میں بمبئی کی روئی پر محصول موقوف کر دیا گیا اور 1844ء میں مدراس سے جانے والی روئی پر بھی محصول ختم ہو گیا لیکن کورٹ آف ڈائرکٹرز اس پر آمادہ نہیں ہوا کہ کپاس کی کاشت کو ترقی دینے کے لیے مالگزاری میں تخفیف کر دی جائے۔

دوسرا گواہ ڈاکٹر جان فوربس رائل (Dr. John Forbes Royle) تھا جو نو سال تک سہارنپور کے نباتاتی باغ (Botanical Garden) کا نگراں رہ چکا تھا۔ 1837ء میں ہندوؤں کے طریقہ علاج کی قدامت کے متعلق اس کا ایک بیش بہا مضمون شائع ہوا تھا جس میں اس نے قدیم ہندوؤں کے طبی اور جراحی معلومات کی کیفیت و کمیت کی تشریح کی تھی۔ اس نے اپنے بیان میں کہا کہ امریکی روئی کے مقابلے میں سورت کی روئی 30 فیصدی کم پر لیورپول میں فروخت ہوتی ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ ہندوستانی روئی عام طور سے پوری طرح صاف نہیں کی جاتی ہے۔ امریکہ میں کپاس لال مٹی میں زیادہ پیدا ہوتی ہے اور ہندوستان کی کپاس کالی مٹی میں زیادہ ہوتی ہے۔ امریکہ کی الاباما اور لوزیانا (Alabama and Louisiana) ریاستوں میں ایک ایکڑ میں 400 پونڈ کپاس پیدا کی جاتی ہے جبکہ ہندوستان میں 100 یا 160 پونڈ سے زیادہ پیدا نہیں ہوتی ہے۔ 1833ء کے بندوبست کے بعد جس نے پٹے کی مدت میں اضافہ کر دیا تھا۔ شمالی ہندوستان میں کپاس کی کاشت میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔ ہندوستان میں اگر کپاس اوٹنے کی وہ چرخی استعمال کی جا سکے جس میں آرے کی طرح دندانے ہوتے ہیں تو وہ مفید ثابت ہوگی۔ پھر بھی امریکہ کی روئی اگر کم قیمت پر میسر آ سکے تو مانچسٹر کے

---

[1] سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ، ص 6۔

کارخانے ہندوستان کی روئی استعمال نہ کریں۔ انگلستان میں ہندوستان کی روئی کے دو استعمال ہیں۔ یا تو اس سے کپڑا بنایا جاتا ہے یا وہ سردیوں میں استعمال کیے جانے والے کوٹوں میں بھری جاتی ہے۔ ہندوستان میں انگریزی سوتی کپڑوں کی درآمد بڑھتی جا رہی ہے جس سے ہندوستان کی صنعت سال بہ سال زیادہ تباہ ہو رہی ہے۔

مانچسٹر کے چیمبر آف کامرس کے صدر ٹامس بیزلے (Thomas Bazley) نے ایک نقشہ پیش کیا جس میں انگلستان میں درآمد ہونے والی امریکہ اور ہندوستانی روئی کا تناسب دکھایا گیا تھا۔ برطانیہ کی مجموعی درآمدات میں ہندوستانی روئی کا تناسب 8 سے لے کر 15 فیصدی تک تھا۔ ملکہ وکٹوریہ کی تخت نشینی کے بعد کے دس سال کے اعداد و شمار ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔

انگلستان، اسکاٹ لینڈ اور آئرلینڈ میں درآمد کی جانے والی روئی

سال	ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے پونڈ	برطانیہ کے مشرقی مقبوضات سے پونڈ
1837ء	32,03,51,716	5,15,77,141
1838ء	43,14,37,888	4,02,29,495
1839ء	31,15,97,798	4,71,70,640
1840ء	48,78,56,504	7,70,10,917
1841ء	35,82,14,964	9,73,68,312
1842ء	40,53,26,600	9,65,55,186
1843ء	55,87,35,600	6,88,20,570
1844ء	51,72,18,622	8,86,39,608
1845ء	62,66,50,412	5,84,37,426
1846ء	38,25,26,000	3,42,70,800

اسی گواہ نے اپنے بیان میں یہ بھی کہا کہ سورت کی ایک پونڈ روئی سے 12 اونس سوت تیار کیا

جاتا ہے جب کہ امریکہ کی ایک پاؤنڈ روئی سے ½13 اونس سوت بنتا ہے۔ اس لیے امریکہ کی ایک پونڈ روئی کی قیمت ½9 پنس اور 6 پنس کے درمیان رہتی ہے اور ہندوستان کی روئی کی قیمت 3 پنس اور 5 پنس کے درمیان۔

ٹامس بزلے نے اپنے بیان کے آخر میں ہندوستان اور انگلستان کے درمیان ہونے والی تجارت کے متعلق ایک انگریز کے خیالات چند لفظوں میں پیش کیے۔ اس نے کہا "ہندوستان بہت بڑا ہے اور اس کی آبادی اتنی زیادہ ہے کہ وہاں برطانوی مصنوعات کی کھپت بہت زیادہ ہو سکتی ہے۔ ہندوستان سے تجارت کے سلسلے میں سارا سوال یہ ہے کہ ہم جو مصنوعات وہاں بھیجنے کو تیار ہیں کیا وہ ان کی قیمت زمین کی پیداوار کی شکل میں ادا کر سکتا ہے؟"[1]

رابرٹ کرافورڈ (Robert Crawford) نے، جو تاجر تھا اور بمبئی میں رہ چکا تھا، 1834ء سے 1845ء تک کی بارہ سال مدت میں بمبئی کے کچھ اضلاع میں ہونے والی کپاس کی کاشت کے متعلق اعداد و شمار پیش کیے۔ بڑودچ میں تشخیص شدہ اراضی پر ہونے والی مجموعی کاشت کی 43 فیصدی کپاس تھی، سورت میں 22 فیصدی، خاندیش میں 10 فیصدی اور شولاپور میں 3 فیصدی تھی۔ جب گواہ سے گجرات میں تشخیص مالگزاری کی نوعیت دریافت کی گئی تو اس نے کہا "چونکہ حکومت اور سرکاری ملازمین تمام مالگزاری وصول کرنے کے لیے بجا طور سے داد حاصل کر سکتے ہیں۔ انھیں داد ملنی چاہیے تھی۔ یہ اور بات ہے کہ کسان کا خون نچوڑا جاتا ہے"۔ گواہ نے بڑودچ کے کلکٹر مسٹر ڈیویز کی رپورٹ کا ایک حصہ پڑھ کر سنایا "چونکہ منڈیوں کا موجودہ حالت بدقسمتی سے ایسی ہے کہ منافع تو درکنار اس کی (کسان کی) لاگت بھی نہیں نکلتی ہے اس لیے وہ غلہ اپنے پاس نہیں رکھ سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں تباہی سے بچنے کے لیے اُسے چھوٹ اور بقایا کا سہارا لینا پڑتا ہے"۔[2]

اسی گواہ نے جہازرانی کے قوانین (Navigation Laws) کے بُرے اثرات کا بھی ذکر کیا جن کی رو سے جہازوں میں صرف انگریز ملاح بھرتی کیے جاتے تھے۔ گواہ نے کہا "مجھے وہ وقت یاد ہے جب بمبئی کے بندرگاہ کا کوئی جہاز، جس میں ہندوستانی ملاح ہوتے تھے، اس ملک تک آ سکتا تھا اگر اُسے وہی سہولتیں نصیب ہوتیں جو انگریزی جہازوں کو ہوتی ہیں"۔[3]

---

[1] سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ، ص 67۔

[2] سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ، ص ص 96 اور 97۔

[3] ایضاً، ص 104۔

ایک اور اہم گواہ میجر جنرل برگس (Major General Briggs) تھا۔ وہ 1801ء میں کمپنی کی ملازمت میں داخل ہوا اور تیئس سال تک ہندوستان میں فرائض منصبی ادا کرتا رہا۔ اس نے سرجان مالکم اور ماؤنٹ اسٹورٹ الفنسٹن جیسے لوگوں کی ماتحتی میں کام کیا تھا اور میسور کا کمشنر اور ناگپور کا ریذیڈنٹ رہ چکا تھا۔ اُس نے ہندوستان کے زمین کے محصول کے متعلق بڑی تفصیلی اور بیش قیمت کتاب لکھی تھی اور لارڈ ولیم بین ٹنک کو شمالی ہندوستان کے بندوبست کے متعلق مشورے دیے تھے۔ اُس نے ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ اصل ماخذوں کے ذریعے کیا تھا اور فرشتہ کی "تاریخ ہند" کا عالمانہ ترجمہ کیا تھا جو آج بھی معیاری ترجمہ سمجھا جاتا ہے۔

میجر جنرل برگس نے ہندوستان میں روئی کی بے اندازہ کھپت کا ذکر کیا اور کہا کہ وہ ملک "اتنی روئی پیدا کر سکتا ہے کہ پوری دُنیا کے لیے کافی ہو"۔ اس کے خیال میں ہندوستان سے بڑی مقدار میں روئی انگلستان کو برآمد کرنے میں دو باتیں مانع آتی تھیں۔ ایک زمین کا محصول اور دوسرے باربرداری کے لیے سڑکوں کی کمی[لہ]۔ جب اس سے اوّل الذکر کے متعلق سوال کیا گیا تو اس نے کہا "ہندوستان میں زمین کا محصول اور دوسرے بلا واسطہ محاصل انکم ٹیکس کے اصول پر قائم ہیں۔ آمدنی کا ایک حصہ چاہے وہ جنس کی شکل میں ہو یا رقم کی، عام طور سے بادشاہ کا حق سمجھا جاتا ہے"۔ ہندوؤں کے زمانہ حکومت میں یہ حصہ ابتدا میں پیداوار کا $\frac{1}{10}$ مقرر کیا گیا تھا[ثہ]۔

لارڈ ولیم بین ٹنک نے 1833ء میں جو بندوبست شمالی ہندوستان میں شروع کیا تھا اس نے لوگوں کے قدیم اداروں کو برقرار رکھا۔ اگر اس کو استمراری حیثیت دے دی جائے تو وہ حکومت اور کسان دونوں کے لیے انتہائی مفید ثابت ہو"۔ مدراس کی شرح تشخیص اس تخفیف کے باوجود بہت زیادہ ہے جو 1827ء میں سر ٹامس منرو نے کی تھی۔ سرکاری مطالبہ پوری طرح نہ ادا کیا جاتا ہے اور نہ کیا جا سکتا ہے۔ وصولیابی کا کام کلکٹر کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ "کلکٹر کی صوابدید پر چھوڑنے کے معنی یہ ہیں کہ وصولیابی ان چھوٹے موٹے افسروں کی صوابدید پر چھوڑ دی گئی ہے جو ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک بکھرے ہوئے ہیں"۔ معینہ مالگزاری کبھی ادا نہیں کی جاتی تھی۔ ہر سال چھوٹ دینا پڑتی تھی اور کسانوں کی حالت "انتہائی سقیم تھی[شہ]"۔

لہ سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ، ص 121۔

ثہ سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ، ص 123۔

شہ ایضاً، ص ص 126 اور 129۔

جاتا ہے جب کہ امریکہ کی ایک پونڈ روئی سے ½19 اونس سُوت بنتا ہے۔ اس لیے امریکہ کی ایک پونڈ روئی کی قیمت ½3 پنس اور 6 پنس کے درمیان رہتی ہے اور ہندوستان کی روئی کی قیمت 3 پنس اور 5 پنس کے درمیان۔

ٹامس بزلے نے اپنے بیان کے آخر میں ہندوستان اور انگلستان کے درمیان ہونے والی تجارت کے متعلق ایک انگریز کے خیالات چند لفظوں میں پیش کیے۔ اس نے کہا "ہندوستان بہت بڑا ہے اور اس کی آبادی اتنی زیادہ ہے کہ وہاں برطانوی مصنوعات کی کھپت بہت زیادہ ہو سکتی ہے۔ ہندوستان سے تجارت کے سلسلے میں سارا سوال یہ ہے کہ ہم جو مصنوعات وہاں بھیجنے کو تیار ہیں کیا وہ ان کی قیمت زمین کی پیداوار کی شکل میں ادا کر سکتا ہے؟"[1]

رابرٹ کرافورڈ (Robert Crawford) نے، جو تاجر تھا اور بمبئی میں رہ چکا تھا، 1834ء سے 1845ء تک کی بارہ سال مدت میں بمبئی کے کچھ اضلاع میں ہونے والی کپاس کی کاشت کے متعلق اعداد و شمار پیش کیے۔ بڑودچ میں تشخیص شدہ اراضی پر ہونے والی مجموعی کاشت کی 43 فیصدی کپاس تھی، سُورت میں 22 فیصدی، خاندیش میں 10 فیصدی اور شولاپور میں 3 فیصدی تھی۔ جب گواہ سے گجرات میں تشخیص مالگزاری کی نوعیت دریافت کی گئی تو اس نے کہا "چونکہ حکومت اور سرکاری ملازمین تمام مالگزاری وصول کرنے کے لیے بجا طور سے داد حاصل کر سکتے ہیں۔ انہیں داد ملنی چاہیے بھی۔ یہ اور بات ہے کہ کسان کا خون نچوڑا جاتا ہے۔" گواہ نے بڑودچ کے کلکٹر مسٹر ڈیویز کی رپورٹ کا ایک حصّہ پڑھ کر سُنایا "چونکہ منڈیوں کا موجودہ حالت بدقسمتی سے ایسی ہے کہ منافع تو درکنار اس کی (کسان کی) لاگت بھی نہیں نکلتی ہے اس لیے وہ غلّہ اپنے پاس نہیں رکھ سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں تباہی سے بچنے کے لیے اُسے چھُوٹ اور بقایا کا سہارا لینا پڑتا ہے۔"[2]

اسی گواہ نے جہاز رانی کے قوانین (Navigation Laws) کے بُرے اثرات کا بھی ذکر کیا جن کی رو سے جہازوں میں صرف انگریز ملّاح بھرتی کیے جاتے تھے۔ گواہ نے کہا "مجھے وہ وقت یاد ہے جب بمبئی کے بندرگاہ کا کوئی جہاز، جس میں ہندوستانی ملّاح ہوتے تھے، اس ملک تک آ سکتا تھا اگر اُسے وہی سہولتیں نصیب ہوتیں جو انگریزی جہازوں کو ہوتی ہیں۔"[3]

---

[1] سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ، ص 67۔

[2] سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ، ص ص 96 اور 97۔

[3] ایضاً، ص 104۔

ایک اور اہم گواہ میجر جنرل برگس (Major General Briggs) تھا۔ وہ 1801ء میں کمپنی کی ملازمت میں داخل ہوا اور تینتیس سال تک ہندوستان میں فرائض منصبی ادا کرتا رہا۔ اس نے سرجان مالکم اور ماؤنٹ اسٹورٹ الفنسٹن جیسے لوگوں کی ماتحتی میں کام کیا تھا اور میسور کا کمشنر اور ناگپور کا ریذیڈنٹ رہ چکا تھا۔ اُس نے ہندوستان کے زمین کے محصول کے متعلق بڑی تفصیلی اور بیش قیمت کتاب لکھی تھی اور لارڈ ولیم بینٹنک کو شمالی ہندوستان کے بندوبست کے متعلق مشورے دیے تھے۔ اُس نے ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ اصل ماخذوں کے ذریعے کیا تھا اور فرشتہ کی "تاریخ ہند" کا عالمانہ ترجمہ کیا تھا جو آج بھی معیاری ترجمہ سمجھا جاتا ہے۔

میجر جنرل برگس نے ہندوستان میں روئی کی بے اندازہ کھپت کا ذکر کیا اور کہا کہ وہ ملک "اتنی روئی پیدا کر سکتا ہے کہ پوری دُنیا کے لیے کافی ہو"۔ اس کے خیال میں ہندوستان سے بڑی مقدار میں روئی انگلستان کو برآمد کرنے میں دو باتیں مانع آتی تھیں۔ ایک زمین کا محصول اور دوسرے بار برداری کے لیے سڑکوں کی کمی[1]۔ جب اس سے اوّل الذکر کے متعلق سوال کیا گیا تو اس نے کہا "ہندوستان میں زمین کا محصول اور دوسرے بلا واسطہ محاصل انکم ٹیکس کے اصول پر قائم ہیں۔ آمدنی کا ایک حصہ، چاہے وہ جنس کی شکل میں ہو یا رقم کی، عام طور سے بادشاہ کا حق سمجھا جاتا ہے"۔ ہندوؤں کے زمانہ حکومت میں یہ حصہ ابتدا میں پیداوار کا $\frac{1}{10}$ مقرر کیا گیا تھا[2]

لارڈ ولیم بینٹنک نے 1833ء میں جو بندوبست شمالی ہندوستان میں شروع کیا تھا اس نے لوگوں کے قدیم اداروں کو برقرار رکھا۔ "اگر اس کو استمراری حیثیت دے دی جائے تو وہ حکومت اور کسان دونوں کے لیے انتہائی مفید ثابت ہو"۔ مدراس کی شرح تشخیص اس تخفیف کے باوجود بہت زیادہ ہے جو 1827ء میں سر ٹامس منرو نے کی تھی۔ سرکاری مطالبہ پوری طرح نہ ادا کیا جاتا ہے اور نہ کیا جا سکتا ہے۔ وصولیابی کا کام کلکٹر کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ "کلکٹر کی صوابدید پر چھوڑنے کے معنی یہ ہیں کہ وصولیابی ان چھوٹے موٹے افسروں کی صوابدید پر چھوڑ دی گئی ہے جو ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک بکھرے ہوئے ہیں"۔ معینہ مالگزاری کبھی ادا نہیں کی جاتی تھی۔ ہر سال چھوٹ دینا پڑتی تھی اور کسانوں کی حالت "انتہائی سقیم تھی"[3]

---

1. سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ، ص 121۔
2. سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ، ص 123۔
3. ایضاً، ص ص 126 اور 129۔

جنرل برگس نے زور دار الفاظ میں غلے کی بنیاد پر لگان کی تشخیص کی سفارش کی یعنی ہر سال کی پیداوار کی بنیاد پر لگان تشخیص کیا جائے۔ اس کا خیال تھا کہ اس بنیاد پر رعیت داری طریقہ قابلِ عمل بنایا جا سکتا ہے۔ اگر غلے کی شکل میں پیداوار کا نصف وصول کیا جائے تو یہ فاضل پیداوار یا خالص پیداوار سے زیادہ نہیں ہوگا" لیکن چونکہ محصول رقم میں وصول کیا جاتا ہے یہ اکثر حالات میں پوری پیداوار کی نمائندگی کرتا ہے[1]۔"

ٹامس ولیم (Thomas Williamson) نے جو بمبئی کا ریونیو کمشنر رہ چکا تھا، تشخیص مالگزاری کے برطانوی طریقے پر سخت اعتراض کیا۔ اس نے کہا کہ تمام لوگوں کی خوشحالی کا انحصار ایک شخص یعنی کلکٹر یا مالگزاری کے تشخیص کنندہ کی مرضی پر ہوا کرتا ہے۔ اُس نے کہا کہ "پورے ضلع کی خوشحالی کا دار ومدار حاکم ضلع کے ذاتی اوصاف پر ہوا کرتا ہے"، لیکن ضلع کے کلکٹر ہمیشہ باصلاحیت اور رحم دل نہیں ہوا کرتے ہیں۔ کچھ مدت پہلے تک گجرات میں شرح تشخیص بہت زیادہ تھی جس کی وجہ سے زمین کی ترقی میں رکاوٹیں پڑ گئی تھیں۔ بڑودہ میں مالگزاری کی بہت سی رقم بقایا تھی۔ چھوٹ کے سلسلے میں جانب داری دکھائی جاتی تھی اور طرح طرح کی بد دیانتیوں کا اثر چھوٹ کی رقم پر پڑتا تھا۔ عام طور سے لوگ انتہائی غریب اور مظلوم تھے۔ ان کے پاس زراعت کا سامان کم تھا اور کپاس کی پیداوار کم ہو گئی تھی۔ "بھاری شرح تشخیص کے یہ نتیجے بھی ہیں اور علامتیں بھی[2]۔"

جارج گبرن (George Gibberne) گجرات کا کلکٹر رہ چکا تھا۔ 1836ء میں وہ ہندوستان سے واپس چلا گیا تھا اور 1840ء میں جوڈیشل کمشنر کی حیثیت سے واپس آیا تھا۔ حالانکہ وہ چودہ سال بعد آیا تھا لیکن اس نے لوگوں کی حالت میں کسی قسم کی بہتری نہیں پائی۔ مجموعی اعتبار سے اُسے یہ محسوس ہوا کہ دولت مند لوگوں کی تعداد کم ہو گئی ہے۔ اور یہ کہا جا سکتا تھا کہ شرح تشخیص زیادہ ہے "میں جن اضلاع میں کلکٹر رہ چکا ہوں ان کے بارے میں یقین سے کہہ سکتا ہوں وہاں اتنی کم پیداوار ہوتی ہے کہ کسان اپنے لیے نہ کچھ بچا سکتا ہے نہ اس کی بنا پر کوئی رقم پس انداز کر سکتا ہے۔"

گواہ سے دریافت کیا گیا "کیا آپ کسی ایسے ضلع سے واقف ہیں جہاں بھاری شرح تشخیص کی وجہ سے کاشت میں کمی ہو گئی ہو؟" اس نے جواب دیا "یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ میں کسی ایسے ضلع سے واقف

---

[1] سیلکٹ کمیٹی کی رپورٹ، ص 136۔

[2] سیلکٹ کمیٹی کی رپورٹ، ص ص 154—157۔

ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ترقی کرنے کے بجائے وہ ایک جگہ پر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ چاہے اس میں کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو کسان کاشت کے علاوہ کچھ اور کام کر ہی نہیں سکتے ہیں۔ اپنا اور اپنے خاندان کا پیٹ بھرنے کے لیے انھیں کاشت کرنی پڑتی ہے۔ انھیں اپنے علاقے یا اپنے گانو سے اتنا لگاؤ ہوتا ہے کہ وہ کھیت سے ایک پیسہ نہ ملنے کی صورت میں بھی حتی الامکان لگان ادا کرتے رہتے ہیں۔ ترقی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے[۵۸]"

فرانسس کارنک براؤن (Faancis Carnac Br. wn) کے ماں باپ تو انگریز تھے لیکن وہ پیدا ہندوستان میں ہوا تھا اور اپنے باپ کی طرح ہندوستان کے سوتی کپڑے کی صنعت کا بڑا تجربہ رکھتا تھا۔ اس نے سلیکٹ کمیٹی کے سامنے ایک چرخا پیش کیا اور اسے بتایا کہ ہر چرخے اور دست کاروں کے دوسرے اوزاروں پر محصول لگایا جاتا ہے۔ اس محصول کی وجہ سے کپاس اوٹنے کی وہ چرخیاں ہندوستان میں مقبول نہ ہو پائیں جن میں آری کی طرح دندانے لگے ہوتے ہیں۔

فرانسس براؤن کپاس کی کاشت کے ہندوستانی طریقے کا بڑا مداح تھا۔ اس نے کہا کہ ہندوستانی کسانوں کو کپاس کی کاشت کا ہنر سکھانے کے لیے امریکہ کے کسانوں کو مدعو کرنا ایسا ہے جیسے برطانوی کسانوں کو گیہوں کی کاشت کا درس دینے کے لیے بیلجیم کے کسانوں کو بلانا۔ اس نے اپنی بات کے ثبوت میں ایک امریکی کسان مسٹر مرسر (Mr. Mercer) کا بیان پیش کیا جو کپاس کی کاشت کو ترقی دینے کے لیے ہندوستان بھیجا گیا تھا۔ 46-1845ء میں مسٹر مرسر نے کہا تھا (حکومت بمبئی کی گشتی چٹھی مورخہ 28/ جنوری 1847ء کی رو سے) "تجرباتی کھیتوں پر حکومت کا روپیہ فضول خرچ ہوگا۔ امریکہ کا طریقہ ہندوستان کے لیے مفید ثابت نہیں ہوگا۔ دیسی کسان چونکہ یہاں کی آب و ہوا اور زمین کی پیداواری صلاحیت سے زیادہ واقف ہیں اس لیے وہ یورپین کسانوں کے مقابلے میں کم لاگت سے بہتر پیداوار حاصل کر سکتے ہیں[۵۹]"

فرانسس براؤن نے اپنے بیان میں تشخیص مالگزاری کے سوال پر بڑا زور دیا۔ مدراس کے کسان کے پاس "سرکاری مطالبہ ادا کرنے کے بعد صرف اتنا بچتا ہے کہ وہ اپنی گزر بسر کر لے۔" مدراس میں لاکھوں کسان تھے اور ان کی مجموعی یافت صرف اتنی ہوتی تھی کہ وہ زندہ رہ سکیں یا غذائی

---

[۵۸] سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ، ص ص 200 — 203

[۵۹] سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ، ص 135

جنرل برگس نے زور دار الفاظ میں غلّے کی بُنیاد پر لگان کی تشخیص کی سفارش کی یعنی ہر سال کی پیداوار کی بُنیاد پر لگان تشخیص کیا جائے۔ اس کا خیال تھا کہ اس بُنیاد پر رعیت داری طریقہ قابلِ عمل بنایا جا سکتا ہے "اگر غلّے کی شکل میں پیداوار کا نصف وصول کیا جائے تو یہ فاضل پیداوار یا خالص پیداوار سے زیادہ نہیں ہوگا" لیکن چونکہ محصول رقم میں وصول کیا جاتا ہے یہ اکثر حالات میں پوری پیداوار کی نمائندگی کرتا ہے[1]"

تھامس ولیم (Thomas Williamson) نے جو بمبئی کا ریونیو کمشنر رہ چکا تھا، تشخیص مالگزاری کے برطانوی طریقے پر سخت اعتراض کیا۔ اس نے کہا کہ تمام لوگوں کی خوشحالی کا انحصار ایک شخص یعنی کلکٹر یا مالگزاری کے تشخیص کنندہ کی مرضی پر ہوا کرتا ہے۔ اُس نے کہا کہ "پورے ضلع کی خوشحالی کا دار و مدار حاکم ضلع کے ذاتی اوصاف پر ہوا کرتا ہے" لیکن ضلع کے کلکٹر ہمیشہ باصلاحیت اور رحم دل نہیں ہوا کرتے ہیں۔ کچھ مدّت پہلے تک گجرات میں شرح تشخیص بہت زیادہ تھی جس کی وجہ سے زمین کی ترقّی میں رُکاوٹیں پڑ گئی تھیں۔ بڑودہ میں مالگزاری کی بہت سی رقم بقایا تھی چھوٹ کے سلسلے میں جانب داری دکھائی جاتی تھی اور طرح طرح کی بد دیانتیوں کا اثر چھوٹ کی رقم پر پڑتا تھا۔ عام طور سے لوگ انتہائی غریب اور مظلوم تھے۔ ان کے پاس زراعت کا سامان کم تھا اور کپاس کی پیداوار کم ہو گئی تھی۔" بھاری شرح تشخیص کے یہ نتیجے بھی ہیں اور علامتیں بھی[2]"

جارج گبرن (George Gibberne) گجرات کا کلکٹر رہ چکا تھا۔ 1836ء میں وہ ہندوستان سے واپس چلا گیا تھا اور 1840ء میں جوڈیشل کمشنر کی حیثیت سے واپس آیا تھا۔ حالانکہ وہ چودہ سال بعد آیا تھا لیکن اس نے لوگوں کی حالت میں کسی قسم کی بہتری نہیں پائی۔ مجموعی اعتبار سے اُسے یہ محسوس ہوا "کہ دولت مند لوگوں کی تعداد کم ہو گئی ہے" اور یہ کہا جا سکتا تھا کہ شرح تشخیص زیادہ ہے "میں جن اضلاع میں کلکٹر رہ چکا ہوں ان کے بارے میں یقین سے کہہ سکتا ہوں وہاں اتنی کم پیداوار ہوتی ہے کہ کسان اپنے لیے نہ کچھ بچا سکتا ہے نہ اس کی بنا پر کوئی رقم پس انداز کر سکتا ہے۔"

گواہ سے دریافت کیا گیا "کیا آپ کسی ایسے ضلع سے واقف ہیں جہاں بھاری شرح تشخیص کی بنا پر کاشت میں کمی ہو گئی ہو؟" اس نے جواب دیا "یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ میں کسی ایسے ضلع سے واقف

---

[1] سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ، ص 136۔

[2] سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ، ص ص 154 — 157۔

ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ترقی کرنے کے بجائے وہ ایک جگہ پر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ چاہے اس میں کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو کسان کاشت کے علاوہ کچھ اور کام کر ہی نہیں سکتے ہیں۔ اپنا اور اپنے خاندان کا پیٹ بھرنے کے لیے انھیں کاشت کرنی پڑتی ہے۔ انھیں اپنے علاقے یا اپنے گاؤں سے اتنا لگاؤ ہوتا ہے کہ وہ کھیت سے ایک پیسہ نہ ملنے کی صورت میں بھی حتی الامکان لگان ادا کرتے رہتے ہیں۔ ترقی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے[1]۔"

فرانسس کارنک براؤن (Francis Carnac Brown) کے ماں باپ تو انگریز تھے لیکن وہ پیدا ہندوستان میں ہوا تھا اور اپنے باپ کی طرح ہندوستان کے سوتی کپڑے کی صنعت کا بڑا تجربہ رکھتا تھا۔ اس نے سلیکٹ کمیٹی کے سامنے ایک چرخا پیش کیا اور اسے بتایا کہ ہر چرخے اور دست کاروں کے دوسرے اوزاروں پر محصول لگایا جاتا ہے۔ اس محصول کی وجہ سے کپاس اوٹنے کی وہ چرخیاں ہندوستان میں مقبول نہ ہو پائیں جن میں آری کی طرح دندانے لگے ہوتے ہیں۔

فرانسس براؤن کپاس کی کاشت کے ہندوستانی طریقے کا بڑا مداح تھا۔ اس نے کہا کہ ہندوستانی کسانوں کو کپاس کی کاشت کا ہنر سکھانے کے لیے امریکہ کے کسانوں کو مدعو کرنا ایسا ہے جیسے برطانوی کسانوں کو گیہوں کی کاشت کا درس دینے کے لیے بیلجیم کے کسانوں کو بلانا۔ اس نے اپنی بات کے ثبوت میں ایک امریکی کسان مسٹر مرسر (Mr. Mercer) کا بیان پیش کیا جو کپاس کی کاشت کو ترقی دینے کے لیے ہندوستان بھیجا گیا تھا۔ 46-1845ء میں مسٹر مرسر نے کہا تھا (حکومت بمبئی کی گشتی چٹھی مورخہ 28/ جنوری 1847ء کی رو سے) "تجرباتی کھیتوں پر حکومت کا روپیہ فضول خرچ ہوگا۔ امریکہ کا طریقہ ہندوستان کے لیے مفید ثابت نہیں ہوگا۔ دیسی کسان چونکہ یہاں کی آب و ہوا اور زمین کی پیداواری صلاحیت سے زیادہ واقف ہیں اس لیے وہ یورپین کسانوں کے مقابلے میں کم لاگت سے بہتر پیداوار حاصل کر سکتے ہیں[2]۔"

فرانسس براؤن نے اپنے بیان میں تشخیص مالگزاری کے سوال پر بڑا زور دیا۔ مدراس کے کسان کے پاس "سرکاری مطالبہ ادا کرنے کے بعد صرف اتنا بچتا ہے کہ وہ اپنی گزر بسر کر لے۔" مدراس میں لاکھوں کسان تھے اور ان کی مجموعی یافت صرف اتنی ہوتی تھی کہ وہ زندہ رہ سکیں یا غذائی

---

[1] سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ، ص ص 200 — 203

[2] سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ، ص 135

ضروریات پوری کر سکیں۔ فطرت کا شدید ترین تقاضہ یعنی پیٹ کی آگ انہیں کاشت پر مجبور کرتی تھی۔ ادھر انھوں نے کہیں قدم رکھا ادھر سرکاری مطالبہ لازم آیا۔ سرکاری مطالبہ اتنا زیادہ ہوا کرتا تھا کہ وہ کبھی بھی پوری طرح وصول نہیں کیا جا سکتا تھا۔ گواہ نے کہا "مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوا جیسے ہر ہندوستانی کے پیدا ہونے کی غایت ہی یہ تھی کہ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو روپیہ ادا کرے[1]۔"

جب فرانسس براؤن پر حکومت کی مخالفت کا الزام لگایا گیا تو اس نے کہا "میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے اچھے کاموں کو پس پشت ڈالنا نہیں چاہتا لیکن ملک کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں ایک انگریز کی طرح اپنی آنکھوں، اپنی سمجھ بوجھ اور دیانت سے کام لینا چاہیے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کو اس معیار کے مطابق جانچنا چاہیے ..... میں صدق دل سے کہہ رہا ہوں کہ میں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت میں مالابار کے لوگوں کو بھوکوں مرتے اور اس علاقے کو غربت و افلاس کے گڑھے میں گرتے دیکھا ہے..... اس ملک کی حکومت نے وہاں کے لوگوں کو تباہ اور ذلیل کر دیا[2]۔"

امریکہ میں کپاس کی کاشت بڑھ رہی تھی اور ہندوستان میں برآمد کرنے کے قابل کپاس کی کاشت کم ہوتی جا رہی تھی۔ امریکہ اور ہندوستان کے نظام اراضی کا مقابلہ کرتے ہوئے گواہ نے کہا امریکہ میں زمین ایک ڈالر فی ایکڑ کی شرح سے فروخت کی جاتی ہے۔ کوئی شخص غیر مشروط جائیداد جب خرید لیتا ہے تو اسے پھر کچھ ادا کرنا نہیں پڑتا ہے۔ لیکن ہندوستان کے حالات اس کے برعکس ہیں وہاں کسی کو حق ملکیت حاصل نہیں ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی شخص نہ زیادہ روپیہ لگاتا ہے نہ اتنی محنت کرتا ہے جتنی اپنے فائدے کے لیے اسے کرنی چاہیے۔ امریکی کپاس کی پیداوار کے فطری عوامل ہندوستان میں نہیں پائے جاتے ہیں[3]۔"

فرانسس براؤن کی تعریف کرنی پڑتی ہے کہ اُس نے سب سے پہلے جنگلوں کی تباہی اور اس بنا پر بارش کی کمی کے خطرے کی نشان دہی کی۔ اس زمانے میں لوگ اس موضوع سے متعلق زیادہ واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ گواہ نے بیرن ہمبولٹ (Baron Humboldt) کے ایک بیان کا مندرجہ

---

[1] سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ، ص ص 241 اور 243۔

[2] سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ، ص ص 262 اور 263۔

[3] سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ، ص 269۔

ذیل حصہ پڑھ کر سُنایا" پہاڑوں کی چوٹیوں اور پہلوؤں پر اُگنے والے درختوں کو کاٹنے والے ہر ملک میں آئندہ نسلوں کے لیے دو بڑی دشواریاں پیدا کر دیا کرتے ہیں یعنی جلانے کی لکڑی اور پانی کی قلت"[ھ]

ہندوستان میں پائے جانے والے قدیم آب رسانی کے ذرائع کے متعلق فرانسس براؤن نے کہا "گنجام سے راس کماری تک پورے جنوبی ہندوستان میں تالابوں کے لیے عجیب و غریب آثار پائے جاتے ہیں جنھیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے"۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ان بیش بہا تالابوں کی مرمّت نہ کر کے انھیں برباد کر دیا۔ صرف تنجور میں مرمّت کی گئی جہاں آبپاشی کے بہت اچھے نتیجے دیکھنے میں آئے۔ میجر آرتھر کاٹن نے کمپنی کی حکومت کی توجّہ ذرائع آب رسانی کی اہمیت پر دلائی لیکن اس کی کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ فرانسس براؤن کا خیال تھا کہ آبپاشی کی سہولت مہیا کر کے ہندوستان کے بڑے علاقے کو اُتنا زرخیز بنایا جا سکتا تھا جتنی وادیٔ نیل مدّتوں پہلے بن چکی تھی۔[ھ]

اس میں شک نہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹر فرانسس براؤن کو فتنہ پرور و مفسد نہ سہی مگر ضرورت سے زیادہ پرجوش ضرور سمجھتے تھے لیکن پچاس سال گزرنے کے بعد اس کے بیان سے یہ بات بخوبی ظاہر ہوتی ہے کہ اس نکتہ رس انگریز نے، جو ہندوستان میں پیدا ہوا تھا اور یہیں پرورش پائی تھی، اُن بڑی بڑی خرابیوں کو محسوس کر لیا تھا جو ہندوستان کے حاکموں کی نظروں سے اوجھل تھیں۔ اس بات کی بھی توقع نہیں تھی کہ ہندوستان کے حکّام فرانسس براؤن جیسے شخص کے بیان کو تسلیم کر لیں گے۔ مسٹر براؤن کے مندرجہ بالا بیان کے تین دن بعد راس بنگلس (RossBangless) نے شہادت دینے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ حکومتِ ہند میں سکریٹری مال کے عہدے پر فائز رہ چکا تھا اور اس وقت پارلیمنٹ کا رکن اور ایسٹ انڈیا کمپنی کا ڈائریکٹر تھا۔ غالباً اس زمانے میں انگلستان کا کوئی دوسرا آدمی کمپنی کے نظام مالگزاری کی صفائی اس سے زیادہ زوردار الفاظ میں نہیں پیش کر سکتا تھا۔ اس کا بیان پڑھ کر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس کا یقین محکم تھا اور خیالات گنجلک نہیں تھے۔ اس کے باوجود بنگلس نے زمین کے محصول کے اصول کی صفائی پیش کی حالانکہ اس کی عملی خرابیاں اس سے زیادہ کون جانتا تھا:

اس نے کہا کہ بنگال میں، جہاں بندوبست استمراری کیا جا چکا ہے، زمیندار اوسطاً اپنی زمینداریوں

[ھ] سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ، ص 270۔

سے مجموعی لگان کا نصف بطور مالگزاری حکومت کو ادا کرتے ہیں۔ جن علاقوں میں بندوبست استمراری نہیں ہوتا ہے وہاں اکثر حکومت کا مطالبہ مجموعی لگان کا 75 فیصدی ہوتا ہے۔ مدراس میں کسان زمین کا مالک ہوتا ہے اور براہِ راست حکومت کو مالگزاری ادا کرتا ہے لیکن رعیت داری طریقے کی بڑی خرابی یہ ہے کہ اس میں ہمیشہ مداخلت کی جاتی ہے اور ہر سال شرح مالگزاری کا تعین کیا جاتا ہے۔ "اس کی وجہ سے رشوت، بالجبر وصولی اور مظالم کے لیے میدان ہموار ہو جاتا ہے[1]۔"

دوسرے دن جب راس منگلس شہادت کے لیے پیش ہوا تو سلیکٹ کمیٹی کے صدر جان برائٹ اور ایک رکن جارج ٹامسن سے اس کا کچھ بحث و مباحثہ ہونے لگا۔ یہ گفتگو دلچسپی سے خالی نہیں۔

جارج ٹامسن — اگر ہم فرض کریں کہ انگلستان یا کوئی دوسرا ملک پورے ہندوستان پر حکومت کرنے لگے اور پورے ہندوستان کی زمین کی ملکیت کا دعوی دار ہو تو کیا آپ اخلاقی طور سے اس کو حق بجانب تسلیم کرنے کو تیار ہیں؟

راس منگلس — میں سمجھتا ہوں کہ اس سوال کا تعلق مالگزاری سے نہیں ہے۔ میں نے کبھی یہ فرض کیا نہ کبھی کہا کہ حکومت ہندوستان میں زمین کی مالک ہے۔ میرا خیال یہ نہیں ہے کہ ہندوستان میں حکومت زمین کی مالک ہے۔

مسٹر ٹامسن — اگر حکومت پورے ملک میں لگان کے 75 فیصدی کا مطالبہ کرے تو کیا اس کو عملاً مالک نہیں سمجھا جائے گا؟

راس منگلس — زمانہ قدیم سے لگان کا ایک حصہ ریاست کا حق سمجھا جاتا ہے تاکہ سرکاری کاروبار چلایا جا سکے۔

جان برائٹ — کلکٹروں کے ذریعہ لگان وصول کرنے کا جہاں تک تعلق ہے کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ جس زمین کی پیداوار مثلاً 100: وہاں کوئی معینہ تناسب ہے جس کی رو سے کلکٹر سرکاری مطالبہ مقرر کرنے کا اختیار رکھتا ہے؟

راس منگلس — میں کمیٹی کو بتا چکا ہوں کہ ادھر کچھ دن سے پیداوار کو بندوبست کی بنیاد بنانا بہت خطرناک سمجھا جانے لگا ہے۔ کلکٹروں سے ہر موقع پر کہا گیا ہے کہ وہ لگان معلوم کرنے کی کوشش کریں اور اس کو بندوبست کی بنیاد بنائیں۔

---

[1] سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ، ص 276۔

جان برائٹ ـــــ اگر تشخیص سال بہ سال کی جائے جیسا کہ ہندوستان میں کمپنی کی حکومت کے ایک بڑے حصّے میں کیا جا رہا ہے تو ایسی صورت میں شرح تشخیص میں اس قسم کے اضافہ (یعنی اس صورت میں جب کسان زمین کو ترقی دیں) کے یہ معنی سمجھے جائیں گے کہ کسان نے کاشت کو ترقی دی یا اس کا مفہوم یہ سمجھا جائے گا کہ زمین کو ترقی دینے کے سلسلے میں کسان کی ہمّت شکنی کی گئی ہے۔

راس منگلس ـــــ ظاہر ہے کہ اس سے کسان کی ہمّت شکنی ہوگی۔ سالانہ بندوبستوں کا میں بھی اُتنا ہی مخالف ہوں جتنے عزّت مآب صدر رہیں۔

مندرجہ بالا اقتباسات بڑے اہم ہیں۔ وہ اُن اہم اصولوں پر روشنی ڈالتے ہیں جو 1848 تک تسلیم کیے جاتے تھے۔

۱۔ حکومت زمین پر حق ملکیت کی دعوے دار نہیں تھی۔ زمیندار اور کسان زمین کے مالک سمجھے جاتے تھے۔

2۔ حکومت مالگزاری کے طور پر مناسب لگان کے ایک حصّے کا مطالبہ کرتی تھی۔

3۔ وہ حصّہ معینہ نہیں تھا۔ جہاں بندوبست استمراری ہو چکا تھا وہاں وہ حصّہ 50 فیصدی تھا اور جہاں بندوبست استمراری نہیں ہوا تھا وہاں 75 فیصدی کے لگ بھگ تھا۔[1]

بقیہ بیان میں راس منگلس نے جان اسٹورٹ مل سے اتفاق کیا کہ مالگزاری چونکہ لگان کے ایک حصّے پر مشتمل ہوتی ہے اس لیے زمین کی پیداوار کی لاگت میں شامل نہیں ہے اور کپاس کی کاشت پر اس کا کوئی خراب اثر نہیں پڑتا ہے۔

جان سُلیون (John Sullivan) نے بھی، جو حکومت مدراس کا ایک رکن اور بورڈ آف ریونیو کا صدر رہ چکا تھا، ہندوستان کی مالگزاری کے طریقے کی حمایت کی لیکن ہندوستان سے سال بہ سال ہونے والے دولت کے نکاس کی مذمت کی۔ "جہاں تک اُن شکایتوں کا تعلق ہے جو ہندوستان کے لوگوں کو موجودہ مالی طریقے سے ہیں میرے خیال میں اُن شکایتوں کا تعلق اس رقم سے نہیں ہے جو وصول کی جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ اس رقم کو استعمال کرنے کے طریقے کے شاکی ہیں جب تک حکومت

---

[1] بعد میں کم از کم نظری طور سے یہ غیر یقینی صورت ختم کر دی گئی۔ 1855ء کے ضوابط سہارنپور نے اور 1864ء کے سکریٹری آف اسٹیٹ کے مراسلے نے جہاں عارضی بندوبست ہوا تھا وہاں بھی زمینداری اور رعیت واری میں سرکاری مطالبہ لگان کا تقریباً 50 فیصدی مقرر کر دیا تھا۔

اُن کے ہاتھ میں رہی وہ روپیہ جو ملک سے حاصل کیا جاتا تھا وہیں خرچ بھی ہوتا تھا لیکن ہماری حکومت میں آمدنی کا ایک بڑا حصّہ ہر سال ملک کے باہر چلا جاتا ہے جس کا انھیں کوئی معاوضہ نہیں ملتا ہے۔ دولت کا یہ نکاس گزشتہ ساٹھ یا ستّر سال سے ہو رہا ہے اور کمی کے بجائے اس میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے... ہماری حکومت اسپنج کا کام کر رہی ہے۔ وہ گنگا کے ساحل کی تمام اچھّی چیزیں جذب کر لیتی ہے اور ٹیمس کے ساحل پر ان کو نچوڑ دیتی ہے۔ اُن محاصل کے نفاذ میں اُن کی (ہندوستان کے لوگوں کی) کوئی آواز نہیں ہوتی جو انھیں ادا کرنے ہوتے ہیں۔ اُن قوانین کے بنانے میں بھی ان کی کوئی آواز نہیں ہوتی جن کی انھیں پابندی کرنی پڑتی ہے۔ اپنے ملک کے نظم و نسق میں ان کا کوئی حصّہ نہیں ہے۔ جن بُنیادوں پر اُن کے جائز حقوق تسلیم کرنے سے اِنکار کیا جاتا ہے وہ توہین آمیز ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ذہنی اور اخلاقی طور سے فرائض کی ادائیگی کے اہل نہیں[1]۔"

کچھ اور گواہوں کے بیان بھی قلمبند کیے گئے تھے لیکن اُن کی کوئی بڑی اہمیت نہیں تھی۔ سلیکٹ کمیٹی کے سامنے پیش ہونے والی شہادت کی نوعیت کے متعلّق کافی کہا جا چُکا ہے۔ اس شہادت کی بُنیاد پر جان برائٹ اور اس کے ساتھیوں نے ۱۷ جولائی 1848ء کو اپنی رپورٹ پیش کر دی۔

اس رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ "پچھلے ساٹھ سال میں یعنی 1788ء سے کورٹ آف ڈائرکیٹرز کپاس کی کاشت اور برآمد میں اضافہ کرنے کے لیے مختلف تجربے کرتا رہا ہے۔ اس نے کپاس اوٹنے کی امریکی چرخی کو ہندوستان میں رواج دیا، امریکہ میں کپاس کی کاشت کرنے والوں کو وہاں بھیجا اور کپاس کو ترقّی دینے کے لیے تجرباتی کھیت قایم کیے۔ ڈائرکیٹروں کا اب بھی خیال ہے کہ کپاس کی کاشت کی دشواریوں پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

ان تجربوں کے نتائج نے سلیکٹ کمیٹی کو مطمئن کر دیا ہے کہ ہندوستان زیادہ سے زیادہ مقدار میں بہتر روئی انگلستان کو مہیا کر سکتا ہے۔ لیکن کمیٹی کا خیال ہے کہ جو طریقے اختیار کیے گئے ہیں ان کی بنا پر خاطر خواہ نتائج کا حاصل ہونا مشکوک و مشتبہ ہے۔ ہندوستان کے صنعت کاروں کے لیے امریکہ کی لمبے ریشے کی روئی کی بہ نسبت ہندوستانی روئی زیادہ موزوں ہے اور باہر کی مانگ چونکہ گھٹتی بڑھتی رہتی ہے اس لیے ایک بیرونی اور دور دراز منڈی کی مانگ پوری کرنے

---

[1] سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ، ص 402۔

کے لیے نئے قسم کی کپاس کی کاشت شروع کرنے کے لیے کافی محرکات نہیں پائے جاتے ہیں[1]۔

سلیکٹ کمیٹی نے ہندوستان کے کسانوں کی خستہ حالی پر بھی توجہ دی۔ مدراس اور بمبئی کے زیادہ تر کسانوں کے پاس "نہ سرمایہ ہے اور نہ وہ ذرائع ہیں جو سرمائے کے بغیر حاصل نہیں کیے جا سکتے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ اس قسم کے کسان ہیں جن کی حالت انتہائی سقیم ہوا کرتی ہے"۔

اس بات پر اختلاف رائے تھا کہ کسانوں کے ان خراب حالات کی ذمہ داری کس حد تک مالگزاری کے سرکاری مطالبے پر ہے۔ ایک طرف یہ اصول پیش کیا جاتا تھا کہ سرکاری مطالبہ اگر مناسب لگان کے ایک حصے پر مشتمل ہے تو اس کا کوئی خراب اثر کاشت پر نہیں پڑنا چاہیے۔ دوسری طرف اس امر کی شہادت پیش ہو چکی تھی کہ کثیر آبادی رکھنے والے اضلاع، جن کا انتظام ایک افسر کے سپرد ہوتا ہے عملاً بدنظمی و بدانتظامی کا شکار رہا کرتے ہیں۔ غیر ضروری اور احمقانہ جوش، عدم صلاحیت اور غلطیوں کی بنا پر پورے پورے ضلعوں کی خوشحالی متاثر ہوتی ہے اور یہ کہ "پورا انتظام کسانوں کے جذبہ ترقی کی تباہی کا باعث نہ سہی مگر اس نے مایوسی کا احساس ضرور پیدا کر دیا ہے"۔

سفارش کی گئی کہ ہندوستان میں بندوبست کی بنیاد کے دو اصول ہونے چاہئیں حکومت کے مطالبے میں اعتدال اور لگان کی رقم کا یقینی تعین۔

آخر میں سلیکٹ کمیٹی نے ہندوستان میں سڑکوں کی افسوسناک حد تک کمی پر تاسف کا اظہار کیا۔ اراکین کمیٹی نے راس منگلس کی شہادت کے حوالے سے، جو خود ایسٹ انڈیا کمپنی کا ڈائرکٹر تھا، دکھایا کہ نقل و حمل کے داخلی ذرائع کو بہتر بنانے کے لیے کتنا کم کام کیا گیا ہے۔ جو گواہ پیش ہوئے تھے انھوں نے اپنے بیانوں میں اس امر کی سفارش بھی کی تھی کہ ہندوستان کے درآمد و برآمد کے مراکز سے اندرونی منڈیوں تک ریلیں تعمیر کی جائیں۔

---

[1] شکر کی طرح ہندوستان میں کپاس کی کاشت بھی مقامی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کی جاتی تھی۔ ہندوستان کے لوگ ان چیزوں کو پیدا کرتے وقت لنکاشائر کے کارخانوں کی ضرورت کے بجائے بجا طور سے اپنی قومی ضرورت پر نظر رکھتے تھے۔

باب 9

چائے، نمک اور افیم

جان برائٹ نے اپنی رپورٹ 1848ء میں پیش کر دی تھی۔ پانچ سال بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے چارٹر کی تجدید ہوئی۔ حسبِ معمول پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کی سلیکٹ کمیٹیوں نے کمپنی کے نظم و نسق کے متعلق 1852ء اور 1853ء میں پوری پوری تحقیقات کی۔ کمپنی کے عام انتظامات کا جائزہ لیتے وقت ہم اس تحقیقات کا بھی ذکر کریں گے۔ لیکن اس تحقیقات کے دوران چائے، نمک اور افیم کی پیداوار کے متعلق جو دلچسپ واقعات سامنے آئے تھے انھیں موجودہ باب میں شامل ہونا چاہیے۔

چائے

چائے کی کاشت کے سلسلے میں سب سے زیادہ اہم شہادت سہارنپور کے نباتاتی باغ کے سابق نگراں ڈاکٹر رائل کی تھی۔ روئی کی کمیٹی کے سامنے اس کے بیان کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اُس نے 1827ء اور 1834ء میں حکومتِ ہند سے چائے کی کاشت کی سفارش کی تھی۔ حکومتِ ہند نے 1835ء میں چائے کی کاشت شروع کی اور 1842ء میں پہلی دفعہ چائے تیار کی گئی۔ جس وقت اس گواہ کا بیان ہوا تھا (1853ء) اس وقت ہمالیہ کے شمال و مغربی حصوں میں اور آسام میں بھی قابلِ لحاظ پیمانے پر چائے کی کاشت ہونے لگی تھی۔

حالانکہ کمایوں میں ابھی تک کسی سال 10,000 پونڈ سے زیادہ چائے پیدا نہیں ہوتی تھی پھر بھی کاشت کے رقبے میں اضافہ ہو رہا تھا۔ کم سے وادیٔ کانگڑا بلکہ کشمیر تک پھیلے ہوئے پہاڑ، چائے کی کاشت کے لیے موزوں تھے جن میں نیپال اور کمایوں کے پہاڑی علاقے بھی شامل تھے۔ ایسٹ

انڈیا کمپنی کے ملازم ڈاکٹر جیمسن (Dr. son) نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا "چائے کا پودا جس طرح وادیٔ کانگڑا میں نشوونما پاتا ہے کہیں اور نہیں پا سکتا۔ چائے ایسی شے نہیں ہے ہندوستانیوں کا کوئی طبقہ عام طور پر استعمال کرتا ہو"[1]

حکومتِ ہند نے آسام میں چائے کی کاشت کے تمام حصے ایک کمپنی کو منتقل کر دیے تھے اور ایک اور کمپنی کمایوں کے چائے کے باغات حکومت سے خریدنے کی خواہش مند تھی[2]۔

نمک

برطانوی ہندوستان میں کمپنی کی آمدنی کا ایک اہم ذریعہ نمک اور افیم کی اجارہ داری تھی۔ کمپنی کے ملازم بنگال میں نمک تیار کیا کرتے تھے۔ اس نمک کو منڈی میں لانے سے پہلے اس کی لاگت میں پانچ شلنگ فی من محصول کا اضافہ کر دیا جاتا تھا۔ پنجاب کی کانوں سے نکلنے والے نمک پر چار شلنگ فی من محصول لگایا جاتا تھا۔ دیسی ریاستوں میں بننے والے نمک پر برطانوی علاقے میں داخل ہونے سے پہلے چار یا پانچ شلنگ چنگی لگائی جاتی تھی۔

مدراس کے ساحلی علاقے میں سمندر کے پانی کو خشک کر کے نمک بنایا جاتا تھا اس لیے وہ بنگال کے نمک سے سستا ہوتا تھا اور کمپنی اس کو دو شلنگ فی من فروخت کر کے بہت منافع کمایا کرتی تھی۔ بمبئی میں حکومت نمک سازوں کو ایک شلنگ چھ پنس فی من ڈیوٹی ادا کرنے کے بعد نمک کے قطعوں سے نمک اُٹھانے کی اجازت دیتی تھی۔ انگلستان یا دوسرے ممالک سے ہندوستان میں درآمد ہونے والے نمک پر چار یا پانچ شلنگ فی من ڈیوٹی لگائی جاتی تھی تاکہ درآمد کرنے والے اُسے اس ہندوستانی نمک سے کم قیمت پر فروخت نہ کر سکیں جس پر محصول ادا کیا جاتا تھا[3]۔

1793ء میں کمپنی کو نمک سازی سے 8,00,000 پونڈ کا خالص منافع ہوا تھا جو 1844ء میں بڑھ کے تقریباً 13,00,000 پونڈ ہو گیا تھا۔ خیال ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ان باون برسوں میں جو نمک کی مجموعی مقدار تیار کی وہ تقریباً 2 سو ملین من سے کچھ زیادہ تھی اور کمپنی کو اس سے

---

[1] ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کی چوتھی رپورٹ، 1853ء۔ ڈاکٹر رائل کا بیان۔

[2] ہاؤس آف لارڈز کی سلیکٹ کمیٹی۔ ایڈورڈ تھارنٹن کا بیان۔

[3] ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کی چوتھی رپورٹ، 1853ء، پری ڈے کا بیان۔

ساٹھ ملین پونڈ کا مجموعی منافع ہوا تھا۔[1]

مندرجہ بالا واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس نمک میں جو وہ خود بنایا کرتی تھی اور انگلستان سے درآمد ہونے والے نمک میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ہاؤس آف کامنز نے 1836ء میں سلیکٹ کمیٹی کی ایک تجویز کے ذریعے اس پالیسی کا نفاذ کر دیا تھا اور اس تجویز پر عمل کرنا خود کمپنی کا بھی مقصد تھا۔ لیکن اس اصول پر عمل کرنے میں کمپنی نے شدت اختیار کی اور برطانوی صنعت کاروں کو بیجا فائدے پہنچائے۔ اس نے "لاگت میں" سرکاری آمدنی کے تحفظ کے اخراجات بھی شامل کر دیے اور اس طرح بنگال کے نمک کی قیمت فروخت میں اضافہ کر دیا۔ برطانوی صنعت کاروں نے اس غلطی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور برطانوی نمک کی فروخت میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہونے لگا۔ دو گواہوں[2] نے جو ہندوستان میں برطانوی نمک کی فروخت میں دلچسپی رکھتے تھے، سلیکٹ کمیٹی کے سامنے جو اعداد و شمار پیش کیے وہ ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں۔

کلکتہ میں درآمد ہونے والا برطانوی نمک، من میں (82 پونڈ)

1845-46ء	1846-47ء	1847-48ء	1848-49ء	1849-50ء	1850-51ء	1851-52ء
5,08,616	3,52,835	7,52,998	4,59,803	6,94,447	10,12,698	18,50,762

ہندوستان میں درآمد ہونے والا برطانوی نمک، ٹن میں

1847ء	1848ء	1949ء	1860ء	1851ء
25,754	15,507	27,640	36,341	61,711

برطانوی نمک کی بڑھتی ہوئی درآمد نے بنگال کے بورڈ آف ریونیو کو خائف کر دیا۔ اس نے نہایت قابلیت کے ساتھ لکھے ہوئے ایک طویل مراسلے میں[3] "لاگت" میں ایسے اخراجات شامل کر کے جو لاگت کی تعریف میں نہیں آتے تھے، بنگال کے نمک کی قیمت میں اضافے کو غیر منصفانہ فعل قرار دیا۔

لارڈ ڈلہوزی نے، جو اس وقت ہندوستان کا گورنر جنرل تھا، اس اہم موضوع پر نہایت

---

[1] ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کی چوتھی رپورٹ، 1853ء ایلون کا بیان

[2] مراسلہ نمبر 685 مورخہ 29 جون 1852ء۔

[3] رودلو مورخہ 11 ستمبر 1852ء۔

فاضلانہ روداد لکھی جس کے اقتباسات ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔

"میری حقیر رائے میں بورڈ آف ریونیو کے نمائندوں نے ثابت کر دیا ہے کہ موجودہ طریقے میں نمک درآمد کرنے والے کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہوتی ہے لیکن مقامی نمک سازوں کے ساتھ روز افزوں ناانصافی ہو رہی ہے۔"

"اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ باہر کے نمک نے اتنی کامیابی کے ساتھ مقامی نمک سے مقابلہ کرنا شروع کر دیا ہے کہ آخرالذکر منڈیوں سے بیدخل ہو رہا ہے۔ اگر مقامی نمک کی فروخت ہندوستانی تاجروں کے ہاتھ میں ہوتی اور اس کی قیمت فروخت وہ مقرر کرتے تو وہ بیرونی نمک کا مقابلہ کر سکتا تھا۔"

"میرے خیال میں حکومت کے لیے یہ بات کم شرمناک ہوگی کہ گزشتہ غلطی کے الزام سے اپنے دامن کو بچانے کے لیے ناانصافی کے تدارک میں پس وپیش سے کام لینے کے بجائے اپنی غلطی تسلیم کرے۔"

"ہوسکتا ہے کہ باہر کا نمک، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ دوسری تجارتی اشیاء کے مقابلے میں اس کی درآمد زیادہ مفید ہے، نئی قیمتوں کے باوجود مقامی نمک کو منڈیوں سے نکال باہر کرے۔ اگر اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنا پڑا تو حکومت اس کی روشنی میں اس سوال پر غور کرے گی۔ حکومت کا موجودہ فرض سب پر عیاں ہے۔"

"عزت مآب کورٹ آف ڈائریکٹرز کے علم میں لائے بغیر اتنی بڑی تبدیلی کرنا مناسب نہیں۔ آئندہ ڈاک سے ڈائریکٹرز کو اطلاع دی جائے اور چونکہ یہ معاملہ فوری توجہ کا متقاضی ہے اس لیے ان سے جلد جواب دینے کی درخواست کی جائے۔"

چنانچہ کورٹ آف ڈائریکٹرز کو مراسلہ[1] بھیجا گیا جس میں ہندوستانی نمک کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کی وضاحت کی گئی تھی اور اس کے تدارک کی اجازت طلب کی گئی تھی۔

ایک طرف تو ہندوستانی حکام کوشش کر رہے تھے کہ ہندوستانی نمک کی "لاگت" کا حساب اس طرح لگایا جائے کہ اُسے باہر سے آنے والے نمک کے ساتھ مقابلہ کرنے کا مناسب موقع مل سکے دوسری طرف برطانوی نمک درآمد کرنے والے بھی ہاتھ پہ ہاتھ رکھے نہیں بیٹھے ہوئے تھے نمک کے برطانوی صنعت کاروں نے، جن کا کہنا تھا کہ ہم ہندوستان کے لوگوں کو بہتر نمک مہیا کرنا چاہتے ہیں، ہاؤس آف کامنز میں درخواست گزاری کہ ہندوستان میں باہر سے آنے والے نمک پر کوئی محصول نہ لگایا

---

[1] حکومتِ ہند کا مراسلہ، مورخہ ۱۷/ستمبر 1852ء۔

جائے۔ اُن کا خیال تھا کہ اس طرح ہندوستان کے ناقص نمک سے منڈیاں پاک ہو جائیں گی اور ہندوستان کے لوگ برطانوی نمک استعمال کرنے لگیں گے۔

مانچسٹر کے تاجروں، صنعت کاروں، خُردہ فروشوں اور دوسرے لوگوں نے تجویز کیا کہ "کم قیمت پر اچھے قسم کے نمک کی مسلسل رسد ہندوستان کی کثیر آبادی کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔" ہندوستان میں درآمد ہونے والے نمک پر 7 پونڈ فی ٹن محصول لگایا جاتا ہے جو اس کی قیمت کے تناسب سے 2,000 فیصدی سے کم نہیں اور "ہندوستان کے لوگوں کی کمر توڑ رہا ہے۔" آخر میں درخواست کی گئی تھی کہ انگلستان سے ہندوستان میں درآمد ہونے والے نمک کو یا تو محصول سے مستثنیٰ قرار دیا جائے یا اس پر برائے نام محصول عائد کیا جائے۔

چیسٹر کی کاؤنٹی میں واقع نارتھ وِچ کے لوگوں کا کہنا تھا کہ چیشائر کے نمک سازی کے علاقوں میں ہر سال 60,00,000 ٹن نمک بنایا جاتا ہے جس کی بنا پر 5,000 انگریز روزگار سے لگے ہوتے ہیں۔ اگر برطانوی نمک پر بھی اُتنا ہی محصول ادا کرنا پڑے جتنا دوسرے برطانوی مصنوعات پر ادا کرنا ہوتا ہے تو چیشائر سے ہندوستان کو ایسا نمک بھیجا جا سکتا ہے جو "پاک وصاف ہو، کافی مقدار میں مہیا کیا جا سکے اور سستا ہو۔"

ڈرائٹ وِچ (Droitwich) کے باشندوں نے شکایت کی کہ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی نمک سازی کر کے "ولیم چہارم کے ایکٹ نمبر 3 اور 4 کی دفعہ 85 کی خلاف ورزی کر رہی ہے جس کی رو سے کمپنی کے لیے لازمی قرار دیا گیا تھا کہ وہ تجارتی کاروبار ترک کر دے۔" انھوں نے مزید کہا کہ 7 پونڈ فی ٹن محصول کی وجہ سے صرف 50,000 ٹن سالانہ نمک ہندوستان جا سکتا ہے جبکہ ہندوستان میں 8,00,000 ٹن سالانہ کی کھپت ہونی چاہیے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا فرض ہے کہ وہ اپنی تمام تر آمدنی خود ہندوستان سے حاصل کرے اور "برطانوی تاجروں کو ایک ایسی منڈی سے فائدہ اُٹھانے سے باز نہ رکھے جہاں قدم جمانے کا انھیں قدرتی اور دوسروں سے زیادہ حق حاصل ہے۔"

ڈرسیسٹر کی کاؤنٹی میں واقع وائچ، جو ڈرائٹ وِچ بھی کہلاتا تھا، کے میئر، اراکین بلدیہ اور پارلیمنٹ کے ممبروں نے بھی شکایت کی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے 7 پونڈ فی ٹن کا بھاری محصول لگا کر "برطانوی نمک کو ہندوستانی منڈیوں میں آنے سے روک دیا ہے۔"

گلوسیسٹر (Gloucester) کے چیمبر آف کامرس نے بھی شکایتاً کہا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نمک

بناکر "ولیم چہارم کے ایکٹ نمبر 3 اور 4 کی دفعہ 85 کی خلاف ورزی کر رہی ہے" اور اس امر کے خلاف احتجاج کیا کہ برطانوی تاجروں کو "ان منڈیوں سے فائدہ اُٹھانے کا موقع نہیں دیا جارہا ہے جن پر اُنھیں قدرتی اور دوسروں سے زیادہ حق حاصل ہے"۔

سنیٹ ہیلنس کے تاجروں، صنعت کاروں اور خُردہ فروشوں نے کہا کہ کم قیمت پر بہتر نمک اگر زیادہ مقدار میں مہیا کیا جاسکے تو وہ "ہندوستان کے لوگوں کی بہبود کے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہوگا"۔ ہندوستانی نمک ناقص ہونے کے ساتھ مہنگا بھی ہے اور "انگلستان کا بنا ہوا نمک اگر محصول سے مستثنیٰ قرار دیا جائے یا بیجک کی رو سے اس پر بھی اس شرح سے محصول لگایا جائے جس شرح سے دوسری اشیاء پر لگایا جاتا ہے اور درآمد ہونے کے بعد اس پر کوئی اکسائز ڈیوٹی نہ لگائی جائے تو انگلستان آسانی سے ہندوستان کو ضرورت کے مطابق نمک مہیا کرسکتا ہے"۔

چیسٹر کی کاؤنٹی میں واقع ونس فورڈ کے باشندوں نے بھی ایک درخواست بھیجی جس کا مضمون لفظاً لفظاً وہی تھا جو نارتھ وچ کے مندرجہ بالا درخواست کا تھا۔

ڈرسیسٹر کے چیمبر آف کامرس نے شکایت کی کہ برطانوی ہند کی بندرگاہیں چونکہ برطانوی نمک کے لیے قریب قریب بند کردی گئی ہیں اس لیے ڈرسیسٹر کے کبھی نہ ختم ہونے والے چشموں کے نمک کی برآمد میں بڑی کمی ہوگئی ہے"۔ روشن خیالی اور انسان دوستی پر مبنی پالیسی کا تقاضہ ہونا چاہیے کہ صرف آمدنی کے لیے مناسب محصول ادا کرنے کے بعد بلاخلل درآمدات کی ہمت افزائی کی جائے۔ لیکن حکومتِ ہند ادنیٰ قسم کے نمک کی اجارہ داری کا تحفظ کرنے کی خاطر بندشیں عائد کر رہی ہے۔ سائلوں کو یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ حکومتِ ہند یہ کاروبار کرکے ولیم چہارم کے ایکٹ نمبر 3 اور 4 کی دفعہ 85 کی خلاف ورزی کر رہی ہے"۔

ہندوستان میں نمک کا محصول لگنے کی وجہ سے جو دشواریاں پیدا ہو رہی تھیں ان کے متعلق برسٹل کے چیمبر آف کامرس نے زوردار الفاظ میں بڑی مدلل درخواست پیش کی "یہاں (انگلستان میں) صارف کو 30 شلنگ فی ٹن نمک کی قیمت ادا کرنی ہوتی ہے لیکن ہندوستان میں نمک کی قیمت فروخت 21 پونڈ فی ٹن ہے۔ انگلستان میں کچھ سال پہلے نمک کے محصول کو منسوخ کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی اور وہ ختم کردیا گیا۔ سائلوں کا خیال ہے ہندوستان میں رہنے والی ملکہ معظّم کی لاکھوں کروڑوں رعایا کو نمک کے محصول سے مستثنیٰ ہونے کا زیادہ حق حاصل ہے، جو افلاس کی انتہائی حدوں تک پہنچ چکے ہیں اور جنھیں زندہ رہنے اور وہاں کی آب و ہوا میں بیماریوں سے بچنے کے لیے نمک کی ضرورت ہے"۔

لیور پول کے تاجروں، جہازوں کے مالکوں اور خردہ فروشوں کا کہنا تھا کہ "حکومت کا یہ مقدس اور سنجیدہ فرض ہے کہ وہ اس ملک (ہندوستان) کے لوگوں کے ساتھ اسی شفقت اور مہربانی کے ساتھ پیش آئے جس کا مظاہرہ اس ملک کے لوگوں کے ساتھ کیا جاتا ہے اور کیا جانا چاہیے۔" ان کا خیال تھا کہ "برطانوی ہند میں نمک کے محصول کی منسوخی سے نہ صرف اس ملک کے لوگوں کو بہت فائدہ ہوگا، جس کے انصاف اور انسان نوازی کی رو سے وہ مستحق ہیں، بلکہ سوتی کپڑے اور دوسرے برطانوی مصنوعات کی مانگ میں اضافہ کر کے یہ اس ملک کے تجارتی مفادات کی توانائی و ترقی کا باعث بھی ہوگی۔[1]"

مندرجہ بالا اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ نمک کے برطانوی تاجروں اور صنعت کاروں نے اس موقع پر اپنے مفاد میں ایک منظم تحریک شروع کر دی تھی۔ اس کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ وہ ایمانداری کے ساتھ سمجھتے تھے کہ اس معاملے میں ان کے اور ہندوستان کے محصول دہندگان کے مفادات یکساں ہیں۔ ہندوستان کے حق میں اچھا ہوتا اگر ان کی بات سُنی جاتی اور مقامی نمک اور باہر سے آنے والے نمک دونوں کو محصول سے مستثنیٰ قرار دے دیا جاتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کے نتائج برطانوی صنعت کاروں کی توقع کے خلاف ہوتے۔

ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کے سامنے اس امر کی کافی شہادت پیش ہوئی تھی کہ ہندوستان میں نمک کا محصول کس طرح لگایا جاتا ہے۔ مدراس نیٹو ایسوسی ایشن کی طرف سے پیش ہونے والی ایک عرضداشت میں جس پر ٹی۔ راما سوامی اور دوسروں کے دستخط تھے، سائلوں نے مدراس کے حالات کے متعلق کہا تھا۔

"یہ کہ 1806ء میں حکومت نے محکمہ نمک کے انتظام اور نگرانی کے لیے ایک ادارہ قایم کیا جس کا پہلا نتیجہ یہ ہوا کہ نمک کی قیمت دوگنی ہو گئی اور 70 روپیہ (7 پونڈ) فی گارس مقرر کی گئی۔ تین سال کی اوسط کھپت 91,685 گارس تھی۔ تین سال بعد 1809ء میں اس کی قیمت 70 روپے سے بڑھا کر 105 روپیہ (10 پونڈ 10 شلنگ) فی گارس کر دی گئی جو حکومت کی اجارہ داری سے پہلے کی قیمت کی تگنی تھی۔ چونکہ زیادہ قیمت کا کھپت پر اثر پڑنا لازمی تھا اس لیے 1920ء میں نمک کی قیمت گھٹا کر پھر 70 روپیہ (7 پونڈ) فی گارس کر دی گئی۔ لیکن پانچ سال بعد قیمت پھر 105 روپیہ (10 پونڈ 10 شلنگ) کر دی گئی اور 1840ء میں مزید اضافے کے بعد 180 روپیہ (18 پونڈ) قیمت مقرر

---

[1] ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کی چوتھی رپورٹ، 1853ء، ضمیمہ 2 اور پانچویں رپورٹ، 1853ء ضمیمہ 3۔

کی گئی۔ لیکن اس سال اس کو کم کر کے 120 روپیہ (12 پونڈ) کر دیا گیا جس پر ابھی تک نمک فروخت ہو رہا ہے۔ لیکن یہ قیمت تھوک کی ہے۔ خردہ فروشوں کو نمک زیادہ قیمت پر ملتا ہے جو اس پر منافع بھی لیتے ہیں اور یہ تمام رقم صارف کو ادا کرنی پڑتی ہے"۔

"اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ لوگ یا تو نمک استعمال ہی نہیں کرتے ہیں یا اس کی جگہ معمولی مٹی سے حاصل کیا ہوا کھارا استعمال کرتے ہیں جو مضر صحت بھی ہے اور جس کا بنانا جُرم ہے۔ سرکاری اجارہ داری کے نمک کے علاوہ کوئی اور نمک حاصل کرنا ممنوع ہے۔ اگر کوئی اس جُرم کا مرتکب ہو تو کلکٹر یا اس کا تحصیلدار اپنی صوابدید کے مطابق جرمانہ کر سکتا ہے اور جسمانی سزا دے سکتا ہے"۔[1]

اسی طرح کلکتہ کی برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی جانب سے پیش ہونے والی ایک درخواست میں، جس پر راجا رادھا کانت دیب بہادر اور دوسروں کے دستخط تھے، نمک کے سلسلہ میں برتی جانے والی سختی کو پوری طرح بے نقاب کیا گیا تھا۔

"حکومت نمک کی من مانی قیمت فروخت مقرر کرتی ہے اور ہمیشہ قیمت اتنی زیادہ رکھی جاتی ہے کہ ملک میں نمک سازی کے بڑے وسائل موجود ہونے کے باوجود انگریز تاجر باہر سے نمک منگاتے ہیں اس کی قیمت اتنی زیادہ ہے کہ ان مقامات کے قریب رہنے والے بھی، جہاں نمک بنایا جاتا ہے، مجبوراً نمک والی زمین کی مٹی کھرچ کر استعمال کرتے ہیں اور اندرون ملک کے رہنے والے ترکاریوں کو جلا کر ان کی راکھ میں پائی جانے والی القلی (Alkali) استعمال کیا کرتے ہیں۔ انصاف اور پالیسی کے تمام اصولوں کے خلاف محکمہ نمک کے افسروں کو عدالتی اختیارات حاصل ہیں جن کے استعمال میں بہت بے ضابطگی برتی جاتی ہے اور لوگوں کو پریشان کیا جاتا ہے۔ مال کی خفیہ درآمد و برآمد کو روکنے کے نام پر ماتحت افسروں کو موقع دیا جاتا ہے کہ وہ نمک لے جانے والوں اور شورا بنانے والوں کو پریشان کریں۔ سائلوں کا خیال ہے کہ اس محکمے کی دوسری ضروری اصلاحات کے ساتھ حکومت کو چاہیے کہ، اگر وہ فوری طور سے اس قابل نفرت ذریعہ آمدنی سے دست بردار نہیں ہو سکتی ہے، تو وہ نمک پر قطعی شرح محصول مثلاً 200 روپیہ (20 پونڈ) فی سومن (8,200 پونڈ) مقرر کر دے۔ اس سے نہ صرف غریبوں کا بھلا ہوگا بلکہ قانون عدالتی اختیارات رکھنے والے اکسائز کے افسروں کی بے ضابطگی سے پاک ہو جائے گا۔ اور تاجروں کو نمک کی چوکیوں کے چھوٹے موٹے افسر پریشان نہیں

---

[1] ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کی پہلی رپورٹ، 1853ء، ضمیمہ 7۔

کرسکیں گے۔ چونکہ نمک ضروریات زندگی میں شامل ہے اس لیے نمک کا محصول جلد سے جلد مکمل طور پر ختم کر دیا جانا چاہیے[1]۔"

بمبئی کے کاشتکاروں نے نمک کے ظالمانہ محصول کے خلاف 26 نومبر 1853ء کو حکومت بمبئی کو عرضداشت پیش کی اور رستم جی وکاجی نے، جس کا بیان اگلے سال ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کے سامنے ہوا تھا، اس درخواست کے کچھ حصے پڑھ کر سنائے۔ سائلوں نے اپنی درخواست میں کہا تھا کہ ان کے کھیتوں کی پیداوار سے انھیں سال میں صرف آٹھ مہینے غذا میسر آتی ہے۔ بقیہ چار مہینے وہ ترکاریاں کھا کر زندہ رہتے ہیں" جن پر وہ مرچ، اور جس زمانے میں نمک پر محصول نہیں لگا کرتا تھا، اس وقت مرچ کے ساتھ نمک بھی لگا کر کھاتے تھے۔ لیکن جب نمک پر محصول لگا دیا گیا تو انھیں مجبوراً وہ نمک بھی ترک کر دینا پڑا[2]۔"

بہت سے ممتاز اور تجربہ کار افسروں نے جو شہادت دی وہ بنگال، مدراس اور بمبئی کے لوگوں کی شہادت سے کسی طرح کم زوردار نہیں تھی۔

رابرٹ برڈ تیس سال تک ہندوستان میں مجسٹریٹ اور افسر مال کے فرائض ادا کر چکا تھا اور شمالی ہندوستان کے اہم بندوبست اراضی کا معمار تھا۔ اس سے دریافت کیا گیا کہ نمک کا محصول جتنا تباہ کن بتایا جاتا ہے کیا واقعی وہ اتنا تباہ کن ہے۔

اس نے جواب دیا "مجھے نہیں معلوم کہ نمک کے محصول کتنا ظالمانہ بتایا جاتا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ محصول نہایت حوصلہ شکن ہے۔ نمک کی لاگت پر 300 فیصدی یا غالباً 250 فیصدی محصول لگایا جاتا ہے لیکن یہ محصول صرف سرحد پر وصول کیا جاتا ہے۔ لارڈ آکلینڈ حسب معمول جب مغربی صوبجات میں اس کام کے متعلق تبادلۂ خیال کرنے کے لیے آیا، جو میں اس زمانے میں کر رہا تھا، تو اس نے مجھ سے نمک کے محصول کے متعلق بھی بات کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ نمک کے محصول کی بنا پر لوگوں کو جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان کی بڑی شکایتیں کی جا رہی ہیں۔ خاص طور سے اس واقعہ کی بنا پر حکومت بدنام ہو رہی ہے اور اس سے شکایت پیدا ہو رہی ہے کہ عورتوں کی ان پالکیوں کی تلاشی لی جاتی ہے جن میں بیٹھ کر وہ سرحد پار کیا کرتی ہیں۔ . . .

---

[1] ہاؤس آف کامنز کی پہلی رپورٹ، 1853ء ضمیمہ 7۔

[2] ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کی چوتھی رپورٹ، 1853ء، ص 27۔

میں صرف اتنا کہہ سکا کہ ان کی تلاشی اگر نہ لی جائے تو اوباش و بدقماش لوگوں کی اتنی بیویاں مغربی صوبجات میں آئیں کہ ان کی مثال کوئی دوسرا ملک نہ پیش کرسکے اور ہر عورت کی پالکی میں نمک ہی نمک بھرا ہو[1]۔"

فریڈرک ہالی ڈے (Frederick Halliday) نے، جو حکومتِ ہند کے داخلی اُمور کے محکمے میں سکریٹری تھا اور کچھ دن بعد بنگال کا لیفٹننٹ گورنر مقرر کردیا گیا تھا، کہا کہ ہندوستان میں نمک کی اجارہ داری کا جو طریقہ ہے اس میں بد دیانتی اور جبری وصولی سے نہیں بچا جاسکتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اگر اجارہ داری ختم کر دی جائے اور ہندوستان کے لوگوں کو نمک سازی کی اجازت دے دی جائے تو باہر کے نمک کو ہندوستان میں کوئی موقع نہیں مل سکے گا۔

"بنگال کی منڈیوں میں صارفین کو سرکاری نمک کی جو قیمت ادا کرنی پڑتی ہے وہ بہت زیادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نمک سازی کے سرکاری طریقے میں فضول خرچی ہوتی ہے اور اخراجات کو کم کرنے کی کوئی سبیل نہیں کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ سٹّے بازی، جبری وصولی اور بد دیانتی اس طریقے کے لازمی جُز ہوا کرتے ہیں اور لوگ موقع سے فائدہ اُٹھا کر ہر قسم کی بے ضابطگیوں سے کام لیتے ہیں۔ اس موضوع کے متعلق معلومات رکھنے والے لوگوں کو یقین ہے کہ ان حالات میں اگر حکومت دست بردار ہو جائے، نمک پر کوئی محصول عائد نہ کیا جائے اور نمک بنانے والوں کو پوری آزادی دے دی جائے تو بنگال کے مقامی نمک ساز باہر سے آنے والے نمک کے مقابلے میں سستا نمک بیچ سکیں گے اور بنگال میں نمک کا ایک ذرّہ بھی باہر سے نہیں آسکے گا[2]۔"

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ نہ تو نمک کے محصول کے خلاف پیش ہونے والی عرضداشتیں کامیاب ہوئیں اور نہ ان کے خلاف چلائی جانے والی تحریک کامیاب ہوئی۔ نمک کا محصول ختم نہیں کیا گیا۔

افیم

نمک کے علاوہ افیم پر بھی کمپنی کو اجارہ داری کے حقوق حاصل تھے۔ سلیکٹ کمیٹی کے سامنے

---

[1] ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کی چوتھی رپورٹ، 1853ء

[2] ایضاً۔

اس سے آمدنی حاصل کرنے کے طریقے کی الف ۔ ڈبلیو ۔ پری ڈے نے بڑی وضاحت کے ساتھ تشریح کی جو انڈیا آفس میں ہندوستان کی مراسلت کے نائب نگران کی حیثیت سے کام کرتا تھا ۔

بنگال میں پوست کی کاشت بالکل ممنوع تھی ۔ صرف ان لوگوں کو کاشت کی اجازت دی جاتی تھی جو اس کا رس حکومت کے ہاتھ فروخت کیا کرتے تھے ۔ جو کسان پوست کی کاشت کرنا چاہتے تھے ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس کا رس معینہ قیمت پر حکومت کے ہاتھ فروخت کریں ۔ یہ رس ان دو بڑے کارخانوں کو بھیج دیا جاتا تھا جس میں سے ایک پٹنہ میں اور دوسرا بنارس میں واقع تھا ۔ وہاں اس سے افیم بنائی جاتی تھی اور کلکتہ بھیج دی جاتی تھی ۔ کلکتہ میں افیم نیلام کی جاتی تھی ۔ جو رقم حکومت اس کی خرید پر خرچ کرتی تھی اور جو رقم ان تاجروں سے وصول کی جاتی تھی جو چین کو افیم برآمد کیا کرتے تھے ان دونوں کا فرق حکومت کا منافع ہوا کرتا تھا ۔

بمبئی میں نہ پوست کی کاشت ہوتی تھی اور نہ افیم بنائی جاتی تھی کمپنی کو آمدنی اس افیم سے ہوتی تھی جو مالوا کی دیسی ریاست میں اگائی اور تیار کی جاتی تھی ۔ اس ریاست کے تاجر چین کو برآمد کرنے کے لیے افیم بمبئی کی برطانوی بندرگاہ کو بھیجا کرتے تھے ۔ برطانوی علاقے سے گزرنے والی افیم کی ہر پیٹی (123 پونڈ) پر برطانوی حکومت 40 پونڈ بطور محصول وصول کیا کرتی تھی ۔ 1843ء سے پہلے مالوا کی افیم سندھ کے راستے ہندوستان کے باہر جایا کرتی تھی ۔ لیکن 1843ء میں انگریزوں نے سندھ کو اپنے علاقے میں شامل کر لیا تھا ۔ اس کے بعد مالوا کی افیم پر تمام راستے بند ہو گئے تھے اور اُسے مجبوراً برطانوی علاقے سے گزرنا اور گزرنے کے لیے محصول ادا کرنا پڑتا تھا ۔ بمبئی کی افیم کی آمدنی اصل میں اس محصول کی آمدنی تھی ۔ چنانچہ سندھ کی فتح سے یہ مالی فائدہ ہوا کہ بمبئی کی افیم کی آمدنی بڑھ گئی ۔

مدراس میں افیم پیدا نہیں ہوتی تھی ۔

انگلستان میں اس کے متعلق بڑا اختلاف رائے پایا جاتا تھا کہ افیم کی آمدنی کو کیا ہندوستان کے لوگوں پر لگنے والے محصول کا نام دیا جا سکتا ہے، اس آمدنی کو برقرار رکھنے کے لیے چین سے جو لڑائیاں ہوئیں کیا وہ حق بجانب تھیں اور کیا حکومتِ ہند کو افیم کی اجارہ داری برقرار و بحال رکھنی چاہیے ۔ موجودہ کتاب کا مقصد یہ ہے کہ قارئین کے سامنے واقعات پیش کر دیے جائیں تاکہ وہ خود کسی نتیجے پر پہنچ سکیں اسی لیے ہم اس بحث میں نہیں پڑیں گے ۔ ہمارے خیال میں کوئی معقول ماہر معاشیات اس سے انکار نہیں کر سکے گا کہ ایسی سرکاری اجارہ داری، جو لوگوں کو ایک

منافع بخش صنعت سے محروم کر دے اور ایک اچھی قیمت اُٹھانے والی شے کی کاشت، تیاری اور تجارت سے باز رکھے خود ہی عوام پر لگنے والا ایک محصول ہے۔ کسی غیر جانبدار مورّخ نے لارڈ پامرسٹن کی چین کی اُن جنگوں کی حمایت نہیں کی جن کا مقصد یہ تھا کہ وہاں کی حکومت کی مرضی کے خلاف ہندوستانی افیم چین جاتی رہے۔ افیم پر اگر سرکاری اجارہ داری آسانی سے ختم کی جا سکے تو کوئی سنجیدہ مدبر اُس کو برقرار رکھنا نہیں چاہے گا۔

اس کے باوجود چونکہ افیم انسانی غذا کا لازمی جُز نہیں ہے اس لیے ہندوستان کے لوگ افیم پر سرکاری اجارہ داری کو عام لوگوں کے لیے اتنا مضرت رساں نہیں سمجھتے جتنا نمک کی اجارہ داری کو ہندوستان میں اوّل الذکر کے خلاف ویسے جذبات نہیں پائے جاتے ہیں جیسے آخر الذکر کے خلاف۔ پھر بھی اُن کا خیال ہے کہ حکومت اگر اجارہ داری ختم کر دے تو اچھا ہے۔ وہ افیم کی تیاری اور تجارت پر اُسی طرح بھاری محاصل عائد کر سکتی ہے جس طرح وہ دوسری منشیات اور شرابوں پر کرتی ہے۔ برٹش انڈین ایسوسی ایشن نے ہاؤس آف کامنز میں جو عرضداشت پیش کی تھی اس میں ہندوستان کے لوگوں کے خیالات کی صحیح ترجمانی کی گئی تھی۔

"انصاف کا تقاضہ ہے کہ حکومت افیم کی کاشت میں مداخلت ترک کر دے۔ افیم سے ہونے والی آمدنی اس کی تیاری اور برآمدات، اور بالخصوص برآمدات کے محاصل کی شکل میں حاصل کی جانی چاہیے جیسا کہ کسی حد تک مالوا کی افیم کے تعلق سے کیا جاتا ہے۔ اگر یہ اصول تسلیم کر لیا جائے تو کسانوں کو وہ آزادیٔ عمل حاصل ہو جائے گی جو ایسی حکومت کے تحت ہر شخص کا حق سمجھی جاتی ہے جو مطلق العنانیت کے اصولوں پر قایم نہیں ہوتی ہیں۔ اس طریقے کو اپنانے میں جو مالی نقصان ہوگا وہ اس بچت سے پورا ہو جائے گا جو موجودہ عملے کی برطرفی کی بنا پر ہوگی جس پر بہت روپیہ خرچ ہو رہا ہے۔"

لیکن درخواست بے سود ثابت ہوئی۔ نہ ایسٹ انڈیا کمپنی اس کے لیے تیار تھی کہ اجارہ داری سے دست بردار ہو جائے یا اس کے بجائے افیم کی تیاری اور برآمد پر محصول لگائے نہ ملکۂ انگلستان کی حکومت جس نے 1858ء میں ہندوستان کا انتظام سنبھال لیا تھا۔

باب 10

محاصل، برآمدات و درآمدات

ہندوستانی مقننہ نے تجارت اور جہاز رانی کے ضابطے بنانے اور محاصل کا تعین کرنے کے لیے 1833ء اور 1853ء کی درمیانی مدت میں کئی ایکٹ بنائے[1] ہندوستان میں درآمد ہونے

---

[1] 1836ء ایکٹ نمبر 2، 3، 14، 22، 25، 32

1837ء ایکٹ نمبر 5، 14، 16، 17، 32

1838ء ایکٹ نمبر 1، 5، 19، 29، 31

1839ء ایکٹ نمبر 5، 13، 15، 20

1840ء ایکٹ نمبر 13

1841ء ایکٹ نمبر 6، 10، 13، 48 23

1842ء ایکٹ نمبر 3، 4، 11، 15

1843ء ایکٹ نمبر 14، 25

1844ء ایکٹ نمبر 6، 15، 16، 20، 21

1845ء ایکٹ نمبر 7، 9، 24، 32

1846ء ایکٹ نمبر 2، 9

1848ء ایکٹ نمبر 6، 16، 17، 23

1849ء ایکٹ نمبر 5، 8، 13

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

وہاں کچھ خاص خاص اشیاء پر 1852ء میں جو محصول لگایا گیا تھا وہ مندرجہ ذیل نقشے میں دکھایا جا رہا ہے۔

اشیاء	محصول درآمد
کتابیں ـــــ برطانوی	مستثنیٰ
کتابیں ـــــ دوسرے ملکوں کی	3 فیصدی
کافی	$7\frac{1}{2}$ فیصدی
سُوتی اور ریشمی کپڑا ـــــ برطانوی	5 فیصدی
سُوتی اور ریشمی کپڑا ـــــ دوسرے ملکوں کا	10 فیصدی
سُوتی دھاگہ، ڈورا اور سُوت ـــــ برطانوی	3 فیصدی
سُوتی دھاگہ، ڈورا اور سُوت ـــــ دوسرے ملکوں کا	7 فیصدی
گھوڑے اور دوسرے جانور	مستثنیٰ
جہاز رانی کا سامان ـــــ برطانوی	5 فیصدی
جہاز رانی کا سامان ـــــ دوسرے ملکوں سے آنے والا	10 فیصدی
دوائیں ـــــ برطانوی	5 فیصدی
دوائیں ـــــ دوسرے ملکوں کی	10 فیصدی
بیر، ایل اور دوسرے نشہ آور مشروبات	5 فیصدی
نمک	5 شلنگ فی من (82 پونڈ) بنگال میں 6 شلنگ فی من مدراس میں
تیز شرابیں	3 شلنگ فی امپیریل گیلن لندن کے معیار کے مطابق
چائے	10 فیصدی

(صـــــ سے آگے)

1850ء ایکٹ نمبر 5، 10، 11، 24، 27، 28

دیکھیے ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ، 1852ء، ضمیمہ 5۔

باب 10

محاصل، برآمدات و درآمدات

ہندوستانی مقننہ نے تجارت اور جہاز رانی کے ضابطے بنانے اور محاصل کا تعین کرنے کے لیے 1833ء اور 1853ء کی درمیانی مدت میں کئی ایکٹ بنائے[1] ہندوستان میں درآمد ہونے

---

[1] 1836ء ایکٹ نمبر 2، 3، 14، 22، 25، 32

1837ء ایکٹ نمبر 5، 14، 16، 17، 32

1838ء ایکٹ نمبر 1، 5، 18، 29، 31

1839ء ایکٹ نمبر 5، 13، 15، 20

1840ء ایکٹ نمبر 13

1841ء ایکٹ نمبر 6، 10، 13، 2398

1842ء ایکٹ نمبر 3، 4، 11، 15

1843ء ایکٹ نمبر 14، 25

1844ء ایکٹ نمبر 6، 15، 16، 20، 21

1845ء ایکٹ نمبر 7، 9، 24، 32

1846ء ایکٹ نمبر 2، 9

1848ء ایکٹ نمبر 6، 16، 17، 23

1849ء ایکٹ نمبر 5، 8، 13

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

والی کچھ خاص خاص اشیاء پر 1852ء میں جو محصول لگایا گیا تھا وہ مندرجہ ذیل نقشے میں دکھایا جا رہا ہے۔

اشیاء	محصول درآمد
کتابیں — برطانوی	مستثنیٰ
کتابیں — دوسرے مُلکوں کی	3 فیصدی
کافی	$7\frac{1}{2}$ فیصدی
سُوتی اور ریشمی کپڑا — برطانوی	5 فیصدی
سُوتی اور ریشمی کپڑا — دوسرے مُلکوں کا	10 فیصدی
سُوتی دھاگہ، ڈورا اور سُوت — برطانوی	3 فیصدی
سُوتی دھاگہ، ڈورا اور سُوت — دوسرے مُلکوں کا	7 فیصدی
گھوڑے اور دوسرے جانور	مستثنیٰ
جہاز رانی کا سامان — برطانوی	5 فیصدی
جہاز رانی کا سامان — دوسرے مُلکوں سے آنے والا	10 فیصدی
دھاتیں — برطانوی	5 فیصدی
دھاتیں — دوسرے مُلکوں کی	10 فیصدی
بیئر، ایل اور دوسرے نشہ آور مشروبات	5 فیصدی
نمک	5 شلنگ فی من (82 پونڈ) بنگال میں 6 شلنگ فی من مدراس میں
تیز شرابیں	3 شلنگ فی امپیریل گیلن لندن کے معیار کے مطابق
چائے	10 فیصدی

(صــــ سے آگے)

1850ء ایکٹ نمبر 5، 10، 11، 24، 27، 28

دیکھیے ہاؤس آف کامنز کی سیلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ، 1852ء، ضمیمہ 5۔

اشیاء		محصول درآمد
ہلکی شرابیں		2 شلنگ فی امپیریل گیلن
اُونی کپڑے	برطانوی	5 فیصدی
اُونی کپڑے	دوسرے مُلکوں کے	۱۰ فیصدی
مصنوعات		5 فیصدی
وہ اشیاء جن کا نام درج نہیں ہے۔		$3\frac{1}{2}$ فیصدی

ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ کے ضمیمہ 3 میں، جس سے مندرجہ بالا اعداد وشمار اخذ کیے گئے ہیں، 1835-36ء سے 1849-50ء تک کے سولہ سال میں بنگال، مدراس اور بمبئی کے درآمدات و برآمدات کی مالیت بھی درج ہے۔ مندرجہ ذیل دو نقشوں میں ایک پونڈ کو ۱۰ روپے کے برابر تسلیم کیا گیا ہے۔

درآمدات

درآمد ہونے والا تجارتی مال اور خزانہ

سال	بنگال پونڈ	مدراس پونڈ	بمبئی پونڈ	کُل میزان پونڈ
1834-35ء	26,45,355	6,50,405	28,52,369	61,54,129
1835-36ء	28,57,530	5,85,088	34,85,694	69,28,312
1836-37ء	33,95,423	6,72,985	35,04,747	75,73,157
1837-38ء	35,12,788	7,32,466	34,27,317	76,72,572
1838-39ء	38,51,183	7,78,536	36,21,876	82,51,596
1839-40ء	45,68,378	7,95,714	24,12,408	77,76,501
1840-41ء	55,09,563	8,37,079	38,55,551	1,02,02,193

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

سال	بنگال	مدراس	بمبئی	کُل میزان
1841-42ء	52,52,527	7,45,887	36,31,485	96,29,900
1842-43ء	55,63,897	6,60,593	48,22,403	1,10,46,894
1843-44ء	62,26,848	7,67,504	66,18,122	1,36,12,475
1844-45ء	75,15,355	12,35,455	57,55,727	1,45,06,537
1845-46ء	62,23,623	10,22,211	43,37,603	1,15,83,438
1846-47ء	66,49,671	10,29,003	41,57,911	1,18,36,586
1847-48ء	54,18,584	11,08,817	40,43,606	1,05,71,008
1848-49ء	57,70,623	10,65,271	57,13,412	1,25,49,307
1849-50ء	64,98,035	10,27,441	61,71,218	1,36,96,696

برآمدات

برآمد ہونے والا تجارتی مال اور خزانہ

سال	بنگال پونڈ	مدراس پونڈ	بمبئی پونڈ	کُل میزان پونڈ
1834-35ء	41,58,598	9,92,485	30,37,077	81,88,161
1835-36ء	55,93,896	11,52,968	44,67,740	1,12,14,604
1836-37ء	68,49,527	13,51,416	53,03,173	1,35,04,117
1837-38ء	69,05,809	10,72,640	36,04,886	1,15,83,436
1838-39ء	69,54,381	11,11,719	40,56,573	1,21,22,675
1839-40ء	70,00,943	13,55,914	29,76,411	1,13,33,268

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

	بنگال	مدراس	بمبئی	کل میزان
1840-41ء	82,06,771	11,33,466	44,81,832	1,38,22,070
1841-42ء	82,25,539	14,23,064	46,91,689	1,43,40,293
1842-43ء	74,36,369	13,27,308	50,03,942	1,37,67,621
1843-44ء	1,00,76,904	12,30,255	66,92,393	1,79,99,553
1845-46ء	1,02,18,755	17,06,516	57,71,796	1,76,97,052
1846-47ء	95,19,797	15,84,316	49,65,192	1,60,69,307
1847-48ء	88,66,928	14,91,558	43,79,947	1,47,38,435
1848-49ء	98,19,742	19,46,311	68,62,190	1,86,28,244
1849-50ء	1,05,02,244	13,45,522	64,35,776	1,82,83,543

مندرجہ بالا نقشوں کے اعداد و شمار دعوت فکر دیتے ہیں۔ ایک نظر میں دیکھا جا سکتا ہے کہ بنگال اور بمبئی کی برآمدات و درآمدات میں تیزی سے اضافہ ہوا مگر مدراس میں زیادہ اضافہ نہیں ہوا۔ بمبئی اور بنگال کی درآمدات دو ملین سے بڑھ کر چھ ملین ہو گئیں لیکن مدراس کی درآمدات 6,00,000 پونڈ سے بڑھ کر صرف ایک ملین پونڈ ہو سکیں۔ بمبئی کی برآمدات تین ملین سے بڑھ کر ساڑھے چھ ملین ہو گئیں اور بنگال کی برآمدات چار ملین سے ساڑھے دس ملین ہو گئیں۔ لیکن مدراس سے ہونے والی برآمدات ایک ملین سے بڑھ کر صرف ڈیڑھ ہو سکیں۔ اس بڑے فرق کی وجہ بنگال اور بمبئی کے علاقوں کی توسیع نہیں تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ 1834ء اور 1849ء کی درمیانی مدت میں بنگال اور بمبئی کے علاقوں میں کوئی قابلِ لحاظ اضافہ نہیں ہوا تھا۔ اس فرق کی اصل وجہ یہ تھی کہ مدراس کے غلط قسم کے نظام مالگزاری نے لوگوں کو تباہ کر دیا تھا جس کا ذکر ہم ایک پچھلے باب میں کر چکے ہیں۔

مندرجہ بالا اعداد و شمار سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ برطانوی ہند کی درآمدات و برآمدات میں بڑا فرق تھا۔ 1834-35ء میں یہ فرق دو ملین پونڈ تھا مگر 1849-50ء میں بڑھ کر ساڑھے چار ملین پونڈ ہو گیا تھا۔ یہ اعداد و شمار صرف انگلستان کے ساتھ نہیں بلکہ دُنیا کے تمام ممالک کے ساتھ تجارت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ دوسرے ملکوں کو جو مال بھیجا جاتا تھا اس کا منصفانہ معاوضہ مل جاتا تھا۔ جہاں تک انگلستان کا تعلق تھا وہ ہندوستان سے خراج وصول کیا کرتا تھا جس کے معاوضے میں کوئی

تجارتی اشیاء نہیں آتی تھیں۔ ہندوستان کی درآمدات و برآمدات میں دو سے چار ملین سالانہ کا جو فرق ہوا کرتا تھا وہ ہندوستان سے سال بہ سال ہونے والے دولت کے نکاس کی نمائندگی کرتا تھا۔

مندرجہ بالا نقشے میں ہم نے 1850ء تک ہندوستان کی تجارت کے اعداد و شمار پیش کیے تھے۔ ہم کمپنی کی حکومت کے بقیہ 8 سال یعنی 1851ء لغایت 1858ء کے اعداد و شمار بھی پیش کر رہے ہیں جو ایک حالیہ ماخذ سے اخذ کیے گئے ہیں[1]

دُنیا کے تمام مُلکوں کے ساتھ ہندوستان کی تجارت

سال	تجارتی مال کی درآمد پونڈ	خزانے کی درآمد پونڈ	جملہ درآمدات پونڈ	جملہ برآمدات پونڈ	فاضل برآمدات پونڈ
1851ء	1,15,58,789	38,11,809	1,53,70,598	1,87,05,439	33,34,839
1852ء	1,22,40,490	50,52,059	1,72,92,549	2,07,98,342	35,05,793
1853ء	1,00,70,863	68,31,377	1,69,02,240	2,15,18,863	46,17,623
1854ء	1,11,22,659	48,71,954	1,59,94,613	2,07,78,435	47,83,822
1855ء	1,27,42,671	20,28,256	1,47,70,927	2,01,94,255	54,23,328
					فاضل درآمدات
1856ء	1,39,43,494	1,13,01,288	2,52,44,782	2,36,38,435	16,05,347
1857ء	1,41,94,587	1,44,13,697	2,86,08,284	2,65,91,877	20,16,407
1858ء	1,52,77,629	1,58,15,436	3,10,93,065	2,82,78,474	28,14,591

پہلے پانچ سال میں فاضل برآمدات کا سلسلہ جاری رہا لیکن آخری تین برسوں میں درآمدات برآمدات سے زیادہ تھیں۔ ان تین میں دو غدر کے سال تھے۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ برآمدات کے مقابلے میں درآمدات کی زیادتی عارضی تھی۔ جیسا کہ ہم

---

[1] برطانوی ہند کے متعلق اعداد و شمار کا اقتباس، 1840ء لغایت 1865ء۔

ایک اگلے باب میں دیکھیں گے 1864ء کے بعد ہندوستان کی برآمدات ایک دفعہ پھر درآمدات سے زیادہ ہوگئیں اور وقت گزرنے کے ساتھ اُن کا فرق تشویش ناک حد تک بڑھ گیا۔

ہندوستان کی مجموعی تجارت کی نصف سے کچھ زیادہ انگلستان کے ساتھ ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ 1841ء اور 1855ء کی درمیانی مدّت میں، جب ہندوستان کی مجموعی درآمدات دس سے سترہ ملین تک کی ہوا کرتی تھیں، صرف انگلستان سے ہونے والی درآمدات پانچ سے دس ملین تک کی تھیں۔ آخری تین برسوں یعنی 1856ء 1857ء اور 1858ء میں جب درآمدات بڑھ کے پچّیس سے اکتّیس ملین تک کی ہونے لگیں تو انگلستان سے ہونے والی درآمدات چودہ سے لے کر اٹھارہ ملین تک کی ہو گئیں۔ ہندوستان کی برآمدات میں انگلستان کا حصّہ نسبتاً کم ہوا کرتا تھا۔ 1841ء اور 1855ء کی درمیانی مدّت میں ہندوستان کی مجموعی برآمدات تیرہ سے اکّیس ملین تک کی ہوتی تھیں جن میں سے پانچ سے آٹھ ملین تک کی برآمدات انگلستان کو کی جاتی تھیں۔ آخری تین سال میں انگلستان کو ہندوستان سے ہونے والی برآمدات بڑھ کے دس ملین ہوگئیں جبکہ اس کی مجموعی برآمدات تیئس ملین سے اٹھائیس ملین تک کی تھیں۔

جگہ کی قلّت اس امر کی اجازت نہیں دیتی ہے کہ ہم ان برسوں میں تمام تجارتی اشیاء کی درآمد و برآمد میں کمی اور زیادتی کا جائزہ لے سکیں۔ پھر بھی کچھ خاص خاص تجارتی اشیاء کی تاریخ اہمیت کی حامل ہے۔ اس سے ہندوستان کے لوگوں کی صنعتوں پر روشنی پڑتی ہے۔ ہندوستان کی اہم درآمدات میں سُوتی دھاگا اور سُوت، سُوتی کپڑے، ریشمی کپڑے، اُونی کپڑے، مشینیں اور دھات کا سامان شامل تھا۔ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ دس برسوں میں ان اشیاء کی کھپت میں کیا تبدیلی ہوئی۔

ہندوستان میں تمام ملکوں سے ہونے والی درآمدات

سال	سُوتی دھاگا اور سُوت پونڈ	سُوتی کپڑا پونڈ	ریشمی کپڑا پونڈ	اُونی کپڑا پونڈ	مشینیں پونڈ	دھات کا سامان پونڈ
1849ء	9,09,016	22,22,089	1,23,505	1,11,815	18,064	2,03,997
1850ء	11,31,586	33,71,618	1,12,601	1,56,154	8,079	1,66,139

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

سال	سوتی دھاگا اور سوت	سوتی کپڑا	ریشمی کپڑا	اونی کپڑا	مشینیں	دھات کا سامان
1851ء	10,39,329	36,42,361	1,11,554	2,18,848	20,666	2,45,393
1852ء	13,91,134	47,70,779	1,26,064	2,05,505	14,337	2,46,701
1853ء	11,30,500	36,67,433	1,10,546	1,42,027	26,457	2,17.187
1854ء	13,06,913	44,32,525	1,16,955	1,44,473	52,788	2,86,671
1855ء	12,74,098	54,03,244	1,97,510	1,71,065	1,26,303	3,12,304
1856ء	14,14,274	49,48,005	1,38,768	1,33,898	4,35,512	7,88,859
1857ء	11,91,974	48,41,353	1,06,333	1,43,797	2,44,433	5,58,329
1858ء	9,43,920	47,82,698	1,08,023	2,61,589	4,65,453	3,78,989

مندرجہ بالا اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ 1849ء سے 1855ء تک کے چھ سال میں سوتی کپڑے کی درآمد دُگنی سے زیادہ ہو گئی تھی۔ حالانکہ غدر کے دوران اس میں کوئی اضافہ نہیں ہوا لیکن 1859ء میں اُس کی درآمد ایک لخت بڑھ کے آٹھ ملین ہو گئی مشینوں اور دھات کے سامان کی درآمد میں بھی قابلِ لحاظ اضافہ ہوا۔

مندرجہ ذیل اعداد و شمار انھیں دس برسوں میں ہندوستان سے ہونے والی خاص خاص برآمدات کی کمی اور زیادتی کو ظاہر کرتے ہیں۔

ہندوستان سے تمام ملکوں کو ہونے والی برآمدات

سال	روئی پونڈ	سوتی کپڑا، دھاگا اور سوت پونڈ	خام ریشم پونڈ	ریشمی کپڑا پونڈ	خام اُون پونڈ
1849ء	17,75,309	6,90,584	7,13,632	3,02,322	55,591
1850ء	22,01,178	7,42,320	6,66,094	4,41,749	48,925
1851ء	34,74,489	6,73,549	6,19,319	3,55,223	68,335

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

سال	روئی	سوتی کپڑا، دھاگا اور سوت	خام ریشم	ریشمی کپڑا	خام اون
1852ء	36,18,989	8,19,048	6,88,640	2,60,225	1,00,612
1853ء	36,29,494	9,30,877	6,67,546	3,15,305	1,72,110
1854ء	28,02,150	7,69,345	6,40,451	3,26,571	2,05,601
1855ء	24,28,764	8,17,103	5,00,105	2,63,453	2,07,263
1856ء	33,14,951	7,79,647	7,07,706	3,41,035	2,72,942
1857ء	14,37,949	8,82,241	7,82,140	2,81,450	3,14,216
1858ء	43,01,768	8,09,183	7,66,673	1,58,224	3,87,104

سال	غلّے پونڈ	شکر پونڈ	افیم پونڈ	نیل پونڈ	پٹ سن پونڈ
1849ء	8,58,691	18,14,404	57,72,526	20,93,474	68,717
1850ء	7,57,917	18,25,403	59,73,395	18,38,474	88,989
1851ء	7,62,295	18,23,789	54,59,135	19,80,896	1,96,936
1852ء	8,68,002	18,01,660	65,15,214	20,25,313	1,80,976
1853ء	8,88,160	17,29,762	70,34,075	18,09,685	1,12,617
1854ء	14,13,654	9,48,582	64,37,098	20,67,769	2,14,768
1855ء	17,42,530	11,35,699	62,31,278	17,01,825	2,29,241
1856ء	28,96,262	13,59,104	62,00,871	24,24,332	3,29,076
1857ء	25,87,456	17,86,077	70,56,630	19,37,907	2,74,957
1858ء	37,90,374	11,75,771	91,06,635	17,34,339	3,03,292

برآمد ہونے والی اشیا کی کمی اور زیادتی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ دس سال میں روئی کی برآمد دو ملین سے کچھ کم سے بڑھ کر چار ملین سے کچھ زیادہ ہو گئی۔ انگلستان میں مسلسل یہ خواہش پائی جاتی تھی کہ ہندوستان میں کپاس کی کاشت میں اضافہ کیا جائے اور اس کو ترقی دی جائے تاکہ انگلستان کے کارخانوں کی ضرورت امریکہ کے بجائے اس کا مقبوضہ علاقہ پوری کر سکے۔ ہم ایک اگلے باب میں دیکھیں گے کہ ساتویں دہائی کے ابتدائی برسوں میں ہونے والی امریکی خانہ جنگی نے ان کوششوں کو تقویت پہنچائی۔ خانہ جنگی کے دوران امریکہ سے بہت کم روئی آ سکی اور ہندوستان سے ہونے والی روئی کی برآمد 1864ء میں قریب قریب چھتیس ملین تک پہنچ گئی اور اگلے سال اس سے بھی تجاوز کر گئی۔ لیکن ریاست ہائے متحدہ میں امن قایم ہونے کے بعد یہ اُمید ختم ہو گئی۔ انگلستان کے کارخانے ہندوستانی روئی کے بجائے ایک دفعہ پھر امریکی روئی استعمال کرنے لگے اور ہندوستانی روئی کی برآمد جس تیزی سے بڑھی تھی اُتنی ہی تیزی سے گھٹ گئی۔

پچھلی صدی میں کپڑا بُننے کی ہندوستانی صنعت کو ترقی دینے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ نہ یہاں کے لوگوں کو بھاپ سے چلنے والے کرگے استعمال کرنے کی تربیت دی گئی اور نہ اُن کے ہتھ کرگوں کی کارکردگی میں کسی قسم کا اضافہ کیا گیا۔ اگر واقعی قومی حکومت ہوتی یعنی ایسی حکومت جو قوم کی بھلائی کے لیے کام کرتی تو وہ نئے اور بہتر طریقے رائج کر کے پُرانی قومی صنعتوں کا تحفظ کرتی اور ہندوستان کے صابر، جفاکش، اور ہنرمند دست کار نئے نئے طریقے سیکھتے اور نئے حالات میں اپنی قدیم صنعت کو بحال و برقرار رکھتے۔

ایک دفعہ پھر مندرجہ بالا نقشے پر نظر ڈالی جائے تو ہم دیکھیں گے کہ خام ریشم کی برآمد تو ایک جگہ ٹھیری رہی، خام اُون کی برآمد میں اضافہ ہوتا رہا لیکن ریشم کے مصنوعات کی برآمد میں، جن کے تعلق سے انگلستان کے ریشم کے بُنکروں میں بڑا حسد پایا جاتا تھا، 1857ء اور 1858ء کے بعد خاصی کمی ہونے لگی اور پھر کبھی اس میں اضافہ نہیں ہو سکا۔ لیکن غذائی اجناس کی برآمد میں تشویش ناک حد تک اضافہ ہو گیا۔ دس سال کی مدّت میں غلّے کی برآمد ایک ملین سے کچھ کم سے بڑھ کر تقریباً چار ملین ہو گئی۔ یہ قدرتی نتیجہ تھا دستکاریوں اور صنعتوں کے زوال کا۔ بہرحال ہندوستان کو ہر سال انگلستان کو خراج ادا کرنا تھا اور وہاں سے درآمد ہونے والے سامان کی قیمت ادا کرنی تھی اس لیے لوگوں کی غذا کا روزافزوں حصّہ باہر بھیجنا پڑتا تھا۔ اُنیسویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے چاول، گیہوں اور دوسرے غلّوں کی سالانہ برآمد 12 ملین پونڈ ہو چکی تھی۔

کمپنی کے عہدِ حکومت کے آخری برسوں میں ہندوستان سے شکر کی برآمد کم ہونی شروع ہو گئی تھی اور صدی کے ختم ہوتے ہوتے 1,70,000 پونڈ سے کچھ کم کی شکر انگلستان جا رہی تھی لیکن پٹ سن کی برآمد میں خاص طور سے جنگ کریمیا (Crimean War) کے بعد بڑا اضافہ ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے انگلستان پٹ سن کی بڑی مقدار روس سے حاصل کیا کرتا تھا۔ جنگ کی وجہ سے اس کی درآمد میں خلل پڑ گیا۔ اس طرح ہندوستان کے پٹ سن کو ایک اچھا موقع مل گیا۔ اس کی برآمد کی سطح ابھی تک برقرار ہے۔ صدی کے ختم ہوتے ہوتے تقریباً دس ملین پونڈ کا پٹ سن اور اس کے مصنوعات ہندوستان سے برآمد ہونے لگے تھے۔

ہندوستان سے نیل بھی بڑی مقدار میں برآمد کیا جاتا تھا لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس صنعت کی تاریخ غیر قانونی کارروائیوں اور جبر و ظلم کے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ بنگال میں پائے جانے والے نیل کے صنعت کاروں کی بدعنوانیوں نے لوگوں کو مشتعل کر دیا تھا اور بنگال کے زیادہ تر حصوں میں بالآخر لوگوں کو خود اُن کا علاج کرنا پڑا۔ کسانوں نے نیل کی کاشت کرنے سے انکار کر دیا۔ بہت سی نیل کی کمپنیوں کا دیوالا نکل گیا اور، جیسا کہ ایک اگلے باب میں بتایا جائے گا، نیل کی صنعت کا زوال ہو گیا۔ صدی کے آخری برسوں میں جرمنی میں کیمیائی رنگ کی ایجاد نے اس قدیم صنعت کو بالآخر ختم کر دیا۔

محترفہ

ہندوستانی صنعتوں کے سلسلے میں یہ بتاتے ہوئے اطمینان ہوتا ہے کہ تاجروں اور پیشہ ور لوگوں پر لگنے والا محترفہ محصول 1853ء کے بعد، مدراس کے ظلمت زدہ صوبے کے علاوہ، پورے ہندوستان میں منسوخ کر دیا گیا تھا۔ مدراس کی نیٹو ایسوسی ایشن نے ہاؤس آف کامنز[1] میں جو عرض داشت پیش کی تھی اس میں محترفہ کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی تھی: "تجارتوں اور پیشوں اور حرفوں پر لگنے والا محصول جو بنکروں، بڑھئیوں، دھاتوں کا سامان بنانے والوں، خردہ فروشوں وغیرہ پر لگتا ہے چاہے وہ دوکان رکھتے ہوں یا خوانچہ لگتے ہوں۔ دوکان پر علاحدہ سے محصول لگایا جاتا ہے ——— یہ محصول معمولی سے معمولی اشیا پر اور سستے سے سستے اوزاروں پر لگایا جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو اس محترفہ محصول کی رقم

---

[1] ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کی پہلی رپورٹ 1853ء، ضمیمہ 7 -

جس کی ادائیگی کے بعد انھیں کام کرنے کی اجازت دی جاتی ہے ان کے اوزاروں کی قیمت سے بھی زیادہ ہوتی ہے"۔ یادداشت میں مزید کہا گیا تھا "اس محصول کا بار دولت مند لوگوں کے بجائے غریبوں پر زیادہ پڑتا ہے۔ اس کی وصولی چونکہ افسروں کی صوابدید پر چھوڑ دی گئی ہے اس لیے غیر ذمہ دار کلکٹر یا تو ناجائز فائدہ اُٹھانے یا اپنی خواہش پوری کرنے کے لیے مُسلسل تفتیش و تحقیقات کرتے رہتے ہیں اور جبری روپیہ وصول کرنے اور ظُلم ڈھانے سے بھی پرہیز نہیں کرتے ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ روپیہ وصول کرنے کے لیے وہ قید و بند اور ہتھکڑی بیڑی کا سہارا بھی لیا کرتے ہیں"۔ حالانکہ "اس طرح وصول ہونے والی مجموعی رقم صرف 1,00,000 پونڈ سے کچھ ہی زیادہ ہوتی ہے"۔

مندرجہ بالا بیان میں مبالغے سے کام نہیں لیا گیا تھا۔ ایک گواہ جے۔ ڈبلیو۔ بی۔ ڈائکس نے جو مجسٹریٹ اور افسر مال کے عہدوں پر کام کر چُکا تھا اور مدراس میں محصول کا روپیہ وصول کرنے پر مامور رہ چُکا تھا، اس کی ظالمانہ نوعیت کا ذکر زیادہ زوردار الفاظ میں کیا۔

سوال —— کیا محصول صرف ان لوگوں کو ادا کرنا ہوتا ہے جو تجارتی کاروبار کیا کرتے ہیں؟

جواب —— قریب قریب ہر شخص کو یہ محصول ادا کرنا ہوتا ہے جو کاشت نہیں کرتا ہے۔ . . . اگر ایک بڑھیا کچھ ترکاریاں بازار لے جائے اور کسی سڑک کے کنارے بیٹھ کر انھیں بیچے تو اسے ترکاری بیچنے پر محصول ادا کرنا ہوتا ہے۔ اگر کوئی آدمی کپڑا بیچتا ہے تو اس پر بھی محصول تشخیص کیا جاتا ہے لیکن یورپین تاجر اس سے مستثنیٰ ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ چند روپیہ سال پیدا کرنے والے اس آدمی کی بغل میں ایک یورپین تاجر کی دکان ہو جس کی سیکڑوں روپیہ سال آمدنی ہو لیکن وہ ایک پیسہ بھی بطور محصول ادا نہ کرتا ہو۔[1]

1853ء کی پارلیمانی تحقیقات کے بعد اس قسم کا غیر منصفانہ محصول ہندوستان کے کسی گوشے میں برقرار نہیں رہ سکتا تھا۔ چنانچہ اس کو منسوخ کر دیا گیا۔ ہندوستان کی حکومت ملکہ انگلستان کو منتقل ہونے کے بعد جو انکم ٹیکس لگایا گیا وہ زیادہ منصفانہ تھا۔ اس لیے کہ یہ محصول سب طبقوں پر لگایا گیا تھا اور آخر میں کم آمدنی والے اس سے مستثنیٰ قرار دے دیے گئے تھے۔

---

[1] ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کی چوتھی رپورٹ، 1853ء۔

باب 11

آب رسانی کے ذرائع اور ریلیں

شمالی ہندوستان کے مُسلمان حکمرانوں نے آبپاشی کے لیے جو بڑی بڑی نہریں بنائی تھیں اٹھارھویں صدی کی جنگوں کی بنا پر اُن کی مرمّت نہ ہو سکی۔ 1803ء میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے شمالی ہندوستان پر قبضہ و دخل حاصل کر لیا تو کمپنی کے ملازمین نے اُن کی طرف توجّہ دی۔ لارڈ منٹو کے زمانے میں ایک پیمائش کرنے والی کمیٹی (A Committee of Survey) 1810ء میں مقرر کی گئی۔ اس کے سپرد جمنا کے مشرق اور مغرب میں واقع قدیم نہروں کی تحقیقات کی گئی تھی لیکن چیف انجینئر اور سروے یر جنرل (Survey or General) میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا اور اُنھوں نے "سروے کی رپورٹ میں اتنی متضاد سفارشیں پیش کیں" کہ نہروں کی مرمّت کی پہلی اسکیم بے معنی ہو کر رہ گئی۔[1]

لارڈ ہیسٹنگز نے زیادہ عملی طریقہ اختیار کیا۔ اُس نے 1815ء میں بالائی ہندوستان کا دورہ کیا تھا۔ اس دورے کے بعد اُس نے جمنا کے مغرب میں واقع قدیم نہر کی مرمّت کی اسکیم کا ذکر نہایت اُمید افزا الفاظ میں کیا تھا۔

"میں اپنے مشاہدے کی بنا پر صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ اس مُفید نہر کی فوری مرمّت کی پالیسی اور اس کے لیے دی جانے والی سہولتوں کے متعلق مجھے پورا اطمینان ہو گیا ہے۔ اس امر سے قطع نظر کہ اس کی وجہ سے اس وسیع علاقے میں کاشت کی جائے گی جو اس وقت افتادہ پڑا ہوا ہے اور اس سے عزّت مآب کمپنی کی مالگزاری میں بڑا اضافہ ہو جائے گا، اس نہر کا پانی تقسیم کر کے جو آبپاشی

---

[1] مرجان کے، ایسٹ انڈیا کمپنی کا نظامِ نسق (Administration of East India Company) (1853) ص 238

کی رقم وصول کی جائے گی وہ بجائے خود ایک بڑی آمدنی ہوگی[1]"

چنانچہ لیفٹننٹ بلین (Lientenant Blain) نے جمنا کی مغربی نہر کی مرمّت کا کام شروع کر دیا اور نصف صدی کے بعد پھر دہلی تک پانی آنے لگا۔ لیکن اس کے بعد کام رُک گیا۔ 1823ء میں کرنل جان کالون دہلی کی آبپاشی کا جنرل سپرنٹنڈنٹ مقرر کیا گیا۔ اس کے زمانے میں کام تیزی کے ساتھ مکمل ہونے لگا۔ 1897ء کے عظیم قحط کے زمانے میں اس نہر کے پانی کی وجہ سے جو فصلیں بچائی جا سکیں ان کی مجموعی تخمینی قیمت ڈیڑھ ملین پونڈ بتائی جاتی ہے۔ یہ نہر 445 میل لمبی تھی[2]۔

اس کے بعد جمنا کی مشرقی نہر پر توجہ دی گئی۔ یہ نہر بھی مسلمان بادشاہوں نے تعمیر کی تھی۔ اس کی مرمّت کے سلسلے میں دو انگریز انجینئر کرنل رابرٹ اسمتھ اور کرنل بیرڈ اسمتھ نے بڑی شہرت حاصل کی۔ پہلے انجینئر رابرٹ اسمتھ نے 1830ء میں اصل نقشے کے مطابق نہر کو مکمل کر دیا لیکن اس میں بہت سی خامیاں تھیں اور بہت کام باقی تھا۔ کیپٹن کاٹلے (Captain Cautley) نے یہ خامیاں دُور کیں۔ رابرٹ بیرڈ اس کا جانشین تھا۔ ایک اور محکمے میں اس کے انتظامی کاموں کا ذکر ایک اگلے باب میں کیا جائے گا۔ اس نے نہر میں ضروری ترمیم اور اضافے کیے۔ 155 میل لمبی اس نہر کی تکمیل کا حال خود کرنل بیرڈ اسمتھ نے بڑے فخر کے ساتھ انڈین ریویو کے صفحات میں بیان کیا ہے۔

"چوڑی چکلی سڑک جو انگلستان کے سبزہ زاروں کی طرح ہموار ہے، پانی کے دھارے پر سایہ ڈالتی ہوئی دو رویہ درختوں کی قطاریں، دُور تک پھیلا ہوا مدریجی ڈھلان، کنارے کنارے زرخیز کھیتوں کی لہلہاتی ہوئی فصلیں، صاف ستھری چوکیاں اور اس کے تمام شعبوں پر دی جانے والی خصوصی توجہ ان باتوں نے نہر کے ہر حصّے کو بلاشبہ انتہائی خوبصورت بنا دیا ہے۔"

گنگا کی نہروں کی تاریخ کمپنی کے دَورِ حکومت کے آخری برسوں سے تعلق رکھتی ہے یہ اہم کام لارڈ آکلینڈ نے شروع کیا تھا لیکن بدقسمتی سے اس کے جانشین لارڈ ایلن برا نے اس کو مُلتوی کر دیا۔ لارڈ ہارڈنگ نے اس شاندار اسکیم کی اہمیت کو سمجھا اور اس کی منظوری دے دی۔ جمنا کے مشرقی اور مغربی نہروں کے مالی نتائج نے کورٹ آف ڈائرکٹرز کی ہمّت افزائی کی اور اس نے اس

---

[1] روداد مورخہ 21 ستمبر 1815ء۔

[2] ترقیاتی کاموں کی یادداشت (Memorandum of the Improvements)۔ ہاؤس آف کامنز کے حکم کی تعمیل میں پیش کیے جانے والے اعداد و شمار مورخہ 9 فروری 1858ء۔

اہم کام پر ایک ملین پونڈ خرچ کرنے کی اجازت دے دی۔ لیکن کام مکمل ہونے سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کا دورِ حکومت ختم ہو گیا۔ کمپنی کے زمانے میں جتنا کام ہو گیا تھا اس کا ذکر خود کمپنی کی یادداشت میں کیا گیا ہے۔

"گنگا کی نہروں اور ان کی شاخوں کی تکمیل کے بعد اُن کی مجموعی لمبائی ½899 میل ہو گی اور اُن سے ½4 ملین ایکڑ زمین کی بخوبی سینچائی کی جا سکے گی۔ شمال مغربی صوبجات کے لیفٹننٹ گورنر کے قول کے مطابق "یہ نہر آبپاشی کے ایسے نظام کی نمائندگی کرتی ہے جس کی وسعت کی نظیر دُنیا پیش نہیں کر سکتی۔ اس کی لمبائی اور چوڑائی نے، اس کے ساتھ ساتھ بننے والے اینٹ اور چُونے کے عظیم الشان اور نہایت مضبوط پُشتوں نے اور خاص طور سے رُڑکی اور ہردوار کے درمیان بننے والے پُشتوں نے اس کو قومی افتخار و امتیاز کی علامت بنا دیا ہے۔" یکم مئی 1856ء تک اس پر 15,60,000 پونڈ خرچ ہو چکے تھے۔ کام مکمل ہونے تک مجموعی اخراجات دو ملین پونڈ سے کم نہیں ہوں گے۔ نہرِ آبپاشی ابھی حال میں شروع ہوئی ہے۔ نہر کے ڈائریکٹر کرنل بیرڈ اسمتھ کا خیال ہے کہ جس زمین کی سینچائی اس نہر کے پانی سے ہو رہی ہے اس کی سالانہ پیداوار 50,000 سے لے کر 2,00,000 پونڈ تک کی مالیت کی ہونے لگی ہے اور نہر کے مکمل ہونے کے بعد پیداوار کی قیمت سات ملین پونڈ کی خطیر رقم تک پہنچ جائے گی۔ 30 اپریل 1856ء تک نہر اتنی بن چکی تھی کہ اصل نہر اور اس کی شاخوں میں ½449 میل تک پانی دوڑنے لگا تھا[1]

لارڈ ڈلہوزی نے 1849ء میں پنجاب پر قبضہ کیا تھا۔ اس زمانے میں پنجاب میں دو قسم کی نہریں ہوا کرتی تھیں یعنی سیلابی نہریں اور مستقل نہریں۔

"سیلابی نہریں دریاؤں میں کاٹ کر نکالی جاتی ہیں۔ چونکہ سردیوں میں دریاؤں میں پانی کم ہو جاتا ہے اور نہروں میں داخل نہیں ہو سکتا ہے اس لیے وہ سوکھی پڑی رہتی ہیں۔ موسم بہار میں برف پگھلنے کی وجہ سے جب دریاؤں میں پانی بڑھ جاتا ہے تو ان نہروں میں بھی پانی آنے لگتا ہے اور موسم خزاں تک آتا رہتا ہے۔ جنوب مشرقی پنجاب کی زرخیزی کا انحصار ان نہروں پر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں اس قسم کی نہریں تمام دریاؤں سے نکالی جاتی تھیں۔ نہ صرف گانوؤں کے کھنڈر بلکہ شہروں اور سرکاری عمارتوں کے آثار اُن کی نشاندہی کرتے ہیں جن کا دار و مدار نہروں

---

[1] ترقیاتی کاموں وغیرہ کی یادداشت (Memorandum of Improvements) 1858ء۔

کی لائی ہوئی علاقے کی زرخیزی پر ہوا کرتا تھا۔ پنجاب کے الحاق کے وقت جو نہریں کارآمد تھیں اُنھیں برقرار رکھا گیا اور ترقی و توسیع دی گئی۔ دوسری نہروں کی مرمّت کا منصوبہ و تخمینہ تیار کیا جاچکا ہے۔ لیکن ان نہروں پر جو روپیہ خرچ ہوتا تھا اس کا بڑا حصّہ مستقل نہروں کی تعمیر و ترقی پر خرچ کیا جاچکا ہے[1]۔"

ایسٹ انڈیا کمپنی نے پنجاب میں صرف ایک اہم مُستقل نہر تعمیر کی یعنی باری دوآب نہر جو تقریباً 450 میل لمبی تھی۔ اس شاندار نہر کے لیے ہندوستان جان لارنس اور لارڈ ڈلہوزی کا ممنون احسان ہے۔ جان لارنس سڑکیں اور نہریں تعمیر کرنے کے لیے حکومتِ ہند پر برابر زور ڈالتا رہا۔ اس کا کہنا تھا کہ ان پر خرچ ہونے والی رقم سے دس گُنا زیادہ رقم مالگزاری کی شکل میں وصول ہو جائے گی۔ لاہور بورڈ نے لکھا تھا "اگر ہم ان لاکھوں انسانوں کو غذا فراہم کرنا چاہتے ہیں جو حکومت کی تبدیلی کی بنا پر بے روزگار ہو گئے ہیں تو اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم نئی نہریں تعمیر کریں اور پُرانی نہروں کی مرمّت کریں[2]۔" لارڈ ڈلہوزی نے لکھا تھا "ہر جگہ میں نے اس قسم کے بڑے بڑے علاقے دیکھے ہیں جو زرخیز ہونے کے باوجود بنجر پڑے ہیں۔ اگر انھیں پانی مل سکے تو نہایت اُپجاؤ کاشت میں تبدیل ہو سکتے ہیں[3]۔" کورٹ آف ڈائرکٹرز نے انھیں "اس کام کے لیے بخوشی اجازت دی" یعنی باری دوآب نہریں بنانے کی منظوری حاصل ہو گئی۔ لیکن کورٹ نے انھیں متنبہ بھی کیا تھا کہ اس کام پر "ضرورت سے زیادہ روپیہ صرف نہ کیا جائے[4]۔"

شمالی ہندوستان میں آبپاشی کا سب سے ممتاز ماہر بیرڈ اسمتھ سمجھا جاتا تھا۔ وہ جب طویل چھٹی پر یورپ گیا تو موقع سے فائدہ اُٹھا کر اُس نے اٹلی کا سفر کیا تاکہ لمبارڈی اور پیڈمانٹ کی نہروں کا معائنہ کر سکے۔ اس کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے خرچ پر اس نے ریاستہائے متحدہ کا علمی دورہ کیا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ باری دوآب نہر کی تعمیر کا کام تیزی سے ہوتا رہا۔ مئی 1856ء تک 325 میل لمبی کُھدائی کی جاچکی تھی اور خیال تھا 1859ء میں نہر مکمّل ہو جائے گی۔ اس پر ہونے والے

---

[1] ترقیاتی کاموں وغیرہ کی یادداشت (Memorandum of Improvements)، 1858ء۔

[2] لاہور بورڈ کا خط مرکزی حکومت کے نام مورخہ 28/نومبر 1850ء۔

[3] روداد مورخہ 6/دسمبر 1850ء۔

[4] کورٹ آف ڈائرکٹرز کا مراسلہ گورنر جنرل کے نام مورخہ 25/اپریل 1851ء۔

خرچ کا تخمینہ ایک ملین پونڈ لگایا گیا تھا اور توقع تھی اس نہر سے 20,000 پونڈ سالانہ یا لاگت پر 12 فیصدی کا منافع ہوگا۔[1]

بمبئی کے صوبے میں نربدا اور تاپتی کے علاوہ کوئی اور بڑے دریا نہیں ہیں۔ اُن سے صرف کچھ ضلعوں میں آبپاشی ہوسکتی ہے۔ دکن کی سطح مرتفع پر نہروں سے آبپاشی کا امکان کم ہے اور کمپنی کے ملازمین نے کنوؤں اور پانی کے ذخیروں کے ذریعے آبپاشی پر کافی توجہ نہیں دی تھی سندھ میں آبپاشی کا انحصار دریائے سندھ کے پانی کی سطح پر تھا جس کا پانی بہت سی قدیم نہروں کے ذریعے تقسیم کیا جاتا تھا اور کمپنی ان نہروں کی مرمت پر ہر سال 25,000 پونڈ خرچ کیا کرتی تھی۔

مدراس میں پانی کے ذخیروں کے بہت سے آثار پائے جاتے تھے جو قدیم راجاؤں اور پیلی گروں نے تعمیر کیے تھے۔ ڈاکٹر بکانن نے 1800ء میں مدراس سے مغربی ساحل کو جاتے ہوئے انھیں دیکھا تھا اور ان کا حال بیان کیا تھا۔[2] اگر آبپاشی کے پُرانے ذرائع کی مرمت اور دیکھ بھال کی جاتی اور جہاں ضرورت محسوس کی جاتی وہاں نئے ذرائع تعمیر کیے جاتے تو پچاس یا ساٹھ سال میں مُلک کی حالت بدل جاتی اور کمپنی جس وقت جنوبی صوبے ملکہ کو منتقل کرتی تو وہاں کی زراعت کا تحفظ ہو چُکا ہوتا اور لوگ قحطوں سے محفوظ ہوتے لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ آب رسانی کے ذرائع کو نظرانداز کیا گیا ہے۔ اگر کوئی کلکٹر پانی کے کسی قدیم ذخیرے کی مرمت کرنے پر آمادہ بھی ہوتا تھا تو اس کا مقصد ضلع کی اس مالگزاری میں اضافہ کرنا ہوتا تھا جو پہلے ہی بہت زیادہ تھی۔

لیکن مدراس کے صوبے کے کچھ خطے ایسے بھی ہیں جہاں بڑے پیمانے پر نہروں سے آبپاشی کی

---

[1] ترقیاتی کاموں وغیرہ کی یادداشت (Memorandum of Improvements) 1858ء

[2] ہندوستان کے ہر صوبے میں آبپاشی کے مختلف طریقے ہوتے ہیں۔ گنگا اور سندھ کی وادیوں میں آبپاشی کا سب سے موزوں ذریعہ وہ نہریں ہیں جو اُن دریاؤں سے نکالی جاتی ہیں۔ دریاؤں سے فاصلے پر کنویں کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ بنگال میں جہاں بہت زیادہ بارش ہوتی ہے۔ اُتھلے تالاب بہت مفید ثابت ہوتے ہیں اور پُرانے زمانے میں اس قسم کے تالاب بڑی تعداد میں پائے جاتے تھے جن میں سے کچھ بہت بڑے تھے۔ مدراس اور جنوبی ہند میں زمین ہموار ہوتی ہے اور زیرِ زمین چٹانیں پانی محفوظ کر لیتی ہیں۔ وہاں کے لیے سب سے موزوں آبپاشی کے ذریعے پانی کے ذخیرے ہوتے ہیں جو بڑے بڑے پُشتے تعمیر کرکے اور پہاڑوں سے آنے

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

جاسکتی ہے اور یہ خطے گوداوری، کرشنا اور کاویری کے ڈیلٹے ہیں۔ اصحاب فکر نے اُنیسویں صدی کے شروع ہی میں ان دریاؤں کے ذریعے ان کے ڈیلٹوں کی سینچائی کے امکانات کو سمجھ لیا تھا جس طرح بیرڈ اسمتھ اور اس کے ساتھیوں کا نام شمالی ہندوستان کی نہروں سے منسوب ہے اسی طرح سر آرتھر کاٹن کا نام جنوب کی اہم نہروں کے ساتھ ہمیشہ منسوب رہے گا۔

کاویری کا ایک معاون دریا کولیرون ہے اور کولیرون کے قدیم آبپاشی کے ذرائع دوسری صدی عیسوی میں ہندوؤں نے تعمیر کیے تھے۔ 1801ء میں جب وہ علاقہ انگریزوں کے قبضے میں آیا تو اُن میں بہت سے نقص دریافت ہوتے۔ مٹی جمنے سے دریا کی سطح اُونچی ہو گئی تھی اس لیے کم علاقے کی سینچائی ہو سکتی تھی۔ شمالی ہندوستان میں جمنا کی نہر کے سلسلے میں جو کامیابی حاصل ہوئی تھی اس نے جنوب میں کولیرون کے ذرائع آبپاشی کو بہتر بنانے کی ترغیب دی اور 1836ء کے بعد سے باضابطہ طور سے تیزی کے ساتھ کام ہونے لگا۔ کولیرون کے بالائی اور زیریں ذرائع آبپاشی پر ہونے والا مجموعی خرچ 80,000 پونڈ سے کچھ زیادہ تھا اور ایک لاکھ پونڈ کی مزید رقم تنجور کے ضلع اور ترچناپلی اور جنوبی آرکاٹ کے کچھ حصّوں میں پانی لے جانے کے لیے نہریں بنانے پر صَرف ہوئی۔ کولیرون اور کاویری سے 6,30,000 ایکڑ کے بجائے 7,16,000 ایکڑ کی سینچائی ہونے لگی اور مالگزاری میں بقدر 44,000 پونڈ اضافہ ہو گیا۔ گویا کہ لاگت پر 24 فیصدی کا منافع ہونے لگا۔

اس کام کے منافع بخش نتائج کو ایسٹ انڈیا کمپنی اپنا کارنامہ سمجھتی تھی۔ حالانکہ یہ کارنامہ سر آرتھر کاٹن کا تھا جس نے سب سے پہلے اس کی اہمیت کو سمجھا اور مخالفت کے باوجود کولیرون کے بالائی بند کی تعمیر کا کام شروع کر دیا۔ سر آرتھر کاٹن 1803ء میں پیدا ہوا تھا اور 1821ء میں مدراس آیا تھا۔ 1860ء میں ملازمت سے سُبکدوش ہونے سے پہلے اس نے ہندوستان کے تمام انجینئروں سے زیادہ شہرت حاصل کر لی تھی۔ شمالی ہندوستان کے آبپاشی کے ماہر بیرڈ اسمتھ نے لکھا تھا "تنجور کی دائمی خوشحالی بلاشبہ اور بڑی حد تک کرنل کاٹن کے اس جرأت مندانہ اقدام کا

(ص ــــ سے آگے)

والے پانی کو روک کر بنائے جاتے ہیں۔ مدراس کے زیادہ تر قدیم ذخیرے اسی طرح بنائے گئے تھے۔ دیکھیے وولکر، ہندوستانی زراعت کی ترقی، (Improvement of Indian Agriculture)، 1883ء۔

نتیجہ ہے جو اُس نے کولیرون کے بالائی بند کی تعمیر کے سلسلے میں سخت دُشوار حالات، اپنے محدود ذرائع اور انتہائی مخالفت کے باوجود اُٹھایا اور اتنی بڑی ذمّہ داری قبول کرلی۔"[1]

کولیرون کے بند کی بنا پر آرتھر کاٹن نے اتنی شُہرت حاصل کرلی تھی کہ گوداوری کے بند کے لیے بھی اُس کا انتخاب کیا گیا جس کی بنا پر اُس نے خاص طور سے شُہرت پائی۔ اس نے قدیم ہندو دارالسلطنت راجہ مندری سے کچھ میل دُور ایک جگہ کا انتخاب کیا اور دریا کے دو تیز بہاؤں سے فائدہ اُٹھا کر اپنا شاندار بند چار حصّوں میں تعمیر کیا۔ تخمینے کے مطابق اس پر کُل 2,64,000 پونڈ خرچ ہونے والے تھے لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی اس کو منافع بخش کام سمجھتی تھی اور اُس کا خیال تھا کہ مالگزاری میں 3,00,000 پونڈ یا 100 فیصدی سالانہ کا اضافہ ہو جائے گا۔[2]

صرف کرشنا دریا باقی رہ گیا تھا۔ اس پر 1863ء میں بند باندھنا شروع کیا گیا۔ ابتدا میں خرچ کا تخمینہ 1,55000 پونڈ لگایا گیا تھا اور خیال تھا کہ مالگزاری میں 60,000 پونڈ کا اضافہ ہوگا یا لاگت پر

---

[1] جنرل سر آرتھر کاٹن، اس کی سوانح اور کارنامے (General Sir Arthur Cotton, his life and work) اس کی بیٹی لیڈی ہوپ کی تصنیف (لندن) 1900ء۔ ص 52۔

[2] ترقیاتی کاموں وغیرہ کی یادداشت (Memorandum on the Improvements)، 1068ء۔ اس بند میں توسیع کی گئی اور آخر میں خرچ کا تخمینہ بڑھ گیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے بعد قائم ہونے والی ملکہ انگلستان کی حکومت آب رسانی کے اس منافع بخش اور مفید کام پر روپیہ خرچ کرنے کو تیار نہیں تھی حالانکہ ریلوں کی تعمیر پر انھوں نے بہت روپیہ برباد کیا۔ 1878ء کی سلیکٹ کمیٹی کے سامنے جب سر آرتھر کاٹن کی شہادت ہوئی تو اس نے اس بات کا ذِکر کیا تھا۔

"اُن سے 7,00,000 پونڈ حاصل کرنے کے لیے بتّیس سال صرف کرنے پڑے یعنی اُس کام کے لیے 20,000 پونڈ سالانہ جو ابتدا سے نہایت کامیاب ثابت ہوا تھا.... جھگڑا صرف اس بات پر ہے کہ اس رقم پر 27 فیصدی، 28 فیصدی یا 40 فیصدی منافع ہوا اور بتّیس سال گزرنے کے بعد ایک ملین ایکڑ کے بجائے صرف سات لاکھ ایکڑ کی سینچائی.... اس دوران ناگپور کو جانے والی 60 میل کی ریل پر 5,00,000 پونڈ خرچ کرنے میں کوئی پس و پیش نہیں کیا گیا حالانکہ سب کو معلوم تھا کہ ان پر 4 فیصدی سے زیادہ منافع نہیں ہوگا۔" جنرل سر آرتھر کاٹن، سوانح اور کارنامے (General Sir Arthur Cotton his life and work) از لیڈی ہوپ، ص 276۔

39 فیصدی سالانہ آمدنی ہو گی۔ 1858ء میں ختم ہونے سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی نے آب رسانی کے جو خاص خاص ذرائع تعمیر کیے تھے وہ یہ تھے۔ ان پر بہت روپیہ خرچ ہوا تھا اور کمپنی بجا طور پر پانی پر مناسب محصول لگا کر اُن سے فائدہ حاصل کرنے کا دعویٰ کر سکتی تھی۔ لیکن مندرجہ بالا اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ کمپنی نے اس پر اکتفا نہیں کیا۔ اس کا اطلاق خاص طور سے مدراس کے ظلمت زدہ صوبے پر ہوتا ہے۔ اس نے مالگزاری میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کیا جس کی بنا پر بدقسمت کسان ویسے ہی غریب رہے جیسے پہلے تھے۔ اگر کوئی زمیندار اپنے کسانوں کے ساتھ اس قسم کا برتاؤ کرتا تو اس کو سمجھداری اور انصاف پر مبنی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ایک ایسی حکومت کے لیے تو یہ طریقہ اور بھی غیر منصفانہ اور احمقانہ تھا جو کسانوں کی کثیر آبادی رکھنے والے ایک بڑے ملک پر حکومت کرتی تھی۔ ایک روشن خیال حکومت کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ لوگوں کی دولت میں اضافہ ہو اور وہ سرمایہ پس انداز کر سکیں۔

ہندوستان میں ریلوں کی تاریخ کی نوعیت آب رسانی کے کاموں کی تاریخ سے مختلف ہے۔ شروع سے آب رسانی کے ذرائع سے منافع بلکہ ضرورت سے زیادہ منافع ہوا کرتا تھا۔ لیکن ریلوں کی لاگت پر مناسب منافع نہیں ہوتا تھا۔ آب رسانی کے ذرائع سے حکومت کو مالی فائدہ ہوتا تھا لیکن ریلوں کی وجہ سے حکومت کو ہر سال نقصان اُٹھانا پڑتا تھا۔ آب رسانی کے ذرائع سے فصلیں محفوظ رہتی تھیں، پیداوار میں اضافہ ہوتا تھا اور بارش کم ہونے کی صورت میں قحطوں سے بچا جا سکتا تھا۔ ریلیں قحط کے زمانے میں متاثرہ علاقوں تک غذائی اجناس پہنچا سکتی تھیں لیکن زمین کی پیداوار میں اضافہ نہیں کر سکتی تھیں۔

ان حالات میں ہر شخص توقع کرے گا کہ ہندوستان کی طرح کے ایک زرعی ملک کی حکومت ریلوں کے بجائے آب رسانی کے ذرائع پر زیادہ توجہ دے گی۔ لیکن انگریز اپنے ملک میں نہروں کے مقابلے میں ریلوں سے زیادہ واقف تھے۔ انھوں نے غلطی یہ کی کہ ہندوستان کی ضرورتوں کو انگلستان کی ضرورتوں کے مطابق سمجھا۔ انگریز صنعت کاروں کا خیال تھا کہ نہروں کے مقابلے میں ریلیں ہندوستان کی داخلی منڈیوں تک جلدی پہنچنے کا ذریعہ بن جائیں گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور ملکہ دونوں کے زمانہ حکومت میں پارلیمنٹ ملک کی آمدنی کے کم ہو جانے کا خطرہ مول لینے کو تیار ہو گئی اور ریلوں کی توسیع پر زور دینے لگی۔ چونکہ ہندوستان کے لوگ نہ ووٹ دے سکتے تھے اور نہ حکومت میں انھیں نمائندگی حاصل تھی اس لیے وہ کسی قسم کا کوئی زور نہیں ڈال سکے۔ اس لیے آب رسانی کے ذرائع نسبتاً نظرانداز کیے گئے اور ملک کی ضرورت اور وسائل سے زیادہ ریلوں کی توسیع کی گئی۔

1845ء میں دو نجی کمپنیاں بنائی گئیں جن میں سے ایک کا نام ایسٹ انڈین ریلوے کمپنی تھا اور دوسری کا گریٹ انڈین پیننی شولر ریلوے کمپنی۔ لیکن کمپنیاں بنانے والوں کو معلوم ہوا کہ حکومت کی مدد کے بغیر ضروری سرمایہ جمع کرنا ممکن نہیں۔ بہت بحث و مباحثہ کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں نے ریلوں کے سرمائے پر سود کی ضمانت کی صورت میں مدد دینا قبول کر لیا۔ معاہدے کی شرطیں تھیں کہ ریلوں کی تعمیر پر صرف ہونے والے سرمائے پر خالص منافع اگر 5 فیصدی سے کم ہوا تو حکومتِ ہند اس کمی کو ہندوستان کی سرکاری آمدنی سے پورا کر دے گی۔ لیکن ریلوں کا خالص منافع اگر 5 فیصدی سے زیادہ ہوا تو 5 فیصدی سے زیادہ رقم کا نصف حصّہ ریل کی کمپنیوں کو ملے گا اور نصف حکومتِ ہند کو۔ مثلاً تعمیر پر ہونے والے سرمائے پر اگر 4 فیصدی منافع ہوا تو حکومتِ ہند ضمانت شُدہ شرحِ سود کو پورا کرنے کے لیے ایک فیصدی ادا کرے گی۔ لیکن ریلوں سے اگر 7 فیصدی منافع ہوا تو ریلوے کمپنی کے حصّے دار 6 فیصدی لیں گے اور ایک فیصدی حکومتِ ہند کو ادا کیا جائے گا۔ ریلوں کا انتظام ریل کی کمپنی کے ہاتھ میں تھا[1]

معاہدے کی ایک شرط یہ تھی کہ ریل کمپنیاں چھ مہینے کا نوٹس دے کر ریلوں سے دست بردار ہو سکیں گی اور حکومت کو ان کی تعمیر پر صرف ہونے والا سرمایہ واپس کرنا ہوگا۔ حکومت کو اختیار دیا گیا تھا کہ بالترتیب پچیس اور پچاس سال گزرنے کے بعد حصّوں کی بازاری قیمت ادا کر کے ریلیں خرید سکے گی۔ آخری شرط یہ تھی کہ ننانوے سال گزرنے کے بعد تمام عمارتیں وغیرہ حکومت کی ملکیت ہو جائیں گی اور انجن اور ڈبّے وغیرہ وہ قیمت ادا کر کے خرید سکے گی[2]

ایسٹ انڈین ریلوے —— 1854ء میں صرف $37\frac{1}{2}$ میل پٹری بچھی تھی جس پر ریلیں چلتی تھیں۔ 1855ء میں 121 میل یعنی کلکتہ سے رانی گنج تک اور ریل چلنے لگی۔ اس کے بعد لارڈ ڈلہوزی نے ہندوستان میں عام طریقے سے ٹرنک لائنیں پھیلانے کی ایک اسکیم بنائی۔ ایک اور معاہدہ کیا گیا جس کی رو سے وہی ریل کمپنی دہلی تک ریلوے لائن تعمیر کرنے کے لیے تیار ہو گئی اور ریل کی اس توسیع پر خرچ ہونے والے سرمائے کی حد تک $4\frac{1}{2}$ فیصدی ضمانت شُدہ سود منظور کر لیا۔ لیکن اس

---

[1] سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کو جولینڈ ڈینورس (Juland Danvers) کی رپورٹ، مورخہ 12/مارچ 1860ء، پیراگراف 4۔

[2] ایضاً۔

لائن پر ابھی ریلیں چل نہ پائی تھیں کہ غدر ہو گیا اور غدر کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ختم ہو گئی۔

گریٹ انڈین پینن شولر ریلوے ـــ 1854ء میں بمبئی سے کلیان تک کی 37 میل لمبی لائن مکمل ہو گئی تھی۔ اسی سال نومبر میں اس کمپنی نے خرچ ہونے والے سرمایے پر کم سے کم ½4 فیصدی سود قبول کر لیا اور لائن کی توسیع کرنے کو آمادہ ہو گئی۔ لیکن جب کمپنی کے حصّے فروخت کیے جاتے تھے تو سود کی شرح بڑھا کر 5 فیصدی کر دی جاتی تھی۔ 1857ء کے غدر سے پہلے 54 میل کا اضافہ کیا جا چکا تھا۔

مدراس ریلوے ـــ اس لائن کا پہلا حصّہ یعنی مدراس سے آرکاٹ تک کی 65 میل کی لائن جولائی 1856ء میں تیار ہو گئی تھی اور اس پر ریلیں چلنے لگی تھیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دورِ حکومت میں اس میں کوئی توسیع نہ ہو سکی۔ تین مندرجہ بالا ریلوے لائنوں کے علاوہ نومبر 1858ء سے پہلے، جب کمپنی کی حکومت ملکہ انگلستان کو منتقل ہوئی تھی کوئی اور ریلوے لائن تعمیر نہیں ہو پائی تھی۔

مندرجہ بالا تینوں ریلوے لائنوں میں نقصان ہو رہا تھا۔ حکومتِ ہند کو ضمانت شدہ سود کی رقم پوری کرنے کے لیے سال بہ سال جو ادائیگیاں ریل کمپنیوں کو کرنی پڑیں وہ اگلے صفحے پر دکھائی گئی ہیں[1]

ریلوں کی سال بہ سال توسیع کے بعد ہندوستان کے لوگوں کا نقصان بھی بڑھتا رہا لیکن سود کی ضمانت کی وجہ سے ریل کمپنیاں منافع کماتی رہیں اور ہندوستان کے دوسرے حصّوں میں ریلیں تعمیر کرنے کے لیے نئی کمپنیاں وجود میں آ گئیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا زمانہ حکومت ختم ہونے سے پہلے سندھ ریلوے کمپنی، جس کے دائرہ عمل میں پنجاب بھی شامل تھا، بمبے، بڑودہ اینڈ سنٹرل انڈیا ریلوے کمپنی، ایسٹرن بنگال ریلوے کمپنی، گریٹ ساؤتھ آف انڈیا ریلوے کمپنی اور کلکتہ اینڈ ساؤتھ ایسٹرن ریلوے کمپنی بن چکی تھیں لیکن ان لائنوں پر ریلوں کا آنا جانا شروع نہیں ہوا تھا۔

---

[1] جوائنٹ ڈسپیچ 1860ء پیراگراف 32، 84 اور 60۔

وہ رقمیں جو حکومت کو سود کی ضمانت کی بنا پر ادا کرنی پڑیں

سال	ایسٹ انڈین ریلوے پونڈ	گریٹ انڈین پنن شولر ریلوے پونڈ	مدراس ریلوے پونڈ
1849ء	5,602	00	00
1850ء	17,471	3,063	00
1851ء	37,185	6,319	00
1852ء	45,234	16,310	00
1853ء	52,071	22,825	00
1854ء	88,884	25,002	9,703
1855ء	1,95,730	30,259	18,115
1856ء	2,97,390	60,370	42,510
1857ء	3,54,511	1,16,612	81,1.39
1858ء	4,33,968	1,75,289	1,09,267
کل میزان	15,28,046	4,56,049	2,60,734

یہ تاخیر برطانوی صنعت کاروں اور تاجروں کی ناراضگی کا باعث ہوئی اور 1858ء میں ہاؤس آف کامنز کی ایک کمیٹی مقرر کی گئی تاکہ "ان وجوہ کی تحقیقات کی جائے جن کی بنا پر تاخیر ہوئی"۔ کمیٹی نے تحقیقات کے بعد اپنی رپورٹ میں کہا کہ حکومت کی نگرانی، ہندوستان سے انگلستان کے فاصلے، غدر اور اس ملک میں پائی جانے والی قدرتی دشواریوں کی بنا پر تاخیر ہوئی ہے۔ کمیٹی نے مزید کہا کہ

"پہلی بات یہ کہ حکومت نے مفاد عامہ کے اس اہم کام کی ذمہ داری نجی کاروباری اداروں کو سونپنے میں بڑی سمجھ داری کا مظاہرہ کیا ہے۔

"دوسری بات یہ کہ ضروری سرمائے پر ضمانت شدہ سود کی شرط کے بغیر اس نئے اور بڑے کام میں روپیہ لگانے پر لوگوں کو آمادہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔"

"تیسری بات یہ کہ ہندوستان کی قومی آمدنی کو فضول خرچی سے محفوظ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ریلوں پر حکومت کو اختیار حاصل ہو۔ اس سے خود حصہ داروں کو بھی فائدہ پہنچے گا۔"

یہ بات سمجھنا دشوار نہیں ہونی چاہیے کہ کمیٹی میں اگر ہندوستان کے نمائندے شامل ہوتے یا کمیٹی نے زیادہ ہندوستانیوں کی شہادت قلمبند کی ہوتی تو اس کی رائے مختلف ہوتی۔ غالباً وہ یہ سفارش کرتی کہ ہندوستان کی قومی آمدنی کو اصراف بیجا سے بچانے کے لیے ان ریلوں کے علاوہ جو سیاسی اعتبار سے ضروری ہوں کوئی ریل ضمانت شدہ سود کی شرط پر تعمیر نہ کی جائے اور تمام دوسری ریلوں کی تعمیر کا کام نجی کاروباری طبقے پر چھوڑ دیا جائے۔ غالباً وہ یہ بھی سفارش کرتی کہ ہندوستان کے لیے نہریں زیادہ ضروری ہیں۔ ان کو لوگ نقل و حمل کے ایک کم خرچ ذریعے کے طور پر بھی استعمال کر سکتے ہیں اور وہ قلت اور قحطوں کے زمانوں میں ان کا تحفظ بھی کر سکتی ہیں۔

باب 12

نظم ونسق

کمپنی کا چارٹر جس کی تجدید 1834ء میں ہوئی تھی 1854ء میں ختم ہونے والا تھا۔ تجدید تو زیر غور تھی اور حسب معمول کمپنی کے گذشتہ نظم ونسق کے متعلق تحقیقات کرنے کے لیے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کی سلیکٹ کمیٹیاں مقرر کی گئیں۔ ان کمیٹیوں کے سامنے گواہوں نے جو بیانات دیے وہ نیلی کتابوں (پارلیمنٹ کی رپورٹوں) کی شکل میں شائع کر دیے گئے تھے۔ ملکہ وکٹوریہ کے دورِ حکومت کے ابتدائی زمانے کی تاریخ کے لیے یہ رپورٹیں بیش بہا مواد فراہم کرتی ہیں۔

اسی طرح ہاؤس آف کامنز کی ایک سلیکٹ کمیٹی کا اجلاس 1852ء میں ہوا۔ اس میں چانسلر آف اکسچیکر (وزیر خزانہ) لارڈ جان رسل، سر چارلس وُڈ، کابڈن، گلیڈسٹن اور دوسرے ارکین شامل تھے۔ اس کمیٹی نے لارڈ الفنسٹن، لارڈ ایلن برا، لارڈ ہارڈنگ، سر جارج کلارک، کاس مو میلول (Cosmo Melvill)، ہنری تھابی پرنسیپ (Henry Thoby Prinsep) اور دوسرے گواہوں کے بیانات سُنے اور جون 1852ء میں اپنی رپورٹ پیش کر دی۔ 53-1852ء کے اجلاس میں ہاؤس آف کامنز کی ایک سلیکٹ کمیٹی مقرر کی گئی جس میں مندرجہ بالا اشخاص کے علاوہ میکالے، لارڈ اسٹینلی اور پارسٹن بھی شامل تھے۔ اس کمیٹی نے سر جارج کلارک، سر ایڈورڈ ری آن (Sir Edward Ryan)، سر ارسکن پیری (Sir Erskine Perry)، سر چارلس ٹریولین، فریڈرک ہالی ڈے، جے کیرون، مر ٹنس برڈ، ڈاکٹر رائل، جان سیلسون، جان مارش مین اور دوسرے گواہوں کے بیانات قلمبند کیے اور مئی اور اگست 1853ء کی درمیانی مدت میں چھ رپورٹیں پیش کیں۔

اس باب میں اتنی گنجائش نہیں کہ ہم ان بیانات کی تلخیص پیش کر سکیں جن کو ایسی گیارہ

رپورٹوں کی شکل میں پارلیمنٹ کے سامنے لایا گیا تھا جو چار ہزار مطبوعہ صفحات پر مشتمل تھیں۔ ہم زیادہ سے زیادہ اتنا کرسکتے ہیں کہ اس زمانے کے اہم ترین واقعات کے متعلق اہم ترین اشخاص کی رائے قارئین کے سامنے پیش کر دیں۔ اس سے بڑا فائدہ ہوگا اگر وکٹوریہ کے زمانہ حکومت کے ابتدائی دنوں میں ہندوستان کے نظم و نسق پر تبصرہ کرتے وقت ہم ان لوگوں کی رائے سے فائدہ اُٹھائیں جنھوں نے اس میں حصّہ لیا تھا۔ اس سے نہ صرف اتنا فائدہ ہوگا کہ ہم اس طریقے کو سمجھ سکیں گے جن پر عمل کیا گیا بلکہ ہمیں یہ بھی معلوم ہوسکے گا کہ وہ طریقہ کس حد تک کامیاب ہوا۔ ہم نہ صرف اُن ضابطوں سے واقف ہوسکیں گے جو حکّام کی رہنمائی کیا کرتے تھے بلکہ ان لوگوں کے بیانوں میں نظم و نسق کی تصویر دیکھ سکیں گے جنھوں نے اپنی زندگی کے بیس، تیس یا چالیس سال سلطنتِ ہند کی کثیرآبادی کے درمیان کام کرتے ہوئے گزارے تھے۔

دوعملی حکومت

1784ء کے پٹ کے انڈیا ایکٹ کی پیروی کرتے ہوئے، 1834ء کے انڈیا ایکٹ نے ہندوستان میں دوعملی حکومت قائم کر دی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے چوبیس ڈائرکٹروں کے ہاتھوں میں تمام انتظامی اختیارات تھے لیکن نگرانی کے اختیارات بورڈ آف کنٹرول کو سونپ دیے گئے تھے جس کو شاہ انگلستان مقرر کرتا تھا۔ کمپنی آئندہ تجارت نہیں کرسکتی تھی اور 1834ء کے بعد اس کی حیثیت محض ہندوستان کے حکمرانوں کی تھی۔ یہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ ان ملازمین اور حکّام کے تقرر کے علاوہ جن کا ذکر ایکٹ میں ہے کمپنی کے ڈائرکٹروں کے تمام کاموں پر بورڈ کو نگرانی کا اختیار حاصل ہوگا۔ ہر کام کی ابتدا کورٹ آف ڈائرکٹرز کرتا تھا لیکن اس پر اختیار بورڈ آف کنٹرول کو حاصل ہوتا تھا۔ کام میں آسانی پیدا کرنے کے لیے چوبیس ڈائرکٹر تین کمیٹیوں میں منقسم ہوگئے تھے یعنی مالیاتی کمیٹی، فوجی اور سیاسی اُمور کی کمیٹی اور مالگزاری اور عدالتی اُمور کی کمیٹی[1]

لیکن ایک اہم معاملہ ایسا بھی تھا جس کی ابتدا کرنے کا اختیار کورٹ آف ڈائرکٹرز کو حاصل نہیں تھا۔ بورڈ آف کنٹرول ڈائرکٹرز سے مشورہ کیے بغیر اعلان جنگ یا صلح کرسکتا تھا۔ ان معاملات میں وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ایک سیلکٹ کمیٹی کی وساطت سے کام کرتا تھا۔ "سیاسی نوعیت کے تمام

---

[1] کاس سومیلول کا بیان، ہاؤس آف کامنز کی سیلکٹ کمیٹی کی رپورٹ، 1852ء۔

اہم کاموں کے متعلق کہا جا سکتا ہے، جن میں اعلانِ جنگ اور صلحنامے بھی شامل ہیں، کہ وہ شاہی وزیر کی ہدایتوں کے مطابق کیے جاتے ہیں جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی خفیہ کمیٹی کے توسط سے ہندوستان کے افسر اعلیٰ سے رابطہ قایم کرتا ہے۔ یہ خفیہ کمیٹی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں کے تابع نہیں ہے اور اُسے کام کرنے کی آزادی حاصل ہے۔[1]"

چنانچہ بارہا ایسا ہوا کہ کورٹ آف ڈائرکٹرز کے علم میں لائے بغیر بورڈ آف کنٹرول کے صدر نے، جو برطانوی کابینہ کا رکن ہوا کرتا تھا، ہندوستان کو جنگوں میں اُلجھا دیا۔ "اگر ان معاملات میں کورٹ آف ڈائرکٹرز کو کوئی اختیار حاصل ہوتا تو افغانستان کے خلاف لارڈ آکلینڈ کی جنگ" غالباً نہ ہوتی جس میں 15,000 انسانی جانیں تلف ہوئیں اور کئی ملین روپیہ خرچ ہوا۔" "کورٹ آف ڈائرکٹرز کو برما کی جنگ کی ابتدا، اس کے مختلف مراحل اور موجودہ صورتِ حال کے متعلق کوئی علم نہیں ہے۔ میں نے دو دفعہ متعلقہ کاغذات طلب کیے۔ لیکن مجھے بتایا گیا کہ کورٹ کو اُن کاغذات کا بھیجنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔[2]"

یہ بتانا ضروری نہیں ہے کہ اس ناقص انتظام کی بنا پر لارڈ پامرسٹن کی قسم کے سامراج نواز برطانوی وزیر انگلستان کے سامراجی مفاد میں لڑی جانے والی جنگوں اور فوجی مہموں میں ہندوستان کو اُلجھا سکتے تھے اور اُنھوں نے اُلجھایا۔ کورٹ آف ڈائرکٹرز کو ان جنگوں کے لیے جو ان کی مرضی یا علم کے بغیر لڑی جاتی تھیں، روپیہ فراہم کرنا ہوتا تھا۔ کورٹ آف ڈائرکٹرز نے بھی بہت سی غلطیاں کی ہیں۔ اس نے ہندوستان کے ایک قدیم قانون کی غلط تشریح کر کے بہت سی دیسی ریاستوں کا الحاق کیا اور اس طرح اپنی قبر آپ کھود لی۔ لیکن انصاف کا تقاضہ ہے کہ ہم کورٹ کو وکٹوریہ کے دَورِ حکومت کے ابتدائی دنوں کی بدترین جنگوں یعنی افغانستان کی جنگ، سندھ کی جنگ اور برما کی جنگ کے سلسلے میں بری الذمہ قرار دیں۔

حکومت کے آئین میں یہ نقص تو ضرور تھا مگر نظم و نسق کی حد تک دوعملی کا طریقہ کامیاب ثابت ہوا۔ اس نے ایک طرف تو کمپنی کے ڈائرکٹروں کو ضروری حد تک قابو میں رکھا دوسری طرف

---

[1] کرنل سائیکس کا بیان جو خود ایسٹ انڈیا کمپنی کا ڈائرکٹر تھا، ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ، 1852ء۔

[2] سر ٹی۔ ایچ۔ مینڈک کا بیان، ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ، 1852ء۔

شاہی وزیروں کو غیر ذمہ داری اور مطلق العنانیت کی خرابیوں سے باز رکھا۔ اس زمانے کے سب سے ذکی فہم اور قابل گورنر جنرل نے کہا تھا "شاہ انگلستان کو زیادہ اہمیت دینے کے مقابلے میں دو عملی کا طریقہ زیادہ سمجھ داری پر مبنی ہے[1]"۔ اُنیسویں صدی کے صاحبِ فکر اور دُور اندیش انگریز فلسفی نے اس طریقے کو پسند کیا تھا۔ 1823ء سے 1862ء تک جان اسٹورٹ مِل نے تیس سال تک ہندوستانی مراسلات کے نائب نگراں کے عہدے پر کام کیا تھا چنانچہ جس نظام کے تحت وہ کام کرتا تھا اس کے متعلق اُس نے جو کچھ کہا اُس کو مستند سمجھنا چاہیے۔

جان اِسٹورٹ مِل کی شہادت

"یہ بات قریب قریب ناممکن ہے کہ ایک ملک میں دوسرے ملک کے لیے ایسی حکومت قایم کی جائے جو اچھے نظم و نسق میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی رکھتی ہو۔ اگر ایسا نہ ہو سکے تو اس کے بعد بہترین صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ایسا ادارہ قایم کیا جائے جو بری حکومت میں کم سے کم دلچسپی رکھتا ہو۔ میرا خیال ہے کہ اس ملک میں ہندوستان کے تعلق سے جو انتظامی ادارے بنائے گئے ہیں وہ دنیا کی کسی حکومت کے مقابلے میں کم سے کم شر آمیز ہیں"۔

"کورٹ آف ڈائرکٹرز وہ ادارہ ہے جو ہر کام کی ابتدا کرتا ہے۔ لیکن اُسے آخری فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ وہ ایک دوسرے ادارے کی رضامندی کے بغیر کوئی اقدام نہیں کر سکتا ہے۔ اس ادارے کی حمایت حاصل کرنے کے لیے کورٹ کے پاس استدلال کے علاوہ اور کوئی طاقت نہیں۔ ان حالات میں اس بات کا امکان پایا جاتا ہے کہ ایسا ادارہ کوئی قدم اُٹھانے سے پہلے بڑی احتیاط کے ساتھ اس کے ہر پہلو کا جائزہ لے گا۔ اگر کورٹ کو ابتدا کرنے کے ساتھ آخری فیصلہ کرنے کا بھی حق حاصل ہوتا تو حالات مختلف ہوتے"۔

"اگر حکومتِ ہند کا کاروبار چلانے کی ذمہ داری صرف سکریٹری آف اسٹیٹ پر ہوتی تو اس کو اس ملک میں پائی جانے والی مکمل مطلق العنانیت سے تعبیر کرنا پڑتا۔ اس صورت میں بحث و مباحثہ کی کوئی گنجائش نہ ہوتی۔ سکریٹری آف اسٹیٹ صرف اپنے ماتحتوں سے مشورہ کرتا جن کی رائے ماننا اس کے لیے ضروری نہ ہوتا۔ اگر وہ اپنے ماتحتوں کی بات سُنتا بھی تو وہ جو مشورہ دیتے اس

---

[1] لارڈ ہارڈنگ کا بیان، ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ، 1862ء۔

کی ذمہ داری اُن پر نہ ہوتی[1]"

پچاس سال پہلے جان اسٹورٹ مِل نے یہ رائے ظاہر کی تھی اور ہمارے پچاس سال تجربے نے اس عظیم فلسفی کی دُور اندیشی اور سمجھ داری کا ثبوت فراہم کر دیا ہے۔ پچھلے پچاس سال میں زیادہ تجربے کی بنا پر ہندوستان کا نظم و نسق کئی اعتبار سے سدھر گیا ہے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ سکریٹری آف اسٹیٹ کی غیر ذمہ دار حکومت کے کئی تکلیف دہ نتائج بھی سامنے آئے ہیں۔ کورٹ آف ڈائرکٹرز کی نگرانی کا اختیار بورڈ آف کنٹرول کو حاصل تھا اس طرح سکریٹری آف اسٹیٹ کے کاموں پر نظر رکھنے کا اختیار کسی کو حاصل نہیں ہے۔ جس طرح کمپنی کے چارٹر کی ہر تجدید کے موقع پر کمپنی کے نظم و نسق کے متعلق تحقیقات کی جاتی تھی موجودہ انتظامات کے متعلق وقفے وقفے سے اس قسم کی تحقیقات نہیں کی جاتی ہے جس طرح کمپنی پر سختی کے ساتھ تبصرہ کیا جاتا تھا، جو کسی حد تک جذبہ حسد پر مبنی ہوتا تھا، موجودہ حکومتِ ہند کی سرگرمیوں پر ویسی کڑی تنقید نہیں کی جاتی ہے۔ اس غیر ذمہ دار حکومت کے آخری پانچ برسوں میں ہندوستان کی سالانہ آمدنی کا اوسط تیس ملین پونڈ تھا اور اس میں سے صرف ساڑھے تین ملین پونڈ گھریلو اخراجات کے لیے انگلستان بھیجے جاتے تھے۔ ملکہ وکٹوریہ کی حکومت کے آخری سال یعنی 01-1900ء میں اگرچہ برطانوی علاقے میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا اور لوگوں کی مالی حالت بھی بہتر نہیں ہوئی تھی مگر یہ آمدنی پچپن ملین پونڈ یعنی دُگنی ہو گئی تھی[2]۔ اس میں ریلوں اور نہروں کی آمدنی شامل نہیں تھی، اور اس میں سے سترہ ملین پونڈ سے زیادہ گھریلو اخراجات کے لیے انگلستان بھیجے گئے تھے۔ یہ بے اندازہ دولت کا نکاس (جو پچاس سال میں پانچ گنا ہو گیا تھا) ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ حکومت میں ممکن نہ ہوتا۔

برطانوی تاجروں کی رائے

برطانوی تاجر اور صنعت کار چاہتے تھے کہ ہندوستان کا نظم و نسق اچھا ہو مگر انھیں "اچھے نظم و نسق میں" نہ اتنی دلچسپی تھی اور نہ ہو سکتی تھی، جس کی بنا پر اس کو سدھارا جا سکتا۔ یہ قدرتی امر تھا کہ انھیں اپنے تجارتی اور صنعتی مفادات میں زیادہ دلچسپی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی

---

[1] جان اسٹورٹ مِل کی شہادت، ہاؤس آف لارڈز کی سلیکٹ کمیٹی کی 1852ء کی رپورٹ۔

[2] بالائی برما اور بلوچستان سے ہونے والی آمدنی نہ ہونے کے برابر تھی۔

کے ختم ہوجانے، اور ہندوستان کی حکومت براہِ راست شاہی وزیر کے ہاتھ میں آجانے کے بعد وہ شاہی وزیر پر دباؤ ڈال کر ہندوستان سے برطانوی تجارت کے لیے زیادہ سہولتیں حاصل کرسکیں گے۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ مانچسٹر، برمنگھم اور لیورپول نے لارڈ ہارڈنگ اور جان اسٹورٹ مِل سے اختلاف کیا اور شاہی وزیر کے ذریعے ہندوستان پر حکومت کرنے کا مشورہ دیا۔

مانچسٹر کے شہر میں ایک جلسہ عام منعقد ہوا جس میں کہا گیا "جب تک ہندوستان کی حکومت کے اُن شعبوں کی پوری اصلاح نہ کی جائے جو انگلستان میں ہیں اس وقت تک وہاں کی خرابیوں کو دُور نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ کورٹ آف ڈائریکٹرز اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے مالکان کا حکومتِ ہند سے کوئی تعلق نہیں رہنا چاہیے۔ آئندہ اس ملک میں حکومتِ ہند ایک ایسے وزیر اور کاؤنسل پر مشتمل ہونا چاہیے جن کو شاہی منظوری حاصل ہو اور جو براہِ راست پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہ ہوں[1]۔"

لیورپول کی ایسٹ انڈیا اور چائنا ایسوسی ایشن نے اس امر کی ضرورت کی طرف اشارہ کیا کہ "ہندوستان کے بندرگاہوں سے اور بندرگاہوں تک مصنوعات اور تجارتی سامان کو لانے لے جانے کے لیے نقل و حمل کے داخلی ذرائع کو ترقی دی جانی چاہیے۔" اس نے ہندوستان کے بھاری زمین کے محصول اور سونے کے معیار کو ختم کرنے کے خلاف احتجاج کیا، عدالتوں اور پولیس کے بہتر نظام کا مطالبہ کیا، کسٹم میں ہونے والی تاخیر کے خلاف آواز بلند کی اور "مودبانہ انداز میں مشورہ دیا کہ مصلحت کا تقاضہ ہے کہ ہندوستان میں بورڈ آف کنٹرول کی نگرانی اور اختیار کو کسی نہ کسی صورت میں توسیع دی جائے[2]۔"

برمنگھم کے لوگوں نے ایک عام جلسہ میں زیادہ تحکمانہ انداز اختیار کیا اور مطالبہ کیا کہ پارلیمنٹ "موجودہ حکومت کا دو عملی کا طریقہ ختم کردے، ایسا داخلی نظم و نسق قایم کرے جس کا تقرر شاہ انگلستان نے کیا ہو جو براہِ راست پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہ ہو[3]۔"

برطانوی حکومت کی پالیسی فلسفیوں اور مدبروں کے بجائے وہاں کے تاجر، صنعت کار اور رائے

---

[1] ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کی پہلی رپورٹ، 1853ء، ضمیمہ 7۔

[2] ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کی چوتھی رپورٹ، ضمیمہ 2۔

[3] ایضاً۔

دہندگان تشکیل کیا کرتے ہیں۔ انگلستان کے صنعت کار اور تاجر چاہتے تھے کہ ہندوستان پرشاہ انگلستان کی حکومت ہو۔ ان کے حکم کی تعمیل میں کچھ وقت لگ سکتا تھا مگر اس کی تعمیل بہرحال ہوتی تھی۔

نمائندگی کا مُطالبہ

ہندوستان کے لوگوں نے پہلی دفعہ جب نمائندگی کا مطالبہ کیا تو اُن کی آواز سات سمندر پار کے انگلستان میں بہت کم سُنائی دی۔

مدراس نیٹو ایسوسی ایشن اور مدراس پریسی ڈنسی کے دیسی باشندوں نے مشورہ دیا کہ مدراس کی کاؤنسل "سرکاری اور غیر سرکاری اراکین کی مساوی تعداد پر مشتمل ہو یعنی دونوں کی تعداد چھ یا سات ہو۔ سرکاری ممبر جب بربنائے منصب کاؤنسل بورڈ میں جگہ پالیں تو حکومت اُن کو نامزد کردے۔ ان میں سے ایک اکاؤنٹنٹ جنرل بھی ہونا چاہیے۔ غیر سرکاری اراکین کا انتخاب گورنر اُن اٹھارہ یا بیس اشخاص کی فہرست میں سے کرے جن کو مدراس کے محصول دہندگان منتخب کریں یا جیوری میں شامل کیے جانے کے اہل سمجھے جائیں یا جنھیں یہ عزت مآب ایوان کسی اور وجہ کی بنا پر قابل انتخاب سمجھتا ہو۔ چونکہ سرکاری اراکین، جن کو ضرورت کے وقت گورنر کا کاسٹنگ ووٹ (Casting Vote) مل سکتا ہے، ہر اہم معاملہ اپنے حق میں فیصل کر سکتے ہیں اس لیے مجوزہ منصوبے کے عمل درآمد میں کوئی رکاوٹ پڑنے کا اندیشہ نہیں اور اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ تمام موضوعات کے متعلق کافی معلومات فراہم کی جا سکیں گی[1]۔"

بمبئی ایسوسی ایشن کے اراکین اور بمبئی پریسی ڈنسی کے دوسرے دیسی باشندوں نے عرضداشت پیش کی کہ "اب وقت آگیا ہے کہ ہندوستان کے لوگ اپنے ملک کے نظم و نسق میں پہلے سے زیادہ حصّہ لینے کے حقدار ٹھیرائے جائیں اور عام پالیسی اور قانون سازی کی حد تک مقامی حکومتوں کی کاؤنسلوں کے دروازے ان کے لیے کھول دیے جائیں تاکہ باعزّت اور باصلاحیت ہندوستانی لارڈ ایلن برا، لارڈ الفنسٹن اور دوسرے حضرات کے مشورے کے مطابق ملک کے عام مفاد کے معاملات کی بحثوں میں حصّہ لے سکیں[2]۔"

---

[1] ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کی پہلی رپورٹ، ضمیمہ 7۔

[2] ایضاً۔

برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے اراکین اور بنگال پریسی ڈنسی کے دوسرے دیسی باشندوں نے پارلیمنٹ میں عرضداشت پیش کی جس میں درخواست کی گئی تھی "کہ کلکتہ میں ایک لیجسلیٹو کاؤنسل کا قیام عمل میں لایا جائے ۔ جو سات اراکین پر مشتمل ہو۔ ہر پریسی ڈنسی کے باعزت اور باصلاحیت دیسی باشندوں میں سے تین اراکین کا انتخاب کیا جائے جو اُن پریسی ڈنسیوں کے دیسی باشندوں کی نمائندگی کر سکیں سرکاری مفادات کی نمائندگی کرنے کے لیے ہر پریسی ڈنسی کا گورنر اعلیٰ سول حکام میں سے ایک کو نامزد کرے اور ایک رکن کو ملکہ انگلستان مقرر کرے[1]۔"

ہندوستان کی مختلف مجالس نے نمائندگی کا مطالبہ تو بڑی احتیاط کے ساتھ بلکہ ڈرتے ڈرتے کیا تھا لیکن انھوں نے اعلا ملازمتوں میں ہندوستانیوں کو زیادہ حصّہ دینے کا مطالبہ زوردار الفاظ میں کیا۔ یہ مطالبہ 1833ء کے ایکٹ کی اس دفعہ کی بُنیاد پر کیا گیا تھا جو ہاؤس آف کامنز میں بڑی پسند اور ہندوستان میں مسلسل نظر انداز کی گئی تھی ۔ انگریز گواہوں نے ہندوستانیوں کے ساتھ کی جانے والی وعدہ خلافی کی تصدیق کی ہے کیمرون نے، جو 1843ء سے 1848ء تک گورنر جنرل کی کاؤنسل کا رکن قانون رہا تھا، اس بات پر بہت زور دیا۔

لارڈ مانٹیگل (Lord Monteagle) جہاں تک اعلان کا تعلق ہے پچھلے ایکٹ کی دفعہ 87 میں جو اعلان کیا گیا ہے کیا ہندوستان کے دیسی باشندوں کی اہلیت کے متعلق اس سے زیادہ کچھ کہا جاسکتا تھا۔

ہے کیمیرون ـــــ جی نہیں۔ میرے خیال میں نہایت واضح اور نہایت زوردار الفاظ میں اعلان کیا گیا ہے۔

لارڈ مانٹیگل ـــــ اگر اس دفعہ کا وہ وسیع تر مفہوم سمجھا جائے جو آپ سمجھتے ہیں تو کیا آپ کہہ سکیں گے کہ اس کے عملی نتائج نے اس دفعہ کے بنانے والوں کی توقعات کو پورا کر دیا ہے؟

ہے کیمیرون ـــــ جی نہیں۔ نتائج ان کی توقعات کے برعکس ثابت ہوئے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے کسی ہندوستانی کو اس ایکٹ کی مذکورہ دفعہ کی بنا پر ایسا عہدہ نہیں ملا جو وہ اس ایکٹ کی مذکورہ دفعہ کے بغیر حاصل نہ کر سکتا[2]۔

---

[1] ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کی پہلی رپورٹ، ضمیمہ 7 ۔

[2] ہاؤس آف لارڈز کی سلیکٹ کمیٹی کی دوسری رپورٹ، 1853ء۔

چارلس ٹریویلین نے اپنے بیان میں زیادہ زوردار الفاظ استعمال کیے تھے۔ اس نے گزشتہ دور کی سامراجی قوموں یعنی یونانی اور رومن لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ پائیدار سلطنتیں مفتوح اور فاتح کے "مساوی حقوق" کی بنیاد پر قایم ہوئی تھیں۔ اس نے خیال ظاہر کیا کہ "ہندوستان پر اپنی حکومت برقرار رکھنے کے لیے ہمیں ہندوستانیوں کو ان عہدوں کے لیے بھرتی کرنا چاہیے جن کی بنا پر ان پر اعتماد کیا جا سکے اور ان کی اچھی یافت ہو سکے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ انھیں تعلیم دی جائے تاکہ اپنے فرائض بحسن و خوبی ادا کرنے کی اہلیت ان میں پیدا ہو جائے[1]"

1833ء کا ایکٹ اس وقت منظور ہوا تھا جب انگلستان میں حقیقی آزاد خیالی پائی جاتی تھی۔ انگلستان کے پہلے اصلاحی ایکٹ کے ایک سال بعد یہ ایکٹ بنا تھا۔ اس کے بعد آزاد خیالی کم ہو گئی، انگلستان میں سامراج پسندوں کا اثر بڑھ گیا اور ہندوستانی لوگوں کے لیے جذبہ خیر سگالی کم ہو گیا۔ فرانسس رابنسن نے اس افسوسناک واقعہ کی تصدیق کی جو ہندوستان میں جج اور بورڈ آف ریونیو کے رکن کے فرائض ادا کر چکا تھا۔

اس نے اپنے بیان میں کہا "ہندوستان میں حکمراں قوم محکوموں سے سخت نفرت کرتی ہے۔ اس واقعہ کا علم سب سے زیادہ خود لارڈ ولیم بینٹنک کو تھا جس نے سب سے پہلے ان جذبات کو بدلنے اور ہندوستان کے دیسی لوگوں کو سماجی اعتبار سے بہتر مقام دینے کی کوشش کی۔"

فرانسس رابنسن سے دریافت کیا گیا "کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ کمیٹی یہ سمجھے کہ خود گورنر جنرل لارڈ ولیم بینٹنک نے اس موضوع پر لوگوں کی توجہ مبذول کرانے کے لیے جو اقدامات کیے اُن کی بنا پر دیسی لوگوں کے جذبات کے احترام میں کوئی بڑا اضافہ ہوا یا نہیں ہوا؟"

فرانسس رابنسن نے جواب دیا "میرے خیال میں لوگوں نے اثر قبول کیا تھا۔ لارڈ ولیم بینٹنک کے بعد اس کا ردِ عمل ہوا ہے[2]۔"

لارڈ ولیم بینٹنک کی اصلاحات کو دو دہائیاں گزر چکی تھیں۔ اس نے پرنسپل صدر امین، ڈپٹی مجسٹریٹ اور ڈپٹی کلکٹر کے عہدوں کی تشکیل کر کے ہندوستانیوں کو ایسے موقع فراہم کرنے کی کوشش کی تھی کہ ان پر اعتماد کیا جا سکے اور ذمہ داری سونپی جا سکے۔

---

[1] ہاؤس آف لارڈز کی سلیکٹ کمیٹی کی دوسری رپورٹ، 1853ء۔

[2] ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کی چوتھی رپورٹ، 1853ء۔

لیکن اس کے ہندوستان سے واپس جانے کے بعد اس سلسلے میں کوئی مزید اقدام نہیں کیا گیا۔ 1828ء یعنی لارڈ ولیم جس سال ہندوستان آیا اور اس کے اکیس سال بعد یعنی 1849ء میں جتنے ہندوستانی سول انتظامات کے محکموں میں ملازم تھے ان کی تعداد مندرجہ ذیل نقشہ میں دکھائی گئی ہے[1]

	1828	1849
پرنسپل صدر امین	×	64
صدر امین	157	81
منصف	86	494
ڈپٹی مجسٹریٹ	×	11
ڈپٹی اور اسٹینٹ کلکٹر	×	86
سب کلکٹر کے ماتحت	×	27
آبکاری سپرنٹنڈنٹ	×	15
تحصیلدار	356	276
سرشتہ دار	367	155
مالگذار	8	110
دفتردار	2	19
کماوس دار	57	×
عدالتی	×	5
میر منشی	×	1
تعلیمی	14	479
متفرق	149	990
میزان	1197	2813

1849ء میں تین ہزار سے کم ہندوستانی برطانوی ہند میں سرکاری ملازمت میں تھے۔

---

[1] ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ، 1852ء، ضمیمہ 3۔

ان میں سے ایک ہزار سے کچھ کم ایسے تھے جنھیں عزّت، اعتماد اور ذمّہ کے عہدے ملے ہوئے تھے۔

انتظامی محکمے

1833ء کے ایکٹ نے، جس کا نفاذ اپریل 1834ء میں ہوا تھا، بڑی تبدیلیاں یہ کی تھیں کہ آگرے اور بنگال کی حکومتیں علاحدہ ہو گئی تھیں۔ بنگال تو براہِ راست گورنر جنرل لارڈ ولیم بینٹنک کے تحت رہا لیکن سر چارلس مٹکاف کو آگرے کا پہلا گورنر بنا دیا گیا۔ گورنر جنرل کی کونسل میں قانون کے ممبر کا اضافہ کیا گیا اور پہلا قانون کا ممبر میکالے مقرر کیا گیا۔ ابھی تک بنگال، مدراس اور بمبئی کے صوبے اپنے ضابطے خود بنایا کرتے تھے۔ اب گورنر جنرل کو اپنی کاؤنسل کی امداد سے پورے برطانوی ہندوستان کے لیے قانون بنانے کا اختیار حاصل ہو گیا۔

بنگال کا علاحدہ گورنر نہیں ہوتا تھا۔ ہندوستان کا گورنر جنرل بنگال کا گورنر بھی ہوتا تھا۔ ہنری تھابی پرنسپ کو حکومتِ ہند اور حکومتِ بنگال دونوں کا سکریٹری مقرر کیا گیا تھا۔[1]

نظری اعتبار سے مدراس اور بمبئی پر گورنر جنرل کو زیادہ اختیارات حاصل ہو گئے تھے مگر بدقسمتی سے ان صوبوں کی حکومتوں کی آزادی میں دخل اندازی کا رُجحان کم تھا۔ "کلکتہ کا گورنر جنرل بر اجلاس کاؤنسل بمبئی اور مدراس کے داخلی معاملات میں بہت کم مداخلت کرتا ہے۔ جب روپے کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ مالیات میں ورنہ صرف قانون سازی میں مداخلت کرتا ہے لیکن مال، پولیس اور عدالت کے معاملات میں وہ شاذ ہی مداخلت کرتا ہے۔"[2]

1849ء میں جب پنجاب کا الحاق کیا گیا تو اس کو پانچواں صوبہ بنا دیا گیا اور اس کا انتظام ایک بورڈ کے سپرد کر دیا گیا جو دونوں لارنس بھائیوں اور مینسل پر مشتمل تھا۔ تین سال بعد بورڈ موقوف کر دیا گیا اور 1852ء میں جان لارنس پنجاب کا چیف کمشنر بنا دیا گیا۔

ہر صوبہ اضلاع میں منقسم تھا اور ضلع کے افسر، جن کو فوجداری، مال اور انتظامی اختیارات حاصل ہوا کرتے تھے، اس وقت بھی اس پرانے طریقے کے مطابق اضلاع کا انتظام کیا کرتے تھے جس کو گزشتہ صدی میں وارن ہیسٹنگز اور لارڈ کارنوالس نے رائج کیا تھا۔ زیادہ اہم فوجداری مقدمات

---

[1] پرنسپ کی شہادت، ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ، 1852ء۔

[2] لارڈ ہارڈنگ کی شہادت، ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ، 1852ء۔

کی سماعت جج کرتے تھے جو اپنے ہندوستانی ماتحتوں کی مدد سے تمام دیوانی مقدمات بھی فیصل کیا کرتے تھے۔

عدالتی محکمے

ہر صوبے میں دو اعلا عدالتیں ہوتی تھیں۔ صدر عدالت کمپنی کے سول ملازمین پر مشتمل ہوتی تھی اور سپریم کورٹ کے ججوں کو ملکہ انگلستان مقرر کرتی تھی۔ عام خیال پایا جاتا تھا کہ دونوں عدالتوں کو ملا دیا جانا چاہیے۔

سر ارسکین پیری (Sir Erskine Perry) کا خیال تھا، جو 1841ء اور 1852ء کی درمیانی مدّت میں بمبئی کے سپریم کورٹ کا جونیر جج اور چیف جسٹس رہ چکا تھا، کہ "اُن کو ملا دینا نہایت مناسب ہوگا۔ ہندوستان کی ترقی کا پہلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ ہندوستان میں تمام انصاف ملکہ کے نام سے ہونا چاہیے . . . . میں جس طریقے کی سفارش کر رہا ہوں وہ بڑی حد تک عدالتوں کی اُس باہمی چشمک کو دُور کرسکے گا جو آج کل دیکھنے میں آتی ہے"۔

سر ایڈورڈ رے آن (Sir Edward Ryan) کا بھی خیال تھا جو 1827ء اور 1842ء کی درمیانی مدّت میں بنگال کے سپریم کورٹ میں جونیر جج اور چیف جسٹس رہ چکا تھا، کہ "سپریم کورٹ اور صدر عدالت کو ملا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ملکہ کے مقرر کیے ہوئے ججوں کو اور کمپنی کے مقرر کیے ہوئے ججوں کو ایک عدالت میں یک جا کر دیا جائے اور اس عدالت کو اُس صوبے کی عدالت اپیل بنا دیا جائے جہاں وہ واقع ہو"۔

سر ایڈورڈ گمبیر (Sir Edward Gambier) نے کہا تھا، جو 1836ء اور 1850ء کی درمیانی مدّت میں مدراس سپریم کورٹ کا جونیر جج اور چیف جسٹس رہ چکا تھا: "میں جو بھی مشورہ دوں گا اس کا تعلق غالباً اس سے ہوگا جو میری نظر میں نہایت مناسب اقدام ہے یعنی پریسی ڈنسی کی دونوں عدالتوں، سپریم کورٹ اور صدر عدالت، کا انضمام"[1]۔

ججوں کی طرح وکیلوں نے بھی اس پر زور دیا تھا۔ چنانچہ جان فارلے لیتھ (John Farley Leith)

---

[1] سر ارسکین پیری، سر ایڈورڈ رے آن اور سر ایڈورڈ گمبیر کے بیانات، ہاؤس آف کامنز کی سیلکٹ کمیٹی کی پہلی رپورٹ، 1853ء۔

نے، جو ایک انگریز بیرسٹر تھا اور کلکتہ سے ریٹائر ہونے کے بعد لندن کی پریوی کونسل میں پریکٹس کیا کرتا تھا، مجوزہ انضمام کے فوائد بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیے "کمپنی کے افسروں کے ساتھ جو ہندوستان کی سول سروس کے اراکین ہوتے ہیں، ایسے انگریز جج ہونے چاہئیں جنھوں نے قانون کی تعلیم پائی ہو . . . . سول سروس سے تعلق رکھنے والے جج اس ملک کے لوگوں اور اداروں، ان کے طور طریقوں اور رسم و رواج کے متعلق اپنے علم اور تجربے سے فائدہ اُٹھائیں اور اس کے بعد ایک تعلیم یافتہ اور باعمل ماہر قانون کو موقع دیں کہ وہ اپنی قانونی بصیرت کی روشنی میں، جو صحیح صحیح تفتیش و تحقیق اور منطقی استدلال کی عادی ہوتی ہے، واقعات اور قانون کی بنا پر اپنا فیصلہ صادر کرے[1]۔"

بنگال کی برٹش انڈین ایسوسی ایشن نے بھی گزارش کی "صدر عدالت اور سپریم کورٹ کا انضمام جلد سے جلد کر دینا چاہیے[2]۔" چنانچہ کمپنی کے چارٹر کی تجدید کے وقت اس متفقہ رائے کی بنا پر عدالتوں کا انضمام ہو گیا اور ان کی جگہ پر کلکتہ، مدراس اور بمبئی کے ہائی کورٹ وجود میں آ گئے۔

1833ء کا ایکٹ منظور کرنے کے بعد ایک قانونی کمیشن مقرر کیا گیا تھا اور گورنر جنرل کی کاؤنسل کا پہلا ممبر قانون میکالے اس کا پہلا صدر تھا۔ کمیشن نے سب سے پہلے تعزیرات ہند تیار کرنے کا کام شروع کیا۔ میکالے کے سامنے نپولین کا ضابطہ اور دوسرا مواد موجود تھا اور تعزیرات ہند کا مسودہ 1837ء میں تیار کر کے پیش کر دیا گیا۔ اس کے بعد یہ مسودہ ہندوستان اور انگلستان کے قانون دانوں کے سامنے پیش کیا گیا اور ہندوستانی عدالتوں کی رایوں پر 1847ء میں قانون کمیشن کے بقیہ دو اراکین ایلیٹ اور سر ہے کیمرون نے نظرثانی کی۔ اس کے بعد کچھ مدت کے لیے تعزیرات ہند معرض التوا میں رہی۔ آخر پہلا مسودہ میں اس زمانے کے ممبر قانون بیتھون (Bethune) اتنی ترمیم و تنسیخ کر دی کہ وہ بیتھون کی تعزیرات کہلانے لگی[3]۔ بہرحال تعزیرات ہند ایسٹ انڈیا کمپنی کی

---

[1] ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کی پہلی رپورٹ، 1853ء۔

[2] ایضاً۔

[3] سرایڈورڈ ریان اور سر ارسکین پیری کی شہادت، ہاؤس آف لارڈز کی سلیکٹ کمیٹی کی پہلی رپورٹ، 1853ء۔ فریڈرک ہالیڈے کی شہادت، ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کی پہلی رپورٹ، 1853ء۔

حکومت ختم ہونے کے بعد قانون بن سکی۔

1848ء کے قانون کے کمیشن نے، جو اس زمانے میں ایلیٹ اور بے کیمیرون پر مشتمل تھا، ضابطہ فوجداری بھی تیار کیا۔ لیکن وہ بھی کمپنی کی حکومت ختم ہونے کے بعد قانون بن سکا۔ ہندوستان کی حکومت ملکہ کو منتقل ہونے کے بعد لارڈ کیننگ ہندوستان کا پہلا وائسرائے مقرر کیا گیا تھا۔ اس کے زمانے میں تعزیراتِ ہند اور ضابطہ فوجداری کے علاوہ ضابطہ دیوانی بھی قانون بن گیا۔

ضابطوں کی عدم موجودگی میں کمپنی کے جج اور مجسٹریٹ اپنی سمجھ کے مطابق مقدمے فیصل کیا کرتے تھے۔ ان ہندوستانی افسروں نے جو اہم عدالتی عہدوں پر مقرر کیے گئے تھے اپنی قابلیت، انصاف پسندی اور عدالتی کام کی صلاحیت کا ثبوت دیا کر بڑے سے بڑے حاکم کو بھی ان کی تعریف کرنی پڑی۔ سر ایڈورڈ رے آن کو "ان کی اہلیت اور دادرسی کی صلاحیت پر بڑا تعجب ہوا" ارسکین پیری نے ہندوستان میں وکالت کرنے والے دو سرکردہ بیرسٹروں کی رائے پیش کرتے ہوئے اس کی حمایت کی کہ "کمپنی کے ان ججوں کے فیصلوں سے، جو اپیلیں سنتے ہیں، ہندوستانی ججوں کے فیصلے بہتر ہوتے ہیں۔[1]"

اس کے باوجود ہندوستانی ججوں کو بہت کم تنخواہیں ملا کرتی تھیں۔ سر ارسکین پیری نے ہاؤس آف لارڈز کی سلیکٹ کمیٹی کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ ایک انگریز جج کو 3,000 پونڈ سالانہ ملتے ہیں اور ایک منصف 120 پونڈ پاتا ہے۔ اسی سال جب ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کے سامنے اس کی شہادت ہوئی تو سر ارسکین نے زیادہ زوردار الفاظ میں اپنی رائے ظاہر کی۔

"میرا خیال ہے کہ جہاں تک عدالتی محکمے کا تعلق ہے وہ ذہنی اور اخلاقی اعتبار سے اعلا سے اعلا عدالتی عہدے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ضلع ججوں کے تعلق سے میں نے یہ سفارش کی تھی کہ انگریز بیرسٹروں کو ان عہدوں پر مقرر کیا جانا چاہیے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستانی مفادات کے تحفظ کے لیے اور ہندوستان کے بہتر نظم و نسق کے لیے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان عہدوں پر انگریزوں کے ساتھ ہندوستانیوں کا بھی تقرر کیا جائے .... میرا خیال ہے کہ دیسی حکام کو دیانت داری سے کام کرنے پر آمادہ کرنے کے لیے آپ کو وہی طریقہ استعمال کرنا چاہیے جو ہندوستان

---

[1] سرای۔ رے آن اور سرای۔ پیری کے شہادت، ہاؤس آف لارڈز کی سلیکٹ کمیٹی، 1853ء۔

کے انگریز حکام کے لیے استعمال کیا گیا پورے ملک میں آپ کے پاس ایسے انگریز ملازم ہیں جن کو ہر طرح قابلِ اعتماد سمجھا جا سکتا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے آپ نے انھیں بڑی بڑی تنخواہیں دینا منظور کیا۔ میرا خیال ہے کہ آپ اگر دیسی ملازمین پر بھی اس اصول کا اطلاق کریں تو آپ کو انگریزوں کی طرح قابلِ اعتماد ہندوستانی ملازم بھی مل سکتے ہیں[1]"

سر ارسکین پیری کی تعریف کرنی پڑتی ہے کہ اس نے حالانکہ ہندوستان میں محض ایک جج کی حیثیت سے کام کیا لیکن اس کی نظریں عدالت کی حدود تک محدود نہیں رہیں۔ اس نے روزمرہ کے معمول بیوپار کی بنا پر یہاں کے لوگوں کے کردار کے متعلق ایک رائے قایم کر لی۔ ہندر جہ بالا اقتباس کے فوراً بعد سر ارسکین نے ہندوستان کے لوگوں کی کاروباری دیانت کے متعلق اپنی رائے ظاہر کی۔

"ان کی کاروباری دیانت ہمیشہ مشہور رہی ہے۔ ان لوگوں میں پائے جانے والی کاروباری ساکھ کا اصول عجیب و غریب ہے جس کی بنا پر ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ان کے رقعے کو ضمانت سمجھا جاتا ہے۔ ان کے تجارتی بہی کھاتے کے تقدس کا یہ عالم تھا کہ مقامی عدالتیں ان کے بہی کھاتوں کو متنازعہ معاملات میں قطعی ثبوت سمجھا کرتی تھیں۔"

جی چاہتا ہے کہ ایک دوسرے انگریز کے بیان کا اقتباس بھی پیش کریں جو سر ارسکین پیری کا ہم عصر تھا۔ اسے ہندوستان کے لوگوں سے عدالتوں اور کاروباری دفتروں میں تو زیادہ ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا لیکن وہ ان کے گانوؤں میں اور ان گھروں پر گیا تھا۔ کرنل سلی مین کو آج بھی ہندوستان کے لوگ ایک ایسے نمایاں حاکم کی حیثیت سے یاد کرتے ہیں جو امن قایم کرنے، جرائم کا سدباب کرنے اور ٹھگوں کی سرکوبی کرنے کے لیے صوبہ صوبہ اور گانو گانو گھوما کرتا تھا۔ کرنل سلی مین نے لکھا تھا "ایسے سیکڑوں واقعات میرے علم میں ہیں جب ایک شخص کی جائیداد، آزادی اور زندگی کا انحصار غلط بیانی پر تھا لیکن اُس نے جھوٹ بولنے سے انکار کر دیا[2]"۔ جن انگریزوں نے ہندوستانیوں کو محض عدالتوں اور دفتروں میں دیکھا ہے وہ اس رائے سے اتفاق نہیں کریں گے لیکن جنھیں ہندوستانیوں کے گانوؤں میں اور ان کے گھروں پر جا کر ان سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے وہ اس سے انکار نہیں کر سکیں گے۔ یہ ایک حقیقت ہے جس کی تصدیق جو چاہے کرے کہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں، خاندانی

---

[1] ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کی پہلی رپورٹ، 1853ء۔

[2] ایک ہندوستانی افسر کے دورے اور یادیں (Rambles and Recollections of an Indian official)۔

معاملات میں اور سماجی اور کاروباری لین دین میں ہندوستانیوں کی اکثریت اتنی ہی سیدھی سادھی اور دیانت دار، وفادار اور صادق القول ہے جتنی دُنیا کی کوئی اور قوم۔

محکمہ پولیس

ہندوستان کی برطانوی حکومت کا سب سے کم کامیابی حاصل کرنے والا محکمہ پولیس کا محکمہ تھا اور آج بھی ہے۔ فریڈرک ہالی ڈے نے، جو بہت جلد بنگال کا پہلا لیفٹننٹ گورنر مقرر ہو گیا تھا، اپنے زمانے میں ہندوستان کی پولیس کے محکمے کا حال بڑی تفصیل سے بیان کیا تھا۔

"واقعہ یہ ہے کہ پولیس کے چھوٹے افسروں کو بہت کم تنخواہیں دی جاتی ہیں۔ وہ لالچی اور انتہائی بد دیانت ہوتے ہیں۔ . . . مجسٹریٹ یا ڈپٹی مجسٹریٹ کے نیچے داروغہ یا تھانیدار ہوتا ہے جس کو کچھ دن پہلے تک 25 روپیہ (50 شلنگ) ماہوار تنخواہ دی جاتی تھی۔ اس کو بڑے اختیارات حاصل ہوتے ہیں اور اس کا مستقر اس کے حلقے کے بیچ میں ہوتا ہے جو دو سو سے تین سو مربع میل تک پھیلا ہوتا ہے . . . . . داروغہ کے تحت جو افسر ہوتا ہے اس کو محرر یا کلرک کہتے ہیں۔ وہ رپورٹیں اور بیانات ضابطہ تحریر میں لاتا ہے اور تھانے کا ریکارڈ اپنی تحویل میں رکھتا ہے۔ داروغہ کی عدم موجودگی میں یا اس کے حکم کی تعمیل میں وہ داروغہ کے فرائض ادا کرتا ہے۔ اس کو آٹھ روپیہ (16 شلنگ) ملتے ہیں ایک جمعدار ہوتا ہے جس کی تنخواہ 8 یا 10 روپیہ (16 شلنگ یا 20 شلنگ) ماہوار ہوتی ہے۔ وہ بھی داروغہ کی ہدایت کے مطابق اسی قسم کے فرائض ادا کرتا ہے (تحریر کے علاوہ)۔ ہر تھانے میں دس سے لے کر پچیس تک کانسٹبل یا برقنداز ہوتے ہیں جن کو چار سے پانچ روپے تک (8 شلنگ یا 10 شلنگ) ماہوار تنخواہیں ملتی ہیں۔ کام کی زیادتی کی صورت میں داروغہ کے حکم سے وہ تنہا جرائم کی تفتیش کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔ یہ لوگ تنخواہ پانے والے سرکاری افسر ہوتے ہیں۔ ان کے نیچے گانو کا چوکیدار ہوتا ہے۔" ہالی ڈے نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے مزید کہا "میں نہیں کہہ سکتا کہ جرائم میں تخفیف ہو رہی ہے یا نہیں۔ جرائم کی شدت میں ضرور تخفیف ہو رہی ہے۔ مثلاً صوبے کے زیریں حصے میں ڈکیتی کی وارداتوں میں کوئی کمی نہیں ہوئی ہے اور کلکتہ کے نواح میں وارداتیں زیادہ ہونے لگی ہیں مگر مظالم اور بے دردی کے واقعات کم ہو گئے ہیں[1]۔"

---

[1] ہاؤس آف لارڈز کی سلیکٹ کمیٹی کی پہلی رپورٹ، 1852ء۔

ایک دوسرے گواہ رابرٹ ٹورینس (Robert Torrens) نے کہا، جو ہندوستان میں مجسٹریٹ، جج اور پولیس کمشنر کے فرائض ادا کرچکا تھا، کہ بہت سی خرابیوں کی جڑ یہ واقعہ ہے کہ ایک ہی حاکم کو پولیس اور عدالت کے اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔

لارڈ ہاروبی ـــ کیا ایک ہی شخص جُرم کی تفتیش بھی کرتا ہے، ملزم کا سراغ بھی لگاتا ہے اور بعد میں اس جُرم کے متعلق فیصلہ بھی صادر کرتا ہے؟

ٹورینس ـــ جی ہاں۔

لارڈ ہاروبی ـــ یہ بات صرف نظری اعتبار سے قابلِ اعتراض نہیں بلکہ عملاً بھی اس کو قابلِ اعتراض سمجھا جائے گا۔

ٹورینس ـــ میرے خیال میں یہ بات سخت قابلِ اعتراض ہے۔ میں اس کو اپنے تجربے کی بناء پر قابلِ اعتراض سمجھتا ہوں۔[1]

یہ امر کسی حد تک تعجب انگیز ہے کہ اس دور کے کسی انگریز حاکم نے پولیس اور ملک کے عام نظم و نسق کو بہتر بنانے کے لیے عام لوگوں اور ان کی گانو پنچایتوں کا تعاون حاصل کرنے کی واقعی کوشش نہیں کی۔ ہندوستان گانو پنچایتوں کا سب سے پُرانا وطن تھا اور سیکڑوں ہزاروں سال سے یہ خود مختار پنچایتیں اس وقت بھی امن برقرار رکھتی تھیں اور گانو کے جھگڑے چُکایا کرتی تھیں جب ملک میں نراج تھا۔

مدراس کے صوبے کے متعلق 1812ء کی ایک رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ "مدّتوں سے اس ملک کے لوگ اس سیدھی سادھی میونسپل حکومت کے تحت زندگی گزارتے رہے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ لوگ حکومتوں کے زوال اور اُن کے ٹوٹ کر بکھر جانے کی پرواہ نہیں کرتے ہیں۔ جب تک گانو کی سالمیت پر آنچ نہ آئے ان کو اس امر کی پرواہ نہیں ہوتی کہ وہ کس کو منتقل کر دیا گیا ہے یا کسی بادشاہ کے حقّے میں آیا ہے۔ اس کی داخلی معیشت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ہے۔"[2]

1819ء میں صوبہ بمبئی کی ایک رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ "چھوٹے پیمانے پر ایک ریاست کے تمام لوازمات ان پنچایتوں میں پائے جاتے ہیں۔ اگر تمام دوسری حکومتیں دست بردار ہو جائیں

---

[1] ہاؤس آف لارڈز کی سلیکٹ کمیٹی کی تیسری رپورٹ، 1853ء۔

[2] پانچویں رپورٹ، 1812ء، ص 85۔

پھر بھی وہ اپنے اراکین کے تحفظ کے لیے کافی ہیں[1]۔"

شمالی ہندوستان کے متعلق سر چارلس مٹکاف نے 1830ء میں لکھا تھا کہ "گانو پنچایتیں چھوٹی موٹی جمہوریتیں ہوتی ہیں۔ ضرورت کی تمام چیزیں اُن میں پائی جاتی ہیں۔ وہ اس وقت بھی باقی رہتی ہیں جب کچھ بھی باقی نہیں رہتا ہے۔ خاندان کے بعد خاندان ختم ہوتے رہے۔ انقلاب کے بعد انقلاب آتا رہا۔ باری باری ہندو، پٹھان، مغل، مرہٹے، سکھ اور انگریز طاقت حاصل کرتے رہے لیکن گانو پنچایتوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی . . . . میرے خیال میں گانو پنچایتوں کے اتحاد نے، جن میں سے ہر ایک علاحدہ ریاست کا حکم رکھتی ہے، لوگوں کو ان تمام انقلابوں اور تبدیلیوں کے دوران بحال رکھا جن سے انھیں دوچار ہونا پڑا۔ بڑی حد تک یہ پنچایتیں ان کی مسرت، آزادئ فکر و عمل سے اُن کے مستفید ہونے اور ان کی حریت کی ضامن رہی ہیں[2]۔"

یہ بڑی افسوسناک بات ہے کہ ان قدیم اور خود مختار اداروں کا زوال ہو گیا اور انگریزوں کی حکومت میں، جو ضرورت سے زیادہ مرکزی تھی، وہ ختم ہو گئے۔ اگر گانوؤں کے رہنماؤں پر کس قدر اعتماد کیا گیا ہوتا، انھیں مال، فوجداری اور پولیس کے انتظام میں کچھ اختیارات دیے گئے ہوتے اور خرابیوں کو دُور کرنے کے لیے ہمدردی اور احتیاط کے ساتھ ان کی نگرانی کی گئی ہوتی تو یہ پنچایتیں اس زمانے میں بڑی کار آمد ثابت ہوتیں۔ پُرانے طریقے کے ختم ہونے کے بعد حکومت خود اختیاری کا کوئی نیا طریقہ رائج نہیں کیا جا سکا۔ موجودہ زمانے میں گانو کے نمائندے حکومت کا ہاتھ بٹانے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ ایک بدیسی حکومت کو وہ عوامی اساس اور لوگوں کے ساتھ وہ رابطہ نصیب نہیں ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کی حکومتوں نے بڑی سمجھ داری کے ساتھ صدیوں تک برقرار رکھا تھا۔

تعلیم

غالباً ہندوستان کے لیے انگریزی راج کی سب سے بڑی نعمت مغربی تعلیم ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں نے بڑے سوچ بچار کے بعد ہندوستان کے لوگوں کو انگریزی تعلیم دینے کی

---

[1] الفنسٹن "پیشوا سے حاصل کیے جانے والے علاقوں کے متعلق رپورٹ"، 1819ء۔

[2] سر چارلس مٹکاف کی روداد، مورخہ 7/ نومبر 1830ء۔

اجازت دی تھی۔ 1792ء میں جب ولبر فورس (Wilberforce) نے ہندوستان کو اسکول کے اساتذہ بھیجنے کے لیے چارٹر کے ایکٹ میں دو دفعات کا اضافہ کرنے کی تجویز پیش کی تھی تو کورٹ آف پروپرائٹرز (Court of Proprietors) میں اس کی بڑی مخالفت کی گئی تھی اور دفعات کو واپس لینا پڑا تھا۔ اس تجویز کی بنا پر ڈائرکٹروں میں ایک یادگار مباحثہ ہوا تھا۔

"اس موقع پر ایک ڈائرکٹر نے کہا تھا کہ ہم نے امریکہ میں اسکول اور کالج قایم کرنے کی حمایت کی تھی جس کی بنا پر وہ ملک ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ اب ہمیں ہندوستان کے تعلق سے اس قسم کی حماقت نہیں کرنی چاہیے۔ اگر دیسی لوگ تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انھیں انگلستان آنا چاہیے[1]۔"

چنانچہ 1792ء تک صرف دو تعلیمی ادارے قایم کیے گئے تھے۔ وارن ہیسٹنگز نے 1781ء میں ایک محمڈن کالج کلکتہ میں قایم کیا۔ اور لارڈ کارنوالس نے 1792ء میں ایک سنسکرت کالج بنارس میں قایم کیا۔ ان اداروں کو قایم کرنے کا مقصد یہ تھا کہ عدالتی معاملات میں انگریز ججوں کی مدد کرنے کے لیے مولویوں اور پنڈتوں کو قانونی تربیت دی جائے۔ اس کے بعد بھی بیس سال تک لوگوں میں تعلیم عام کرنے کی مخالفت کی جاتی رہی۔ 1813ء میں پہلی دفعہ برطانوی پارلیمنٹ نے تینوں صوبوں کے لوگوں کو تعلیم دینے کے لیے 10,000 پونڈ کی رقم منظور کی لیکن دس سال تک یعنی 1823ء تک اس رقم کو خرچ کرنے کے لیے کوئی اقدام نہیں کیے گئے[2]۔

اس دوران کچھ لوگوں نے نجی طور سے بنگال میں انگریزی پڑھنا شروع کر دی تھی۔ "دو شخصوں نے اس کا بیڑا اٹھایا۔ ان میں سے ایک مسٹر ڈیویڈ ہیر تھا اور دوسرا ایک ہندوستانی رام موہن رائے۔ 1815ء میں ایک شام وہ دوستوں سے باتیں کر رہے تھے کہ دیسی لوگوں میں ذہن و کردار کے اعلا صفات پیدا کرنے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ رام موہن رائے کا خیال تھا کہ ایک انجمن یا سبھا قایم کی جائے اور اس میں ویدانت یا قدیم ہندو مذہب کے اعلا تر اور پاکیزہ تر اصولوں کا درس دیا جائے . . . . مسٹر ڈیویڈ ہیر کلکتہ کا ایک گھڑی ساز تھا۔ ایک معمولی غیر تعلیم یافتہ انسان۔ مگر تھا وہ بڑا باعمل اور باہمت۔ اس نے کہا ہمیں ہندوستانی نوجوانوں کی تعلیم کے لیے انگریزی کا اسکول

---

[1] جے سی۔ مارش مین کی شہادت، ہاؤس آف لارڈز کی سلیکٹ کمیٹی کی دوسری رپورٹ، 1853ء۔

[2] سر چارلس ٹریویلین کی شہادت، ہاؤس آف لارڈز کمیٹی کی سلیکٹ کمیٹی کی دوسری رپورٹ، 1853ء۔

یا کالج کھولنے کا منصوبہ بنانا چاہیے۔ چنانچہ اس نے اس موضوع پر ایک گشتی چھٹی تیار کر کے لوگوں کو بھیجی جس نے رفتہ رفتہ سرکردہ انگریزوں کو متوجہ کرنا شروع کیا۔ جن لوگوں کو گشتی چھٹی نے متاثر کیا ان میں چیف جسٹس سر ہائیڈ ایسٹ بھی شامل تھا۔ مجوزہ اقدام پر جب اس کی توجہ مبذول کرائی گئی تو وہ خلوص دل کے ساتھ اس کی حمایت کرنے لگا اور مئی 1816ء میں اس نے یورپی لوگوں کا ایک جلسہ منعقد کیا۔ اس جلسہ میں شرکت کی دعوت کچھ بااثر ہندوستانیوں کو بھی دی گئی۔ اتفاق رائے سے یہ طے پایا کہ اعلا طبقوں کے بچوں کو انگریزی کی تعلیم دینے کے لیے ایک تعلیمی ادارہ شروع کیا جائے جسے کلکتہ کے ہندو کالج کا نام دیا جائے۔ اس منصوبے کو عملی شکل دینے کے لیے یورپی لوگوں اور ہندوستانیوں کی ایک مشترک کمیٹی بنائی گئی۔ 1817ء کے شروع میں کالج بلکہ اسکول کھل گیا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ بنگال بلکہ ہندوستان کا پہلا ادارہ تھا جہاں انگریزی پڑھائی جاتی تھی[1]۔"

پارلیمنٹ کے حکم کی تعمیل میں تعلیم کے لیے 10,000 پونڈ کی منظوری کے دس سال بعد یعنی 1832ء میں بنگال کی حکومت نے تعلیم عامہ کی ایک کمیٹی مقرر کی۔ اس کمیٹی نے آگرہ اور دہلی میں مجڈن کالج قایم کیے جن میں سنسکرت بھی پڑھائی جاتی تھی۔ اس کمیٹی نے سنسکرت اور عربی کے کلاسک بڑے پیمانے پر شایع کرنے کا منصوبہ بنایا اور ان زبانوں میں سائنس کی پوری کتابوں کا ترجمہ شروع کیا گیا۔ کمیٹی نے چھ سال پہلے قایم ہونے والے کلکتہ کے ہندو کالج کو سالانہ مالی امداد دینی شروع کی جس کی وجہ سے کالج کی کامیابی کے امکانات پیدا ہو گئے اور اس کی افادیت میں اضافہ ہو گیا[2]۔

ماؤنٹ اسٹورٹ الفنسٹن انگریزی تعلیم کا بڑا حامی تھا۔ 1820ء میں اس نے بمبئی کے اس جلسہ عام کی صدارت کی جس میں تعلیم کو فروغ دینے کے لیے ایک کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس نے کمیٹی کے لیے 5,000 پونڈ کا عطیہ حاصل کیا تاکہ اس سے کتابیں چھاپی جاسکیں اور بچوں کو دینے کے لیے انعامات خریدے جاسکیں۔ اگلے سولہ سال تک دیسی زبانوں کی تعلیم کا انتظام اسی کمیٹی کے ذریعہ ہوتا رہا۔ بمبئی کی تعلیمی کیفیت کے متعلق جو تحقیقات کی گئی تھی اس سے ظاہر ہوا کہ 1832ء میں اس صوبے میں 1,705 اسکول اور 35,134 طالب علم تھے[3]۔

---

[1] ریورنٹ الگزینڈر ڈف کی شہادت، ہاؤس آف لارڈز کی سلیکٹ کمیٹی کی دوسری رپورٹ، 1853ء۔

[2] سر چارلس ٹریویلین کی شہادت، ہاؤس آف لارڈز کی سلیکٹ کمیٹی کی دوسری رپورٹ، 1853ء۔

[3] جے۔ ایس۔ کاٹن، "ماؤنٹ اسٹورٹ الفنسٹن اور جنوب مغربی ہندوستان کی تعمیر"

(Mountstuart Elphinstone and Making of South Western India).

نوجوان سول افسروں کی تربیت کے لیے بمبئی میں ایسا کالج قایم کرنے کی تجویز الفنسٹن نے پیش کی تھی جس میں ہندوستانی افسروں کی تربیت کا شعبہ بھی ہو۔ لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں نے اس تجویز کو نامنظور کر دیا تھا۔ الفنسٹن کے واپس جانے کے ایک سال بعد یعنی 1828ء میں انگریزی کا پہلا اسکول بمبئی میں قایم کیا گیا۔ بمبئی کا اہم الفنسٹن انسٹی ٹیوٹ تو 1834ء کے بعد وجود میں آسکا۔

1828ء میں مدراس میں کچھ تعلیمی ادارے قایم ہو چکے تھے جنھیں مشنری چلا رہے تھے لیکن کسی ادارے کو سرکاری امداد نہیں ملتی تھی۔ پاچیاپا نامی ایک ہندو نے کار خیر کے لیے ایک بڑی رقم چھوڑی تھی۔ مدراس کے ایڈوکیٹ جنرل مسٹر نارٹن نے اس کی وصیت کے مطابق 70,000 یا 80,000 پونڈ کی رقم جمع کی۔ 1839ء میں اس رقم سے ایک مرکزی تعلیمی ادارہ قایم کیا گیا اور اس وقف کی دیکھ بھال کرنے کے لیے ایک بورڈ تشکیل کیا گیا جو ہندوستانی اراکین پر مشتمل تھا[1]۔ پاچیاپا کالج کا شمار آج بھی مدراس کے کامیاب اور پھوتے پھلتے تعلیمی اداروں میں ہوتا ہے۔

سر چارلس ٹریولیین کی کوششوں سے دہلی میں ایک انگریزی کا کالج قایم ہو گیا تھا۔ ہندوستان میں میکالے کی آمد سے انگریزی تعلیم کو نئے محرکات نصیب ہو گئے۔ اس کی حمایت اور مدد سے لارڈ ولیم بینٹنک نے 7 مارچ 1835ء کی مشہور تجویز منظور کی جس کی رو سے انگریزی زبان کو اعلا تعلیم کا ذریعہ بنایا گیا۔ تعلیم عامہ کی کمیٹی کی توسیع کی گئی، میکالے کو اُس کا صدر مقرر کیا گیا، سر ایڈورڈ ریان، لیے کیمرون اور دوسرے اراکین کا اضافہ کیا گیا اور اس زمانے کے تین نمایاں و ممتاز ہندوستانیوں یعنی رادھے کانت دیب، راسو ملتے دت اور نواب تہوّر جنگ کو اس کا ممبر مقرر کیا گیا[2]۔

لیکن لارڈ ولیم بینٹنک کے تمام جانشین ہندوستان میں انگریزی تعلیم کو فروغ دینے کی نیک خواہش نہیں رکھتے تھے لارڈ ایلن برا، جو 1842ء میں ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر کیا گیا تھا، ہندوستان میں انگریزی تعلیم کے اثرات کے متعلق بڑے شکوک و شبہات کا اظہار کیا کرتا تھا۔

---

[1] نارٹن کی شہادت، ہاؤس آف لارڈز کی سلیکٹ کمیٹی کی دوسری رپورٹ، 1853ء۔

[2] ٹریولیین کی شہادت، ہاؤس آف لارڈز کی سلیکٹ کمیٹی کی دوسری رپورٹ، 1853ء۔

اس کا کہنا تھا کہ اس زمانے کا اہم ترین ہندوستانی مصنف دُوارکا ناتھ ٹیگور بھی اس کا ہم خیال ہے۔

"مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ مرحوم دُوارکا ناتھ ٹیگور مجھ سے ملنے آیا۔ اس ملک میں آنے والا وہ سب سے ذہین ہندوستانی تھا اور خود اپنے ملک میں اس کا شمار ذہین ترین لوگوں میں ہوتا تھا۔ دُوارکا ناتھ ٹیگور نے ہندوستان کے دیسی لوگوں کی تعلیم کے موضوع پر جو تقریر کی تھی وہ میں صبح کے اخبار میں پڑھ چکا تھا۔ جب وہ مجھ سے ملنے آیا تو میں نے کہا "آپ نے تعلیم کے موضوع پر تقریر کی تھی"۔ اس نے دریافت کیا "کیا وہ شایع ہوئی ہے ؟" میں نے کہا "شایع تو ہر چیز ہو جایا کرتی ہے۔ لیکن یہ بات ہمارے علم میں ہے کہ اس کمرے میں بات کرتے وقت ہمیں اس انداز سے بات نہیں کرنی چاہیے جس طرح اشاعت کے لیے کی جاتی ہے۔ خیالات کے اظہار میں ہمیں تحفظات سے کام نہیں لینا چاہیے۔ یہ بات آپ سے چھپی ہوئی نہیں ہے کہ ہندوستان کے دیسی لوگوں کو تعلیم دینے کے خواہشمند حضرات اگر پوری طرح کامیابی حاصل کر لیں تو ہم اس ملک میں تین مہینے بھی مشکل سے رہ سکیں گے"۔ اس نے کہا "شاید تین ہفتے بھی نہ رہ سکیں" اور اس کا خیال بالکل صحیح تھا[1]"

لارڈ ایلن برا کا جانشین لارڈ ہارڈنگ ایک قابل حاکم اور دانشمند مدبّر تھا۔ اس نے انگریزی کے ذریعے دی جانے والی اعلا تعلیم کے لیے میدان تیار کرنے کی غرض سے بنگال کے مختلف اضلاع میں دیسی زبانوں کی تعلیم دینے کے لیے سو اسکول کھولے۔ اس نے وہ مشہور تجویز منظور کی جس کی رو سے سرکاری ملازمتوں کے لیے صرف ان اُمّیدواروں کا انتخاب لازمی قرار دیا گیا تھا جنھوں نے ان ہی اسکولوں میں تعلیم پائی تھی۔ اس زمانے کا ممتاز ماہر تعلیم اور ادیب پنڈت ایشور چندر ودیاساگر اس انتخاب میں لارڈ ہارڈنگ کی مدد کیا کرتا تھا۔

آخر میں 1854ء کا مشہور تعلیمی مراسلہ موصول ہوا جس میں بینٹنک اور ہارڈنگ کے طریقے کو قریب قریب تسلیم کر لیا گیا تھا اور ہندوستان کی دیسی زبانوں کی ایسی تعلیم کے ضابطے مقرر کیے گئے تھے جو انگریزی کے ذریعے اعلا تعلیم کا راستہ کھول دے۔ اصول کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی تھی: معین لوگوں نے انگریزی زبان میں اتنی مہارت حاصل کر لی ہے کہ اس کے ذریعے عام تعلیم حاصل کر سکیں ان کے لیے تعلیم کا بہتر ذریعہ انگریزی ہے اور اس کو استعمال

---

[1] لارڈ ایلن برا کی شہادت، ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ، 1852ء۔

ہوتے رہنا چاہیے۔ لیکن انگریزی سے نابلد یا کم استعداد رکھنے والے بڑے طبقے کو دیسی زبانوں کے ذریعے تعلیم دی جانی چاہیے۔[1]"

مراسلے میں اس امر کی منظوری دی گئی تھی کہ اعلا تعلیم کے لیے ہندوستان میں یونیورسٹیاں قایم کی جائیں جو سائنس اور آرٹ کے مختلف شعبوں کی تعلیم کے ثبوت میں تعلیمی اسناد عطا کر کے باضابطہ اور صحیح تعلیم کی ہمت افزائی کریں اور جو لوگ اعزازی امتیاز کے لیے مقابلے کے خواہشمند ہوں ان کے اعزاز میں اضافہ کریں۔ اس تجویز میں ہم نے جس تعلیمی کاؤنسل کا ذکر کیا ہے اس نے لندن یونیورسٹی کو معیاری نمونہ سمجھا ہے اور ہمیں ان سے اتفاق ہے کہ اس یونیورسٹی کی ساخت، انتظام اور طریقۂ کار (اس کے چارٹر اور ضابطوں کی نقلیں ہم آپ کے لیے ملفوف کر رہے ہیں) ہندوستان کی ضرورتوں کے مطابق ہیں اور ان کی تقلید کے مفید نتائج ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ جزویات کی حد تک کچھ تبدیلیاں ضروری سمجھی جائیں۔[2]"

عام لوگوں کو دیسی زبانوں کے ذریعے تعلیم دینے کا انتظام سرکاری امداد کے ذریعے اور دوسرے طریقوں سے کیا گیا۔ پاٹھ شالاؤں اور مکتبوں کی بھی ہمت افزائی کی گئی تاکہ وہ بڑے پیمانے پر عام لوگوں کو ابتدائی معلومات فراہم کر سکیں۔[3]

چنانچہ لارڈ کیننگ نے کلکتہ، مدراس اور بمبئی کی یونیورسٹیاں قایم کیں۔ اس مشہور مراسلے میں جس طریقۂ کار کی موٹی موٹی باتوں کا ذکر کیا گیا تھا آج تک ہندوستان میں اس پر عمل ہو رہا ہے۔ اس کے بعد الٰہ آباد اور لاہور میں بھی یونیورسٹیاں قایم ہو چکی ہیں اور ملکہ وکٹوریہ کے زمانہ حکومت کے آخری سال میں چالیس لاکھ سے زیادہ لڑکے برطانوی ہند کی درس گاہوں میں تعلیم پا رہے تھے۔

ابتدائی تعلیم

آج کل برطانوی ہند کے اسکولوں میں تعلیم پانے والے چالیس لاکھ لڑکوں میں سے زیادہ تر

---

[1] تعلیمی مراسلہ مورخہ 19/جولائی 1854ء، پیراگراف

[2] تعلیمی مراسلہ مورخہ 19/جولائی 1864ء، پیراگراف 24 اور 26۔

[3] ایضاً، پیراگراف 41 اور 46۔

ابتدائی تعلیم پاتے ہیں اور لکھنا، پڑھنا اور تھوڑا سا حساب سیکھ لیتے ہیں۔ یہ ابتدائی تعلیم برطانوی حاکموں نے نہیں شروع کی بلکہ ہندوستان میں پرانے زمانے سے پائی جاتی ہے۔ سر ٹامسن منرو اور ماونٹ اسٹورٹ الفنسٹن نے انیسویں صدی کے شروع میں تحقیقات کرنے کے بعد اپنی رپورٹوں میں لکھا تھا کہ قدیم زمانے سے ابتدائی تعلیم یورپ کے مقابلے میں ہندوستان میں زیادہ پھیلی ہوئی تھی اور پرانے قسم کے مکتبوں میں پڑھنے والے طالبِ علم معمولی حساب کتاب کرنے کی بڑی ذہنی صلاحیت رکھتے تھے۔ برہمن اور بالائی طبقوں کے ہندوستانی اپنے بچوں کو موروثی کام کے لائق بنانے کے لیے لکھنا پڑھنا اور حساب سکھایا کرتے تھے۔ انگریزی حکومت نے ابتدائی تعلیم کے اس قدیم طریقے کو سمجھا، سہارا دیا اور مالی امداد دی لیکن دی جانے والی امداد اب بھی ناکافی ہے۔ اس وقت کی ایک بڑی ضرورت یہ ہے کہ گانوؤں کے ابتدائی مدارس کی زیادہ مدد کی جائے اور کسانوں میں ابتدائی تعلیم کو زیادہ فروغ دیا جائے تاکہ ہندوستان کے ہر کسان اور مزدور کے لیے یہ ممکن ہو سکے کہ وہ تھوڑے بہت پیسے خرچ کرکے اپنے گانو کے اسکول میں لکھنا، پڑھنا اور حساب سیکھ لے۔ سر آرسکین پیری نے 1853ء میں مالی امداد کی کمی کی شکایت کی تھی اور کہا تھا کہ اس ناکافی مالی امداد کے ساتھ حکومت "ہر گانو میں اسکول قائم" نہیں کر سکتی۔ مالی امداد اب بھی ناکافی ہے اور "ہر گانو میں اسکول کھولنے" کا فرض اب بھی پورا نہیں ہو سکا ہے۔[2]

تعلیم نسواں

اب اسکول جانے والے لڑکے اور لڑکیوں کی تعداد کی بنیاد پر فیصلہ کیا جائے تو ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ تعلیم کے میدان میں لڑکیاں لڑکوں کے مقابلے میں پیچھے ہیں۔ ایک ایسے ملک میں جہاں دس سے چودہ سال تک کی عمر کے درمیان لڑکیوں کی شادی ہو جاتی ہے پرانے زمانے میں انہیں اسکول جانے کا کوئی موقع نہیں ملتا تھا اور آج کل بھی بہت کم لڑکیاں اسکول جاتی ہیں۔ ان کو عام

---

[1] سر آرسکین پیری کی شہادت، ہاؤس آف لارڈز کی سلیکٹ کمیٹی کی دوسری رپورٹ، 1853ء۔

[2] ملکہ وکٹوریہ کی حکومت کے آخری سال میں 230 ملین آبادی رکھنے والے ہندوستان کی تعلیم پر خرچ ہونے والی مجموعی رقم ایک ملین پونڈ سے کچھ زیادہ تھی۔ اس میں سے 6,64,000 پونڈ حکومت نے ادا کیے تھے اور 8,84,000 پونڈ مقامی بورڈوں اور میونسپلٹیوں نے ادا کیے تھے۔

طور سے نجی اُستادوں کے ذریعے گھروں پر تعلیم دی جاتی ہے۔ گورنر جنرل کی کونسل کے ممبر قانون ڈرنک واٹر بیتھون (Drink Water Bethune) نے کلکتہ میں ایک لڑکیوں کا اسکول شروع کرنے کی نہایت قابل تعریف اور کامیاب کوشش کی۔ اس اسکول کو اس نے اپنی جیب سے 10000 پونڈ دیئے۔ آج بھی بیتھون اسکول ہندوستان میں لڑکیوں کی تعلیم کا ایک کامیاب ادارہ ہے اور یونیورسٹی کی اعلا ترین سطح کے امتحانوں کے لیے لڑکیوں کو تیار کرتا ہے۔ لندن یونیورسٹی کی طرح ہندوستان کی یونیورسٹیاں بھی لڑکیوں کو اسناد عطا کرتی ہیں اور کلکتہ، مدراس اور بمبئی کی گریجویٹ لڑکیاں سندیں حاصل کیا کرتی ہیں۔ ابتدائی اسکولوں میں چھوٹے چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں عام طور سے ساتھ پڑھا کرتے ہیں اور ملکہ وکٹوریہ کی حکومت کے آخری سال میں برطانوی ہند میں اسکول جانے والی لڑکیوں کی تعداد تقریباً پانچ لاکھ تھی۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے ان اعداد سے ہندوستان میں لڑکیوں کی تعلیم کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ہے۔ بالائی طبقوں کی ناکتخدا اور شادی شدہ لڑکیاں عام طور سے گھروں پر تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ نچلے اور غیر تعلیم یافتہ طبقوں کی عورتیں یورپ کے مقابلے میں کہیں زیادہ مذہبی حقائق، اخلاقی فرائض اور قومی رسوم و ادبیات سے واقف ہوا کرتی ہیں۔ ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان کے گانوؤں میں رہنے والی غیر تعلیم یافتہ عورتیں کم از کم مذہبی معلومات اور قومی رسوم و ادبیات کی حد تک اُتنی باخبر تو ضرور ہوتی ہیں جتنی کہ یورپ کی غریب عورتیں جو انجیل سے واقف ہوتی ہیں اور کبھی کبھی کم قیمت رسالوں میں شایع ہونے والی کہانیاں پڑھتی ہیں۔

اخبارات

کورٹ آف ڈائرکٹرز اور حکومت ہند کے درمیان ہونے والی مراسلت کا ایک پورا دفتر، جو 1858ء میں ہاؤس آف کامنز کے حکم کی تعمیل میں شایع ہوا تھا، ہندوستان کے اخبارات کی دلچسپ تاریخ کے مطالعے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

1791ء میں، جب لارڈ کارنوالس ہندوستان کا گورنر جنرل تھا، دی بنگال جرنل (The Bengal Journal) میں ایک گستاخانہ پیراگراف لکھنے کے سلسلے میں ولیم ڈوائن

---

[1] مارش مین کی شہادت، ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کی چھٹی رپورٹ، 1853ء۔

(William Duane) نامی ایک شخص کو حکومت بنگال نے یورپ واپس بھیجنے کے لیے گرفتار کر لیا تھا سپریم کورٹ نے حکومت کے اقدام کو جائز قرار دیا۔ ولیم ڈوائن کو فہمایش کے بعد رہا کر دیا گیا لیکن اس نے ایک دفعہ پھر دی ورلڈ (The World) میں جارحانہ مضمون لکھا جس کی بنا پر اسے 1794ء میں یورپ واپس بھیج دیا گیا۔

1794ء کے بعد اخبارات میں ہونے والے دوسرے حملوں پر بھی توجہ کی گئی اور 1799ء میں لارڈ ویلزلی کی حکومت نے اخباروں کو قابو میں رکھنے کے لیے کچھ ضابطے بنائے۔ اخبار کو چھاپنے سے پہلے سرکاری افسر کو دکھانا ضروری قرار دیا گیا۔ ان ضابطوں اور دوسرے ضابطوں کی خلاف ورزی کی سزا تھی "یورپ کے لیے فوراً جہاز پر سوار کر دینا" کورٹ آف ڈائرکٹرز نے ان ضابطوں کو منظور کر لیا تھا۔

1801ء اور 1818ء کی درمیانی مدت میں قابلِ اعتراض مضامین یا نوٹ لکھنے کے سلسلے میں بہت سے ایڈیٹروں کو فہمائش کی گئی اور کئی قابلِ اعتراض مضامین لکھنے والوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ حکومت سے معافی مانگیں۔ 1818ء میں لارڈ ہیسٹنگز کی حکومت نے نئے ضابطے بنائے جو نسبتاً نرم تھے لیکن اب بھی ایڈیٹروں کو اس امر کی اجازت نہیں تھی کہ وہ سرکاری اقدامات پر "تنقید" کریں یا ایسے "مباحث" شایع کریں جن سے دیسی لوگوں میں "بے چینی" پیدا ہو یا "کسی پر اس قسم کے نازیبا ذاتی حملے کریں یا اس کو رُسوا کریں" جس سے تکرار و تصادم ہونے کا امکان پیدا ہو۔

ان ضابطوں کے منظور ہونے کے بعد کئی سال تک حکومت قابلِ اعتراض مضامین کے خلاف کارروائیاں کرتی رہی۔ اس قسم کے متعدد واقعات پیش آئے۔ لیفٹیننٹ کرنل رابنسن نے اپنے اس مضمون کی حمایت میں حکومت کو ایک سخت خط لکھا تھا جو کلکتہ جرنل میں "ایک فوجی دوست" کے نام سے شایع ہوا تھا اور جس کی بنا پر کمانڈر انچیف نے 1822ء میں اس پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلانے کا حکم دے دیا تھا۔

مدراس اور بمبئی میں بھی عام طور سے اخباروں کی تحریروں پر کڑی نظر رکھی جاتی تھی۔

ڈائرکٹروں نے 1823ء میں کہا تھا "ایسے دستور کے لیے جس میں نمائندگی کا اصول ملحوظ رکھا گیا ہو اخباروں کی آزادی ضروری اور لازمی سمجھی جاتی ہے۔ جہاں حکومت عام لوگوں سے طاقت حاصل کرتی ہے اور ان کے سامنے جواب دہ ہوتی ہے وہاں لوگوں کو حکومت کے اقدام پر بحث

کرنے کا حق ضرور حاصل ہونا چاہیے۔ جہاں لوگ ایسے قانون بنانے کے لیے نمائندوں کا انتخاب کرتے ہیں، جس کا اثر ان کی ذات اور جائیداد پر پڑتا ہے، تو اس جماعت کو جو انھیں نمائندگی کا استحقاق عطا کرتی ہے یہ حق بھی حاصل ہوتا ہے کہ ان کے طریقہ کار پر تنقید کرے۔ لیکن کسی طرح بھی ہندوستان کی حکومت کو قایم کرنے میں عام لوگوں کا کوئی ہاتھ نہیں تھا نہ اُنھیں اس کی کارروائیوں پر کسی قسم کا کوئی اختیار حاصل ہے۔"

"حکومتِ ہند تفویض کیے ہوئے اختیارات استعمال کرتی ہے جو کورٹ آف ڈائریکٹرز اور بورڈ آف کنٹرول نے اس کو سونپے ہیں۔ حکومتِ ہند اس ملک میں (انگلینڈ میں) ہے اور بلاشبہ انگلستان کی رائے عامہ کے سامنے اسی طرح جواب دہ ہے جس طرح خود حکومت انگلستان۔ چنانچہ اس کے کاموں پر ہندوستان کے بجائے اس ملک میں بحث و مباحثہ کیا جانا چاہیے۔"[1]

ہندوستانی اخبارات کے متعلق 1823ء میں ڈائریکٹروں کے خیالات کچھ اس قسم کے تھے۔ لیکن یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں جنھیں ہندوستانی اخبار کہا جاتا تھا وہ ہندوستان میں رہنے والے انگریزوں کے ایک چھوٹے سے طبقے کے اخبار تھے۔ یہ اخبارات نہ ہندوستان کے لوگوں کے مفادات کی نمائندگی کرتے تھے نہ ان کا تحفظ۔ اس وقت یا اس کے تیس سال بعد تک ہندوستانیوں کے پاس کوئی با اثر اخبار نہیں تھا چنانچہ ہوا یہ کہ جب لارڈ ولیم بینٹنک نے ہندوستان کے لوگوں کی حالت سُدھارنے اور کمپنی کے تحت اُنھیں ذمہ دار عہدوں پر ملازم رکھنے کی کوشش کی تو ہندوستان کے اخباروں نے اس پر اس قسم کے نازیبا حملے کیے کہ اس کی مثال کسی گورنر جنرل کا زمانۂ حکومت پیش نہیں کر سکتا۔

لارڈ ولیم کے مشیرِ خاص میکالے کو بھی اس قسم کے حملوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نے اپنے زمانے کے ہندوستانی اخبارات کا ذکر ان ناقابل فراموش الفاظ میں کیا ہے "رائے عامہ کے معنی ان پانچ سو اشخاص کی رائے سمجھی جاتی ہے جو ان پچاس ملین لوگوں کے ساتھ، جن کے درمیان وہ رہتے ہیں، کوئی مشترک مفاد، احساس یا مذاق نہیں رکھتے ہیں۔ آزادی پریس کے معنی وہ سخت اعتراضات سمجھے جاتے ہیں جو پانچ سو افراد ہر اس اقدام کے خلاف کیا کرتے ہیں جو انھیں پچاس ملین کے تعلق سے

---

[1] ایسٹ انڈیا کمپنی کے صدر اور نائب صدر کا خط بنام سی۔ ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ ون کے نام، مورخہ 17/جنوری 1823ء۔

من مانی کرنے سے باز رکھتے ہیں[1]۔"

لارڈ ولیم بینٹنک کے جانشین سر چارلس مٹکاف نے 1835ء میں اخباروں کو تھوڑی بہت آزادی دے کر اپنے مختصر دور حکومت کو ممتاز بنا دیا اور اس حقیقی ترقی پسند اور جرأت مندانہ اقدام نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں کو ناراض کر دیا۔ انھوں نے لکھا تھا۔

"یہ اقدام ہمارے تمام گزشتہ احکام، کلکتہ کے سپریم کورٹ اور ملک معظم کی پریوی کونسل کے فیصلوں، جو اس مسئلے کی موافقت میں اور اس کے خلاف بحث سننے کے بعد دیے گئے تھے اور بنگال، مدراس اور بمبئی کی تمام گزشتہ حکومتوں کی تحریری رائے کے خلاف ہے۔"

"ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ یہ قدم چونکہ ایک ایسی حکومت نے اٹھایا ہے جو محض عارضی ہے اس لیے اس کو اور زیادہ غیر معقول سمجھنا پڑتا ہے۔"

"ہونا تو یہ چاہیے کہ پارلیمنٹ کے ایکٹ کی رو سے ہمیں جو اختیارات حاصل ہیں ان سے کام لے کر آپ کے نئے قانون کو ہم نامنظور کر دیں۔ یہ قانون لاکھ نا عاقبت اندیشانہ اور مضر سہی پھر بھی ہم جانتے ہیں کہ اس کی فوری تنسیخ شر انگیز نتائج کی حامل ہو گی۔ اس لیے ہم اس وقت تک انتظار کریں گے جب تک لارڈ آکلینڈ، آپ کا موجودہ گورنر جنرل، ہندوستان نہ پہنچ جائے اور گورنر جنرل اِن کاؤنسل کا واضح مشورہ ہمیں حاصل نہ ہو جائے۔ اس کے بعد ہم اپنے قطعی فیصلے سے آپ کو مطلع کریں گے۔ آپ کو ہمارے جذبات کا علم ہو گیا ہے۔ اگر آپ ایک دفعہ پھر گزشتہ طریقے کو رائج کر کے ہماری مداخلت کو غیر ضروری بنا دیں تو ہمیں کوئی خاص افسوس نہیں ہو گا[2]۔"

خوش قسمتی سے سر چارلس مٹکاف ان لوگوں میں سے تھا جن کو ڈائرکٹروں کے "جذبات"

---

[1] ٹریویلین، "لارڈ میکالے کی سوانح اور مکاتیب" (Life and Letters of Lord Macaulay)،
جان اسٹورٹ مل نے 1852ء میں ہندوستانی اخبارات کے متعلق اسی قسم کے خیالات ظاہر کیے تھے۔ اس نے ہاؤس آف لارڈز کی سلیکٹ کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے کہا تھا "جب تک ہندوستان کے عام لوگ اخباروں تک دسترس حاصل نہیں کر سکیں گے اس وقت تک اس امر کا خطرہ رہے گا کہ وہ محض ذاتی مفادات کی وکالت کریں۔ ہندوستان کے انگریزی کے اخبار صرف انگریزوں کی وکالت کرتے ہیں اور خاص طور سے ان انگریزوں کی جو حکومت سے متعلق نہیں ہیں۔ ان اخباروں کا دیسی لوگوں اور ہندوستان کے عظیم مفادات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

[2] مراسلہ مورخہ یکم فروری 1836ء۔

اپنے راستے سے نہیں ہٹا سکتے تھے اور وہ ان کی دھمکی میں آ کر پُرانا طریقہ رائج کرنے کو تیار شکل ہی سے ہو سکتا تھا۔ دو سال بعد جب لارڈ آکلینڈ ہندوستان پہنچا تو ہندوستان اور انگلستان دونوں ملکوں کے لوگ اخباروں کی آزادی کے عادی ہو چکے تھے اور مٹکاف کے رائج کیے ہوئے اچھے طریقے کو منسوخ نہیں کیا گیا۔

بیس سال بعد غدر کے ہنگاموں کے دوران ایک انگریزی کے اخبار[1] کو ایسے مضامین لکھنے کے سلسلے میں تنبیہہ کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی جو لوگوں کو مشتعل کر سکتے تھے اور ہندوستانی زبانوں کے تین اخباروں پر مقدمہ چلایا گیا۔ ان میں سے دو اخباروں کے ناشروں[2] کو معافی مانگنے اور مچلکے داخل کرنے کے بعد رہا کر دیا گیا۔ تیسرے اخبار کے ناشر[3] کے خلاف جرم ثابت نہیں ہو سکا اور وہ بری کر دیا گیا۔ اس زمانے میں اخباروں پر جو تھوڑی بہت بندشیں عائد کی گئی تھیں وہ بعد میں ختم کر دی گئیں۔

---

[1] دی فرینڈ آف انڈیا (The Friend of India)

[2] دوربین اور سلطان الاخبار۔

[3] سماچار سدھا برشن۔

باب 13

ہندوستانی مالیات عامہ، ہندوستان کے قرض کی ابتدا

پارلیمنٹ کی سلیکٹ کمیٹیوں نے جو شہادت قلمبند کی تھی، اور جس کے طویل اقتباسات پچھلے باب میں پیش کیے جا چکے ہیں، وہ 1852ء اور 1853ء میں شایع کر دی گئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت ہندوستان کے نظم و نسق کے متعلق مکمل اور تفصیلی تحقیقات کی گئی تھی۔ لوگوں کی اور خاص طور سے انگلستان کے تاجروں اور صنعت کاروں کی رائے تھی کہ ہندوستان کی حکومت ملکۂ انگلستان براہِ راست اپنے ہاتھ میں لے لے۔ شاہی وزیر جنھوں نے ڈائرکٹروں سے مشورہ کیے بغیر ہندوستان میں اکثر اعلانِ جنگ اور صلح نامے کیے تھے، ہندوستان کی حکومت براہِ راست اپنے ہاتھوں میں لینے کے خلاف نہیں تھے۔ پھر بھی ایک ایسی کمپنی کو موقوف کرنے میں قوم پس و پیش کر رہی تھی جو سلطنت ہندوستان کی معمار تھی۔ چنانچہ ایک قسم کا سمجھوتا کرنا پڑا۔

کمپنی کے چارٹر کی ایک دفعہ پھر تجدید کی گئی۔ لیکن 1853ء کے ایکٹ میں تجدید شدہ چارٹر کی مدت کا تعین نہیں کیا گیا تھا۔ اس میں صرف اتنا کہا گیا کہ جب تک پارلیمنٹ اس کے بارے میں کوئی حکم نہ دے اس وقت تک ہندوستان کے علاقے شاہی امانت کے طور پر کمپنی کے زیرِ حکومت رہیں گے۔ ڈائرکٹروں کی تعداد 24 سے گھٹا کر 18 کر دی گئی تھی اور ان اٹھارہ میں سے چھ ڈائرکٹر مقرر کرنے کا اختیار ملکہ انگلستان کو حاصل ہو گیا تھا۔ بورڈ آف کنٹرول کی نگرانی کے اختیارات بحال رہے تھے۔

چارٹر کے نئے ایکٹ کی رو سے اور تبدیلیاں بھی ہوئی تھیں۔ اس میں بنگال کے لیے ایک گورنر یا لیفٹننٹ گورنر مقرر کرنے کا اختیار دیا گیا تھا۔ اس صوبے کا پہلا لیفٹننٹ گورنر 1854ء میں مقرر

ہوا جو مدتوں خود گورنر جنرل کے زیرِ حکومت رہ چکا تھا۔ اس ایکٹ میں ایک اور سربریزی ڈفنی یا لیفٹننٹ گورنر کا صوبہ بنانے کا اختیار دیا گیا تھا۔ چنانچہ 1859ء میں پنجاب میں ایک لیفٹننٹ گورنر مقرر کیا گیا۔ ایکٹ کی رو سے جو اور اہم تبدیلیاں ہوئیں تھیں ان میں ہم گورنر جنرل کی کاونسل کا ذکر کر سکتے ہیں قانون سازی کے مقصد کے لیے اس میں اراکین کا اضافہ کرکے قانون سازی کی حد تک اس کی توسیع کر دی گئی تھی۔ ہندوستان کے عہدہ داروں کے تقرر کی سرپرستی کا حق کورٹ آف ڈائریکٹرز سے چھین لیا گیا تھا۔ آئندہ تقرر ان ضابطوں کے مطابق ہونا طے پایا تھا جو بورڈ آف کنٹرول نے بنائے تھے اور ان ضابطوں کے مطابق ہندوستان کی سول سروس میں داخلہ مقابلہ کے عام امتحان کے ذریعہ ہو سکتا تھا۔

ان تبدیلیوں کے ساتھ، جن کی وجہ سے کمپنی کے اختیارات میں کمی اور ملکہ کے اثرات میں اضافہ ہوگیا تھا، وہ دوعملی حکومت برقرار رہی جس کی حمایت جان اسٹورٹ مل نے کی تھی۔ یہ طریقہ کار کچھ برسوں تک جاری رہا یہاں تک کہ ہندوستان کے غدر نے برطانوی قوم اور برطانوی پارلیمنٹ کو کمپنی کی حکومت موقوف کرنے کا ایک مناسب موقع اور معقول وجہ مہیا کر دی۔ ہندوستان میں کمپنی کی حکومت کا ذکر ختم کرتے وقت ہم موجودہ باب میں اس کے مالیاتی نظام کا اجمالی جائزہ لیں گے۔

ان اعداد و شمار کا مطالعہ بڑا دلچسپ ہے جن سے ملکہ وکٹوریہ کی تخت نشینی سے لے کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے ختم ہونے تک کی اکیس سالہ مدت میں ہندوستان کی آمدنی اور خرچ ہوتے ہیں۔ ان میں اس زمانے کی سیاسی تاریخ کے انعکاسات دیکھے جا سکتے ہیں۔ مندرجہ ذیل نقشہ سیاسی دستاویزات سے تیار کیا گیا ہے[1]۔ ان سے زمین کے محصول سے ہونے والی مجموعی آمدنی کا تناسب اور گھریلو اخراجات کے طور پر انگلستان میں ہونے والے مجموعی مصارف کا تناسب ظاہر ہوگا۔

---

[1] پہلے دو سال کے اعداد و شمار ہاؤس آف کامنز کے حکم کی تعمیل میں تیار کیے جانے والے نقشے میں جو 22 / جون 1855ء کو شایع کیا گیا تھا اور ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ، 1852ء، ضمیمہ 7 سے لیے گئے ہیں۔ بقیہ برسوں کے اعداد و شمار برطانوی ہند کے اعداد و شمار کے اقتباس، 1840ء تا 1865ء سے لیے گئے جو پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں پیش کیا گیا تھا۔

سال	مالگزاری پونڈ	مجموعی آمدنی پونڈ	انگلستان میں ہونے والا خرچ پونڈ	مجموعی خرچ پونڈ
1837-38ء	[1] 1,18,53,975	2,08,58,820	23,04,445	[2] 1,98,57,970
1838-39ء	1,23,03,200	2,11,58,099	26,15,465	2,13,06,232
1839-40ء	1,22,73,982	2,01,24,038	25,78,966	2,22,28,011
1840-41ء	1,23,13,840	2,08,51,073	26,25,776	2,25,46,430
1841-42ء	1,21,54,587	2,18,37,823	28,34,786	2,35,34,446
1842-43ء	1,33,22,880	2,26,16,487	24,58,193	2,38,88,526
1843-44ء	1,32,28,850	2,35,86,573	28,44,073	2,49,25,371
1844-45ء	1,32,24,054	2,36,66,246	24,85,212	2,42,93,647
1845-46ء	1,33,86,517	2,42,70,608	30,44,067	2,56,62,738
1846-47ء	1,39,95,717	2,60,84,681	30,66,635	2,69,16,188
1847-48ء	1,44,37,254	2,49,08,302	30,16,072	2,67,46,474
1848-49ء	1,42,74,270	2,53,96,386	30,12,908	2,67,66,848
1849-50ء	1,52,48,694	2,75,22,344	27,50,937	2,69,60,988
1850-51ء	1,53,82,442	2,76,25,360	27,17,186	2,70,00,624

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

[1] اس میں اگر ایکسائز، سائر اور محترفہ کی آمدنی جوڑ دی جائے تو میزان 1,26,71,743 پونڈ بنتا ہے جیسا کہ "انگریزی راج کے ابتدائی دور میں" دکھایا گیا ہے۔

[2] اگر اس میں سے وہ رقم کم کر دی جائے جو انگلستان میں خرچ کی گئی تو ہندوستان میں ہونے والا مجموعی خرچ 1,75,53,525 پونڈ ہوا جیسا کہ "انگریزی راج کے ابتدائی دور میں" دکھایا گیا ہے۔

سال	مالگزاری	مجموعی آمدنی	انگلستان میں ہونے والا خرچ	مجموعی خرچ
1851-52ء	1,53,91,664	2,78,32,237	25,06,377	2,70,98,462
1852-53ء	1,53,65,250	2,86,09,109	26,97,488	2,79,76,735
1853-54ء	1,58,38,649	2,82,77,530	32,62,289	3,02,40,435
1854-55ء	1,64,19,031	2,91,33,050	30,11,735	3,07,53,456
1855-56ء	1,71,09,971	3,08,12,528	32,64,629	3,16,37,530
1856-57ء	1,77,22,170	3,16,91,015	35,29,673	3,16,08,875
1857-58ء	1,53,17,911	3,17,06,776	61,62,043	4,12,40,571

ان اعداد وشمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملکہ وکٹوریہ کی حکومت کے پہلے سال میں گھریلو اخراجات کے دوملین پونڈ نکالنے کے بعد بھی بچت تھی۔ اس کی وجہ لارڈ ولیم بین ٹنک کا محتاط نظم و نسق اوراس کی اوراس کے جانشین سرچارلس مٹکاف کی اصلاحات اور اخراجات میں کمی کرنے کی پالیسی تھی لیکن 1838ء میں لارڈ آکلینڈ ہندوستان آیا جس نے لارڈ پامرسٹن کے اشاروں پر توسیع پسندی کی پالیسی پر عمل کرنا شروع کیا۔ اس سال سے ہندوستان کے بجٹ میں بچت کے بجائے خسارہ ہونے لگا۔ یہ خسارہ اس کے جانشین لارڈ ایلن براکے دَورِ حکومت میں بھی برقرار رہا۔

آئندہ آنے والے گورنر جنرلوں یعنی ہارڈنگ اور ڈلہوزی کے زمانوں میں سکھوں سے لڑی جانے والی جنگوں کی وجہ سے حالات بدتر ہوگئے۔ سکھوں سے لڑی جانے والی آخری جنگ اور پنجاب کے زرخیز صوبے کے الحاق کے بعد 50-1849ء میں ایک دفعہ پھر بچت ہوئی لیکن ہندوستان کی قسمت کے مالک اس نوجوان سامراج پسند نے پھر بچت کو خسارے میں تبدیل کر دیا۔ لارڈ ڈلہوزی کے ہندوستان سے واپس جانے سے پہلے ہندوستان کے مجموعی اخراجات تیزی کے ساتھ بڑھ کر 54-1853ء میں تیس ملین پونڈ سے زیادہ ہوگئے تھے۔ اس کے باوجود کہ اس نے ناگپور اور دوسری زرخیز ریاستوں کا الحاق کرلیا تھا اس کے ہندوستان سے روانہ ہونے کے وقت یعنی 56-1855ء تک ہندوستان کے بجٹ میں خسارہ ہوتا رہا۔

لارڈ کیننگ کے دَورِ حکومت کے پہلے سال میں بچت ہوئی۔ اس کی اصل وجہ اودھ کا الحاق تھا جس پر اس کے ہندوستان پہنچنے سے پہلے قبضہ کرلیا گیا تھا لیکن ہندوستان کے غدر

کے سال یعنی 58-1857ء میں یہ بچت دس ملین کے بھاری خسارے میں تبدیل ہوگئی۔

مندرجہ بالا نقشہ ایک اور دلچسپ مگر افسوسناک واقعہ پر روشنی ڈالتا ہے۔ انگلستان میں ہونے والے مصارف میں، جن کو گھریلو اخراجات کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، برابر اضافہ ہو رہا تھا۔ ہندوستان میں انگریزی راج قائم ہونے اور اس کو برقرار رکھنے سے انگلستان اور ہندوستان دونوں کو فائدہ تھا اور اس سلطنت کو برقرار رکھنے کے اخراجات حصہ رسدی دونوں ملکوں کو برداشت کرنے چاہیے تھے۔ اس بات کو قرین انصاف سمجھا جاتا اگر ہندوستان میں ہونے والے اخراجات کا $\frac{9}{10}$ حصہ ہندوستان برداشت کرتا اور $\frac{1}{10}$ حصہ انگلستان ادا کرتا جو اس زمانے میں گھریلو اخراجات کا تناسب تھا۔ لیکن جس طرح بریلس (Brennus) کے زمانے میں فاتح کی تلوار ترازو کے پاسنگ کے طور پر استعمال ہوتی تھی اسی طرح آج بھی ہوتی ہے اور حاکم و محکوم قوموں کے درمیان ہونے والے مالیاتی انتظامات میں انصاف کو دخل نہیں ہوتا ہے۔ دولت کا نکاس ہندوستان کے لیے نقصان محض تھا۔ ملک سے باہر جانے والا روپیہ کبھی واپس نہیں آتا تھا۔ ایک امیر ملک کی تجارت و صنعت کو فروغ دینے کے لیے ایک غریب ملک سے دولت جاتی تھی۔

ایک نمایاں حیثیت رکھنے والے حاکم نے لکھا تھا جس کے شاندار کارناموں کا جائزہ ہم اس کتاب کے پانچویں باب میں لے چکے ہیں "جہاں تک ہندوستان پر پڑنے والے اس کے مضر اثرات کا تعلق ہے ہماری موجودہ پالیسی کا سب سے زیادہ قابل اعتراض پہلو وہ خراج ہے جو انگلستان کو ادا کیا جاتا ہے۔ ملک کے محاصل کو اسی ملک میں خرچ کرنا جہاں سے وہ وصول کیے جائیں معاشی اثرات کے تعلق سے ان محاصل سے قطعی مختلف ہوتا ہے جو ایک ملک سے وصول کیے جائیں اور دوسرے ملک میں خرچ کیے جائیں۔ اول الذکر صورت میں عام لوگوں سے وصول ہونے والے محاصل آبادی کے اس حصے کو تنخواہوں کی صورت میں ادا کیے جاتے ہیں جو سرکاری ملازمت میں ہوتا ہے۔ وہ اس روپے کو خرچ کرتے ہیں اور اس طرح محاصل کی صورت میں ادا کیا ہوا روپیہ صنعتی طبقوں کو واپس مل جاتا ہے۔ محاصل کی وجہ سے دولت کی تقسیم کا طریقہ بدل جاتا ہے لیکن ان سے قومی آمدنی کو کوئی نقصان نہیں ہوتا ہے۔"

"لیکن جب محاصل کی شکل میں حاصل کی ہوئی دولت اس ملک میں خرچ کی جائے جہاں سے وہ حاصل نہیں کی گئی تھی تو صورتِ حال یکسر بدل جاتی ہے۔ اس صورت میں محاصل کے معنی صرف اتنے نہیں ہوتے کہ قومی آمدنی کا ایک حصہ شہریوں کے ایک طبقے سے دوسرے

طبقے کو منتقل کر دیا گیا بلکہ محصول ادا کرنے والے ملک سے جو رقم باہر چلی جاتی ہے وہ ختم ہو جاتی ہے اور نقصان محض کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ جہاں تک قومی پیداوار پر پڑنے والے اس کے اثرات کا تعلق ہے کسی رقم کا دوسرے ملک کو منتقل ہونا ایسا ہی ہے جیسے اسے سمندر میں پھینک دیا جائے۔"

"ہندوستان سے وصول ہونے والے خراج کو چاہے ہم انصاف کی ترازو میں تولیں یا اپنے حقیقی مفاد کی روشنی میں اس کا جائزہ لیں آخر میں ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ انسانیت، دانشمندی اور معاشی سائنس کے مسلمہ اصولوں کے منافی ہے۔ اس صورت میں دانشمندی کا تقاضہ یہ ہے کہ آئندہ حکومتِ ہند کی گھریلو اخراجات پر صرف ہونے والی وہ رقم شہنشاہی خزانے سے ادا کی جائے جو واقعی خراج کی تعریف میں آتی ہے۔ غالباً ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ان اخراجات میں مندرجہ ذیل باتیں شامل ہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حصّوں پر دیا جانے والا منافع، گھریلو قرضوں کا سود، حکومتِ ہند کے اس محکمے کے افسروں اور دوسرے ملازمین کو دی جانے والی تنخواہیں اور عمارتوں پر خرچ کی جانے والی رقمیں جو انگلستان میں ہیں، انگلستان آنے والے فوجی اور سول ملازمین کی پنشنیں اور چھٹیوں کے بھتّے، ہندوستان میں متعین برطانوی فوج کے سلسلے میں اس ملک میں کیے جانے والے ہر قسم کے اخراجات اور برطانوی فوج کے ہندوستان جانے اور وہاں سے واپس آنے پر صرف ہونے والی رقم کا ایک حصّہ[1]۔"

پچھلی جلد میں ہم نے ملکہ وکٹوریہ کی تخت نشینی تک ہندوستان میں برطانوی سلطنت کی ابتدا اور استحکام کا جائزہ لیا تھا۔ اس میں دکھایا گیا تھا کہ برطانوی حکومت کی ابتدا سے 1837ء تک ہندوستان کی مجموعی آمدنی یہاں ہونے والے مجموعی اخراجات سے زیادہ تھی حالانکہ برطانوی افسروں کو بڑی بڑی تنخواہیں دی جاتی تھیں اور ہندوستان میں لڑی جانے والی جنگوں پر بہت روپیہ برباد کیا جاتا تھا۔ اس باب میں ہم نے جو اعداد و شمار پیش کیے ہیں وہ بھی ظاہر کرتے ہیں کہ ملکہ وکٹوریہ کی حکومت کے پہلے اکیس سال میں یعنی 1837ء سے 1858ء تک ہندوستان میں ہونے والے اخراجات سے اس کی آمدنی زیادہ تھی۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں

---

[1] میجر ونگیٹ - ہندوستان کے ساتھ ہمارے مالیاتی رشتے (Our Financial Relations with India) لندن 1859ء۔

کہ برطانوی حکومت کی ابتدا سے اگر ہندوستان کو گھریلو اخراجات کے بارے محفوظ رکھا جاتا تو 1858ء میں کمپنی سے ملکہ کو حکومت منتقل ہوتے وقت کوئی سرکاری قرض نہ ہوتا بلکہ بڑی بچت دکھائی جا سکتی کمپنی نے اپنے صد سالہ دورِ حکومت میں جو سرکاری قرض لیا تھا اس کی وجہ انگلستان میں ہونے والا خرچ تھا جس کا بار ہندوستان پر ڈالا گیا تھا۔ انصاف کی رو سے یہ قرض ہندوستان کو نہیں ادا کرنا چاہیے تھا۔ اگر اس صدی میں انگلستان اور ہندوستان کے درمیان پائے جانے والے مالیاتی رشتوں کے تعلق سے کسی غیر جانبدار عدالت میں رجوع کیا جاتا تو اس عدالت کا فیصلہ کیا ہوتا اس کے متعلق کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ گھریلو اخراجات جس رقم کی نمائندگی کرتے ہیں اس سے کہیں زیادہ دولت انگلستان نے ہندوستان سے حاصل کی ہے۔ انصاف اور دیانت داری کا تقاضہ تھا کہ ان مصارف کو خود انگلستان برداشت کرتا۔ انصاف اور اخلاق کی رو سے 1858ء میں ہندوستان پر کوئی سرکاری قرض نہیں ہونا چاہیے تھا بلکہ اس کے برعکس فاضل ادائیگیوں کی رقم کو واپس مانگنے میں وہ حق بجانب ہوتا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ انصاف کا تقاضہ ہے کہ ہم یہ بتا دیں کہ اس کے دورِ حکومت میں گھریلو اخراجات نسبتاً کم تھے۔ وہ ہندوستان کی سالانہ آمدنی کے $\frac{1}{10}$ سے کچھ زیادہ تھے۔ غدر سے پہلے کے بیس سال میں آمدنی بیس ملین سے بڑھ کر تیس ملین ہو گئی تھی اور گھریلو اخراجات ڈھائی ملین سے بڑھ کر ساڑھے تین ملین ہو گئے تھے۔ ہندوستان میں ملکہ کی حکومت کا سب سے افسوسناک نتیجہ یہ ہوا کہ گھریلو اخراجات میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہونے لگا۔ یہ اضافہ محض مطلق نہیں تھا بلکہ آمدنی کے تناسب سے بھی اضافہ ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ملکہ کی حکومت ذمہ دار حکومت نہیں تھی۔ یہ نتیجہ جان اسٹورٹ مل کی اس رائے کو بجا ثابت کرتا ہے، جس کا اقتباس پچھلے باب میں پیش کیا گیا تھا، کہ سیکریٹری آف اسٹیٹ اور اس کی کاونسل کے ذریعہ ہندوستان پر حکومت کرنا برطانوی حکومت میں "پائی جانے والی مکمل مطلق العنانیت ہوگی"۔

ہندوستان کا مجموعی سرکاری قرضہ، جس پر سود ادا کرنا پڑتا تھا، 1792ء میں 7 ملین پونڈ سے کچھ زیادہ تھا اور 1799ء میں بڑھ کے دس ملین ہو گیا تھا۔ اس کے بعد لارڈ ویلزلی کی جنگوں کا دور شروع ہوا اور 1805ء میں سرکاری قرض بڑھ کے 21 ملین ہو گیا اور 1807ء میں 27 ملین ہو گیا۔ کئی سال تک قرض کی رقم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی لیکن 1829ء میں وہ بڑھ کے 30 ملین ہو گیا۔ اس سے ایک سال پہلے لارڈ ولیم بینٹنک ہندوستان آ چکا تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ کا وہ واحد قابل و محتاط گورنر جنرل تھا جس نے ہندوستان کا سرکاری قرضہ خاصا کم کر دیا۔ 30/اپریل 1836ء کو ہندوستان کے ذمّہ 2,69,47,434 پونڈ قرض رہ گیا تھا۔[1]

مندرجہ ذیل نقشے میں ملکہ وکٹوریہ کی تخت نشینی سے لے کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے اکیس سالہ دور کا سرکاری قرض دکھایا گیا ہے۔

سال	ہندوستانی قرض پونڈ	انگلستان میں لیا جانے والا قرض پونڈ	کُل میزان پونڈ
1837-38ء	3,02,49,893	35,22,825	3,37,72,718
1838-39ء	3,02,31,162	17,34,300	3,19,65,462
1839-40ء	3,27,50,697	17,34,300	3,44,84,997
1840-41ء	3,41,87,827	17,34,300	3,59,22,127
1841-42ء	3,66,70,173	17,34,300	3,84,04,473
1842-43ء	3,87,44,340	17,34,300	4,04,78,640
1843-44ء	4,01,49,151	17,34,300	4,18,83,451
1844-45ء	4,12,03,150	22,99,600	4,35,02,750
1845-46ء	4,15,92,249	22,99,600	4,38,91,849
1846-47ء	4,45,84,625	22,99,600	4,68,84,225
1847-48ء	4,59,57,613	27,99,600	4,87,57,213
1848-49ء	4,71,51,018	38,99,500	5,10,50,518

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

[1] یہ "رجسٹری شدہ قرض" تھا۔ اس کے علاوہ ٹریژری نوٹ اور ڈپازٹ تھے جن کی بنا پر مجموعی "ہندوستانی قرض" 2,98,32,288 تھا۔ اس میں اگر "گھریلو دستاویزات کا قرض" شامل کر دیا جائے تو 30/اپریل 1836ء کو ہندوستان پر مجموعی قرض 3,33,55,536 پونڈ تھا۔

سال	ہندوستانی قرض	انگلستان میں لیا جانے والا قرض	کُل میزان
1849-50ء	5,00,35,268	38,99,500	5,39,34,768
1850-51ء	5,11,99,815	38,99,500	5,50,99,315
1851-52ء	5,12,15,193	38,99,500	5,51,14,693
1852-53ء	5,23,13,094	39,20,592	5,62,33,686
1853-54ء	4,97,62,876	39,20,592	5,36,83,468
1854-55ء	5,16,15,528	39,15,592	5,55,31,120
1855-56ء	5,38,48,922	39,15,317	5,77,64,239
1856-57ء	5,55,46,652	39,15,317	5,94,61,969
1857-58ء	6,07,04,084	87,69,400	6,94,73,484

یہ اعداد و شمار سرکاری دستاویزات سے حاصل کیے گئے ہیں[1]۔

1839-40ء کے قرض میں جو $2\frac{1}{2}$ ملین کا اضافہ نقشے میں دکھایا گیا ہے وہ حقیقی اضافہ نہیں تھا۔ دیکھنے میں جو اضافہ معلوم ہوتا ہے وہ ان دستاویزات میں جن سے اعداد و شمار لیے

---

[1] سترہ سال یعنی 1833-34ء لغایت 1849-50ء کے اعداد و شمار ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ برائے 1853ء ضمیمہ 2، میں درج ہیں۔ اعداد و شمار کے اقتباس میں 26 سال یعنی 1839-40ء لغایت 1864-65ء کے اعداد و شمار درج ہیں۔ چنانچہ دونوں دستاویزات میں دس سال یعنی 1839-40ء لغایت 1849-50ء کے اعداد و شمار مشترک ہیں لیکن وہ ایک دوسرے سے ملتے نہیں ہیں مثلاً سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق 1839-40ء میں مجموعی قرض 3,24,38,078 پونڈ تھا جبکہ اعداد شمار کے اقتباس میں اسے 3,44,84,997 پونڈ دکھایا گیا ہے سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ ضمیمہ 2، میں جو نقشہ دیا ہوا ہے اس میں مجموعی قرض کا کچھ حصہ درج ہونے سے رہ گیا ہوگا۔ میں نے صرف دو سال کے اعداد و شمار سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ سے لیے ہیں یعنی 1837-38ء اور 1838-39ء کے اس لیے کہ اعداد و شمار کے اقتباس میں ان برسوں کے اعداد و شمار نہیں دیے گئے ہیں۔ بقیہ اُنیس سال یعنی 1839-40ء لغایت 1857-58ء کے اعداد و شمار میں نے اعداد و شمار کے اقتباس سے لیے ہیں اس لیے کہ ہندوستان کے مجموعی قرض کے متعلق وہ زیادہ صحیح معلومات فراہم کرتا ہے۔

گئے دہرے حسابات رکھنے کے دو طریقوں پر عمل کرنے کا نتیجہ ہے جس کی تشریح حاشیے میں کر دی گئی ہے۔ لیکن 41-1840ء سے لارڈ آکلینڈ کی افسوسناک جنگ افغانستان کا اثر ہندوستان کی مالیات پر پڑنا شروع ہوگیا اور 45-1844ء میں مجموعی قرض $34\frac{1}{2}$ ملین سے بڑھ کے $43\frac{1}{2}$ ملین ہوگیا۔ ہندوستان پر جنگ افغانستان کے اخراجات کا بوجھ ڈالنے کے خلاف صرف ایسٹ انڈیا کمپنی ہی نے احتجاج نہیں کیا بلکہ ہاؤس آف کامنز کے بہت سے اراکین نے بھی جان برائٹ کی حمایت کی جب اس نے کہا "پچھلے سال میں نے جنگ افغانستان پر ہونے والے بے اندازہ خرچ کا ذکر کیا تھا جو قریب قریب 15 ملین پونڈ تھا۔ یہ تمام خرچ انگلستان کے محصول دہندگان پر ڈالا جانا چاہیے تھا۔ آخر کو یہ جنگ برطانوی کابینہ کے حکم سے اور برطانوی مقاصد کے لیے لڑی گئی تھی[1]۔"

لارڈ ایلن برا کے الحاق سندھ اور لارڈ ہارڈنگ اور لارڈ ڈلہوزی کی سکھوں کے خلاف جنگوں پر اور روپیہ صرف ہوا اور ہندوستان کا مجموعی قرض 51-1850ء میں بڑھ کے 55 ملین ہوگیا۔ اس کے بعد قرض میں کمی زیادتی ہوتی رہی اور قرض کم کرنے کی کوششیں کی جاتی رہیں لیکن ڈلہوزی کے زمانہ حکومت کے آخری سال میں قرض بڑھ کے $59\frac{1}{2}$ ملین ہوگیا۔ 1857ء میں ہونے والے غدر نے ایک سال میں قرض میں 10 ملین کا اضافہ کر دیا۔ 30 اپریل 1858ء کو ہندوستان کا مجموعی قرض $69\frac{1}{2}$ ملین پونڈ ہو چکا تھا۔

ایک غیر جانبدار مورخ نے کہا ہے کہ دُنیا کی کسی بغاوت کو اگر حق بجانب قرار دیا جا سکتا ہے تو وہ ہندوستان کے ہندو اور مسلمان سپاہیوں کی بغاوت تھی جس کی وجہ وہ مکروہ اور قابل نفرت کارتوس تھے جن پر گائے اور سور کی چربی لگائی جاتی تھی غلطی تو برطانوی حکومت کی تھی لیکن اس کی قیمت ہندوستان کو ادا کرنی پڑی۔ اس سے پہلے ہندوستانی فوج چین اور افغانستان میں استعمال کی جا چکی تھی اور سرحد پار ہندوستانی فوج کو استعمال کرنے کے سلسلے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو کوئی رقم ادا نہیں کی گئی تھی۔ لیکن جب ہندوستان کے غدر کو فرو کرنے کے لیے برطانوی فوج ہندوستان بھیجی گئی تو انگلستان نے بے مثال سختی کے ساتھ فوج کی منتقلی پر ہونے والے اخراجات وصول کر لیے۔

"نوآبادیاتی دفتر کے تمام اخراجات یا دوسرے الفاظ میں یہ کہیے کہ ہندوستان کے علاوہ

---

[1] جان برائٹ کی تقریر جو یکم اگست 1859ء کی گئی تھی۔

تمام برطانوی نوآبادیات ومقبوضات کے ان محکموں کے اخراجات جو انگلستان میں ہیں اور ان پر ہونے والے فوجی اور بحری اخراجات بھی انگلستان کے خزانے سے ادا کیے جاتے ہیں۔ اس لیے یہ قدرتی نتیجہ نکلتا ہے کہ ہندوستان کے تعلق سے ہونے والے اس قسم کے اخراجات کو بھی انگلستان کو برداشت کرنا چاہیے۔ لیکن حقیقت کیا ہے؟ ہماری ہندوستانی سلطنت کے فوجی دفاع پر برطانوی خزانے سے کبھی ایک شلنگ بھی خرچ نہیں کیا گیا ہے۔"

"کتنی عجیب بات ہے کہ ایک ایسی قوم جو نوآبادیوں اور دوسرے ملکوں کو ان کی ضرورت کے وقت مالی امداد دینے میں فراخ دلی بلکہ فضول خرچی سے کام لیتی ہے خود اپنی عظیم ہندوستانی سلطنت کو شدید مالی مشکلات کی صورت میں، خلاف عادت ناقابل فہم کنجوسی سے کام لیتے ہوئے، امداد دینے سے انکار کر دے"۔

"صرف اتنا ہی نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب مزید فوج ہندوستان بھیجی جاتی ہے جیسا کہ گزشتہ شورش کے زمانے میں کیا گیا تھا، تو ہندوستان روانہ ہونے سے پہلے کے چھ مہینے کی تنخواہوں کا بار بھی ہندوستان کے خزانے پر ڈالا جاتا ہے اور برطانوی فوج کا دفتر محاسبی حکومت ہند کی طرف واجب الوصول قرض کی طرح اس رقم کو وصول کر لیتا ہے"۔

"غدر کے بحرانی دور میں، جب کہ ہندوستان کی مالی حالت انتہائی سقیم ہو چکی تھی، انگلستان نے نہ صرف ہندوستان سے تمام مزید فوج پر روانہ ہونے کی تاریخ سے خرچ ہونے والی رقم وصول کی بلکہ ہندوستان روانہ ہونے کی تاریخ سے چھ مہینے پہلے تک اس فوج پر اس ملک میں جو رقم خرچ کی گئی تھی اس کا بھی مطالبہ کیا[1]"

لیکن سر جارج ون گیٹ سے عظیم تر ایک شخصیت نے غدر کے اخراجات کے موضوع پر زیادہ صاف گوئی اور بے باکی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ جان برائٹ نے کہا تھا "میرا خیال ہے کہ اس غدر پر خرچ ہونے والے چالیس ملین کا بار ہندوستان کے لوگوں کے لیے ناقابل برداشت ہے۔ یہ اخراجات پارلیمنٹ اور انگلستان کے لوگوں کی بدانتظامی کی بنا پر ہوئے ہیں۔ اگر ہر شخص کے ساتھ انصاف کیا جائے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ چالیس ملین اس ملک

---

[1] ون گیٹ "ہندستان کے ساتھ ہمارے مالیاتی تعلقات" (Our Financial Relations with India)، لندن، 1858ء۔

کے لوگوں پر عاید ہونے والے محاصل میں سے ادا کیے جانے چاہئیں[1]"

ان اقتباسات کو پیش کرنے اور ان واقعات کو دُہرانے سے ہمارا یہ مقصد نہیں کہ ایک ایسی بحث پھر شروع کی جائے جس کو لوگ بھول چکے ہیں۔ ہمارا مقصد تو صرف اتنا ہے کہ ہندوستان کے قرض کے ابتدائی مراحل کی تشریح کر دی جائے۔ عام لوگوں کا خیال ہے کہ ہندوستان کے قرض کی بنیاد وہ سرمایہ تھا جو ہندوستان کو فتح کرنے، اس کا انتظام کرنے اور اس کے وسائل کو ترقی دینے پر انگلستان کو خرچ کرنا پڑا۔ اس باب میں جن واقعات کی وضاحت کی گئی ہے ان سے معلوم ہوگا کہ 1858ء تک ہندوستان کے قرض کی بنیاد یہ نہیں تھی۔ اپنی فتح اور اپنے نظم ونسق کے اخراجات خود ہندوستان نے ادا کیے تھے کمپنی کی حکومت کے آخری سال تک جو تھوڑا بہت سونا انگلستان سے ہندوستان آیا تھا وہ اس خراج کا ایک بہت چھوٹا سا حصہ تھا جو ہندوستان ایک صدی تک ادا کرتا رہا تھا۔ ادا کی جانے والی رقم کا تخمینی اندازہ بھی لگانا ممکن نہیں ہے۔ سر جارج ون گیٹ کا خیال ہے کہ انیسویں صدی کی ابتدا سے 1858ء تک 100 ملین ادا کیے گئے۔ اس رقم میں سود شامل نہیں ہے منٹگمری مارٹن نے ہندوستان کی شرح سود یعنی 12 فیصدی کے حساب سے سود در سود لگا کر بتایا ہے کہ انیسویں صدی کے پہلے تیس سال میں 700 ملین ادا کیے گئے۔ اس رقم میں وہ رقمیں شامل نہیں ہیں جو اٹھارھویں صدی میں انگلستان بھیجی گئی تھیں۔

ہندوستان کے قرض کی بنیاد وہ خراج تھا جو گھریلو اخراجات کے نام پر وصول کیا جاتا تھا۔ ہندوستان اپنے نظم ونسق کے اخراجات خود برداشت کرتا تھا۔ علاقے حاصل کرنے کے لیے جو جنگیں عام طور سے لڑی جاتی تھیں ان کے اخراجات بھی ہندوستان خود برداشت کرتا تھا۔ ان مقامی اخراجات کے علاوہ اس سے جو خراج طلب کیا جاتا تھا ظاہر ہے کہ وہ اس کی پوری ادائیگی نہیں کر سکتا تھا۔ ہر سال کچھ نہ کچھ بقایا رہ جاتا تھا اور اس طرح ہندوستان پر قرض بڑھتا گیا جو لارڈ ڈلہوزی کی ہندوستان سے واپسی کے وقت ساٹھ ملین ہو چکا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے خاتمے کے وقت غدر کے پہلے سال کے اخراجات نے قرض کو بڑھا کر ستر ملین کر دیا تھا۔

حکومت کی منتقلی کی وجہ سے ہندوستان پر اخراجات کا جو نیا بار ڈالا گیا اس کا ذکر اگلے باب میں کیا جائے گا۔ ملکہ نے کمپنی سے ہندوستان کی سلطنت خریدی مگر اس کی قیمت ہندوستان

---

[1] ایسٹ انڈیا قرض کے موضوع پر جان برائٹ کی تقریر، مارچ 1859ء۔

کے لوگوں کو ادا کرنی پڑی کمپنی کے حصہ داروں کو جو رقم ادا کی گئی وہ ملک کے خزانے سے نہیں ادا ہوئی تھی جس کو ایک سلطنت مل گئی تھی۔ یہ رقم ہندوستان کے قرض میں شامل کر دی گئی تھی۔

کیا انگلستان کم ازکم اس قرض کی ضمانت کر دے گا جو اس طرح بڑھتا رہا ہے؟ اگر انگلستان ضمانت کم کر دے تو اس قرض کے سود میں ایک ملین پونڈ کی کمی ہو جائے گی اور ہندوستان کے محصول دہندگان کا بوجھ کسی قدر ہلکا ہو جائے گا۔ لارڈ اسٹینلی نے جو بعد میں لارڈ ڈربی کے نام سے مشہور ہوا، 1859ء میں محتاط الفاظ میں اس کا مشورہ دیا تھا۔

"مجھے معلوم ہے کہ اس ملک کی حکومت اور پارلیمنٹ کی ہمیشہ یہ پالیسی رہی ہے کہ ہندوستان کے قرض کے متعلق وہ کوئی ذمہ داری قبول نہ کریں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ قرض ہندوستان کے خزانے سے ادا ہونا چاہیے۔ موجودہ حالات کے پیش نظر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں اس پالیسی میں تبدیلی کی سفارش نہیں کروں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ اس قسم کی تجویز لوگوں کو خائف کر دے گی اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس کو تسلیم کرنے سے یقیناً انکار کر دیا جائے گا لیکن یہ مسئلہ بار بار سامنے آتا رہے گا اور جس طرح ہم آج اس پر غور کر رہے ہیں اسی طرح آئندہ بھی ہمیں اس پر غور کرنا پڑے گا۔"

"میں ایوانوں کی توجہ اس امر کی طرف دلانا چاہتا ہوں کہ آئندہ اگر اس سلسلہ میں متفقہ پالیسی میں کوئی تبدیلی ہوئی اور اس قرض کی قومی ضمانت کی گئی تو اس ضمانت کی بنا پر ہندوستان کے قرض پر ادا کیے جانے والے سود میں 7,50,000 بلکہ 10,00,000 پونڈ سے کم بچت نہیں ہوگی۔ اس رقم سے اگر ایک ذخیرہ ادائی بنایا جائے تو اس سے بڑی حد تک اصل کی ادائیگی کی جا سکے گی[1]"

لیکن چھ مہینے بعد خود جان برائٹ نے ہندوستانی قرض کی شہنشاہی ضمانت کے تصوّر کی مخالفت کی۔ اس کی دلیلیں اس کے انداز فکر کی غمازی کرتی ہیں۔ "شہنشاہی ضمانت کی مخالفت کرنے کی وجہ یہ نہیں کہ اس معاملہ میں مجھے انگلستان کے محصول دہندگان سے کوئی خاص ہمدردی ہے۔ میرا خیال ہے کہ انگلستان کے محصول دہندگان نے عام طور سے ہندوستان کے معاملات کو نظرانداز کیا ہے اور انہیں اس کی قیمت ادا کرنی چاہیے . . . . میں شہنشاہی ضمانت کی مخالفت اس لیے کر رہا ہوں کہ ہم نے اگر ہندوستان کے افسروں کو قابو میں نہ رکھا تو ہندوستان کے

---

[1] ایسٹ انڈیا قرض کے موضوع پر لارڈ اسٹینلی کی تقریر: فروری 1859ء۔

وسائل کو ختم کرنے کے بعد وہ انگلستان کے لوگوں کی جیبیں ٹٹولنے لگیں گے۔ چونکہ انگلستان کے لوگوں کو ہندوستان میں ہونے والے اخراجات پر کوئی اختیار حاصل نہیں ہے اس لیے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس حد تک اسراف بیجا کے مرتکب ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کو بچانے کی کوشش میں ہم انگلستان کو خاصا تباہ کر ڈالیں[1]۔"

جان برائٹ بھی یہ بات نہ سمجھ پایا کہ ہندوستان کے قرض کی کچھ ذمہ داری اگر انگلستان کے لوگوں پر ڈال دی جاتی تو وہ ہندوستان کے معاملات کو نظر انداز کرنا ترک کر دیتے اور ہندوستان میں ہونے والے اخراجات پر حقیقی اختیار حاصل کر لیتے۔

---

[1] جان برائٹ کی تقریر، یکم اگست 1859ء۔

باب 14

کمپنی کی حکومت کا اختتام

انگلستان روانہ ہونے سے پہلے لارڈ ڈلہوزی نے ہندوستان میں اپنی آٹھ سالہ حکومت کے متعلق ناقابلِ فراموش تبصرہ ان الفاظ پر ختم کیا تھا۔

''ہندوستان سے روانہ ہوتے وقت میں یہ امید لے کر جا رہا ہوں اور میری دعا ہے کہ ابدالآباد تک اُن پریزیڈنسیوں اور صوبوں سے سال بہ سال آنے والی رپورٹیں، جو ہماری حکومت میں شامل ہیں، امن، خوشحالی اور ترقی کی خوش خبریاں سُناتی رہیں گی''۔

ہندوستان روانہ ہونے سے پہلے لارڈ کیننگ نے لندن کی ایک الوداعی دعوت میں کورٹ آف ڈائریکٹرز کے اراکین کی تقریروں کا جواب دیتے ہوئے پیغمبرانہ شان سے یہ الفاظ کہے تھے۔

''ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہندوستان کی فضا نہایت صاف و پُرسکون سہی مگر کسی وقت بادل اُٹھ سکتا ہے۔ شروع میں بالشت بھر کا ٹکڑا نظر آنے والا بادل بڑھ کے پوری فضا پر چھا سکتا ہے اور ہمارے لیے ایک بہت بڑا خطرہ بن سکتا ہے''۔

لارڈ ڈلہوزی نے امن، خوشحالی اور ترقی کی جو جبین تصویر پیش کی تھی اس کی قسمت میں لکھا تھا کہ وقتی طور سے وہ دھندلی پڑ جائے۔ لارڈ کیننگ نے سلطنت پر گہرے بادل چھانے کا ذکر کیا تھا اور اس کی پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی۔

1857ء کے غدر کی وجوہ کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہیں۔ جان لارنس نے لکھا تھا "مجموعی اعتبار سے ہندوستانی فوج واقعی سمجھتی تھی کہ ان کارتوسوں کا عام استعمال، جس سے اُن کے مذہبی

جذبات مجروح ہوتے تھے، محض وقتی تھا... حقیقت میں غدر کی ابتدا اس سے ہوئی۔[1]" اب ہمیں لارڈ رابرٹس کی تصدیق کی بنا پر معلوم ہوگیا ہے کہ ہندوستانی فوج کا خیال بے بنیاد نہیں تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ رائج کیے جانے والے کارتوسوں پر گائے اور سور کی چربی لگائی جاتی تھی۔

یہ بھی واقعہ ہے کہ سیاسی وجوہ کی بنا پر محض سپاہیوں کی بغاوت شمالی اور وسطی ہندوستان کے بہت سے طبقوں میں پھیل گئی اور اس نے ایک سیاسی شورش کی شکل اختیار کرلی۔ لارڈ ڈلہوزی نے بڑے پیمانے پر اور تیزی کے ساتھ ریاستوں کا الحاق کیا تھا۔ اس کی بنا پر لوگ محسوس کرنے لگے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی پورے ہندوستان کو فتح کرنا چاہتی ہے اور اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے وہ معاہدوں اور ملک کے قوانین کو نظر انداز کر رہی ہے۔ لوگوں کے ذہن صاف نہیں تھے۔ بغاوت کے رہنماؤں نے اعلان جاری کیے جن میں کہا گیا کہ بدیسی حاکم زمین حاصل کرنے کے لیے وعدہ خلافی کیا کرتے ہیں۔ جھانسی کی ریاست کی بیوہ رانی، جس کا الحاق لارڈ ڈلہوزی نے کیا تھا، اس بغاوت کی روح رواں بن گئی۔ وہ مردانے کپڑے پہن کر انگریزی فوج کے خلاف لڑی اور میدانِ جنگ میں کام آئی۔ اودھ میں بھی، جس کے الحاق کا سہرا اسی حاکم کے سر ہے، باغی سپاہیوں کے ساتھ بہت سے لوگ شامل ہوگئے اور تخت سے اُتار دیے جانے والے بادشاہ کے لیے لڑنے لگے۔

موجودہ کتاب کا مقصد اس اہم جنگ کے وہ ہیجان خیز واقعات سنانا نہیں ہے جو سر جان کے اور ملیسن (Malleson) نے اپنی اہم کتابوں میں پیش کیے ہیں اور جنھیں بڑی وضاحت کے ساتھ آج کی کم اہم مگر نہایت مفید کتابوں میں پیش کیا گیا ہے۔ ان مٹھی بھر انگریزوں کی بہادری جنھوں نے موج در موج آنے والے باغیوں کا لکھنؤ میں مقابلہ کیا اور اس قابل فخر اور بہترین انگریز سپاہی یعنی ہنری لارنس کی افسوسناک موت جس نے "اپنا فرض ادا کرنے کی کوشش کی"، وہ ثابت قدمی جس کے ساتھ فوجیوں کے چھوٹے سے ایک دستے نے دہلی کی تاریخی پہاڑی پر تھکا دینے والے کئی مہینوں تک قبضہ رکھا یہاں تک کہ جان لارنس نے پنجاب میں مقیم تمام فوج اکٹھا کرکے وہ ناقابل فراموش حملہ کیا جو سلطنت کے لیے فیصلہ کن ثابت ہوا، وسط ہند میں تیزی اور کامیابی کے ساتھ کی جانے والی پیش قدمی اور روہیلکھنڈ اور اودھ کی طویل اور دشوار مہم۔ یہ تمام

---

[1] دہلی کے بادشاہ کے مقدمے کے بارے میں خط مورخہ 29 اپریل 1858ء۔

واقعات تاریخ انگلستان سے تعلق رکھتے ہیں اور انگریزی ادب کا جُز بن چکے ہیں۔ وکٹوریہ کے زمانے کے سب کے بڑے شاعر نے لکھنؤ کے متعلق جو نظم لکھی ہے وہ کبھی بھلائی نہیں جا سکے گی۔ آج کل کے عام پسند مصنفین جان نکلسن اور فتح دہلی کی تاریکی کہانیاں سُنایا کرتے ہیں۔

اس کتاب کا مقصد یہ بھی نہیں ہے کہ غدر کے واقعات کے تاریک پہلوؤں کو پیش کیا جائے۔ انگریز اور ہندوستانی دونوں دل سے چاہتے ہیں کہ وہ واقعات تاریخ سے محو کر دیے جائیں۔ کم از کم وہ اس طرح تو پیش نہ کیے جائیں جس طرح لڑکوں کی نصابی کتابوں میں پیش کیے گئے ہیں۔ ہندوستان میں جنگیں تو کلایو اور وارن ہیسٹنگز کے زمانوں سے ہوتی رہی ہیں لیکن ایسی جنگ کبھی نہیں ہوئی تھی جس میں دونوں فریقوں نے وہ مظالم و جرائم کیے ہوں جو 1857ء میں کیے گئے۔ حالانکہ باغیوں کا خیال تھا کہ وہ اپنے مذہب اور قوم کے تحفظ کے لیے تلوار اُٹھا رہے ہیں لیکن انھوں نے نہتّے بچوں اور عورتوں کے بیدردانہ اور بہیمانہ قتل عام کی انسانیت سوز حرکتیں کرکے اپنے مذہب اور قوم کو بدنام کیا۔ دوسری طرف انگریزی فوج نے اپنے راستوں میں سینکڑوں میل تک گانو کو جلا کر ملک کو "ریگستان" میں تبدیل کر دیا، باغیوں کے بھاگ جانے کے بعد برطانوی فاتحوں نے دہلی کے لوگوں کا قتل عام کیا اور برطانوی اسپیشل کمشنروں نے شمالی ہندوستان کے ہزاروں بے گناہوں کو پھانسیاں دیں۔ ایک زندہ مورخ کے الفاظ میں[1]
"ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دو وحشی قوموں میں مقابلہ ہو رہا ہے جو نہ سوچ سکتے ہیں اور نہ ان میں رحم و انصاف کا جذبہ باقی رہا ہے وہ صرف اتنا محسوس کرتے تھے کہ دشمنوں کو ختم کرنا چاہیے۔ دونوں طرف سے اس قسم کے مظالم کیے گئے کہ اُن کے متعلق خاموشی اختیار کرنا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔"

---

[1] ریورنڈ ڈاکٹر فرنک برائٹ کی تاریخ انگلستان (History of England) دور چہارم (1893ء)، ص 328۔ اس کے علاوہ دیکھیے ہاؤس آف کامنز کے حکم کی تعمیل میں داخل ہونے والی دستاویزات جو 4 / فروری 1858ء کو شائع ہوئیں مونٹگمری مارٹن کی کتاب "دیسی سپاہیوں کی 1857ء کی بغاوت کی تاریخ (History of the Mutiny of the Sepoy Troop in 1857) باس ورتھ اسمتھ "لارڈ لارنس کی سوانح" (Life of Lord Lawrence) (1885ء) جلد دوم، ابواب 4 اور 5۔ سر چارلس ایچی سن "لارڈ لارنس" (Lord Lawrence) اور دوسری کتابیں جن میں غدر کا جائزہ لیا گیا ہے۔

ہندوستان میں ان مظالم کو سب سے زیادہ لارڈ کیننگ نے محسوس کیا اور انگلستان میں اُن پر سب سے زیادہ ملکہ نے افسوس کیا۔ لارڈ کیننگ نے ملکہ کو لکھا تھا "بلا سوچ سمجھی اور شدید انتقامی کارروائیوں کے وہ لوگ بھی مرتکب ہو رہے ہیں جنھیں بہتر مثال پیش کرنی چاہیے تھی۔ اپنے ہم وطنوں کی حرکتیں یاد کر کے شرم آتی ہے"۔ ملکہ وکٹوریہ نے جواب میں لکھا تھا "لارڈ کیننگ باور کریں کہ خود یہاں کے لوگ ہندوستان کے متعلق جن غیر مسیحی جذبات کا اظہار کرتے ہیں ان کی بنا پر ملکہ بھی اُن کے (لارڈ کیننگ کے) غم و غصّے کے جذبات میں شریک ہے[1]۔"

ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کو تو بہرحال ختم ہونا تھا۔ برطانوی قوم اس سلسلے میں فیصلہ کر چکی تھی۔ ہندوستان کے غدر نے انھیں ایک موقع دے دیا۔ 1855ء میں لارڈ پامرسٹن وزیرِ اعظم ہو گیا تھا اور اس نے حسبِ معمول ہمّت سے کام لے کر کریمیا کی جنگ کو ختم کر دیا تھا۔ 1857ء کے عام انتخابات میں اُسے بڑی اکثریت حاصل ہو گئی۔ اُسی سال اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے صدر کو مطلع کیا کہ حکومتِ ہند کو براہِ راست ملکہ کے تحت لانے کے لیے حکومت پارلیمنٹ میں بل پیش کرنا چاہتی ہے۔

راس منگلس نے جو اس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی کا صدر تھا، اور نائب صدر سر فریڈرک کیوری نے 31/دسمبر 1857ء کو اس خط کا جواب دیا۔ انھوں نے اس پر کورٹ کے تعجب کا اظہار کیا کہ ملکہ معظمہ کی حکومت غدر کے سلسلے میں کمپنی پر کوئی الزام لگائے بغیر اور کوئی پارلیمانی تحقیقات کرائے بغیر کمپنی کو فوری طور سے ختم کرنے کی تجویز پیش کر رہی ہے۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ کمپنی کی طرح کا ایک "درمیانی، غیر سیاسی اور آزاد ادارہ" ہندوستان کے اچھے نظم و نسق کے لیے لازمی اور ضروری ہے۔ وہ یہ بات سمجھنے سے قاصر تھے کہ نئی حکومت کے اراکین کی شاہی نامزدگی کی صورت میں اس قسم کا ادارہ کس طرح وجود میں آ سکتا ہے۔

کمپنی نے ذی فہم جان اسٹورٹ مل کی تیار کی ہوئی ایک باضابطہ عرضداشت ہاؤس آف کامنز اور ہاؤس آف لارڈز میں پیش کی[2]۔ ایسے صاحبِ فکر اور فلسفی مصنّف کی لکھی ہوئی دستاویز

---

[1] ملکہ کے شوہر کی سوانح (Life of the Prince Consort) جلد 4، ص 146۔

[2] ہاؤس آف لارڈز کے حکم کی تعمیل میں پیش کی جانے والی معلومات، جو 22/فروری 1858ء کو شایع کر دی گئیں۔

آج بھی لوگوں کی دلچسپی کا باعث ہے اور اس قابل ہے کہ اس کے ایک دو ٹکڑے یہاں پیش کیے جائیں۔

اس دوعملی حکومت کا ذکر کرتے ہوئے جس کو کمپنی کے ڈائرکٹر اور بورڈ آف کنٹرول کا وہ صدر مل کر چلاتے تھے، جو ملکہ معظمہ کا وزیر ہوا کرتا تھا، جان اسٹورٹ مل نے یہ دلیل پیش کی "سائلوں کی مودبانہ گزارش ہے کہ ان حالات میں اگر نظم و نسق ناکام ہوگیا تو یہ توقع قرین عقل نہیں سمجھی جاسکتی کہ حکومت کے اس شعبے کو موقوف کرکے اس کا تدارک کیا جائے جس پر بنیادی غلطی کا الزام کسی طرح عاید نہیں کیا جاسکتا اور جو ممکن ہے کہ بے قصور بھی ثابت ہوسکے اور تمام طاقت اس شعبے کو منتقل کر دی جائے جس کا ہر حقیقی یا مفروضہ غلطی میں اہم اور بڑا حصّہ تھا۔ اگر یہ سمجھا جائے کہ ہندوستان کی حکومت چلانے کا کام ملکہ کا وزیر کورٹ آف ڈائرکٹرز کی مدد کے بغیر کرتا تو وہ غلطیوں سے پاک ہوتی تو پھر ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ملکہ کا وزیر جس کو ہندوستان پر حکومت کرنے کے پورے اختیارات حاصل تھے، بد انتظامی کا مرتکب ہوا ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اسے تجربہ کار اور ذمّہ دار مشیر میسّر تھے"۔

سیکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کی مجوزہ کونسل کا ذکر کرتے ہوئے اس نے زور دے کر کہا تھا "سائل ہندوستان کے لیے اس سے بدتر حکومت کا تصوّر بھی نہیں کرسکتے ہیں کہ وزیر کی ایسی کونسل ہو جس سے مشورہ کرنے یا نہ کرنے کا اس کو پورا پورا اختیار حاصل ہو . . . . وزیر کے ساتھ کام کرنے والے وہ لوگ جو اس پر قابو نہیں رکھ سکتے ایسی ٹٹی بن جائیں گے جس کی آڑ میں شکار کھیلا جائے گا . . . . سائلوں کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ ایک کونسل، جس کے ممبروں کو ملکہ نامزد کرے گی، اپنے فکر و عمل میں اس حد تک آزادی سے کام لے سکے گی جس حد تک کورٹ آف ڈائرکٹرز لیا کرتا تھا . . . . سائل یہ بات سمجھنے سے بھی قاصر ہیں کہ اس بااختیار انجمن کے تمام اراکین کو اگر وزیر نامزد کرے گا تو پارلیمنٹ کی پارٹی کے اثر سے آزاد رہنے کا وہ جذبہ کس طرح برقرار رہ سکے گا جس کی بنا پر ہندوستان کے نظم و نسق کو اور اس ملک کے اہم عہدوں پر لوگوں کے تقرر کو ایک نمایاں حیثیت حاصل تھی"۔

آخر میں دوعملی حکومت کے طریقے کی مخالفت کے بارے میں سائلوں نے کہا تھا "اس کو پارلیمنٹ کے آئین کے سقم کے بجائے اس کی خوبی سمجھا جاتا ہے کہ دوہری کی بجائے تہری حکومت ہے۔ سائلوں کا خیال ہے کہ انتظامیہ کے لیے اکثر یہ مفید ثابت ہوتا ہے کہ وہ تنہا کام کرے اس لیے کہ

اس کی پہلی شرط مستعدی ہوتی ہے لیکن سائلوں کے خیال میں گزشتہ اقدام کے متعلق رائے ظاہر کرنے اور آئندہ کے لیے اصول بنانے کا کام ایسا ہے جس میں ایک سے زیادہ رایوں کا اتفاق ضروری اور مناسب سمجھا جاتا ہے۔ اس قسم کے اداروں کا دو ہونا کوئی سقم نہیں اور ایک ہونا کوئی خوبی نہیں"۔

لیکن یہ عرضداشت بے سود ثابت ہوئی۔ لارڈ پامرسٹن نے کمپنی کی حکومت ختم کرنے اور آئندہ ہندوستان کی حکومت سنبھالنے کے لیے بل پیش کر دیا۔ اس بل میں اس امر کی رعایت رکھی گئی تھی کہ انگلستان میں ہونے والے انتظامات آٹھ اراکین پر مشتمل ایک کونسل اور اس کے صدر کے سپرد کر دیے جائیں۔ کونسل کے اراکین کی نامزدگی کا اختیار ملکہ کو حاصل تھا۔ کونسل کے اراکین کی مدت کار آٹھ سال متعین کی گئی تھی۔ ہر سال باری باری سے دو اراکین کو ریٹائر ہونا تھا۔ بل جب دوسری مرتبہ پیش کیا گیا تو اسے بڑی اکثریت کی حمایت حاصل ہو گئی۔ لیکن بل منظور ہونے سے پہلے لارڈ پامرسٹن کی حکومت نے سازش کے بل (Con'spiracy Bill) کے مسئلہ پر استعفیٰ دے دیا جس کا مقصد تھا کہ انگلستان آنے والے سیاسی مہاجرین کی سازشوں سے فرانس کے شہنشاہ کو محفوظ رکھا جائے۔

اس کے بعد لارڈ ڈربی نے کنزرویٹو حکومت بنائی اور خزانے کے وزیر (Chancellor of Excheqer) بنجمن ڈزرائیلی (Benjumin Disnaeli) نے ایک نیا انڈیا بل پیش کیا جو زیادہ الجھا ہوا، ناقابل عمل اور بے سروپا تھا۔ اس میں اس امر کی رعایت رکھی گئی تھی کہ ہندوستانی کونسل کے کچھ اراکین کو ملکہ نامزد کرے اور کچھ کو مانچسٹر اور دوسرے شہروں کے شہری اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے حصہ دار منتخب کریں۔ ڈزرائیلی کی یہ اسکیم طنز و مزاح کی نذر ہو گئی۔ لارڈ پامرسٹن نے اس بل کے لیے کہا تھا کہ ڈان کوئی زوٹ (Don Quescote) کی طرح جب وہ سڑک پر کسی کو ہنستا ہوا دیکھتے ہیں تو یقین ہو جاتا ہے کہ وہ ڈزرائیلی کے بل پر گفتگو کر رہا ہوگا۔ جب ایسٹر کی تعطیل کے بعد ہاؤس آف کامنز کا اجلاس پھر شروع ہوا تو ایک آدمی بھی ایسا نہ مل سکا جو بل کی حمایت کرے۔

کورٹ آف ڈائرکٹرز نے ان دونوں بلوں کا بڑے غور سے مطالعہ کیا اور انھوں نے کورٹ آف پروپرائٹرز کو ایک قابلانہ رپورٹ پیش کی۔ یہ رپورٹ بھی جان مل کی منطقی اور بے باک طرز نگارش کا نمونہ تھی۔ اس کا ایک ٹکڑا قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کے قابل ہے۔

"ان دشواریوں پر ایک قوم کی دوسری قوم پر حکومت کی؛ قابو پانے کے لیے جو ذرائع بل میں

تجویز کیے گئے ہیں وہ ایک وزیر کے غیر مشروط اختیارات پر مشتمل ہیں۔ جہاں تک اس کا تعلق ہے دونوں بلوں میں ذرہ برابر فرق نہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ وزیر کی ایک کونسل بھی ہوگی۔ لیکن بدترین مطلق العنان حکمرانوں کی بھی کونسل ہوا کرتی ہے۔ ایک مطلق العنان حکمراں کی کونسل میں جو حکمراں کو مطلق العنان بننے سے باز رکھتی ہے یہ فرق ہوا کرتا ہے کہ ایک کونسل کا انحصار حکمراں پر ہوا کرتی ہے اور دوسری آزاد ہوتی ہے۔ ایک کے پاس کوئی اختیارات نہیں ہوتے ہیں اور دوسری کسی حد تک بااختیار ہوتی ہے پہلے بل میں (لارڈ ڈپا رسٹن کے بل میں) تمام اراکین کی نامزدگی کا پورا اختیار وزیر کو حاصل تھا اور دوسرے بل (ڈزرائیلی کے بل) کی رو سے نصف اراکین کو وہ نامزد کر سکتا تھا۔ دونوں بلوں میں تھوڑے بہت فرق کے ساتھ کونسل کے فرائض وزیر کی صوابدید پر چھوڑ دیے گئے ہیں[1]"

اس دلیل کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ نصف صدی کے تجربے کے بعد بہت سے صاحبِ فکر حضرات اس بات کو تسلیم کرنے پر تیار ہو جائیں گے کہ ایک طاقتور اور آزاد مشاورتی انجمن ملکہ کے وزیر کے کاموں کی نگرانی کر سکتی تھی اور ہندوستان کو بہتر نظم و نسق مہیا کر سکتی تھی۔ کمپنی کے ڈائرکٹر اس قسم کی انجمن تھے لیکن وہ ہندوستان کے لوگوں کے بجائے کمپنی کے حصہ داروں کے مفاد کی نمائندگی کرتے تھے۔ پرانے طریقے میں یہ سقم تھا اور اس سقم کا سدِّ باب ہونا چاہیے تھا۔ لیکن پارلیمنٹ نے 1858ء میں جو تنظیم نو کی اس میں یہ سقم دور نہیں کیا گیا۔ کورٹ آف ڈائرکٹرز کے اختیارات ختم کر دیے گئے لیکن اس کی جگہ کوئی ایسی آزاد مشاورتی انجمن نہیں لے سکی جو ہندوستان کے لوگوں کی نمائندگی کرتی اور ان کی خوشحالی اور مفادات کا تحفظ کرتی۔

مسٹر ڈزرائیلی کا بل ختم ہو چکا تھا اور نئے بل کا مسودہ تیار کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ اس وقت فیصلہ کیا گیا کہ نئی اسکیم کے اصولوں پر ایوانوں میں بحث کی جائے اور ایسا بل پیش کیا جائے جو دونوں پارٹیاں مل کر تیار کریں۔ اس پر عمل کیا گیا اور اگست 1858ء میں نیا بل قانون بن گیا جو "ایکٹ برائے بہتر نظم و نسق ہند (Act for the better Government)

---

[1] وہ رپورٹ جو کورٹ آف ڈائرکٹرز نے 6/اپریل 1858ء کو منظور کی اور ہاؤس آف لارڈز کے حکم کی تعمیل میں پیش کی گئی اور 2/مئی 1858ء کو جس کی اشاعت کا حکم دے دیا گیا تھا۔

ndia3 (ه)”کے نام سے مشہور ہے۔

ایکٹ 5 11 دفعات پر مشتمل ہے اور آج بھی ہندوستان کا نظم و نسق اس کے مطابق چلایا جا رہا ہے۔ کچھ اہم دفعات کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضات ملکہ معظمہ کو منتقل ہو گئے اور وہ اختیارات جو ایسٹ انڈیا کمپنی اور بورڈ آف کنٹرول کو حاصل تھے سیکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کو حاصل ہو گئے۔ پندرہ ممبروں کی ایک کونسل مقرر کی گئی۔ اس کونسل کے اراکین اس وقت تک کونسل کے رکن رہ سکتے تھے جب تک وہ اچھے کردار کا ثبوت دیں اور ہندوستان کی آمدنی میں سے 1200 پونڈ سالانہ تنخواہ پانے کے حقدار تھے[1]۔ اسی طرح سکریٹری آف اسٹیٹ اور اس کے عملے کی تنخواہ بھی ہندوستان کو ادا کرنی نہیں تھی۔

صرف چند خاص خاص معاملوں کے علاوہ سکریٹری آف اسٹیٹ کو کونسل کی اکثریت کی رائے کے خلاف کام کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ اعلان جنگ اور صلح کرنے کے متعلق (جو ابھی تک بورڈ آف کنٹرول کورٹ آف ڈائرکٹرز کی خفیہ کمیٹی کے ذریعہ کیا کرتا تھا) سکریٹری آف اسٹیٹ کو مجاز کیا گیا تھا کہ وہ کونسل سے مشورہ کیے بغیر ہندوستان حکم بھیج دے یا کمیٹی کے اراکین کو اس کی اطلاع دے دے۔

ہندوستان کے گورنر جنرل اور مدراس اور بمبئی کے گورنروں کو مقرر کرنے کا اختیار ملکہ معظمہ کو حاصل ہو گیا تھا۔ لیفٹننٹ گورنروں کو ملکہ معظمہ کی منظوری کے بعد گورنر جنرل مقرر کر سکتا تھا۔ سکریٹری آف اسٹیٹ کو وہ ضابطے بنانے کا اختیار دیا گیا تھا جن کے تحت مقابلے کے امتحان کے ذریعے سول سروس کے لیے امیدواروں کا انتخاب ہوتا تھا۔

اس ایکٹ کی سب سے زیادہ حیرت انگیز دفعات مالیاتی دفعات تھیں۔ ان میں کہا گیا تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حصہ داروں کا منافع، انگلستان میں کمپنی کا قرض، کاروباری قرض اور ہنڈیاں اور کمپنی کا علاقائی اور دوسرا قرض صرف ہندوستان کی آمدنی سے ادا ہونا چاہیے اور اس کے ذمے واجب الادا قرار دیا جانا چاہیے[2]۔“

---

[1] ان اراکین کی مدت کار دس سال ہے۔ انھیں سکریٹری آف اسٹیٹ نامزد کرتا ہے اور انھیں دوبارہ نامزد کیا جا سکتا ہے۔

[2] دفعہ 2۔

اس عجیب و غریب دفعہ کی رو سے کمپنی میں لگا ہوا سرمایہ اور کمپنی کا قرض ہندوستان کے سرکاری قرض میں شامل کر دیا گیا اور کمپنی میں لگے ہوئے سرمائے کے سود کی صورت میں جو سالانہ خراج ہندوستان ادا کیا کرتا تھا اُس نے دوامی حیثیت اختیار کر لی۔ ملکہ نے ایک شلنگ ادا کیے بغیر کمپنی سے ہندوستان کی شاندار سلطنت حاصل کر لی۔ اس کی قیمت ہندوستان کے لوگوں نے ادا کی اور اب بھی ادا کر رہے ہیں۔ برطانیہ کے ایک ماتحت ملک کے ساتھ یہ اس قسم کی ناانصافی تھی جس کی مثال برطانوی سلطنت کی تاریخ نہیں پیش کر سکتی[1]

اس ایکٹ کی صرف ایک مالیاتی دفعہ معقول تھی "بالاستثنٰی اس صورت کے جب ملکہ معظمہ کے ہندوستانی مقبوضات کا کسی حقیقی حملے کے خلاف دفاع کرنا پڑے، یا حملہ آور یا کسی دوسرے فوری حادثے کا مقابلہ کرنا پڑے، پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کی اجازت کے بغیر ان مقبوضات کی باہری سرحد کے پار ہونے والی ملکہ معظمہ کی فوجوں کی کاروائیوں کے اخراجات ہندوستان کی آمدنی میں سے ادا نہیں کیے جائیں گے[2]" بدقسمتی سے اس منصفانہ اور مفید اصول کی خلاف ورزی اکثر کی جاتی رہی ہے اور مصر اور حبشہ کی مہموں، افغانستان کی جنگوں اور برما کی فتح کے اخراجات ہندوستان کو ادا کرنے پڑے ہیں۔

یہ ایکٹ بننے کے بعد بورڈ آف کنٹرول ختم ہو گیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی صرف اس لیے باقی رکھی گئی کہ ہندوستان کی آمدنی میں سے اپنے حصہ داروں کا منافع وصول کر سکے۔

ہندوستان کے زیادہ تر لوگوں کو نئے ایکٹ کی دفعات کا کوئی علم نہیں تھا لیکن وہ انگلستان کی ملکہ سے واقف تھے اور اس کا نام بڑے پیار کے ساتھ لیا کرتے تھے۔ انھیں یہ سُن کر خوشی ہوئی کہ

---

[1] تاریخ انگلستان کے طالب علم کو اس قسم کی لاتعداد مثالیں ملیں گی جب برطانیہ نے نوآبادیوں اور ماتحت ملکوں کے لیے بڑے بڑے خرچ برداشت کیے۔ لیکن ایسی کوئی مثال نہیں ملے گی جب پورے کے پورے خرچ کا بار ماتحت ملکوں پر ڈالا گیا ہو۔ 1900ء میں برطانوی حکومت نے 5,65,000 پونڈ میں رائل نائجر کمپنی سے نائجیریا خریدا تھا۔ یہ رقم نائجیریا سے نہیں وصول کی گئی تھی۔ ابھی حال میں برطانیہ نے جنوبی افریقی سلطنت کا تحفظ کرنے یا اسے توسیع دینے پر دو سو ملین پونڈ سے زیادہ خرچ کیے یقین نہیں آتا کہ اس رقم کے چھوٹے سے حصے کے علاوہ انگلستان جنوبی افریقہ سے کچھ وصول کر سکے گا۔

[2] دفعہ 55۔

ہندوستان کی سلطنت پر ملکہ حکومت کرنے لگی۔ موقع کی مناسبت سے ایک اعلان جاری کیا گیا۔ چونکہ اعلان میں ظاہر کیے جانے والے جذبات خود ملکہ کے جذبات تھے اس لیے وہ لوگوں کو بہت عزیز ہے۔

چونکہ اعلان کا پہلا مسودہ ملکہ معظمہ کو پسند نہیں آیا تھا اس لیے اس نے وزیرِ اعظم لارڈ ڈربی سے دوسرا مسودہ تیار کرنے کے لیے کہا۔ "آپ اس بات کو دھیان میں رکھیے کہ ایک ملکہ خون ریز جنگ کے بعد براہِ راست حکومت سنبھالتے وقت مشرق کے سو ملین لوگوں سے مخاطب ہے، ان سے ایسے وعدے کر رہی ہے جن کو آئندہ پورا کرنا ہے اور اپنی حکومت کے اصول سمجھا رہی ہے۔ اس قسم کی دستاویز میں فراخ دلی، کریم النفسی اور مذہبی رواداری کے جذبات ہونے چاہئیں اور ان خصوصی حقوق کا ذکر ہونا چاہیے جو ملکہ کی رعایا کی حیثیت سے مساوی حیثیت پانے کے بعد ہندوستان کے لوگوں کو حاصل ہوں گے اور اس خوش حالی کی نشان دہی کی جانی چاہیے جو تہذیب و تمدّن کی بنا پر انھیں نصیب ہوگی۔"

ہندوستانی رعایا کے متعلق ملکہ کے جذبات یہ تھے۔ اس کی خواہش کے مطابق اعلان کا نیا مسودہ تیار کیا گیا اور یہ مسودہ اس موقع کے شایانِ شان تھا۔ ہندوستان کے لوگ اس اعلان کو اپنے حقوق کا چارٹر تصوّر کرتے ہیں۔ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پورا اعلان یہاں نقل کیا جائے جو زیادہ طویل نہیں ہے۔[1]

ہندوستان کے دیسی حکمرانوں، سرداروں اور لوگوں کے نام

ملکہ بہ اجلاس کونسل کا اعلان

"وکٹوریہ جو خدا کے فضل سے انگلستان اور آئرلینڈ کی اور یورپ، ایشیا، افریقہ، امریکہ اور آسٹریلیا میں واقع ان کی نوآبادیات و مقبوضات کی ملکہ اور محافظ دین ہے۔

---

[1] میرے بچپن کا سب سے پُرمسرّت دن وہ تھا جب میں نے یہ اعلان سُنا جو یکم نومبر 1858ء کو بنگال کے ایک ضلع کے صدر مقام پر سب سے بڑے انگریز افسر نے پڑھ کے سنایا تھا۔ اسی دن یہ اعلان ہندوستان کے تمام اضلاع کے صدر مقامات پر سُنایا گیا تھا۔ ہندو اور مسلمان جمع تھے اور انھوں نے خوشی کے نعرے لگا کر اعلان کا خیر مقدم کیا تھا۔ برہمنوں نے جنیؤ پر ہاتھ رکھ کر نعرہ لگایا تھا "عظیم ملکہ زندہ باد"۔ مجھے یہ واقعہ ایسا یاد ہے جیسے کل پیش آیا ہو۔

"تہ گاہ کہ مختلف وقیع دلیلوں کی بنا پر پارلیمنٹ میں شامل لارڈ کلیسائی لارڈ عام اور عام لوگوں کے مشورے اور اجازت سے ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہندوستان کے ان علاقوں کی حکومت ہم خود سنبھال لیں جن کا انتظام ابھی تک آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی ہماری طرف سے کرتی تھی۔"

"چنانچہ مذکورہ بالا مشورے اور اجازت کے ساتھ ہم اعلان کرتے ہیں اور لوگوں کو آگاہ کرتے ہیں کہ مذکورہ حکومت ہم نے اپنے ہاتھ میں لے لی ہے۔ ہم اس اعلان کے ذریعے مذکورہ علاقوں میں رہنے والی اپنی رعایا کو ہدایت کرتے ہیں کہ وہ وفادار رہے اور ہماری اور ہمارے وارثوں اور جانشینوں کی حقیقی معنی میں اطاعت گزار رہے۔ ہمارے نام سے اور ہماری طرف سے مذکورہ علاقوں کا انتظام کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً ہم جس کو آئندہ مقرر کرنا مناسب سمجھیں اس کے اختیارات کو وہ تسلیم کرے۔"

"ہم اپنے قابلِ اعتماد اور عزیز بھائی اور مشیر چارلس جان والی کاؤنٹ کیننگ کی اہلیت، قابلیت، وفاداری اور قوت فیصلہ پر خصوصی اعتماد کرتے ہوئے مذکورہ والی کاؤنٹ کیننگ کو اس اعلان کے ذریعے اپنے مذکورہ علاقوں میں اور مذکورہ علاقوں کا پہلا وائسرائے اور گورنر جنرل مقرر کرتے ہیں اور اسے ہدایت کرتے ہیں کہ وہ ہمارے نام سے ان علاقوں پر حکومت کرے اور ہمارے نام سے اور ہمارے طرف سے عام کارروائیاں کرے بشرطیکہ وہ ان احکام و ضوابط کی پابندی کرتا رہے جو ہم وقتاً فوقتاً اپنے ایک خصوصی سکریٹری آف اسٹیٹ کی وساطت سے جاری کریں۔"

"ہم اس اعلان کے ذریعے ان سول اور فوجی افسروں کو جو ابھی تک آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں تھے ان کے عہدوں پر مستقل کرتے ہیں بشرطیکہ وہ آئندہ ہماری خوشنودی حاصل کرتے رہیں اور مستقبل میں بننے والے قوانین وضوابط کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"ہم اس اعلان کے ذریعہ ہندوستان کے دیسی حکمرانوں کو مطلع کرتے ہیں کہ وہ تمام معاہدے ہم تسلیم کرتے ہیں جو آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی نے ان سے کیے ہیں یا اس کے طرف سے کیے گئے ہیں۔ ان کی پوری طرح پابندی کی جائے گی اور ہم امید کرتے ہیں کہ دیسی حکمران بھی ان پر عمل کریں گے۔"

"ہم اپنے موجودہ مقبوضات میں اضافے کے خواہشمند نہیں ہیں۔ ہم اس امر کی کسی کو اجازت نہیں دیں گے کہ ہمارے علاقوں اور ہمارے حقوق کو بغیر پاداش جرم غصب کر سکے۔ اسی کے ساتھ

ہم دوسروں کے علاقوں اور دوسروں کے حقوق میں مداخلت کو بھی گوارا نہیں کریں گے۔ ہم دیسی حکرانوں کے حقوق، عزت اور وقار کا احترام خود اپنے حقوق، عزت اور وقار کی طرح کریں گے۔ ہماری خواہش ہے کہ وہ اور ان کے ساتھ خود ہماری رعایا اس خوشحالی اور سماجی ترقی سے مستفید ہو جو صرف داخلی امن اور بہتر انتظام کی بنا پر حاصل ہو سکتی ہے۔"

"ہندوستانی علاقوں کے دیسی باشندوں کی طرف ہم نے اسی قسم کے فرائض ادا کرنے کی ذمہ داری قبول کی ہے جس قسم کی ذمہ داری ہم دوسری رعایا کے تعلق سے محسوس کرتے ہیں اور خدا کے فضل و کرم سے ہم پوری طرح اور ایمانداری کے ساتھ ان فرائض کو ادا کریں گے۔"

"حالانکہ ہم مسیحیت کی سچائی پر خلوص دل سے ایمان رکھتے ہیں اور مذہب سے حاصل ہونے والی تسکین کا جذبہ احسان مندی کے ساتھ اقرار کرتے ہیں لیکن اپنی رعایا کو اس پر مجبور کرنے کی خواہش اور حق سے ہم انکار کرتے ہیں کہ وہ ہمارے معتقدات کو قبول کرے۔ ہم اعلان کرتے ہیں کہ ہماری خواہش اور خوشی یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے مذہبی معتقدات اور رسم و رواج کی بنا پر نہ کسی طرح کا فائدہ اٹھا سکے اور نہ پریشان کیا جا سکے بلکہ سب لوگوں کو قانون کا غیر مشروط تحفظ پوری طرح حاصل ہو۔ ہم اپنے تمام با اختیار ماتحتوں کو سختی کے ساتھ آگاہ کرتے ہیں کہ وہ ہماری رعایا کے ہر فرد کے مذہبی معتقدات اور طریقۂ عبادت میں مداخلت سے باز رہیں ورنہ انھیں ہماری شدید ناراضگی کے لیے تیار رہنا پڑے گا۔"

"ہماری مزید خواہش یہ ہے کہ ہر نسل اور ہر مذہب سے تعلق رکھنے والی ہماری رعایا حتی الوسع آزادی اور غیر جانبداری کے ساتھ ملازمت کے ان عہدوں پر مقرر کی جائے جن کے فرائض پوری طرح ادا کرنے کی اہلیت بر بنائے تعلیم قابلیت اور دیانت داری ان میں پائی جاتی ہو۔"

"ہمیں معلوم ہے کہ ہندوستان کے لوگ اس زمین سے بڑا جذباتی لگاؤ رکھتے ہیں جو انھوں نے اپنے بزرگوں سے ورثے میں پائی ہو اور ہم اس جذبے کی قدر کرتے ہیں۔ اس زمین کے تعلق سے ہم ان کے تمام حقوق کا تحفظ کرنے کے خواہشمند ہیں۔ انھیں صرف ریاست کا مناسب مطالبہ ادا کرنا ہوگا۔ یہ بہت اچھی بات ہوگی اگر قانون بناتے وقت اور عمل درآمد کرتے وقت ہندوستان کے قدیم حقوق، دستور اور رواجوں پر بھی غور کیا جائے۔"

"ہم ہندوستان کے ان دکھوں اور تکلیفوں پر دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں جن کی وجہ ان جاہ طلب لوگوں کے افعال و اعمال تھے جنھوں نے بے بنیاد افواہیں پھیلا کر انھیں

بغاوت پر آمادہ کیا۔ ہم نے میدان جنگ میں اس بغاوت کو شکست دے کر اپنی طاقت کا مظاہرہ کر دیا ہے۔ اب ہم ان لوگوں کے قصور معاف کر کے اپنی رحم دلی کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں جنھیں گمراہ کیا گیا تھا اور جو اپنے فرائض کی ادائیگی کا راستہ اب اختیار کرنا چاہتے ہیں۔"

"مزید خون ریزی کو روکنے اور ہمارے ہندوستانی مقبوضات میں تیزی کے ساتھ امن قائم کرنے کی غرض سے ہمارا وائسرائے اور گورنر جنرل ایک صوبے کی حد تک چند شرائط کے ساتھ ان لوگوں کی بڑی تعداد کو معافی کی امید دلا چکا ہے جو ہماری حکومت کے خلاف جرائم کے مرتکب ہوئے تھے اور ان لوگوں کو دی جانے والی سزاؤں کا اعلان کر چکا ہے جن کے جرائم کی نوعیت ناقابل معافی ہے۔ ہم وائسرائے اور گورنر جنرل کے مذکورہ ایکٹ کو منظور کرتے ہیں اور اس کی توثیق کرتے ہیں اور مندرجہ ذیل مزید اعلان کرتے ہیں۔"

"سوائے ان لوگوں کے جن کے خلاف برطانوی رعایا کے قتل میں براہ راست حصہ لینے کا جرم ثابت ہو گیا ہے یا آئندہ ہو جائے ہم تمام مجرموں کو معاف کرتے ہیں۔ جہاں تک اُن لوگوں کا تعلق ہے جن کے خلاف جرم ثابت ہو گیا ہے یا آئندہ ہو جائے انصاف کا تقاضہ ہے کہ انھیں معاف نہ کیا جائے۔"

"جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے جنھوں نے عمداً اور حقیقت حال سے واقف ہونے کے باوجود قاتلوں کو امان دی یا جن لوگوں نے شورش کو ہوا دی یا اس کی قیادت کی انھیں محض جان بخشی کا یقین دلایا جا سکتا ہے۔ لیکن ایسے لوگوں کو سزا دیتے وقت ان حالات پر پوری طرح غور کیا جائے گا جن کے تحت وہ بغاوت پر آمادہ کیے گئے تھے۔ جن لوگوں کے متعلق یہ ثابت ہو سکا کہ ان کے جرائم کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے مفسدوں کی پھیلائی ہوئی افواہوں پر یقین کر لیا ان کے ساتھ بہت نرمی برتی جائے گی۔"

"حکومت کے خلاف تلوار اٹھانے والے دوسرے لوگوں سے ہم اس اعلان کے ذریعے وعدہ کرتے ہیں کہ انھیں غیر مشروط معافی دی جائے گی۔ اگر وہ اپنے گھروں کو واپس آجائیں اور پُرامن زندگی گزارنے لگیں تو ہمارے تخت اور وقار کے خلاف ان کے جرائم بھلا دیے جائیں گے۔"

"ہماری خواہش ہے کہ اس معافی کا اطلاق ان سب لوگوں پر کیا جائے جو آئندہ یکم جنوری سے پہلے ان شرائط کو پورا کر دیں۔"

"خدا کے فضل سے امن قائم ہو جانے کے بعد ہماری خواہش ہے کہ ہندوستان کی پُرامن صنعت کی رفتار کو تیز کیا جائے، مفادِ عامہ کے کاموں اور ترقیاتی کاموں کو فروغ دیا جائے اور ہندوستان میں رہنے والی اپنی رعایا کے مفاد میں حکومت کی جائے۔ ان کی خوشحالی ہماری تقویت کا باعث ہوگی۔ ان کی آسودہ خاطری ہمارا تحفظ ہوگا اور اُن کی شکرگزاری ہمارا بہترین انعام ہوگی۔ خدائے بزرگ و برتر ہمیں اور ہمارے بااختیار ماتحتوں کو توفیق دے کہ لوگوں کی بھلائی کی خواہشات پوری کر سکیں۔"

حصّہ دُوم

سنہ 1876ء سنہ 1858ء

باب 1

کیننگ، ایلگن اور لارنس

کریمیا کی جنگ کے بعد امن، اخراجات میں تخفیف اور اصلاح کا دور شروع ہوا۔ لارڈ پامرسٹن وزیر خارجہ تھا لیکن جب قوم نے امن کی خواہش ظاہر کی تو وہ نہایت امن پسند وزیر اعظم بننے پر مجبور ہو گیا۔ دنیا کی تاریخ میں یکے بعد دیگرے بڑے بڑے واقعات پیش آئے۔ 1860ء میں اٹلی اتحاد ہو گیا۔ امریکہ کی خانہ جنگی میں جو خون بہا تھا اس نے اس کے اتحاد کو مضبوط تر بنا دیا۔ پروشیا نے ڈنمارک سے صوبے چھین لیے اور جارحیت کی راہ پر گامزن ہو گیا۔ روس نے مشرق کی طرف بڑھنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ یہ سب کچھ پامرسٹن کی نظروں کے سامنے ہو رہا تھا لیکن وہ ساکت تھا۔ بڑی قوموں کا عروج اس کے دل میں حسد کی آگ تو بھڑکاتا رہا مگر اسے مداخلت کرنے پر تیار نہ کر سکا۔ 1865ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت اس کا ملک امن کے دور سے گزر رہا تھا۔

انگلستان میں داخلی اصلاحات کا دور شروع ہو چکا تھا۔ مسٹر گلیڈسٹن کی عظیم مالی اصلاحات نے، جو اس زمانے میں وزیر خزانہ تھا، رفتہ رفتہ تجارت پر لگائی جانے والی تمام بندشیں ختم کر دیں۔ مسٹر کابڈن نے 1859ء میں فرانس کے ساتھ تجارتی معاہدہ کیا۔ کاغذ کا محصول 1860ء میں منسوخ کر دیا گیا۔ دوسرے محاصل بھی منسوخ کر دیے گئے۔ پھر بھی تجارت میں اضافہ ہونے کی وجہ سے قومی آمدنی تیزی کے ساتھ بڑھتی رہی۔

لارڈ پامرسٹن کے انتقال کے بعد اصلاح کا ایک بل پیش کیا گیا تھا مگر وہ نامنظور کر دیا گیا۔ لیکن چونکہ قوم اصلاح کا مطالبہ کر رہی تھی اس لیے مسٹر ڈزرائیلی کا پیش کیا ہوا اصلاح کا بل

منظور ہوگیا۔ 1868ء میں اس کی جگہ مسٹر گلیڈسٹن وزیر اعظم ہوگیا۔ اس نے اپنے پہلے دور میں کچھ اور اصلاحات کیں۔ آئیرلینڈ کا کلیسا موقوف کر دیا گیا۔ اراضی کے متعلق آئیرلینڈ کا پہلا ایکٹ منظور کیا گیا قومی تعلیم کا طریقہ شروع کیا گیا۔ فوج کی اصلاح کی گئی۔ قانون رائے دہندگی (Ballot Act) منظور کیا گیا۔ انصاف کے لیے ایک ہائی کورٹ قائم کیا گیا۔

ملکہ کی حکومت کے پہلے اٹھارہ سال کی ہندوستان کی تاریخ میں ان پر امن کارروائیوں کے انعکاسات دیکھے جا سکتے ہیں۔ لارڈ کیننگ ہندوستان کا پہلا وائسرائے مقرر کیا گیا۔ جن لوگوں نے اس کی "نرمی" کے خلاف احتجاج کیا تھا اور اس کو واپس بلانے کی درخواست کی تھی ان میں سے بہت کم اس کے کارناموں سے واقف تھے یا یہ جانتے تھے کہ اسے کن آزمائشوں سے گزرنا پڑا ہے۔ غدر کے پُرآشوب زمانے میں اکثر وہ خاموش اور اَن تھک کارکن دن کا زیادہ حصہ اور پوری پوری رات اپنے دفتر میں گزارا کرتا تھا۔ سردیوں میں ایک دفعہ اس نے آدھی رات سے دوپہر تک کام کیا۔ اسے آرام اور ناشتے کا بھی ہوش نہیں رہا۔ آخر کو تھک کر وہ گر گیا۔ اس کا دماغ ماؤف ہوگیا تھا۔ یہ بار تنہا لارڈ کیننگ ہی کو نہیں اٹھانا پڑا تھا۔ اس کی بیوی جو اس کی تمام پریشانیوں میں شریک رہا کرتی تھی۔ اکثر اس کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ وہ رات گئے تک بیٹھی اُن خفیہ خطوں اور مراسلوں کی نقل کرتی رہتی تھی جو عام سرکاری ذریعوں سے نہیں بھیجے جا سکتے تھے۔ دونوں نے مل کر اس بوجھ کو اٹھایا اور آخر میں وہ کامیاب ہوئے۔

غدر کا ہنگامہ ختم ہوگیا۔ یکم نومبر 1858ء کو الٰہ آباد میں ایک بڑا دربار کیا گیا اور لارڈ کیننگ نے ان لوگوں کو ملکہ کا اعلان سنایا جو اس دربار میں شریک تھے۔ ہندوستان کے اس عظیم ترین دربار میں خودنمائی اور نمائش کے بجائے وقار سے کام لیا گیا تھا۔ اس میں شیخی بگھارنے کے بجائے مؤثر انداز میں تقریریں کی گئیں تھیں۔ کان پور میں ہونے والے ایک دوسرے دربار میں وائسرائے نے ایک اور خوش آئندہ اعلان کیا۔ گود لینے کو ممنوع قرار دینے والا وہ ضابطہ منسوخ کر دیا گیا تھا جس کی بنا پر کئی حکمراں خاندان ختم ہو گئے تھے۔ دیسی حکمرانوں کے گود لینے کے قدیمی حق کو ملکہ کی حکومت نے تسلیم کر لیا تھا۔ یہ اعلان سن کر ہر دیسی حکمراں نے اطمینان کا سانس لیا۔ قوم نے ملکہ کی نئی حکومت کا بڑے جوش و خروش کے ساتھ خیر مقدم کیا۔

اس سفر کے دوران لارڈ کیننگ شمالی ہندوستان اور پنجاب کے کئی اہم شہروں سے گزرا اور فروری 1860ء میں سرحد کے شہر پشاور پہنچ گیا۔ واپس آتے ہوئے اس نے

کچھ دن شملہ میں قیام کیا اور مئی کی گرمی میں کلکتہ پہنچ گیا۔ زیادہ کام کرنے کی وجہ سے اس کی صحت خراب ہو گئی تھی۔ لیکن فرض کی ادائیگی میں صحت کا خیال مانع نہیں آتا تھا۔ موسم خزاں میں اس نے ایک اور دشوار گزار سفر کیا اور ہلکر سندھیا اور وسط ہند کے دوسرے سرداروں سے ملنے کے لیے جبل پور میں دربار کیا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ ہر جگہ جائے اور غدر کے بعد دیسی حکمرانوں اور عام لوگوں سے رابطہ قائم کرے۔ ان کے شک و شبہات دور کرنا اور ان کی خیر خواہی کرنا اور وفاداری کی بنیادوں پر سلطنت کو مستحکم بنانا ضروری تھا۔

1861ء میں لارڈ کیننگ کو ایک بڑا صدمہ اٹھانا پڑا۔ شمالی ہندوستان کے ایک تازہ سفر سے جب وہ واپس آیا تو اس نے اپنی بیوی کو شدید بیماری میں مبتلا پایا۔ دارجلنگ سے واپس آتے ہوئے لیڈی کیننگ ترائی کے بخار میں مبتلا ہو گئی تھی۔ اس مہلک بیماری کی بنا پر اس کی حالت تیزی سے خراب ہوتی گئی اور نومبر میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس حادثے نے اس ان تھک کارکن کا دل توڑ دیا۔ اس کے پرائیوٹ سکریٹری نے لکھا ہے۔ " جب میں اس کمرے میں گیا جہاں میت تھی تو اس باوقار اور کم آمیز انسان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ ہاتھ ملانے کے انداز سے اس کے جذبات کی شدت ظاہر ہوتی تھی"۔

مارچ 1862ء میں قریب المرگ لارڈ کیننگ ہندوستان سے روانہ ہو گیا۔

لارڈ ولیم بین ٹنک کی فیض رساں عمل داری کے علاوہ ہندوستان کی جدید تاریخ میں کوئی ایسا دور نہیں آیا جس میں اتنے کم وقت میں اتنی زیادہ اصلاحات کی گئی ہوں جتنی کہ لارڈ کیننگ کے دور حکومت میں کی گئیں۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ ہندوستان کی زرعی دولت میں اضافہ تھا یعنی اس نے زراعت کے فوائد زمین جوتنے والوں کے لیے مخصوص کر دیے۔ تمام زراعت پیشہ قوموں کی خوش حالی کی بنیاد زمین کا مسئلہ ہوا کرتا ہے۔ لارڈ کیننگ نے لوگوں کے مفاد میں اس مسئلے کو حل کرنے کی جو کوششیں کیں ان کا ذکر آئندہ باب میں کیا جائے گا۔ یہاں صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ 1859ء کے بنگال رینٹ ایکٹ نے صوبے کے لوگوں کو وہ تحفظ مہیا کر دیا جو انھیں اس سے پہلے کبھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ دس سال بعد جب مسٹر گلیڈ سٹن نے آئیر لینڈ کے پہلے لینڈ ایکٹ کا مسودہ تیار کیا تو یہ ایکٹ اس کے پیش نظر تھا۔ اس کے علاوہ لارڈ کیننگ نے یہ کوشش بھی کی کہ ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے کسانوں کا بار بار ہونے والے بندوبستوں اور بڑھتے ہوئے سرکاری مطالبوں کے خلاف تحفظ کیا جائے۔

اگر سمجھ داری پر مبنی یہ اقدامات کئے جا سکتے تو ہندوستان ان بار بار پڑنے والے قحطوں سے نسبتاً محفوظ رہتا جو انیسویں صدی کے آخر ربع کی تاریخ کے سب سے زیادہ افسوسناک حادثے ہیں۔

وائسرائے نے اعلیٰ تعلیم کی طرف بھی توجہ دی۔ لندن یونی ورسٹی کے نمونے پر کلکتہ، مدراس اور بمبئی کی یونی ورسٹیاں 1857ء میں قائم کی گئیں۔ زیادہ لوگوں کو مغربی تعلیم کا فیضان حاصل ہونے لگا۔ ہندوستانی سماج اس کا اثر قبول کرنے لگا۔ انیسویں صدی کی ساتویں دہائی کے ابتدا میں بنگال کے عظیم مصنفین ایشور چندر ودیا ساگر، مدھوسودن دت اور بنکم چندر چٹرجی نے اپنا سکہ بٹھالیا۔ ملکہ وکٹوریہ کی حکومت کے ابتدائی زمانے میں اور اس کے پہلے وائسرائے کے دور میں لوگوں نے جن بلند آرزوؤں اور صحت مند توقعات کا مظاہرہ کیا ویسا مظاہرہ لارڈ ولیم بینٹنک کے زمانے کے بعد سے کبھی نہیں کیا گیا تھا۔

قانون سازی میں بھی لارڈ کیننگ کا زمانہ حکومت اس کے بعد آنے والے تمام وائسرایوں کے زمانوں سے مختلف نظر آتا ہے۔ تعزیرات ہند 1860ء میں قانون بن گئی جس کا مسودہ 1834ء میں لارڈ میکالے اور پہلے لاکمیشن نے تیار کیا تھا۔ ضابطہ دیوانی اور ضابطہ فوجداری منظور کئے گئے۔ پولیس کی تنظیم نو کی گئی اور اس میں باقاعدگی پیدا کرنے کے لیے ایک ایکٹ بنایا گیا۔

1861ء کی تنظیم نو کے بعد گورنر جنرل کی کونسل پانچ عام ممبروں پر مشتمل تھی۔ لارڈ کیننگ نے مختلف اراکین میں کام تقسیم کر دیا اور ہر ایک کے سپرد ایک محکمہ کر دیا۔ اس طرح کاونسل ایک کابینہ میں تبدیل ہو گئی جس کا سربراہ گورنر جنرل تھا۔ ہر ممبر اپنے محکمے کے تمام معمولی مسائل خود حل کرتا تھا اور صرف اہم مسائل فیصلے کے لیے گورنر جنرل کے سامنے پیش کئے جاتے تھے۔ اختلاف رائے کی صورت میں اس پر کاونسل میں بحث کی جاتی تھی۔ نظم و نسق کا یہ طریقہ جسے لارڈ کیننگ نے شروع کیا تھا، آج تک جاری ہے۔ اس میں صرف ایک سقم ہے جس کو کیننگ کے زمانے کے بعد دور کر دینا چاہئے تھا۔ وہ سقم یہ ہے کہ سلطنت کے انتظام میں عام لوگوں کو نمائندگی حاصل نہیں ہے۔

عدالتی نظام کی تنظیم نو بھی کی گئی۔ 1861ء میں کمپنی کی عدالتوں اور ملکہ کی عدالتوں کو ملا دیا گیا اور کلکتہ، مدراس اور بمبئی کے ہائی کورٹ وجود میں آگئے۔ ایک ممتاز و نمایاں حیثیت رکھنے والے وکیل سر بارنس پی کاک (Sir Barnes Peacock) کو کلکتہ ہائی کورٹ کا چیف جسٹس مقرر کیا گیا۔ مشہور و معروف راجہ رام موہن رائے کے بیٹے رام پرشاد رائے کو

کلکتہ ہائی کورٹ کا پہلا ہندوستانی جج مقرر کیا گیا لیکن تقرری کے کچھ دن بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے جانشینوں میں سب سے ممتاز دوارکا ناتھ متر تھا جس کے متعدل فیصلوں اور آزادیٔ رائے کی سب لوگ عزت کرتے تھے اور تعریف کیا کرتے تھے۔

فوج کی تشکیل نو کی گئی اور ہندوستان میں 70,000 انگریزی فوج اور 1,35,000 ہندوستانی فوج رکھی گئی۔ کیننگ کے بعد اس بڑی فوج میں قابل لحاظ اضافہ کر دیا گیا ہے اور ایشیا اور افریقہ میں برطانیہ کی سامراجی ضرورتوں پورا کرنے کے لیے اس کو تیار رکھا جاتا ہے۔

لیکن کیننگ کے سامنے سب سے مشکل مسئلہ مالیات کا تھا۔ برطانوی حکومت نے فیصلہ کیا تھا کہ غدر کی جنگوں کا تمام بار ہندوستان پر ڈالا جائے جس کی وجہ سے ہندوستان کے قرض میں چالیس ملین پاؤنڈ سے زیادہ کا اضافہ ہو گیا تھا۔ اس قرض کا سالانہ سود بہت زیادہ ہوا کرتا تھا اور ہندوستان کے محصول دہندگان کو اس مطالبے کو پورا کرنا تھا۔ سیاسی معاشیات کا ایک باصلاحیت ماہر جیمس ولسن، جو کچھ مدت تک برطانوی حکومت کا مالیاتی سکریٹری رہ چکا تھا گورنر جنرل کی کاونسل کا پہلا مالیاتی ممبر مقرر کیا گیا۔ اس نے کاغذی کرنسی کو چلن دیا اور بڑھتے ہوئے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے لائسنس ٹیکس اور انکم ٹیکس لگایا۔

لارڈ کیننگ ہندوستان میں اپنا کام مکمل کر چکا تھا۔ انگلستان اور ہندوستان کی رائے عامہ کی تلخی دور ہو چکی تھی۔ ہندوستان کے پہلے اور عظیم ترین وائسرائے کے متعلق انگریز زیادہ منصفانہ خیالات قائم کر چکے تھے۔ لارڈ کیننگ کو پیش کئے جانے والے ایک الوداعی سپاسنامے میں کہا گیا تھا " مغرب کی اس سرزمین پر اگر کبھی انصاف و انسانیت کی قدر کی گئی تو آپ کو ایک نمایاں حیثیت دی جائے گی۔" لیکن لارڈ کیننگ کی قسمت میں مزید اعزاز نہیں تھے۔ وہ پچاس سال کی عمر میں جون 1862ء میں انتقال کر گیا۔ اسے ویسٹ منسٹر ایبی میں اپنے نامور اور اعلیٰ مرتبت باپ کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔ انگلستان کے درخشاں ناموں کی طویل فہرست میں وزیر اعظم جارج کیننگ اور ہندوستان کے وائسرائے چارلس کیننگ کے ناموں سے روشن تر نام بہت کم ہیں۔

لارڈ ایلگن مارچ 1862ء میں ہندوستان آیا اور لارڈ کیننگ کا قابل قدر جانشین ثابت ہوا۔ اس نے امن کی اسی پالیسی پر عمل کیا اور اسے ہندوستان کے لوگوں سے اسی قسم کی ہمدردی تھی۔" مرمر ایلگن" کے نام سے پکارے جانے والے ان بیش قیمت پتھر کے مجسموں کی بنا پر

جو وہ ایتھنس سے لایا تھا انگریز اس کے باپ سے زیادہ واقف تھے۔ بیٹا قریب قریب لارڈ کیننگ کا ہم عمر تھا اور آکسفورڈ میں اس کے ساتھ پڑھ چکا تھا۔ 1847ء سے 1854ء تک وہ کناڈا کا گورنر جنرل رہ چکا تھا اور وہاں کارہائے نمایاں سرانجام دے چکا تھا۔ 1857ء میں برطانوی فوج کے ساتھ چین جاتے ہوئے اس نے ہندوستان کے غدر کی خبر سنی تھی اور بڑی مستعدی کے ساتھ چین جانے والی فوج کو ہندوستان کی مدد کے لیے روانہ کر دیا تھا۔ پانچ سال بعد وہ وائسرائے اور گورنر جنرل کی حیثیت سے ہندوستان آیا۔ ہندوستان کے لوگوں سے ہمدردی رکھنے اور اپنا کام جاننے والے اس حکمراں سے بڑی توقعات وابستہ تھیں۔ لیکن وہ ہندوستان آنے کے ایک سال بعد انتقال کر گیا اور اس لیے ہندوستان کے نظم و نسق کو متاثر نہ کر سکا۔

اس کے بعد لارڈ ایلگن کے جانشین کا مسئلہ درپیش ہوا۔ ڈلہوزی اور کیننگ ہندوستان کی حکومت کے شکار ہو گئے تھے اور اپنے وطن صرف مرنے کے لیے واپس گئے تھے۔ ایلگن ہندوستان میں دو سال بھی نہ گزار پایا تھا کہ اس کا انتقال ہو گیا۔ تجربے سے یہ معلوم ہوا کہ وہ لوگ جو ہندوستان میں کافی مدت گزار چکے ہیں اور وہاں کی آب و ہوا کے عادی ہو چکے ہیں وہاں کام کرنے کے لیے زیادہ موزوں ہیں۔ سرجان لارنس کا حق دوسروں سے زیادہ تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ اس کا تعلق طبقہ امرا سے نہیں تھا۔ یہ بھی حقیقت تھی کہ سرجان شور کے علاوہ کوئی ہندوستانی کا سول ملازم اس سے پہلے گورنر جنرل کے عہدے پر مستقل نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن غیر معمولی حالات نے اس دستور کو ترک کرنے پر مجبور کر دیا۔

ہندوستان میں بہتر حکومت کا ایک ایکٹ لارڈ ڈربی کی حکومت 1858ء میں بنا چکی تھی اور اس کا لڑکا لارڈ اسٹینلی پہلا سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا مقرر کیا گیا تھا۔ 1859ء میں کنزرویٹو حکومت ختم ہو گئی اور اس کے بعد قائم ہونے والی لبرل حکومت میں سرچارلس وڈ سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا مقرر کیا گیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ حکومت میں وہ بورڈ آف کنٹرول کا صدر رہ چکا تھا اور 1854ء کے مشہور مراسلے کے ذریعہ ہندوستان میں تعلیم کی تنظیم نو کر چکا تھا۔ وہ ہندوستان کے متعلق بڑی واقفیت رکھتا تھا۔ اس کے ساتھ اس میں سمجھ بوجھ اور ہندوستان کے لوگوں کے ساتھ انصاف کرنے کے عزم کی بھی کمی نہیں تھی۔ اس کا نائب سکریٹری لارڈ ڈی گرے (Lord de Grey) کچھ مدت بعد مارکوئیس آف رپن کے نام سے مشہور ہوا اور ہندوستان کا وائسرائے مقرر کیا گیا۔

سرجان لارنس 1859ء میں انڈیا کاؤنسل کا رکن مقرر کیا گیا تھا اور لارڈ اسٹینلی اور سرچارلس وڈ کی ماتحتی میں چار سال کام کر چکا تھا کہ لارڈ ایلگن کی موت نے ہندوستان کے وائسرائے کی جگہ خالی کر دی۔ انگلستان کے رائے عامہ نے پنجاب کے اس کارآزمودہ حاکم کو لارڈ ایلگن کا سب سے موزوں جانشین سمجھا۔ سرچارلس وڈ بھی اس کے کام سے واقف ہو چکا تھا اور اس نے بھی اس رائے سے اتفاق کیا۔ 30 نومبر 1863ء کی صبح وہ انڈیا آفس میں سرجان لارنس کے کمرے میں گیا اور کہا "آپ کو گورنر جنرل کی حیثیت سے ہندوستان جانا ہے۔ جب تک میں ملکہ کی منظوری حاصل کر کے ونڈسر (WINDSOR) سے واپس نہ آجاؤں آپ یہیں ٹھہریئے"۔ ملکہ کی منظوری حاصل کر کے سرچارلس اسی دن شام تک واپس آگیا۔

جنوری 1864ء میں لارنس کلکتہ پہنچ گیا۔ وہ ہندوستانیوں کے متعلق جتنی واقفیت رکھتا تھا شاید ہی کوئی انگریز رکھتا ہو۔ خوش قسمتی سے اس کی کاونسل کے اراکین بھی بڑے لائق و کارآمد تھے۔ ہنری سمنر مین (Henry Sumner Maine) اس کے کاؤنسل کا ممبر قانون تھا جو اس زمانے میں انگلستان کا سب سے لائق قانون دان سمجھا جاتا تھا۔ بزرگ سرچارلس ٹریویلین ممبر مالیات تھا جو تیس سال پہلے بین ٹنک اور میکالے کا رفیق کار رہ چکا تھا۔ رابرٹ نیپیر اس کا فوجی مشیر تھا جو بعد میں لارڈ نیپیر آف مگڈالا کے نام سے مشہور ہوا۔

ایک بے چین و بے قرار ماتحت اس کے لیے کچھ دشواریوں کا باعث بھی بنا۔ سربارٹل فریر Sir Bartle Frere جو اس زمانے میں بمبئی کا گورنر تھا۔ سخت سامراجی ذہنیت رکھتا تھا۔ اس نے ایک مضمون میں سرجان لارنس کی سرحدی پالیسی پر حملے کئے تھے۔ یہ مضمون لارڈ ایلگن یا اس کے جانشین کے لیے لکھا گیا تھا اور اس کے متعلق اس وقت تک کسی کو علم نہیں تھا۔ جب سرجان لارنس نے ایلگن کی جگہ وائسرائے کا عہدہ سنبھالا تو یہ مضمون اس کے ہاتھ لگ گیا۔ لارنس نے اپنے مخصوص انداز میں جواں مردی کے ساتھ اپنا تحفظ کیا۔ جب وہ مضمون سکریٹری آف اسٹیٹ کے دفتر پہنچا تو سرچارلس وڈ نے بڑی حقیقت پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے کہا "فریر نے پنجاب کی پالیسی کے خلاف جو لعن طعن کی ہے اس سے زیادہ ناعاقبت اندیشی اور عجلت پسندی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے"۔[1] اصراف بیجا اور ترقی کی وسیع اسکیمیں بناتے ہیں بھی سربارٹل فریرے

---

[1] باسورتھ اسمتھ، لارڈ لارنس کی سوانح Life of Lord Lawrence (1885ء) جلد 2 ص 300

اسی حد تک ناعاقبت اندیشی سے کام لیتا تھا جس حد تک لارنس احتیاط اور جزرسی سے کام لیتا تھا۔ اپنے اس ناعاقبت اندیش ماتحت کو قابو میں رکھنے کے لیے وائسرائے کو بہت کچھ کرنا پڑا۔

اکتوبر 1864ء میں لاہور میں ایک بڑا دربار کیا گیا۔ اس میں شریک ہونے والے چھ سو دیسی حکمرانوں اور سرداروں کے سامنے لارنس نے خود ان کی زبان میں تقریر کی۔ یہ ایسا کارنامہ تھا کہ اس کے پہلے یا اس کے بعد کا کوئی گورنر جنرل سرانجام نہیں دے سکتا تھا۔ بھوٹان کے ساتھ ایک چھوٹی سی جنگ ہوئی جس کے نتیجے میں دوآرس کا الحاق کر لیا گیا۔ الحاق کی شرط یہ تھی کہ مال گزاری کی نصف آمدنی بھوٹان کو ادا کی جائے گی۔ 1866ء میں اڑیسہ میں شدید قحط پڑا۔ لوگوں کو سہولتیں بہم پہنچانے کا کام پوری طرح نہیں کیا جا سکا جس کی وجہ سے بڑا جانی نقصان ہوا — حکومت کے سامنے زمین کا مسئلہ تو ہمیشہ ہی رہتا ہے۔ لارڈ کیننگ نے بنگال کے کسانوں کی لگان داری کا تحفظ کر دیا تھا۔ لارنس نے اودھ اور پنجاب میں بھی اس مفید پالیسی پر عمل کیا۔ لارڈ کیننگ سے اتفاق کرتے ہوئے سرجان لارنس نے سفارش کی کہ ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں بھی سرکاری مطالبے کا دائمی تعین کر دیا جائے۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک طاقتور درمیانی طبقے کو وجود میں لایا جائے اور لوگوں کی زرعی دولت کو فروغ دیا جائے۔ وہ ایسا زمانہ تھا جب لوگوں کی خوش حالی حاکموں کا اولین فرض سمجھا جاتا تھا۔

فوجی اخراجات جو سرجان لارنس کے زمانہ حکومت کے شروع میں 1,31,82,000 پاؤنڈ تھے اس کے اختتام کے وقت گھٹ کر 29,90,000 پاؤنڈ رہ گئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ہر سال خسارہ ہوتا تھا۔ اس کے پانچ سالہ دورِ حکومت میں قریب قریب $3\frac{3}{4}$ ملین پاؤنڈ کا مجموعی خسارہ ہوا۔ محاصل میں اضافے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ تجارت پر لگنے والے محاصل کی مخالفت برطانوی تاجر کیا کرتے تھے جس کا مقابلہ حکومت نہیں کر سکتی تھی۔ سرجان لارنس نے 1867ء میں سکریٹری آف اسٹیٹ کو لکھا تھا "اگر لائسنس ٹیکس منسوخ کر دیا گیا تو مجھے تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس قسم کے تمام محاصل لگانا ممکن نہیں ہے جس سے ہندوستان کی غیر یورپی آبادی کو تھوڑا بہت بھی فائدہ پہنچ سکے۔ جہاں تک ان کی رائے کا تعلق ہے وہ اس قسم کے کسی محصول کو منظور نہیں کریں گے۔ وہ تو چاہتے ہیں کہ تمام محاصل کا بار دیسی آبادی پر پڑے"[1]

---

(1) باسورتھ اسمتھ "لارڈ لارنس کی سوانح"

سر آرتھر سکیس پیری کو، جو اس وقت انڈیا کونسل کا رکن تھا۔ سر جان لارنس نے ایک نجی خط میں لکھا تھا "ان معاملات میں حکومت ہند کا انصاف سے کام لینا بہت دشوار ہے۔ ہندوستانیوں کی مدد کرنے کے لیے جب کوئی اقدام کیا جاتا ہے یا اس کی کوشش کی جاتی ہے تو اس کے خلاف آوازیں اٹھنے لگتی ہیں جن کی بازگشت انگلستان میں سنائی دیتی ہے اور لوگوں کی حمایت و ہمدردی حاصل کر لیتی ہے۔ کبھی کبھی تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔ مطلق اصطلاحات کی حد تک ہر شخص انصاف، اعتدال پسندی اور اس قسم کی دوسری خوبیوں پر زور دیا کرتا ہے۔ لیکن جب ان اصولوں کا اطلاق کیا جاتا ہے اور اس سے ان کے مفادات متاثر ہوتے ہیں تو وہ لوگ بدل جایا کرتے ہیں[1]۔"

ہندوستان کے قرض میں ایک غیر منصفانہ اضافے کی لارنس نے سختی سے مخالفت کی لیکن اس کی ایک نہ چلی۔ 1867ء میں انگلستان کی ایک چھوٹی سی جنگ حبشہ کے شاہ تھیوڈور کے ساتھ ہوئی تھی۔ بمبئی کی فوج کے کمانڈر انچیف رابرٹ نیپیر کو اس مہم پر بھیجا گیا تھا اور ڈزرائیلی کی شاعرانہ زبان میں گویا سینٹ جارج کا پرچم کوہ رسیلاس پر لہرا دیا گیا۔ لیکن اس مہم پر خرچ بہت ہوا تھا۔ ہندوستان کے سالانہ خساروں اور مالیاتی ابتری کے باوجود اس خرچ کے بڑے حصے کا بار نہایت رکیک اور غیر منصفانہ انداز سے ہندوستان پر ڈال دیا گیا۔ سر جان لارنس نے لکھا تھا۔ "غالباً میرا یہ خیال درست ہے کہ غدر کو فرو کرنے کے لیے انگلستان سے آنے والی تمام فوج کے اخراجات ہندوستان کو برداشت کرنے پڑے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ 1859ء اور 1860ء میں انگلستان چھاؤنیوں میں بڑی تعداد میں جمع ہونے والے ان لوگوں کے اخراجات بھی غیر منصفانہ طور سے ہندوستان پر ڈال دیے گئے تھے جن کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ ہندوستان بھیجے جائیں گے .... موجودہ صورت میں ہندوستان حبشہ کی مہم میں کوئی دل چسپی نہیں رکھتا ہے اور میری رائے میں اسے مہم کے اخراجات کا کوئی حصہ ادا نہیں کرنا چاہیے[2]۔" لارنس نے محض انصاف کا مطالبہ کیا تھا لیکن اس کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔

---

(1) باسورتھ اسمتھ "لارڈ لارنس کی سوانح" (Life of lord lawrence)

(2) ایضاً جلد 2 ص ص 411، 412۔ (Life of Lord Lowrence)

اب صرف اس سرحدی پالیسی کے متعلق چند الفاظ کہنے ہیں جس سے لارنس کا نام منسلک ہوگیا تھا۔ 1866ء میں سر چارلس وڈ سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کے عہدے سے سبکدوش ہوگیا۔ خرابی صحت کی بنا پر وہ انڈیا آفس سے علاحدہ ہوگیا اور لارڈ ہیلی فیکس کا خطاب پاکر ایوان بالا کا رکن ہوگیا۔ فروری 1866ء میں لارڈ ڈی گرے، جو بعد میں لارڈ رپن کے نام سے مشہور ہوا، سکریٹری آف اسٹیٹ مقرر کر دیا گیا۔ لیکن اس کے کچھ دن بعد لبرل حکومت ختم ہوگئی اور لارڈ کرین بورن LORD CRANBORNE جو بعد میں مارکوئیس آف سیلس بری کے نام سے مشہور ہوا، 1866ء میں سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا مقرر کر دیا گیا۔ وہ بھی بہت کم مدت اس عہدے پر کام کر سکا۔ مارچ 1867ء میں سر اسٹیفورڈ نارتھ کوٹ سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا ہوگیا۔ جب لبرل پارٹی کی حکومت دوبارہ بنی تو 1868ء میں نارتھ کوٹ کی جگہ ڈیوک آف ارگل (DUKE OF ARGYLL) سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا مقرر کیا گیا۔

عصری رجحان کا تقاضا تھا کہ تمام سکریٹری آف اسٹیٹ جن کے تحت سر جان لارنس کو کام کرنے کا موقع ملا یعنی سر چارلس وڈ، لارڈ ڈی گرے، لارڈ کرین بورن، سر اسٹیفورڈ نارتھ کوٹ اور ڈیوک آف ارگل، اس کے سرحدی پالیسی سے اتفاق رکھتے تھے۔ سب نے اس کے اس ناقابل ترمیم عزم کی حمایت کی کہ ہندوستان کی قدرتی سرحدوں کو برقرار رکھا جائے اور افغانستان کے دور تک پھیلے ہوئے پہاڑوں میں کسی نئی سرحد کی تلاش نہ کی جائے۔

لارنس کا کہنا تھا کہ ہندوستان کی مغربی سرحد کی توسیع کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم ان خطرات کو دعوت دیں جن سے ہم خائف ہیں، ہم ناقابل عبور دریاؤں اور پہاڑوں کی سنگین دیوار کی قدرتی سرحد کے بجائے ایک ایسی سرحد کی تلاش کریں جو ہر جگہ ہے اور کہیں بھی نہیں ہے، ہم اپنے مستقر سے دور اور ایک اجنبی آبادی کے درمیان دشمن سے لڑنے پر مجبور ہوں جو ہم سے پرخاش رکھتی ہے، ہم ان انسانوں کو جو مداخلت نہ کرنے کی صورت میں ہمارے دوست بن سکتے ہیں اپنا دشمن بنا لیں اور ہندوستان کی وہ بے اندازہ دولت برباد کریں جس کی ان لوگوں کو ضرورت ہے جو محصول وصول کرنے والوں سے محفوظ رہنا چاہتے ہیں اور واقعی بھک مری کے شکار ہیں۔ چنانچہ 1863ء میں دوست محمد کے انتقال کے بعد جب افغانستان کے تخت کے لیے رسہ کشی شروع ہوئی تو لارنس سختی کے ساتھ اپنی پالیسی پر ــــــ جس کو ماہرانہ بے عملی کی پالیسی کہا جاتا تھا ــــــ اس وقت تک قائم رہا جب تک افغانوں نے آپسی جھگڑے نبٹا نہیں لیے

1868ء میں دوست محمد کے ایک بیٹے شیر علی نے جب اپنے باپ کے تخت پر قبضہ کر لیا تو انگلستان کی حکومت کی منظوری کے ساتھ سر جان لارنس نے اسے افغانستان کا حقیقی حکمراں تسلیم کر لیا۔

لیکن سر جان لارنس کی اس دانش مندانہ، یکساں اور کامیاب پالیسی پر بھی اعتراضات کئے گئے۔ 1863ء میں پنجاب کی سرحد کے متعلق اس کی پالیسی پر حملے کرنے والا سر بارٹل فریرے انڈیا کونسل کا رکن مقرر ہو گیا تھا۔ وہ "مکتب پیش قدمی" سے تعلق رکھتا تھا اور اسے انڈیا کونسل کے ایک اور رکن سر ہنری رالنسن (Sir Henry Rawlinson) کی حمایت حاصل ہو گئی۔ رالنسن نے اپنی مشہور یادداشت میں ایک دفعہ پھر یہ مسئلہ اٹھایا اور وسط ایشیا میں روس کے پیش قدمی کو روکنے اور افغانستان اور ایران میں انگلستان کی طاقت اور اثر کو تقویت پہنچانے کے لیے "اقدامات تجویز کئے عجیب بات یہ ہے کہ "مکتب پیش قدمی" سے تعلق رکھنے والے کسی شخص نے یہ نہیں کہا کہ افغانستان اور ایران میں اپنی طاقت اور اثر کو تقویت پہنچانے کے اقدامات خود انگلستان برداشت کرے۔ اگر اس قسم کی تجویز پیش کی جاتی تو برطانوی محصول دہندگان اس سے نبٹ لیتے۔ ان کی ہر تجویز کی بنیاد یہ مفروضہ ہوتا تھا کہ اس کے اخراجات ہندوستان کے لوگوں کو برداشت کرنے چاہئیں۔

سر ہنری رالنسن کی یادداشت سر جان لارنس کو بھیج دی گئی۔ لارنس نے پانچ سال پہلے جس قسم کا جواب بارٹل فریرے کو دیا تھا ویسا جواب رالنسن کو بھی دیا۔ مختلف روداوں کے بھیجنے کے لیے اس موقع پر جو مراسلہ لکھا گیا تھا اس میں ہمیشہ کے لیے باضابطہ طور پر لارنس کی پالیسی کو پیش کر دیا گیا تھا۔

"ہم فوج کے ساتھ یا فوج کے بغیر کسی اعلیٰ برطانوی افسر کو بھیج کر افغانستان کے معاملات میں عملی مداخلت کے خلاف ہیں۔ ہم اس کے بھی خلاف ہیں کہ طاقت کے ساتھ یا طاقت کے بغیر اپنی سرحد کے پار اس ملک کی کسی چوکی یا علاقے پر قبضہ کیا جائے۔ ہمارا خیال ہے کہ موجودہ حالات میں اس قسم کا اقدام حملے یا دفاع کے لیے ہماری طاقت میں اضافہ کرنے کے بجائے افغانوں میں ہمارے خلاف اشتعال، مزاحمت اور نفرت کے جذبات پیدا کر دے گا۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ قدم سیاسی سوجھ بوجھ کے منافی ہو گا اور روس نے ہندوستان پر حملہ کرنے کا اگر واقعی کبھی ارادہ کیا تو اس کے راستے کی رکاوٹوں کو کم کر دے گا۔ ہمیں یقین ہے کہ ہم نے

اگر اپنی سرحد پار کر کے ایک دشوار گزار ملک میں اور دشمنی کا احساس اور غم و غصہ کے جذبات رکھنے والے لوگوں کے درمیان روس سے مقابلہ کرنا چاہا تو اس کی دشواریاں بڑی حد تک کم ہو جائیں گی۔ اس قسم کا قدم اٹھانے کی صورت میں ہمیں جو اخراجات برداشت کرنا پڑیں گے ان کا اندازہ لگانا مشکل ہے اور ہم ہندستان کے لوگوں پر مزید محاصل کا بار ڈالنے کے خلاف ہیں جو ان اقدامات کا بار اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہیں جن سے وہ واقف ہیں اور جن کی قدر و قیمت کو سمجھتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ ہندوستان میں دلچسپی رکھنے والے دوسرے لوگوں کی طرح ہمیں بھی جو مقاصد عزیز ہیں وہ خود اپنی سرحد کو مضبوط بنا کر، پوری طرح تیار رہ کر اور ایسی قابل عمل اور درست اغراض پر اپنی پوری توجہ اور وسائل صرف کر کے حاصل کیے جا سکتے ہیں جن کو پوری طرح اپنے قابو میں رکھا جا سکے۔

اگر روس کی طرح کی کوئی بیرونی قوت باہر سے ہندوستان پر حملہ کرنے کا ارادہ کرے یا جس کا امکان زیادہ ہے، ملک کے اندر بے چینی اور تاراج پھیلانے کی کوشش کرے تو ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری حقیقی پالیسی اور ہمارا بہترین دفاع کابل، قندھار اور اس قسم کی دوسری چوکیوں میں مداخلت سے پرہیز کرنے میں پایا جائے گا۔ اپنے علاقے میں یا اپنی سرحد پر ایک مضبوط، مسلح اور تربیت یافتہ فوج پر اعتماد کرنے اور لوگوں کی محبت نہ سہی ان کی دلجمعی میں پایا جائے گا۔ حق و جائیداد کے تحفظ کے اس جذبے میں پایا جائے گا جو ہماری پالیسی کی بنا پر رفتہ رفتہ طبقہ امرا اور خاص خاص سرداروں کے ذہنوں میں جاگزیں ہوتا جا رہا ہے۔ برطانوی ہند کے ان اہم کاموں میں پایا جائے گا جن کی بنا پر ایک طرف تو لوگوں کو مزید سہولتیں مل رہی ہیں دوسری طرف ہماری سیاسی اور فوجی طاقت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ مالیات کو بہتر بنانے اور وسائل کو ترقی دینے اور مستحکم بنانے میں پایا جائے گا۔ خاموشی کے ساتھ ان فوری ضرورتوں کو پورا کرنے کی تیاری میں پایا جائے گا جنھیں کوئی ہندوستانی مدبر نظر انداز نہیں کر سکتا ہے۔ ہمارے ارادوں کی دیانت اور راست بازی پر اعتماد اور شکایتوں کی ان وجوہ کو دور کرنے میں پایا جائے گا جن کی بنا پر یا تو باہر سے حملہ ہوتا ہے یا مشتعل افراد ملک کے اندر بغاوت پر تیار ہو جاتے ہیں۔"

باب 2

میو اور نارتھ بروک

ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد لارنس کو لارڈ کے خطاب سے نوازا گیا اور ہندوستان میں ایک لائق شخص کو اس کا جانشین مقرر کیا گیا۔ لارڈ میو آئرلینڈ کا ایک خاندانی امیر تھا اور اپنے ہم وطنوں کی طرح ہمدردی اور فراخ دلی کے جذبات رکھتا تھا۔ اس کی خوش خلقی اور ملنساری دشمنوں کو رام کر لیا کرتی تھی۔ کام کرنے کی اس کی زبردست صلاحیت اچھے انتظام کی ضامن تھی۔ امن کے مفادات سے شدید لگاؤ نے اسے موقع دیا کہ وہ اپنے پیش رو کی پالیسی کو برقرار رکھے۔ اس کا باوقار و سنجیدہ انداز سب کو متاثر کیا کرتا تھا۔ وہ ہندوستان کے دیسی حکمرانوں اور سرداروں کے ہجوم میں ایسا لگتا تھا جیسے تاروں کے جھرمٹ میں چاند۔[1]

لارڈ میو 1822ء میں ڈبلن میں پیدا ہوا تھا۔ 1847ء میں پارلیمنٹ کا رکن منتخب ہو گیا تھا اور ہندوستان روانہ ہونے سے پہلے تین دفعہ آئرلینڈ کا چیف سکریٹری رہ چکا تھا۔ اس کا انتخاب مسٹر ڈزرائیلی نے کیا تھا۔ چونکہ 1868ء کے آخر میں کنزرویٹو حکومت ختم ہو گئی تھی اس لیے لوگوں کو شبہ تھا کہ لبرل وزارت اس کو وائسرائے نہیں بنائے گی۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ مسٹر گلیڈسٹن نے پارٹی کی بات ماننے اور اس کے انتخاب کو

---

(1) ایک نوجوان افسر کی حیثیت سے مجھے 72-1871ء کے موسم سرما میں شاہ سیام کو دی جانے والی ایک دعوت میں شرکت کا موقع ملا تھا جو کلکتہ کے گورنمنٹ ہاؤس میں ہوئی تھی۔ وائسرائے کی شاہانہ شخصیت اور باوقار تواضع نے دوسرے لوگوں کی طرح شاہی مہمان کو بھی متاثر کیا تھا۔

رد کرنے سے انکار کردیا۔ لارڈ میو کے تین سالہ دورِ حکومت میں اس کو لبرل وزارت کی پوری حمایت حاصل رہی۔

لارڈ میو نے 12 جنوری 1869ء کو کلکتہ میں حکومت ہند کا جائزہ لیا۔ اگر ہم اس کی "کابینہ" اور سات محکموں پر نظر ڈال لیں تو وائسرائے کی حیثیت سے اس کے کام کا کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ لارڈ میو نے خارجہ اور مفادِ عامہ کے کاموں کے محکموں کے "پورٹ فولیو" اپنے پاس رکھے۔ لائق قانون داں فزجیمس اسٹیفن (Fitz James Stephen) کاؤنسل کا رکن قانون تھا اور قانون سازی کے محکمے کی صدارت کیا کرتا تھا۔ سر رچرڈ ٹیمپل، جسے ہندوستان کے تعلق سے کئی قسم کے تجربے حاصل تھے، اس کا مالیاتی رکن تھا، بر وایلس رکن داخلہ تھا اور سر جان اسٹریچی ممبر مال تھا۔ ہر ممبر اپنے محکمے کے تعلق سے عام فرائض خود ادا کیا کرتا تھا۔ صرف اہم معاملات گورنر جنرل کے سامنے پیش کئے جاتے تھے۔ ہفتہ میں ایک دفعہ کونسل کا اجلاس ہوتا تھا جس میں تمام اراکین حصہ لیا کرتے تھے اور "دروازے بند کرکے یہ چند سری حکومت سامراجی پالیسی کے تمام پہلوؤں پر تبادلۂ خیال کرتی ہے۔"[1]

یہ مختصر مگر فکر انگیز جملہ ہندوستان کے نظم و نسق کی تمام اچھائیوں اور تمام برائیوں کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ "چند سری حکومت" ہندوستان کے لائق ترین برطانوی افسروں پر مشتمل تھی۔ لیکن شاہی حکومت کے پچاس سالہ دور میں کبھی کوئی ہندوستانی اس ادارے تک رسائی نہ پا سکا۔ کسی ہندوستانی کے سپرد نہ کبھی محکمہ مال کیا گیا، نہ محکمہ مالیات اور نہ کوئی دوسرا محکمہ۔ ہندوستان کے لوگوں کے لیے "کابینہ" میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ کابینہ کا مشورہ دینے کے لیے نمائندہ مشاورتی ادارہ بھی نہیں بنایا گیا ہے۔ کوئی ایسے آئینی طریقے بھی نہیں اختیار کئے گئے ہیں جن کی بنا پر ہندوستان کے لوگوں کا کابینہ سے رابطہ قائم ہو سکے۔ جب لوگوں کو اتنی سختی کے ساتھ خود اپنے معاملات کا انتظام کرنے سے باز رکھا جائے تو قابل ترین حکام پر مشتمل بہترین حکومت بھی کامیابی حاصل نہیں کر سکتی۔

ہندوستان پہنچنے کے صرف دو مہینے بعد لارڈ میو نے انبالہ کے مشہور دربار میں افغانستان کے نئے امیر کا خیر مقدم کیا۔ شیر علی جو افغانستان کے تخت پر پوری طرح قابض ہو چکا تھا۔

---

(1) سر ولیم ہنٹر "ارل آف میو" (Earl of Mayo) (اکسفورڈ 1891ء) ص 86-

اس امید کے ساتھ آیا تھا کہ حکومت ہند سے ایک معینہ رقم حاصل کر سکے گا۔ لارڈ میو نے اُسے ایک لاکھ پاونڈ کی وہ رقم دی جس کا وعدہ کیا جا چکا تھا اور بشرط ضرورت آئندہ امداد و حمایت کی امید دلائی لیکن معینہ رقم ادا کرنے سے سختی کے ساتھ انکار کر دیا۔ لارڈ میو نے لکھا تھا "ہم نے وضاحت اور صفائی کے ساتھ امیر کو بتا دیا ہے کہ اس کی باغی رعایا کی سرکوبی کے لیے کسی صورت میں بھی برطانیہ کا کوئی سپاہی سرحد پار نہیں کرے گا کسی مقررہ مدت کے لیے کوئی معینہ مالی امداد یا رقم اس کو نہیں دی جا سکے گی۔ کسی اور صورت میں بھی امداد کا وعدہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ہم اس قسم کا کوئی معاہدہ بھی نہیں کر سکیں گے جس کی رو سے ہمارے لیے ضروری ہو جائے کہ ہر حال میں ہم اسے یا اس کے وارثوں کو افغانستان کا امیر تسلیم کرتے رہیں۔ پھر بھی اس وقت اُسے صاف صاف اور غیر مشروط انداز سے امیر تسلیم کر کے اور اس کے کردار اور اس کے مفادات کے احترام کی دوستانہ شہادت پیش کر کے اس کی ہر امکانی اخلاقی امداد کرنے کو تیار ہیں۔ اس کے علاوہ جب ہم مناسب اور ضروری سمجھیں گے تو روپیہ، اسلحہ، گولہ بارود اور مقامی دست کار مہیا کر کے اس کی مدد کریں گے۔"[1]

یہ لارڈ لارنس کی "ماہرانہ بے عملی" پر سختی سے قائم رہنے کی مثال تھی۔ لارڈ میو نے انبالہ دربار کے فوراً بعد لارڈ لارنس کو لکھے جانے والے ایک خط میں اس کو تسلیم بھی کیا تھا "میں مذکورہ پالیسی پر سختی سے عمل کر رہا ہوں یعنی ایسا معاہدہ نہ کیا جائے جو آئندہ ہماری پریشانی کا باعث ہو۔ لیکن دوستانہ مراسم رکھے جائیں اور موقع کے مطابق مزید امداد دی جائے۔ مجھے یقین ہے کہ پچھلے دسمبر میں آپ نے شیر علی کو روپیہ اور اسلحہ دے کر جس پالیسی کی داغ بیل ڈالی تھی وہ آئندہ ہمارے لیے مفید ثابت ہو گی۔ میں اس کو برقرار رکھنا چاہتا ہوں۔"[2]

لیکن لارڈ میو نے اپنے پیش رو کی پالیسی کو محض برقرار نہیں رکھا۔ ہندوستان کی سرحدوں پر مستحکم بنیادوں پر امن قائم کرنے کے لیے اُس نے اُس پالیسی کو ترقی بھی دی۔

---

(1) سر ولیم ہنٹر، "ارل آف میو کی سوانح" (Life of Earl of Mayo) 1876ء جلد1، ص ص 259، 260۔

(2) باسورتھ اسمتھ، "لارڈ لارنس کی سوانح" (Life of Lord Lawrence) (1885) جلد2، ص 478۔

اس کی خارجہ پالیسی کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس نے ہندوستان کی سرحدوں پر دوستانہ مراسم رکھنے والی آزاد سلطنتیں قائم کیں جن کے داخلی معاملات میں وہ مداخلت نہیں کرتا تھا اور جنہیں برطانیہ کے زیر اثر نہیں لانا چاہتا تھا۔ لارڈ میو نے لکھا تھا "میرے خیال میں جو ہماری سرحدی پالیسی کے خاص خاص باتیں ہیں میں انھیں کئی بار دہرا چکا ہوں۔ ان کو چند الفاظ میں پھر بیان کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں قلات، افغانستان، یارقند، نیپال اور برما کی سرحدی ریاستوں سے دوستانہ تعلقات قائم کرنا چاہیے اور انھیں محسوس کرانا چاہیے کہ انتہائی طاقت ور ہونے کے باوجود ہم ان کی قومی سالمیت کی حمایت کرنا چاہتے ہیں۔ ضرورت پڑنے پر ہمیں روپے اور اسلحہ سے ان کی مدد کرنی چاہیے۔ بعض صورتوں میں فوجی مدد بھی کرنی چاہیے۔ ہمیں ان ریاستوں کو اپنی سلطنت کی بیرونی فصیل میں تبدیل کر دینا چاہیے اور یہ بات ان کے ذہن نشین کرا کے کہ ریاستوں کے الحاق کے دن ختم ہو چکے انھیں یقین دلانا چاہیے کہ ہماری دوستی اور حمایت حاصل کر کے وہ نقصان کے بجائے بہت فائدے میں رہیں گے۔"[1]

اس واضح مفید اور دانش مندانہ پالیسی پر عمل کرتے ہوئے لارڈ میو نے اکتوبر 1869ء ڈگلس فارسیتھ (Douglas Forsyth) کو روسی وزیر سے مذاکرات کے لیے سینٹ پیٹرس برگ بھیجا اور امیر افغانستان کی سلطنت کی شمالی سرحد دریائے آمو کا مقرر کیا گیا۔ لارڈ میو شاہ ایران کو بھی اس امر پہ آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ بلوچستان اور اس کی سلطنت کے درمیان حد بندی کر دی جائے۔ اس نے ایک برطانوی افسر کو بلوچستان کے داخلی جھگڑے چکانے کا اختیار دے دیا۔ نیپال کی طرف اس نے دوستانہ مگر سخت رویہ اختیار کیا۔ شمالی برما کے بادشاہ کے جنگجویانہ رجحانات پر اس نے قابو پالیا اور اس سے قریبی تجارتی مراسم قائم کئے۔ اگر لارڈ میو کے جانشین ہندوستان کے آس پاس کے ملکوں کی طرف ہمیشہ سخت مگر دوستانہ رویہ اختیار کرتے تو اس سے ہندوستان کو بہت فائدہ پہنچتا۔

لیکن ہندوستان کے داخلی انتظام اور خصوصاً مالیاتی انتظام میں لارڈ میو زیادہ کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ سر جان لارنس، جو بڑا سخت گیر ماہر معاشیات تھا، خسارہ کو بجٹ میں

---

(۱) سر ولیم ہنٹر، "ارل آف میو کی سوانح" (Life of Earl of Mayo) (1876ء)
جلد 1، ص ص 283 اور 284۔

تبدیل نہ کر سکا تھا اور لارڈ میو بھی صرف محاصل میں اضافہ کرکے کامیابی حاصل کر سکا۔ اس میں ان کا قصور نہیں تھا۔ اصل قصور برطانوی وزرا کا تھا جو وہ تمام مالی بار ہندوستان پر ڈال دیا کرتے تھے جس کا ایک حصہ انگلستان کو برداشت کرنا چاہیے تھا۔ 1870ء میں سرکاری قرض 102 ملین ہو چکا تھا اور اس بھاری قرض کا سود ادا کرنا پڑتا تھا۔ لارڈ میو نے انکم ٹیکس کی شرح ایک فی صدی سے بڑھا کر ½2 فی صدی کر دی اور کچھ دن بعد وہ ½3 فی صدی کر دی گئی۔ اس نے خسارے سے بچنے کے لیے بمبئی اور مدراس میں نمک کا محصول بڑھا دیا۔

لیکن لارڈ میو کے زمانہ حکومت میں ہندوستان کے مالیاتی نظام میں کچھ مستقل تبدیلیاں کی گئیں۔ سب سے پہلے اس اصول کو تسلیم کیا گیا اور اس کو عملی شکل دی گئی کہ قرض کی رقم پیداآور کاموں پر خرچ کی جائے تاکہ سالانہ آمدنی سے عام اخراجات پورے کیے جاسکیں۔ اس پالیسی کی بنا پر جیسا کہ ہم ایک اگلے باب میں دیکھیں گے، بغیر کسی معقول وجہ کے ریلوں کی تعمیر پر بڑی بڑی رقمیں خرچ کی گئیں اور بڑھتے ہوئے قرض کو کم کرنے کے لیے مناسب ذخیرہ ادائی کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا۔

دوسری تبدیلی وہ تھی جس کو لارڈ میو کی لامرکزیت کی اسکیم کہا جاتا ہے۔ اس کے وائسرائے مقرر کیے جانے سے پہلے ہندوستان کے مختلف صوبوں کو کوئی معینہ رقم نہیں دی جاتی تھی۔ صوبائی گورنر اپنے صوبوں کے لیے زیادہ سے زیادہ رقم حاصل کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے. جو سب سے زیادہ چیخ پکار کرتا تھا اسے سب سے زیادہ رقم مل جاتی تھی اور سر جان لارنس بڑی مشکل سے سر بارٹل فریرے کو بمبئی میں ایسے کام کرنے سے روک سکا تھا جس پر بڑی رقم خرچ ہونے کا امکان تھا۔ 14 دسمبر 1870ء کے آئین کے رو سے لارڈ میو نے صوبائی حکومتوں کو دی جانے والی رقموں کا پانچ سال کے لیے تعین کر دیا اور صوبائی گورنر معینہ رقم کی حدود میں رہتے ہوئے اپنے صوبوں کا بہتر سے بہتر انتظام کیا کرتے تھے۔ اب بھی جب پانچ سال میں ایک دفعہ صوبوں کی رقموں کا تعین کیا جاتا تھا تو زیادہ رقمیں حاصل کرنے کے لیے بھاگ دوڑ شروع ہو جاتی تھی۔ لیکن پانچ سال میں ایک دفعہ ہونے والی بھاگ دوڑ گورنروں کی سالانہ رسا کشی سے بہتر تھی۔[1]

لارڈ میو کے زمانے حکومت میں تیسری اور سب سے بڑی مالیاتی تبدیلی یہ کی گئی کہ مرکزی ذرائع آمدنی کے علاوہ لگنے والے صوبائی محاصل میں بڑا اضافہ کر دیا گیا۔ 1861ء میں لارڈ کیننگ کے

وزیر مالیات نے اس ضرورت کی طرف اشارہ کیا تھا کہ مرکزی ذرائع آمدنی کو زیادہ بار سے بچانے کے لیے صوبوں کو مجاز کیا جائے کہ وہ اپنے علاقے میں مقامی محاصل عائد کر سکیں۔ سر جان لارنس کے وزیر مالیات نے 1865ء کے بجٹ پر تقریر کرتے ہوئے بتایا تھا کہ 65-1864ء میں مقامی محاصل کی حقیقی آمدنی ½2 ملین پاونڈ تھی۔ لارڈ میو کی لامرکزیت کی اسکیم نے ان مقامی محاصل میں اور بھی اضافہ کر دیا۔

جب لامرکزیت کی اسکیم کے تحت مختلف صوبوں کے لیے رقموں کا تعین کیا جاتا تھا تو ہر صوبے کو اس کی ضرورت سے کم رقم دی جاتی تھی اور اس سے صاف صاف کہا جاتا تھا کہ مقامی محاصل میں اضافہ کر کے خسارہ پورا کیا جائے۔ محاصل اور محاصل کی شرحوں میں اضافہ کر کے مرکزی خزانے کا بار کم کیا جاتا تھا۔ پرانے ذرائع آمدنی برقرار رہے اور صوبوں نے صوبائی آمدنی میں اضافہ کرنے کے لیے نئے محاصل لگانے شروع کیے جو زیادہ تر زمین پر لگائے جاتے تھے۔ جیسا کہ کسی آئندہ باب میں بتایا جائے گا۔ لارڈ لارنس اس اسکیم پر غور کرنے کے بعد اس کو مسترد کر چکا تھا۔ بدقسمتی سے لارڈ میو نے اس پر عمل کیا جس کی بنا پر زمین پر سرکاری مطالبے کا بار

---

(1) 1870ء میں لارڈ میو نے پہلی مرتبہ مختلف صوبوں کے لیے مندرجہ ذیل رقمیں معین کی تھیں۔

بنگال	11,68,592 پاؤنڈ
شمالی مغربی صوبجات	6,40,792 "
پنجاب	5,16,221 "
مدراس	7,39,488 "
بمبئی	8,80,075 "
اودھ	2,06,948 "
صوبجات متوسط	2 61,263 "
برما	2,75,332 "
کل میزان	46,88,711 "

لیکن کچھ سال بعد اس اسکیم میں ترمیم کرنے اور معینہ رقم کے بجائے ہر صوبے کو مال گزاری کا حصہ دینے کی ضرورت محسوس کی گئی۔

بہت بڑھ گیا اور تشخیص مال گزاری کو نصف لگان تک محدود رکھنے کے وہ ضابطے درہم برہم ہوگئے جنھیں 1855ء اور 1862ء میں رواج دیا گیا تھا۔

ان مختلف النوع مصروفیتوں کے دوران اس ان تھک حاکم کی زندگی ایک قاتل کے خنجر نے ختم کر دی۔ لارڈ میو جزائر انڈومان کے دورے پر گیا تھا جہاں سزا یافتہ مجرموں کی بستی تھی۔ عین جوانی کے عالم میں، جب اس کی ذہنی اور جسمانی صلاحیتیں اپنے شباب پر تھیں، 8 رفروری 1872ء کو ایک قیدی نے اسے خنجر سے ہلاک کر دیا۔

خوش قسمتی سے اس کا جانشین بھی اس کی طرح نمایاں حیثیت رکھنے والا مدبر تھا اور امن کی پالیسی سے اسی حد تک لگاؤ رکھتا تھا۔ لارڈ نارتھ بروک 1826ء میں ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوا تھا جسے محتاط و کامیاب تاجر کی حیثیت سے یورپ میں بڑا نمایاں مقام حاصل تھا۔ اس نے ہندوستان کے انڈر سکریٹری کی حیثیت سے اس ماتحت ملک کے متعلق بڑی معلومات حاصل کر لی تھیں۔ ہندوستان کے سرحدی سوال کے تعلق سے اس نے لارنس اور میو کے صحت مند تصورات کو اپنایا۔ مالیاتی انتظام میں اسے اپنے ایک قریبی عزیز سر ایولن بارنگ (Sir Evelyn Baring) کی امداد اور مشورے حاصل تھے جس نے لارڈ کرومر (Lord Cromer) کے نام سے برطانوی سلطنت میں وہ شہرت پائی جو کم لوگوں کو نصیب ہوئی۔

اس کے دو پیش روؤں کی طرح لارڈ نارتھ بروک کا دور حکومت بھی دورِ امن و آشتی تھا۔ لیکن ہندوستان کی طرح کے ملک کے نظم و نسق میں دشواریوں سے پیچھا نہیں چھٹتا ہے اور انتظام سنبھالنے کے دوسرے سال لارڈ نارتھ بروک نے سکریٹری آف اسٹیٹ کو مطلع کیا کہ بنگال میں ایک شدید قحط پڑنے کا خطرہ محسوس کیا جا رہا ہے۔[1]

1866ء کے اڑیسہ کے قحط اور 1869ء کے شمالی ہندوستان کے قحط کے شدید جانی نقصان کو لوگ ابھی بھولے نہیں تھے اور لارڈ نارتھ بروک نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ 1874ء میں ان مہلک نتائج سے لوگوں کو محفوظ رکھے گا۔ لوگوں کی مدد کے بہت سے اقدامات وقت پر کئے گئے اور ہندوستان کی تاریخ میں پہلی دفعہ ان اقدامات میں مکمل کامیابی حاصل

---

(1) وائسرائے برا جلاس کونسل کا خط مورخہ 30 راکتوبر 1873ء

ہوئی۔ ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے مقابلے میں بنگال زیادہ وسائل رکھتا تھا۔ جہاں بندوبست استمراری کیا جا چکا تھا اور لگان کی شرح کم تھی اور دوسرے لوگوں کے مقابلے میں وہاں کے لوگ زیادہ بڑے پیمانے پر اپنی مدد آپ کر سکے اور ان اسباب کی بنا پر جانی نقصان کو بچانے میں امدادی اقدامات کارگر ثابت ہوئے قحط کے بعد کی جانے والی تحقیقات سے ظاہر ہوا کہ قحط کی وجہ سے کوئی جانی نقصان نہیں ہوا تھا۔

بروداکے گیکواڑ کی بدانتظامیوں نے کچھ دشواریاں پیدا کر دی تھیں۔ برطانوی ریذیڈنٹ کو زہر دینے کے اقدام کا الزام بھی اس پر لگایا گیا تھا۔ لارڈ نارتھ بروک نے اس کے مقدمے کی سماعت کا معقول انتظام کیا۔ تین انگریزوں اور تین دیسی حکمرانوں پر مشتمل عدالت قائم کی گئی اور گیکواڑ کے وکیل صفائی کے فرائض ادا کرنے کے لیے سرجنٹ بلان ٹین (Sergeant Ballantyne) کو انگلستان سے بلایا گیا۔ عدالت کا فیصلہ متفقہ نہیں تھا اور آخری دم تک سرجنٹ بلان ٹین کو یقین تھا کہ مبینہ اقدام کے سلسلہ میں گیکواڑ بے قصور تھا۔ لیکن وہ حکومت کرنے کے لیے ناموزوں ثابت ہو چکا تھا اور مزید الحاق کے خلاف ملکہ کے اعلان پر عمل کرتے ہوئے لارڈ نارتھ بروک نے اس کے خاندان کے ایک کم عمر لڑکے کو برودا کی گدی پر بٹھا دیا۔ پوری ایک نسل کے تجربے نے اس اقدام کی دانش مندی کو ثابت کر دیا ہے۔ اپنے حکمراں کے زیر حکومت برودا کا انتظام ہندوستان کی ریاستوں میں سب سے اچھا ہے۔ وہ کم عمر حکمراں بڑا ہونے کے بعد ملک کا سب سے روشن خیال دیسی حکمراں ثابت ہوا۔

پرنس آف ویلس، جو اب ملک معظم ایڈورڈ ہفتم بن چکا تھا، 76-1875ء کے موسم سرما میں ہندوستان آیا۔ اس کا بھائی ڈیوک آف اڈنبرا پانچ سال پہلے ہندوستان کا دورہ کر چکا تھا۔ ہندوستان کے لوگوں نے صدق دل کے ساتھ اور عام طور پر اپنی وفاداری کا مظاہرہ کر کے شاہی خاندان کے ساتھ اپنے دلی لگاؤ کا ثبوت دیا۔

لیکن مغرب سے اٹھنے والا ایک بادل رفتہ رفتہ ہندوستان کے صاف آسمان پر چھانے لگا۔ کیننگ اور لارنس، میو اور نارتھ بروک نے دوستانہ مراسم رکھنے والی طاقتور حکومتوں کے ساتھ امن برقرار رکھنے اور غریب اور بے وسیلہ ملکوں کی مالی حالت سنبھالنے کی جو ان تھک کوشش کی تھی اس کو انگلستان میں پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔ ایک نو

پھر برطانوی سامراجیوں نے سوچنا شروع کیا کہ مشرق کی طرف روس کی پیش قدمی کو روکا جائے۔ ایک دفعہ پھر انھوں نے فیصلہ کیا کہ اس سامراجی کھیل پر خرچ ہونے والی رقموں کا بار ہندوستان کو برداشت کرنا چاہیئے۔

1864ء میں سر بارٹل فریرے نے بمبئی کے گورنر کی حیثیت سے پیش قدمی کی پالیسی پر زور دیا تھا لیکن اس کی کوشش بے سود ثابت ہوئی تھی۔ اس نے لارنس کی سرحدی پالیسی پر جو حملے کئے تھے وہ لارنس کی نظر میں آگئے تھے اور ان کا موثر جواب دیا جا چکا تھا۔ 1868ء میں سر ہنری رالنسن نے ایک دفعہ پھر یہ مسئلہ اٹھایا تھا۔ چونکہ موقع مناسب تھا اس لیے تیسری کوشش کامیاب ہو گئی۔

1874ء میں سر بارٹل فریرے نے زور دینا شروع کیا کہ ہرات، قندھار اور کابل میں برطانوی ایجنٹ مقرر کئے جائیں اور افغانستان کو ایک دوستانہ مراسم رکھنے والے طاقتور ملک کی حیثیت دینے کے بجائے اس ملک پر برطانوی اقتدار و اثر قائم کیا جائے۔ کار آزمودہ لارڈ لارنس نے 1874ء میں جواب دیا کہ جس پالیسی کی وکالت سر بارٹل فریرے کر رہا ہے اس سے روس کی پیش قدمی رکنے کے بجائے اس کو سہولتیں مل جائیں گی، افغان قوم انگریزوں کے خلاف ہو جائے گی، افغانستان میں مقیم برطانوی افسر قتل کر دیے جائیں گے اور قتل کے بعد از سر نو جنگ شروع ہو جائے گی۔ اس روشن ضمیر بزرگ نے 1874ء میں جو پیش گوئی کی تھی وہ پانچ سال بعد لفظاً لفظاً پوری ہوئی۔ لیکن اس کا مشورہ نظر انداز کر دیا گیا اور پنجاب اور افغانستان کی سرحد کے متعلق اس کے غیر معمولی تجربات و معلومات کو درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا سر بارٹل فریرے نے جنوری 1875ء میں لارڈ لارنس کو جواب دیا اور لارڈ سیلس بری نے جو اس سے پہلے پیش قدمی کی موافقت کرنے والوں کے خطرات کا طنز آمیز انداز میں مذاق اڑا چکا تھا، سر بارٹل فریرے کی بات مان لی۔ 1874ء میں کنزرویٹو حکومت بنی تو ڈیوک آف ارگل کی جگہ لارڈ سیلس بری سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا مقرر کیا گیا۔ اس نے لارڈ نارتھ بروک کو لکھا کہ ہرات میں ایک برطانوی ایجنٹ مقرر کیا جائے، اس کے بعد قندھار اور آخر میں کابل میں بھی ایجنٹ مقرر کیا جائے۔[1]

---

(1) مراسلہ مورخہ 22 جون 1875ء

لارڈ نارتھ بروک اب بھی لارڈ لارنس کا ہم خیال تھا۔ اس نے سر بارٹل فریرے کے نام لارڈ لارنس کا جواب پڑھا تھا اور لارڈ لارنس کے نام ایک خط میں اپنی مکمل حمایت کا اظہار کیا تھا۔[1]

جب لارڈ نارتھ بروک کو لارڈ سیلس بری کا خفیہ مراسلہ فروری 1875ء میں ملا تو اس نے تار کے ذریعہ جواب دیا کہ مجوزہ اقدامات کے لیے وقت اور حالات ساز گار نہیں ہیں۔ جون 1875ء میں اس نے لارڈ سیلس بری کے مراسلے کا باضابطہ جواب دیا اور اس میں لکھا کہ لارڈ ڈلہوزی کے زمانے سے جس پالیسی پر عمل ہوتا رہا ہے اور کامیابی کے ساتھ عمل ہوتا رہا ہے وہ ہے ایک طاقت ور افغانستان کو وجود میں لانا جس کے حکمراں پر اتنا برطانوی اثر ہو کہ اسے دوسروں پر حملہ کرنے سے باز رکھ سکے۔ اس خط[2] پر نارتھ بروک اور اس کی کاونسل کے دوسرے اراکین یعنی لارڈ نیپیر آف مگ ڈالا، سر ہنری نارمن، سر آرتھر ہابوس، سر ولیم میور اور ایشلے ایڈن کے دستخط تھے۔

لارڈ سیلس بری نے نومبر 1875ء میں اس کا جو جواب دیا وہ برطانوی منسٹر کے قلم سے لکھی جانے والی دستاویزات میں بدترین تھا۔ "امیر کے ساتھ زیادہ اطمینان بخش بنیاد پر مراسم قائم کرنے میں پہلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ اس کو اس امر پر تیار کیا جائے کہ وہ اپنے دارالسلطنت میں ایک عارضی سفارت خانہ کھولنے کی ہمیں اجازت دیدے۔ ہمیں اس امر کا اعلان عام نہیں کرنا چاہیے کہ اس کی سلطنت میں مستقل سفارت خانہ کھولنے سے اس اقدام کا کوئی تعلق ہے۔ اس سے بڑا فائدہ ہوگا اگر یہ دکھا جائے کہ اس کا مقصد کوئی کمتر سیاسی مفاد ہے جس کو دریافت کرنا یا بشرط ضرورت ایجاد کرنا جناب والا کے لیے زیادہ مشکل نہیں ہونا چاہیے۔"[3]

اس عجیب وغریب خط کا جواب لارڈ نارتھ بروک نے سخت مگر باوقار انداز سے دیا۔ اس نے لکھا کہ افغانستان میں اگر مستقل سفارت خانہ قائم کرنے کا ارادہ ہے تو ہمیں اس کی

---

(1) مراسلہ مورخہ 18ر دسمبر 1874ء مندرجہ باسورتھ "لارڈ لارنس کی سوانح" Life of Lord Lawrence (1885ء)، جلد دوم، ص 479۔

(2) مورخہ 7ر جون 1875ء۔

(3) خفیہ مراسلہ مورخہ 19ر نومبر 1875ء۔

نوعیت اور غرض سے امیر کو مطلع کر دینا چاہیے۔ اسی کے ساتھ اس نے اس اقدام کو غیر ضروری قرار دیا۔

ہمیں یقین ہے کہ لارڈ کیننگ، لارڈ لارنس اور لارڈ میو نے افغانستان کے تعلق سے جو پالیسی اختیار کی تھی اس پر ثابت قدمی سے قائم رہنا، جس کی ہم مسلسل کوشش کرتے رہے ہیں، امیر کے ساتھ قابل اطمینان بنیادوں پر مراسم قائم کرنے کے لیے ناگزیر ہے۔ جناب والا کے مراسلہ میں جو ہدایتیں دی گئی ہیں ان پر موجودہ حالات میں عمل کرنے میں ہم محسوس کرتے ہیں کہ افغانستان کے امن اور ہندوستان کی برطانوی سلطنت کے مفادات کے لیے بڑے خطرات پیدا ہو جائیں گے[1]۔"

جس ڈاک سے یہ باوقار احتجاج انگلستان پہنچا اسی سے وائسرائے کے عہدے سے نارتھ بروک کا استعفیٰ بھی پہنچا۔

1858ء میں شروع ہونے والا امن و اصلاحات کا زمانہ لارڈ نارتھ بروک کے استعفیٰ کے ساتھ ختم ہو گیا۔ لٹن کے ساتھ سامراج پسندی کے دور کا آغاز ہوا۔

---

(1) مراسلہ مورخہ 28 جنوری 1876ء۔

باب 3

شمالی ہندوستان کی زرعی اصلاحات

یوں تو لارڈ کیننگ نے حکومت ہند کے ہر محکمے میں اصلاحات کیں لیکن اس کی اہم ترین اصلاحات وہ تھیں جن سے ہندوستان کے کسانوں اور مالکان اراضی کو فائدہ پہنچا۔ اس کے بنائے ہوئے 1859ء کے بنگال رینٹ ایکٹ نے نہ صرف بنگال کے کسانوں کا مناسب تحفظ کیا بلکہ دوسرے صوبوں کے لیے اسی قسم کے رینٹ ایکٹ بنانے میں اس کے جانشینوں کی مدد کی۔ کیننگ اور لارنس نے شمالی ہندوستان میں جو زرعی اصلاحات کی تھیں ان کا اجمالی ذکر اس باب میں کیا گیا ہے۔

بنگال

لارڈ کارنواس نے 1893ء میں جب بنگال کی مالگزاری کا بندوبست استمراری کیا تھا تو اس ایکٹ میں ایک دفعہ ایسی رکھی گئی تھی جس کے تحت حکومت کسانوں کا مناسب تحفظ کرنے کے اقدام کی مجاز تھی۔ وقفے وقفے سے کسانوں کی حالت کے متعلق تفتیش و تحقیقات کی جاتی تھی لیکن ساٹھ سال سے زیادہ مدت تک بنگال کے کسانوں کو معہودہ تحفظ حاصل نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ بنگال کا انتظام کرنے والے کمپنی کے ملازمین کی بے توجہی نہیں تھی اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ بالائی طبقوں اور عام لوگوں کے درمیان قانون سازی کرنے کی مناسب بنیاد تلاش کرنا بڑا دشوار کام تھا۔

آخر کو لارڈ کیننگ نے اس دشواری پر قابو پا لیا۔ اس کا بنایا ہوا بنگال رینٹ ایکٹ

(1859ء کا ایکٹ نمبر 10) بنگال کے کسانوں کا چارٹر سمجھا جاتا ہے، اس نے بنگال کے ان کسانوں کو تین درجوں میں تقسیم کر دیا جن کے ساتھ بندوبست کیا جا چکا تھا۔ جو لوگ 1793ء سے زمین پر قابض و دخیل تھے ان کے لیے اس قانون میں کہا گیا کہ ان کے لگان میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکے گی۔ جو لوگ بیس سال سے زمین پر قابض تھے ان کے متعلق کہا گیا تھا کہ جب تک اس کے خلاف قطعی شہادت نہ پیش کی جائے وہ 1793ء سے قابض سمجھے جائیں گے اور یہ سمجھا جائے گا کہ وہ اس مدت میں وہی لگان دیتے رہیں جواب دے رہے ہیں۔ جو لوگ بارہ سال سے زمین پر قابض تھے انھیں دخیل کاری کا حق حاصل ہو گیا۔ بلا مستثنیٰ ان خصوصی اور معقول بنیادوں کے جن کا ذکر ایکٹ میں کر دیا گیا تھا ان کے لگان میں آئندہ کوئی اضافہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔[1]

یہ قانون بنگال میں ایک انقلاب لے آیا۔ چونکہ پہلے تو 1793ء میں مالکان اراضی سے وصول ہونے والے سرکاری مطالبے کا تعین کر دیا گیا تھا اور اب کسانوں سے وصول ہونے والے مالکان اراضی کے مطالبے کا تعین کر دیا گیا۔ اس لیے ہندوستان کے دوسرے حصوں کے مقابلے میں بنگال کے لوگ اس وقت زیادہ باوسیلہ اور خوش حال ہیں۔

اُودھ

اُودھ کے صوبے کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ 1856ء میں جب لارڈ ڈلہوزی نے اس صوبے کا الحاق کیا تو زمین دار یا تعلق دار اپنی زمین داریوں کے قریب مالک تھے اور شمالی ہندوستان کے دوسرے حصوں کے مقابلے میں گانو پنچایتیں کم ترقی یافتہ تھیں۔

برطانوی حکومت نے اس فرق کو نظر انداز کیا۔ حکام بندوبست نے کچھ صورتوں میں تعلق داروں کو بالائے طاق رکھ دیا اور گانو کے مالکان کے ساتھ بندوبست کیا۔ لیکن زیادہ تر صورتوں میں ایسا نہیں کیا جا سکا۔ اُودھ کے 23,543 گانوں میں سے 13,640 کا بندوبست 1856ء میں تعلق داروں کے ساتھ کیا گیا[2] اور 990 کا بندوبست گانو کے مالکان

(1) بعد میں بننے والے ایک ایکٹ کے ذریعے دوسرے کسانوں کو بھی حق دخیل کاری حاصل ہو گیا۔ اور شکمی کسانوں کے حقوق کا تعین کر دیا گیا۔

(2) بیڈن پاول ’برطانوی ہند کا زرعی نظام‘ (land System of British India) جلد دوم، ص 201

کے ساتھ کیا گیا۔ نئے نئے حاصل ہونے والے ایک صوبے میں لوگوں کے قدیم رہنماؤں کو نظر انداز کرنا نہ انصاف پر مبنی تھا اور نہ فراست پر۔ اُودھ کے تعلق داروں نے سمجھا کہ ان کے حقوق چھینے جا رہے ہیں اور دوسرے سال جب غدر شروع ہوا تو وہ اس میں شامل ہو گئے۔

غدر ختم ہو گیا اور لارڈ کیننگ نے مارچ 1858ء کے اس اعلان کے ذریعے جو تاریخی اہمیت کا حامل ہے، تمام جاگیریں چھین لیں۔ گورنر جنرل نے صرف چھ وفادار مالکان اراضی کے حقوق کا احترام کیا اور دوسروں سے وعدہ کیا کہ وہ اگر اپنے دعوے کا ثبوت بہم پہنچا سکے تو انھیں "انعام و اعزاز" سے نوازا جائے گا۔

اس اعلان کے ذریعہ گورنر جنرل اودھ کے لوگوں کو مزید آگاہ کرتا ہے کہ مندرجہ بالا مستثنیات کے علاوہ صوبے کی زمین کا حق ملکیت برطانوی حکومت کے حق میں ضبط کیا جاتا ہے۔ حکومت اس حق کے متعلق جو فیصلہ مناسب سمجھے گی کرے گی۔

"ان تعلق داروں، سرداروں اور مالکان اراضی اور ان کے عملے سے جو اودھ کے چیف کمشنر کے سامنے فوراً حاضر ہو جائیں، ہتھیار ڈال دیں اور اس کے حکم کی تعمیل کریں۔ آنریبل گورنر جنرل وعدہ کرتا ہے کہ بالا مستثنیٰ ان صورتوں کے جب ان کے ہاتھ کسی ایسے انگریز کے خون سے رنگے ہوئے ہوں جس کو انھوں نے قتل کیا ہو، ان کی جان و عزت محفوظ رہے گی۔ لیکن آئندہ ان کے ساتھ کی جانے والی مہربانی، یا ان حالات کے لیے، جن میں انھیں رکھا جائے گا، انھیں چاہیے کہ وہ برطانوی حکومت کے انصاف اور رحم و کرم پر خود کو چھوڑ دیں۔"[1]

لارڈ کیننگ کا بڑے سے بڑا مداح تسلیم کرے گا کہ یہ اعلان صحیح نہیں تھا۔ غالباً اس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ وہ تمام تر زمین ضبط کرے اور تمام زمینوں کو ضبط کرنے کا اعلان نامناسب اور سیاسی اعتبار سے غلط بھی تھا۔ اس اعلان کی بنا پر لوگ محسوس کرنے لگے کہ آئندہ ہونے والے بندوبست میں برطانوی حکومت 1856ء کے مقابلے میں زیادہ تعلق داروں کو ختم کر دے گی۔ اس نے تعلق داروں کے ان خطرات کو درست ثابت کر دیا کہ نئے حکمراں ملک کا پرانا زرعی نظام ختم کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ اپنی انتہائی زرعی پالیسی کی ابتدا کر سکیں۔

لارڈ ایلین برا نے اس غلطی کو سمجھ لیا، جو 1858ء میں کنٹرول وشو حکومت بننے کے بعد

---

(1) اودھ کے کاغذات جن کی اشاعت کا حکم ہاؤس آف کامنز نے ۷ رمئی 1858ء کو دیا۔

بورڈ آف کنٹرول کا صدر مقرر کر دیا گیا تھا۔ اس کی جگہ کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو وہ گورنر جنرل کو خفیہ طریقے سے غلطی سے آگاہ کر دیتا اور اسے ہدایت کرتا کہ کسی آئندہ اعلان میں اس کی تلافی کر دی جائے۔ لیکن لارڈ ایلن برا کی ایک کمزوری یہ تھی کہ وہ بار بار دہرائی جانے والی باتیں بھی خطیبانہ انداز میں کہا کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ اس موقع کو ہاتھ سے جانے دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اپریل 1858ء میں اس نے اپنا مشہور خط لارڈ کیننگ کو لکھا۔

"یکبارگی لوگوں (اودھ کے) نے دیکھا کہ ان کا بادشاہ ان کے درمیان سے ہٹا دیا گیا اور ایک ایسے بادشاہ کی جگہ ہم نے لے لی جو ہزار خراب سہی مگر تھا تو ہندوستانی۔ حکومت کی اس تبدیلی کے فوراً بعد مال گزاری کا سرسری بندوبست کیا گیا جس نے صوبے کے ایک قابل لحاظ حصے میں سب سے زیادہ بااثر مالکان اراضی کو اس جائیداد سے محروم کر دیا جس کو وہ اپنی سمجھتے تھے اور جس کی بنا پر ان کے خاندان بلاشبہ مدتوں دولت و اعزاز حاصل کرتے رہے تھے۔

ان حالات میں ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اودھ میں ہمارے خلاف جو کچھ ہوا اس کی نوعیت بغاوت کے بجائے باضابطہ جنگ کی تھی۔ اس لیے اودھ کے لوگوں کے ساتھ ایسی تعزیری کارروائی کے بجائے دل جوئی و مہربانی کا برتاؤ کیا جانا چاہئے جس کی وسعت و شدت کی مثال تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔

آپ نے مختلف اصول پر عمل کیا ہے۔ کچھ لوگوں کو آپ نے خصوصی مراعات کے قابل سمجھا اور اس ملک کے بقیہ باشندوں پر وہ ضرب لگائی جس کو وہ سخت ترین سزا تصور کرتے ہیں۔

"جس ملک کے تمام لوگ یہ سمجھیں کہ ان کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے اور دشمنی پر کمربستہ ہو جائیں وہاں طاقت کے بل پر زیادہ دن حکومت نہیں کی جا سکتی ہے۔ اگر ان حالات میں کی جا بھی سکے تو اس کو خواہش کی تکمیل نہیں کہا جا سکے گا۔[1]"

اس سرزنش کا ہر جملہ انصاف پر مبنی ہے۔ لیکن لارڈ کیننگ کے ساتھ یہ زیادتی تھی جو ہندوستان میں برطانوی حکومت کو پیش آنے والے سب سے بڑے حادثے کا بار مسلسل

---

(1) کورٹ آف ڈائریکٹرز کی خفیہ کمیٹی کا خط ہندوستان کے گورنر جنرل کے نام مورخہ 19 اپریل 1858ء پیراگراف 13، 14، 15، 16 اور 20۔

اٹھا تا رہا تھا اور جس نے خود اپنے ہم وطنوں کے مشتعل جذبات پر قابو رکھا تھا اور مخالفوں کے ساتھ رحم دلی سے پیش آیا تھا۔ یہ واقعی زیادتی تھی کہ اودھ کے اعلان کے مقصد کے بجائے اس کی زبان کی بنا پر کیننگ کی سرزنش کی گئی۔

لارڈ ایلن برا کی سرزنش بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ وہ برطانوی کابینہ کا رکن تھا اور اس کی ناپسندیدگی کو برطانوی وزارت کی حمایت حاصل تھی اور وہ تار کے ذریعے ہندوستان بھیجی گئی تھی۔ ان واقعات نے ایسے موقع پر لارڈ کیننگ کے اقتدار کو دھکا پہنچایا جب اسے حمایت اور ہمت افزائی کی ضرورت تھی۔ انگریزوں نے اس کو محسوس کیا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ لوگ محسوس کریں کہ ہندوستانی سلطنت کے بچانے والے کی برطانوی حکومت نے مذمت کی ہے۔ یہ دشوار مسئلہ اس وقت حل ہوا جب لارڈ ایلن برا نے وزارت سے استعفیٰ دے دیا۔

ہندوستان میں ذمہ دار اور اہل فکر لوگوں نے لارڈ کیننگ کی غلطی کو سمجھ لیا تھا۔ سر جیمس اُوٹرم نے ’جو اس وقت اودھ کا چیف کمشنر تھا‘ لارڈ کیننگ کو اعلان میں ایک دفعہ بڑھانے پر راضی کر لیا کہ اودھ کے ان مالکان اراضی کے دعووں پر ہمدردی کے ساتھ غور کیا جائے گا جو فوراً اطاعت تسلیم کر لیں۔ سر جان لارنس نے کہا تھا ’جو اس وقت پنجاب کا چیف کمشنر تھا۔

"لوگوں سے یہ کہنا کہ ان کی تمام زمینیں اور جائدادیں ضبط کر لی جائیں گی۔ اس بات کے مترادف ہے کہ لوگوں کو پچھلی حالت پر واپس آنے کا موقع دینے سے انکار کر دیا جائے‘ اور انھیں مایوسی کی انتہا کو پہنچا دیا جائے۔" لارڈ ایلن برا کی سرزنش کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ غلطی کی پوری تلافی کر دی گئی۔ اودھ میں ملکیت کو تسلیم کر لیا گیا جن تعلق داروں نے اطاعت قبول کر لی ان کی زمینیں واپس کر دی گئیں۔ لوگوں کے رہنماؤں کو کچلنے کی جو غلطی 1849ء میں پنجاب میں اور 1856ء میں اودھ میں کی گئی تھی اس سے اکثر و بیشتر بچا گیا۔ زمین کا پہلا باضابطہ بندوبست 1860ء میں شروع ہوا اور 1878ء میں مکمل ہوا۔ یہ بندوبست تیس سال کے لیے کیا گیا تھا۔

یہ کام لارڈ لارنس کے حصہ میں آیا کہ اودھ کے کسانوں کا قریب قریب اسی قسم کا تحفظ کیا جائے جیسا لارڈ کیننگ نے بنگال کے کسانوں کا کیا تھا۔ اودھ کا پہلا رینٹ ایکٹ (1868ء کا ایکٹ نمبر 13) اس وقت بنایا گیا تھا جب پہلے بندوبست کا کام جاری تھا۔ نئے حقوق کو وجود میں لائے اور دخیل کار کسانوں کو تسلیم کیے بغیر اس نے ساقط الملکیت کسانوں کی لگان داری کو معینہ قرار دیدیا اور عدالت مجاز کے حکم کے بغیر ان کے لگان میں اضافہ ممنوع قرار دیدیا۔

شمال۔ مغربی صوبجات

کسی گزشتہ باب میں بتایا جا چکا ہے کہ اس علاقے کا بندوبست جو شمالی مغربی صوبجات کہلاتا تھا، رابرٹ مرٹنس برڈ کی نگرانی میں ہوا تھا۔ ٹامسن نے ہدایت برائے حکام جاری کی تھیں اور لارڈ ڈلہوزی نے 1855ء میں قطعی فیصلہ کر دیا تھا کہ سرکاری مطالبہ لگان کا نصف مقرر کیا جائے۔ اس کے بعد کے زمانے میں جو موجودہ باب کا موضوع ہے صرف ایک اہم تبدیلی کی گئی یعنی لارڈ نارتھ بروک کے زمانے میں لینڈ ریونیو ایکٹ (1873ء کا ایکٹ نمبر 13) منظور کیا گیا۔ اس نے پچھلے پچاس ضابطوں یا ایکٹوں کو منسوخ یا ترمیم کر کے قانونی الجھنیں دور کر دیں اور نئے ایکٹ کی دفعات کے تحت بندوبست پر نظر ثانی کی گئی۔ پیمائش کے پرانے طریقوں کے بجائے پیمائش برائے مال گزاری کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ حکام بندوبست نے موقع پر تحقیقات کر کے ہر کھیت کے لگان پر نظر ثانی کی اور غلطیاں درست کیں اور اس طرح مقرر کئے جانے والے لگان کا 45 سے 55 فی صدی تک سرکاری مال گزاری کا مطالبہ مقرر کیا گیا۔

ان تبدیلیوں کی اہمیت کو قاری سمجھ سکے گا۔ پرانا طریقہ جس پر برڈ اور ٹامسن نے عمل کیا تھا کل سے جز کی طرف جانے کا طریقہ تھا۔ ایک مالی حلقے کی مال گزاری معین کر دی جاتی تھی اور پھر اس حلقے میں شامل گاؤں پر وہ تقسیم کر دی جاتی تھی۔ لیکن 1873ء کے ایکٹ نمبر 13 کے تحت بنائے جانے والے ضابطوں کے رو سے جز سے کل کی طرف جانے کا طریقہ رائج کیا گیا۔ تحقیقات و تفتیش کے بعد ہر کھیت کے لگان کی درستی و تعین کیا گیا اور ایک مالی حلقے کے کھیتوں کے نظر ثانی شدہ لگانوں کی بنیاد پر مال گزاری تشخیص کی گئی اور اس طرح حلقے کی مال گزاری کا تعین کر دیا گیا۔ دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ پرانے طریقے میں کسی مالی حلقے کا سرکاری مطالبہ قیاسی ہوا کرتا تھا۔ لیکن نئے طریقے میں اس کا تعین نظر ثانی شدہ لگان کی بنیاد پر کیا جاتا تھا۔

اس کے باوجود حقیقی لگان مقرر کرنے کا طریقہ اصولی اعتبار سے غلط اور عملی طور سے ظالمانہ تھا۔ اگر کسی مالک آراضی کے متعلق یہ سمجھا گیا کہ وہ بہت نرمی سے کام لیتا ہے تو حاکم بندوبست کو اختیار حاصل تھا کہ وہ 1,000 پاؤنڈ کے مجموعی لگان کو نظر ثانی کے بعد 1,200 پاؤنڈ کر دے اور 600 پاؤنڈ سرکاری مطالبہ معین کر دے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مالکان اراضی بھی جو نرمی برتنا چاہتے تھے۔ سختی کرنے پر مجبور ہو گئے اور اس کی وجہ سے انھیں لگان کی شرح میں غیر ضروری

اضافہ کرنے کے موقعے مل گئے حالانکہ برطانوی حکومت کا اولین مقصد یہ ہے کہ لگان میں نامناسب اضافے کو روکا جائے۔

نصف لگان کے ضابطے کی ایک اور خلاف ورزی اس وقت کی گئی جب لارڈ میو کی 1870 کی لامرکزیت کی اسکیم کے تحت مقامی محاصل میں اضافہ ہوا۔ نصف لگان کا ضابطہ بناتے وقت لارڈ ڈلہوزی کی حکومت کا واضح مقصد یہ تھا کہ مالکان اراضی مجموعی لگان کے نصف حصے سے مستفید ہوں اور سرکاری مطالبہ نصف ثانی تک محدود رہے۔ لیکن 1871ء میں جب مالگزاری کے علاوہ اس کی مجموعی رقم پر 10 فی صدی ابواب لگائے گئے تو نصف لگان کے ضابطے کا مقصد فوت ہوگیا۔ علاقائی اسکیم نے زمین کے محصول میں اضافہ کر دیا' اس نے واضح حدود توڑ دیں جو لارڈ ڈلہوزی نے مقرر کی تھیں اور زمین سے وصول کئے جانے والے سرکاری مطالبے میں اضافہ کرنے کے لامحدود اختیارات صوبائی حکومتوں کو دیدئے۔ 1871ء میں ہندوستان کے تمام صوبوں میں زمین پر متعدد مقامی محصول عائد کر دیے گئے۔

پنجاب

پنجاب کے کسانوں کے حق لگان داری کے تحفظ کی سرجان لارنس نے نہایت جراَت مندانہ اور کامیاب کوشش کی تھی۔ جب دوسرے بندوبست کا موقع آیا تو بہت سے اُن مالکان اراضی نے دعوے دائر کر دیے جو 1853ء کے بندوبست کے وقت داخل خارج کی کاروائی نہیں کروا پاتے تھے، اگر انھیں مالکان اراضی تسلیم کر لیا جاتا تو ان کے آسامیوں کی حیثیت کم ہو جاتی اور وہ شکمی بن جاتے۔ خیال تھا کہ امرتسر کے ضلع میں اگر مالکان اراضی کے دعوے تسلیم کر لیے گئے تو 60,000 خاندانوں میں سے 46,000 خاندانوں کے کرتا اپنی حیثیت کھو بیٹھیں گے اور شکمی بن جائیں گے۔ چنانچہ کسانوں کے حقوق کا تحفظ کرنے کے لیے ایک ٹیننٹ بل (Tenant Bill) پیش کیا گیا اور 18 اکتوبر 1968ء کو شملہ میں اس پر بڑا سخت مباحثہ ہوا۔ سر ہنری مین نے ایک ناقابل فراموش تقریر کی اور اس کی پوری پوری حمایت کی اور سرجان لارنس نے خواہش ظاہر کی کہ اس کو قانون کی حیثیت دیدی جائے۔ آخر کو مخالفین خاموش ہو گئے۔ اور ٹیننٹ ایکٹ (1868ء کا ایکٹ نمبر 27) نے مالکان اراضی کے دعووں کو تسلیم کرتے ہوئے پنجاب کے کسانوں کا تحفظ کیا۔

"ایکٹ نے حقوق دخیل کاری کے ساتھ کسانوں کی حیثیت کو منضبط کیا اور اس کی تشریح کی۔ خصوصی صورتوں کے علاوہ اس نے اضافہ لگان کے خلاف ان کا تحفظ کیا، انتقالی لگان داری کے حق کو تسلیم کیا استحقاق شفع کو محدود کیا اور صرف مالک اراضی کو اس کا حق دیا اور آئرلینڈ میں زیر بحث آنے والے امور کے خطروں کی پیغمبرانہ پیش بینی کرتے ہوئے اس نے ان ترقیات کی وضاحت کی جو کسان کی بدولت ہو سکتی ہیں اور اس معاوضے کا تعین کیا جو اس کو ملنا چاہئے۔"[1]

یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ٹینینٹ ایکٹ کی منظوری کے تین سال بعد پنجاب لینڈ ریونیو ایکٹ (1871ء کا ایکٹ نمبر 33) لارڈ میو کے زمانہ حکومت میں بنایا گیا اور پنجاب کے بندوبست اس ایکٹ کے تحت بننے والے ضابطوں کی بنیاد پر کئے گئے۔

موجودہ باب میں ہم نے ان قوانین کا اجمالی جائزہ لیا ہے جو لارڈ کیننگ اور اس کے جانشینوں کے زمانوں میں شمالی ہندوستان کے کسانوں کے حقوق، لگان داری کے تحفظ کے لیے بنائے گئے۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت نے اس سے زیادہ مفید اور منفعت بخش قوانین کبھی نہیں بنائے ہیں۔ اس زمانے کے دانش مند حکام مالکان اراضی کے طبقے کو ختم نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس کے برعکس وہ ان کے حقوق کا احترام کرتے تھے لیکن اسی کے ساتھ وہ ان لوگوں کا بھی تحفظ کرنا چاہتے تھے جو واقعی کاشت کرتے تھے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ کیننگ اور لارنس نے ہندوستانی کسانوں کے تعلق سے نئے تصورات اور نئے حقوق کو رواج دیا ہو۔ انھوں نے تو صرف ان حقوق کی تشریح کی، ترقی دی اور منضبط کیا جو رواج کی بنا پر سینکڑوں ہزاروں سال سے ہندوستان کے کسانوں کو حاصل تھے۔ ہندوستان کے عام لوگوں کے مورخ کو اس دور میں بننے والے قوانین کا ذکر کرتے ہوئے بڑی مسرت محسوس ہوتی ہے یعنی ان قوانین کا ذکر جو طاقت ور کا احترام کرتے تھے اور کمزور کا تحفظ اور جن کی بنیاد ہندوستان کے وہ رسم و رواج اور قدیم حقوق تھے جو ضبط تحریر میں نہیں لائے گئے تھے۔ دانش مندی پر مبنی ان مفید قانونوں کا سہرا اصل میں لارڈ کیننگ اور سر جان لارنس کے سر ہے۔ اول الذکر نے بنگال کے

---

(1) ڈبلیو۔ ایس۔ سیٹین کار، مندرج باسورتھ اسمتھ، لارڈ لارنس کی سوانح (Life of Lord Lawrence) (1885ء)، جلد دوم، ص 423۔

کسانوں کا سب سے پہلے قانونی تحفظ کیا اور آخر الذکر نے اودھ اور پنجاب کے کسانون کا دیسا ہی تحفظ کیا۔ 1857ء کے مایوس کن زمانے میں ہندوستان کی برطانوی سلطنت کو بچانے کے لیے ان دونوں نے جو جرات مندانہ خدمات سرانجام دیں تاریخ ان کا اعتراف کرتی ہے۔ لیکن تاریخ ان خدمات کے اعتراف میں بڑے بخل سے کام لیتی ہے جو انھوں نے شمالی ہندوستان کے بے زبان کسانوں کے مفادات کے تحفظ اور ان کی خوش حالی کے لیے کیں۔ ہندوستان کے ان دو اہم ترین حاکموں کے اس کام کا اعتراف ہندوستان کے لوگوں کے معاشی حالات کے مورخ کا خصوصی اور قابل فخر کارنامہ ہے جس کو عام طور سے نظر انداز کیا گیا ہے۔

ایک طرف تو ان ممتاز و نمایاں حکمرانوں نے شمالی ہندوستان میں کسانوں سے وصول ہونے والے مالکان اراضی کے مطالبے کی ایک حد مقرر کر دی دوسری طرف انھوں نے مالکان اراضی سے وصول ہونے والے سرکاری مطالبے کا تعین کرنے میں بھی اسی قدر ہمت اور جرأت کا ثبوت دیا۔ ان کا خیال تھا، اور یہ خیال درست تھا، کہ ایک زرعی ملک میں حکومت ہر نئے بندوبست کے موقعے پر اگر زیادہ مال گزاری کا مطالبہ کرتی رہے تو وہاں مستقل بنیادوں پر نہ لوگ خوش حال ہو سکتے ہیں، نہ دولت اندوزی کر سکتے ہیں اور نہ زمین کو ترقی دینے کے لیے کوئی محرکات انھیں میسر آ سکتے ہیں۔ کیننگ اور لارنس چاہتے تھے کہ بڑھتے ہوئے مطالبوں کو حد میں رکھا جائے تاکہ لوگ خوش حال ہو سکیں اور لوگوں کی بنا پر ریاست کی آمدنی میں اضافہ ہو سکے۔ چونکہ مدبرین کی آئندہ نسل تنگ نظری کا شکار تھی اس لیے کیننگ اور لارنس اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ سلطنت کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہونے کی وجہ سے عام لوگوں کے ساتھ ان کے روابط میں کمی آ گئی تھی اور وہ لوگوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ اس مباحثے کی داستان بڑی دکھ بھری ہے جو آئندہ باب میں سنائی جائے گی۔

باب 4

ہندوستان کے لیے بندوبست استمراری کی تجویز

1837ء کے قحط کے بعد شمالی ہندوستان کے لوگوں کو پیش آنے والا سب سے تباہ کن حادثہ 1860ء کا قحط تھا۔ اس سے 25,000 مربع میل کا علاقہ اور 13 ملین آبادی متاثر ہوئی۔ دہلی، آگرہ، الہ آباد اور دوسرے شہروں کو قیامت خیز حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ حکومت نے ان لوگوں کی مدد کے لیے کام شروع کیے جو کام کرنے کی سکت رکھتے تھے۔ جو لوگ کام کرنے کے قابل نہیں تھے ان کی مدد کی ذمہ داری ارباب خیر نے قبول کی۔ جانی نقصان 1837ء کے مقابلے میں کم ہوا۔

جب قحط کے تباہ کن اثرات ختم ہو گئے تو لارڈ کیننگ نے اس کی وجوہ اور متاثرہ علاقے کی وسعت کی تحقیقات کا کام کرنل بیرڈ اسمتھ کے سپرد کیا۔ اس سے بہتر انتخاب ممکن نہیں تھا۔ بیرڈ اسمتھ نے 1857ء میں دہلی کی دوبارہ فتح کے سلسلے میں چیف انجینیر کی حیثیت سے نمایاں خدمات انجام دی تھیں۔ لیکن اس کی شہرت کی بڑی وجہ شمالی ہندوستان کی وہ نہریں تھیں جن کے ذریعے سے اس نے زیر کاشت رقبے میں اور لوگوں کے لیے غذائی اجناس میں اضافہ کر دیا تھا۔ اس نے حسب معمول بڑے جوش و خروش کے ساتھ نیا کام شروع کیا اور قحط سے متاثر ہونے والے رقبے کے حالات کی تفصیلی تحقیقات کے بعد مئی اور اگست 1861ء کے درمیانی وقفے میں تین رپورٹیں پیش کیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے کچھ ایسے واقعات دریافت کیے جن کا اطلاق ہندوستان کے ہر قحط پر کیا جا سکتا ہے۔

سب سے پہلے اس نے بڑی وضاحت کے ساتھ بتایا کہ قحط کی اصل وجہ ملک میں غذائی اجناس کی کمی نہیں تھی۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ فاقوں میں مبتلا لوگ غذائی اجناس حاصل نہیں کر سکتے

تھے۔ دوسری بات اس نے یہ کہی کہ لوگوں کی طاقت مدافعت کا انحصار بڑی حد تک اس زرعی نظام پر ہوتا ہے۔ جس کے تحت وہ زندگی گزارتے ہیں۔

"اس سے بڑی غلط فہمی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اگر یہ سمجھا جائے کہ زمین پر سرکاری مطالبے کی تشخیص کا قحط سے بہت کم تعلق ہوتا ہے یا کچھ حضرات کے بقول کوئی تعلق نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بڑی حد تک قحط کی اصل وجہ زرعی نظام ہے۔ حالانکہ نہروں، سڑکوں اور اسی قسم کی دوسری ضروری چیزوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مگر لوگوں کی روزمرہ کی زندگی اور ان کی خوشحالی اور بدحالی سے زرعی نظام کا ایک قریبی اور لازمی تعلق ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ انسانی ذہن کا ایجاد کردہ بہتر سے بہتر بندوبست بھی قدرت کی لائی ہوئی خشک سالی کے زمانے میں آسمان پر بادل نہیں چھا سکتا اور زمین پر بارش نہیں کرا سکتا۔ لیکن خشک سالی اور اس کے عواقب کو ایک حقیقت ماننے کے باوجود ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان کے تباہ کن اثرات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت تکمیل بندوبست کے راست تناسب ———— بلکہ میں تو کہوں گا اقلیدسی تناسب ———— سے پیدا ہوتی ہے جس کے تحت وہ زندہ رہتے ہیں اور زندگی گزارتے ہیں۔"[1]

1837ء اور 1860ء کے تفصیلی اور محتاط تقابل نے کرنل بیرڈ اسمتھ کے خیال کو پختہ تر کر دیا۔ دونوں قحطوں کے متاثرہ رقبے تقریباً یکساں تھے۔ دوسرے قحط نے مقابلتاً زیادہ لوگوں کو متاثر کیا تھا۔ لیکن دوسرے حالات 1860ء میں بدتر تھے۔ اس کے باوجود 1837ء کے مقابلے میں 1860ء میں لوگوں کو بہت کم تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا تھا اور جانی نقصان بھی بہت کم ہوا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ 1833ء میں جو زرعی نظام رائج کیا گیا تھا وہ پہلے نظام سے بہت بہتر تھا۔

ان ذرائع میں جنھوں نے شمالی ہندوستان کے سماج کو اس حد تک تقویت پہنچائی کہ 1860-61ء کی خشک سالی اور قحط کے زمانے میں 1837-38ء کے حالات سے بدتر حالات کا مقابلہ کیا اور نسبتاً کم نقصان اٹھایا۔ میں سب سے زیادہ اہمیت اس کو دیتا ہوں جسے فوری طور سے آسانی کے ساتھ تبدیل اور منتقل کرنے کے قابل بڑی زرعی جائیداد کہا جانا چاہیے جو طویل مدت کے لیے

---

(1) رپورٹ مورخہ ۱۴ر اگست 1861ء، پیراگراف 36۔

زمین پر سرکاری مطالبے پر حد قائم کرنے اور اس کے ساتھ انفرادی حقوق کے اقدامات کا راست نتیجہ تھی جن پر موجودہ بندوبست کے وقت سے عمل کیا جا رہا ہے[1]۔"

تحقیقات کے دوران حاصل ہونے والے اعداد و شمار اور شمالی ہندوستان میں اس وقت اور اس سے پہلے پائے جانے والے حالات کی بنا پر کرنل بیرڈ اسمتھ نے آئندہ قحطوں کے بدترین اثرات کے خلاف تحفظ کرنے اور لوگوں کی عام خوش حالی کی بنا پر ملک کی آمدنی میں اضافہ کرنے کے لیے مال گزاری کے بندوبست استمراری کی سفارش کی۔

"صحت مند اصولوں پر جزوی طور سے عمل کرنے کے خوشگوار نتائج مزید اقدامات کا جواز بھی مہیا کرتے ہیں اور ان کی ہمت افزائی بھی کرتے ہیں۔ چونکہ مجھے یقین ہے کہ اس سے سرکاری مفادات' اور عام لوگوں کے مفادات بھی' زیادہ سے زیادہ تقویت پائیں گے اس لیے میری مودبانہ گزارش ہے کہ سب سے پہلا اور سب سے اہم اقدام زمین پر سرکاری مطالبے کا استمراری تعین ہونا چاہیے۔"

یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ حکومت کی طرف سے دی جانے والی مطالبے کے دائمی تعین کی رعایت سرکاری آمدنی میں کمی کا باعث ہوگی۔ لیکن اس بات کو دھیان میں رکھنا چاہیے کہ بالا مستثنیٰ ایک امر واحد کے' جس پر علیحدہ غور کیا جائے گا' حکومت کے حالیہ اقدامات کا رجحان ایک اور خیال کی غمازی کرتا ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ اس کے مفادات کا تحفظ عام اضافوں کے بجائے زمین کے مطالبوں میں عام کمی سے ہوتا ہے .... اس قسم کی ذخیرہ اندوزی سے زمین کو فائدہ پہنچے گا اور اس طبقے کی بڑھتی ہوئی خوش حالی کے لازمی نتیجے کے طور پر' جس کو ہمیشہ ہندوستانی سماج کا روح رواں سمجھا جائے گا اور جس کی تقویت یا کمزوری سے سماجی ڈھانچہ ہمیشہ متاثر ہوگا' تجارت' کاروبار اور عام آسودہ حالی میں نہ صرف اضافہ ہوگا بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ سماج زیادہ سے زیادہ طاقت ور ہوتا جائے گا اور اس قسم کے حادثات کے دوران جن پر ہم اس وقت غور کر رہے ہیں' اس کی شکست و ریخت کا خطرہ رفتہ رفتہ کم ہوتا جائے گا۔ اگر ہم فرض کریں کہ اس قسم کے اقدامات کے نتیجے کے طور پر کسی نہ کسی حد تک ہماری توقعات پوری ہوں گی تو یہ خیال قرین عقل نہیں معلوم ہوتا کہ ایک باشعور اور طاقت ور حکومت اپنے فرائض

---

(1) رپورٹ' مورخہ ۱۴ ار اگست ۱۸۶۱ء' پیراگراف 60۔

ادا کرنے میں غفلت برتے گی۔ حکومت کا شعور اس کو مجبور کرے گا کہ عام آسودہ حالی میں حصہ لینے کا سب سے کم ناگوار اور سب سے زیادہ موثر طریقہ اختیار کرے اور حکومت کی طاقت اس طریقے کی مناسب آزمائش اور بالآخر کامیابی کی ضامن ہوگی۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ حکومت کو حقیقت میں کوئی قربانی نہیں دینی ہوگی بلکہ اس کے برعکس سرکاری مطالبے کے بندوبست استمراری کی بنا پر نجی جائیداد میں اضافہ ہو جائے گا اور اس کی وجہ سے سرکاری وسائل بھی بہت بڑھ جائیں گے[1]۔"

کرنل بیرڈ اسمتھ کے تجویز کردہ علاج کا پہلا اقدام یہ تھا۔ اس نے نہروں، سڑکوں اور ذرائع رسل و رسائل کو مکمل کرنے اور ان کو توسیع دینے پر بھی زور دیا۔ لارڈ کیننگ نے کرنل بیرڈ اسمتھ کی رپورٹ تمام صوبائی حکومتوں کو بھیج دی تاکہ وہ اس پر سنجیدگی سے غور کر سکیں۔

پنجاب کی رپورٹ

شمالی ہندوستان کی حکومت میں صرف پنجاب کی حکومت نے فوری طور سے بندوبست استمراری رائج کرنے کی مخالفت کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پنجاب کا الحاق صرف بارہ سال پہلے ہوا تھا اور زراعت کے اعتبار سے بہت سے ضلع پس ماندہ تھے۔ نئے لفٹیننٹ گورنر نے کہا۔

پنجاب کا نصف علاقہ بھی زیر کاشت نہیں ہے، ابھی بڑے بڑے علاقے افتادہ پڑے ہیں جہاں قریب قریب کوئی آبادی نہیں ہے، نقل و حمل کے ذرائع نامکمل ہیں اور وسائل کو عام طور سے جزوی ترقی دی جا سکی ہے۔ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ دانش مندی کا تقاضہ ہے کہ ان صوبوں کے لگان کے اضافے میں حکومت اپنے آئندہ حق سے دست بردار ہو جائے جہاں کی کاشت میں اوسط درجہ کی ترقی ہو چکی ہے پھر بھی یہ بات قرین مصلحت ہے کہ پس ماندہ صوبوں میں اس حق کو برقرار رکھا جائے۔

پنجاب کی حد تک تمام امور پر غور کرنے کے بعد لفٹننٹ گورنر اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ پنجاب کی طرح کے اس علاقے کے متعلق اس امر کو اگر قرین مصلحت بھی سمجھا جائے کہ وہاں زمین کے محصول میں آئندہ کوئی اضافہ نہ ہو جو زراعت کے اعتبار سے پس ماندہ ہو، اپنے فوجی اخراجات پوری طرح ادا نہ کر سکتا ہو اور جس کے سول ادارے سماج کے ترقی یافتہ حالات سے مطابقت نہ رکھتے ہوں

---

(1) رپورٹ، مورخہ ۱۴ اگست 1861ء، پیراگراف 62 اور 64۔

پھر بھی تقسیم کی موجودہ اور آئندہ انتہائی نابرابری کے پیش نظر اس کو دائمی قرار دینا مناسب نہیں ہوگا۔"[1]

شمال۔ مغربی صوبجات کی رپورٹ

شمالی ہندوستان پر ساٹھ سال سے انگریز حکومت کر رہے تھے اور ان ضلعوں میں بندوبست استمراری کو رواج دینے کے متعلق زوردار اور متفقہ رائے پائی جاتی تھی جہاں زراعت ترقی کر چکی تھی۔

ولیم میور نے، جو اس وقت بورڈ آف ریونیو کا سینیر ممبر تھا اور بعد میں صوبے کا لفٹننٹ گورنر اور ہندوستان کا ممبر مالیات مقرر ہوا تھا بندوبست استمراری کے فوائد کا خلاصہ چھ عنوانات کے تحت بیان کر دیا تھا۔

1۔ وقفے وقفے سے ہونے والے بندوبست کے اخراجات بچیں گے۔
2۔ بار بار ہونے والے بندوبست کی پریشانیوں سے لوگوں کا پیچھا چھٹے گا۔
3۔ ہر عارضی بندوبست کے بعد جائیداد کی مالیت میں ہونے والی کمی سے چھٹکارا ملے گا۔
4۔ زمین کو ترقی دینے کے محرکات اور زمین میں لگائے جانے والے سرمائے کی بنا پر خوش حالی میں اضافہ ہوگا۔
5۔ اراضی کی قیمت بہت بڑھ جائے گی۔
6۔ لوگ اطمینان کا سانس لے سکیں گے۔[2]

بورڈ آف ریونیو کے جونیئر ممبر آر۔ منی کا خیال تھا کہ اس اقدام کی بنا پر حکومت کو کوئی مالی نقصان نہیں ہوگا۔

"میرا خیال ہے کہ آئندہ بندوبست کے وقت جو سرکاری مطالبہ مقرر کیا جائے گا اس سے زیادہ مال گزاری میں کتنا ہی راست اضافہ کیا جائے لیکن زمین کی لگان داری کے طریقے کو زیادہ سے زیادہ آسان بنانے اور استحکام دینے سے مال گزاری کے وسائل میں بالواسطہ یا بلاواسطہ

---

(1) حکومت پنجاب کا خط حکومت ہند کے نام، مورخہ 25 اپریل 1862ء، پیراگراف 6 اور 16۔
(2) روداد مورخہ 5 دسمبر 1861ء، پیراگراف 30۔

اور رفتہ رفتہ جو اضافہ ہوگا اس سے اول الذکر اضافہ کوئی مناسبت نہیں رکھے گا"[1]۔

ان رایوں سے اتفاق کرتے ہوئے شمال مغربی صوبجات کے لفٹننٹ گورنر نے ایک پر مغز اور طویل روداد میں بندوبست استمراری کی سفارش کی۔

مجھے یقین ہے کہ شمال مغربی صوبجات کے بندوبست کو اگر رفتہ رفتہ دائمی حیثیت دیدی گئی تو اس وہ تمام فوائد حاصل ہوں گے جن کا ذکر کرنل بیرڈ اسمتھ اور مسٹر میور نے بڑی تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ زیادہ مدت کے لیے کیے جانے والے بندوبست کے نتائج کی بنا پر بجا طور سے توقع کی جا سکتی ہے کہ سرکاری مطالبے پر ہمیشہ کے لیے حد لگانے کی صورت میں لوگ زمین میں سرمایہ لگانے کو بڑی حد تک تیار ہو جائیں گے۔ زراعت پیشہ طبقوں کی دولت میں اضافہ ہوگا اور ملک کی خوش حالی اور قوم کی قوت بڑھ جائے گی۔ زمین کی زیادہ قیمت مل سکے گی۔ زراعت کی توسیع اور پیداواری صلاحیت میں ہونے والی ترقی کی بنا پر جو منافع حاصل ہوگا اس میں حصہ پانے کے حق سے دست بردار ہو کر حکومت آئندہ جو نقصان اٹھائے گی وہ کلیتاً نہ سہی مگر جزوی طور سے ان بالواسطہ رسومات سے پورا ہو جائے گا جو ملک کی بڑھتی ہوئی دولت اور خوش حالی کی بنا پر ہوں گی۔

میری رائے میں اس بات کو تسلیم کرنا چاہیے کہ سرکاری مطالبے کا دائمی بندوبست سیاسی اعتبار سے ایک دانش مندانہ قدم ہوگا۔ یہ واقعہ ہے کہ بہار اور بنارس کے صوبے کے کچھ اضلاع اور خصوصیت کے ساتھ غازی پور میں، جہاں بندوبست استمراری کیا جا چکا ہے، 58-1857ء کی بغاوت اتنے ہی شدید اور وسیع پیمانے پر ہوئی جتنی کہ صوبے ان حصوں میں ہوئی جہاں عارضی بندوبست کیا گیا تھا۔ لیکن جذبات کے اس مظاہرے کو اشتعال انگیزی کا نتیجہ سمجھنا چاہیے جس کا اثر وقتی تھا۔ اس سے یہ دلیل رد نہیں ہوتی کہ زمین کے مطالبے پر عائد ہونے والی مطلق حدود زراعت پیشہ لوگوں کے اطمینان کا باعث ہوں گی اور امید ہے کہ حکومت سے لگاؤ کے جذبے اور ملک کے بہترین مفادات کو ترقی دینے کی سرکاری خواہش پر اعتماد کے احساس کو جنم دے سکیں گی۔

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ بندوبست استمراری کو چند شرائط مستثنیات اور محفوظات کے ساتھ رائج کیا جانا چاہیے اور کچھ برسیں گزرنے کے بعد اس اقدام کی تکمیل کی جانی چاہیے۔ اس نہایت اہم معاملے میں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے جس سے حکومت اور عام لوگ دونوں کے

---

(1) روداد مورخہ 21 دسمبر 1861ء، پیراگراف 11۔

مفادات مجروح ہوسکتے ہیں۔"[1]

لفٹننٹ گورنر جی۔ ایف ایڈمانسٹن G.E. Edmonston کی تجویز کردہ "شرائط استثنیات اور محفوظات" کا مقصد یہ تھا کہ موجودہ بندوبست کو دائمی قرار دینے سے پہلے اس پر نظر ثانی کی جانی چاہیے، کچھ پس ماندہ اور غیر مزروعہ اضلاع کو چند برسوں کے لیے اس سے مستثنیٰ قرار دینا چاہیے اور وقفے وقفے سے ہونے والے بندوبست کے وقت مال گزاری میں متوقع اضافے کی کمی کو کسی حد تک پورا کرنے کے لیے پانی کے محصول کی شرح میں اضافہ کیا جانا چاہیے۔"[2]

بنگال کی رپورٹ

بنگال کا لفٹننٹ گورنر سیسل بیڈن (Cecil Beadon) گورنر جنرل کی کونسل کے رکن کی حیثیت سے مجوزہ اقدام کے متعلق اپنی رائے پہلے ہی ظاہر کر چکا تھا اور اس کی حمایت کر چکا تھا۔ اس نے ایک علیحدہ مراسلے کے ذریعے بنگال کے لفٹننٹ گورنر کی حیثیت سے اپنی رائے کی تصدیق کی۔

" حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ بورڈ اس بات کو کہنے میں حق بجانب ہے کہ حکومت اور اس شخص کے درمیان ہونے والا بندوبست، جس کو بندوبست کا مجاز سمجھا جائے، صرف ایک معاہدہ ہوتا ہے اور ایک عارضی معاہدے کی طرح کسی دائمی معاہدے کو باضابطہ اور جائز قرار دینے کے لیے قانون سازی کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر بھی لفٹننٹ گورنر کو یقین ہے کہ بنگال کے زیریں حصے کے بڑے علاقے میں، بلکہ پورے ہندوستان میں، مال گزاری کے بندوبست کے تعلق سے اگر ایک مستقل اصول بنا لیا جائے تو مناسب ہوگا کہ 1763ء کی طرح اس کی توثیق ایک باضابطہ قانون کے ذریعے کر دی جائے۔"[3]

---

(1) روداد مورخہ 27 مئی 1862ء، پیراگراف 7 — 10۔

(2) روداد مورخہ 27 مئی 1862ء، پیراگراف 37۔

(3) حکومت بنگال کا مراسلہ حکومت ہند کے نام مورخہ 29 جون 1862ء۔ اس بات کی وضاحت کر دینی چاہیے کہ 1763ء میں اڈیسہ اور چھوٹا ناگپور کی طرح بنگال کا بڑا علاقہ برطانوی حکومت میں شامل نہیں تھا اور اس لیے لارڈ کارنوالس کا بندوبست استمراری وہاں نہیں ہو سکا تھا۔ سیسل بیڈن کی مندرجہ بالا سفارش یہ تھی کہ ان بڑے علاقوں میں بندوبست استمراری کیا جانا چاہیے۔

وزیر مالیات کی رائے

سر جان شور ، جو اس وقت گورنر جنرل کی کونسل کا رکن تھا اس تجویز کی حمایت کی۔ لیکن لارڈ کیننگ کے لیے جس کی حمایت بڑی اہمیت رکھتی تھی وہ اس کی کاؤنسل کا رکن مالیات سیموئل لینگ (Samuel lang) تھا اس نے ایک ماہر مالیات کی خلقی اور قابل تعریف احتیاط سے کام لیتے ہوئے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا کہ بند و بست استمراری سے مال گزاری میں ہونے والا نقصان دوسرے ذرائع سے ہونے والی زیادہ آمدنی سے پورا ہو جائے گا۔ لیکن اس نے اعلیٰ مقاصد کے پیش نظر مجوزہ اقدام کی حمایت کی۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان مقاصد کو خود اس کے زوردار الفاظ میں بیان کر دیا جائے۔

" حکومت کی حیثیت سے ہمارا مقصد صرف اتنا نہیں کہ ہم ملک سے زیادہ سے زیادہ مال گزاری وصول کریں یا لوگوں کو یکساں طور سے جمود کی سطح پر رکھیں خواہ ایک پدرانہ حکومت کے تحت کسانوں کی یہ حالت ان کے لیے اطمینان بخش ہی کیوں نہ ہو۔"

"مسٹر بیڈن کی تجویز کے مطابق اگر ہم بند و بست استمراری کرتے ہیں تو ہم ایک ایسے سماج کی داغ بیل ڈال دیں گے جس کے انتظام میں شاید کچھ دشواریاں ہوں، مگر جو تہذیب و ترقی کے اعتبار سے زیادہ مالا مال اور متنوع ہوگا سماج کی درجہ بندی ہو جائے گی۔ ایک طرف بڑی بڑی جائیدادیں رکھنے والے امرا ہوں گے ان کے نیچے دیہات میں رہنے والے مالکان اراضی ہوں گے اور پھر آزاد کسان ہوں گے۔ حق ملکیت رکھنے والے چھوٹے چھوٹے کسان۔ سرمایہ اور مہارت رکھنے والے کسان طویل المدت پٹے کریں گے، چھوٹے کسان پٹے داروں کے شکیوں اور اجرت پر کام کرنے والے مزدوروں کی حیثیت حاصل کریں گے[1]۔"

---

(۱) دو قسم کے جس سماج کی عکاسی یہاں کی گئی ہے وہ آج بھی بمبئی اور مدراس کے رعیت داری علاقوں میں اور بنگال کے ان اضلاع میں پائے جاتے ہیں جہاں بند و بست استمراری ہو چکا ہے۔ اوّل الذکر میں حکومت کے تحت ملکیت رکھنے والے کسانوں کی جامد سطح ہے جو خوش اور مطمئن نہیں ہے۔ بنگال میں سماج کی درجہ بندی ہو گئی ہے۔ بڑی بڑی زمین داریاں رکھنے والے امرا ہیں۔ دیہات میں رہنے والے مالکان اراضی ہیں، دخیل کار کسان ہیں جن کے حقوق محفوظ ہیں، شکمی ہیں اور مزدور ہیں۔

"کچھ اضلاع میں ایک قسم کے لوگ زیادہ ہوں گے اور دوسرے اضلاع میں دوسرے قسم کے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ زیادہ تکلیفوں، نابرابریوں اور تکرار و تصادم کے باوجود مجموعی اعتبار سے اس کی بناپر، اس صورت کے مقابلے میں جہاں حکومت کو تمام اختیارات حاصل ہوں، زیادہ حرکت، سرگرمی اور ترقی پائی جائے گی۔"

"اگر انگلستان کا بادشاہ مختلف خانہ جنگیوں میں ضبط ہونے والی اور کلیسا سے چھینی جانے والی تمام اراضی کو غیر مشروط طور سے اپنے قبضہ و دخل میں رکھتا تو اس سے اتنی آمدنی ہوتی کہ محاصل کے بغیر حکومت چلائی جا سکتی لیکن کیا انگلستان کبھی اس قسم کا ملک بن سکتا جیسا کہ وہ ہے۔؟

اگر مشرق میں ہمارا کوئی مقصد ہے تو وہ یہ ہے کہ مشرق کی مطلق العنانیت کے قدیم اور مسلّمہ طریقے کے بجائے کوئی بہتر طریقہ تلاش کیا جائے اور ہندوستان کے لوگوں کو کم سے کم اس کا موقع دیا جائے کہ وہ باشعور اور آزاد قوم بن سکیں۔

میرے خیال میں ہمیں اس کے آمدنی پر پڑنے والے اثر سے ڈرنا نہیں چاہئے۔

یہ واقعہ ہے کہ اگلے بیس یا تیس سال تک لگان تو یقینی بڑھتا رہے گا لیکن ہمیں اس سے اتنا فائدہ نہیں ہوگا جتنا لگان کے اضافے کا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھنے کی صورت میں ہو سکتا ہے۔

"اگر بندوبست کے تعلق سے کچھ شرائط پر عمل کیا جائے تو مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمیں کافی آمدنی ہوتی رہے گی اور میں اس بات کو مناسب بھی نہیں سمجھتا ہوں کہ حکومت کی آمدنی ضروری مقاصد پر خرچ کی جانے والی رقم سے زیادہ ہو اور وہ آسانی سے روپیہ وصول کر سکے۔"[1]

سر جان لارنس کی روداد

صوبجات متوسط، مدراس اور بمبئی کی رپورٹوں کے ساتھ یہ رپورٹیں بھی سکریٹری آف اسٹیٹ

---

(1) روداد مورخہ 7 راپریل 1862ء۔ سر ڈاسمتھ نے لکھا تھا "نیم سنجیدہ اور نیم مضحک انداز میں یہ بات کہی گئی تھی کہ بھرے پرے خزانے کا لازمی نتیجہ جنگ ہوا کرتی ہے : لیکن یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ زیادہ محاصل لگا کر جو بچت حاصل کی جاتی ہے اس کا نتیجہ مزید فوجی خرچ، ہندوستان پر ڈالا جانے والا غیر منصفانہ بار اور ہندوستان سے ہونے والا زیادہ دولت کا نکاس ہوا کرتا ہے۔

فار انڈیا کے سامنے پیش کی گئیں[1]، سر چارلس وڈ نے اس سوال پر اور اس کے زمین کے محصول کے انفکاک سے تعلق رکھنے والے سوال پر پوری طرح غور کیا جو پچھلے کچھ برسوں سے حکومت کے زیر غور تھا۔ انفکاک کے معاملے میں تو پیش رفت نہ ہو سکی لیکن بندوبست استمراری کے سوال پر ٹھنڈے دل اور قابلیت کے ساتھ بحث و مباحثہ کیا گیا۔

سر جان لارنس نے، جو اس زمانے میں سکریٹری آف اسٹیٹ کی کونسل کا ممبر تھا، انفکاک کی پالیسی کی مخالفت کی لیکن بندوبست استمراری کی زوردار حمایت کی۔

"پچھلے دنوں میں ملک نے کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر لی ہو پھر بھی میرا خیال ہے کہ حکومت کے مطالبے پر حدود عائد کرنے سے ملک اور زیادہ تیزی سے ترقی کرے گا اس لیے میں بندوبست استمراری کی سفارش کرتا ہوں۔ یہ اقدام لوگوں کو زمین میں روپیہ لگانے پر آمادہ کرے گا اور اس کی وجہ سے مال گزاری محفوظ ہو جائے گی جو بار بار رونما ہونے والی قلت و بربادی کے زمانے میں پوری طرح وصول نہیں ہو پاتی ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ مال گزاری کا یہ نقصان بڑی حد تک عارضی ہوتا ہے۔ یہ بات بھی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ موجودہ کھیت جوتنے والوں اور حق ملکیت رکھنے والے کسانوں کو بے دخل کیے بغیر زمین سے تعلق رکھنے والے درمیانی طبقے کو پھلنے پھولنے کی سہولتیں مہیا کی جائیں۔ اس طبقے میں بہت سے ذہین، باہمت اور سماجی اثر رکھنے والے لوگ موجود ہیں لیکن وہ اتنے غریب ہیں کہ ان کے لیے صاف کپڑے پہننا بھی مشکل ہے۔ اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ کچھ لوگوں کو خصوصی مراعات دی جائیں خاص طور سے ایسی حالت میں جب کہ ان مراعات سے پوری قوم کا نقصان ہو۔ اصل میں ضرورت اس امر کی ہے کہ ان میں جو ذہین، کفایت شعار اور جفاکش ہیں انھیں موقع دیا جائے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو کام میں لا کر اپنی حالت سدھاریں اور اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ زمین کے سرکاری مطالبے پر حد لگا دی جائے۔ جب یہ لوگ جائیداد حاصل کر لیں اور ان کی مالی حالت بہتر ہو جائے گی تو انھیں حکومت سے لگاؤ پیدا ہو جائے گا اور وہ اپنا بڑھتا ہوا اثر اس کے حق میں استعمال کریں گے۔ ہندوستان کے لوگ مذہب اور احساس نسل کا بڑا پاس کرتے ہیں۔ لیکن ان کے دلوں میں زمین کی محبت اس سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ شمالی ہندوستان کے لاکھوں لوگ، جو جنگ جو نسلوں سے تعلق رکھتے

---

(1) صوبجات متوسط، مدراس اور بمبئی کی حکومتوں کی رائیں آئندہ تین ابواب میں پیش کی جائیں گی۔

ہیں۔ ان کی اولاد میں جنھوں نے زمین کی خاطر اپنا مذہب قربان کر دیا تھا۔ ملک کی اصل طاقت کسان ہیں۔ بڑی حد تک برطانوی راج کی بقا کا انحصار کسانوں کی آسودہ خاطری پر ہے۔ اگر وہ خوش حال ہیں تو زیادہ فوج کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ بہ صورت دیگر ہمیں بڑی فوج رکھنی پڑے گی[1]۔"

سر چارلس وڈ کا مراسلہ

سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا نے اپنے یادگار مراسلے مورخہ ۹ر جولائی 1862ء میں ان جذبات و دلائل کی حمایت کی۔ اس کے مندرجہ ذیل اقتباسات ہم پیش کر رہے ہیں۔

"بندوبست استمراری کے سیاسی فوائد کے متعلق ملکہ معظمہ کی حکومت کو کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔ مالکان اراضی سے وصول ہونے والے سرکاری مطالبے پر دائمی حدود عاید کرنے سے جو تحفظ کا احساس پیدا ہوگا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ زمین کی قطعی ملکیت کے حق کی جو تشکیل ہوگی اس سے ان لوگوں میں حکومت سے لگاؤ اور اس کے لیے احساس وفاداری پیدا ہونا ضروری ہے جس نے انھیں ایسی نعمت بخشی ہے اور جس کی بقا پر اس کے ہمیشہ قائم رہنے کا انحصار ہے۔"

یہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حق ملکیت رکھنے والے اور قبضہ و دخل رکھنے والے کسانوں کو بید خل کئے بغیر زمین سے تعلق رکھنے والے درمیانی طبقہ کو رفتہ رفتہ ترقی کرنے کے لیے ضروری سہولتیں مہیا کی جائیں۔ عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ اس طبقے میں بہت سے ذہین، مفاد عامہ سے دل چسپی رکھنے والے اور سماجی اثر رکھنے والے لوگ پائے جاتے ہیں حالانکہ وہ نسبتاً تنگ دست ہیں۔ اس طبقے کے ذہین، کفایت شعار اور جفاکش لوگوں کو اپنی حالت سدھارنے اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا موقع دینے کے لیے ضروری ہے کہ ان کی زمینوں پر تشخیص ہونے والے سرکاری مطالبے پر حدود عاید کی جائیں۔ جب یہ لوگ جائیداد حاصل کرلیں گے اور ان کی مالی حالت بہتر ہو جائے گی تو وہ اس حکومت کی طرف بہتر رویہ اختیار کریں گے جس کے تحت وہ زندگی گزارتے ہیں۔ آبادی کا بڑا حصہ کسانوں پر مشتمل ہے اور ان کی آسودہ خاطری پر حکومت کے تحفظ کا انحصار ہے۔ اگر کسان خوش حال ہیں تو کسی دوسرے طبقے یا گروہ کی عارضی شورش خطرے کا

---

(1) روداد مورخہ ۹ر جولائی 1862ء پیراگراف 15۔

باعث نہیں بن سکتی اور فوج اور فوجی اخراجات میں حسب ضرورت کمی بیشی کی جا سکتی ہے۔"

ملکہ معظمہ کی حکومت کو اس میں شک نہیں ہے کہ بندوبست استمراری عام ترقی کی رفتار کو تیز کردے گا۔ زمین پر حق ملکیت کی تشکیل ملک کی بڑھتی ہوئی دولت کے کاروباری استعمال کا ایک مفید ذریعہ مہیا کردے گی اور اس سے سب طبقوں کو فائدہ پہنچے گا۔ جیسا کہ بیرڈ اسمتھ نے نہایت قابلیت کے ساتھ لکھے ہوئے مذکورہ مضمون میں بتایا ہے کسانوں کی سماجی حیثیت بڑھ جائے گی اور وہ نہ صرف قلت کے زمانوں کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرسکیں گے بلکہ عام حالات میں بغیر کسی دشواری کے دوسرے قسم کے محاصل کا بوجھ بھی برداشت کرسکیں گے۔ ملکیت کا احساس یا' دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ زمین میں لگائے جاتے والے سرمائے اور محنت کا پھل پانے کا یقین انھیں اس بات پر آمادہ کرے گا کہ وہ زمین کو ترقی دینے کی ہر امکانی کوشش کریں۔ ملکہ معظمہ کی حکومت کو یقین ہے کہ آسودہ خاطر اور بتدریج ترقی کرتے ہوئے لوگ بغیر کسی دشواری کے دوسرے ذریعوں سے ہونے والی آمدنی میں اضافے کا باعث بنیں گے۔ یہ اضافہ اتنا ہو گا کہ آئندہ زمین سے ہونے والی آمدنی کی کمی کو پورا کردے گا۔"

ان تمام امور پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد ملکہ معظمہ کی حکومت اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ نہ صرف زمین سے تعلق رکھنے والے طبقوں بلکہ پوری قوم کو جو فائدے پہنچنے کی توقع کی جا سکتی ہے وہ اس قسم کے ہیں کہ ان کو حاصل کرنے کے لیے متوقع نقصان کا خطرہ مول لینا حق بجانب قرار دیا جا سکتا ہے اور ان تمام اضلاع میں جہاں اس اقدام کے لیے ضروری ابتدائی انتظامات مکمل ہو گئے ہیں یا آئندہ ہو جائیں' وہاں استمراری بندوبست کو صحت مند پالیسی کا آئینہ دار سمجھا جائے گا۔ اس سے ہندوستان کے وسائل ترقی پائیں گے اور بڑی حد تک وہ اس ملک میں بسنے والی ملکہ معظمہ کی رعایا کی خوشحالی اور آسودہ خاطری کا ضامن ہو گا۔"

حکومت کا خیال ہے کہ بندوبست استمراری کا راست طریقہ اس بالواسطہ طریقے سے بہتر ہے جس میں مالکان اراضی کو فک تشخیص کا حق دے کر مطلوبہ نتائج حاصل کئے جائیں۔ اس کا خیال کہ جائیداد کو ترقی دینے کی خاطر مالکان اراضی کو روپیہ خرچ کرنے پر آمادہ کرنے کے لیے فک تشخیص کا استحقاق ضروری نہیں ہے۔ انھیں محنت کرنے اور روپیہ لگانے پر آمادہ کرنے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ جائیداد کے سلسلے میں سرکاری ادائیگیوں سے انھیں مستثنیٰ قرار دے دیا جائے ضرورت اس امر کی ہے کہ مطالبے کا دائمی تعین کردیا جائے۔ تعین کرتے وقت اعتدال سے کام لیا جائے

اور غیر یقینی حالات ختم کر دیے جائیں۔ بنگال میں جہاں ستر سال پہلے زمین داروں کے ساتھ بندوبست استمراری کیا گیا تھا، دولت اور خوش حالی میں بڑا اضافہ ہوا ہے حالانکہ بندوبست کے طریقے میں کچھ غلطیاں اور خامیاں بھی تھیں جن کی وجہ سے کسانوں کی حالت میں سدھار نہیں ہو سکا تھا۔ اپنی موجودہ واقفیت کی بنا پر ہم ان غلطیوں سے بچ سکتے ہیں جن کا مضر اثر زمین کے ذیلی قابض کسانوں کے مفادات پر پڑے۔"

"چنانچہ ملکہ معظمہ کی حکومت نے قطعی فیصلہ کر لیا ہے کہ فک مال گزاری کے اختیارات صرف ان صورتوں میں استعمال کیے جائیں گے جن کا حوالہ مندرجہ بالا پیراگراف 26 میں دیا جا چکا ہے۔ لیکن اس نے پکا ارادہ کر لیا ہے کہ پورے ہندوستان میں مال گزاری کا بندوبست استمراری کیا جائے۔ پھر بھی اس امر کا فیصلہ کرنا باقی ہے کہ کس ضلع کے حالات اس کے فوری عمل درآمد کی اجازت دیتے ہیں[1]۔"

سر چارلس وڈ اور ارل ڈی گرے

جب سر جان لارنس ہندوستان کا وائسرائے مقرر ہوا تو اس نے اپنی خلقی مستعدی سے کام لیتے ہوئے زمین کے اہم مسئلے پر غور کرنا شروع کر دیا۔ مارچ 1864ء میں اس نے ایک روداد لکھی جس میں شمالی ہندوستان، اودھ اور پنجاب میں بندوبست استمراری کرنے کی تجویز کی موٹی موٹی باتیں پیش کیں۔

سکریٹری آف اسٹیٹ سر چارلس وڈ نے 24 مارچ 1865ء کو اسے جواب دیا۔ اس نے تین درجوں میں ہندوستان کے اضلاع کو تقسیم کیا۔

(1) وہ ضلعے جہاں زراعت پس ماندہ تھی۔

(2) وہ ضلعے جن کے بڑے حصے زیر کاشت تھے اور پوری طرح ترقی کر چکے تھے۔

(3) وہ ضلعے جن کے کچھ حصے پوری طرح زیر کاشت تھے اور کچھ حصے پچھڑے ہوئے تھے۔

اس نے فیصلہ کیا کہ دوسری قسم کے اضلاع میں فوراً بندوبست استمراری کر دیا جائے لیکن پہلی قسم کے اضلاع میں نہ کیا جائے۔ جہاں تک تیسری قسم کے اضلاع کا تعلق تھا اس نے

---

(1) مراسلہ مورخہ 9 جولائی 1862ء، پیراگراف 47، 48، 53، 58، 59 اور 63۔

کہا کہ ملکہ معظمہ کی حکومت "اس کے لیے تیار ہے کہ ان زمین داریوں پر نظر ثانی کرنے کے بعد جن کی 80 فی صدی اراضی یا مال گزاری ادا کرنے والا رقبہ واقعی زیر کاشت ہے فوری طور سے ہمیشہ کے لیے بندوبست کر دیا جائے۔" "جن زمین داریوں کی اراضی پوری طرح زیر کاشت نہیں تھی۔" "ان کی طرف عام رویہ اختیار کیا جائے اور ان کا بندوبست ایک معینہ مدت کے لیے کیا جائے جو تیس سال سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے۔"

وائسرائے بر اجلاس کاونسل نے 3 ر اگست 1865ء کو اس مراسلت کی نقلیں روانہ کر دیں جو نہری سینچائی کے تعلق سے بندوبست استمراری کے سوال پر شمال۔ مغربی صوبجات کی حکومت سے ہوئی تھی۔

سکریٹری آف اسٹیٹ ارل ڈی گرے اور رپن نے 17 ر مارچ 1866ء کو اس کا جواب دیا جس میں حکومت ہند کی ان ہدایتوں پر صاد کیا گیا تھا جو شمال مغربی صوبجات میں بندوبست استمراری رائج کرنے کے بارے میں لفٹننٹ گورنر کو دی گئی تھیں اور نہری سینچائی کے متعلق مندرجہ ذیل ضابطہ تجویز کیا۔

"ایک ضابطہ بنایا جا سکتا ہے کہ کسی ایسی زمین داری میں بندوبست استمراری نہیں کیا جائے گا جس کے متعلق بندوبست اور آب رسانی کے محکموں کے حکام کا خیال ہے کہ آب رسانی کے ذرائع کی متوقع ومکمل توسیع کے بعد ان کی مالیت موجودہ مالیت کے مقابلے میں 20 فی صدی زیادہ ہو جائے گی۔"

سر اسٹیفورڈ نارتھ کوٹ

سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا سر اسٹیفورڈ نارتھ کوٹ نے 23 ر مارچ 1867ء کو بندوبست استمراری کرنے کے متعلق ایک دفعہ پھر ملکہ معظمہ کی حکومت کے فیصلہ کی تصدیق کی۔ اس نے لکھا کہ "مالکان اراضی کے مفادات کو برطانوی حکومت کے استحکام سے منسلک کرنے کی اہمیت کے پیش نظر" ملکہ معظمہ کی حکومت مال گزاری میں آئندہ ہونے والے اضافے سے دست بردار ہونے کو تیار ہے۔ اس نے غیر ترقی یافتہ علاقوں اور زمین داریوں میں بندوبست استمراری پر کچھ حدود وقیود عائد کرنے کے لیے دو ضابطے بنائے۔

"پہلا ــــــ کسی ایسی زمین داری میں بندوبست استمراری نہیں کیا جائے گا جس کی

قابل زراعت اراضی یا مال گزاری ادا کرنے والے علاقے کا 80 فی صدی رقبہ واقعی زیر کاشت نہ ہو۔"

دوسرا ــــــ کسی ایسی زمین داری میں بند وبست استمراری نہیں کیا جائے گا جس کے متعلق گورنر جنرل بہ اجلاس کاونسل کا خیال ہے کہ آئندہ بیس سال میں نہری سینچائی کی سہولت اسے حاصل ہو جائے گی اور اس کی وجہ سے اس کی موجودہ مالیت میں بقدر 20 فی صدی اضافہ ہو جائے گا۔"

تجویز کی قطعی نامنظوری

اس امر کی تحقیقات ہوتی رہی کہ سر اسٹیفورڈ نارتھ کوٹ کے عائد کردہ شرائط کے پیش نظر شمالی ہندوستان کے کن اضلاع یا ضلع کے حصوں میں بند وبست استمراری کیا جا سکتا ہے۔ 1869ء میں کچھ رپورٹیں پیش کی گئیں جن میں کہا گیا تھا کہ مجوزہ شرائط کے باوجود بند و بست استمراری کی بنا پر حکومت کو آیندہ نقصان ہوگا۔ یہ دلیل نئی نہیں تھی اس نقصان پر سر اسٹیفورڈ نارتھ کوٹ کی نظر تھی اور اس نے کہا تھا کہ ملکہ معظمہ کی حکومت نے سوچ سمجھ کر "مالکان اراضی کے مفادات کو برطانوی حکومت کے استحکام سے منسلک کرنے کی اہمیت کے پیش نظر نقصان برداشت کرنے کا قطعی فیصلہ کیا ہے۔" لیکن خیریت کے ساتھ گزرتا ہوا ہر سال نقصان برداشت کرنے کے جذبے کو کمزور تر کرتا گیا اور وہ اعتراضات جن کو 1867ء میں ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد رد کیا جا چکا تھا 1867ء میں باوزن سمجھے جانے لگے۔ 1867ء میں عاید کی جانے والی دو شرطوں کے علاوہ ایک تیسری شرط اور لگائی گئی۔ اس تیسری شرط کا مقصد یہ تھا کہ جب تک زمین کی مالیت میں اضافہ ہوتا ہے اس وقت تک بند وبست استمراری معرض التوا میں رہے۔

اس کے بعد روپے کی قیمت گرنے لگی جس نے نئی مشکلات پیدا کر دیں۔ سر چارلس وڈ کی نظر اس پر تھی لیکن ساتویں دہائی کے مقابلے میں آٹھویں دہائی میں حکام اس سے زیادہ خائف تھے اس لیے وقتی طور پر بند وبست استمراری کا خیال ترک کر دیا گیا۔

آخر کار قطعی فیصلے کا وقت آگیا۔ سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا نے مراسلہ نمبر 24 مورخہ 8 مارچ 1883ء کے ذریعہ اس تجویز پر خط نسخ کھینچ دیا جو اکیس سال پہلے لارڈ کیننگ نے

پیش کی تھی۔ مراسلے میں کہا گیا تھا "مجھے آپ کی حکومت سے اتفاق ہے کہ 1862ء میں جس پالیسی کی تشکیل کی گئی تھی اب اس کو باضابطہ طور سے ترک کر دینا چاہیے"۔

مندرجہ بالا واقعات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مال گزاری کے بندوبست استمراری کی تجویز کی نامنظوری کی وجہ تحقیقات کے دوران ظاہر ہونے والی نئی دشواریاں نہیں تھیں۔ اس کی اصل وجہ حکومت کی پالیسی میں رونما ہونے والی تبدیلی تھی۔ ابتدا میں اس تجویز کی بنیاد لوگوں کی مادی حالت سدھارنے کی خواہش تھی جس کی تشریح لارڈ لارنس نے مندرجہ ذیل الفاظ میں کی تھی "زمین میں روپیہ لگانے کے لیے لوگوں کی ہمت افزائی کی جائے: ہندوستان کے درمیانی طبقے کو بتدریج ترقی کرنے کے مواقع فراہم کئے جائیں اور سرمایہ اندوزی اور وسائل کو فروغ دیا جائے تاکہ لوگ قلت، خشک سالی اور دشواری کے زمانوں میں مقابلہ کر سکیں۔ حاکموں کی نئی نسل نے ان نیک مقاصد کو بھلا دیا۔ سکھوں سے لڑی جانے والی جنگوں اور غدر کے بعد کے برسوں میں ملکہ معظمہ کی حکومت کی خواہش تھی کہ بقول سر اسٹیفورڈ نارتھ کوٹ "مالکان اراضی کے مفادات کو برطانوی حکومت کے استحکام سے منسلک کرنے کی اہمیت کے پیش نظر" مال گزاری کے آئندہ اضافے سے دست بردار ہو جائے۔ لیکن اس کے بعد آنے والے امن کے دور نے اور ملکہ معظمہ سے ہندوستان کے لوگوں کے وفادارانہ لگاؤ نے اس جذبے کو تقویت پہنچانے کے بجائے کمزور کر دیا اور امن کے پچیس سالہ دور کے بعد 1883ء میں کسی قسم کا نقصان برداشت کرنے کا جذبہ ختم ہو چکا تھا۔ کسی قوم کو وفاداری کا ایسا صلہ شاید ہی کبھی ملا ہو۔ شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ لوگ امن پسندی کی بنا پر اس نعمت سے محروم کر دئے گئے ہوں جس کا دشواریوں اور پریشانیوں کے زمانے میں انھیں یقین دلایا گیا تھا۔ یہ بات نہ حکومت کے شایان شان ہے کہ وہ اس قسم کا سبق دے اور نہ لوگوں کے لیے مناسب کہ وہ اس سے کچھ سیکھیں۔

باب 5

صوبجات متوسط کے بندوبست

ملک کا وہ بڑا خطہ جو ہندوستان کے صوبجات متوسط کے نام سے مشہور ہے۔ تقریباً نوے ہزار مربع میل پر مشتمل ہے اور اس کی آبادی نو ملین نفوس سے کچھ زیادہ ہے[1]۔ مختلف اوقات میں اس پر انگریزوں کا قبضہ ہوا۔ مرہٹوں کے ساتھ لڑی جانے والی آخری جنگ میں جو 1817ء میں ہوئی تھی۔ ناگپور کے راجہ کی فوجوں نے سیتابالدی کے مقام پر انگریزوں کا مقابلہ کیا مگر انھیں نقصان اٹھا کر پسپا ہونا پڑا۔ راجہ نے باغی فوج سے اپنی لاتعلقی کا اظہار کیا اور ساگر اور نربدا کے علاقے انگریزوں کے حوالے کر کے ان سے دوستانہ مراسم قائم کر لیے۔ اس طرح 1818ء میں اس علاقے پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ 1849ء میں سمبل پور کا راجہ مر گیا۔ وہ لاوارث تھا۔ لارڈ ڈلہوزی نے اس کی ریاست کا الحاق کر لیا۔ ناگپور کے راجہ کی موت کے بعد اس کی ریاست پر بھی 1853ء میں قبضہ کر لیا گیا اور راجہ کے متبنیٰ ولی عہد کا دعویٰ خارج کر دیا گیا۔ لارڈ کیننگ نومبر 1861ء میں سمبل پور کے علاوہ تمام متفرق علاقوں کو ایک حکومت کے تحت لے آیا جس کے بعد یہ علاقہ ہندوستان کے صوبجات متوسط کے نام سے مشہور ہو گیا۔ 1862ء میں سمبل پور بھی اس میں شامل کر دیا گیا۔ یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ 1861ء اور 1862ء کے اتحاد سے پہلے مختلف علاقوں کا انتظام کس طرح کیا جاتا تھا۔

---

(1) 1901ء کی مردم شماری کے مطابق۔ اس کے بعد صوبجات متوسط میں برار شامل ہو گیا۔

ساگرا ور نربدا کے علاقے

جب ساگراور نربدا کے علاقے انگریزوں کے قبضے میں آئے تو پہلے ان کا انتظام براہ راست حکومت ہندوستان نے سنبھالا اور اس کے بعد وہ شمال مغربی صوبجات کے لفٹننٹ گورنر کے زیر انتظام آگئے۔ 1842ء میں ان کا انتظام ایک ایجنٹ کے سپرد کر دیا گیا جو حکومت ہند کے تحت تھا۔ اس کے کچھ دن بعد وہ ایک دفعہ پھر شمال مغربی صوبجات کے لفٹننٹ گورنر کو منتقل کر دیے گئے اور 1861ء کے اختتام تک یہ انتظام برقرار رہا۔

ابتدا میں ساگراور نربدا کے علاقوں کا انتظام اطمینان بخش نہیں تھا۔ برطانوی حکام جو غلطیاں مراٹھا اور دوسرے مقامات پر کر چکے تھے ان سے وہاں بھی نہ بچ سکے۔ انھوں نے زمین پر بہت زیادہ مال گزاری تشخیص کی۔ سرکاری مطالبات کی ادائیگی ناممکن ہو گئی، لوگ تباہ ہو گئے اور ملک کی ترقی کی راہیں مسدود ہو گئیں۔ بعد میں غلطی کا احساس ہوا اور زوردار الفاظ میں اس کی مذمت کی گئی۔

ہوشنگ آباد اور سیونی کے اضلاع —— ہوشنگ آباد اور سیونی میں ہونے والا پانچ سالہ بندوبست، جو 1821ء میں کیا گیا تھا، "غالباً بدترین بندوبست تھا۔ میجر میک فرسن Major Macpherson کو ایک ویران علاقے اور تباہ حال اور مایوس لوگوں سے سابقہ پڑا ...... میجر میک فرسن کو توقع تھی کہ پانچ سال میں ملک اتنی ترقی کرے گا جتنی وہ پینتالیس سال میں بھی نہیں کر سکا ہے ...... جلد یہ محسوس کر لیا گیا تھا کہ شرح تشخیص بہت زیادہ ہے جس کی ادائیگی نہیں ہو سکے گی ...... لیکن میجر میک فرسن نے ہوشنگ آباد پر کوڑے برسائے اور سیونی کو بچھوؤں کے حوالے کر دیا۔"[1]

میجر میک فرسن نے اس رقبے پر 1821ء میں 10,359 پونڈ مال گزاری ادا کرتا تھا۔ 1825ء میں ایک اور پانچ سالہ بندوبست کیا گیا اور سرکاری مطالبہ بڑھا کے 13,877 پاؤنڈ کر دیا گیا جو مرہٹوں کے مطالبے کا سات گنا تھا۔ یہ بھاری مطالبہ کبھی وصول نہ ہو پایا اور اس میں چھوٹ دینی پڑی۔" لیکن چھوٹ ناکافی تھی اور مال گزاری وصول کرنے کے لیے بڑی کوشش

---

(1) ہوشنگ آباد کے بندوبست کی رپورٹ 1855ء، از چارلس ایلیٹ، پیراگراف 46، 47، 48 اور 49۔

کرنی پڑی۔ آج تک زمین داروں کے ذہنوں میں اس زمانے کی سزاؤں اور مظالم کی یاد تازہ ہے[1]۔"

اس کے بعد پینتیس سال کے لیے بندوبست کیا گیا جس سے لوگوں کے دکھ کچھ کم ہو گئے۔ آخر میں بیس سال کا بندوبست 1836ء میں کیا گیا جس میں مال گزاری میں تخفیف کرکے 6,192 پونڈ سرکاری مطالبہ مقرر کیا گیا۔ یہ بھی مرہٹوں کے مطالبے کا اٹھگنا تھا۔ **ضلع نرسنگ پور** ــــــ پہلے پندرہ سال میں نرسنگ پور کے حالات بھی اتنے ہی خراب تھے جتنے سیونی اور ہوشنگ آباد کے۔ "اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ ہماری حکومت کے پہلے پندرہ سال مال گزاری کے ناقابل برداشت بوجھ کے نیچے دبے ہوئے کسانوں کے امداد کرنے اور انھیں زندہ رکھنے کی مسلسل جدوجہد میں گزرے۔ ہمارے پہلے بندوبست کی بنیاد مرہٹوں کی آخری تشخیص تھی۔ جیسا کہ بتلایا جا چکا ہے ایک غیر معمولی بحران کا مقابلہ کرنے کے لیے اس تشخیص میں ضرورت سے زیادہ سختی برتی گئی تھی .... جب اس غلط بنیاد پر تشخیص کی ہوئی مال گزاری کو وصول کرنے میں ہمارے افسروں نے سختی سے کام لیا اور نربدا کے علاقے کو دی جانے والی مالی امداد کا عارضی سہارا بھی ختم ہو گیا تو پورا انتظام درہم برہم ہو گیا اور بہت سے گاؤں کی ویرانی نے ظاہر کر دیا کہ اس تشخیص کی پالیسی غلط تھی[2]۔"

پہلے 66,769 پاؤنڈ مال گزاری تشخیص کی گئی۔ یہ تباہ کن ثابت ہوئی اور مال گزاری برباد ہو گئے۔ بھاری چھوٹ دینی پڑی اور 1830ء اور 1833ء کے سہ سالہ بندوبستوں میں مال گزاری میں کافی تخفیف کی گئی۔ 1836ء میں بیس سال کے لیے بندوبست کیا گیا جس میں سرکاری مطالبہ 5,313 پونڈ مقرر کیا گیا۔

ضلع مودہ ــــــ اس ضلع میں 1835ء میں بیس سال کے لیے جو بندوبست کیا گیا تھا اس میں کم مدتی بندوبستوں میں کی جانے والی تشخیص میں تخفیف کرنے کے بجائے اضافہ کر دیا گیا 1835ء میں 30,514 پونڈ سرکاری مطالبہ مقرر کیا گیا۔

اس بندوبست میں بہت سے مال گزار اپنے پٹوں سے دست بردار ہو گئے اور بڑے

---

(1) ہوشنگ آباد کے بندوبست کی رپورٹ، 1855ء از چارلس ایلیٹ، پیراگراف 46، 47، 48 اور 49۔

(2) ہوشنگ آباد کے بندوبست کی رپورٹ، 1855ء، از چارلس ایلیٹ پیراگراف 50۔

سخت اقدامات کے بعد اس دشواری پر قابو پایا جاسکا .... زمین کی قیمت گر گئی۔ کئی سال تک بہت سے گاؤں میں انتظام خاص کرنا پڑا[1]"۔

ضلع ساگر ــــ اس ضلع میں بھی کم مدتی بندوبستوں کے بعد ہونے والے طویل المدت بندوبست سے لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ "حکومت کے مطالبے کا اتنا بار لوگوں پر پڑ گیا ہے کہ محنت کرنے کا جذبہ ختم ہوگیا ہے اور وہ زمینوں کو ترقی دینے کی کوئی کوشش نہیں کرتے ہیں۔ یہ بات میرے ذاتی علم میں ہے کہ کہیں کہیں تو سرکاری مطالبہ گاؤں کے مجموعی لگان سے زیادہ ہے۔

لوگوں کے حوصلے اس حد تک پست ہوگئے ہیں کہ کچھ صورتوں میں حقیقی وارث کسی طرح بھی گاؤں کے حقوق ملکیت تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوئے۔ ضلع کے اس حصے کے دکھوں اور تکلیفوں کو جب تک دیکھا نہ جائے اس وقت تک انھیں پوری طرح سمجھا نہیں جاسکتا ہے۔ اس کا اطلاق خاص طور سے دموہ اور ہینیکا پٹنہ کے کچھ حصوں پر ہوتا ہے۔

" ضلع کے ان حصوں کے معائنے کے وقت مجھے بتایا گیا کہ اتنی زیادہ تباہی ہوئی ہے اور انسانی زندگی کے اتنے کم آثار نظر آتے ہیں جیسے پرگنے مرگئے ہوں"۔

پچاس سال کی برطانوی حکومت کے بعد ساگر کی اس بدحالی کی حکومت ہند نے پرزور الفاظ میں مذمت کی۔ اس نے لکھا "1834ء میں بیس سالہ بندوبست کے وقت بھی اعتدال سے کام نہیں لیا گیا اور اس علاقے کے دوسرے اضلاع کو طویل المدت بندوبست سے جو فائدے پہنچے وہ بھی ان لوگوں کو نہ مل سکے۔ بھاری چھوٹ دینی پڑی جس کی وجہ سے مطالبہ اور بھی کم ہوگیا۔ ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ حکومت وقت نے تو چھوٹ کی ضرورت پر زور دیا لیکن ان احکامات کے عمل درآمد میں مقامی حکام نے بخل سے کام لیا اور بہت کم چھوٹ دی۔ اگر وقت پر چھوٹ دیدی جاتی تو غالباً ضلع کی حالت سنبھل جاتی[2]"۔

سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا نے لندن سے لکھا "ہندوستان کے ان حصوں سے

---

(1) دموہ کے بندوبست کی رپورٹ' 1866ء' از اے۔ رسل' پیراگراف 60۔

(2) مراسلہ نمبر 353 مورخہ 30 جون 1867ء' منجانب حکومت ہند (محکمہ خارجہ) بنام چیف کمشنر برائے صوبجات متوسط۔

آنے والی پچھلی رپورٹوں کے مقابلے میں یہ رپورٹ زیادہ شدت کے ساتھ ظاہر کرتی ہے کہ برطانوی حکومت میں آنے کے بعد اس ضلع میں بہت زیادہ مال گزاری تشخیص کرنے کی غلطی کی گئی[1]۔"

ان اقتباسات سے اچھی طرح ظاہر ہو جاتا ہے کہ برطانوی حکومت کی ابتدائی دہائیوں میں ساگر اور نربدا کے علاقوں کی کیا حالت تھی۔ پہلے کم مدتی بندوبست اور بھاری تشخیص کی گئی اور رابرٹ مارٹن برڈ نے، جو شمالی ہند کے بندوبستوں کا باوا آدم کہلاتا ہے، 1834ء میں طویل المدت بندوبست کرنے پر زور دیا۔ اس نے ان علاقوں کے ناخوش گوار حالات کے متعلق ایک زوردار رپورٹ پیش کی جو مسلسل طور سے بھاری مال گزاری کو عارضی تدبیروں کا سہارا دینے" کی مسلسل کوششوں کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے۔

رابرٹ مارٹن برڈ کی عام رپورٹ ——— اس نے لکھا تھا "کہا جاتا ہے کہ فریب اور سٹے بازی کے ایک نظام کو رواج دیا گیا ہے اور حکومت جو چھوٹ دیتی ہے اس سے کسانوں کو شاذ ہی فائدہ پہنچتا ہے بلکہ زیادہ سے زیادہ رقم کی ادائیگی پر انھیں مجبور کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف مداخلت کا ایک ایسا طریقہ رائج کیا گیا ہے جس نے اعتماد ختم کر دیا اور زمین کو سرمائے سے محروم کر دیا۔ تاجروں کے گودام کھول کر زبردستی غلہ حاصل کیا گیا تاکہ کسانوں کو بیج مہیا کیا جائے۔ ان کو نہ اس غلے کی قیمت ادا کی گئی اور نہ اس غارت کئے ہوئے مال کو آئندہ حاصل کرنے میں ان کی کوئی مدد کی گئی۔

کہا جاتا ہے کہ یہ لوٹ ان کسانوں کے لیے کی گئی جن کو دھوکہ دہی اور وعدہ خلافی کے پچھلے تجربوں کی بنا پر ساہوکاروں نے قرض دینے سے انکار کر دیا تھا۔ جن سرمایہ داروں نے کسانوں کے خلاف ڈگریاں حاصل کر لی تھیں انھیں کسانوں کے جانور نیلام کرنے یا انھیں جیل بھجوانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ حکام کا خیال تھا کہ ان دونوں اقدامات کے نتیجے میں زمین جوتی نہیں جا سکے گی اس طریقے کی پیچیدہ تفصیلات میں جانے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ اتنا بتا دینا کافی ہے کہ دیسی باشندوں کے بیان کردہ واقعات، جن سے یورپین حکام انکار نہیں کر سکتے، اس امر کا پورا ثبوت مہیا کرتے ہیں کہ بھاری تشخیص کو سہارا دینے، درجزویات کے انتظام میں مہارت رکھنے کے بے بنیاد تصور نے لوگوں کے نجی معاملات و انتظامات میں مداخلت کرنے کے طریقہ کو جنم دیا جو قریب

---

(1) مراسلہ نمبر 33، مورخہ 30 اپریل 1868ء۔

قریب ہر جگہ پایا جاتا ہے"[1]۔

اس رپورٹ کے پیش ہونے اور حکومت ہند کا حکم صادر ہونے کے بعد ان علاقوں میں بیس سال کی مدت کے لیے بندوبست کیا گیا۔ ہم دیکھ چکے ہیں اس طویل المدت بندوبست کی بنا پر کچھ اضلاع میں مال گزاری کم ہو گئی۔ اور بقیہ اضلاع میں حالات بدستور رہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مقامی افسر اب بھی زیادہ سے زیادہ مال گزاری وصول کرنے کے اصول پر عمل کرتے تھے۔ یہ بندوبست اس وقت جاری رہا جب تک 1861ء میں صوبجات متوسط کی نئی حکومت نہ بن گئی۔

ریاست ناگپور۔ اس ریاست پر سو سال سے زیادہ مدت تک یعنی 1743 سے 1853ء تک مرہٹوں کے بھونسلا خاندان نے حکومت کی۔ لیکن اس دوران 1818 سے 1830ء تک راجہ کی نابالغی کے زمانے میں انتظام انگریز افسروں کے ہاتھوں میں رہا تھا۔ انگریزوں نے غلطی سے مال گزاری کے اضافے کو بہتر کارکردگی کا ثبوت سمجھا اس بارہ سال کی مدت میں ریاست کی مال گزاری میں بہت اضافہ کر دیا گیا اور چندا کے ضلع میں تو مطالبہ دگنا کر دیا گیا جن بلوغ کو پہنچنے کے بعد جب ریاست راجہ کے حوالے کی گئی تو مال گزاری 2,53,000 پاؤنڈ ہو چکی تھی"[2]۔ راجہ کی حکومت انگریزوں کی طرح سختی نہیں کرتی تھی اور ہمیں یہ بیان کرتے ہوئے خوشی ہوتی ہے کہ 1853ء میں راجہ کے انتقال کے وقت مال گزاری گھٹ کر 2,24,170 پاؤنڈ رہ گئی تھی۔ اس کے بعد لارڈ ڈلہوزی نے ریاست کا الحاق کر لیا۔

الحاق کے بعد پہلے آٹھ سال میں یعنی 1853ء سے 1861ء تک ریاست کا انتظام ناقص تھا۔

---

(1) ساگر اور نربدا کے علاقوں کے متعلق برڈ کی رپورٹ' مورخہ 31 اکتوبر 1834ء۔

(2) اضلاع ناگپور اور واردھا	1,66,400 پاؤنڈ
ضلع چندا	48,500
ضلع بھنڈارا	38,100
کل میزان	2,53,000 پاؤنڈ

انگریزوں کے بارہ سالہ انتظام کا مالی نتیجہ اطمینان بخش ثابت ہوا۔ ریاست کا انتظام سنبھالتے وقت جتنی مال گزاری تھی اس میں ریاست واگزاشت کرتے وقت خاصا اضافہ ہو چکا تھا: جے۔ بی۔ نظر۔ صوبجات متوسط کے بندوبست کی روداد Note on The Central Provinces Settlement

کم مدتی بند و بستوں سے نہ لوگوں کو کوئی فائدہ ہوا نہ ریاست کی آمدنی بڑھی۔ 1861ء میں ریاست کو ملحقہ اضلاع میں شامل کر کے صوبجات متوسط بنا دیے گئے۔

ریاست سمبل پور

صدیوں تک اس ریاست پر چوہان راجپوتوں کا ایک خاندان حکومت کرتا رہا تھا۔ جو مسلمانوں کے حملے سے پہلے ہندوستان کے بہت سے حصوں پر حکومت کیا کرتے تھے۔ کچھ دن کی بیدخلی کے بعد 1817ء میں انگریزوں نے چوہان خاندان کے ایک راجہ کو گدی پر بٹھا دیا اور ریاست پر حکومت بنگال کو سیاسی اقتدار حاصل ہو گیا۔ ریاست کی مال گزاری تقریباً 10,000 پاؤنڈ تھی۔

اس خاندان کا آخری راجہ لاوارث تھا۔ 1849ء میں لارڈ ڈلہوزی نے ریاست کا الحاق کر لیا اور 1862ء تک یہ حکومت بنگال کے زیر انتظام رہی۔ چنانچہ 1861ء میں جب صوبجات متوسط کا قیام عمل میں آیا تو سمبل پور کو اس میں شامل نہیں کیا گیا بلکہ بدستور حکومت بنگال اس کا انتظام کرتی رہی۔ 1862ء میں صوبجات متوسط کو منتقلی کے بعد وہاں کچھ برسوں تک گدی کا ایک دعوی دار فتنہ و فساد پھیلاتا رہا۔ چنانچہ 1863ء اور 1867ء میں ہونے والے صوبجات متوسط کے بند و بستوں سے سمبل پور مستثنیٰ رہا اور اس کا نظام مال آج تک صوبجات متوسط کے حصوں سے مختلف ہے۔

صوبجات متوسط کا قیام

لارڈ کیننگ نے 2 نومبر 1861ء کو وہ تجویز تیار کی جس کی بنیاد پر صوبجات متوسط کا قیام عمل میں آیا۔ اس تجویز کے کچھ اقتباسات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

"گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل نے صوبہ ناگپور اور ساگر اور نربدا کے علاقوں کے انتظامات پر غور کرنے کے بعد فیصلہ کیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ ان مختلف اضلاع کا انضمام کر کے انہیں ایک مرکزی حکومت کے تحت لے لیا جائے۔"

چنانچہ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل نے اولاً تجویز کیا کہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ساگر اور نربدا کو علاقوں کی حیثیت سے ختم کر دیا جائے اور ان میں ایک خود کفیل و مستحکم حکومت قائم کی جائے۔

ثانیاً تجویز کیا کہ ان علاقوں کو ایک مقامی حکومت کے تحت صوبہ ناگ پور سے ملحق کر دیا جائے جس سے وسائل کے انتظام میں بڑا فائدہ ہوگا اور علاقہ ہر طرح سے ترقی کر سکے گا۔ چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ ناگ پور کے صوبے اور ساگر اور نربدا کے علاقوں پر مشتمل ایک چیف کمشنر کا صوبہ بنایا جائے جس کو چیف کمشنر کے صوبجات متوسط کا نام دیا جائے۔[1]

صوبجات متوسط میں ضلع سنبل پور اپریل 1862ء میں شامل ہوا، ضلع نمار مئی 1864ء میں اور بجراگوگڑھ مئی 1865ء میں۔

ایک بڈھا اور ناکارہ افسر کرنل ایلیٹ پہلا چیف کمشنر مقرر کیا گیا۔ لیکن پہلے تو اس کی چھٹی کے زمانے میں اور پھر اس کی برطرفی کے بعد سر رچرڈ ٹمپل (جو اس وقت مسٹر ٹمپل تھا) چیف کمشنر مقرر کیا گیا اور اس نے 1866ء تک صوبہ کا انتظام کیا۔ وہ ٹامسن کے ماتحتی میں کام کر چکا تھا جو شمالی ہندوستان کا حاکم اور اہم افسر مال رہ چکا تھا۔ پنجاب میں وہ بورڈ BOARD OF AdminIstRaTion) اور لارنس کے ماتحت کام کر چکا تھا اور اب اسے موقع ملا تھا کہ نئے نئے قائم ہونے والے صوبے کا انتظام کر کے ایک ہمدرد حاکم کی حیثیت سے شہرت حاصل کرے۔ زمانہ اس کے موافق تھا۔ ملکہ کی راست حکومت کی پہلی دہائی میں ہندوستان کے ساتھ مہربانی بلکہ فراخ دلی کا برتاؤ کرنے کی خواہش پائی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ کینگ اور لارنس، سر چارلس وڈ اور سر اسٹیفورڈ نارتھ کوٹ لوگوں کی حالت سدھارنے اور برطانوی حکومت سے ان کا لگاؤ بڑھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

مجوزہ بندوبست استمراری

جس زمانے میں مسٹر ٹمپل قائم مقام چیف کمشنر کے فرائض ادا کر رہا تھا اس زمانے میں مال گزاری کے بندوبست استمراری کے متعلق کرنل بیرڈ اسمتھ کی وہ تجویز اس کے سامنے پیش کی گئی جس کا ذکر پچھلے باب میں کیا جا چکا ہے۔ یہ بتانا ضروری نہیں کہ رچرڈ ٹمپل نے اس تجویز کی زور دار حمایت کی۔ حکومت ہند کو اس نے جو جواب دیا وہ بہت طویل نہیں تھا۔ اس کا پورا متن ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

---

(1) تجویز مورخہ 2 نومبر 1861ء ملکمغارہ، پیراگراف 1 اور 5۔

ابھی تک آپ کے مراسلے نمبر 2038 مورخہ 7 اکتوبر 1861ء اور مراسلے نمبر 1477 مورخہ 20 مارچ 1862ء کے جوابات نہیں دیے جاسکے ہیں جن میں قحط کے متعلق کرنل بیرڈ اسمتھ کی رپورٹ کے پیراگراف 76 لغایت 82 میں زیر بحث آنے والے مال گزاری کے بندوبست استمراری کے مسئلے اور جہاں موجودہ بندوبست کی نوعیت ایسی نہیں ہے کہ اسے بندوبست استمراری میں تبدیل کیا جاسکے وہاں بندوبست کی مدت کو قانونی حیثیت دینے کی ضرورت پر قائم مقام چیف کمشنر کو اپنی رائے دینے کی ہدایت کی گئی تھی۔ اس موضوع کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے لیکن صوبے کے انتظام میں ہونے والی تبدیلیوں کی بنا پر اس پر ضروری توجہ نہیں دی جاسکی۔ لیکن قائم مقام چیف کمشنر نے اب صوبے میں شامل اضلاع کے خصوصی حالات کی روشنی میں اس پر پوری طرح غور کر لیا ہے اور وہ اپنی رائے ظاہر کرنے کو تیار ہے۔ چنانچہ مجھے مندرجہ ذیل رپورٹ پیش کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

2۔ پہلی بات قائم مقام چیف کمشنر یہ کہنا چاہتا ہے کہ یہاں یا کہیں یہ بتانا ضروری نہیں ہے کہ بندوبست استمراری کا اثر صرف زمین کے محصول پر پڑے گا۔ اس کی بنا پر مطالبہ کا دائمی تعین ہو جائے گا۔ اگر اس کو زمین کے مطالبے پر دائمی حدود عاید کرنا کہا جائے تو اس کا مفہوم زیادہ واضح ہو جائے گا۔ زمین کے متعلق لوگوں کا بنیادی حق اور استحقاق ملکیت اس سے کسی طرح متاثر نہیں ہوگا۔ اس حق اور استحقاق ملکیت کا تعین مطلق اور تغیر سے بری ہوگا چاہے زمین کا محصول ایک خاص رقم تک محدود رکھا جائے یا نہ رکھا جائے۔ یہ واقعہ ہے کہ اس حق اور استحقاق ملکیت کے مفاد میں کمی بیشی کا انحصار اس امر پر ہوگا کہ سرکاری مطالبہ کم یا زیادہ مدت کے لیے یا ہمیشہ کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ لیکن حق اور استحقاق ملکیت بہر حال بدستور برقرار رہیں گے۔

3۔ چنانچہ دوسرے مقامات کی طرح یہاں بھی بندوبست استمراری کے اصول کا اطلاق مندرجہ بالا مفہوم میں ہونا چاہیے۔ صنعت، کاروبار، کسانوں کی خود اعتمادی، سرمائے کے استعمال اور دولت کو اس سے جس حد تک فروغ ہوگا اس کا اندازہ اس وقت نہیں لگایا جاسکتا ہے۔ جہاں تشخیص منصفانہ ہوگی اس کو لوگ ایک نعمت سمجھیں گے اور قبول کر لیں گے۔ اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ریاست مال گزاری میں آئندہ اضافے کے حق سے دست بردار ہو کر نقصان میں رہے گی لیکن دوسرے ذرائع سے ہونے والی آمدنی میں تیزی کے ساتھ نہ سہی پھر بھی آہستہ آہستہ اضافہ ہوگا۔ جس سے نہ صرف یہ نقصان پورا ہو جائے گا بلکہ آمدنی بڑھ جائے گی۔ آمدنی کے ان ذریعوں کا

انحصار عام لوگوں کی دولت کے اضافے پر ہوا کرتا ہے۔ دولت کو بڑھانے کے لیے دوسرے اقدامات کے مقابلے میں بندوبست استمراری زیادہ کارآمد ثابت ہوگا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بندوبست استمراری زمین کے محصول کے علاوہ تمام دوسرے ذریعوں سے ہونے والی آمدنی میں اضافہ کردےگا اس صوبے میں مجموعی آمدنی کا ایک تہائی سے زیادہ حصہ ان محاصل سے حاصل ہوتا ہے جن میں زمین کا محصول شامل نہیں ہے۔ زمین کے محصول کے علاوہ تمام محاصل میں اضافہ ہو رہا ہے۔ مالیاتی نقطہ نظر سے کسی ایسے اقدام میں ناکامی کا کوئی خطرہ نہیں ہے جو زمین کے محصول پر حدود عاید کردے لیکن دوسرے محاصل میں اضافے کا باعث ہو۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس صوبے میں روپے کی قیمت برابر بڑھتی رہے گی چنانچہ کچھ مدت بعد کسانوں کو اپنی پیداوار کا اتنا معاوضہ ملنے لگے گا جتنا پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔ لیکن اجرت میں بھی اضافہ ہوگا جس کی وجہ سے سرکاری اخراجات بہت بڑھ جائیں گے۔ بظاہر یہ بات خطرناک معلوم ہوتی ہے کہ حکومت اخراجات میں آئندہ ہونے والے اضافے سے باخبر ہونے کے باوجود زمین کے محصول پر حدود عاید کرے جو آمدنی کا سب سے اہم ذریعہ ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دوسرے محاصل سے ہونے والی آمدنی کے اضافے پر پورا یقین کیا جاسکتا ہے اگرچہ اس کا تعلق بندوبست استمراری سے نہیں ہے پھر بھی کرنل ایلیٹ اور مسٹر ٹمپل نے اپنی مشترکہ رپورٹ میں کہا ہے "دماتل میں اضافے کی توقع زمین کے محصول کے بجائے متفرق محاصل سے کی جانی چاہیے۔"

۱۸۔ چنانچہ بندوبست استمراری جس حد تک رائج کیا جاسکے وہ لوگوں کے لیے بھی مفید ہے اور ریاست کے لیے بھی سودمند ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس حد تک اس کا عمل درآمد ممکن ہے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ اس کو کب رواج دیا جاسکتا ہے؟ اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ اس صوبے میں ریلوں، سڑکوں اور جہاز رانی کی وجہ سے ضرور تبدیلیاں آئیں گی لیکن آب رسانی کے ذرائع سے اس قسم کے نتائج کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ آئندہ ترقی کے امکانات یہاں بھی اتنے ہی ہیں جتنے کہ ہندوستان کے دوسرے حصوں میں۔ نہ ان سے کم نہ زیادہ۔ اگر دوسرے مقامات پر آئندہ ترقی کے امکانات بندوبست استمراری کی راہ میں حائل نہیں ہوئے تو یہاں کیوں ہوں؟ اس لیے جہاں تک ریلوں، سڑکوں اور جہاز رانی کا تعلق ہے صوبجات متوسط کو اسی حد تک بندوبست استمراری سے مستفید ہونے کا حق حاصل ہے جس حد تک ہندوستان کے دوسرے صوبوں کو۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ بات بھی دھیان میں رکھنی چاہیے کہ اس صوبے میں بہت زیادہ قابل کاشت اراضی بنجر پڑی ہوئی ہے۔ حالانکہ اس قسم کے حالات دوسرے مقامات پر بھی پائے جاتے ہیں لیکن یہاں خصوصیت کے ساتھ

بنجر اراضی زیادہ ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں کہ بڑے بڑے بنجر علاقوں کے دعوی دار ایسے لوگ ہیں جن کا حق ملکیت مشکوک ہے بلکہ اس صوبے کی زمین داریوں اور گانوؤں کی اکثریت ایسی ہے جن کے قانونی اور جائز حدود میں بہت سی قابل کاشت اراضی شامل ہے۔ حالانکہ بندوبست استمراری کا طرۂ فائدہ یہ ہے کہ اس سے بنجر توڑنے کے محرکات کو تقویت ملتی ہے پھر بھی ریاست کے ساتھ انصاف کا تقاضہ ہے کہ اس حق کے سلسلے میں اعتدال سے کام لیا جائے۔ صحیح طریقہ یہ ہوگا کہ جس زمین داری میں بندوبست استمراری کیا جائے اس کو زراعت کی توسیع کے لیے بنجر کا مناسب حصہ توڑنے کی اجازت دی جائے۔ کسی ایسی زمین داری میں بندوبست استمراری کرنا مناسب نہیں ہوگا جس میں بے حساب بنجر اراضی شامل ہو۔ اس وقت، اس کا مالک ، اس بنجر کو زیر کاشت لانے کی استطاعت نہ رکھتا ہو اور جو آئندہ مختلف امور کی بنا پر بیش قیمت بن سکتی ہو۔

5۔ چنانچہ اس صوبے میں بہت سی زمین داریاں اور گانو، بہت سے علاقے اور کچھ ضلعے ایسے ہیں جہاں ابھی بندوبست استمراری کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ ان اضلاع میں مندرجہ ذیل شامل ہیں — رائے پور، بلاس پور، سمبل پور، سرونچا، بھنڈارا، منڈلا، سیونی چھنڈواڑا اور بیتول۔ یہ عبوری دور سے گزر رہے ہیں۔ یقین ہے کہ جلد یا بدیر ان پر اس قسم کے اثرات پڑیں گے جو ان کی شکل بدل دیں گے۔

6۔ لیکن کچھ ضلعے ایسے ہیں جن کے پورے علاقے میں تو نہیں لیکن کچھ حصوں میں بندوبست استمراری کیا جا سکتا ہے۔ اس سے ان حصوں کا اسی حد تک فائدہ ہوگا اور اس کی اتنی ہی وجہ پائی جاتی ہے جتنی ہندوستان کے دوسرے حصوں میں۔ جن علاقوں میں بندوبست استمراری کرنے کی سفارش کی جاتی ہے وہ ہیں ناگ پور، چندا، نچن گانو (کاوٹا)، جبل پور، ساگر، دموہ، نرسنگ پور اور ہوشنگ آباد کے اضلاع۔ ان تمام ضلعوں (ساگر اور دموہ کے علاوہ) کے بڑے بڑے علاقوں میں مسلسل بہت اچھی کاشت ہوتی ہے اور وہ اسی طرح ترقی کر رہے ہیں جیسے ہندوستان کے دوسرے حصے۔ ساگر اور دموہ کے زیادہ علاقے ناہموار اور پتھریلے ہیں اور مندرجہ بالا اضلاع کی طرح بڑے مزروعہ علاقے وہاں نہیں پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے حالات یکساں ہیں۔ جہاں تک گزشتہ تشخیص کا تعلق ہے کبھی مطالبہ بہت زیادہ مقرر کیا جاتا تھا اور کبھی بہت کم۔ لیکن یہ صورتِ حال صرف ان اضلاع تک محدود نہیں ہیں بلکہ ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ جبل پور، ساگر، دموہ، نرسنگ پور اور ہوشنگ آباد کے اضلاع کے سالانہ مالیاتی اعداد و شمار موجود ہیں جو پینتیس سال سے انگریزوں کے

زیر حکومت ہیں۔ ناگ پور، چن گڑھ اور چندا کا برطانوی تشخیص کے علاوہ مال گزاری کے وہ اعداد وشمار موجود ہیں جس کی تشخیص زمانہ ریجنسی میں سر۔ آر۔ جینکنس (Sir R. Jenkins) اور اس کے ماتحت حکام نے کی تھی۔

7۔ بندوبست استمراری کے متعلق مسٹر ٹیمپل کے خیالات اس قسم کے ہیں۔ میں مزید عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس کی رائے میں اس امر کی کوئی وجہ نہیں پائی جاتی کہ اس وقت ہونے والے بندوبست میں اس اصول پر عمل نہ کیا جائے۔ اس بندوبست کے تعلق سے حالات اور کارگزاری کی تفصیلی رپورٹ میرے مراسلے نمبر 1 مورخہ 30 / ماہ گزشتہ میں دی جا چکی ہے۔[1] اس لیے جزئیات میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ قائم مقام چیف کمشنر صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہے کہ ہز ایکسی لینسی وائسرائے بہ اجلاس کونسل اگر اولاً مندرجہ بالا اصول کو منظور کرے اور ثانیاً صوبجات متوسط کے ان ضلعوں میں اس کے فوری عمل درآمد کی اجازت دے جو ضروری حد تک ترقی کر چکے ہیں اور اس کے لیے موزوں ہیں تو مندرجہ ذیل خصوصی اقدامات کی منظوری بھی دی جائے۔

8۔ (1) موجودہ بندوبست کے دوران جب حکام بندوبست کو محسوس ہو کہ مندرجہ بالا اصول کے مطابق کوئی زمین داری بندوبست استمراری کے لیے موزوں ہے تو اس زمین داری میں مطالبے کا دائمی تعین کر دیا جائے۔

9۔ (2) اس نعمت سے مستفید ہو سکنے کی ایک بڑی شرط یہ قرار دی جائے کہ اس زمین داری کا کم از کم تین چوتھائی قابل کاشت رقبہ زیر کاشت ہو۔

10۔ (3) کچھ صورتوں میں حکام بندوبست کو یہ وعدہ کرنے کا اختیار حاصل ہو کہ تشخیص مالگزاری پر نظر ثانی کی جائے گی اور نظر ثانی شدہ مطالبہ دائمی قرار دیدیا جائے گا۔

11۔ چنانچہ لوگ اگر واقعی بندوبست استمراری کے خواہش مند ہیں تو یہ طریقہ ہر مالک اراضی کو اس پر آمادہ کر دے گا کہ وہ کاشت میں اضافہ کرے اور فائدہ اٹھائے اس طرح زرعی صنعت کو محرکات وعوامل مہیا کئے جا سکیں گے۔"

1863.67ء کا بندوبست

ایک طرف تو بندوبست استمراری کئی سال تک موضوع بحث بنا رہا دوسری طرف صوبجات

---

(1) حکومت کے محکمہ خارجہ کے نام۔

متوسط میں نیا بندوبست شروع کر دیا گیا۔ ساگر اور نربدا کے علاقوں کے تعلق سے، جو اس زمانہ میں شمال مغربی صوبجات کے تحت تھے، اس صوبے کی حکومت نے 1854ء ہی میں وہ اصول طے کر دیے تھے جن کے مطابق یہ بندوبست کیا جا رہا تھا۔ اس وقت ان پر عمل نہیں ہو سکا تھا۔ 1861ء میں صوبجات متوسط کے قیام کے بعد 1854ء کے پرانے اعلان کو اس صوبے کی مال گزاری کے بندوبست کی بنیاد بنایا گیا۔

اعلان میں جو خاص اصول پیش کیا گیا تھا، اور جس کو صوبجات متوسط نے بعد میں منظور کر لیا تھا، وہ یہ تھا کہ مال گزاری کے حقوق ملکیت کو تسلیم کیا جائے۔ اس کو اکثر ایک نیا انعام کہا گیا ہے۔ یہ صرف اس حد تک انعام تھا کہ اس حق کو جو عملاً مال گزاروں کو حاصل تھا نظری اعتبار سے تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اس زمانے کے قابل ترین حاکم بندوبست مسٹر چیسوم (MR. CHISHOLM) نے کہا تھا "بیع اور رہن کرنے کے حق کے علاوہ میری نظر میں کوئی ایسا حق نہیں جو انفرادی یا مشترکہ طور پر مال گزار کو حاصل نہیں تھا۔ اس کو گانو منتقل کرنے کا حق حاصل نہ ہونے کی وجہ صرف اتنی تھی کہ دیسی حکومت نے اپنی کوتاہ اندیشی کی بنا پر زمین پر مطلق حق تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن جب تک وہ قابض و دخیل تھا اسے گانو کے داخلی انتظامات کا پورا پورا حق حاصل تھا یعنی وہ کسانوں کو آباد کر سکتا تھا، انھیں بے دخل کر سکتا تھا، لگان میں اضافہ کر سکتا تھا، باغ لگا سکتا تھا، تالاب بنا سکتا تھا وغیرہ۔ حقیقت میں اسے گانو کے انتظام کے سلسلے میں وہ تمام اختیارات حاصل ہوتے تھے جو دوسرے مقامات پر کل حقوق ملکیت رکھنے والوں کو حاصل ہوتے تھے۔"

پھر بھی اس حق کو جو عملاً حاصل تھا پوری طرح تسلیم کر لیا گیا تھا مال گزار کو اختیار دیدیا گیا کہ وہ جائیداد کو بیع یا رہن کر سکتا ہے تو اس سے بڑا فائدہ ہوا۔ 1854ء کے اعلان میں کہا گیا تھا "اب حکومت کا ارادہ ہے کہ بیس سال کے لیے ایک اور بندوبست کیا جائے اور جن لوگوں کے متعلق سمجھا جائے کہ وہ اس قسم کا انعام پانے کے مستحق ہیں انھیں حق زمین داری عطا کیا جائے۔" اسی اعلان میں مزید کہا گیا تھا "ہر مالک کو جائیداد منتقل یا تقسیم کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہوگا۔" بندوبست میں اس اصول پر عمل کرنے کا خوشگوار فرض رچرڈ ٹمپل نے ادا کیا۔

مال گزاری کے حقوق ملکیت کو تسلیم کرنے کے بعد ایک اور سوال پیدا ہوا۔ سرکاری مالگزاری کے طور پر لگان کے کتنے حصے کا مطالبہ کیا جائے؟ ضابطۂ سہارن پور کی رو سے شمالی ہندوستان میں مال گزاری لگان کے نصف سے زیادہ مقرر نہیں کی جا سکتی تھی اور اس ضابطے کا نفاذ ساگر اور نربدا کے

علاقوں میں کیا جا چکا تھا۔(1) لیکن ناگ پور پر کس ضابطے کا اطلاق کیا جاتا جو صوبجات متوسط کے بڑے حصے پر مشتمل تھا۔

ناگ پور کے لیے حکومت ہند نے ہدایت کی تھی کہ مجموعی لگان کا 35 فی صدی سے 55 فی صدی تک مال گزار کے لیے چھوڑ دیا جائے۔(2) اس میں مزید کہا گیا تھا "گورنر جنرل بر اجلاس کونسل کا خیال ہے کہ انتظامات پر ہونے والے اخراجات کے لیے اور حقوق ملکیت کی بنا پر بہر حال 40 فی صدی مال گزار کے لیے چھوڑنا چاہیے اور خاص صورتوں میں اس رقم کو بڑھا کر 50 فی صدی تک کیا جا سکتا ہے۔" رچرڈ ٹمپل نے ان ہدایتوں کی تشریح میں فراخ دلی سے کام لیا اور گورنر جنرل کی منظوری کے بعد اس نے بندوبست کے جو ضابطے بنائے ان میں تشخیص کی بنیاد ضابطہ سہارن پور کو بنایا جس میں نصف لگان کا اصول پیش کیا گیا تھا۔ اس نے ہدایت جاری کی کہ اس ضابطے کا نفاذ پورے صوبجات متوسط میں ہوگا اور صوبے کے کسی حصے کو اس سے مستثنا قرار نہیں دیا جا سکے گا۔(3)

چنانچہ صوبجات متوسط کے بندوبست کے دو اہم اصول مندرجہ ذیل تھے۔

(1) مال گزاروں کے حقوق ملکیت اور کسانوں کے حقوق دخیل کاری تسلیم کئے جائیں۔

(2) مال گزاری جائیدادوں کے مجموعی لگان کی نصف مقرر کی جائے۔(4)

ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ تشخیص مال گزاری میں دوسرے اصول کی پابندی نہیں کی گئی۔ بعد میں مقرر ہونے والے اس صوبے کے دو چیف کمشنروں نے اس طریقے کی وضاحت کی ہے جس کی بنا پر ہر زمین داری کے مجموعی لگان کا تعین کیا گیا تھا۔(5)

جس حد تک ان دونوں بیانوں میں مطابقت پیدا کی جا سکتی ہے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ حکام بندوبست نے زمین داریوں کے حقیقی مجموعی لگان کو تسلیم نہیں کیا۔ انھوں نے من مانے

---

(1) شمال۔ مغربی صوبجات کی حکومت کے حکم نمبر 74 مورخہ 16 فروری 1855ء کی رو سے۔

(2) مراسلہ نمبر 2279 مورخہ 28 جون 1860ء کی رو سے۔

(3) ملاحظہ پیراگراف 135 اس کی انتظامی رپورٹ برائے 63-1862ء۔

(4) سنبل پور اس وقت بد انتظامی کے دور سے گزر رہا تھا اس لیے اسے اس کا بندوبست سے کوئی فائدہ نہیں ہوا کچھ دن بعد اس ضلع میں رعیت واری بندوبست کیا گیا۔

(5) مراسلہ نمبر 501 ایس مورخہ 18 مئی 1887ء اور مراسلہ نمبر 1862ء مورخہ 11 اپریل 1901ء۔

طریقے سے مجموعی لگان کا تخمینہ لگایا' اس تخمینی مجموعی لگان کی بنا پر مال گزاری کے مطالبے کا تعین کیا اور مالکان اراضی کو مطالبہ بتا دیا گیا۔ انھیں مجبوراً لگان میں اتنا اضافہ کرنا پڑا کہ وہ تخمینی لگان کے برابر ہو جائے۔ کسانوں کا خون نچوڑنے کے لیے مالکان اراضی کی ہمت افزائی کرنے کا اس سے زیادہ قابل نفرت طریقہ سوچا بھی نہیں جا سکتا ہے۔ بنگال' اودھ اور پنجاب میں لارڈ کیننگ اور سر جان لارنس نے کوشش کی تھی کہ نجی مالکان اراضی کو لگان میں اضافہ کرنے سے باز رکھنے کے لیے خصوصی قانون بنائے جائیں۔ لیکن صوبجات متوسط میں اور دوسرے مقامات پر حکام بندوبست نے ایسا طریقہ اختیار کیا جس کی بنا پر کسانوں کا خون نچوڑنے کے لیے مالکان اراضی کی ہمت افزائی ہوئی۔

زیادہ تر اضلاع میں مال گزاری کے مطالبے کا تخمینی لگان سے کبھی حقیقی تناسب 50 فی صدی سے زیادہ تھا جیسا کہ مندرجہ ذیل فہرست میں ظاہر ہوتا ہے[1]۔

لگان کا فی صدی حصہ جو مال گزاری کے طور پر وصول کیا جاتا تھا۔

سیونی			واردھا	79	فی صدی
ہوشنگ آباد	50 فی صدی سے کم		چھندواڑا	66	فی صدی
نرسنگ پور			بیتول	64	فی صدی
جبل پور	50	فی صدی	بھنڈارا	60	فی صدی
ساگر	51	فی صدی	چندا	60	فی صدی
دموہ	54	فی صدی	بلاس پور	57	فی صدی
منڈلا	56	فی صدی	رائے پور	53	فی صدی
نمار	64	فی صدی	سمبل پور	(رعیت واری بندوبست)	
ناگ پور	78	فی صدی			

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مال گزاری کے اصولوں کی دوہری خلاف ورزی کی گئی۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ جو مجموعی لگان تشخیص کی بنیاد بنایا گیا وہ اس سے زیادہ تھا جو مالکان اراضی کو واقعی حاصل ہوتا تھا اور دوسری بات یہ تھی کہ زیادہ تر اضلاع میں مال گزاری کا مطالبہ مجموعی لگان کے

---

(1) صوبجات متوسط کے چیف کمشنر کا خط ہندوستان کے گورنر جنرل کے نام' نمبر 1862' مورخہ 11 اپریل 1901ء

50 فی صدی سے زیادہ تھا۔ ناگ پور میں تو یہ مطالبہ لگان کا 87 فی صدی تھا۔ ایک دفعہ پھر حکومت کے احکام کی تعمیل میں "مقامی حکام نے بخل سے کام لیا" اور جب وہی حکام ضابطوں کی خلاف ورزی کرنے لگے جن کے لیے ضابطے بنائے گئے تھے تو لوگوں کی فریاد کون سنتا۔

پھر بھی اس بندوبست سے ایک فائدہ ہوا۔ بندوبست کا کام تیس سال تک جاری رہا اور کسانوں اور مالکان اراضی کو پچھلے دور کی پریشانیوں کے بعد کچھ سکون نصیب ہوا۔

باب 6

مدراس کے بندوبست

پچھلے ایک باب میں ہم ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے آخری بیس سال میں مدراس کے نظام مال گزاری کا حال سنا چکے ہیں۔ حکومت مدراس نے 1855ء میں صوبے کی پیمائش اور بندوبست کا فیصلہ کیا۔ زمین کے محصول میں کمی کی تجویز کی گئی تاکہ کاشت میں اضافہ ہو سکے۔ توقع تھی کہ کاشت میں اضافے کے ساتھ مال گزاری میں بھی اضافہ ہوگا۔

ڈائرکٹروں کی رائے

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں نے، جو شمالی ہندوستان اور بمبئی کے بندوبستوں کے خوشگوار نتائج دیکھ چکے تھے، 1856ء میں ایک مراسلے کے ذریعے اپنی باضابطہ منظوری دیدی[1] جس کا اقتباس ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔

"آپ نے اپنے خط مورخہ 11 اکتوبر (نمبر 44) 1855ء کے ساتھ مشاورت کی روداد مورخہ 19 اگست 1855ء ملفوف کی ہے جس میں آپ کے صوبے میں شامل اضلاع کی تشخیص مال گزاری پر نظرثانی اور عام پیمائش کے سوال پر پچھلے دس سال میں ہونے والے غور و خوض کے نتائج درج ہیں:

"ہمارے خیال میں اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ پریزیڈنسی میں شامل اضلاع کے بڑے حصوں کی مال گزاری پر نظرثانی کرنے کے لیے فوری پیمائش ضروری ہے۔"

آپ کے کہنے کے مطابق مال گزاری تشخیص کرنے والے حکام کو ہمیشہ یہ بات دھیان میں رکھنی

---

(1) مراسلہ فورٹ سینٹ جارج کے گورنر کے نام، مورخہ 17 دسمبر 1856ء۔

چاہیئے کہ حکومت کو وہ لگان وصول کرنے کا حق حاصل نہیں ہے جو کاشت کے اخراجات اور کاشت کاری کے سامان کے منافع کی منہائی کے بعد تمام فاضل پیداوار پر مشتمل ہو بلکہ اس کو صرف مالگزاری وصول کرنے کا حق حاصل ہے جو حتی الوسع اتنی کم ہونی چاہیئے کہ قابض و دخیل شخص کو فاضل پیداوار یا لگان بچ جائے چاہے وہ واقعی دوسروں کو زمین اٹھادے یا اسے خود جوتے۔

"چنانچہ ہمارا خیال ہے کہ مال گزاری کی تشخیص مجموعی پیداوار کے بجائے خالص پیداوار کے تناسب سے کی جانی چاہیئے۔[1]"

اگر مال گزاری کی تشخیص جنس کی صورت میں کی جائے اور اس کو رقم میں تبدیل کرنے کی مناسب و معقول شرح معین کر دی جائے تو ہمارا خیال ہے کہ اس قسم کا اعلان کر دینا چاہیئے کہ تیس سال تک اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی (جیسا کہ بمبئی اور شمال مغربی صوبجات میں کیا جا چکا ہے) تیس سال کی مدت ختم ہونے کے بعد جنسی تشخیص اور رقم میں تبدیل کرنے کی شرح دونوں پر نظر ثانی اور اس وقت کے حالات کے مطابق ان میں ضروری کمی بیشی کی جائے گی۔

"آپ کو یقین ہے کہ ان کی (مجوزہ اقدامات کی) بنا پر کاشت میں بہت اضافہ ہوگا اور آپ کو یہ بھی یقین ہے کہ اس کے نتیجے میں "مال گزاری کم ہونے کے بجائے بڑھ جائے گی"۔

"ہم آپ کی توقعات سے اتفاق رکھتے ہیں۔ ان کی کامیابی کے امکانات کے ثبوت میں بمبئی پریزیڈنسی کی مال گزاری پر نظر ثانی کے نتائج اور جنوبی ارکاٹ کے ضلع میں رائج کی جانے والی کم شرح کے خوشگوار اثرات پیش کئے جا سکتے ہیں"۔

سر چارلس وڈ کے خیالات

خط کشیدہ الفاظ بہت اہم ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی تمام خالص پیداوار یا زمین کے لگان کی دعوے دار نہیں تھی۔ وہ مال گزاری کے طور پر اس کا صرف ایک حصہ وصول کرنا چاہتی تھی۔ چونکہ 1855ء سے پہلے شمالی ہندوستان میں مال گزاری کے طور پر مجموعی لگان کے دو تہائی کا مطالبہ کیا جاتا تھا اس لیے رعیت داری علاقوں میں بھی وہ مال گزاری کے طور پر

---

(1) خالص پیداوار اس کو کہیں گے جو کاشت کاری کے اخراجات اور کاشت کے سامان کے منافع کی منہائی کے بعد کسان کے پاس بچے۔

خالص پیداوار کے دو تہائی کا مطالبہ کرتی تھی۔ لارڈ ڈلہوزی کی حکومت نے شمالی ہندوستان میں مال گزاری کا مطالبہ کم کر کے مجموعی لگان کا نصف کر دیا۔ نو سال بعد جب ہندوستان کی حکومت کمپنی سے منتقل ہو کر ملکہ انگلستان کے ہاتھ آ گئی تو سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا چارلس وڈ نے جنوبی ہندوستان میں مال گزاری کا مطالبہ خالص پیداوار کا نصف مقرر کر دیا۔ ہم 1864ء کے اس اہم مراسلے کے دو ٹکڑے ذیل میں درج کرتے ہیں جس میں یہ ضابطہ درج تھا اور جو اس سے پہلے شائع نہیں کیا گیا تھا۔

"سر ولیم ڈینیسن (Sir Wiliam Denisam) کی اس تجویز کی پوری حمایت کرنے کو میں تیار ہوں کہ مجموعی کے بجائے خالص پیداوار کو وہ اکائی سمجھا جائے جس کا ایک حصہ حکومت کو وصول کرنا ہے۔"

گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کو میں یہ سوچی سمجھی رائے دینا چاہتا ہوں کہ انصاف کا تقاضہ ہے کہ حکومت خالص پیداوار کا نصف حصہ سرکاری مطالبہ کے طور پر وصول کرے نہ کہ ایک تہائی جس کی تجویز سر ولیم ڈینیسن نے اپنی روداد میں پیش کی ہے۔"[1]

چنانچہ 1864ء سے، یعنی اس بندوبست کی ابتدا سے جس کی منظوری 1856ء میں دیدی گئی تھی لیکن جو کئی سال بعد شروع ہو سکا تھا، حکومت مدراس کی تشخیص مال گزاری کا واضح قاعدہ یہ تھا کہ سرکاری مطالبے کا تعین اس طرح کیا جائے کہ کھیت کی خالص پیداوار کا نصف حصہ کسان کے پاس بچ جائے اور دوسرا نصف حصہ مال گزاری کے طور پر وصول کیا جائے۔

اصول استمرار

1856ء کے ڈائریکٹروں کے خط سے ایک اور بات نکلتی ہے۔ ڈائریکٹروں نے اس اصول استمرار کو قطعی نظر انداز کر دیا جو رعیت داری طریقے کی اساس تھا۔ اس طریقے کے معمار حقیقی سر ٹامس منرو نے ہاؤس آف کامنز کے سامنے زوردار الفاظ میں کہا تھا کہ بنگال کے زمین داری طریقے کی طرح رعیت داری طریقے کا اصول بھی سرکاری مطالبے کا ہمیشہ کے لیے تعین کرنا تھا۔" جہاں تک

---

(1) مدراس کا بھیجا ہوا مراسلہ نمبر 7 مورخہ 24 فروری 1864ء پیراگراف 11، 15۔ الفاظ کے نیچے خط ہم نے لگایا ہے۔

دوامی حیثیت کا تعلق ہے دونوں طریقوں میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن رعیت داری طریقے میں زیر کاشت آنے والے بنجر کے تناسب سے مال گزاری میں اضافہ ہوتا جاتا ہے[1]" منرو کے اس بیان کے چالیس سال سے زیادہ مدت بعد تک حکومت مدراس نے اس کے متعلق کسی شک و شبہ کا اظہار کبھی نہیں کیا کہ استمراری مطالبہ مدراس کے طریقے کا اصول تھا حالانکہ اس دوران وہ اتنی زیادہ مال گزاری کا مطالبہ کرتی رہی جس کی ادائیگی کسانوں کے لیے ممکن نہیں تھی اور سال بہ سال وصول ہونے والی رقم میں کمی بیشی کرتی رہی۔ اپنے خط کے کسی حصے میں اس اصول کا حوالہ دیئے بغیر کورٹ آف ڈائریکٹرز نے ہر بیس سال بعد مال گزاری پر نظر ثانی کرنے کا فیصلہ کرکے اس کو قطعی نظر انداز کر دیا۔

لیکن اس اصول کو اتنی آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ڈائریکٹروں کا خط موصول ہونے کے بعد مدراس کے بورڈ آف ریونیو نے اعلان کیا کہ رعیت داری طریقے کا اصول اب بھی استمراری تشخیص کا اصول ہے۔ اس نے 1857ء میں لکھا تھا: "انگلستان میں عام طور سے یہ خیال پایا جاتا ہے کہ مدراس کے موجودہ رعیت داری طریقے میں مالکان اراضی کے حقوق کو زیادہ استحکام حاصل ہو گیا ہے۔ یہ خیال سراسر غلط ہے۔ مدراس کا کسان جب تک اپنے معاہدے کی شرائط کی پابندی کرتا ہے اس وقت تک وہ زمین پر قابض و دخیل رہ سکتا ہے اور اس سے وصول ہونے والے مطالبے میں کوئی اضافہ نہیں کیا جا سکتا ہے:"

چنانچہ 1861ء میں لارڈ کیننگ نے جب حکومت مدراس کو لکھا کہ وہ مال گزاری کے بندوبست استمراری کی ان سفارشات کے متعلق رپورٹ بھیجے جو کرنل بیرڈ اسمتھ نے پیش کی ہیں تو حکومت مدراس نے جواب میں لکھا کہ مدراس کا طریقہ ایک قسم کا بندوبست استمراری ہے۔ گورنر اور اس کی کونسل کے اراکین میں صرف اس بات پر اختلاف رائے ہے کہ زمین کا محصول جنس کی شکل میں وصول ہونے والا استمراری لگان ہونا چاہیے یا رقم کی شکل میں وصول ہونے والا استمراری لگان۔ یہ خط اتنا اہم ہے کہ اس کا پورا متن درج کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے[2]۔

مجوزہ بندوبست استمراری

"آنریبل گورنر بااجلاس کونسل نے مجھے ہدایت کی ہے کہ آپ کے مراسلے نمبر 2035 مورخہ

---

(1) 1813ء میں ہاؤس آف کامنز کی سیلکٹ کمیٹی کے سامنے دی جانے والی شہادت

(2) حکومت مدراس کا مراسلہ حکومت ہند کے نام، نمبر 241، مورخہ 8/فروری 1862ء

7/ اکتوبر 1861ء کی موصولی کی آپ کو اطلاع دوں جس میں اس سے کہا گیا ہے کہ وہ " مدراس پریزیڈنسی کے مختلف اضلاع میں بندوبست استمراری کے نفاذ کے فوائد" کے بارے میں اپنی رائے پیش کرے۔ اس کے علاوہ "جن اضلاع میں گورنر بہ اجلاس کونسل موجودہ بندوبست کو استمراری حیثیت نہ دینا چاہیے وہاں بندوبست کی مدت کو قانونی حیثیت دینے کی افادیت کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرے۔"

2۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس حکومت کے خیال میں " بندوبست استمراری" سے گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کا مقصد اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ زمین کے محصول کا تعین ہمیشہ کے لیے کر دیا جائے۔ دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو زمین اس بندوبست کے تحت آجائے اس کے مطالبے میں اضافہ کرنے کے حق سے حکومت ہمیشہ کے لیے دست بردار ہو جائے۔

3۔ لیکن مدراس کے 1802ء کے ضابطے نمبر 25 میں اور بنگال کے 1793ء کے ضابطے نمبر 1 میں " بندوبست استمراری" کے الفاظ زمین داری بندوبست کے تعلق سے عام مفہوم میں استعمال ہوئے ہیں۔ حکومت اس پریزیڈنسی کی حد تک اس حق کو توسیع دینے کے خلاف ہے۔ من جملہ دیگر اعتراضات اس کے خلاف ایک بڑا اعتراض یہ ہے کہ اس کی بنا پر حکومت کو تمام بنجر زمین سے دست بردار ہونا پڑے گا۔ حکومت کو توقع ہے کہ اس ذریعہ سے مال گزاری میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوگا اور یہ ضروری ہے کہ آئندہ آمدنی کے اس ذریعہ سے حکومت محروم نہ ہو جائے۔

4۔ اس بات کی وضاحت ہو جانے کے بعد میں چند الفاظ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ موجودہ رعیت داری طریقے کے تحت اس پریزیڈنسی میں زمین کے استحقاق کی کیا نوعیت ہے۔ آپ کے خط میں جو تجویز پیش کی گئی ہے اس کا اطلاق صرف رعیت داری بندوبست پر ہوتا ہے۔

5۔ بندوبست کا یہ طریقہ کرنل ریڈ نے 1792ء میں شروع کیا تھا۔ اس کے بعد سر ٹامس منرو نے اس کو مکمل کیا۔ 1812ء میں حکومت انگلستان نے اس کے عام نفاذ کا حکم جاری کیا۔ اس کے بعد سے یہ پریزیڈنسی کا عام طریقہ بن گیا۔ زمین داریوں سے حاصل ہونے والی مال گزاری تقریباً نصف ملین پونڈ ہے جب کہ رعیت داری علاقے سے ساڑھے تین ملین پونڈ مال گزاری وصول کی جاتی ہے۔

6۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ رعیت داری طریقے کا بنیادی اصول یہ ہے کہ زمین پر سرکاری مطالبہ ہمیشہ کے لیے معین کر دیا جاتا ہے۔

7۔ 1796ء میں جب ضلع سالم کا پہلا بندوبست کیا جا رہا تھا کرنل ریڈ نے کسانوں کے نام ایک اعلان جاری کیا تھا جس میں مندرجہ ذیل ضابطہ شامل تھا "جوت کی پیمائش اور مالیت کا تخمینہ لگانے کے بعد اس میں شامل ہر کھیت کی مال گزاری کی تشخیص اگر پوری شرح کے مطابق کی جائے گی تو اس کا تعین ہمیشہ کے لیے کر دیا جائے گا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ حکومت نہ زیادہ رقم وصول کر سکے گی نہ کم رقم لینے کو تیار ہو گی۔ موجودہ شرح سے آپ کو نہ زیادہ ادا کرنا ہو گا نہ کم۔ مال گزاری کی رقم میں تبدیلی صرف اس صورت میں ہو گی کہ جو کھیت واقعی سینچائی سے محروم ہیں انھیں سرکاری خرچے پر آب پاشی کی سہولت مہیا کی جائے۔ اس صورت میں پیداوار کے اضافے کی مناسبت سے موجودہ شرح میں اضافہ کیا جائے گا اور اضافہ شدہ مال گزاری کا تعین ہمیشہ کے لیے کر دیا جائے گا۔ اگر آب پاشی کا انتظام اپنے خرچ سے کریں گے اور باغات وغیرہ لگائیں گے تو آپ ان سے اور زمین کی دوسری ترقیوں سے فائدے حاصل کرنے کے باوجود معینہ شرح کے مطابق ادائیگی کرتے رہیں گے جس کو مندرجہ بالا صورت حال کے علاوہ سرکار کا استمراری مطالبہ سمجھا جائے گا۔ آپ زمین کو جوت کر اور اس میں کھاد ڈال کر اس کی قیمت بڑھا سکتے ہیں اور اس کی مانگ ہو تو ان اصولوں کے مطابق اپنی زمین بٹے پر اٹھا سکتے ہیں جس کی شرح سرکاری شرح سے بہت زیادہ ہو سکتی ہے۔ پھر بھی آپ سرکار کو ہمیشہ معینہ شرح کے مطابق ادائیگی کر سکیں گے۔"

8۔ سر ٹامس منرو نے بھی 1802ء میں حاصل ہونے والے اضلاع کے کلکٹروں کو ہدایت جاری کرتے ہوئے مندرجہ ذیل خیال ظاہر کیا تھا "جب کسی علاقے کی پیمائش ہو جائے تو انفرادی (رعیت داری) بندوبست گانو اور ضلع کے بندوبستوں کو منسوخ کر دیتا ہے اور ان کی جگہ لے لیتا ہے۔ ہر کھیت کا لگان چونکہ معین ہوتا ہے اس لیے ہر کسان اپنی مرضی کے مطابق کھیت پر قابض رہنے یا اس سے دست بردار ہونے کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ کسی ایک گانوں میں ایک سال کے دوران جن کھیتوں پر قبضہ کیا جاتا ہے ان کے لگان گانو کے بندوبست کی بنیاد ہوتے ہیں۔" پھر 1806ء میں رعیت داری بندوبست کے طریقہ کار کی تشریح کرتے ہوئے اس نے کہا تھا "جب پیمائش ہو جاتی ہے اور ہر کھیت کا لگان ہمیشہ کے لیے معین کر دیا جاتا ہے تو انفرادی بندوبست بہت آسان ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد صرف دو کام باقی رہ جاتے ہیں یعنی اس امر کی تفتیش کہ کس کھیت پر کون قابض ہے اور پٹے میں اس کا اندراج۔ ان کے مطالبوں کا کل میزان اس کا سالانہ لگان ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ رقم طلب نہیں کی جا سکتی لیکن مفلسی یا غیر معمولی نقصانات کی صورت میں اسے چھوٹ

دی جاسکتی ہے۔ اس سے فائدہ یہ ہے کہ ابتدائے فصل میں جب وہ کھیت جوتنا شروع کرتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ کتنی رقم کا مطالبہ اس سے کیا جائے گا۔ اپنی جوت کے مختلف کھیتوں کا معینہ لگان اس کے علم میں ہوتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ ان کی مجموعی رقم سے زیادہ کا مطالبہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ نہ صرف موجودہ بلکہ آئندہ برسوں کے بھی زیادہ سے زیادہ لگان کی رقم اس کے علم میں ہوتی ہے اس لیے کہ جب تک وہ مزید زمین پر قبضہ نہ کرے اس کے لگان میں اضافہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی قسطوں کی باضابطہ ادائیگی زیادہ آسانی سے کرسکتا ہے اور اچھے موسم میں حاصل ہونے والے منافع سے برے موسم کے نقصانات کی تلافی کرسکتا ہے۔" بورڈ آف ریونیو نے 18 ء میں ہدایت جاری کی کہ حکومت انگلستان کے حکم کے مطابق رعیت داری طریقہ ہر جگہ جاری کر دیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ اس طریقے کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ ہر کھیت کا زیادہ سے زیادہ لگان ہمیشہ کے لیے معین کر دیا جاتا ہے۔"

۹۔ بعد کے زمانے میں بھی کئی موقعوں پر رعیت داری بندوبست کی استمراری حیثیت کو واضح الفاظ میں تسلیم کیا گیا ہے۔"

10۔ مدراس کی انتظامی رپورٹ برائے 56-1855ء میں رعیت داری کی تشریح مندرجہ ذیل الفاظ میں کی گئی ہے۔

رعیت داری طریقے میں زمین کے ہر درج خسرہ قابض کو اس کا مالک سمجھا جاتا ہے اور وہ براہ راست حکومت کا مطالبہ ادا کرتا ہے۔ اسے حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنے کھیت کو شکمی کو اٹھا دے یا ہبہ، بیع اور رہن کے ذریعہ منتقل کر دے۔ جب تک وہ معینہ مطالبہ ادا کرتے رہے حکومت اسے بیدخل نہیں کرسکتی ہے اور اسے حق حاصل ہے کہ ہر سال وہ اپنی جوت میں اضافہ یا تخفیف کرتا رہے یا اس سے دست بردار ہو جائے۔ فصلوں کی خرابی کے زمانے میں اسے پیداوار کے کلی یا جزوی نقصان کے مطابق چھوٹ مل سکتی ہے۔ مطالبے کی تشخیص رقم کی شکل میں کی جاتی ہے اور اس میں سال بہ سال تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔ تبدیلی صرف اس صورت میں کی جاتی ہے جب وہ سرکاری ذرائع سے پانی حاصل کر کے بارانی زمین کی سینچائی کرے یا ایک فصل پیدا کرنے والی زمین سے دو فصلیں حاصل کرے۔ ایسی صورتوں میں پانی کا مزید محصول حکومت کو ادا کرنا ہوتا ہے۔ اگر کسان اپنے خرچ سے زمین کو ترقی دے تو مطالبے میں کسی قسم کا اضافہ نہیں کیا جاتا ہے۔ اس طریقے میں کسان عملاً مالک ہوتا ہے اور اس کا حق ملکیت سیدھا سادھا مگر مکمل ہوتا ہے۔ اسے استمراری پٹے کے تمام

فوائد حاصل ہوتے ہیں لیکن ان کی ذمہ داریوں سے محفوظ رہتا ہے۔ وہ جب چاہے اپنی زمین سے دست بردار ہو سکتا ہے لیکن جب تک وہ مطالبہ ادا کرتا رہے اسے بیدخل نہیں کیا جا سکتا ہے۔ قلت کے زمانے میں اس کی مدد کی جاتی ہے اور پڑوسی کی ادائیگی کی اس پر کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی ہے۔" حکومت انگلستان نے 1857ء میں رعیت داری کی اسی قسم کی تشریح ہاؤس آف کامنز میں کی تھی۔(1)

11۔ نئی پیمائش اور بندوبست کے متعلق 1857ء میں حکومت کو پیش کی جانے والی ایک رپورٹ میں بورڈ آف ریونیو نے لکھا تھا "یہاں اس بات کا ذکر بیجا نہیں ہوگا کہ انگلستان میں عام خیال پایا جاتا ہے کہ مدراس کے موجودہ رعیت داری طریقے کے مقابلے میں بمبئی کے تیس سالہ بندوبست میں اراضی پر قابض کسان کے حق کو زیادہ استحکام حاصل ہوگیا ہے۔ یہ خیال سراسر غلط ہے۔ مدراس کا کسان جب تک اپنے معاہدے کی شرائط کی پابندی کرتا رہے اس وقت تک وہ زمین پر قابض و دخیل رہ سکتا ہے اور اس سے وصول ہونے والے مطالبے میں کوئی اضافہ نہیں کیا جا سکتا:

12۔ اسی سال آنریبل مسٹر رکٹ (MR. Rickett) کی رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے حکومت نے زوردار الفاظ میں کہا تھا "کسان کو مکمل حق ملکیت حاصل ہے اور جب تک وہ زمین کا معینہ مطالبہ ادا کرتا رہے اس کو کوئی بیدخل نہیں کر سکتا۔ رعیت داری نظام کا کوئی اصول اس اصول سے زیادہ متعین اور مشہور نہیں ہے اور حکومت اس بات کو ماننے سے انکار کرتی ہے کہ کوئی حق اس سے زیادہ مستحکم ہو سکتا ہے۔"

13۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رعیت داری کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ زمین سے تعلق رکھنے والے سرکاری مطالبے پر ہمیشہ کے لیے حدود عائد کر دیے جاتے ہیں۔ اس طرح کسان کو زمین داری کے تمام فوائد حاصل ہو جاتے ہیں اور ریاست کے ہیں بنجر زمین کا بیش بہا علاقہ رہتا ہے جس کی بنا پر زراعت کی توسیع کی صورت میں وہ اپنے وسائل میں اضافہ کر سکتی ہے اور بڑھتے ہوئے مالی مطالبوں کو پورا کر سکتی ہے جو ملک کی ترقی کا نتیجہ ہوا کرتے ہیں۔ رعیت داری کے عمل درآمد میں

---

(1) پارلیمنٹ میں دیا جانے والا جواب جس میں بتایا گیا تھا کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں زمین کے تعلق سے لوگوں کو کیا حقوق حاصل ہیں اور کتنا زمین کا محصول ادا کرنا پڑتا ہے (مسٹر ولیم ایڈورڈ) 22 جون 1857ء کو ہاؤس آف کامنز نے اشاعت کا حکم دیا۔

اس اہم اصول کی خلاف ورزی کبھی نہیں کی گئی ہے۔ جنوبی ارکاٹ، بلیری، کڑپا وغیرہ کی طرح کبھی کبھی مطالبے میں تخفیف کردی گئی ہے لیکن اس میں اضافے کی کوئی مثال پیش نہیں کی جاسکتی۔ روپے کی حالیہ قلت کے زمانے میں یہ مشورہ کبھی نہیں دیا گیا کہ حکومت کی آمدنی کا ایک ذریعہ زمین کے محصول میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔

14- اگر بات صرف اتنی ہوتی تو حکومت کہہ سکتی تھی کہ اس پریزیڈنسی کے رعیت داری مالکان اراضی کو وہ تمام فوائد حاصل ہو چکے ہیں جو گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل ان کو پہنچانا چاہتا ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ کسانوں کے اس قسم کے فوائد پہنچانے کے لیے قانون کا سہارا نہیں لیا گیا۔

15- لیکن 1815ء میں اس وقت ہونے والی پیمائش اور بندوبست شروع کرتے وقت زمین کے حق میں ایک اہم ترمیم کی گئی تھی۔

16- اس اقدام کا مقصد تشخیص پر نظر ثانی کرنا تھا جس کی شرح عام طور سے بہت زیادہ تھی ہر صورت میں کسان کی زمین میں مالکانہ دلچسپی پیدا کرنے اور کاشت میں اضافے کے لیے عوامل مہیا کرنے کے لیے مجموعی پیداوار کا 30 فی صدی' جس کا حساب تجویز کردہ طریقے کے مطابق بڑی احتیاط سے لگایا جاتا تھا'' حکومت کا زیادہ سے زیادہ مطالبہ مقرر کیا گیا'' اور یہ سمجھا گیا کہ یہ مطالبہ اوسطاً 25 فی صدی ہوگا۔ حکومت کا خیال تھا کہ پچاس سال کی مدت کے لیے مطالبہ جنس کی شکل میں مقرر کیا جائے اور ہر سات یا دس سال کی مدت کے بعد اس زمانے میں ملنے والی اوسط قیمت کے مطابق جنس کو رقم میں تبدیل کرنے کی شرح میں کمی بیشی کی جائے۔ حکومت انگلستان نے اس انتظام کو ناپسند کیا اور رقم کی شکل میں ایسا لگان تشخیص کرنے کو ترجیح دی جس میں تیس سال تک کوئی تبدیلی نہ کی جائے۔ حکومت نے اس پر مزید غور کیا اور آخر میں فیصلہ کیا کہ بشرط ضرورت تشخیص پر پچاس سال بعد نظر ثانی کی جائے لیکن یہ فیصلہ ابھی تک باضابطہ طور سے لوگوں کے علم میں نہیں لایا گیا ہے۔

17- اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ رعیت داری طریقے کی اہم خصوصیت حالانکہ استمراری تشخیص ہے پھر بھی اس وقت ہونے والی تشخیص پر پچاس سال بعد نظر ثانی کی جائے گی۔

18- آپ کے زیر جواب خط میں جو متبادل تجاویز پیش کی گئی ہیں ان پر حکومت نے پوری طرح غور کیا۔ وہ جس نتیجے پر پہنچی ہے وہ میں چند الفاظ میں بیان کر دینا چاہتا ہوں۔

19- ہز ایکسی لینسی گورنر اس بات کی موافقت میں ہے کہ ہمیشہ کے لیے جنسی لگان مقرر کر دیا جائے لیکن وہ حکومت کے اس حق کو برقرار و بحال رکھنا چاہتا ہے کہ مستقبل میں کبھی روپے کی قیمت میں

ہونے والی تبدیلی کی بنا پر اگر یہ اقدام ضروری ہو جائے تو وہ ایک معینہ مدت کے بعد جنس کو رقم میں تبدیل کرنے کی شرح کا تعین کر سکے۔

20۔ لیکن کونسل کے آنریبل اراکین رقم کی شکل میں استمراری تشخیص کے قدیم رعیت داری کے اصول کی حمایت کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس تشخیص کی حمایت کرتے ہیں جس کی بنیاد پیداوار کا ایک حصہ ہوتی ہے جس کو ایسی مناسب شرح سے رقم میں تبدیل کیا جاتا ہے جو ہمیشہ کے لیے مقرر کر دی جاتی ہے۔

21۔ میں آپ کی توجہ اس روداد کی طرف دلانا چاہتا ہوں جو اس خط کے ساتھ ملفوف کی جا رہی ہے اور جس میں کونسل کے صدر اور اراکین کے خیالات شامل ہیں۔

22۔ حکومت کو اس سے اتفاق نہیں ہے کہ بندوبست کی مدت کا تعین کرنے کے لیے قانون کا سہارا لیا جائے۔ اس قسم کے بندوبستوں سے کسانوں کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچے گا مگر حکومت کے کام میں رکاوٹ پڑے گی۔ حکومت اور عام لوگ دونوں کا فائدہ اس میں ہے کہ یا تو بندوبست استمراری کیا جائے یا حکومت کو یہ اختیار حاصل ہونا چاہیے کہ ریاست کی ضرورتوں کے پیش نظر وہ جس وقت مناسب سمجھے کارروائی شروع کر سکے۔ جب تک شدید ضرورت نہ ہو حکومت کو مطالبے میں کمی بیشی نہیں کرنی چاہیے لیکن اس قسم کی ضرورت اس مدت میں بھی پیش آ سکتی ہے جس کے متعلق از روئے قانون طے کر دیا جائے کہ اس کے دوران بندوبست میں کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔

نیا بندوبست

حالانکہ اس خط میں ہمیشہ کے لیے مقرر کیے جانے والے سرکاری مطالبے کے اصول کو تسلیم کیا گیا تھا لیکن اس پر عمل نہیں کیا گیا۔ بندوبست تیس سال کے لیے کیے جاتے تھے اور اس مدت کے ختم ہو جانے کے بعد ہر کسان کی مال گزاری میں اضافہ کیا جا سکتا تھا۔ 1859 اور 1868ء کے قوانین میں کچھ اصول رکھے گئے تھے جن کی بنیاد پر بنگال کے نجی مالکان اراضی لگان میں اضافہ کر سکتے تھے۔ لیکن سرکاری مطالبے میں اضافہ کرنے کے کوئی خصوصی مقرر شدہ اصول نہیں تھے۔

نئے بندوبست کے پہلے پندرہ سال یعنی 1861 سے 1875 تک کے مالیاتی نتائج مندرجہ ذیل نقشے میں دکھائے جا رہے ہیں[1]

---

(1) یہ اعداد و شمار مدراس کے بورڈ آف ریونیو کی تجویز نمبر 542 مورخہ 6 دسمبر 1900ء ضمیمہ سے اخذ کیے گئے

	مالابار اور جنوبی کنارا کو چھوڑ کے مدراس کی مال گزاری				
سال	مقبوضہ رقبہ ایکڑ میں	اس کی مالگزاری پونڈ	رعیت داری کا مجموعی مطالبہ پونڈ	دیگر محاصل پونڈ	میزان پونڈ
1861ء	1,58,00,000	32,00,000	32,20,000	70,000	32,90,000
1862ء	1,64,00,000	32,30,000	33,80,000	70,000	34,50,000
1863ء	1,70,00,000	32,10,000	34,30,000	70,000	35,00,000
1864ء	1,73,00,000	31,80,000	33,60,000	50,000 (2)	34,10,000
1865ء	1,75,00,000	31,90,000	34,10,000	80,000	34,90,000
1866ء	1,78,00,000	31,80,000	35,20,000	1,50,000	36,70,000
1867ء	1,82,00,000	32,30,000	33,00,000	1,80,000	34,80,000
1868ء	1,84,00,000	32,40,000	34,00,000	2,20,000	36,20,000
1869ء	1,88,00,000	32,70,000	36,00,000	2,60,000	38,60,000
1870ء	1,92,00,000	33,00,000	37,10,000	2,90,000	40,00,000
1871ء	1,89,00,000	32,20,000	35,60,000	4,00,000	39,60,000
1872ء	1,90,00,000	32,20,000	36,70,000	4,20,000	40,90,000
1873ء	1,88,00,000	31,90,000	35,40,000	4,20,000	39,60,000
1874ء	1,92,00,000	32,30,000	37,60,000	4,20,000	41,80,000
1875ء	1,92,00,000	32,50,000	35,30,000	4,10,000	39,40,000

مندرجہ بالا اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ زیر کاشت رقبے میں اور زمین کے مجموعی سرکاری مطالبے میں پندرہ سال میں تقریباً 20 فی صدی اضافہ ہوا۔ لیکن اس سے زمین کے محصول کے بار کا

ہیں۔ دس روپے ایک پونڈ کے برابر تسلیم کیے گئے ہیں۔

(2) ابواب پہلی دفعہ لگائے گئے۔

پورا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ 1860ء میں جو زمین زیر کاشت آچکی تھی اس کے مقابلے میں زیر کاشت آنے والی نئی زمین کم زرخیز تھی اور اس میں کم پیداوار ہوتی تھی۔ پیداوار میں 20 فی صدی اضافہ ہونے کے بجائے مشکل سے دس فی صدی کا اضافہ ہوا۔ دوسری بات یہ ہے کہ پندرہ سال کی مدت کے شروع میں پیداوار کی جو قیمت ملتی تھی اس کے مقابلے میں اس کے آخر میں ملنے والی قیمت کم تھی۔ چنانچہ کسانوں کو فی گارس[1] جو قیمت ملتی تھی وہ پہلے ملنے والی قیمت سے کم تھی۔ اس لیے اس بات پر تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ اس مدت کے آخر میں کسانوں کو اسی حد تک چھوٹ دینی پڑتی تھی جتنی شروع میں دی جاتی تھی۔ چنانچہ مدراس کی پیمائش اور بندوبست، جن سے بڑی توقعات وابستہ تھیں، لوگوں کو ضروری آسانیاں بہم نہیں پہنچا سکے۔ اس میں شک نہیں کہ کچھ فائدے بھی ہوئے۔ پہلا فائدہ تو یہ ہوا کہ زمین کے محصول میں بڑی حد تک یکسانیت پیدا کر دی گئی۔ اس کے علاوہ تیس سال کی مدت کے لیے ہونے والے بندوبست نے کسانوں کو سالانہ تفتیش پریشانی اور دشواری سے نجات دلا دی۔ لیکن صوبے کی مجموعی پیداوار اور اس پیداوار کی قیمتوں کی مناسبت سے دیکھا جائے تو 1860ء کے مقابلہ میں 1875ء میں محصول کا بار لوگوں پر زیادہ پڑنے لگا تھا۔ 1877ء میں پڑنے والے مدراس کے خوفناک قحط نے ثابت کر دیا کہ نیا بندوبست لوگوں کا تحفظ اور ان کی قوت مدافعت میں اضافہ کرنے میں ناکام رہا۔

اگر 1864ء کے ضابطے پر ایمانداری سے عمل کیا جاتا جس کی رو سے سرکاری مطالبہ خالص پیداوار کے نصف تک محدود کر دیا گیا تھا تو بہتر نتائج حاصل کیے جا سکتے تھے۔ لیکن ان بڑے بڑے علاقوں کا بندوبست کرتے وقت جن میں 1,50,00 جوت تھیں مجبوراً سرسری طریقے اختیار کرنے پڑے اور تیزی کے ساتھ کارروائی کی گئی۔ کسانوں کو اس کا موقع ہی نہیں دیا گیا کہ وہ یہ ثابت کر سکیں کہ وہ اپنے کھیتوں سے کتنی مجموعی پیداوار حاصل کرتے ہیں، کاشت پر کیا خرچ آتا ہے اور ان کی کتنی خالص آمدنی ہوتی ہے۔ عام طور سے سمجھا جاتا تھا کہ مجموعی پیداوار کا ایک تہائی حصہ کاشت پر ہونے والے اخراجات کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اچھی زمین کے ایک ایکڑ کی کاشت کے لیے سمجھا جاتا تھا کہ اس پر 28 شلنگ خرچ ہوتے ہیں۔ اور معمولی ریتیلی زمین کے ایک ایکڑ کی کاشت کے اخراجات کے لیے

---

(1) 1861ء لغایت 1865ء منڈی کا بھاؤ 194 روپے فی گارس۔

1871ء لغایت 1875ء منڈی کا بھاؤ 155 روپے فی گارس۔

12 شلنگ کافی سمجھے جاتے تھے۔ مدراس کے کسان اور صوبے کا تجربہ رکھنے والے انگریز جانتے تھے کہ یہ رقم ناکافی ہے۔[1]

سرکاری تشخیص کی بنیاد اس قسم کے غلط تخمینے تھے جو ملک کے بڑے حصوں کی بابت مشترکہ طور سے لگائے گئے تھے۔ تشخیص کا نتیجہ کسان کو بتایا جاتا تھا جو پریشان ہو جاتا تھا۔ اکثر صورتوں میں اس پریشانی میں صرف مدراس کے کسان ہی مبتلا نہیں تھے۔ سر چارلس وڈ کے جانشین بھی جنہوں نے 1864ء کا واضح ضابطہ بنایا تھا، اس بات سے کم پریشان نہیں تھے کہ عمل درآمد کے وقت اس ضابطے کو نظر انداز کیا جاتا تھا۔ مدراس کے گورنر لارڈ ہوبرٹ (LORD HOBART) نے 1874ء میں تجویز پیش کی کہ بندوبست کی کارروائی روک دی جائے اور کوئی آسان تر طریقہ اختیار کیا جائے۔ انڈر سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا سر لوئی میلیٹ (SIR LOUIS MALLET) نے دو طویل اور مشاورتی رودادوں میں بتایا کہ مدراس کے بندوبست میں ایسے اصولوں سے کام نہیں لیا جا رہا ہے جو حکام کی رہنمائی کر سکیں۔ پہلی روداد کا ایک اہم ٹکڑا ہم درج کر رہے ہیں۔

سر لوئی میلٹ کی روداد

ہندوستان کے نظام مال کے متعلق 1857ء میں ہاؤس آف کامنز میں پیش کی جانے والی ایک دستاویز میں، جس پر مسٹر جان ایس۔ مل نے دستخط کئے تھے، مجھے مندرجہ ذیل بیان ملا "عام طور سے ہندوستان میں زمین ذاتی ملکیت ہوا کرتی ہے جس پر مال گزاری ادا کی جاتی ہے۔ ملک کے مختلف حصوں میں تشخیص کے مختلف طریقے رائج ہیں۔"

---

(1) مسٹر بوڈن (BOWDEN) نے، جو تجربہ کار مالک اراضی تھا، 5/دسمبر 1895ء کو ضلع کے کلکٹر کو لکھا تھا "یہ خیال ایک وہم سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا کہ اچھی زمین کے مقابلے میں خراب زمین پر کاشت کرنے کے اخراجات کم ہوتے ہیں۔" مسٹر فاسٹر نے مغربی ڈیلٹا کے متعلق اپنی رپورٹ کے پیراگراف 79 میں لکھا تھا "میں اس بات کا ثبوت حاصل نہ کر سکا کہ اچھی زمین کے مقابلے میں خراب زمین پر خرچ کم ہوتا ہے۔" مسٹر میئر (MEYER) نے لکھا تھا "محکمہ بندوبست کی یہ کمزوری ہے کہ اس میں اخراجات کاشت کو زمین کی قیمت سے مناسبت دینے کا رجحان پایا جاتا ہے۔" مدراس کے بورڈ آف ریونیو نے 6/دسمبر 1900ء کی تجویز کے پیراگراف 36 میں کہا تھا "نہ ہی اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پیداوار کے تناسب سے اخراجات کی درجہ بندی کی تمام جزویات بالکل درست ہیں۔"

• جس واقعہ کی طرف میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں یعنی مدراس کے ساتھ 1856ء میں ہونے والی مراسلت میں کورٹ آف ڈائریکٹرز نے زوردار الفاظ میں سرکاری ملکیت کے نظریئے کو مسترد کر دیا تھا اور اس اصول کی توثیق کی تھی کہ تشخیص ہونے والا محصول مال گزاری ہے۔ اس کو لگان نہیں کہا جاسکتا مال گزاری، جو لگان پر عاید کی جاتی ہے اور جس کو ایک ایسے خود کفیل ملک میں جو بے شمار غیر ترقی یافتہ زراعتی وسائل کا مالک ہو، ضروری محاصل وصول کرنے کا آسان ترین اور روایتی طریقہ سمجھا جاتا ہے، مالیاتی طریقوں میں غالباً سب سے صحت مند آسان اور منصفانہ طریقہ ہے۔

• سر چارلس وڈ نے 1864ء میں اس اصول ہی کی ایک دفعہ پھر توثیق کی اور تشخیص کی شرح خالص پیداوار کی 50 فی صدی معین کر کے بورڈ پر سبقت لے گیا۔ لیکن وہ اس بات کو پوری طرح تسلیم کرتا تھا کہ یہ صرف عام ضابطہ ہے جس کے عمل درآمد میں زیادہ سے زیادہ آزادی دی جانی چاہیے۔

• ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس طرح وجود میں آنے والا اصول ٹھوس اور سائنسی بنیادوں پر قائم ہے۔ لیکن اس کا عمل درآمد ایسی زبان اور ایسے حالات میں کرنا پڑا کہ وہ صرف ایک تجویز بن کر رہ گیا (اس کی وجہ یہ تھی کہ اصول کے نفاذ کا فیصلہ حکام بندوبست کی صواب دید پر چھوڑ دیا گیا اور ان کے سپرد ایسا کام کیا گیا تھا جس کو نہایت بھونڈے طریقے سے سرانجام دینے کے علاوہ وہ کچھ کر ہی نہیں سکتے تھے) اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ پورا نظام حکومت اب اس بدنظمی کا شکار ہو گیا ہے جس کا ذکر ان کاغذات میں کیا گیا ہے۔

"اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا صرف لگان محض مناسب لگان۔ پر محصول عاید کیا جانا چاہیئے پھر بے موقع من مانے اور فی الجملہ نہایت ناکارہ طریقہ بندوبست سے کیا فائدہ جس پر بے اندازہ روپے صرف ہوتا ہے۔ ہم یہ نہیں کر سکتے کہ تشخیص کی طرف سے بے توجہی برتیں اور جہاں بھی ہمیں موقع ملے ہم زمین کے مجموعی لگان کا حسب مرضی حصہ وصول کر لیں۔ میرے خیال میں اس کا جواب یہ ہے کہ خالص پیداوار کے 50 فی صدی کی ہدایت صرف کاغذ پر درج ہے۔ یہ ایسا افسانہ ہے جس کا انتظامی حقائق سے دور کا تعلق بھی نہیں۔ عمل کے میدان میں عاید کی جانے والی شرح تمام مجموعی لگان پر حاوی ہوتی ہے اور میرا خیال ہے کہ اکثر صورتوں میں منافع بھی اس کی زد میں آجاتا ہے۔"

خط ہم نے لگایا ہے۔

باب 7

بمبئی کے بندوبست

اس کتاب کے ایک ابتدائی باب میں بمبئی کے اس پہلے اہم بندوبست کا ذکر کیا جا چکا ہے جو 1836ء میں شروع ہوا تھا۔ سر جارج ون گیٹ نے بڑے منصفانہ طریقے سے اس کو سرانجام دیا تھا، چونکہ گزشتہ دور کے بار بار ہونے والے بندوبستوں کے بعد جن میں بڑی سختی برتی جاتی تھی، یہ تیس سال کے لیے کیا گیا تھا اس لیے کسانوں کو اس سے بڑا سکون ملا۔ لیکن اس کی بڑی خرابی یہ تھی کہ تشخیص کا کام پیمائش کے حاکم کی صواب دید پر چھوڑ دیا گیا تھا اور کسانوں کو آئندہ ہونے والی نظر ثانیوں کے موقعوں پر اناج رکھنے کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا تھا۔

پہلے تیس سالہ بندوبست کی مدت ختم ہونے سے پہلے حکومت نے بندوبست استمراری کے سوال پر غور کرنا شروع کر دیا تھا۔ لارڈ کیننگ نے کرنل بیرڈ اسمتھ کی 1861ء کی تجویز بمبئی کے گورنر کو بھیج دی۔ گورنر نے تجویز کو تو مسترد کر دیا لیکن اس اصول کو تسلیم کر لیا کہ تشخیص کی بنیاد "مجموعی پیداوار کا منصفانہ حصّہ ہونا چاہیے۔"[1]

مجوزہ بندوبست استمراری

1۔ اس ملک کے بسنے والے لوگوں کا کہنا ہے کہ مالیاتی نظام کی خوبی کا پیمانہ زمین کے محصول کی شکل میں وصول ہونے والی وہ منصفانہ رقم ہے جو حکومت کے خزانے میں داخل ہوتی ہے اور حکومت کی کارکردگی کا اندازہ بلاواسطہ اور بالواسطہ محاصل کی عدم موجودگی سے لگانا چاہیے۔

---

(1) روداد مورخہ 3/ مارچ 1862ء

2۔ مجھے ان کی بات کی سچائی پر کبھی کوئی شک وشبہ نہیں ہوا۔ بات یہ ہے کہ دیسی لوگ محسوس کرتے ہیں کہ ریاست کو وہ جو رقم ادا کرتے ہیں اس کے معاوضے میں انھیں زمین پر دخیل کاری یا قبضے کا حق مل جاتا ہے اور ان کا خیال ہے کہ یہ حق مل جانے کی وجہ سے ان کی ادا کی ہوئی رقم کی نوعیت بدل جاتی ہے اور اسے محصول نہیں کہا جا سکتا۔

3۔ یہ مالیاتی نظام اس ملک کے قدیم ترین اداروں میں شمار کیا جاتا ہے اور اس کی بنیاد ریاست کا یہ حق ہے کہ وہ زمین کی پیداوار کا ایک حصہ حاصل کر سکتی ہے۔ اس حق کے ثبوت میں نہ صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس پر عام طور سے عمل ہوتا ہے بلکہ یہ واقعہ بھی پیش کیا جا سکتا ہے کہ ادائیگی سے مستثنا قرار دیا جانا ایک بڑا اعزاز سمجھا جاتا ہے جو گزشتہ زمانوں میں یا تو بزور حاصل کیا جاتا تھا یا ریاست براہ راست انعام کے طور پر لوگوں کو بخشا کرتی تھی۔

4۔ رسم و رواج اور مختلف حالات کی بنا پر اکثر صورتوں میں زمین کے مالکوں اور قابضوں کو زمین سے فائدہ اٹھانے کا قریب قریب پورا حق حاصل ہے اور ان کے حقوق دخیل کاری قریب قریب استمراری ہیں لیکن پیداوار کا ایک حصہ ادا کرنے سے مستثنا قرار دئے جانے کا رواج کہیں نہیں پایا جاتا۔ یہ غیر معمولی طریقہ ہے۔ میرے خیال میں یہ امر نامناسب ہوگا کہ منڈی کے موجودہ بھاؤ کے مطابق سرکاری مطالبے کی قیمت رقم میں ہمیشہ کے لیے مقرر کر کے مالیات کے اس صحت مند اور مفید اصول کے خلاف ورزی کی جائے جس کی طرف میں اشارہ کر چکا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ قیمتوں اور اجرتوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے جس کے نتیجے میں انتظامی اخراجات میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے اگر زمین سے ہونے والی سرکاری آمدنی بحال رہے یا قریب قریب بحال رہے، جیسا کہ استمراری تشخیص کی صورت میں ہونا لازمی ہے، تو بلاواسطہ دونوں قسم کے محاصل میں اضافہ ناگزیر ہو جائے گا۔

5۔ آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ اس تحریر میں صرف رقم کی شکل میں مطالبہ مقرر کرنے کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے اور میں اس بات کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ میں مجموعی پیداوار کے اس منصفانہ اور مناسب حصے میں کسی تبدیلی کی وکالت نہیں کر رہا ہوں جو موجودہ تشخیص کی بنیاد ہے۔ لیکن پیداوار کی قیمتوں میں چونکہ ہر سال اضافہ ہو رہا ہے اس لیے میں اس کو بندوبست کی ابتدائی شرطوں کے خلاف ورزی نہیں سمجھوں گا۔ نہ اس کو کسان خلاف ورزی سے تعبیر کرے گا، اگر اس تجرباتی بندوبست کی مدت ختم ہونے کے بعد زمین کے محصول میں

بڑھتی ہوئی قیمتوں اور دوسرے حالات سے مطابقت پیدا کر دی جائے بشرطیکہ اس طویل مدت میں کوئی نظرثانی نہ کی گئی ہو اور اگر کی گئی ہو تو انتہائی مناسب و موزوں بنیادوں پر اور مسلّمہ واقعات کی بنا پر کی گئی ہو۔

6- یہ نتیجہ اس قسم کی تیس سالہ بندوبست سے حاصل ہو سکتا ہے جو پریزی ڈنسی کے بڑے حصے میں کیا جا چکا ہے اور بقیہ حصوں میں کیا جا رہا ہے۔ تشخیص میں جس اعتدال سے کام لیا گیا ہے اس نے حق دخیل کاری کی قیمت بہت بڑھا دی ہے اور اس بندوبست کی بنا پر کچھ اضلاع میں لوگوں کی خوشحالی میں بڑا اضافہ ہو گیا ہے۔ لیکن مجھے مرحوم کرنل بیرڈ اسمتھ کی اس رائے سے اتفاق نہیں کہ ان نتائج سے بہتر نتائج حاصل کرنے کے لیے جو اس کے بیان کردہ ان نتائج سے مطابقت رکھتے ہوں۔ جو شمال 'جنوبی صوبجات کے بندوبست کے بعد حاصل ہوئے تھے' مال گزاری کا بندوبست استمراری کرنا ضروری ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان نتائج کی بڑی وجہ ہمارے بندوبست کے وہ دوسرے عناصر ہیں جن کا اس نے ذکر کیا ہے یعنی "حقوق کا تحفظ اور اعتدال پر مبنی تشخیص" اور سب سے بڑھ کے "حقوق کا اعتراف اور احتیاط کے ساتھ سرکاری کاغذات میں اندراج۔" اس کے لیے صرف "سرکاری مطالبے کا استمراری تعین" کافی نہیں۔

7- واقعہ یہ ہے کہ مدتوں تک اس پریزی ڈنسی میں حکومت اور غریب کسانوں کے علاوہ کسی اور کو تسلیم نہ کر کے رعیت داری طریقے کی تکمیل کی کوشش ہوتی رہی ہے اور حکومت کی مدد کرنے کے سلسلے میں کسانوں پر زیادہ سے زیادہ بار ڈالا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اکا دکا ساہوکاروں کے علاوہ اس طریقے نے زمین اور زمین کے باسیوں کو بہت نقصان پہنچایا۔ اس کا نتیجہ وہی ہوا جو کسی ایسی حکومت کے تحت ہونا چاہیے۔ جس کی مالی حالت خراب ہو' جس کے پاس تقاوی دینے کے لیے روپیہ نہ ہو اور ایسا کوئی ذخیرہ نہ ہو جو قلت کے زمانے میں بیج کی ضرورت پوری کر دے۔ صوبے کو تقریباً دو سو سال کی جنگیں اور غارت گری پہلے ہی ویران کر چکی تھی۔ اب وہاں مسلسل جلنے والی چھوٹ اور گانو کی بڑھتی ہوئی بربادی عام ہو گئی۔ آخر کار حکام نے زراعت کو دوبارہ فروغ دینے کا تہیہ کیا۔ میرے خیال میں بہتر یہ ہوتا کہ کچھ ایسے حقوق تسلیم کر لیے جاتے جو سوخت ہو چکے تھے اور ان کی تجدید کر دی جاتی۔ لیکن پرانی عادتوں اور ان پیش رودوں کی قائم کردہ مثالوں کی بنا پر' جن کی جنگوں' بے پناہیوں اور مظالم نے مالکان اراضی کے معزز طبقوں کو ختم کر دیا تھا کامیابی کے وہ بہترین عوامل نظر سے اوجھل ہو گئے جن کا انحصار دولت اور ساکھ پر ہوتا ہے۔

چنانچہ انھوں نے ان لوگوں کے لیے جو زیادہ تر فضول خرچ مسلمانوں کے بجائے جفاکش ہندوؤں پر مشتمل تھے، وہ بہتر سے بہتر طریقہ اختیار کیا جو ان کے امکان میں تھا۔ پیمائش کے بعد انھوں نے جو تشخیص کی اس میں اعتدال سے کام لیا گیا۔ اس وقت یہ کارروائی جاری ہے اور تیس سال کی مدت کے لیے بندوبست کیا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ برطانوی علاقے کے اس حصے میں پہلی دفعہ اس امر کی کوشش کی جا رہی ہے کہ کاشت میں اضافہ کیا جائے اور اس کو ترقی دی جائے اور لوگوں کی ہمت افزائی کی جائے کہ وہ باہر سے آکر اس علاقے میں آباد ہوں اور اپنی تعداد بڑھائیں۔ اگر موجودہ بندوبست سے یہ توقع کی جائے کہ وہ ہمارے مطالبے پر حدود عاید کر دے گا تو اس کو زمین کا محصول وصول کرنے کے سرکاری حق کو نظر انداز کرنے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ باحیثیت اور بااثر زمین داروں اور میراث داروں کے طبقوں کی تجدید سے قطع نظر اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ بندوبست کی مدت اتنی ہونی چاہیے (اور اس کے لیے تیس سال کی مدت کم نہیں) کہ اس سے دو مقصد حاصل ہو سکیں۔ حکومت کے انصاف اور اعتدال پر مبنی مطالبے میں آئندہ اضافہ کیا جا سکے اور کسان کو اس پر آمادہ کیا جا سکے کہ وہ اپنی میراثی جوت کو ترقی دینے کے لیے امکانی محنت سے کام لے اور اپنی چھوٹی سی پونجی میں سے زیادہ سے زیادہ رقم صرف کرے۔

8- میرے خیال میں زمین کے محصول کا استمراری تعین کرنے کے خلاف ایک اور وقیع دلیل پیش کی جا سکتی ہے۔ غیر جانب داری سے اگر کام لیا جائے تو اس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ زمین پر قبضہ ابھی اس نوعیت کا نہیں ہے جسے آسانی سے ایک ایسے حق کی بنا پر قرار دیا جا سکے جس کی زیادہ قدر کی جاتی ہے اور جس کو لوگ زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ پیمائش کی بنیاد پر ہونے والے بندوبست کے تحت کسان کا حق دخیل کاری لاکھ محفوظ سہی پھر بھی میراث کا لفظ اس کے دل میں ملکیت کا ایسا احساس پیدا کرتا ہے جو اس یقین دہانی سے پیدا نہیں کیا جا سکتا کہ جب تک وہ سرکاری مالگزاری ادا کرتا رہے کھیتوں پر اس کا قبضہ بحال و برقرار رہے گا۔ ابھی کچھ دن پہلے ایک ذہین پٹیل نے اس کو واضح کر دیا۔ اس کے خیالات معلوم کرنے کے لیے اس سے سوال کیا گیا کہ وہ اپنی "میراث" اور گھٹ کولی زمین میں نسبتاً کس کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ اس نے جواب دیا "میراث میری ہے گھٹ کولی آپ کی ہے"۔ اس کے بعد ایک اور موقع پر ایک ہندوستانی ڈپٹی کلکٹر اور ایک تجربہ کار ماملت دار نے میری موجودگی میں کہا تھا "وہ میراث کو بہت عزیز رکھتے ہیں"۔

9- آئندہ نئے مستقل محاصل عاید کرنے کے امکان کے سیاق وسباق میں بھی مجھے اس تجویز سے

اتفاق نہیں کہ ریاست زیادہ رقم حاصل کرنے کے اس حق سے دست بردار ہو جائے جو بڑھتی ہوئی قیمتوں کی بنا پر اس زرخیز زمین کی پیداوار کا ایک حصہ حاصل کرنے کے سرکاری حق میں مضمر ہے جس کے لیے کم لاگت اور کم محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ایسا حق ہے جو زمانہ قدیم سے ریاست کو حاصل ہے اور جس کی بنا پر کچھ مدت پہلے تک اس ملک کے لوگ محاصل کے اس بارے قریب قریب محفوظ تھے جن کا بھاری بوجھ یورپ کی قوموں کو کچل رہا ہے۔

10- اگر اس دانشمندانہ طریقے کو ترک کیا گیا تو مجھے بڑا دکھ ہوگا۔ اس کے علاوہ مجوزہ اقدام کی ضرورت بھی نہیں محسوس ہوتی ہے۔ سب لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ کسان ترقی کر رہے ہیں اور رفتہ رفتہ کچھ پونجی جمع کرتے جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ آب رسانی کے وہ ذرائع ایک منظم طریقے سے وجود میں لائے جا سکتے ہیں جو خشک سالی کے زمانوں میں ان کی حفاظت کے ضامن ہونے چاہئیں ان کی تعمیر کی ذمہ داری کوئی بندوبست استمراری نہیں لے سکتا۔ یہ حکومت کا فرض ہے کہ جب بھی وسائل دستیاب ہوں وہ آب رسانی کے ذرائع تعمیر کرے۔

11- اس صوبے میں تیس سال کا بندوبست کرنے کے لیے جس کی کارروائی جاری ہے، قانون سازی کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی گئی اور اب بھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کی جا رہی ہے۔

نظرثانی شدہ بندوبست

اس روداد کے پیراگراف 5 سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت بمبئی اس کو پسند نہیں کرتی تھی کہ "رقم کی شکل میں سرکاری مطالبے کا تعین ہمیشہ کے لیے کر دیا جائے" لیکن اس کی بھی موافقت میں نہیں تھی کہ "مجموعی پیداوار کے انصاف و اعتدال پر مبنی اس حصے میں کوئی تبدیلی نہیں کی جائے جس پر موجودہ تشخیص کی بنیاد قائم ہے" اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اصولی طور سے حکومت بمبئی ایسے بندوبست استمراری کے خلاف تھی جس میں مال گزاری کا تعین رقم کی شکل میں کیا جائے لیکن اس بندوبست استمراری کی حامی تھی جس میں جنسی مال گزاری مقرر کی جائے چونکہ پیداوار کی قیمتوں میں اس وقت اضافہ ہو رہا تھا اس لیے حکومت کا خیال تھا کہ اگلے بندوبست کے موقع پر قیمتوں کے تناسب سے مال گزاری بڑھ جائے گی۔

چار سال بعد ہونے والے دوسرے بندوبست میں اگر اس اصول پر عمل کیا جاتا اور قیمتوں کے تناسب سے مال گزاری میں اضافہ کیا جاتا تو بمبئی کے کسان فائدے میں رہتے۔ لیکن

اس قسم کے اصولوں کو اگر قانونی شکل نہ دی جائے اور غیر جانب دار عدالتیں ان کا تحفظ نہ کریں تو اتنے بڑے پیمانے پر ہونے والی کارروائیوں میں جن کی ذمہ داری انفرادی افسروں پر ہوتی ہے، اس کو بھول جانے کا بڑا امکان ہوا کرتا ہے۔ کم تنخواہیں پانے والے اور غیر تعلیم یافتہ ماتحت افسروں میں یہ خیال عام ہو گیا کہ حکومت چاہتی ہے کہ کسانوں سے زیادہ سے زیادہ مال گزاری وصول کی جائے، عارضی خوش حالی نے اعلا حکام کو اس پر آمادہ کر دیا ہے کہ مال گزاری میں بڑے اضافے کا مطالبہ کیا جائے اور چونکہ نئی شرح مقرر کرتے وقت نہ کسانوں سے مشورہ کیا گیا ہے نہ مال کی عدالتوں میں اپیلیں دائر کی گئیں ہیں اس لیے غیر ضروری اضافہ لازمی ہو گیا ہے۔

بندوبست پر نظر ثانی کی جو کارروائی 1866ء میں شروع کی گئی تھی اس کے دوران اس قسم کے واقعات پیش آئے۔ امریکہ کی خانہ جنگی کی وجہ سے لنکا شائر آنے والی امریکہ کی روئی کی درآمد میں رکاوٹیں پڑنے لگیں جس کی وجہ سے بمبئی میں کپاس کی کاشت بہت بڑھ گئی۔ عارضی خوش حالی کے کچھ آثار نظر آنے لگے تھے جس کو حکام نے مستقل خوش حالی سمجھا۔ چنانچہ پیمائش اور بندوبست کے افسروں نے مال گزاری کے مطالبے میں نا واجب حد تک اضافہ کر دیا۔

ہاؤس آف کامنز کی ایک کمیٹی کے سامنے 1873ء میں شہادت دیتے ہوئے ہندوستان کے ممتاز و نمایاں قوم پرست مسٹر دادا بھائی نوروجی نے اس خطرے کی طرف اشارہ کر دیا تھا انھوں نے کہا تھا کہ خوش حالی کے آثار غیر حقیقی اور عارضی ہیں اور مال گزاری میں ہونے والا بھاری اضافہ ظالمانہ اور غیر منصفانہ ہے۔ دکن میں بھی نئی تشخیص کے خلاف شکایتیں کی جا رہی تھیں لیکن کسی نے خطرے کی اس گھنٹی کو نہیں سنا۔

کسانوں کی شورش

جس کا خطرہ تھا وہ وقت آخر آ ہی گیا۔ خانہ جنگی ختم ہونے کے بعد امریکہ پھر انگلستان کو روئی برآمد کرنے لگا۔ ہندوستان میں کپاس کی کاشت کم ہونے لگی اور قیمتیں اور اجرتیں گرنے لگیں۔ دکن کے کسان وہ اضافہ شدہ مال گزاری ادا کرنے سے قاصر تھے جس کا مطالبہ کیا جاتا تھا۔ چونکہ ساہوکاروں کے خلاف قانونی سختی برتی جاتی تھی اور کسانوں کی ساکھ کم ہو گئی تھی اس لیے وہ قرض دینے کو تیار نہیں تھے۔ چنانچہ 1875ء میں کسانوں کی ایسی شورش پھوٹ پڑی

جس کی مثال برطانوی حکومت میں شاذ ہی ملتی ہے۔ بلوے ہوئے، دکانیں اور مکان جلا دیے گئے اور ذخیرے برباد کر دیئے گئے۔ اس کی تحقیقات کے لیے ایک کمیشن مقرر ہوا۔ شمالی ہندوستان کے ایک سول ملازم اور کمپنی کے دو سول ملازموں کے سپرد ہنگاموں کے اسباب دریافت کرنے کا کام کیا گیا۔ اس کا مقصد بمبئی کے سول ملازموں کو بدنام کرنا نہیں پھر بھی یہ کہنا پڑتا ہے کہ سب سے زیادہ قابلیت اور سب سے زیادہ غیر جانب داری کا مظاہرہ اس یاد داشت میں کیا گیا تھا جو شمالی ہندوستان کے سول ملازم آکلینڈ کولون (ANCK lANDColiN) نے تیار کی تھی جس نے کچھ مدت بعد سر آکلینڈ کالون کے نام سے شمالی ہندوستان کے لفٹیننٹ گورنر اور ہندوستان ممبر مالیات کے فرائض ادا کئے۔

آکلینڈ کالون کے خیالات

آکلینڈ کالون نے اپنی یاد داشت[1] میں بتایا کہ حالیہ بندوبست میں مال گزاری میں کس حد تک اضافہ کیا گیا۔

"اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مندرجہ بالا پانچ تعلقوں کے گانوؤں میں، جن کی شائع شدہ رپورٹیں میرے پیش نظر ہیں، تیس سال میں مندرجہ ذیل اضافے کئے گئے

تعلقہ	ابتدائی بندوبست کے پہلے دور کی وصولیابیات روپے	تیس سال کی مدت ختم ہونے کے بعد نظرثانی شدہ تشخیص روپے	پہلے دور کی وصولیابیوں سے تیسویں سال میں ہونے والے اضافو کا فی صد تناسب
اندا پور	65,220	1,24,506	90
حویلی	64,452	1,34,189	108
پابل	66,508	1,52,228	85
سوپا	48,856	81,943	68
بھیم تھاری	43,407	1,29,842	199

(1) یاد داشت مورخہ 8 نومبر 1875ء۔

"حقیقی اضافہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پرانی پیمائش کے پہلے سال میں ہونے والی وصولیابی کے مقابلے میں پہلی دہائی میں ہونے والی وصولیابی بہت زیادہ تھی کرنل فرانسس کے پیش کردہ ایک نقشے سے ظاہر ہوتا ہے کہ پرانے بندوبست کے آخری سال کی تشخیص اور نئے بندوبست کے پہلے سال کی تشخیص میں اضافہ کا فی صد تناسب مندرجہ ذیل تھا

تعلقہ	فی صد تناسب
اندا پور	56
پابل	48
حویلی	66
بھیم تھڑی	63
سوپا	32

"شمالی ہندوستان میں پرانے بندوبست کے پہلے سال کے مقابلے میں نئے بندوبست کے پہلے سال میں (تیس سال کی مدت) زیادہ سے زیادہ اضافہ 36 فی صد ہوا۔ اس کو مستثنیات میں سے سمجھنا چاہیے۔ اس لیے کہ گورکھپور اور بستی کے ضلعے جو حال میں صاف کرکے زیر کاشت لائے گئے تھے۔ صوبے میں اوسطاً اضافہ 16 فی صدی ہوا تھا۔"

میرا خیال ہے کہ مندرجہ بالا واقعات کے پیش نظر میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ جن خصوصی اسباب کی بنا پر پونا کے ضلع میں قرض خواہ اور قرض دار کے تعلقات کشیدہ ہوئے ان میں سے تیسرا سبب نظر ثانی شدہ بندوبست میں ہونے والا بھاری اضافہ تھا۔"

شمالی ہندوستان کے اضافوں اور بمبئی کے اضافوں کے اس فرق کے متعلق کچھ کہنا فضول ہے جن کی طرف آکلینڈ کالون نے اشارہ کیا تھا۔ لیکن کالون نے بمبئی کے طریقے کی خرابیاں بھی بیان کی ہیں اور ضابطوں کے ذریعے ان پر قابو پانے کی ادھوری کوششوں کا بھی ذکر کیا ہے۔

338

آخری بات یہ ہے کہ جہاں تک اضافہ شدہ تشخیص اور لوگوں کی معاشی حالت کی باہمی مناسبت کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ بمبئی کا انتظامی طریقہ اگر میں اسے ٹھیک سمجھ سکا ہوں

کسان کے لیے دشواری کا باعث ہوگا۔ میں اس قسم کے خیالات کا اظہار کرنے میں خود کو حق بجانب نہ سمجھتا اگر مجھے یہ معلوم نہ ہوتا کہ ہز اکسی لینسی گورنر باجلاس کونسل نے حال میں جو رائے ظاہر کی ہے وہ میرے خیال کی تائید کرتی ہے۔ اس کا اقتباس میں آگے پیش کروں گا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تشخیص صرف اعداد و شمار کی بنیاد پر کی گئی ہے اور کسانوں کے اس طبقے کے حالات پر بہت کم غور کیا گیا ہے جس سے ادائیگی کی توقع کی جاتی ہے۔ اب جب کہ حقوق کی وضاحت کر دی گئی ہے اور سرکاری کاغذات میں ان کا اندراج ہو چکا ہے پیمائش کا محکمہ اضافہ شدہ مال گزاری کو علت نمائی کہنے لگا ہے:

"پھر وہ حکام جن کے سپرد تشخیص کا کام کیا گیا ہے ضلعوں کے انتظام سے نہ کوئی تعلق رکھتے ہیں نہ آئندہ رکھیں گے۔ جن حکام پر ضلعوں کے انتظام کی ذمہ داری ہے انھیں پیمائش اور تشخیص کے کام سے نہ اس وقت کوئی واسطہ ہے نہ پہلے کبھی کوئی واسطہ رہا ہے۔ چنانچہ یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ کلکٹر اور کمشنر مال ان شرحوں کے خلاف احتجاج کیا کرتے ہیں جو محکمہ پیمائش نے عائد کی ہیں:"

بمبئی کی حکومت نے کچھ دن پہلے زیادہ سے زیادہ اضافے کی حد مقرر کر کے اس بے قاعدگی پر قابو پانے کی کوشش کی۔ لیکن اس نے گتھی سلجھانے کے بجائے ڈور کو کاٹ دیا۔ اب بھی حکومت کی خصوصی منظوری حاصل کئے بغیر انفرادی جوت کے مطالبے میں سو فی صدی اور ایک گانو کے مطالبے میں 66 فی صدی اضافہ کیا جا سکتا ہے:

لوگوں کے خیالات

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس فاضلانہ دستاویز کا ایک اقتباس اور پیش کر دیا جائے جسے پونا سار وجنک سبھا نے تیار کیا تھا جو ہندوستان کی سب سے اہم اور باخبر سیاسی انجمن ہے۔ سبھا کی رپورٹ کے باب 3 میں درج پونا کے بلووں کے تحقیقاتی کمیشن PoonaRiots Commission کے اقتباسات اور مندرجہ ذیل ٹکڑا ظاہر کرتا ہے کہ بمبئی کے بندوبست میں تشخیص مال گزاری کے ان اصولوں کی خلاف ورزی کی گئی جو 1856ء میں کورٹ آف ڈائرکٹرز نے اور 1864ء میں سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا نے منظور کئے تھے۔

کاشت کے اخراجات کی منہائی کے بعد جس میں کسان اور اس کے خاندان کی اجرت بھی اور

زراعت کے لیے خریدے جانے والے سامان کی قیمتیں شامل ہونی چاہئیں' زمین کا جو خالص منافع ہے سرکاری مطالبہ اس کے ایک حصے پر مشتمل ہونا چاہیے۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ حکومت کا مطالبہ اور کولکن کے اضلاع میں وصول کیے جانے والے کھوٹ کے منافع مجموعی پیداوار کے نصف سے لے کر ایک تہائی حصے تک پر حاوی ہوتے ہیں۔ جس کے معنی بہر نوع یہ ہوتے ہیں کہ حکومت کی تشخیص کسانوں کا خون چوسنے کی بدترین مثال ہے۔ دیش کے اضلاع کے متعلق بھی بتایا جا چکا ہے کو سال ہر سال زمین جوتنے کی یہ نہیں کہ کسان کے ہاتھ میں مالک کے لگان کا کوئی جز یا کسان کا حقیقی منافع آتا ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ کھیتی باڑی کے کام میں وہ اور اس کا خاندان جو محنت کرتا ہے اس کی اجرت اس کو مل جاتی ہے۔ کاشت کے اخراجات (جن میں اس کی اجرت اور زراعت کے سامان کی قیمت شامل ہوتی ہے) اور سرکاری مطالبہ ادا کرنے کے بعد حقیقت میں کوئی فاضل پیداوار نہیں بچتی ہے۔

حکومت کی طرف سے کی جانے والی کاروائی

ان تمام معقول دلائل وحقائق کو بے سود ہی پیش کیا گیا۔ ان سے بندوبستوں کے کام اور طریقہ میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں ہو سکی۔ وہ کسانوں کو بیجا اضافوں سے محفوظ نہیں رکھ سکے۔ وہ ایسے ضابطے نہیں بنوا سکے جو کورٹ آف ڈائریکٹرز اور سکریٹری آف اسٹیٹ کے بنائے ہوئے زمین کے محصول کے اصولوں پر سختی سے عمل کروا سکیں۔ حکومت نے اپنے ملازمین کے لیے ایسے ضابطے بنانے سے انکار کر دیا۔ جیسے بنگال کے نجی مالکان اراضی کے اختیارات کم کرنے کے لیے بنائے گئے تھے حکومت نے صرف ساہوکاروں پر بندشیں عاید کر کے دکن کے کسانوں کو دکھوں سے نجات دلانے کی کوشش کی۔ 1879ء کے دکن ایگریکلچرسٹس ریلیف ایکٹ (DECCAN AGRICULTURISTS RELIEF ACT) کا مقصد صرف اتنا ہی تھا۔

اس ایکٹ کی رو سے عدالتیں اس امر کی مجاز ہو گئیں کہ چھوٹے چھوٹے قرض داروں کی حد تک دستاویز کے الفاظ کی پابندی کرنے کے بجائے یہ فیصلہ کر سکیں کہ کتنی رقم ادا کی جانی چاہیے اور بقیہ رقم سے انھیں بری الذمہ قرار دے سکیں۔ ان قرض داروں کا جن کے ذمے بڑی بڑی رقمیں تھیں۔ اس نے انسالوینسی ایکٹ (INSOLVENCY ACT) کے ذریعے تحفظ کیا۔ اس ایکٹ میں یہ رعایت بھی رکھی گئی تھی کہ رقم کی ڈگری جاری کرانے کی صورت میں کسان گرفتاری اور سزایابی سے محفوظ ہیں۔

ڈگری جاری ہونے کی صورت میں ان کی غیر منقولہ جائیداد بھی صرف اس صورت میں قرق و فروخت کی جاسکتی تھی اگر وہ خاص طور سے مکفول کی گئی ہو۔ ان صورتوں میں بھی عدالت کو اختیار حاصل تھا کہ وہ قرض دار کو ایک معینہ مدت تک قرض خواہ کی طرف سے زمین جوتنے کی اجازت دیدے مدت ختم ہونے کے بعد قرض بے باق سمجھا جاتا تھا۔

جہاں تک پیمائش اور بندوبست کے حکام کا تعلق تھا انھیں پہلے سے زیادہ اختیارات حاصل ہو گئے۔ 1873ء میں تشخیص کے خلاف ایک اپیل بمبئی کے ہائی کورٹ میں پیش کی گئی۔ ہائی کورٹ نے اپیل کا فیصلہ حاکم بندوبست کے خلاف کیا۔ اس کے فوراً بعد بمبئی کے ہائی کورٹ اور تمام دیوانی کی عدالتوں کو مال کے مقدمات کے اختیار سماعت سے محروم کرنے کے لیے ایک بل بمبئی کے کونسل میں پیش کیا گیا۔ جس ممبر نے بل پیش کیا تھا اس نے بل کے مقاصد کو چھپانے کے بجائے اس کی تشریح ان ناقابل فراموش الفاظ میں کی "اس بات کو خلاف مصلحت سمجھا جاتا ہے کہ دیوانی کی عدالتیں مال گزاری کے متعلق حکومت کی پالیسی پر یا تشخیص کی جانے والی مال گزاری کی جزویات پر نکتہ چینی کریں"۔ چنانچہ 1876ء کا بمبئی ریوینیو جورسڈکشن ایکٹ (BOMBAY RevenueJurisdiction) منظور ہوگیا جس نے دیوانی کی عدالتوں کو مال کے مقدمات کے اختیار سماعت سے محروم کر دیا۔ برطانوی حکومت اور برطانوی قوانین ایک عام شہری کو اس کا حق دیتے ہیں کہ وہ غیر جانب دار عدالتوں میں خود حکومت کے خلاف چارہ جوئی کر سکے۔ لیکن بمبئی اور مدراس کے لاکھوں حق ملکیت رکھنے والے کسان جنھیں بندوبست پر ہونے والی ہر نظر ثانی کے موقع پر بڑھتے ہوئے سرکاری مطالبے کا بار اٹھانا پڑتا ہے۔ عدالتوں یا کسی خصوصی عدالت میں حاکم بندوبست کی غلطیوں یا بیجا سختی کے خلاف چارہ جوئی کے حق سے محروم کر دئے گئے ہیں۔

اس ایکٹ کی منظوری کے تین سال بعد بمبئی کے نظام مال کے ہر پہلو پر بحث کی گئی اور اسے قانونی شکل دے کر 1879ء کا ضابطہ مال بنا دیا گیا۔ یہ واقعی بہت اچھا ضابطہ تھا جس میں جوت کے تعلق سے کسان کے حقوق وراثت و انتقال جائیداد کی تصدیق کر دی گئی تھی۔ لیکن 1856ء اور 1864ء کے اصولوں کے خلاف ورزی کرتے ہوئے جو تشخیص اور بیجا اضافے کئے جاتے تھے ان کے خلاف یہ ضابطہ کسان کا تحفظ نہ کر سکا۔

ہندوستان کی زرعی اصلاحات کا خلاصہ۔

ملکہ کی حکومت کے پہلے اٹھارہ سال میں ہندوستان کے مختلف صوبوں کے مالی نظام کا

اجمالی حال ان پانچ ابواب میں بیان کیا جا چکا ہے۔ بہت سی حقیقی اصلاحات بھی ہوئیں۔ نجی مالکان اراضی کے ہاتھوں لگان کے بیجا اضافوں کے خلاف بنگال، اودھ اور پنجاب کے کسانوں کا تحفظ کیا گیا۔ شمالی ہندوستان کے بندوبستوں کے طریقوں کو سدھارا گیا اور گاؤں کے مجموعی لگان کی واضح بنیادوں پر تشخیص کی جانے لگی۔ تیس سال کے بندوبست کا ضابطہ بنا کر مدراس کے کسانوں کو سہولت فراہم کی گئی۔ 1879ء میں منظور ہونے والے ایگریکلچرل ریلیف ایکٹ اور ضابطہ مال نے بمبئی کے کسانوں کی مدد کی۔ صوبجات متوسط میں مال گزاروں کے حقوق ملکیت کو تسلیم کر کے اور 1863ء میں طویل المدت بندوبست شروع کر کے مصیبت زدہ لوگوں کو دکھوں سے نجات دلائی گئی۔

زراعت کے میدان میں پائی جانے والی اہم خرابیوں کا خلاصہ چند لفظوں میں پیش کیا جاتا ہے۔

بندوبستوں پر نظرثانی کے وقت کئے جانے والے اضافوں کی حد قائم کرنے کے لیے کوئی واضح اور خصوصی ضابطے نہیں بنائے گئے۔

نصف مجموعی لگان کے ضابطے کی بنیاد پر تشخیص نہیں کی جاتی تھی بلکہ مدراس اور بمبئی میں تو اکثر پورے مجموعی لگان پر حاوی ہوا کرتی تھی۔

ضابطوں کے عمل درآمد کی نگرانی غیر جانب دار عدالتیں نہیں کرتی تھیں۔

مال گزاری کے علاوہ زمین پر لگائے جانے والے خصوصی محاصل کی بنا پر نصف مجموعی لگان کے ضابطے کی خلاف ورزی ہوتی تھی۔

باب 8

تجارت وصنعت

لارڈ کیننگ نے ہندوستان کے محاصل درآمد و برآمد میں ایک اہم اصلاح کی۔ ہندوستان آنے کے ایک سال بعد یعنی فروری 1857ء میں اس نے اس موضوع پر کورٹ آف ڈائریکٹرز کی توجہ دلائی۔ اس نے تجویز پیش کی کہ برطانوی اور بدیسی تجارتی مال پر یکساں محصول عاید کیا جائے چاہے وہ خام ہو یا تیار شدہ۔ اس کی خواہش تھی کہ ایسی بہت سی اشیا کو محصول سے مستثنا قرار دیا جائے جن سے بہت کم آمدنی ہوتی ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ محصول برآمد ختم کر دیا جائے اور محصول درآمد میں اضافہ کر دیا جائے۔ 1857ء کے غدر کے دوران یہ تجویزیں معرض التوا میں رہیں اور 1858ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ختم ہو گئی۔

ملک کے دور حکومت میں مقرر ہونے والے پہلے سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا لارڈ اسٹینلی نے اپریل 1859ء میں لارڈ کیننگ کو جواب دیا۔ غدر کی وجہ سے ہندوستان کی مالی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی تھیں اور مالیاتی دشواریوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ لارڈ اسٹینلی نے لارڈ کیننگ کی تجاویز میں ترمیم کر دی تاکہ زیادہ آمدنی ہو سکے۔ برطانوی اور بدیسی مصنوعات کے ساتھ یکساں برتاؤ کرنے کے لیے برطانوی مال پہ اس شرح سے محصول لگایا جائے جس سے بدیسی مال پر لگایا جاتا ہے چھوٹی موٹی اشیا پر محصول ختم نہ کیا جائے۔ محاصل برآمد سے دست بردار نہ ہوا جائے۔ محاصل درآمد میں اضافہ کیا جائے۔

یہ مراسلہ موصول ہونے سے پہلے ہی حکومت ہند 1859ء کا ایکٹ نمبر 7 بنا چکی تھی جس کی رو سے برطانوی مال پر لگنے والے محصول کی شرح وہ ہو گئی تھی جو بدیسی مال کی تھی اور رواں معاہدوں پر بھی زیادہ محصول لگانے کا اختیار حاصل ہو گیا تھا۔ سکریٹری آف اسٹیٹ کا مراسلہ ملنے کے بعد

لارڈ کیننگ نے جواب دیا کہ حال میں منظور ہونے والا ایکٹ قریب قریب ان ہدایتوں کے مطابق ہے جو مراسلہ میں درج ہیں۔

لیکن اس ایکٹ کی وجہ سے ہندوستان کے برطانوی تاجروں میں بڑی بے چینی پیدا ہو گئی اور ہندوستان کا پہلا ممبر مالیات جیمس ولسن جب ہندوستان روانہ ہونے لگا تو اسے ہدایت کی گئی کہ اس بے اطمینانی کو دور کرنے کی کوشش کرے جو اس ایکٹ کی بنا پر پھیل گئی تھی[1]۔ چنانچہ اس نے 1860ء میں ہندوستان کے خام مال پر لگنے والے محاصل برآمد منسوخ کر دیئے اور مصنوعات پر عاید ہونے والے محاصل درآمد میں بڑی تخفیف کر دی گئی۔ برطانوی تاجر تو مطمئن ہو گئے مگر ہندوستان کو ایسے وقت آمدنی سے دست بردار ہونا پڑا جب اسے روپے کی شدید ضرورت تھی۔

اسی سال ہندوستان کے محاصل درآمد و برآمد کی عام تفتیش کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی گئی۔ یہ کمیٹی کلکتہ اور بمبئی کے دو برطانوی تاجروں پر مشتمل تھی اور اس کا صدر ایشلے ایڈن ASHLEY EDEN تھا جو بعد میں بنگال کا لفٹیننٹ گورنر مقرر ہوا۔ کمیٹی نے 1860ء میں اپنی رپورٹ پیش کی جس میں یکساں محاصل اور محاصل میں اہم اصلاحات کی سفارش کی گئی تھی۔ ایک دوسری کمیٹی 1867ء میں مقرر کی گئی جس نے نظرثانی شدہ محاصل کا نقشہ پیش کیا۔ محاصل کا تیسرا نقشہ 1869ء میں بنایا گیا اور اس کے اگلے سال لارڈ میو کی حکومت نے 1870ء کا ایکٹ نمبر 17 منظور کیا۔ اس ایکٹ نے مصنوعات اور خام مال پر ½7 فی صدی، دھاگے پر ½3 فی صدی، کپڑے کے تھان پر 5 فی صدی، لوہے پر 1 فی صدی اور تمباکو پر 10 فی صدی محصول درآمد مقرر کیا۔ خاص خاص محاصل برآمد مندرجہ ذیل تھے۔ ایک من (82 پونڈ) نیل پر 6 شلنگ، ایک من غلے پر 3 پینس، لاکھ پر 4 فی صدی اور تیل، تلہن، سوتی کپڑوں، کھالوں اور شرابوں پر 3 فی صدی۔

اگلے سال 1871ء کے ایکٹ نمبر 13 کے ذریعے مزید تبدیلیاں کی گئیں۔ اس ایکٹ کے مقرر کردہ خاص خاص محاصل درآمد و برآمد ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

محاصل درآمد

کپڑے، اسلحہ، فرنیچر، موم بتیاں، گاڑیاں، گھڑیاں، کپاس وغیرہ	½7 فی صدی

---

(1) دیکھیے ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کے سامنے دی جانے والی سر بارٹل فریرے کی شہادت، 1871ء

سوتی دھاگہ	$3\frac{1}{2}$ فی صدی
کپڑے کے تھان	5 فی صدی
دوائیں	$7\frac{1}{2}$ فی صدی
رنگنے کا سامان	$7\frac{1}{2}$ فی صدی
بجلی شیشے کا سامان، کھالیں، جواہرات، ہاتھی دانت اور تیار شدہ کھالیں	$7\frac{1}{2}$ فی صدی
بیر	$1\frac{1}{2}$ پینس فی گیلن
تیز شرابیں	6 شلنگ فی گیلن
ہلکی شرابیں	3 شلنگ فی گیلن
لوہا	1 فی صدی
دوسری دھاتیں	$7\frac{1}{2}$ فی صدی
بحری بیڑے کا سامان، تیل، روغن، عطر، چینی کا سامان۔	
کھانے پینے کا سامان اور تیل نکالنے کا سامان۔	$7\frac{1}{2}$ فی صدی
ریشم	$7\frac{1}{2}$ فی صدی
شکر	$7\frac{1}{2}$ فی صدی
تمباکو	10 فی صدی
اونی کپڑے کے تھان	5 فی صدی

محاصل برآمد

سوتی کپڑا	3 فی صدی
مختلف قسم کے اناج	$4\frac{1}{2}$ پینس فی من
تیار شدہ کھالیں	3 فی صدی
نیل	6 شلنگ فی من
لاکھ اور لاکھ سے تیار کیا ہوا رنگ	4 فی صدی
تیل	3 فی صدی
تلہن اور مسالے	3 فی صدی

تجارت پر لگنے والے محاصل کے عمل درآمد کے متعلق ہاؤس آف کامنز کی ان سلیکٹ کمیٹیوں کے سامنے بیش بہا شہادتیں پیش کی گئیں جن کے اجلاس 1871، 1872، 1873 اور 1874ء میں ہوئے۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے اس ضخیم شہادت کے کچھ حصوں پر نظر ڈالی جائے۔

کلکتہ کے ایک اہم تاجر جان نٹ بولن (JOHNNUTT BULLEN) نے، جو 1860ء میں لیڈن اسٹلے کی محاصل کی کمیٹی کا رکن رہ چکا تھا، اناج پر لگنے والے 4½ پینس فی من محصول درآمد کے خلاف احتجاج کیا اور کہا کہ اس کا بوجھ دھان پیدا کرنے والے پر پڑتا ہے اور اس لیے اس کو زمین کے محصول میں اضافے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن سوتی کپڑے پر لگنے والا 5 فی صدی محصول درآمد اس کے خیال میں مناسب تھا اور اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا تھا۔[1] کلکتہ میں اس وقت صرف دو یا تین سوت کاتنے اور کپڑا تیار کرنے کے کارخانے تھے۔

سر ہارٹل فریرے نے محتاط الفاظ میں برطانوی مال کی فروخت کو فروغ دینے کے لیے سوتی کپڑے پر محصول درآمد کم رکھنے کی ضرورت کا ذکر کیا۔ اس نے کہا "مشکل یہ ہے کہ جہاں تک سوتی کپڑے کا تعلق ہے ہندوستان اور انگلستان کے مفادات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کپڑے اور سوت وغیرہ پر زیادہ محاصل درآمد لگا کر آمدنی میں بڑا اضافہ کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے نتیجے میں مانگ کم ہو جائے گی اور مقامی پیداوار میں اضافہ ہو جائے گا۔[2]

لیکن والٹر کیسلز (WALTER CASTLES) نے جو بمبئی میں تجارت کرتا تھا اور بمبئی کی لیجسلیٹو کونسل کا رکن رہ چکا تھا، یہ دلیل پیش کی کہ سوتی مال پر لگنے والا 5 فی صدی محصول درآمد بھی کم ہونے کے باوجود 'حفاظتی محصول' کا کام کرتا ہے۔ بمبئی کی ابھرتی ہوئی سوت کاتنے اور کپڑے بننے کی صنعت سے وہ حسد کرتا تھا۔ "میں کہتا ہوں کہ وہ حفاظتی محاصل ہیں۔ لیکن میں صرف اس بنا پر انھیں منسوخ کرنے کی وکالت نہیں کر رہا ہوں۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ بات آپ کے علم میں ہے یا نہیں کہ صرف بمبئی کی پریزیڈنسی میں سوتی کپڑے کے بارہ کارخانے ہیں جن میں (یقیناً مانچسٹر کے مقابلے میں یہ تعداد بہت کم ہے) 3,19,394 تکلے اور 4,199 کرگھے ہیں اور 8,170 مزدور کام کرتے ہیں۔ میرے خیال میں وہ ہر سال 62,000 روئی کی گانٹھیں استعمال کرتے ہیں جن کی

---

(1) سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ، 1871ء سوال نمبر 6014۔

(2) سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ 1871ء سوال نمبر 8608۔

میں سے ہر ایک کا وزن 400 پونڈ ہوتا ہے۔

ہندوستان کے برطانوی حکام بمبئی کی نئی نئی سوتی کپڑے کی صنعت کی ترقی پر حسد کرنے کے بجائے اطمینان کا اظہار کیا کرتے تھے۔ لیکن ہندوستان کے انتظام کے معاملے میں وہ برطانوی تاجروں اور برطانوی رائے دہندگان کے تابع تھے۔ تجربہ کار اور بزرگ سر چارلس ٹریویلین نے جو پچھلی نسل کے حاکموں کے تحت ہندوستان میں شاندار اور نمایاں خدمات سرانجام دے چکا تھا اور اپنی عمر کے آخری دور میں مدراس کا گورنر اور ہندوستان کا ممبر مالیات رہ چکا تھا، برطانوی صنعت کاروں کے حکم کی تعمیل میں ہندوستان کی جائز آمدنی قربان کر دینے کے خلاف احتجاج کیا۔ اس نے کہا، حالانکہ پچھلے دس سال میں ہندوستان کی تجارت 6,00,00,000 پونڈ سے بڑھ کر 10,60,00,000 پونڈ ہو گئی لیکن محاصل کی آمدنی میں 10,13,500 پونڈ کی کمی ہو گئی۔ اگر محاصل درآمد و برآمد آمدنی کے جائز ذرائع ہیں تو پورے ہندوستان کے لیے 24,00,000 پونڈ کی رقم مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے(2)۔

لارڈ لارنس کو بھی یہ بات پسند نہیں تھی۔ ہندوستان کے وائسرائے کی حیثیت سے اس نے 1865 میں پٹ سن اور ہندوستان کی دوسری پیداواروں پر محصول درآمد برآمد بڑھانے کی کوشش کی تھی تاکہ مزید آمدنی ہو سکے اور ملک خسارے سے بچایا جا سکے۔ لیکن برطانوی مفادات زیادہ قوی ثابت ہوئے تھے اور سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا نے اس کی تجاویز رد کر دی تھیں۔ آٹھ سال بعد جب گواہ کی حیثیت سے مسٹر فاسٹ نے اس سے سوال کیا تو اس نے محتاط الفاظ میں ہندوستان کی مالیاتی پالیسی پر برطانوی تجارتی طبقوں کے اثر کے متعلق اپنے افسوسناک تاثرات ظاہر کیے۔

ہنری فاسٹ ——— جہاں تک محاصل برآمد کا تعلق ہے اگر محاصل برآمد میں اضافہ کرنے کی کوشش کی جائے اور مثلاً کپاس پٹ سن پر محصول برآمد لگایا جائے تو مقابلتاً اس محصول کی حد تک ہندوستان کی تجارت پر ناخوشگوار اثر پڑے گا اور اس کی وجہ سے انگلستان کے تجارتی طبقوں کا شدید دباؤ حکومت ہند پر پڑے گا۔ کیا یہ صحیح ہے؟

لارڈ لارنس ——— یہ بالکل صحیح ہے۔

---

(1) سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ 1871ء سوال نمبر 7962۔

(2) سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ 1873ء سوال نمبر 923۔

ہنری فاسٹ ــــ ان امور کے پیش نظر کہ ہندوستان کو اس ایوان میں نمائندگی حاصل نہیں ہے، ایوان میں اس کی بالواسطہ نمائندگی ہوتی ہے اور انگلستان کے تجارتی طبقوں کو بڑی تعداد میں نمائندگی حاصل ہے، کیا آپ کے خیال میں کوئی حکومت ایک لمحے کے لیے اس قسم کے محصول برآمد کی مخالفت کا مقابلہ کرسکتی ہے اگر وہ مخالفت ان طبقوں کی طرف سے ہو جو حق رائے دہندگی رکھتے ہیں"؟

لارڈ لارنس ــــ میرے خیال میں نہیں کرسکتی ہے۔

ہنری فاسٹ ــــ چنانچہ ان امور پر غور کرنے کے بعد کہ ہندوستان پر حکومت کس طرح کی جاتی ہے، یہ کہ ہندوستان پر حکومت ہاؤس آف کامنز کرتا ہے اور یہ کہ ہندوستان پر حکومت سکریٹری آف اسٹیٹ کرتا ہے جو بہرحال اس کابینہ کا رکن ہوتا ہے جس کی بقا کا انحصار ہاؤس آف کامنز کے ووٹوں پر ہوتا ہے، کیا آپ آمدنی میں اضافے کے لیے محصول برآمد پر بھروسہ کرسکتے ہیں؟

لارڈ لارنس ــــ میرا خیال ہے کہ نہیں کرسکتے ہیں[1]۔

یہ دکھلانے کے لیے کہ سکریٹری آف اسٹیٹ اور اس کی کونسل برطانوی تجارتی مفادات کے مقابلے میں ہندوستان کے مفادات کا کتنا تحفظ کرتے تھے یا کرسکتے تھے۔ مسٹر فاسٹ کے سوالوں کے جواب میں دیئے گئے لارڈ لارنس کے بیان کا ایک اور اقتباس پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ متعلقہ ٹکڑا اس تکلیف دہ حقیقت کو ظاہر کرتا ہے جس کا بیان آج بھی اسی حد تک باموقع ہے جتنا تیس سال پہلے تھا۔

فاسٹ جہاں تک سکریٹری آف اسٹیٹ اور اس کی کونسل کے باہمی مراسم کا تعلق ہے میرا خیال ہے کہ آپ نے اپنے پچھلے بیان میں ہند ــــ یورپ ٹیلیگراف کا حوالہ دیتے ہوئے، اور اسے ایک مثال کے طور پر پیش کرتے ہوئے، کہا تھا کہ جب یہ تجویز پیش کی گئی کہ اس ٹیلیگراف کے اخراجات کا پورا بار ہندوستان پر ڈالا جائے اور اس کے کسی حصے کا بار انگلستان پر نہ ڈالا جائے تو سکریٹری آف اسٹیٹ کی کونسل میں اس کے خلاف احتجاج کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس لیے کہ کونسل کے ممبر کوئی سیاسی اثر نہیں رکھتے تھے اور سکریٹری آف اسٹیٹ پر جو خارجی اثرات پڑے ان کا مقابلہ وہ نہ کرسکے۔

---

(1). سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ 1873ء سوالات نمبر 5560 - 5562۔

لارڈ لارنس ـــــ میں نے کہا تھا کہ جہاں تک عمل کا تعلق تھا اس کا یہ نتیجہ نکلا۔ میرا خیال ہے کہ متعدد بار کونسل سکریٹری آف اسٹیٹ اور ان لوگوں کے درمیان حائل ہوئی جو ہندوستان میں اخراجات پر زور دیا کرتے تھے اور ان کا مقابلہ کیا۔ لیکن جب کوئی ایسا اہم معاملہ درپیش ہوا جس سے انگلستان کے تاجروں کے مفادات و جذبات وابستہ تھے تو میرے خیال میں کونسل موثر انداز میں مخالفت نہ کر سکی۔

فاسٹ ـــــ کیا ان کے تقرر اور ہندوستان کی آمدنی پر ان کا بار ڈالنے کا مقصد اس کے علاوہ کچھ اور ہے کہ وہ مخالفت کریں؟ ان کے تقرر کا بڑا مقصد کیا یہ نہیں ہے؟ اگر یہ مقصد نہیں ہے تو جو فرائض وہ ادا کرتے ہیں دوسرے سرکاری محکموں کی طرح وہ فرائض مستقل ملازم یا انڈر سکریٹری ادا کر سکتے ہیں۔ اگر وہ سمجھتے ہیں کہ یہ خرچ بیجا ہے تو انھوں نے کیوں نہیں کہا؟ انہیں ہندوستان کی آمدنی میں سے تنخواہ ملتی ہے۔ ہمیں اس سیاسی دباؤ کی پروا نہیں ہے جو سکریٹری آف اسٹیٹ پر ڈالا جا سکتا ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں اس خرچ کو منظور کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتی جس کو ہم ہندوستان کے مفادات کے پیش نظر بیجا سمجھتے ہیں۔

لارڈ لارنس ـــــ میرا خیال ہے کہ کونسل نہ ہوتی تو عملی سطح پر اس قسم کی مشکل پیش آتی۔ کونسل خامیوں سے پاک نہ سہی یا یہ کہیے کہ سکریٹری آف اسٹیٹ اور ان لوگوں کے درمیان پوری طرح حائل نہ سہی جو ہندوستان پر اخراجات کا بیجا بار ڈالتے ہیں پھر بھی وہ اس سلسلے میں بہت کچھ کرتی رہتی ہے۔ میں اس پانچ سال کے تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں جو میں نے کونسل میں گزارے کہ کونسل نہ ہوتی تو ہندوستان پر وہ بڑے بڑے بار ڈالے جاتے جو کونسل کے احتجاج کی بنا پر اس پر نہ ڈالے جا سکے۔

فاسٹ ـــــ پھر بھی اس بحث میں پڑے بغیر کہ کونسل سے کوئی فائدہ ہے یا اس کو موقوف کر دینا بہتر ہوگا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے مفادات کے پیش نظر انھوں نے اس کو اپنا اولین فرض کیوں نہیں سمجھا کہ وہ ان سیاسی اثرات کا مقابلہ کریں۔ ہم یہ کیوں نہیں کہہ سکتے کہ انھوں نے مقابلہ نہ کر کے اپنے اس اہم فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کی جس کی طرف آپ اشارہ کر رہے ہیں اور یہ نہیں کہا کہ دنیا کی کوئی طاقت انھیں ان اخراجات کی منظوری پر آمادہ نہیں کر سکتی جنھیں وہ ہندوستان کے لوگوں کے نقطۂ نظر سے بیجا سمجھتے ہیں۔ انھیں تنخواہیں اسی کام کے لیے دی جاتی ہیں۔

لارڈ لارنس ــــ نظری اعتبار سے یہ کام بہت آسان معلوم ہوتا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ عملی سطح پر یہ بہت دشوار ہے۔ اس کے علاوہ میرا یہ خیال ہے کہ کونسل نے اگر یہ رویہ اختیار کیا [illegible] تو وہ اس میں کامیاب نہ ہوتی۔ پارلیمنٹ میں یا کہیں اور اس قسم کی تحریک شروع ہو جاتی جس کی بنا پر غالباً کونسل ختم کر دی جاتی یا اس کے اختیارات اتنے کم کر دیئے جاتے کہ وہ جتنا کام ابھی تک کرتی رہی ہے اتنا بھی نہ کر پاتی۔"[1]

کمپنی کی حکومت کے آخری برسوں میں ہندوستان کی مجموعی درآمدات و برآمدات ایک گزشتہ باب میں دی جا چکی ہے۔ ہم ذیل میں ملکہ کی حکومت کے پہلے انیس سال یعنی 1859ء سے 1877ء تک کے اعداد و شمار پیش کر رہے ہیں۔ یہ اعداد و شمار "برطانوی ہند کے متعلق اعداد و شمار کا خلاصہ" (Statistical Abstracts relating to British India) سے حاصل کئے گئے ہیں جو ہر سال شائع ہوتا تھا اور پارلیمنٹ میں پیش کیا جاتا تھا۔

تمام ملکوں کے ساتھ ہندوستان کی تجارت

سال تخمینہ	تجارتی مال کی درآمد پونڈ	چاندی سونے کی درآمد پونڈ	مجموعی درآمدات پونڈ	مجموعی برآمدات پونڈ
1859ء	2,17,28,579	1,28,17,071	3,45,45,650	3,05,32,298
1860ء	2,42,65,140	1,63,56,963	4,06,22,103	2,88,89,218
1861ء	2,34,93,716	1,06,77,077	3,41,70,793	3,40,90,154
1862ء	2,23,20,432	1,29,51,985	3,72,72,417	3,70,00,397
1863ء	2,26,32,384	2,05,08,967	4,31,41,351	4,89,70,785
1864ء	2,71,45,590	2,29,62,581	5,01,08,171	6,68,95,884
1865ء	2,81,50,923	2,13,63,352	4,95,14,275	6,94,71,791
1866ء[2]	2,95,99,228	2,65,57,301	5,61,56,529	6,76,56,475

(1) سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ، 1873ء سوالات نمبر 5597-5599۔

(2) 1866ء تک سرکاری سال 30 اپریل کو ختم ہوا کرتا تھا۔ 1867 کے بعد سرکاری سال 31 مارچ کو ختم ہونے لگا چنانچہ 1867 کے اعداد و شمار صرف گیارہ مہینے کے ہیں یعنی یکم مئی 1866ء سے 31 مارچ 1867ء تک۔

1867ء	2,90,38,715	1,32,56,904	4,22,75,619	4,42,91,497
1868ء	3,57,05,783	1,17,75,374	4,74,81,157	5,24,46,002
1869ء	3,59,90,142	1,51,55,954	5,11,46,096	5,44,57,745
1870ء	3,29,27,520	1,39,54,807	4,68,82,327	5,35,13,729
1871ء	3,44,69,119	54,44,823	3,99,13,942	5,75,56,951
1872ء	3,20,91,850	1,15,73,813	4,36,65,663	6,46,85,376
1873ء	3,18,74,625	45,56,585	3,64,31,210	5,65,48,842
1874ء	3,38,19,828	57,92,534	3,96,12,362	5,69,10,081
1875ء	3,62,22,113	81,41,047	4,43,63,160	5,79,84,549
1876ء	3,88,91,656	53,00,722	4,41,92,378	6,02,91,731
1877ء	3,74,40,631	1,14,36,120	4,88,76,751	6,50,43,789

مندرجہ بالا اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ غدر کے بعد پہلے دو برسوں میں ہندوستان کی درآمدات کے مقابلے میں برآمدات زیادہ تھیں اور اس کے بعد کے دو برسوں میں درآمدات قریب قریب برآمدات کے برابر تھیں۔ یہ برابری زیادہ دن تک برقرار نہیں رہی۔ اپریل 1863ء میں ختم ہونے والے سال میں ہندوستان کی برآمدات اس کی درآمدات سے بقدر چھ ملین زیادہ تھیں۔ یہ فرق بڑھ کے 1864ء میں سولہ ملین اور 1865ء میں بیس ملین ہوگیا۔ اس کے بعد پانچ سال تک یہ فرق کم ہوتا رہا لیکن 1860ء کے بعد یہ فرق مسلسل پندرہ سے بیس ملین پونڈ سالانہ ہوتا رہا۔ ملکہ کی حکومت قائم ہونے کے فوراً بعد ہندوستان سے ہونے والے بھاری اور تباہ کن دولت کے نکاس کے مقابلے میں وہ خراج بہت کم تھا جو کمپنی کے زمانہ حکومت میں ہندوستان کو ادا کرنا پڑتا تھا۔ جیسا کہ ہم ایک پچھلے باب میں دیکھ چکے ہیں۔ کمپنی کی حکومت کے آخری برسوں میں ہندوستان کی درآمدات و برآمدات کا فرق تین چار ملین سالانہ ہوا کرتا تھا۔

حکومت تبدیل ہونے کے بارہ سال کے اندر ہندوستان سے ہونے والا دولت کا نکاس چار گنا ہوگیا۔ ہندوستان اس بڑھتے ہوئے مسلسل دولت کے نکاس کی وجہ سے نقصان اٹھاتا رہا اور وسیع پیمانے پر بار بار پڑنے والے ان قحطوں کے لیے میدان تیار ہوتا رہا جو انیسویں صدی کے آخری پچیس سال میں پڑے۔ وہ دولت کے ایسے نکاس کے فطری معاشی نتیجے تھے جسے دنیا کا

کوئی ملک برداشت نہیں کرسکتا تھا۔

ہندوستان تو نقصان اٹھاتا رہا لیکن برطانوی قوم کو بھی قومی سطح پر کوئی فائدہ نہیں ہوا اگر ہندوستان کی خوش حالی اور دولت میں اضافہ ہوگیا ہوتا تو برطانوی صنعت کار و تاجر، جن پر برطانوی قوم مشتمل تھی، ہندوستان سے بڑھتی ہوئی تجارت کی بنا پر زیادہ منافع کماتے۔ لیکن غریب لوگ بدیسی اشیا کے اچھے صارفین بن سکتے نہیں۔ دنیا کے تمام ملکوں سے ہندوستان میں درآمد ہونے والے تجارتی مال میں تھوڑا سا اضافہ ہوا۔ 1866ء میں اس مجموعی مالیت 36 ملین پونڈ تھی جو 1877ء میں بڑھ کر ½37 ملین پونڈ ہوگئی۔ اس میں آدھے سے زیادہ برطانوی مال تھا۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ دس سال میں برطانوی مصنوعات کی مانگ میں مشکل سے ایک ملین کا اضافہ ہوا۔

اگر ہم درآمد و برآمد ہونے والی خاص خاص اشیا پر نظر ڈالیں تو ہندوستان کے ساتھ ہونے والی تجارت کی نوعیت زیادہ واضح ہو جائے گی۔ خاص خاص درآمدات اس نقشے میں دکھائی گئی ہیں۔

ہندوستان میں تمام ملکوں سے ہونے والی درآمدات

سال	سوتی دھاگا اور سوت پونڈ	سوتی کپڑا پونڈ	ریشمی کپڑا پونڈ	اونی کپڑا پونڈ	مشینیں پونڈ	دھات کا سامان پونڈ
1859ء	17,14,216	80,88,927	1,47,740	2,94,258	5,87,566	4,47,011
1860ء	20,47,115	86,51,813	2,24,116	3,58,557	8,71,531	4,54,467
1861ء	17,48,183	93,09,935	2,59,296	2,22,813	8,70,251	3,86,748
1862ء	14,72,484	87,72,916	1,98,442	2,45,650	5,53,883	3,83,694
1863ء	12,70,301	83,60,229	3,42,111	2,96,221	5,06,518	4,24,188
1864ء	15,29,001	104,16,660	4,56,781	6,11,570	5,85,516	4,18,673
1865ء	21,91,440	1,10,35,885	4,43,949	8,67,831	5,54,156	6,08,104
1866ء	19,61,144	1,18,49,214	3,57,380	5,83,132	5,86,182	6,47,205
1867ء	25,72,700	1,25,24,106	4,15,070	5,76,481	6,01,740	3,59,422
1868ء	26,98,350	1,49,99,917	4,23,598	6,01,957	10,57,861	

1869ء	27,79,934	1,60,72,551	4,86,518	7,64,173	7,93,183	علاحدہ اعداد و شمار نہیں ملے
1870ء	27,15,370	1,35,55,846	4,66,593	5,96,713	5,55,742	
1871ء	33,57,393	1,56,87,476	4,25,527	5,83,220	4,47,543	
1872ء	24,24,522	1,50,58,811	4,80,948	5,14,194	4,05,855	
1873ء	26,28,296	1,46,05,958	5,60,646	7,19,530	5,17,316	
1874ء	26,28,959	1,51,55,666	6,08,374	6,68,911	10,02,347	
1875ء	31,57,780	1,62,63,560	7,10,478	5,57,585	11,85,943	
1876ء	27,94,769	1,64,50,212	7,08,866	8,69,760	13,91,667	4,75,338 (1)
1877ء	27,33,514	1,59,91,719	5,84,789	8,11,652	8,82,373	4,40,190

ہندوستان میں درآمد ہونے والے سوتی کپڑے کی مالیت غدر کے زمانے میں پانچ ملین پونڈ تھی لیکن 1859ء میں وہ تیزی سے بڑھ کے آٹھ ملین پونڈ اور اگلے دس میں اس کی دگنی ہوگئی ہندوستان کے لوگ 1859 میں جتنا سوتی کپڑا استعمال کرتے تھے 1859ء میں اس سے زیادہ استعمال نہیں کرنے لگے تھے۔ درآمد ہونے والے کپڑے میں اضافہ ظاہر کرتا ہے کہ اسی حد تک ہندوستان میں کپڑا کم تیار ہوا۔ معاشی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو لوگوں کو سستے کپڑے سے فائدہ ہوا لیکن کپڑے کی صنعت کو پہنچنے والے نقصان کی وجہ سے انھیں فائدے سے کہیں زیادہ نقصان ہوا۔ اس نقصان کی تلافی کسی دوسری صنعت سے نہیں کی گئی اور لاکھوں بنکر کھیت مزدوروں میں تبدیل ہوگئے جس کی وجہ سے زمین پر پڑنے والا بوجھ بڑھ گیا۔

یہی حال ریشمی اور اونی کپڑے کی مانگ کا تھا۔ ریشمی کپڑے کی درآمدات ۵ ملین پونڈ سے بڑھ کے چھ ملین پونڈ ہوگئیں اور اونی کپڑے کی تین لاکھ پونڈ سے بڑھ کے آٹھ لاکھ پونڈ ہوگئیں۔ ان درآمدات کی حد تک کپڑا سازی کی ہندوستانی صنعت کم ہوگئی۔

آخری سال یعنی اس سال میں جو 31 مارچ 1877ء کو ختم ہوا۔ درآمدات میں کمی کی وجہ جنوبی ہندوستان میں وسیع پیمانے پر پھیلی ہوئی دشواریاں تھیں جو شدت اختیار کر کے 1877ء

(1) 1876ء سے انہیں لوہے کا سامان، چھری کانٹے اور قلعی کیا ہوا سامان شامل کیا گیا ہے۔

ہندوستان سے تمام ملکوں کو ہونے والی برآمدات

سال	کپاس پونڈ	نیل پونڈ	چاول، گیہوں اور دوسرے اناج پونڈ	کھالیں اور چمڑا پونڈ	پٹ سن (1) پونڈ	افیم پونڈ	تلہن پونڈ	چائے پونڈ
1859ء	40,94,100	2,118,016	2,801,871	544,680	917,823	10,827,642	2,059,445	60,533
1860ء	5,637,624	2,021,288	3,588,562	444,537	623,995	9,054,394	1,548,721	127,771
1861ء	7,342,168	1,886,325	3,350,877	661,725	768,719	10,184,713	1,785,526	151,981
1862ء	10,203,470	1,647,503	4,039,938	794,137	7,24,455	10,553,912	1,206,331	192,442
1863ء	18,779,040	2,126,870	3,727,901	904,289	8,82,084	12,494,128	1,833,851	223,763
1864ء	35,864,795	1,756,158	4,325,577	897,575	1,618,244	10,756,093	2,032,832	271,229
1865ء	37,573,637	1,860,141	5,956,408	725,236	1,410,702	9,911,804	1,912,433	301,022
1866ء	35,587,389	1,861,501	3,247,918	609,803	1,083,522	11,122,746	1,750,197	309,899
1867ء	16,458,277	1,798,599	3,651,832	639,342	1,040,876	10,431,703	1,787,996	378,126
1868ء	20,092,570	1,823,226	3,961,225	988,282	1,309,337	12,330,799	2,160,572	729,714
1869ء	20,149,825	2,893,823	4,574,708	1,252,898	1,891,899	10,695,654	1,994,888	983,757
1870ء	19,079,138	3,178,045	3,221,454	1,691,330	1,984,495	11,693,330	2,308,942	1,080,515
1871ء	19,460,899	3,192,503	4,468,958	2,020,819	2,577,553	10,783,863	3,522,305	1,139,703
1872ء	21,272,430	3,705,475	4,865,748	2,525,925	4,117,308	13,365,228	2,728,788	1,482,186
1873ء	14,022,858	3,426,824	6,073,635	2,921,910	4,142,548	11,426,280	1,508,339	1,590,926
1874ء	13,212,241	3,555,300	6,548,346	2,618,358	3,436,015	11,341,857	2,361,451	1,754,618
1875ء	15,257,342	2,576,302	5,488,169	2,677,767	3,246,882	11,956,972	3,235,950	1,963,550
1876ء	13,280,959	2,875,065	6,421,137	2,944,933	2,805,340	11,148,426	5,462,388	2,183,881
1877ء	11,746,184	2,962,786	7,988,189	3,000,552	2,636,647	12,404,748	5,319,447	2,620,140

(1)۔ 1859ء سے 1867ء تک کے اعداد خام اور تیار شدہ پٹ سن دونوں کو ظاہر کرتے ہیں۔'' اعداد و شمار کے خلاصے میں وہ علیحدہ علیحدہ نہیں دکھائے گئے ہیں۔ مفروضے سے کہا جا سکتا ہے کہ غالباً برآمد کا تین چوتھائی حصہ یا اس سے کچھ زیادہ پٹ سن پر مشتمل ہوتا تھا اور ایک چوتھائی یا اس سے کچھ کم تیار شدہ پٹ سن پر۔ اس کے بعد کے برسوں یا 1868 سے 1877ء تک کے اعداد صرف خام پٹ سن کی برآمد کو ظاہر کرتے ہیں۔

کے خوفناک قحط میں تبدیل ہو گئیں۔ بیس سال کا دورِ امن ہندوستان کو خوش حال نہیں بنا سکا تھا۔ اور لارڈ لٹن نے اپنے دہلی دربار کے جشن کے لیے جس سال کا انتخاب کیا وہ بدقسمتی سے ہندوستان کے اس بدترین قحط کا سال تھا جس کی مثال پوری صدی میں نہیں ملتی۔

آگے جو نقشہ دیا ہوا ہے اس میں ہندوستان سے 1859ء اور 1877ء کی درمیانی مدت میں تمام دنیا کو ہونے والی برآمدات دکھائی گئی ہیں۔ ہم نے صرف ان اشیا کا انتخاب کیا ہے جن کی برآمدات کی مالیت 1877ء میں دو ملین پونڈ سے زیادہ تھی۔

اس نقشے میں برآمد ہونے والی پہلی چیز کپاس دکھائی گئی ہے اور اس کی مقدار میں غیر معمولی کمی زیادتی حیرت ناک ہونے کے ساتھ ہماری معلومات میں اضافہ بھی کرتی ہے۔ چونکہ انگلستان ایک خود کفیل سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا اس لیے وہ مدتوں سے کوشش کر رہا تھا کہ لنکا شائر کے کرگوں کے لیے برار اور بمبئی کی سطح مرتفع کی روئی حاصل کرے۔ قارئین کو یاد ہو گا کہ 1848ء میں ایک پارلیمانی کمیٹی مقرر کی گئی تھی اور اس کمیٹی کا صدر جان برائٹ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ انگلستان کے کارخانوں کو مہیا کی جانے والی روئی میں ہندوستان زیادہ اضافہ نہیں کر سکے گا۔ ایک خود کفیل سلطنت کا تصور محض خیال و خواب بن کر رہ گیا تھا۔ انگلستان خام مال اس ملک سے حاصل کرنے پر مجبور تھا جہاں وہ نہ صرف بہتر تھا بلکہ کم قیمت بھی تھا۔ لنکا شائر کے کرگوں کے لیے بہترین روئی امریکہ میں پیدا ہوتی تھی۔ جب انگریز قوم اس معقول معاشی نتیجے کو تسلیم کرنے کے لیے خود کو آمادہ کر رہی تھی اسی زمانے میں امریکہ کی خانہ جنگی شروع ہو گئی جس نے یک لخت اس ملک سے آنے والی روئی کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کر دیں۔ اس کے بعد ہندوستان نے انگلستان کی دست گیری کی اور امریکہ جس چیز کو مہیا کرنے میں ناکام رہا تھا وہ ہندوستان مہیا کرنے لگا۔ 63-1862ء میں ہندوستان سے برآمد ہونے والے روئی کی مالیت دس ملین سے بڑھ کے 18 ملین پونڈ ہو گئی دوسرے سال وہ 35 ملین پونڈ ہو گئی اور اسے اگلے سال 37 ملین پونڈ۔ کچھ لوگوں کو امید ہو چکی تھی کہ انگلستان آئندہ امریکہ سے روئی خریدنا ترک کر دے گا اور اس کی ہندوستانی سلطنت لنکا شائر کے صنعت کاروں کی ضرورتیں پوری کر سکے گی۔ لیکن یہ امید جلد ختم ہو گئی۔ امریکہ میں امن قائم ہو گیا اور تجارت پھر بحال ہو گئی۔ ہندوستان کی روئی کی برآمد جس تیزی سے بڑھی تھی اتنی ہی تیزی کے ساتھ کم ہو گئی اور 67-1866ء تک گھٹ کے بارہ ملین رہ گئی۔ بدقسمتی سے بمبئی کے بندوبست پر نظرِ ثانی اسی سال شروع ہوئی جس سال ایک حادثے کی بنا پر وہاں عارضی خوش حالی پیدا ہو گئی تھی۔

حکام بندوبست کو زمین کے محصول میں وہ بھاری اضافے کرنے کا موقع مل گیا جن کا ذکر ایک دوسرے باب میں کیا جا چکا ہے اور جن کی وجہ سے لوگ تکلیفوں میں مبتلا ہوگئے اور 1875ء کے بلوے اور شورش پھوٹ پڑی۔ یہ واقعہ ایک ایسے ملک میں گھٹتی بڑھتی مال گزاری کے خرابیوں کو اچھی طرح ظاہر کرتا ہے جو بڑی حد تک زراعت پر مبنی ہو ایک کسانوں کی قوم کبھی اپنی حالت میں کوئی مستقل سدھار نہیں کر سکتی ہے اگر خوش حالی کے آثار نظر آتے ہی مطالبے میں اضافہ کر دیا جاتے۔

ایک طرف تو ہندوستانی کپاس کی برآمد میں کمی زیادتی ہوتی رہی اور دوسری طرف ہندوستان کے سوتی کپڑے، دھاگے اور سوت کی برآمد میں رفتہ رفتہ اضافہ ہونے لگا۔ 59-1858ء میں 8,13,604 پونڈ کی مالیت کا سامان برآمد کیا گیا۔ 64-1863ء میں وہ بڑھ کے 11,67,577 پونڈ ہو گئی، 70-1869ء میں 12,98,757 پونڈ اور 77-1876ء میں 19,35,198 پونڈ یا قریب قریب دو ملین ہو گئی۔ اس کی وجہ سے مانچسٹر حسد کرنے لگا اور محاصل کے متعلق وہ قوانین بنائے گئے جن کا ذکر ایک آئندہ باب میں کیا جائے گا۔

زیر غور انیس سال میں چاول، گیہوں اور دوسرے غذائی اناج کی برآمد تین ملین سے کچھ کم سے بڑھ کے تقریباً آٹھ ملین ہو گئی۔ اگر کسی ملک کی تجارت آزاد ہو تو اس قسم کا اضافہ اس کی خوشحالی کی دلیل سمجھا جائے گا۔ لیکن ہندوستان کی تجارت مصنوعی تھی اور اس پر پابندیاں لگی ہوئی تھیں۔ ہندوستان کو ہر سال انگلستان کو وہ خراج ادا کرنا ہوتا تھا جس کا کوئی راست معاوضہ نہیں ملا کرتا تھا۔ وہ مصنوعات کے ذریعے یہ مطالبہ پورا نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ اسے وہ غذائی اناج بڑی مقدار میں برآمد کرنا پڑتے تھے جن کی ضرورت لوگوں کو تھی اور جو اسے عام حالات میں برآمد نہیں کرنا چاہتے تھے۔

یہ طریقہ کار تکلیف دہ سہی لیکن ہم اس سے سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ انگلستان کو سالانہ جانے والی دولت ہندوستان کی آمدنی میں سے ادا کی جاتی ہے۔ ہندوستان کی آمدنی کا بڑا حصہ مال گزاری کی شکل میں زمین سے حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ مال گزاری جنوبی ہندوستان میں کسانوں سے اور شمالی ہندوستان میں ان مالکان اراضی سے وصول کی جاتی ہے جو کسانوں سے لگان لیتے ہیں۔ کسان اپنی مال گزاری یا لگان اپنے کھیتوں کی پیداوار کا بڑا حصہ فروخت کر کے ادا کرتے ہیں اور اپنے لیے چھوٹا سا حصہ رکھتے ہیں جو ان کی گزر بسر کے لیے ناکافی ہوتا ہے۔ برآمد کرنے والے تاجروں کے گماشتے تمام ملک میں پھیلے ہوئے ہیں تاکہ وہ غلہ خرید سکیں جسے بیچنے پر

کسان مجبور ہوتے ہیں۔ ریلوں کے ذریعے یہ غلہ بندرگاہوں تک لایا جاتا ہے اور وہاں سے یورپ کو برآمد کیا جاتا ہے۔ سردیوں میں ہر بڑے شہر اور منڈی میں غلہ کا لین دین ہوتا ہے اور اس موسم میں سیاحت کرنے والوں کو ہندوستان میں بڑی گہما گہمی نظر آتی ہے۔ لیکن غلے کی اس تجارت کے دل خوش کن نظاروں کی آڑ میں یہ حقیقت چھپی ہوتی ہے کہ ایک زراعت پیشہ قوم کے گھر اور گودام خطرناک حد تک غلے سے خالی ہو رہے ہیں تاکہ انگلستان کا وہ سالانہ خراج ادا ہو سکے جس کا مطالبہ ہندوستان سے کیا جاتا ہے۔

ہوتا یہ ہے کہ بڑے بڑے قحطوں کا خطرہ پیدا ہو جانے کی صورت میں بھی غلہ حسب معمول برآمد ہوتا رہتا ہے۔ مال گزاری کا مطالبہ پورا کرنے کے لیے بہر حال بیچنا پڑتا ہے۔ 77-1876ء میں جب صدی کا سب سے بھیانک قحط سروں پر منڈلا رہا تھا اس وقت بھی ہندوستان کو جیسا کہ مندرجہ بالا نقشے سے ظاہر ہوتا ہے، اتنی زیادہ مقدار میں غذائی اناج برآمد کرنا پڑا جس کی نظیر گزشتہ برسوں میں نہیں ملتی۔ ایسے صوبے کو بھی جہاں واقعی قحط پڑ چکا تھا۔ غذائی اناج برآمد کرنے پڑے۔ یہ برآمدات قحط کے دوران اس صوبے سے وصول ہونے والی مال گزاری سے کچھ مناسبت رکھتی ہیں۔

یورپ میں ہندوستان کے چاول اور گیہوں کی مانگ کے اثرات بھی ایسے ہوئے جن کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس مانگ کی وجہ سے کاشت میں تھوڑی بہت توسیع ہو گئی اور ان علاقوں میں جہاں بندوبست استمراری ہو چکا تھا اس سے لوگوں کی دولت میں اضافہ ہو گیا۔ اس میں شک نہیں کہ بنگال میں بڑے پیمانے پر زراعت میں توسیع ہو جانے کی بنا پر سو سال پہلے کے مقابلے میں آج وہاں کے لوگوں کے پاس وسائل زیادہ ہیں۔ لیکن بمبئی اور مدراس کے متعلق یہ بات نہیں کہی جا سکتی۔ وہاں زراعت کی توسیع مال گزاری میں اضافے کا باعث ہوتی ہے۔ کبھی کبھی تو اس اضافے کا منافع سے کوئی تناسب نہیں ہوتا ہے۔ حکام یہ بھول جاتے ہیں کہ زیر کاشت لائی جانے والی زمین کے تناسب سے مال گزاری میں جو اضافہ کیا جاتا ہے اس کی پیداوار سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی ہے۔ لیکن اس قسم کی غلطیاں ہوتی رہتی ہیں۔ زراعت کی توسیع لوگوں کی خوش حالی بڑھانے کے بجائے انھیں زیادہ غریب بنا دیتی ہے۔

اس کے علاوہ یورپ میں ہندوستان کی پیداوار کی مانگ کا اثر غذائی اناج کی قیمتوں پر پڑتا ہے۔ چونکہ ہندوستان کی آبادی زیادہ تر زراعت پیشہ لوگوں پر مشتمل ہے اس لیے غذائی اناج

کی قیمتوں میں اضافہ قوم کے لیے معاشی فائدے کا سبب بنتا ہے۔ لیکن اس میں ایک خرابی بھی ہے۔ زرعی خوش حالی کے آثار اکثر حکام بندوبست کو مال گزاری میں اضافے کرنے پر آمادہ کر دیا کرتے ہیں اور جب قیمتیں گرتی ہیں تو کسان گھاٹے میں رہتے ہیں۔ یہ امور ظاہر کرتے ہیں کہ ایک زراعت پیشہ قوم کی خوش حالی پر بڑھتی ہوئی مال گزاری کا مضر اثر پڑتا ہے۔

چمڑے اور کھالوں کی برآمد پانچ لاکھ سے بڑھ کے تین ملین پونڈ ہو گئی۔ اس سے ایک طرف تو لوگوں کو معاشی فائدہ ہوا لیکن دوسری طرف ایک نقصان بھی ہوا۔ کھالوں کی اتنی زیادہ برآمد ظاہر کرتی تھی کہ ہندوستان میں چمڑے کی صنعت کم ہو رہی ہے۔ انیسویں صدی کی آٹھویں دہائی کے شروع میں پٹ سن کی برآمد ایک ملین سے بڑھ کے تین یا چار ملین ہو گئی۔ زیادہ تر پٹ سن بنگال کے کچھ ضلعوں میں پیدا ہوتا تھا۔ برآمد ہونے والی یہ نئی چیز کسانوں کے وسائل میں اضافے کا باعث ہوئی۔ لیکن اس نے دھان کی پیداوار کم کر دی۔[1]

افیم کی برآمد میں کوئی فرق نہیں ہوا۔ بلکہ زیر مطالعہ مدت میں اس میں کچھ اضافہ ہو گیا۔ چونکہ حکومت کو افیم کی تجارت پر اجارہ داری کے حقوق حاصل تھے اس لیے اس کی برآمد سے ہونے والا منافع ہندوستان کی آمدنی میں اضافہ کرتا تھا۔

انیس سال کی مدت میں تلہن کی برآمد دو ملین سے بڑھ کے پانچ ملین ہو گئی جس کا مضر اثر ہندوستان کی کھاد پر پڑا۔ اگر تیل ہندوستان میں نکال کر برآمد کیا جاتا تو کھیتوں کے لیے بہت سی کھاد مہیا کی جا سکتی تھی۔ "تلہن کی برآمد بقول ڈاکٹر وولکر (DR. VOELCKER) "زمین کی زرخیزی کی برآمد کے مترادف ہے"۔[2]

برآمد کیا جانے والا نیل اور چائے زیادہ تر برطانوی سرمائے سے پیدا اور تیار کیا جاتا ہے۔ صرف اس میں کام کرنے والے مزدور ہندوستانی تھے۔ سرمائے کا منافع انگریز حصہ داروں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ ہندوستان کے لوگوں کو صرف ان کی محنت کی اجرت ملتی تھی۔ بنگال کے باغدار

---

(1) میمن سنگھ کا شمار بنگال کے زیادہ پٹ سن پیدا کرنے والے ضلعوں میں ہوتا ہے۔ 1887ء سے 1890ء تک جب میں وہاں کا کلکٹر تھا اس وقت وہاں پیدا کرنے والی زمین کے قریب قریب ایک تہائی حصے میں پٹ سن کی کاشت ہوتی تھی۔

(2) ہندوستان کی زراعت کے متعلق ڈاکٹر وولکر کی رپورٹ۔

کسانوں کو ان کی مرضی کے خلاف نیل پیدا کرنے پر مجبور کیا کرتے تھے۔ اور کسانوں پر طرح طرح کے ظلم توڑتے تھے جس کے نتیجے میں 1860ء کی شورش اور بلوے ہوئے۔ ایک ہندوستانی مصنف دینا بندھو مترا نے ایک ڈرامے میں ان مظالم کی عکاسی زوردار الفاظ میں کی تھی۔ اس کا ترجمہ ریورنڈ جیمس لانگ نے انگریزی میں کیا جس کی بنا پر کلکتہ کے ہائی کورٹ نے اس کو جرمانے اور قید کی سزا دی۔ انریبل ایشلے ایڈن نے جو کچھ مدت بعد بنگال کا لیفٹننٹ گورنر مقرر ہوا تھا، مظلوم کسانوں کی حمایت کی اور ایک کمیشن کے ذریعہ تحقیقات کروائی گئی جس میں اس طریقے کی بہت سی خرابیاں سامنے آئیں۔ لارڈ کیننگ نے اس مسئلہ پر سر چارلس وڈ کی توجہ دلائی، جو اس زمانے میں سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا تھا۔ اس طاقت ور اور دیانت دار حاکم نے اس خرابی کو دور کرنے کا تہیہ کر لیا۔ جس نے اس صنعت کی تاریخ کو داغ دار بنا دیا تھا۔ بنگال کے کسانوں کی بڑی تعداد آزاد ہوگئی اور انھوں نے باغداروں کے دباؤ میں آکر نیل کی کاشت کرنے سے انکار کر دیا۔ نقشے میں دیئے ہوئے اعداد ظاہر کرتے ہیں کہ 1859ء اور 1862ء کی درمیانی مدت میں نیل کی برآمد کم ہوتی گئی اور 1869ء سے پہلے اس میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکا۔ ایک اور وجہ یعنی مصنوعی نیل کی دریافت کی بنا پر صدی کے ختم ہوتے ہوتے ہندوستان کی یہ صنعت بھی ختم ہوگئی۔

لیکن چائے کی برآمد میں کوئی کمی نہیں ہوئی بلکہ برابر اضافہ ہوتا رہا۔ انیس سال میں اس کی برآمد میں چالیس گنا اضافہ ہوگیا۔ 1858-59ء میں 60,000 پونڈ کی مالیت کی چائے برآمد ہوتی تھی۔ لیکن 1876-77ء میں اس کی مالیت ڈھائی ملین سے زیادہ ہوگئی تھی۔ یہ اضافہ برابر ہوتا رہا۔ اس مدت میں ہر سال برآمد ہونے والی چائے کی مقدار پچھلے سال سے زیادہ ہوتی تھی۔ بہت سی ویران پہاڑیاں اور وادیاں باغوں میں تبدیل ہوگئی ہیں اور لاکھوں غریب ان باغوں میں روزگار سے لگ گئے ہیں۔ لیکن ان قوانین نے جنھیں ہندوستان کے "غلامی کے قانون" کہا جاتا ہے اس صنعت کو داغ دار بنا دیا ہے۔ ناواقف مرد اور عورتیں، جن سے معاہدوں پر دستخط کرا لیے جاتے ہیں۔ اس معاہدے میں دی ہوئی مدت تک آسام کے باغوں میں کام کرنے پر مجبور کیے جاتے ہیں۔ اگر وہ وہاں سے بھاگ جائیں تو انھیں گرفتار کر لیا جاتا ہے، سزا دی جاتی ہے اور دوبارہ مالکوں کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ انھیں کام کرنے پر مجبور کرنے کے لیے ایسے تعزیری قانون بنائے گئے ہیں جن کا اطلاق ہندوستان کی کسی دوسری صنعت پر نہیں ہوتا ہے۔ مزدور حاصل کرنے کے لیے فریب، جبر اور اغوا کے قابل نفرت واقعات بنگال کی فوجداری عدالتوں

میں بیان کئے گئے ہیں۔ بھرتی کئے جانے والے مزدوروں اور عورتوں پر کبھی جو مظالم کئے جاتے تھے انھوں نے آسام کے چائے کے باغوں کی تاریخ کو داغ دار بنادیا ہے۔ ذمہ دار اعلا حکام نے تعزیری قوانین کو منسوخ کرنے کی وکالت کی ہے اور اس امر کی سفارش کی ہے کہ ہندوستان کے لاکھوں مزدوروں میں سے طلب اور رسد کے معمولی قانون کے تحت چائے کے باغوں کے لیے مزدور بھرتی کیے جائیں لیکن سرمایہ داروں کا اثر بے پناہ ہے۔ کوئی سکریٹری آف اسٹیٹ یا ہندوستان کا وائسرائے ان تعزیری قوانین کو منسوخ کرنے اور ہندوستان میں پائے جانے والے اس نیم غلامی کے طریقے کو ختم کرنے کی جرات نہ کر سکا۔

ریلیں اور آب پاشی کے ذرائع

ہندوستان میں ریلوں کی تعمیر کا کام ایک ایسے تصفیے کی بنیاد پر شروع کیا گیا جس کا مقصد مسافروں کو سہولت بہم پہنچانے کے بجائے اسراف بے جا تھا۔ نجی کمپنیوں سے جن کو ریاست نے سرمائے پر 5 فیصدی یا 4½ فیصدی منافع کی ضمانت دی تھی، یہ امید رکھنا فضول تھا کہ وہ خرچ میں کفایت شعاری سے کام لیں گی یا مسافروں کو سہولت بہم پہنچانے کی کوشش کریں گی۔ تعمیر پر ضرورت سے زیادہ روپیہ خرچ یا برباد کرنے کے باوجود حصہ داروں کو خرچ ہونے والے تمام روپے پر، چاہے وہ سمجھداری کے ساتھ خرچ کیا گیا ہو یا نہ بھی، کے ساتھ ضمانت شدہ منافع ملتا رہے گا۔ اگر ریلوں میں جانے والے سامان میں کمی واقع ہو گی اور اُن کی آمدنی ضمانت شدہ شرح سے کم ہو گی تو یہ کمی بھی ہندوستان کی آمدنی یعنی لوگوں کے ادا کیے ہوئے محاصل کی رقم سے پوری کی جائے گی۔

بیس سال کے تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ خطرات بے بنیاد نہیں تھے۔ ریلوں کی تعمیر پر ضرورت سے اتنا زیادہ روپیہ خرچ کیا گیا اور مسافروں کی سہولتوں کو اس طرح نظر انداز کیا گیا کہ اس کی مثال کسی ملک کی ریلوں کی تاریخ نہیں پیش کر سکتی۔ یہ واقعات اعلیٰ عہدے اور حیثیتیں رکھنے والے گواہوں نے ثابت کر دیے ہیں جن کے بیانات 1871ء، 1872ء، 1873ء اور 1874ء کی ان پارلیمانی کمیٹیوں کے سامنے ہوئے تھے جن کا ذکر ہم پچھلے باب میں کر چکے ہیں۔

جولینڈ ڈینورس (Juland Danvers) اور ولیم تھارنٹن (William Thornton) جن کے بیانات بیک وقت مارچ 1873ء میں لیے گئے تھے، اپنی حیثیتوں کے اعتبار سے ریلوں کے متعلق اہم ترین گواہ تھے۔ ڈینورس ریلوں کا سرکاری ڈائریکٹر تھا۔ اس نے یہ تو تسلیم کیا کہ ضمانت کے طریقے کی

بنا پر ضرورت سے زیادہ روپیہ خرچ اور برباد کیا گیا۔ پھر بھی اس نے اس امر سے انکار کیا کہ "اس زمانے میں حکومت کسی اور طریقے سے وہ ریلیں تعمیر کر سکتی تھی جو ہندوستان میں تعمیر کی گئیں۔" تھارنٹن کا خیال اس سے بالکل مختلف تھا۔ اس نے کہا کہ "ضمانت کے طریقے سے کوئی ایسا مقصد پورا نہیں ہوا جو اس کے بغیر بہتر انداز سے پورا نہیں ہو سکتا تھا۔" [1]

دوبارہ بیان دیتے ہوئے تھارنٹن نے کہا "اگر ضمانت نہ کی جاتی تو میرے خیال میں ریلوں کی تعمیر کے لیے بغیر کسی ضمانت کے سرمایہ ہندوستان جاتا۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ اس ملک میں دولت بڑھتی جا رہی ہے، بے اندازہ سرمایہ کاروبار کے راستے تلاش کر رہا ہے جو اسے انگلستان میں نہیں ملتے اور جنوبی افریقہ اور دوسرے ممالک کو منتقل ہو رہا ہے میرے خیال میں وہ ہندوستان کو لگاتار نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ میرا خیال یہ بھی ہے کہ سرمایہ اگر ہندوستان جاتا اور اس کی ضمانت نہ ہوتی اور سرمایہ لگانے والوں کو یہ معلوم ہوتا کہ انھوں نے اگر غلطیاں کیں تو انھیں غلطیوں کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا تو ریلوں کی تعمیر میں بہت احتیاط اور بہت کفایت شعاری سے کام لیا جاتا۔" تھارنٹن نے مزید کہا "لیکن کمپنیوں کی ایک دفعہ ضمانت کر دینے کے بعد یہ امید لاحاصل تھی کہ غیر ضمانت شدہ کمپنیاں ریلیں تعمیر کرنے کے کام میں دلچسپی لیں گی۔" [2]

اس کو کوئی مشکل سے مانے گا مگر واقعہ یہ ہے کہ معاہدوں کی تیاری اتنی لاپرواہی کے ساتھ اور اتنی جلدی میں کی گئی تھی کہ کئی اہم امور میں حکومت یا ہندوستان کی آمدنی کا تحفظ نہیں کیا گیا تھا۔ تھارنٹن نے کہا تھا "میرے خیال میں جس نے بھی ان معاہدوں کے مسودے تیار کیے ہیں اس کو شرم آنی چاہیے۔ کئی دفعات پر مشتمل معاہدے میں دو یا تین تضادات پائے جاتے ہیں اور ان میں جہاں بھی حکومت کے مفاد کے تحفظ کی کوشش کی گئی ہے وہ عملاً اس تحفظ کے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے۔" "جس انداز سے ان کے مسودے تیار کیے گئے ہیں اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ جب ریل کی تعمیر اس مفروضے کی بنا پر شروع کی گئی کہ ریلوں پر خرچ ہونے والی رقم کی ضمانت حکومت نے کی ہے تو حکومت اس پر مجبور ہے کہ خرچ ہونے والی رقم کے سود کی ضمانت بھی کرے۔ چنانچہ اس کی بنا پر ریلوں کے معمار یعنی کمپنی کو کفایت شعاری کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ وہ جانتی ہے کہ غلطیوں کے باوجود اسے خرچ ہونے والی رقم پر پورا پورا

1۔ 1872ء کی رپورٹ، سوالات نمبر 1863 اور 1864۔

2۔ 1872ء کی رپورٹ، سوالات نمبر 3030 اور 3031۔

سود ملتا رہے گا۔"[1]

لفٹیننٹ کرنل چیزنی نے جو چھ سال تک ریلوں کے حسابات کا آڈیٹر رہ چکا تھا اور اس کے بعد نئے نئے قائم ہونے والے کوپرز ہل انجینیرنگ کالج (coopers Hill Engineering college) کا صدر مقرر ہوا تھا، ضمانت کے طریقے کے تحت ہونے والے بیجا اخراجات اور کام کے سلسلے میں ہونے والی بے احتیاطی کے متعلق بیان دیتے ہوئے کہا "ریلوں کی تعمیر 1848ء میں شروع ہوئی اور انجنیر ہندوستان بھیجے گئے۔ یہ بتانا ضروری نہیں کہ اس زمانے میں انگلستان کے انجنیر کفایت شعاری کو اہمیت دینے کے عادی نہیں تھے۔ یہ حضرات ریلیں تعمیر کرنے کے لیے بھیجے گئے تھے اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ ان کے کام کی بہت زیادہ نگہداشت نہیں کی جائے گی۔ ۔ ۔ ۔ اس کے علاوہ حسابات کی جانچ پڑتال کا طریقہ بھی نہایت ناقص تھا۔ جس کو ٹیکنیکی اصطلاح میں بعد میں کیا جانے والا آڈٹ کہتے ہیں۔ جب تک حسابات داخل نہیں کیے جاتے تھے خرچ ہونے والی رقموں کے متعلق کچھ نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اس طریقہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایسٹ انڈیا ریلوے پر خرچ ہونے والے بیس ملین پونڈ کے سرمائے میں سے چار ملین پونڈ کی رقم تسلیم نہیں کی گئی۔ لیکن اس زمانے کے حالات کے پیش نظر اس رقم کو تسلیم کرنے اور خرچ ہونے والے سرمائے میں شمار کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ معاہدے کے الفاظ کچھ اس قسم کے تھے کہ اس رقم کو تسلیم کرنے سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ جو رقم بھی خرچ ہو اس کو آخر میں تسلیم کر لینا چاہیے۔"[2]

کرنل چیزنی سے بڑی حیثیت رکھنے والے حکام نے ضمانت کے طریقے کے تحت ہندوستان میں تعمیر ہونے والی ریلوں پر ضرورت سے زیادہ روپیہ صرف کیے جانے کا ذکر کیا۔ رائٹ آنریبل ولیم این۔ میسی (Right Hon. William N. massey) نے کہا جو لارڈ میو اور لارڈ لارنس کے زمانوں میں ہندوستان کا وزیر مالیات رہ چکا تھا۔ "ایسٹ انڈیا کمپنی پر جتنا روپیہ خرچ ہونا چاہیے تھا اگر اس سے دگنا نہیں تو بہت زیادہ خرچ ہوا۔ بڑی بڑی رقمیں برباد کی گئیں۔ ٹھیکیداروں کے پاس کفایت شعاری کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ روپیہ انگریز سرمایہ داروں کا تھا۔ انہیں دلچسپی اس سے تھی کہ ہندوستان کی آمدنی میں سے ضمانت شدہ 5 فیصدی سود ادا ہوتا رہے۔ انھیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ

1۔ 1872ء کی رپورٹ، سوالات نمبر 1856 اور 1857۔

2۔ 1872ء کی رپورٹ، سوال نمبر 2623

روپیہ ہگلی میں پھینک دیا گیا یا اینٹ چونے میں تبدیل کر لیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بے انتہا روپیہ خرچ کیا گیا اور ایسٹ انڈیا ریلوے کی تعمیر پر میرے خیال میں (میرے سامنے حسابات نہیں) تقریباً 30,000 پونڈ فی میل خرچ ہوا۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ اتنی زیادہ فضول خرچی کسی دوسرے کام میں نہیں کی گئی۔"[1]

جس زمانے میں وہ ہندوستان کا وائسرائے تھا سر جان لارنس نے ریلوں پر ہونے والے ضرورت سے زیادہ اخراجات کی مذمت نہایت سخت الفاظ میں کی تھی اور کہا تھا کہ "ہندوستانی ریل کمپنیوں کی حقیقی کارروائی کی تاریخ اس بدانتظامی اور اصراف بیجا کی مثالیں پیش کرتی ہے جو حکومت کے بدترین مخالفوں کی خواہشات سے مطابقت رکھتی ہیں۔"[2] واقعہ یہ ہے کہ 1873ء کی پارلیمانی کمیٹی کے سامنے لارڈ لارنس نے ایک دفعہ پھر ریلوں کے سلسلے میں ہونے والے بیجا اخراجات اور مسافروں کے ساتھ کیے جانے والے بُرے برتاؤ کی مذمت کی۔

"میرے خیال میں ہندوستان کے ان تمام طبقوں میں، جو ریلوں کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے پائے گئے، یہ بات مشہور ہے کہ ریلوں پر ضرورت سے بہت زیادہ روپیہ خرچ کیا گیا ہے۔ ان پر جو رقم خرچ کی گئی ہے۔ وہ ان کی قیمت یا اس رقم سے بہت زیادہ ہے جو خرچ کی جانی چاہیے تھی۔"

"5 فیصدی کی ضمانت کے بعد سرمایہ دار تو ہر بات پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ انھیں اس کی کامیابی یا ناکامی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ 5 فیصدی کی شرح اتنی اچھی ہے کہ وہ اس سے مطمئن ہو جاتے ہیں اور حقیقی کام میں دلچسپی نہیں لیتے۔ ریلوں پر ضرورت سے زیادہ روپیہ خرچ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔"

میرے زمانے میں دیسی لوگ (اس طریقے کو بہتر بنانے کے لیے کمپنی کے ڈائریکٹروں کی کوششوں کے باوجود مجھے تو آج بھی کوئی فرق نظر نہیں آتا ہے۔) ریلوں میں ان کے ساتھ کیے جانے والے بُرے سلوک کے متعلق بہت شکایتیں کیا کرتے تھے۔ حالانکہ اس قسم کے حالات میں اختیارات کے ناجائز استعمال کو روکنا مشکل ہوتا ہے پھر بھی میرا خیال ہے کہ حکومت اس سلسلے میں کمپنیوں کے مقابلے میں زیادہ موثر اقدام کر سکتی تھی۔۔ اس سلسلے میں دیسی لوگوں کو بہت سی شکایتیں تھیں۔ اس سرکاری اور غیر سرکاری تفتیش کی بنا پر جو میں ہندوستان میں کیا کرتا تھا

1۔ 1872ء کی رپورٹ، سوال نمبر 8887

2۔ لارڈ میو کے مراسلے سے ماخوذ اقتباس مورخہ 11 مارچ 1899ء

میرا یہ خیال پختہ ہو گیا تھا کہ دیسی لوگوں کے یہ بیانات بڑی حد تک صحیح ہیں۔"[1]

ہم نے طویل اقتباسات پیش کیے۔ لیکن ایک اقتباس اور پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ یہ دکھایا جا سکے کہ جب حکومت ہند نے نئی ریلوں کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا تو برطانوی تاجروں کے زیر اثر اور ہندوستان کے حکام کی مرضی کے خلاف نئی اسکیم کو منظور کرنے کے لیے سکریٹری آف اسٹیٹ نے خصوصی اختیارات استعمال کیے۔ یہ بات جنرل رچرڈ اسٹریچی کی شہادت سے ظاہر ہوتی ہے۔ جو ہندوستان کے مفاد عامہ کے کاموں کے محکمے کا طویل تجربہ رکھتا تھا۔

فاسٹ ــــ لیکن مختلف کمپنیوں کے ساتھ کیے جانے والے گھاٹے کے سودوں کے متعلق آپ کا بیان ظاہر کرتا ہے کہ ہندوستان کے لوگوں پر مختلف قسم کے محاصل لگائے جا سکتے ہیں۔ ان سے مقامی حکومتیں محصول وصول کر سکتی ہیں، گورنر جنرل محصول وصول کر سکتا ہے اور سکریٹری آف اسٹیٹ چاہے وہ ہندوستان کے متعلق کچھ نہ جانتا ہو اور اس نے کبھی ایک گھنٹہ بھی وہاں نہ گذارا ہو، وہاں کے حکام کی مرضی کے خلاف اس اسکیم پر عمل کر سکتا ہے۔ جس کی بنا پر اس ملک کے لوگوں پر بھاری مالیاتی بار پڑ جائے۔

جنرل اسٹریچی ــــ "اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک ایسی مطلق العنان حکومت کا یہ افسوسناک نتیجہ ہے جس کو اس طرح چلایا جائے جس طرح حکومت ہند چلائی جاتی ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں اس کے تدارک کی کوئی تدبیر تجویز نہیں کر سکتا۔"[2]

1872ء میں جنرل اسٹریچی نے یہ نہیں سوچا اور اس کے بعد گزرنے والی تیس سال کی مدت میں کسی برطانوی حاکم نے بھی یہ نہیں سوچا کہ ایک مطلق العنان حکومت بھی ان لوگوں سے تھوڑا بہت مشورہ کر سکتی ہے جن کا روپیہ برباد کیا جا رہا ہے۔ اگر 1872ء میں بھی جب پارلیمانی تفتیش کی جا رہی تھی، اس پر عمل کر لیا گیا ہوتا تو پچھلے تیس سال میں سرکاری ریلوں اور ضمانت شدہ ریلوں پر خرچ کی جانے والی اس بے اندازہ رقم میں کمی کی جا سکتی تھی جو ملک کے وسائل کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ لیکن ہندوستانی حکومت کا سب سے بڑا سقم اس کی علیحدگی پسندی ہے جس پر سختی سے عمل کیا جاتا ہے۔ ہندوستانی حکومت کے طریقہ کار میں اس کی کوئی

1۔ 1873ء کی رپورٹ، سوالات نمبر 4589، 4777 اور 4781

2۔ 1872ء کی رپورٹ، سوال نمبر 6774

گنجائش نہیں کہ لوگ اپنے معاملات کی موثر انداز سے نگرانی کر سکیں۔[1]

لارڈ لارنس نے روداد مورخہ 16 اگست 1867ء میں اُس خسارے کا تخمینہ لگایا تھا جو ریلوں کی تعمیر کی بنا پر ہندوستان کے لوگوں کو برداشت کرنا پڑا۔ اُس نے لکھا تھا "ایک تخمینے کی بنا پر زیر تعمیر ریلوں کے لیے کمپنیوں کو 81 ملین مہیا کرنے ہوں گے۔ زمین، شرح تبادلہ کے نقصان اور نگہداشت کے لیے حکومت کو $7\frac{1}{2}$ ملین خرچ کرنے ہوں گے، خالص آمدنی کے علاوہ $14\frac{1}{2}$ ملین سود ادا کرنا ہوگا اور اُن رقموں کے سود کے طور پر $\frac{1}{2}$4 ملین ادا کرنے ہوں گے جن کے سود کی ضمانت کی گئی ہے۔"

1۔ پانچ سال پہلے (1898ء میں) میرا بیان انڈین کرنسی کمیٹی کے سامنے ہوا تھا جس کا صدر رائٹ آنریبل سر ہنری فاولر تھا۔ جو بات میں مندرجہ بالا سطور میں کہہ چکا ہوں۔ اس کی وضاحت کرنے کے لیے میں اپنے بیان کے کچھ حصے معذرت کے ساتھ درج کر رہا ہوں۔

"زمانہ امن میں (1879ء تا 1898ء) ہمارے سرکاری قرض کو کم کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے تھی تاکہ ضرورت کے وقت ہم پھر قرض لے سکتے۔ میں یہ بھی کہوں گا کہ ہندوستان کے لوگوں سے ______ مثلاً پانچ بڑے صوبوں میں سے ہر ایک کے ایک مالیاتی نمائندہ سے حکومت کو مشورہ کرنا چاہیے تھا۔ حکومت کو ایک کمیٹی مقرر کرنی چاہیے اور اس کمیٹی کے لیے وائسرائے کی ایگزیکٹیو کونسل میں جگہ نکالنی چاہیے تاکہ وہ سالانہ بجٹ کی تیاری کے سلسلے میں وائسرائے اور ممبر مالیات کو مشورہ دے سکے۔ امن کے ہر سال میں سرکاری قرض کو کم کرنے کی باقاعدہ کوشش کرنی چاہیے۔"

"مجھے ہندوستان میں بیس سال پہلے پائے جانے والے حالات یاد ہیں۔ اس وقت سب بڑی بڑی ریلیں بن چکی تھیں۔ اس کے بعد بننے والی نئی ریلوں سے تجارت کو کوئی بڑا فائدہ نہیں ہوا۔ اُن کی تعمیر مفادات کی بنا پر کی گئی ہے۔"

"لیکن اس سے ہمارا قرض بڑھ رہا ہے اور یہ گھاٹے کا سودا ہے۔ خود آپ کے اعداد و شمار کے مطابق جیسا 1897-98ء کے بارے میں شائع ہونے والی آخری رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمیں 57 کروڑ روپے (38 ملین پونڈ) کا گھاٹا ہوا ہے۔ اس میں $28\frac{1}{2}$ کروڑ (19 ملین پونڈ) کا گھاٹا پچھلے بیس سال میں ہوا ہے۔ ہمیں ریلیں ختم نہیں کرنی چاہئیں لیکن ہمیں احتیاط برتنی چاہیے اور میرے خیال میں نئی ریلوں کی منظوری سے پہلے ہندوستان کے نمائندوں سے مشورہ کرنا چاہیے۔

سوالات نمبر 10727، 10728 اور 10724

آخر کار ضمانت کا طریقہ ختم کر دیا گیا۔ ہندوستان کی ترقی کے سرکاری وقائع نگار نے کہا تھا۔[1]

"ہندوستان کی خاص خاص ریلیں قریب قریب مکمل ہو گئی ہیں۔ وہ ریاستی ریلیں جو زیر تعمیر یا زیر غور ہیں زیادہ تر ذیلی لائنیں ہیں جو موجودہ خاص خاص ریلوں کی کارکردگی میں اضافہ کریں گی۔ اب ہندوستان میں 5872 میل لمبی ریلیں استعمال ہونے لگی ہیں جن کی تعمیر پر 16,536 پونڈ فی میل کے اوسط خرچ کے حساب سے تقریباً 9,70,00,000 پونڈ خرچ ہوئے۔ ۔ ۔ ۔ چونکہ اب ریل کی کوئی لائن کمپنیوں کے سپرد نہیں کی جائے گی اس لیے ریلوں کی تعمیر کا تمام کام حکومت کے ہاتھوں میں رہے گا۔ اب کلکتہ سے ملتان اور بمبئی تک اور بمبئی سے مدراس تک ریل کی پٹری بچھائی جا چکی ہے۔ بمبئی سے مدراس تک کی لائن یکم مئی 1871ء کو مکمل ہوئی تھی۔ اُس دن گریٹ انڈین پیننشولا (ریلوے) مدراس سے آنے والی ریل کی پٹری سے ملا دی گئی۔"

"پچھلی 31 مارچ تک جمع ہونے والے ضمانت شدہ سرمائے کی مجموعی رقم 9,43,25,000 پونڈ تھی جس میں سے 9,24,17,000 پونڈ خرچ ہو چکے ہیں۔ حکومت نے 53,98,000 پاؤنڈ خرچ کیے۔ اس طرح کل خرچ ہونے والی رقم سو ملین پونڈ سے کچھ زیادہ ہوئی۔"

"لیکن اب ریلیں قریب قریب مکمل ہو چکی ہیں۔ اس لیے تعمیر پر خرچ ہونے والی بھاری رقم کا خرچ رک جانے کی وجہ سے امید ہے کہ مالی حالت سدھر جائے گی۔"

اس رپورٹ کے مؤلف کو اُمید تھی کہ ریلوں کی تعمیر پر ہونے والا بھاری خرچ آئندہ نہیں ہوگا۔ اگر اُس کی اُمید پوری ہو جاتی تو اس سے ہندوستان کا بھلا ہوتا۔ اگر خاص خاص ریلوں کی تعمیر کے بعد اور اُن پر سو ملین پونڈ خرچ کرنے کے بعد 1874ء سے چھوٹی موٹی لائنوں کی تعمیر کا کام نجی کاروبار پر چھوڑ دیا جاتا تو اُن لوگوں کا بھلا ہوتا جن پر ضرورت سے زیادہ محاصل لگائے جا رہے تھے۔ ملک ریلوں کا انتظار کر سکتا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ وسائل اور مالی ذمہ داریوں کے پیش نظر اُسے انتظار کرنا چاہیے تھا۔ لیکن اس کا کوئی امکان نہیں تھا۔ حکومت ہند کو انگلستان میں قرض حاصل کرنے کی جو سہولتیں حاصل تھیں اُس کی بنا پر 1874ء کے بعد ریلوں کی تعمیر کی رفتار پچھلے برسوں کے مقابلے میں تیز تر ہو گئی اور صدی کے ختم ہونے سے پہلے ہندوستان میں ریل کی پٹریوں کی لمبائی چھ ہزار میل سے کچھ کم سے بڑھ کے بیس ہزار

1۔ ہندوستان کی روحانی اور مادی ترقی اور حالات (Moral and material Progress and Conditions of India) بابت 1872-73ء۔ جس کی اشاعت ہاؤس آف کامنز کے حکم کی تعمیل میں ہوئی 2 جون 1874ء ص 75

میل سے کچھ زیادہ ہو گئی۔"

قحط کے زمانوں میں ریلیں غذا کو تقسیم کرنے میں معاون ثابت ہوتی تھیں لیکن وہ اس میں اضافہ نہیں کر سکتی تھیں۔ صرف آب پاشی کے ذرائع پیداوار میں اضافہ کر سکتے تھے اور خشک سالی کے زمانوں میں فصلوں کی ضمانت کر سکتے تھے۔ چنانچہ ہندو اور مسلم حکمرانوں نے آب پاشی کے ذرائع پر بہت زیادہ توجہ دی تھی۔ ہندوستان کے ہر حصے میں پائے جانے والے آب پاشی کے ذرائع کے آثار یعنی شمالی ہندوستان کی نہریں، بنگال کے بڑے بڑے تالاب اور جنوبی ہندوستان کے پانی کے ذخیرے قدیم حاکموں کی سمجھداری اور دور اندیشی کی تصدیق کرتے ہیں۔ کچھ پس و پیش کے بعد برطانوی حاکموں نے بھی آب پاشی کے ذرائع کی تعمیر کا کام شروع کر دیا اور کمپنی کی حکومت ختم ہونے سے پہلے جو شاندار نتائج انھوں نے حاصل کیے ان کا ذکر ایک پچھلے باب میں کیا جا چکا ہے۔ لیکن انگریز اپنے ملک میں نہروں کے بجائے ریلوں سے زیادہ واقف تھے اس لیے وہ ہندوستان کی حد تک آب رسانی کے ذرائع کی اہمیت کو پوری طرح نہیں سمجھ سکے۔ اور ان کی توسیع میں اتنی مستعدی نہیں دکھائی جتنی ریلوں کو پھیلانے میں دکھائی گئی تھی۔

سر آرتھر کاٹن جس نے کاویری اور گوداوری کے بند بنائے تھے ان چند لوگوں میں تھا جو ہندوستان میں آب پاشی اور بار برداری کے لیے نہروں کی اہمیت کو تسلیم کرتے تھے۔ اس نے پارلیمانی کمیٹی کے سامنے ایک پُرجوش حامی کی قابل معافی مبالغہ آمیزی کے ساتھ اپنے خیالات ظاہر کیے۔ اس نے کہا "ہندوستان کے دیہات کی ہر سمت میں آپ نہر لے جا سکتے ہیں۔ یعنی ہر اُس سمت میں جہاں خاصی آبادی ہو۔" اس نے اپنی بات کی وضاحت مندرجہ ذیل الفاظ میں کی۔

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کو آب رسانی کی ضرورت ہے۔ ریلیں قطعی ناکام ہو چکی ہیں۔ وہ مطلوبہ قیمت پر بار برداری نہیں کر سکتی ہیں۔ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ ضرورت کے مطابق سامان نہیں لے جا سکتی ہیں۔ ہندوستان کو ہر سال ان پر تین ملین کی رقم خرچ کرنی پڑتی ہے جو بڑھتی جا رہی ہے۔ ایسی نہریں جن میں دخانی کشتیاں چل سکیں ریلوں پر خرچ ہونے والی رقم کی 1/8 میں تعمیر کی جا سکتی تھیں۔ ان نہروں کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ سامان کم سے کم قیمت پر مطلوبہ رفتار سے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جا سکتا تھا۔ خزانے کو انھیں سہارا نہ دینا پڑتا اور ان سے آب پاشی کا کام بھی لیا جا سکتا تھا۔"[1]

1۔ 1872ء کی رپورٹ، سوالات نمبر 8429 اور 8560

انصاف کا تقاضا ہے کہ ہم یہ بتائیں کہ دو اور حاکم یعنی سرچارلس ٹریویلین اور لارڈ لارنس بھی ہندوستان کے لیے آب پاشی کے ذرائع کی اہمیت کو تسلیم کرتے تھے سرچارلس ٹریویلین نے کہا تھا۔ ہندوستان کے لیے آب پاشی کے ذرائع سب کچھ ہیں۔ پانی زمین سے زیادہ بیش قیمت ہے۔ جب زمین کو پانی دیا جاتا ہے تو اُس کی پیداواری قوت کم سے کم چھ گنا بڑھ جاتی ہے بلکہ عام طور سے تو اس سے بھی بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ پانی کی وجہ سے وہ بڑے علاقے پیداوار کے قابل ہو جاتے ہیں جن میں کچھ نہیں یا بہت کم پیداوار ہوتی ہے۔"[1]

بیس سال یا اس سے کچھ زیادہ مدت تک لارڈ لارنس ہندوستان کے لیے آب پاشی کے ذرائع کی وکالت کرتا رہا تھا۔ وہ ملک کی ضرورت کے لیے ریلوں کے مقابلے میں آب پاشی کے ذرائع کو بہت زیادہ اہم سمجھتا تھا۔ لیکن اس موضوع کے متعلق عام طور سے پائی جانے والی بے توجہی کی وجہ سے وہ کامیاب نہیں ہو سکا چنانچہ اُس کے زمانہ حکومت میں بھی ذرائع آب پاشی کے مقابلے میں ریلیں تیزی سے بنیں۔

لیکن ایک بات میں اُس نے خاص طور سے سختی برتی۔ اُس نے پانی کا لازمی محصول نہیں عاید کیا اُس نے کسانوں کو آزادی دی کہ اگر وہ چاہیں تو پانی لیں اور اُس کا معاوضہ ادا کریں۔ "نہریں تعمیر کرنے کی خواہش کے باوجود میں اُنھیں (لوگوں کو) پانی لینے پر مجبور کرنے کے مقابلے میں اس کو بہتر سمجھتا ہوں کہ کوئی نہر تعمیر نہ کی جائے۔"[2]

جوں جوں ضمانت کے طریقے کے تحت نجی کمپنیوں سے ریلیں تعمیر کروانا رفتہ رفتہ ترک کیا جاتا رہا ویسے ویسے ریلوں پر ہونے والا سرکاری خرچ سال بہ سال بڑھتا گیا۔ لیکن آب پاشی کے ذرائع کی تعمیر کا کام ابتدا سے حکومت کے ہاتھوں میں رہا تھا۔ چنانچہ سرکاری خرچ آب پاشی کے ذرائع پر ہونے والے مجموعی خرچ کی نمائندگی کرتا ہے۔ ہم "اعداد و شمار کے خلاصے" سے مندرجہ ذیل اعداد و شمار پیش کر رہے ہیں جو ریلوں اور آب پاشی کے ذرائع پر امپیریل فنڈس سے ہونے والے اُس خرچ کو ظاہر کرتا ہے جو آمدنی سے وصول نہیں کیا گیا۔

1۔ 1873ء کی رپورٹ، سوال نمبر 8130

2۔ 1873ء کی رپورٹ، سوال نمبر 4408۔ لارڈ لارنس کے زمانۂ حکومت کا طریقہ بدل گیا ہے اور مدراس اور دوسرے علاقوں میں لازمی پانی کا محصول لگا دیا گیا ہے۔

	سرکاری ریلیں پونڈ	آب پاشی کے ذرائع پونڈ
مارچ 1870ء تک ہونے والا خرچ	7,43,862	26,95,465
〃 1871ء 〃 〃 〃	4,49,372	7,18,438
〃 1872ء 〃 〃 〃	6,44,620	9,83,854
〃 1873ء 〃 〃 〃	14,13,649	7,70,920
〃 1874ء 〃 〃 〃	23,54,625	11,98,682
〃 1875ء 〃 〃 〃	30,14,180	12,35,391
〃 1876ء 〃 〃 〃	31,65,184	11,05,445
〃 1877ء 〃 〃 〃	28,65,861	9,43,423
〃 1878ء 〃 〃 〃	39,84,968	8,06,084
〃 1879ء 〃 〃 〃	33,27,888	7,94,654
〃 1880ء 〃 〃 〃	26,80,493	5,98,837
کل میزان	2,46,44,702	1,18,51,193

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ضمانت شدہ کمپنیوں اور حکومت نے ریلوں پر جو رقمیں مارچ 1880ء تک خرچ کیں اُن کا کل میزان 125 ملین پونڈ تھا جب کہ آب پاشی کے ذرائع پر کل بارہ ملین پونڈ خرچ کیے گئے تھے۔ دو قسم کے مفاد عامہ کے کاموں پر خرچ ہونے والی رقموں کے فرق نے سر آرتھر کاٹن کو تکلیف پہنچائی تھی اور 1877ء میں پڑنے والے مدراس کے خوفناک قحط کے بعد اُسے موقع مل گیا کہ وہ انگلستان کی رائے عامہ کو اُس احمقانہ پالیسی کے خلاف ہموار کر سکے جس پر ہندوستان میں عمل کیا جا رہا تھا۔

ہندوستان کے اُن معاشی مسائل پر انگلستان کے لوگ شاذ ہی غور کرتے تھے جن سے انگلستان کے تاجروں اور صنعت کاروں کے مفادات وابستہ نہیں تھے۔ سر آرتھر کاٹن نے ہندوستان کے تعلق سے آب پاشی کے ذرائع کی اہمیت پر لوگوں کی توجہ مرکوز کرانے کی ہر امکانی کوشش کی تھی۔

حالانکہ اس نے کاویری اور گوداوری کے بند بنا کر عملی ثبوت پیش کر دیا تھا پھر بھی وہ برطانوی رائے عامہ کو متوجہ کیے بغیر اپنی قبر میں چلا گیا ہوتا اگر اس زمانے کے ایک ممتاز و نمایاں انگریز کی ہمدردی اور حمایت اُسے حاصل نہ ہو گئی ہوتی۔ جان برائٹ نے اُس کا ساتھ دیا۔

مانچسٹر کے ایک جلسہ عام میں، جو جنوری 1878ء میں منعقد ہوا تھا۔ مسٹر برائٹ نے سر آرتھر کاٹن کی اس تجویز کی حمایت کی کہ ہندوستان میں ایسی کئی نہریں بنائی جائیں جن میں جہاز رانی کی جا سکے اور اُن کی تعمیر پر تیس ملین پونڈ خرچ کیے جائیں۔ اس سے حکام میں سراسیمگی پھیل گئی۔ جان برائٹ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اُس اسکیم کی طرف بے توجہی نہیں برتی جا سکتی تھی جس کی حمایت اُس نے کی تھی۔ اُن ریلوں پر سو ملین خرچ کیے جا چکے تھے جن سے انگریز واقف تھے۔ لیکن آب پاشی کے ذرائع اُن کے لیے اجنبی تھے۔ اُن پر تیس ملین خرچ کرنا اُن کے خیال میں روپیہ برباد کرنا تھا۔ پورے ہندوستان میں نہریں تعمیر کرانا ایک اوسط انگریز کے نزدیک ان جانی سرزمین پر قدم رکھنے کے مترادف تھا

لارڈ جارج ہملٹن نے، جو اُس وقت تیس سال کا نوجوان اور انڈر سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا تھا، اپنی تقریر میں ان خطرات کا اظہار کیا۔ اس امر کے پیش نظر کہ آب پاشی کے ذرائع ڈیلٹا کے علاوہ ہر جگہ ناکام ہو چکے تھے اُس کے خیال میں یہ طریقہ صحیح نہیں تھا کہ کوئی شخص اُس جدو جہد کی حمایت کرے جو حکومت کو اتنا زیادہ روپیہ خرچ کرنے پر مجبور کرنے کے لیے چلائی جا رہی تھی اور ان بدنام زمانہ حقایق کو چھپانے کی کوشش کرے۔ اُسے خاص طور سے اس بات کا افسوس تھا کہ آرتھر کاٹن کی حمایت ایسی ممتاز و نمایاں شخصیت کی طرف سے ہوئی جیسے برمنگھم کا رائٹ آنریبل ممبر، وہ اتنا اچھا مقرر ہے کہ عام لوگوں کو متاثر کرنے میں شاذ ہی ناکام ہوتا ہے۔ [1]

1۔ لارڈ جارج ہملٹن کی تقریر، 22 جنوری 1878ء۔ لارڈ جارج نے اپنی تقریر میں سر آرتھر کاٹن کا ذکر جن الفاظ میں کیا اُن کی بنا پر سر آرتھر کو شکایت پیدا ہو گئی۔ سکریٹری آف اسٹیٹ کو بھیجے جانے والے جواب میں سر آرتھر کاٹن نے لکھا کیا یہ بات مناسب اور مفاد عامہ کے حق میں تھی کہ ایک ایسا نوجوان جس نے ہندوستان کی سرزمین پر کبھی قدم نہیں رکھا ہے، کبھی ایک تالاب 'سنبھالا' کیا ہوا زمین کا ایک چپہ یا ایک میل لمبی ایسی نہر نہیں دیکھی ہے جس میں دخانی کشتی چل سکے یا اُن ضلعوں کے کسی ایک کسان سے کبھی بات نہیں کی ہے جہاں آب پاشی کی سہولتیں حاصل ہیں اور اس لیے لازمی طور سے اس موضوع کے متعلق کوئی واقفیت نہیں رکھتا ہے ایوان اور دنیا کے سامنے ایک ایسے افسر کے متعلق توہین آمیز لہجہ اختیار کرے جو اُسکے دادا کے برابر ہے۔۔۔ یہ ایسا مسئلہ ہے جس کی طرف میں ادب کے ساتھ رائٹ آنریبل سکریٹری آف اسٹیٹ اور اس کی کونسل کو توجہ دلانا چاہتا ہوں۔" سر آرتھر کاٹن کی سوانح (Life of Sir Arthur cotton) لیڈی ہوپ، لندن، 1900ء

ہنری فاسٹ نے "اس امر کو غیر پسندیدہ قرار دیا کہ اس مسئلہ پر بحث کرتے وقت ذاتی پسند یا عدم پسند کا اظہار کیا جائے کہ ریلوں اور آب پاشی کے ذرائع میں کس سے زیادہ فائدہ ہوگا اور کون بار بار پڑنے والے قحطوں کو روکنے میں زیادہ معاون ثابت ہوگا۔"

اس کے بعد جان برائٹ کھڑا ہوا اور اس نے اپنے تمام تر اثر و اقتدار کے ساتھ دریافت کیا "اس کمیٹی کو مقرر کرنے کا یہ خصوصی مقصد کیوں نہ قرار دیا جائے کہ انگلستان میں حاصل ہونے والی شہادت کی بنا پر اور بشرطِ ضرورت ہندوستان میں حاصل ہونے والی شہادت کی بنا پر بھی، ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ آتنی مدت تک قابض رہنے کے بعد اس سے زیادہ ہم کیوں نہیں کہہ سکتے ہیں کہ وہاں خشک سالی ہوتی ہے اور اس کے بعد قحط پڑتا ہے؟

ہم نے سنا ہے کہ اس قسم کے کاموں پر (آب پاشی کے) نو ملین یا سولہ ملین پونڈ خرچ کیے جا چکے ہیں۔ ہندوستان کے لیے اس رقم کی حقیقت کیا ہے؟ صرف مانچسٹر کا شہر جس کی آبادی نصف ملین ہے، دو ملین پونڈ خرچ کر چکا ہے اور اب پارلیمنٹ سے اس نے درخواست کی ہے کہ مزید 3½ ملین خرچ کرنے کی اجازت دی جائے۔ یہ رقم 5½ ملین ہو جائے جو اس شہر اور اس کے مضافات کو کافی مقدار میں صاف پانی مہیا کرنے پر صرف کی جائے گی۔ لیکن ہندوستان میں دو سو ملین لوگ برطانوی حکومت کی رعایا ہیں۔ وہاں ہونے والی بارش اور بڑے بڑے دریا آب پاشی کے بے اندازہ ذرائع ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ذرائع موجود ہیں۔"

سر جارج کیمپ بیل نے صوبہ بنگال کے اعلیٰ عہدے سے ریٹائر ہونے کے بعد پارلیمنٹ کا ممبر ہو گیا تھا، سر آرتھر کاٹن پر جملے کسے اور "خیال ظاہر کیا کہ اس کے متعلق کہی جانے والی اس بات میں کسی حد تک صداقت ہے کہ اس کے اعصاب پر پانی سوار رہتا ہے۔" لیکن جنرل سر جارج بال فور نے آب پاشی کے اس عظیم اور مخلص ماہر کا ذکر محبت و احترام کے ساتھ کیا۔ اس نے ایوان کے سامنے کہا کہ "اسے یقین نہیں تھا کہ سر آرتھر کاٹن کا کیا ہوا کوئی کام کبھی ناکام رہا ہو۔" "سر آرتھر کاٹن بڑی صلاحیت و ذہانت کا مالک ہے۔ اس نے عام لوگوں کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ اس نے ہندوستان کو بڑا فائدہ پہنچایا ہے۔ آئندہ نسلیں اسے ایک ایسے انسان کی حیثیت سے یاد رکھیں گے جس نے اس ملک کے لیے بڑے بڑے کام سر انجام دیے۔"

جس تحقیقات کا مطالبہ کیا گیا تھا اس سے انکار نہیں کیا جا سکا۔ 22 جنوری 1872ء کو ایک سلیکٹ کمیٹی کا تقرر عمل میں آیا۔ لارڈ جارج ہملٹن اس کا صدر تھا۔ بارہ گواہوں کے بیانات لیے گئے، جن میں

لارڈ نارتھ بروک، لارڈ نیپیر اور سر ولیم میور شامل تھے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ سب سے اہم گواہ سر آرتھر کاٹن تھا۔ اُس کی اسکیم کے متعلق فیصلہ کیا جانے والا تھا۔

سر آرتھر نے بیان کے شروع میں اپنا پورا مقدمہ چند لفظوں میں کمیٹی کے سامنے پیش کر دیا۔

"ریلوں کا حساب کھاتا مندرجہ ذیل ہے۔

اخراجات تعمیر	11,20,00,000
قیمت زمین	80,00,000
موجودہ قرض	5,00,00,000
میزان	17,00,00,000

اس سے تقریباً 7,500 میل ریل کی پٹری بچھی یانی میل 23,000 پونڈ خرچ ہوئے۔ موجودہ شرح کے مطابق خزانے کو سرمائے پر ½4 ملین سود اور زمین اور قرض پر 4 فی صدی کے حساب سے 3 ملین سود ادا کرنا ہوتا ہے جس کی مجموعی رقم ½7 ملین ہوتی ہے۔ اس میں سے ½4 ملین خالص آمدنی کی منہائی کے بعد لگائے جانے والے روپے پر ہر سال تین ملین کا خسارہ ہوتا ہے۔"

"آب پاشی کے ذرائع پر صرف ہونے والا سرمایہ 1,60,00,000 پونڈ ہے جس میں تمبھدرا بھی شامل ہے۔ باری دو آب گنگا اور دوسری نہروں کا جمع ہونے والا سود کاویری کرشنا اور گوداوری کے حق میں جمع ہونے والی کل رقم سے بہت زیادہ ہے۔ جن کے حق میں کم سے کم دس ملین جمع ہوئے تھے اس طرح اُن کے حق میں پانچ ملین بچے۔ اگر لگائی جانے والی کل رقم کو 1,10,00,000 سمجھا جائے تو 4 فی صدی کی شرح سے اُس کا سود پانچ لاکھ ہوا۔ اس کے برخلاف رواں اخراجات پر ہونے والا خالص منافع تقریباً ایک ملین ہے۔ اس طرح خزانے کو آب پاشی کے کاموں سے پانچ لاکھ سالانہ کی خالص بچت ہوئی۔"[1]

لیکن سر آرتھر کاٹن نے سب سے زیادہ زور اس پر دیا کہ ریلیں قحط کے خلاف تحفظ نہیں کر سکتی ہیں "ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ مدراس، میسور، حیدر آباد اور بمبئی میں قحط سے متاثر ہونے والے چالیس ملین لوگوں میں سے چار پانچ ملین موت کے گھاٹ اُتر گئے حالانکہ ہم نے ریلوں پر 120 ملین خرچ کیے اور اس کے علاوہ پچاس ملین پونڈ قرض لیے۔"[2] اُس نے زور دیکر کہا کہ ریلیں انسانوں اور جانوروں کے لیے غذا

1۔ سوال نمبر 2204

2۔ سوال نمبر 2204

نہیں مہیا کر سکیں، پورے ملک کے آنے جانے والوں کے لیے کافی نہیں ثابت ہوئیں، سستی سواری نہیں ہیں، لاگت اور قرض پر سود ادا نہیں کرتی ہیں، ملک کی زمین سے غیر ضروری پانی کے نکاس کا انتظام نہیں کرتی ہیں اور لوگوں کے پینے کے لیے پانی مہیا نہیں کرتی ہیں۔ آب رسانی کے ذرائع سے یہ سب کچھ ہوا اور ہو سکتا ہے۔

پھر آب پاشی اور جہاز رانی کی نہروں کو نظر انداز کیوں کیا جاتا ہے؟ اگر ان نہروں کے ذریعہ کم خرچ میں مال لایا لے جایا جا سکتا ہے تو حکومت ہند اُن کو تعمیر کیوں نہیں کرتی ہے؟

برمنگھم کے ایک بینکر سمسن لائیڈ نے، جو کمیٹی کا ممبر تھا، دریافت کیا "میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کیا سوچتے ہیں؟ کوئی شخص کم خرچ ذریعہ باربرداری سے کیوں خائف ہو؟" سر آرتھر کاٹن نے جواب دیا "اصل بات یہ ہے کہ اس کی وجہ سے ریلیں مہمل ثابت ہو جائیں گی۔ ایسٹرن بنگال ریلوے کے ساتھ ساتھ تعمیر ہونے والی ایک نہر کا تصور کیجیے۔ یہ ریل قریب قریب 2,00,000 ٹن مال ڈھوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ چلنے والی نہر کے ذریعہ 20,00,000 ٹن مال ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جا سکتا ہے اور وہ مسافروں اور مال سے ہمیشہ بھری رہ سکتی ہے۔ اس سے ریلوں کی کتنی سبکی ہو گی۔"[1]

اس جواب سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سر آرتھر کو کس حد تک یقین تھا۔ لیکن اُس نے جو کچھ کہا وہ حقیقت پر مبنی تھا۔ ہندوستان کی کم خرچ ذریعہ باربرداری اور آب پاشی کی خصوصی ضرورتوں کو انگریز نہیں سمجھ سکتے تھے۔ ریلوں کا جال بچھانے کے بعد جہاز رانی کے قابل نہریں بنانے میں وہ پس و پیش سے کام لے رہے تھے۔ ذریعہ باربرداری کی حیثیت سے یہ نہریں ریلوں کا مقابلہ کر سکتی تھیں اور کمپنیوں کے اُس منافع کو کم کر سکتی تھیں جس کی حکومت نے ضمانت کی تھی یا جو حکومت کو سرکاری ریلوں سے حاصل ہو رہا تھا۔ فطرت نے ہندوستان کو جہاز رانی کے قابل بڑے بڑے دریا بخشے تھے جو زمانہ قدیم سے تجارتی راستوں کا کام دے رہے تھے۔ اگر نہروں کا ایسا جال بچھا دیا جاتا جن کو ان دریاؤں سے پانی ملتا تو وہ کم خرچ پر باربرداری کی لوگوں کی ضرورتیں پوری کرتیں اور اُس کے ساتھ پیداوار میں اضافہ کر دیتیں، فصلوں کی ضامن ہوتیں اور قحطوں سے نجات دلاتیں۔ لیکن انگریزوں نے ایک جغرافیائی غلطی کی۔ اُنھیں اپنے ملک میں نہروں کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی اس لیے انھوں نے ہندوستان میں بھی نہروں کو نظر انداز کیا۔

جہاز رانی کے خاص خاص راستے جن کی سفارش سر آرتھر کاٹن نے کی تھی مندرجہ ذیل تھے۔

1۔ سوال نمبر 2269

(1) کلکتہ سے کراچی تک جس کے لیے گنگا اور دریائے سندھ استعمال کیے جائیں۔(2) کوکناڈا سے سورت تک جس کے لیے گوداوری اور تاپتی استعمال کی جائیں۔(3) تبھدرا سے کاروار تک جو بحر عرب کے ساحل پر واقع ہے۔(4) بالاگھاٹ اور کوئمبٹور ہوتا ہوا پونانگ کا راستہ۔

دوسرے گواہوں نے بھی سر آرتھر کاٹن کی طرح جہاز رانی کے لیے نہروں کے فوائد پر زور دیا۔ انھوں نے بھی کہا کہ لارڈ جارج ہملٹن نے جن کو "ناکامیوں" سے تعبیر کیا ہے وہ ناکامیاں نہیں تھیں۔ سر ولیم میور نے، جو شمالی ہندوستان کا لفٹیننٹ گورنر اور اُس کے بعد ہندوستان کا ممبر مالیات رہ چکا تھا، کہا:—

میرا خیال ہے کہ میں نے اُن فوائد کی اہمیت پر پورا زور نہیں دیا ہے جو گنگا نہر اور جمنا نہر جیسی بڑی نہروں سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ عام نقطہ نظر سے اُن ضلعوں کو حاصل ہونے والی خوشحالی بہت زیادہ ہے جن میں سے یہ نہریں گزرتی ہیں۔ اُن سے ملک کو بے حد فائدہ پہنچتا ہے۔ ایک اور فائدہ جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں، یہ ہے کہ مال گزاری محفوظ ہو گئی ہے جو نہریں نہ ہونے کی صورت میں بقایا رہتی اور وصول نہ ہو پاتی۔ اس کے علاوہ ایک فائدہ یہ ہے کہ علاقہ اُس خرابی سے محفوظ ہو گیا ہے جو قحط سے متاثر ہونے والے علاقوں میں پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ اس کو ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ علاقہ قحط کے ثانوی اثرات سے محفوظ ہو گیا ہے۔ جن کا سلسلہ قحط ختم ہونے کے بعد بھی مدتوں جاری رہتا ہے۔ دوآبے میں ہونے والی مجموعی ترقی جس کا سہرا ان نہروں کے سر ہے۔ ایک ایسا واقعہ ہے جس سے مالیاتی فوائد سے قطع نظر، چشم پوشی نہیں کی جا سکتی ہے اور نہروں سے سینچائی کے عام فوائد کے متعلق کوئی رائے قایم کرتے وقت اُس پر غور کیا جانا چاہیے۔"[1]

لیکن لارڈ جارج ہملٹن کی کمیٹی آب پاشی کے ذرائع کی اس اہمیت کو اس وسیع اور مدبرانہ نقطہ نظر سے سمجھنے میں ناکام رہی اور اُس نے بار بار اُس تنگ نظری سے کام لیا جس کی بنیاد مفاد عامہ کے کاموں سے فوری طور پر حاصل ہونے والا منافع تھا۔ سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ کے کچھ حصے ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں۔

سر آرتھر کاٹن کی تجویز ہے کہ ریلوں کی قریب قریب سب اسکیمیں اور کام فوری طور سے غیر معیّنہ مدت کے لیے ملتوی کر دیئے جائیں۔ لیکن وہ چاہتا ہے کہ اگلے دس یا بیس سال تک دس ملین سالانہ آب پاشی کے ذرائع کی، خاص طور سے نہروں کی، تعمیر پر صرف کیے جائیں (سوال نمبر 2722)۔ خاص

1۔ سوال نمبر 2885

خاص نہروں کی گہرائی اور چوڑائی ایسی ہو کہ اُس میں کشتیاں چل سکیں۔ اُس کا خیال ہے کہ تیس ملین پونڈ کے خرچ سے دس ہزار میل لمبے جہاز رانی کے ایسے راستے تعمیر کیے جا سکتے ہیں جو کثیر آبادی رکھنے والے اضلاع سے گزریں۔ اس گرانقدر رقم کا بقیہ حصہ ذیلی راستوں کی تعمیر اور دوسرے ضروری کاموں پر خرچ کیا جائے۔

"سر آرتھر کاٹن کا خیال ہے کہ اس خرچ سے حکومت کو بڑا مالی فائدہ ہوگا (سوال نمبر 2751) حالانکہ آپ کی کمیٹی اُن اعداد و شمار کے متعلق پوری معلومات نہیں حاصل کر سکی جن کی بنا پر یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ وہ اس بات پر غور کرنا اپنے لیے ضروری نہیں سمجھتا کہ خرچ ہونے والی رقم کس طرح اور کس شرح سود پر حاصل کی جا سکے گی۔ پورے ہندوستان میں یک لخت اور بیک وقت اتنی بڑی بڑی رقمیں خرچ ہونے کی بنا پر سامان کی قیمت اور مزدوروں کی اُجرت میں جو اضافہ ہونا لازمی ہے اُس کا اندازہ لگانے اور اُسے تخمینے میں شامل کرنے کی بھی اُس نے کوئی کوشش نہیں کی ہے۔

"اس رپورٹ میں جو اعداد و شمار شامل کیے جا چکے ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہت غور و خوض کے بعد بنائی جانے والی آب پاشی کی کتنی کم اسکیمیں منافع بخش ثابت ہو سکیں۔ ان واقعات کی تصدیق خود سر آرتھر کاٹن کر چکا ہے۔ اُس سے جب پوچھا گیا کہ حکومت ہند نے پچھلے پچیس سال میں جو آب پاشی کے ذرائع تعمیر کیے ہیں اُن میں سے 'مدراس کے ڈیلٹا کے علاوہ' کون سے منافع بخش ثابت ہوئے تو اُس نے جواب دیا "آب پاشی کے بڑے کاموں سے ابھی آمدنی نہیں ہوتی ہے۔" (سوال نمبر 2214)۔ "آپ کی کمیٹی پر یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی ہے کہ اس اسکیم کی انتہائی وسعت کے باوجود اس کی نوعیت اتنی غیر حقیقی اور غیر عملی ہے کہ اس پر غور نہیں کیا جا سکتا۔ اس کو قطعی طور سے رد کر دیا جانا چاہیے۔"

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ لارڈ جارج ہملٹن کی کمیٹی کے اس نتیجے پر پہنچنے کے فوراً بعد مدراس کے فیمین کمیشن (Famine Commission) نے زیادہ باضابطہ اور مکمل طور پر ہندوستان اور انگلستان میں تحقیقات شروع کر دیں۔ اور آب پاشی کے کاموں سے فوری طور پر حاصل ہونے والے مالی فائدے اور اُس کے اہم نتائج کے بارے میں وہ جس نتیجے پر پہنچا وہ لارڈ جارج ہملٹن کی کمیٹی کے اخذ کیے ہوئے نتیجے سے بالکل مختلف تھا۔ آب پاشی کے کاموں کے متعلق فیمین کمیشن نے لکھا تھا "جہاں تک اُس میں لگائی جانے والی رقم پر ملنے والے منافع کا تعلق ہے اس کا نتیجہ ریاست کے لیے بہت مفید ثابت ہوا۔ اس کے علاوہ اُن سے عام حالات میں ملک کی دولت میں اضافہ ہوا اور خشک سالی کے زمانوں میں قحط نہ پڑا یا اُس کی شدت کم ہو گئی۔"[1]

1۔ فیمین کمیشن کی رپورٹ، 1880ء

اگر ہندوستان کے لوگوں سے مشورہ کیا جاتا' جو ریلوں اور آب پاشی کے ذرائع دونوں پر خرچ ہونے والی رقمیں مہیا کیا کرتے تھے' تو بلا شبہ پہلے تو وہ سر آرتھر کاٹن کی اس تجویز کی حمایت کرتے کہ خاص نہال ریلوے لائنوں کی تعمیر کے بعد سرکاری اور ضمانت شدہ ریلوں کی مزید توسیع روک دی جانی چاہیے۔ دوسری بات وہ یہ کہتے کہ زراعت کے فروغ اور قحطوں کی روک تھام کے لیے بہت سوچ سمجھ کر آب پاشی کے ذرائع تعمیر کیے جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ سر آرتھر کاٹن کے منصوبے "غیر حقیقی اور غیر یقینی" تھے۔ ظاہر ہے کہ لندن میں تیار کی جانے والی اسکیموں کی نوعیت صرف عارضی ہو سکتی تھی چاہے انھیں تیار کرنے والا کتنا ہی ذہین کیوں نہ ہو اور ہندوستان کے متعلق کتنا ہی تجربہ کیوں نہ رکھتا ہو۔ اگر دقت نظر اور احتیاط کے ساتھ اُن پر غور کیا جاتا تو یہ معلوم ہو جاتا کہ یہ اسکیمیں کس حد تک قابل عمل ہیں اور اُن سے کتنا مالی فائدہ ہونے کا امکان ہے۔ اگر پچیس سال پہلے یہ مفید کام کر لیا گیا ہوتا تو صدی کے آخری برسوں میں پڑنے والے قحطوں کے بدترین اثرات سے بچا جا سکتا تھا۔ لیکن لارڈ جارج ہملٹن کی کمیٹی اپنا فیصلہ صادر کر چکی تھی اور سر آرتھر کاٹن کی دور اندیشی اور جان برائٹ کی فراخ دلانہ ہمدردی نے جو موقع دیا تھا اُس کو اس طرح کھو دیا گیا کہ پھر کبھی وہ اُس صدی میں حاصل نہ ہو سکا۔

باب 10

مالیات اور ہندوستان کا قرض

1858ء یعنی وہ سال جب ملکہ نے ہندوستان کی حکومت اپنے ہاتھوں میں لی اور 1877ء کی درمیانی مدت میں، جب ملکہ نے قیصر ہند کا لقب اختیار کیا، سالانہ حسابات پیش کرنے کے طریقے میں وقتاً فوقتاً تبدیلی ہوتی رہی۔

جب 60-1859ء کے حسابات پارلیمنٹ میں پیش کیے گئے تو ضمانت شدہ ریلوں کے سرمائے پر ادا کیے جانے والے سود کا بار پہلی مرتبہ سال کی آمدنی پر ڈالا گیا۔

68-1867ء میں یہ پالیسی بنائی گئی کہ قرض لی ہوئی رقموں سے بڑے بڑے پیداآور کام کیے جائیں اور قرض لیے ہوئے سرمائے کو آمدنی اور اخراجات کے حسابات میں شامل کیا جاتے۔ لارڈ میو کے زمانہ حکومت میں سرمائے کو حسابات میں شامل نہ کر کے بچت دکھائی گئی تھی۔ قرض لیا ہوا سرمایہ مفاد عامہ کے پیداآور کاموں کی خاطر لیے جانے والے قرض کی مد میں دکھایا گیا تھا اور قرض کا سود آمدنی اور خرچ کے معمولی حساب میں دکھایا گیا تھا۔

71-1870ء میں لارڈ میو کی لامرکزیت کی اسکیم کے تحت یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ مختلف صوبائی حکومتوں کو معینہ رقمیں دی جاتی تھیں اور ان پر ذمہ داری ڈالی گئی تھی کہ کچھ اخراجات ان رقموں میں سے کیے جائیں۔ اس سال اس کا مالیاتی اثر صرف اتنا پڑا کہ 2,00,000 پونڈ پیشگی ادا کرنے پڑے تاکہ ان حکومتوں کو معمولی اخراجات کے لیے رقمیں مہیا کی جا سکیں۔ لیکن 72-1871ء سے 76-1875ء تک کچھ حاصل ہونے والی رقمیں جن کا تخمینہ تقریباً 6,50,000 پونڈ لگایا گیا تھا، اخراجات میں سے منہا کر دی گئیں اور آمدنی اور خرچ کے حسابات کو ان رقموں کی حد تک کم کر دیا گیا اور 5,00,000 پونڈ کی رقم کا یک مشت خرچ صوبائی ملازمین پر خرچ ہونے والی مقررہ رقم کے طور پر دکھایا گیا۔

1871-72ء کے بعد خالص آمدنی کا گوشوارہ ترک کر دیا گیا۔ مجموعی آمدنی دکھائی جانے لگی اور وصولیابی پر ہونے والا خرچ مجموعی اخراجات میں شامل کیا جانے لگا۔

1876-77ء کے بعد صوبائی حکومتوں کو دی جانے والی معینہ رقموں کو دکھانے کا طریقہ بدل دیا گیا۔ صوبائی ملازموں کو دی جانے والی رقموں کو یکجا دکھانے کے بجائے مناسب مدات کے تحت وصول اور خرچ ہونے والی رقموں کی تفصیلات دکھائی جانے لگیں۔ اسی سال سے مفاد عامہ کے پیداآور کاموں سے ہونے والی سالانہ آمدنی اور ان کے سود میں دی جانے والی اور ان پر خرچ ہونے والی رقمیں بھی دکھائی جانے لگیں۔

1877-78ء سے صوبائی محاصل کی ایک نئی مد شروع کی گئی جس کے تحت وہ وصولیابیاں درج کی جاتی تھیں جو 1877ء میں لگائے جانے والے زمین کے خصوصی محاصل سے ہوتی تھیں۔ دوسرے سال ایک اور تبدیلی کی گئی۔ تمام مقامی فنڈوں کو، جن کا حساب پہلے علاحدہ علاحدہ رکھا جاتا تھا۔ عام آمدنی کے کھاتے میں شامل کر دیا گیا اور اخراجات کے مختلف مدات میں ان سے مطابقت رکھنے والی رقمیں درج کر دی گئیں۔

مندرجہ ذیل اعداد و شمار جو 1858-59ء اور 1876-77ء کی درمیانی انیس سالہ مدت میں ہونے والی ہندوستان کی آمدنی اور اخراجات کو ظاہر کرتے ہیں اس اعداد و شمار کے خلاصے سے لیے گئے ہیں جو ہر سال پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ آمدنی کی مد کے تحت ہم نے مال گزاری علاحدہ دکھائی ہے اور اخراجات کی مد کے تحت وہ خرچ علاحدہ دکھایا گیا ہے جو انگلستان میں کیا جاتا تھا۔

سال	مال گزاری پونڈ	مجموعی آمدنی پونڈ	انگلستان میں ہونے والا خرچ پونڈ	مجموعی خرچ پونڈ
1858-59	1,81,23,658	3,60,60,788	74,66,136	5,10,56,930
1859-60ء	1,87,57,400	3,97,05,822	72,39,451	5,18,61,720
1860-61ء	1,85,08,991	4,29,03,234	77,45,848	4,81,54,087
1861-62ء	1,96,84,668	4,38,29,472	76,24,476	4,48,70,232
1862-63ء	1,95,70,147	4,51,43,752	72,52,317	4,40,53,122

4,49,82,006	68,94,234	4,46,13,032	2,03,03,423	1863-64ء
4,64,50,990	69,98,770	4,56,52,897	2,00,95,061	1864-65ء
4,73,32,102	62,11,178	4,89,35,220	2,04,73,897	1865-66ء
4,46,39,924	75,45,518	4,21,22,433	1,91,36,449	1866-67ء (1) (11 مہینے)
5,01,44,569	84,97,622	4,85,34,412	1,99,86,640	1867-68ء
5,34,07,334	1,01,81,747	4,92,62,691	1,99,26,171	1968-69ء
5,33,82,026	1,05,91,013	5,09,01,081	2,10,88,019	1969-70ء
5,10,98,506	1,00,83,004	5,14,13,686	2,06,22,823	1970-71ء
4,86,14,512	98,50,912	5,01,10,215	2,05,20,337	1971-72ء
5,06,38,386	1,05,47,908	5,02,19,489	2,13,48,668	1972-73ء
5,49,59,228	1,02,65,557	4,95,98,253	2,10,37,912	1973-74ء
5,43,00,545	1,06,04,994	5,05,70,171	2,12,96,793	1974-75ء
5,39,11,747	98,98,683	5,13,10,063	2,15,03,742	1975-76ء
5,81,78,563	1,34,67,763	5,59,95,785	1,98,57,152	1976-77ء

ان اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی مجموعی آمدنی اٹھارہ سال میں یعنی 1875-76 کے آخیر تک 36 ملین سے بڑھ کے 51 ملین ہو گئی اور انگلستان میں خرچ ہونے والا اس کا حصہ یعنی گھریلو اخراجات اس مدت میں $7\frac{1}{2}$ ملین سے بڑھ کر 10 ملین ہو گئے۔

اس کے بعد 1876-77ء کا اہم سال آیا جب مدراس کے قحط کی بنا پر مال گزاری میں کمی ہو گئی۔ اس سال کی مجموعی آمدنی اور مجموعی اخراجات میں یک لخت ہونے والے اضافے کی وجہ یہ تھی کہ حسابات میں پیداآور کاموں کا سود آمدنی اور خرچ میں شامل کر لیا گیا تھا جس کی وضاحت ہم پہلے کر چکے ہیں۔ اس سال سے ریلوں سے ہونے والے تمام تر خالص آمدنی وصولیابیوں میں دکھائی گئی۔

(1) حسابات کے طریقوں میں ہونے والے تبدیلیوں کے متعلق ہنری واٹر فیلڈ کی یادداشت مورخہ 20 اپریل 1880ء 1866-18 تک سرکاری سال 30 اپریل کو ختم ہوا کرتا تھا۔ 1867ء سے وہ 31 مارچ کو ختم ہونے لگا۔ چنانچہ مندرجہ بالا نقشے میں 1866-67ء کے اعداد و شمار صرف گیارہ مہینے کے ہیں یعنی یکم مئی 1866ء لغایت 31 مارچ 1867ء۔

اور تمام تر ضمانت شدہ سود اور کمپنیوں کو ادا کیا جانے والا منافع اخراجات میں دکھایا جاتا تھا۔
1856-57ء کے غدر سے فوراً پہلے ہندوستان کا قرض ½59 ملین تھا اور اس سے اگلے سال بڑھ کے ½69 ملین پونڈ ہو گیا تھا۔ چونکہ غدر کے تمام اخراجات کا بار ہندوستان پر ڈالا گیا تھا اس لیے 1860ء میں سرکاری قرض سو ملین سے زیادہ ہو گیا۔ ضمانت کا طریقہ ترک کرنے کے بعد چونکہ ریلوں کی تعمیر کا کام حکومت نے اپنے ذمے لے لیا تھا، اور قرض کے سرمائے سے بے سوچے سمجھے ریلوں کو توسیع دی گئی تھی، اس لیے 1870ء کے بعد سرکاری قرض میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہونے لگا۔

سال	ہندوستان کا قرض اور مالی ذمہ داریاں پونڈ	انگلستان میں حاصل کیا جانے والا قرض۔ پونڈ	میزان پونڈ
1858-59ء	6,60,82,031	1,50,89,277	8,11,71,308
1859-60ء	7,19,69,460	2,61,38,000	9,8$,07,460
1860-61ء	7,19,01,081	2,99,76,000	10,18,77,081
1861-62ء	7,24,18,859	3,50,95,300	10,75,14,159
1862-63ء	7,26,56,135	3,18,39,100	10,44,95,235
1863-64ء	7,22,07,645	2,63,10,500	9,85,18,145
1864-65ء	7,23,52,455	2,61,25,100	9,84,77,555
1865-66ء	7,14,37,251	2,69,46,400	9,83,83,651
1866-67ء	7,25,26,815	2,95,38,000	10,20,64,815
1867-68ء	7,12,89,111	3,06,97,000	10,19,86,111
1868-69ء	7,11,68,289	3,16,97,900	10,28,66,189
1869-70ء	7,29,89,638	3,51,96,700	10,81,86,338
1870-71ء	8,13,72,859	3,76,27,617	11,90,00,476
1871-72ء	8,27,54,841	3,90,12,617	12,17,67,458
1872-73ء	8,24,84,476	3,90,12,617	12,14,97,093
1873-74ء	8,18,37,043	4,11,17,617	12,29,54,660

13,03,35,597	4,85,97,035	8,17,38,564	1874-75ء
13,45,56,809	4,97,97,033	8,47,59,776	1875-76ء
13,89,35,025	5,53,97,033	8,35,37,992	1876-77ء

یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مالیات کے متعلق مقرر ہونے والی سلیکٹ کمیٹی کی سفارشں پر 71-1870ء کی رقموں پر نظرثانی کی گئی تھی اور ان میں ایسی مالی ذمہ داریاں شامل کر دی گئی تھیں جو پہلے نہیں دکھائی جاتی تھیں اور یہ طریقہ آئندہ برسوں میں بھی جاری رکھا گیا۔ 1876-77ء کے ختم ہوتے وقت، جو 139 ملین کا مجموعی قرض تھا اس میں وہ رقمیں شامل تھیں جو حکومت نے قرض لے کر ریاستی ریلوں کی اور آب پاشی کے ذرائع کی تعمیر پر خرچ کی تھیں لیکن وہ رقمیں شامل نہیں تھیں جو نجی کمپنیوں نے ہندوستان کی آمدنی سے ملنے والے ضمانت شدہ سود کی شرط پر خرچ کی تھیں۔ 187677ء تک حکومت ریاستی ریلوں اور آب پاشی کے کاموں پر 24 ملین خرچ کر چکی تھی یعنی ریاستی ریلوں پر 146,51,253 پاؤنڈ اور آب پاشی کے کاموں پر 96,51,618 پونڈ۔

یہ بتانا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا رقموں میں بارہ ملین پونڈ کا ایسٹ انڈیا کا مشترک سرمایہ بھی شامل نہیں تھا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کا سرمایہ تھا اور جس پر ہندوستان اس وقت بھی سود ادا کر رہا تھا۔

ہم ایک گزشتہ باب میں دیکھ چکے ہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی سو سالہ حکومت کے دوران 69½ ملین قرض کا بار حکومت ہند پر ڈال دیا تھا افسوس کی بات تو یہ ہے کہ ملکہ کی حکومت نے انیس سال میں اس قرض کی رقم کو دگنا کر کے 139 ملین کر دیا جس میں ایسٹ انڈیا کا مشترک سرمایہ شامل نہیں تھا۔

ایک دفعہ پھر ہم فرض کریں کہ ایک آزاد اور غیر جانب دار عدالت کو ایک ایسی بین الاقوامی ثالثی عدالت کو جو صرف برطانوی یا ہندوستانی ججوں پر مشتمل نہ ہوتی ۔ 1877ء کے ناقابل فراموش سال میں، جب ملکہ نے قیصر ہند کا لقب اختیار کیا تھا، 139 ملین ہندوستان کے قرض کے مقدمے کی سماعت کرنی پڑتی۔

اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ عدالت کا فیصلہ کیا ہوتا۔ ثالث کمپنی کے زمانے کے 63½ ملین قرض کو غیر قانونی قرار دیتے جو سالانہ خراج کے اس غیر منصفانہ مطالبہ

جزوی طور سے مشتمل تھا جو ہندوستان کو ادا نہیں کرنا چاہیے تھا۔[1] غالباً وہ غدر کے متعلق انگلستان کے 40 ملین قرض کو جائز قرار دیتے جو ہندوستان میں استعمال ہونے والی برطانوی فوج پر ہونے والے اخراجات کی نمائندگی کرتا تھا۔ لیکن عدالت اس میں سے وہ اخراجات منہا کرتی جو افغانستان چین، ایران اور حبشہ کی قیصری جنگوں میں استعمال ہونے والی ہندوستانی فوجوں پر ہوئے تھے۔ اس کے بعد اگر ہندوستان کی طرف کوئی واجب الوصول رقم نکلتی بھی تو وہ بہت کم ہوتی۔ اخیر میں کہہ سکتے ہیں کہ وہ مفاد عامہ کے کاموں کی خاطر لیے جانے والے 24 ملین کے قرض کو جائز قرار دیتے۔ چونکہ چھوٹی موٹی ریلوں کی تعمیر اس وقت تک کے لیے ملتوی کی جا سکتی تھی جب تک بنجی کاروباری طبقہ ان کی طرف مائل نہ ہو اور آب پاشی کے ذرائع کی سالانہ توسیع سلطنت کی معمولی آمدنی سے کی جا سکتی تھی اس لیے غالباً وہ آئندہ قرض لینے کی ممانعت کر دیتے۔ اس طرح ہندوستان کے مسلمہ سرکاری قرض کی سو ملین کی رقم ناجائز اور ناقابل وصول قرار دی جاتی۔ جب اس بھاری اور غیر منصفانہ قرض پر دیئے جانے والے سود سے پیچھا چھوٹ جاتا تو اصل کی بقایا[2] رقم ہندوستان کی آمدنی میں سے ادا کی جا سکتی تھی۔ اس طرح قومی قرضہ باقی نہ رہتا اس لیے کہ ہندوستان کو قومی قرضے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

ہندوستان کے قدیم حکمرانوں کے زمانے میں کوئی قومی قرض کا نام بھی نہیں جانتا تھا۔ جس طرح قدیم انگریز حکمراں اپنے جواہرات رہن رکھ کر قرض لیا کرتے تھے یا قرض کی ادائگی کے لیے کچھ علاقے مکفول کر دیا کرتے تھے اسی طرح قدیم ہندو اور مسلمان حکمراں ساہوکاروں سے ذاتی قرض لیا کرتے تھے۔

1688ء تک جب انگلستان میں انقلاب ہوا، اس کا سرکاری قرض بہت کم تھا۔ یہ قرض ایک ملین پونڈ بھی نہیں تھا۔[3] اگر ہندوستان انگریز حکمراں قومی قرض کے حالیہ یورپی ادارے کو رواج دینے کے بجائے قدیم ہندوستانی طریقے یا سترھویں صدی کے انگریزی طریقے پر عمل کرتے

---

(1) دیکھیے جلد اوّل، باب 63۔

(2) کمپنی کے سو سالہ حکومت میں ہندوستان نے جو خراج ادا کیا تھا اس کی رقم اور اس کے سود کو حساب میں نہ شامل کرتے ہوئے ہم فرض کرتے ہیں کہ ہندوستان کی طرف بقایا نکلے گا۔ اگر اس کو شامل کر لیا جائے تو بقایا انگلستان کی طرف نکلے گا۔

(3) 6,64,263 پونڈ۔

تو وہ زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے۔

جدید یورپی قومیں فتوحات اور نوآبادیات کو توسیع اور قوموں میں اپنی حیثیت برقرار رکھنے کے لیے قومی قرض لیا کرتی ہیں۔ ہندوستان کسی ملک فتح نہیں کرنا چاہتا ہے۔ ایشیا کے کسی ملک سے اس کی چپقلش نہیں ہے۔ ایک طاقتور اور قابل قدر حکومت کے تحت ہونے کی وجہ سے وہ خود کو غیر محفوظ نہیں سمجھتا ہے۔ برطانوی فتوحات کے مصارف اس کی سالانہ آمدنی میں سے پورے کیے جاتے رہے ہیں۔ مفاد عامہ کے کاموں کے مصارف بھی اس کی آمدنی میں سے کیے جا سکتے ہیں۔ ایسے ملک میں ایک مستقل قومی قرض کو وجود میں لانا ضروری نہیں تھا۔ غدر کے بعد جب امن قائم ہو گیا اور ملک کا نظم و نسق ملکہ انگلستان نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تو پھر قرض میں اضافے کی کیا ضرورت تھی لارڈ لارنس نے تمام اخراجات سالانہ آمدنی سے پورے کرنے کی کوشش کی تھی۔ لارڈ میو نے یہ غلطی کی کہ مفاد عامہ کے کاموں کے لیے سرمایہ قرض لیا۔ جب قرض آسانی سے مل جاتا ہے تو انسان اصراف بیجا کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور قرض بڑھتا جاتا ہے۔

خطرناک حد تک بڑھتے ہوئے قرض اور اخراجات نے مسٹر گلیڈسٹن کو متوجہ کیا جو انیسویں صدی کا سب سے بڑا ماہر مالیات تھا۔ وہ اس کو روکنا چاہتا تھا۔ چنانچہ 1871ء میں اس نے ہندوستانی مالیات کے متعلق ایک سلیکٹ کمیٹی مقرر کرنے کی تجویز پیش کی۔ اگر مسٹر گلیڈسٹن اس سلیکٹ کمیٹی میں شامل ہوتا تو اس سے ہندوستان کو بڑا فائدہ ہوتا۔ لیکن انگلستان کے وزیر اعظم کی حیثیت سے وہ اس کا رکن نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ اتنا کر سکتا تھا کہ مسٹر ہنری فاسٹ کو اس کا رکن مقرر کر دے۔ سلیکٹ کمیٹی چار سال یعنی 1871ء سے 1874ء تک کام کرتی رہی۔ بدقسمتی سے 1874ء میں لبرل حکومت ختم ہو گئی جس کی وجہ سے کمیٹی کا کام بھی رک گیا۔ چنانچہ نہ تو کمیٹی کوئی قطعی سفارشات پیش کر سکی۔ لیکن ان چار برسوں میں بیش بہا شہادتیں لی گئی تھیں جن کا ذکر گزشتہ ابواب میں کیا جا چکا ہے۔ ان بیانات کا بار بار حوالہ دینا دلچسپی سے خالی نہیں ہے جو ان لوگوں نے دیے تھے جنھیں ایک نسل پہلے ہندوستان کے مالیات کا انتظام کرنے کا موقع ملا تھا۔

ایک اہم گواہ رائٹ آنریبل ڈبلیو۔ این۔ میسی تھا جو 1865ء سے 1868ء تک ہندوستان کا وزیر مالیات رہ چکا تھا۔ اس نے نہایت زوردار الفاظ میں کمیٹی سے کہا کہ خرچ کسی صورت میں سالانہ آمدنی سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔

"برطانوی مالیات کا اصول یہ ہے کہ آمدنی خرچ کے مطابق ہونی چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ ہندوستانی مالیات کے سلسلے میں جس اصول پر عمل کیا جائے وہ اس کے برعکس ہونا چاہیے۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ کے وسائل اتنے محدود ہیں کہ آپ تھوڑا سا بھی قرض لیں تو آپ کو خسارے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آپ محاصل میں اضافہ نہیں کر سکتے ہیں۔ انکم ٹیکس کے علاوہ آپ کوئی نیا محصول نہیں لگا سکتے ہیں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جہاں تک مجھے معلوم ہے کسی نئے محصول کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔ اس لیے میں ہندوستان کے ان حکام سے جن پر مالیات کی ذمہ داری ہے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں کہ اپنے اخراجات کو آمدنی سے نہ بڑھنے دیں۔" ڈیوک آف ولنگٹن کے اس جواب کا حوالہ دیتے ہوئے جو اس نے 1834ء میں کورٹ آف ڈائریکٹرز کو دیا تھا کہ اخراجات کو آمدنی تک محدود رکھنا چاہیے اس نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ ڈیوک آف ولنگٹن کے اس جواب کے بنیادی اصول کا اطلاق پورے ہندوستان کے موجودہ نظم و نسق پر کیا جائے۔"[1]

ہندوستان کے ایک اور وزیر مالیات سر چارلس ٹریویلین نے بھی اسی قسم نے زوردار الفاظ میں شہادت دی۔ وہ چالیس سال پہلے لارڈ ولیم بینٹنک اور میکالے کے ساتھ ہندوستان میں کام کر چکا تھا۔ وہ مدراس کا گورنر بھی رہ چکا تھا اور محاصل میں اضافے کے خلاف احتجاج کرنے کی بنا پر انگلستان واپس بلا لیا گیا تھا۔ اس کے بعد 1863ء سے 1865ء تک وہ ہندوستان کے وزیر مالیات کے فرائض ادا کر چکا تھا۔ حالانکہ وہ ساٹھ سال کی پختہ عمر کو پہنچ چکا تھا لیکن جوانی کا جوش باقی تھا۔ وہ کمپنی اور ملکہ انگلستان دونوں کی ماتحتی میں کام کر چکا تھا اور ایک تجربہ کار افسر تھا۔ اس نے ملک کی حکومت کے بڑھتے ہوئے اخراجات کے خلاف احتجاج کیا۔

اس سے پوچھا گیا "کیا آپ کی رائے میں سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا بر اجلاس کونسل کے انتظام حکومت سنبھالنے کے بعد ہندوستان میں اخراجات کے مطالبوں کو پورا کرنے کا رجحان بڑھ گیا ہے۔"

اس نے جواب دیا "جی ہاں۔ اس میں شک نہیں ہے کہ ملک کی حکومت معقول خرچ اور دلیل ثابت ہوئی ہے . . . . . . میرا اشارہ اس اہم بات کی طرف ہے جو حکومت کی منتقلی کے وقت اٹھائی گئی تھی کہ انڈیا کونسل کے اراکین کو حیاتی اراکین کی حیثیت دے کر ان کی آزادی کا

---

(1) 1872ء کی رپورٹ، سوالات نمبر 8583 اور 8612۔

تحفظ کیا جائے۔ اس کے علاوہ میرا اشارہ اس انتظام کی طرف بھی ہے جو کونسل میں برقرار رکھا گیا اور جس کی رو سے ایسٹ انڈیا کمپنی کو حاصل ہونے والی آمدنی میں سے کئے جانے والے اخراجات پر کونسل کو قطعی اختیار حاصل تھا۔ لیکن جہاں تک اخراجات کا تعلق ہے اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا . . . . . حکومت پر پڑنے والے اخبارات اور با اثر حمایتوں کے داخلی اثرات اتنے شدید تھے کہ ہر تحفظ بے سود ثابت ہوا۔"[1]

اس کے کچھ دن بعد بیان دیتے ہوئے سر چارلس نے کہا "گزشتہ دور میں ایسٹ انڈیا کمپنی ملکہ کی حکومت کے مطالبوں کی جس طرح مخالفت کیا کرتی تھی اس کی وجہ سے حکومت کے راستے میں بڑی رکاوٹیں پڑ جاتی تھیں اور میں ذمہ داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کمپنی کی مخالفت بڑی حد تک موثر ثابت ہوا کرتی تھی . . . . . اگر ملکہ کے زمانہ حکومت میں ہونے والے مفاد عامہ کے کاموں کا مقابلہ کمپنی کے دور حکومت میں ہونے والے کاموں سے کیا جائے تو یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے گی۔"[2]

مدراس کے گورنر کی حیثیت سے سر چارلس ٹریویلین نے محاصل اور اخراجات میں اضافے کے خلاف چار دفعہ احتجاج کیا۔ اس نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا تھا "اس وقت سے دو متضاد پالیسیاں ہندوستان میں رائج ہو گئیں۔ ایک اخراجات میں تخفیف کی پالیسی تھی جس کی وکالت میں کرتا تھا اور دوسری اخراجات میں اضافے کی پالیسی تھی جس کی حمایت کلکتے اور انگلستان میں کی جاتی تھی۔" اسی سال اس نے دوسری اور تیسری دفعہ بھی احتجاج کیا تھا لیکن 20 مارچ 1860ء کو کئے جانے والے چوتھے احتجاج کی بنا پر اسے اپنے اعلا عہدے سے علاحدہ ہونا پڑا۔ اس نے لکھا تھا "محاصل عام لوگوں کی جائیداد کا وہ حصہ ہیں جو ضروری سرکاری اخراجات کو پورا کرنے کیلیے حکومت حاصل کر لیا کرتی ہے۔ چنانچہ جب تک یہ ثابت نہ کر دیا جائے کہ غیر ضروری اخراجات میں تخفیف کر کے حکومت اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکتی ہے اس وقت مزید محاصل کے مطالبے کو جائز نہیں قرار دیا جا سکتا۔ دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ خسارے کو پورا کرنے کا اصل طریقہ اخراجات میں تخفیف کرنا ہے . . . . . اگر ہم اس طاقت کو استعمال کر کے جو موجودہ حالات کی

---

(1) 1873ء کی رپورٹ، سوالات نمبر 415 اور 416۔

(2) ایضاً، سوال نمبر 965

بنا پر ہمیں حاصل ہے۔ قابل نفرت محاصل لوگوں پر لگا دیتے ہیں تو ان کے ساتھ ہمارے تعلقات کی نوعیت کچھ اس قسم کی ہو جائے گی کہ دیسی فوج میں تخفیف کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہو سکے گا۔ ہم بہ یک وقت غیر مطمئن لوگوں اور غیر مطمئن فوج کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں[1]۔" اس روداد کی اشاعت سر چارلس ٹریویلین کے واپس بلائے جانے کا سبب بنی جس میں واضح لیکن ناخوشگوار حقیقتوں کا اظہار کیا گیا تھا۔ لیکن اس کی طرح کے انسان کو ہندوستان کی حکومت نظر انداز نہیں کر سکتی تھی اور اس واقعہ کے تین سال بعد وہ ہندوستان کا وزیر مالیات مقرر کیا گیا۔

تخفیف اخراجات پر زور دیتے وقت سر چارلس اس راستے کی دشواریوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ قریب قریب پورا انگلستان اور ہندوستان کے تمام حکام اخراجات میں اضافہ کرنا چاہتے تھے اور ہندوستان کے لوگوں کی حکومت کے معاملات میں کوئی آواز نہیں تھی جو اخراجات میں تخفیف کرنا چاہتے تھے۔ ٹریویلین نے بڑی جرأت کے ساتھ ان دشواریوں کا مقابلہ کیا۔ اس کی شہادت کا سب سے اہم حصہ وہ ہے جس میں اس نے سفارش کی تھی کہ نئے محاصل لگاتے وقت لوگوں سے مشورہ کیا جانا چاہیے۔

اس نے کہا تھا "میرے خیال میں ان دوسرے ممالک کی طرح جہاں اس اصول پر عمل کیا جاتا ہے ہندوستان میں بھی محاصل کے لیے نمائندگی ضروری قرار دی جانی چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پہلے آٹھ صوبائی کونسلیں مقرر کی جائیں یعنی آٹھ نیم نمائندہ کونسلیں (میرا کہنا یہ نہیں کہ ابتدا میں ان کے لیے انتخابات کرائے جائیں)، جو آٹھ صوبائی صدر مراکز میں قائم کی جائیں۔ اس کے بعد ضلع کی کونسلیں ہوں جو وہاں کے ممتاز اور قابل اعتماد لوگوں پر مشتمل ہوں۔ آخر میں شہروں اور گانوؤں میں میونسپلٹیاں قائم کی جائیں اور راست انتخابات کے اصول کو اس حد تک رواج دیا جائے جس حد تک اس کو محفوظ اور قرین مصلحت سمجھا جائے:

"دیسی لوگوں میں جاندار وسیع الخیالی کی کمی نہیں ہے۔ ملک کے گوشہ گوشہ میں ایسے تالاب کارواں سرائیں اور دوسری چیزیں پائی جاتی ہیں جن کی تعمیر انفرادی سخاوت کا نتیجہ ہے۔ ان پارسیوں وغیرہ کے غیر معمولی سخاوت سے سب واقف ہیں جنھوں نے گزشتہ زمانے کی کاروباری سرگرمیوں کی بنا پر بڑی دولت پیدا کرلی ہے۔ اگر کونسلوں کو محض مشاورتی اداروں کا درجہ

---

(1) 1873ء کی رپورٹ، سوالات نمبر 1261 اور 1282۔

دیا گیا تو اراکین ان کے یورپین صدروں کے بیجا اختیارات سے کبھی نجات نہیں پا سکیں گے۔ یہ بات مناسب نہیں کہ دیسی لوگوں کو ہمیشہ باندھ کر رکھا جائے۔ یہ تو ایسا ہی ہوا جیسے کسی لڑکے کو اس وقت تک پانی میں اترنے کی اجازت نہ دی جائے جب تک تیرنا نہ سیکھ لے۔ لیکن جب تک وہ پانی میں نہیں اترے گا اور تھوڑے بہت خطرے کا مقابلہ کرکے ہاتھ پیر نہیں مارے گا اس وقت تک اسے تیرنا نہیں آئے گا۔ یہ واقعہ ہے کہ پہلے پہلے وہ لوگ خائف بھی ہوں گے اور کام سے بچیں گے بھی۔ لیکن اپنی مرضی سے تھوڑا سا کام کرنا اس بہت سے کام سے بہتر ہوا کرتا ہے۔ جو دباؤ میں آکر کیا جائے یا جو دوسروں کا مرہون منت ہو۔ انھیں خود روپیہ حاصل کرنے اور خرچ کرنے کا موقع دیجئے اس سے انھیں ضروری محرکات مل جائیں گے اور پورے نظام میں جان پڑ جائے گی۔ ان لوگوں کی نگرانی میں، جو جزویات سے واقف ہیں اور نگرانی و نگہداشت کرنے میں پوری دل چسپی رکھتے ہیں ہر شخص اپنی ذمہ داری محسوس کرے گا۔ ہندوستان کے 20,00,00,000 لوگوں کو حکومت خود اختیاری کا درس دینے کے سلسلے میں یہ سب سے بڑا قدم ہوگا جو اس ملک کے ساتھ ہمارے مراسم کا مقصد ہے"[1]

مندرجہ بالا شہادت کو تیس سال گزر چکے ہیں لیکن ابھی تک صوبائی مشاورتی کونسلیں بھی نہیں قائم کی گئی ہیں تاکہ لوگ مالیات کے انتظام میں تھوڑا بہت حصہ لے سکیں۔

اخراجات میں کمی نہیں ہوئی ہے، محاصل کا بوجھ ہلکا نہیں کیا گیا ہے اور تیس سال کے مقابلے میں آج ملک زیادہ افلاس زدہ ہے اور شدید تر قحط پڑ رہے ہیں۔

جہاں تک ہندوستان کے لوگوں کی صلاحیتوں کا تعلق ہے چالیس سالہ تجربہ رکھنے والے سر چارلس ٹریویلین کو اس میں کوئی شک و شبہ نہیں تھا۔

اس نے کہا تھا، "دیسی لوگ حکام مال کے فرائض ادا کرنے کی پوری پوری اہلیت رکھتے ہیں۔ ہندوستان کا پہلا بندوبست کرنے والے اکبر کے وزیر ٹوڈرمل اور میسور کو خوش حال بنانے والے پورنیہ سے لے کر . . . . . باصلاحیت مگر کم جانے پہچانے مہادیو راؤ اور راماینگر تک تمام دیسی لوگ مال کے کاموں کی خصوصی اہلیت رکھتے ہیں۔ محکمہ کسٹم کی تمام آسامیوں پر دیسی لوگوں کا تقرر کیا جا سکتا ہے۔"

اس کے علاوہ محکمہ عدالت ہے۔ اگر وہ ہائی کورٹ کے جج مقرر ہو سکتے ہیں تو ظاہر ہے کہ

---

(1) 1873ء کی رپورٹ، سوالات نمبر 863 اور 866۔

ماتحت حکام کی حیثیت سے کام کرنے کی اہلیت بھی ان میں ہوتی ہے۔"

"وہ (انجینئرنگ میں) اعلا استعداد کا ثبوت دے چکے ہیں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ جہاں تک آب رسانی کے کاموں کا تعلق ہے ان کا بہترین ثبوت جنوبی ہند کے قدیم آب رسانی کے ذرائع پیش کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم نے ان کی نقل کی ہے۔ سر آرتھر کاٹن کی حیثیت قدیم ہندوستانی انجینئروں کے ایک ایسے نقال سے زیادہ کچھ نہیں جس نے بڑے پیمانے پر کام کیا اور اپنی ذاتی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا۔"[1]

دوسرے ایسے بڑے حاکموں نے بھی تشخیص اور محاصل کے بارے میں لوگوں سے کسی نہ کسی طرح مشورہ کرنے کی ضرورت کو محسوس کیا جو ہندوستان کے مختلف صوبوں میں نمایاں خدمات انجام دے چکے تھے۔

سر بارٹل فریرے نے کہا، جو بمبئی کا گورنر رہ چکا تھا "میرے خیال میں اس امر کی ضرورت ہے کہ تشخیص مال گزاری کے متعلق کسی نہ کسی طرح کسانوں کی رائے معلوم کی جائے۔ گزشتہ زمانے میں ان سے رابطہ قائم کرکے ان کی رائے معلوم کی جاتی تھی۔ چونکہ ہمارے افسر زیادہ مصروف رہا کرتے ہیں اور محصول دہندگان سے زیادہ قریبی رابطہ نہیں قائم کر پاتے ہیں اس لیے میرے خیال میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تیس سال کی مدت گزرنے کے بعد تشخیص پر نظرثانی کرتے وقت کوئی نہ کوئی ایسا طریقہ استعمال کرنا چاہیے جس سے اس موضوع پر کسانوں اور زراعت پیشہ طبقے کی رائے معلوم کی جاسکے۔"[2]

رابرٹ ایلیٹ نے، جو مدراس اور میسور کے لوگوں کا بڑا تجربہ رکھتا تھا، اس امر پر افسوس ظاہر کیا کہ حکومت اور لوگوں کے درمیان رابطہ قائم نہیں ہوسکتا اور لوگوں کی کونسلوں کی تشکیل کی سفارش کی "میں سب سے پہلے لوگوں کو یاد کرانا چاہتا ہوں کہ حکومت ان سے رابطہ قائم کرنا چاہتی ہے اور انھیں حکومت سے رابطہ قائم کرنا چاہیے۔ اس طریقے کو آپ رفتہ رفتہ ترقی دے کر نمائندے اداروں میں تبدیل کرسکتے ہیں۔"[3]

سر چارلس ٹریویلین سے دریافت کیا گیا "اگر اس قسم کی مقامی کونسل ہوتی جس کی وضاحت

---

(1) 1873ء کی رپورٹ۔ سوالات نمبر 851 اور 1547۔

(2) 1871ء کی رپورٹ سوال نمبر 454۔

(3) ایضاً۔ سوالات نمبر 1774 اور 1831۔

آپ نے کی ہے تو ایسے محاصل جیسے بمبئی کے مقننہ نے منظور کئے ہیں۔ یعنی دیہات میں رہنے والے غیر زراعت پیشہ پر لگنے والا محصول یا دعوتوں اور شادیوں پر لگائے جانے والے محاصل آزادی کے ساتھ چنا ہوا کوئی نمائندہ ایوان منظور نہ کرتا۔"

سر چارلس ٹریویلین نے جواب دیا" وہ یقیناً منظور نہ کئے جاتے اور یہ بڑی دلیل ہے اس بات کی کہ دیسی لوگوں کو کونسلوں میں آنے دینا چاہیے۔"

اس کا بھی امکان ہے کہ حکومت اگر کسی قابل اعتراض محصول کی سفارش کرے تو وہ کہیں "ہم اس صوبے کے لوگوں پر بار نہیں ڈالیں گے۔ دوسری مدات میں ہونے والے اخراجات میں تخفیف کر کے یہ رقم حاصل کی جائے"۔ "کیا آپ ان کے فیصلے میں مداخلت نہیں کرنا چاہیں گے؟"۔

"جی نہیں۔"

"کیا آپ انھیں آزادی دیتے وقت ان کے فیصلوں کو مسترد کرنے کا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہیں گے؟"

"جی ہاں۔ اس کا تعلق خود ان سے ہوگا۔"[1]

مالیاتی کمیٹی کے سامنے مسٹر گے (MaCay) نے ایک نقشہ پیش کیا جس میں غور سے ایک سال پہلے یعنی 57-1856ء کے محاصل کا مقابلہ ملکہ کی حکومت کے بارہویں سال یعنی 71-1870ء کے محاصل سے کیا گیا تھا۔ اس مدت میں سلطنت میں توسیع نہیں ہوئی تھی، لوگوں کے وسائل اور ان کی صنعتوں میں اضافہ نہیں ہوا تھا۔ ملک کی ایسی دولت میں جس پر محصول لگایا جا سکے اور لوگوں کے مادی حالات میں کوئی ترقی نہیں ہوئی تھی مگر تعجب اس پر تھا کہ اس کے باوجود محاصل میں اور خصوصاً نمک کے محصول اور تشخیص شدہ محاصل میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ہم کچھ مدات ذیل میں درج کر رہے ہیں۔

1870-7.ء پونڈ (3)	1856-57ء پونڈ (2)	آمدنی کی مدات (1)
2,41,70,151	2,00,46,748	مال گزاری
20,72,025	1,08,833	تشخیص شدہ محاصل
26,10,789	11,91,985	کسٹم کے محاصل

(1)	(2)	(3)
نمک	36,10,223	61,06,280
افیم	49,88,434	80,45,459
آمدنی کی دوسری مدات	19,74,687	63,71,521
کل میزان	3,19,20,910	4,93,76,225

ملک کی بارہ سالہ حکومت میں محاصل میں پچاس فی صدی اضافہ ہوگیا تھا۔ بمبئی میں ایسوسی ایشن نے 29 مارچ 1871ء کو جو عرض داشت ہاؤس آف کامنز میں پیش کی تھی اس میں کہا گیا تھا" پچھلے بارہ سال میں نمک کے محصول میں مدراس میں 100 فی صدی، بمبئی میں 81 فی صدی اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں 50 فی صدی اضافہ ہو چکا ہے۔ شکر کے محصول اور شرابوں کے اب کاری محصول میں 100 فی صدی اضافہ ہو چکا ہے۔ عدالتی اسٹامپ کی قیمت بار بار بڑھائی جا چکی ہے اور اس وقت وہ اتنی الجھی ہوئی، پریشان کن اور زیادہ ہے کہ اکثر لوگ دادرسی سے محروم رہتے ہیں۔ کسٹم کے محصول میں کئی دفعہ اضافہ کیا جا چکا ہے۔ کچھ دن پہلے بھاری کورٹ فیس اور 2 فی صدی محصول وراثت لگایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ زمین پر ½6 فی صدی مقامی محصول اور اسی بھاری شرح کے مطابق ابواب لگائے گئے ہیں۔ دیہی اور قصباتی محصول، کاروبار اور پیشوں پر لگنے والے محصول، میونسپلٹی کے مختلف محصول اور مقامی محصول جو ملک کے مختلف حصوں میں لگائے جا رہے ہیں۔ ان کی مجموعی رقم اتنی زیادہ ہو جاتی ہے کہ اس کے بوجھ سے لوگ دبے جا رہے ہیں۔ چونکہ حکومت ہند نے مختلف صوبائی خدمتوں کے لیے دی جانے والی مالی امداد میں کمی کر دی ہے اس لیے نئے مقامی محاصل لگانے پر غور کیا جا رہا ہے۔ سائلوں کی گزارش ہے کہ برطانوی راج میں ضرورت سے زیادہ لگنے والے محاصل ہندوستان کے لیے مصیبت بن گئے ہیں اور حکام ان سرکاری اخراجات میں تخفیف کرنے کی پوری کوشش نہیں کر رہے ہیں جو سال بہ سال بڑھتے جا رہے ہیں۔ اب مجموعی اخراجات کی رقم 57-1856ء کے اخراجات کی رقم سے بقدر 19 ملین بڑھ چکی ہے[1]"

---

(1) 1971ء کی رپورٹ ص 312۔

دادا بھائی نوروجی نے جنھوں نے ہندوستان کے قوم پرست نمائندے کی حیثیت سے مالیاتی کمیٹی کے سامنے شہادت دی تھی، کمیٹی کے سامنے بہت صفائی سے اور زوردار الفاظ میں ہندوستان کے لوگوں کی انتہائی غربت، برطانوی حکومت میں ان کے وسائل اور دولت میں ہونے والی کمی اور بڑھتے ہوئے محاصل کا حال بیان کیا۔

انھوں نے کہا "اجازت ہو تو میں کمیٹی کے سامنے یہ مالیاتی حقیقت پیش کردوں۔ انگلستان اپنے وسائل سے (میں لارڈ میو کے الفاظ استعمال کر رہا ہوں) 70 ملین پونڈ حاصل کرتا ہے۔ اس میں سے تقریباً 27 ملین پونڈ سرکاری قرض کے سود کے طور پر وضع کر لیے جاتے ہیں اور حکومت کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے تقریباً 43 ملین بچتے ہیں۔ یہ رقم 80 ملین لوگوں کے ملک کی آمدنی کا ½5 فی صدی ہے۔ برطانوی (ہندوستان کی) حکومت اپنے وسائل سے 50 ملین پونڈ حاصل کرتے ہیں جس میں سے ریلوں وغیرہ کے سرکاری قرض کے طور پر 8 ملین وضع کئے جاتے ہیں اور حکومت کی ضروریات کے لیے 42 ملین بچتے ہیں۔ یہ رقم 300 ملین لوگوں کے ملک کی آمدنی کا 14 فی صدی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگلستان کے مقابلے میں حکومت ہند ڈھائی گنے زیادہ اخراجات کرتی ہے"[1]۔

ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہندوستان کے لوگوں کا یہ احتجاج اخراجات اور محاصل میں کمی نہ کرا سکا۔ بلکہ ہوا یہ کہ لارڈ میو کی لامرکزیت کی اسکیم نے، جس کا ذکر خصوصیت کے ساتھ آئندہ باب میں کیا جائے گا۔ صوبائی حکومتوں کو نئے نئے محاصل لگانے پر مجبور کر دیا اور سر چارلس ٹریویلین اور دوسرے لائق حکام کی ہر وہ تجویز نظرانداز کر دی گئی جس میں مشورہ دیا گیا تھا کہ محاصل پر حد لگانے اور اخراجات میں کمی کرنے کے متعلق لوگوں سے مشورہ کیا جائے۔

ہندوستان میں نئی ریلیں تعمیر کرنے اور زیادہ روپیہ خرچ کرنے کے لیے انگلستان کے لوگ چیخ پکار کر رہے تھے جس کی وجہ سے ہندوستان کے حکام خرچ کم کرنے کے بجائے اس میں اضافہ کرنا چاہتے تھے۔ "شاید یہ سمجھا گیا کہ ہندوستان کی ضروریات اس کے وسائل سے کم ہیں اس لیے چین کی جنگ، حبشہ کی جنگ، ٹیلی گراف لائنوں اور ایسے فوجی اخراجات کا بار اس پر ڈالا گیا جو انگلستان کو برداشت کرنے چاہیے تھے"[2]۔

---

(1) 1873ء کی رپورٹ سوال نمبر 6727

(2) دیکھئے ہندوستان کے سابق وزیر مالیات سیموئل لنگ (Samuel Laing) کا بیان 1872ء کی رپورٹ سوالات نمبر 7518، 7519، 7676، 7677 وغیرہ۔

بات یہ تھی کہ حکومت ہند کے دستور میں کوئی ایسا ادارہ نہیں تھا جو اس طرح کے غیر منصفانہ اقدامات میں مزاحم ہو سکتا جس طرح 1858ء سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹر ہوا کرتے تھے۔ سکریٹری آف اسٹیٹ برطانوی کابینہ کا رکن ہوا کرتا تھا اور کابینہ کے مرضی کے خلاف نہیں جا سکتا تھا۔ اس کی کونسل کے ممبر جس میں ہندوستانیوں کو نمائندگی حاصل نہیں تھی، برطانوی اثرات و مطالبات کی مخالفت نہیں کر سکتے تھے۔ ہندوستان کا وائسرائے اور اس کی کونسل جس میں کوئی ہندوستان کا نمائندہ شامل نہیں تھا، انگلستان سے آنے والے احکامات کی پابندی کرنے پر مجبور تھے۔ انڈیا کونسل پر اثرات پڑنے کی صورت میں ہندوستان کے مفادات کو کس طرح قربان کر دیا جاتا ہے۔ یہ بات لارڈ سیلس بری کے بیان سے ظاہر ہوتی ہے جس نے 1874ء میں سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کا عہدہ پھر سنبھال لیا تھا اور مالیاتی کمیٹی کے سامنے شہادت دی تھی۔

ہنری فاسٹ ۔ اس سے قطع نظر کہ اس کام کو کرنے والا حق بجانب ہے یا نہیں اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اپنے دور حکومت میں سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا جانتا ہے کہ ہندوستان پر غیر منصفانہ بار ڈالا جا رہا ہے۔ وہ بار بار احتجاج کرتا ہے۔ لیکن حالات برقرار رہتے ہیں اور ہندوستان کے دکھوں کا علاج اس وقت تک نہیں ہو سکتا ہے۔ جب تک سکریٹری آف اسٹیٹ یہ طریقہ اختیار کرنے کو تیار نہ ہو جائے اور کہے "میں اس کو برداشت نہیں کر سکتا۔ میں استعفےٰ دیدوں گا"

لارڈ سیلس بری ۔ حالات اس حد تک خراب نہیں ہیں۔ اگر سکریٹری آف اسٹیٹ کی کونسل اس کا ساتھ دے تو وہ آسانی سے یہ تجویز منظور کر سکتا ہے کہ فلاں ادائیگی نہ کی جائے۔ لیکن کوئی وزیر اس قسم کا اقدام نہیں کرنا چاہتا ہے۔ اس سے رکاوٹیں پڑتی ہیں۔

ہنری فاسٹ ۔ آپ کے سامنے صرف تین راستے ہیں۔ یا آپ اس مشین کو روک دیں یا استعفےٰ دیں یا ان اقدامات کو خاموشی کے ساتھ برداشت کریں جنھیں آپ غیر منصفانہ سمجھتے ہیں۔

لارڈ سیلس بری۔ اگر آپ "خاموشی کے ساتھ" کا ٹکڑا نکال دیں تو میں آپ کے بیان کو تسلیم کر سکتا ہوں۔ میں برداشت تو کر لوں گا لیکن احتجاج بھی کرتا رہوں گا۔[1]

یہ اقتباسات حکومت ہند کی خامیوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ہندوستان کے ساتھ ہونے والی مالیاتی ناانصافی کے خلاف کوئی موثر اقدام نہیں کیا جا سکتا ہے۔ محاصل و مصارف میں اضافے کو

---

(1) 1874ء کی رپورٹ، سوال نمبر 2234 اور 2235۔

نہیں روکا جا سکتا ہے۔ تمام متمدن ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی نمائندگی کے بغیر محاصل عاید کرنے کا طریقہ ناکام ہو چکا ہے۔ آئندہ کے مدبر جلد اس پر مجبور ہو جائیں گے کہ ہندوستان کے مالیاتی انتظام میں کسی نہ کسی طرح ہندوستانیوں کو شریک کیا جائے تاکہ ہندوستان کی سلطنت کو ان تباہیوں سے بچایا جا سکے جن کا واقعی سامنا ملک کو کرنا پڑ رہا ہے۔

باب ۶۶

زمین کے مقامی محاصل

پچھلے باب میں ہم بتا چکے ہیں کہ ملکہ کی حکومت کے پہلے انیس سال میں ہندوستانی کے سرکاری قرض اور محصولوں میں اضافہ ہوگیا تھا۔ لیکن یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خصوصیت کے ساتھ مقامی محاصل کا ذکر کیا جائے جو اس زمانے میں کئی گنا بڑھ گئے تھے۔ ان مقامی محصولوں کے دو مقصد تھے بظاہر ان کو لگانے کا مقصد سڑکیں تعمیر کرنا اور تعلیم کو فروغ دینا تھا تاکہ ملک زیادہ ترقی کر سکے۔ لیکن ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ مرکزی آمدنی پر ان کا بار نہ ڈالا جائے اور اس کام کے لیے نئے مقامی محاصل کے ذریعے روپیہ فراہم کیا جائے۔ ان پر دو اعتراضات کیے جاتے تھے۔ پہلا اعتراض تو یہ کیا جاتا تھا کہ ان کی وجہ سے ان لوگوں پر زیادہ بار پڑے گا جو پہلے ہی ضرورت سے زیادہ محاصل ادا کر رہے ہیں۔ دوسرا اعتراض یہ تھا کہ نئے محاصل چونکہ زمین پر لگائے جا رہے ہیں اس بیان کی بنا پر اُن علاقوں میں جہاں بندوبست استمراری کیا جا چکا ہے اور ان صوبوں میں بھی جہاں نصف لگان کے مطالبے کی بنیاد پر تیس سال کے لیے بندوبست کیا گیا ہے مالگذاری کے ان حدود کی خلاف ورزی ہوگی جو ایسٹ انڈیا کمپنی اور مسٹر چارلس وڈ نے عائد کیے تھے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے زمین پر جو مقامی محاصل لگائے تھے وہ کم اور غیر اہم تھے اور گانو کے قدیم رواجوں کی بنا پر لگائے جاتے تھے۔ لیکن ملکہ کو حکومت منتقل ہونے کے چھ مہینے کے اندر آمدنی کے اس ذریعے پر حکام کی نظریں پڑنے لگیں۔ پہلے سیکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا لارڈ اسٹینلی نے دیہاتی اسکول پر ہونے والے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے خصوصی محصول لگانے کی ضرورت پر توجہ دلائی[1]۔ اس کے جانشین سر چارلس وڈ نے زمین پر لگائے جانے والے مقامی

---

[1] مراسلہ مورخہ ۷ اپریل 1859ء

محاصل پر اعتراضات کو تسلیم کیا۔ لیکن اُس کا خیال تھا کہ سڑکوں کو برقرار رکھنے کی ذمہ داری ہر جگہ مالکان اراضی پر ڈالی جاتی ہے۔ جہاں تک تعلیم کا تعلق تھا اس کا خیال تھا کہ ایک خصوصی قانون بنایا جانا چاہیے[1]۔ پنجاب، شمالی ہندوستان اور صوبہ جات متوسط میں مال گذاری کے علاوہ زمین پر مقامی محاصل بھی لگائے جاتے تھے اور اس قسم کے محاصل لگانے کے لیے بمبئی میں ایک خصوصی قانون بنایا گیا تھا۔

لارڈ لارنس، جو جنوری 1864ء سے جنوری 1869ء تک ہندوستان کا وائسرائے رہا۔ اس بات کی موافقت میں نہیں تھا کہ صوبائی حکومتوں کو نئے محاصل لگانے کے اختیارات دیے جائیں اور لا مرکزیت کے اس طریقے کو پسند نہیں کرتا تھا جس کی ابتدا اُس کے جانشین نے کی۔ ہندوستان سے ریٹائر ہونے کے بعد جب مالیاتی کمیشن نے اس موضوع پر اس کا بیان لیا تو اس نے کہا جس طریقے کی بعد میں ابتدا کی گئی وہ میرے سامنے بھی پیش کیا گیا تھا۔ میں نے اس پر سنجیدگی کے ساتھ غور کیا لیکن مجھے اس کو رواج دینا مناسب نہیں معلوم ہوا۔ میرا خیال تھا کہ ہندوستان میں حقیقی ضرورت اس امر کی ہے کہ صوبائی حکومتوں کا نظم وضبط برقرار رکھا جائے۔ انھیں اس پر تیار کیا جائے کہ وہ تخمینوں سے زیادہ خرچ کرنے کے بجائے تخمینوں کی تیاری میں احتیاط سے کام لیں۔ اصل ضرورت اس کی تھی کہ بڑے کاموں کے سلسلے میں ان پر پابندی عاید کی جائے[2]۔" اس کے باوجود لارڈ لارنس کی حکومت نے 1867ء اور 1868ء میں سفارش کی تھی کہ بنگال کی سڑکوں اور دیہاتی اسکولوں کے لیے ایک محصول لگایا جائے چاہے لوگ خوشی سے اس کے لیے تیار ہوں یا نہ ہوں[3]۔

لارڈ میو کے زمانہ حکومت میں اس مسکلے پر فیصلے کن انداز سے غور کیا گیا۔ بنگال کی حکومت نے ان زمین داروں پر مجوزہ محصول لگانے کے خلاف سخت اعتراض کیا[4]۔ جن کے ساتھ 1793ء میں بندوبست استمراری کیا جا چکا تھا۔ حکومت کا کہنا تھا کہ زراعت کی

---

(1) مراسلہ مورخہ 25 مئی 1861ء

(2) مالیاتی کمیٹی کی رپورٹ برائے 1873ء، سوال نمبر 4525

(3) حکومت بنگال کے نام خطوط مورخہ 28 اکتوبر 67ء اور 25 اور 27 اپریل 1868ء

(4) حکومت ہند کے نام مراسلہ مورخہ 30 اپریل 1869ء

توسیع کی بنا پر ہونے والے زیادہ منافع کا فائدہ زمینداروں کے بجائے کسانوں کے شکمیوں کے بڑے طبقے کو حاصل ہوا ہے، یہ کہ زمینداریاں منتقل ہو چکی ہیں اور ان کو نئے خریداروں نے ان کی موجودہ قیمت ادا کی ہے، یہ کہ وزیر مالیات سر جیمس ولسن (Sir James Wilson) اور بنگال کے چیف جسٹس سر برنیز پیکاک (Sir Barnes Peacock) کا خیال ہے کہ بنگال میں لگایا جانے والا زمین کا خصوصی محصول بندوبست استمراری کی خلاف ورزی کے مترادف ہے، یہ کہ دوسرے صوبوں کے مقابلے میں بنگال مرکزی خزانے کو زیادہ رقم بھیجتا ہے، یہ کہ اس بنا پر خصوصی تعلیمی محصول لگانا نہ ممکن ہے۔ اور نہ مناسب لیکن سڑکوں کے محصول کا جہاں تک تعلق ہے "لفٹیننٹ گورنر کا خیال ہے کہ اس مقصد کے لیے لگایا جانے والا محصول تعلیم کے محصول کے مقابلہ میں کم غیر پسندیدہ قرار دیا جائے گا"

نہ لارڈ میو کی حکومت نے بنگال کی حکومت کے نقطۂ نظر سے اتفاق کیا اور نہ ڈیوک آف آرگل نے جو سر اسٹیفورڈ نارتھ کوٹ کی جگہ سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا مقرر ہوا تھا۔[9] لارڈ آرگل کا خیال تھا کہ حکومت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ بنگال میں سڑکوں اور تعلیم دونوں کے لیے محاصل لگا سکے۔ پھر بھی اس نے سفارش کی کہ "جب تک بنگال میں مقامی محاصل لگانے اور انھیں وصول کرنے کے طریقے کے متعلق کوئی اطمینان بخش فیصلہ نہ ہو جائے اس وقت تک صرف اتنا محصول لگایا جائے جتنا سڑکوں کے لیے ضروری ہو"۔ ہندوستان کے متعلق اظہارِ خیال کرتے وقت لارڈ آرگل نے اس کے زراعتی طریقوں اور اس کی مال گذاری کی تاریخ سے عدم واقفیت کا ثبوت دیا اور کہا کہ یہ بات درست نہیں ہے کہ "زراعت پیشہ لوگوں سے مال گذاری وصول کرتے وقت حکومت اُن کے وسائل کا اتنا حصہ لے لیتی ہے کہ وہ مزید بار اٹھانے کے قابل نہیں رہتے ہیں۔"

عجیب بات یہ ہے کہ "قانونی حکومت" (Reign of Law) کے مصنف نے اس سلسلہ میں اپنے ان باصلاحیت مشیروں کی رائے کو نظر انداز کیا جنھوں نے قانون کی تشریح کرنے کی کوشش کی۔ سکریٹری آف اسٹیٹ کی کونسل میں اس قسم کے لوگ

---

(9) دیکھیے گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کا مراسلہ مورخہ 31 دسمبر 1869ء اور سکریٹری آف اسٹیٹ کا جواب گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کے نام مورخہ 12 مئی 1870ء

شریک تھے جیسے سر آرسکین پیری بمبئی کا چیف جسٹس رہ چکا تھا، ہنری تھابی پرنسپ اور راس منگلس جنھیں ہندوستان کے انتظامی شعبوں کا بڑا تجربہ حاصل تھا اور سر ہنری مانٹگمری اور سر فریڈرک ہالی ڈے جو ہندوستان کے صوبوں پر حکومت کر چکے تھے۔ یہ لوگ صاف بات کرنے کے عادی تھے۔ سر آسکین پیری نے لکھا تھا۔

"اختلاف کی صورت میں دوسرے نقطۂ نظر کی واضح حمایت کی متعدد کوششوں کے بعد مجھے مجبوراً اس نتیجہ پر پہنچنا پڑا ہے کہ لارڈ کارنوالس اور اس کی حکومت کے اراکین نے جو زبان استعمال کی ہے اور جو ایکٹ بنائے ہیں وہ اتنے واضح اور غیر مبہم ہیں کہ مجوزہ انداز سے خصوصی محاصل لگانا بر طانوی عہد و پیاں کی راست خلاف ورزی سمجھی جانی چاہیے۔"

"1854ء میں لارڈ ڈلہوزی نے، جو جرأت مندانہ اقدام کی صلاحیت رکھتا تھا، پولیس کی حالت سدھارنے کے لیے بنگال میں ایک مقامی محصول لگانے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ لیکن حکومت کے ان عہد و پیاں کے متعلق جو 93-1791ء میں کیے گئے تھے۔ سر بارنس پیکاک کا فاضلانہ فیصلہ پڑھنے کے بعد اُس عظیم حاکم کو چیف جسٹس کی دلیلوں کی معقولیت کو تسلیم کرنا پڑا اور اس نے مجبوراً محصول لگانے کا ارادہ ترک کر دیا۔"

"ہمارے سامنے حکومت کی واضح تحریر موجود ہے جس سے لکھنے والوں کے عصری خیالات ظاہر ہوتے ہیں۔ پچھلے اسّی سال کے زمانہ میں اس سے لوگوں نے اتفاق کیا ہے اور حکومت نے لوگوں کی تشریح کو انصاف پر مبنی قرار دیا ہے۔ ان واقعات کا کیا جواب ہم دیں گے۔"

"حکومت ہند کا کہنا ہے کہ بندوبست استمراری کی زبان اور لارڈ کارنوالس کے اعلان کی دفعہ 7 میں اس امر کی گنجائش ہے کہ مجوزہ محاصل لگائے جا سکیں۔ لیکن غور کرنے کے بعد یہ دلیل اتنی کمزور ثابت ہوئی کہ سکریٹری آف اسٹیبسٹ کو اپنا ارادہ ترک کرنا پڑا۔"

"دو دلیلیں اور پیش کی جاتی ہیں۔ پہلی دلیل یہ ہے کہ انکم ٹیکس نے ثابت کر دیا کہ زمینداروں سے جو مال گزاری وصول کی جاتی ہے اُس کے علاوہ مزید محاصل بھی لگائے جا سکتے ہیں۔ دوسری دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ ہندوستان کے زیادہ تر حصوں میں مال گزاری کے علاوہ تعلیمی محاصل بھی لگائے جاتے ہیں۔

"جہاں تک انکم ٹیکس کا تعلق ہے اس کو معقول دلیل نہیں سمجھا جا سکتا۔ جب کسی مخصوص عہد و پیاں کا مفہوم زیر بحث ہو تو یہ کہنا غلط ہے کہ ایک مطلق العنان حکومت نے لوگوں سے مشورہ کیے

بغیران عہدو پیماں کی توجیہہ اپنے حق میں چونکہ ایک دفعہ کرلی ہے اس لیے اس کا یہ اقدام آئندہ کے لیے نظیر بن گیا ہے اور معقول و منصفانہ ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں مزید دلیلوں کی ضرورت نہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ بنگال کی حکومت اور زمینداروں میں اس بات پر اتفاق ہوگیا ہے کہ کسی شدید ضرورت کی صورت میں دوسرے لوگوں پر لگائے جانے والے عام محاصل اُن پر بھی لگائے جا سکتے ہیں۔

" جہاں تک اُن محاصل کا تعلق ہے جو ہندوستان کے دوسرے حصوں میں مال گذاری کے علاوہ لگائے جاتے ہیں میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ سکریٹری آف اسٹیٹ نے واقعات کو غلط انداز میں پیش کیا ہے اور بنگال کے لیفٹننٹ گورنر کا خیال صحیح ہے"۔

" میں صرف اتنا کہوں گا کہ میرے خیال میں (ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں) لگائے جانے والے تعلیمی محصول کی حقیقی روداد یہ ہے کہ وہ اس وقت لگایا گیا جب یا تو ایک خاص مدت کے لیے بندوبست کرنے پر غور کیا جارہا تھا یا مالکان اراضی اور حکام بندوبست کے درمیان "سودے بازی ہورہی تھی۔ اُن مقاموں پر جہاں بندوبست کیا جاچکا تھا یہ محصول مالکان اراضی کی رضامندی حاصل کرنے کے بعد لگایا گیا"[1]۔

سر آرسکین پیری نے بنگال کے ان زمینداروں کی تعریف کی جنھوں نے کلکتہ کے جلسۂ عام میں مجوزہ تعلیمی محصول کے خلاف احتجاج کیا تھا۔ اس نے کہا کہ ان کی تقریریں حالانکہ بدیسی زبان میں کی گئی تھیں لیکن وہ اتنی معقول تھیں اور ان میں ایسے جذبات کا اظہار کیا گیا تھا کہ وہ انگلستان کے دیہی شرفا کے کسی جلسے کو باوقار بنا سکتی تھیں"۔

دوسرے اختلافی نوٹ بھی اسی قسم کے تھے۔ مسٹر میکناٹن کا خیال تھا کہ "یہ محصول اگر لگانا ضروری ہے تو سب پر لگایا جانا چاہیے۔ بندوبست استمراری کے تحت ادا کی جانے والی مال گزاری کی رقم کا خیال کیے بغیر اس کا اطلاق تمام ایسے لوگوں پر ہونا چاہیے جو حقیقی اور ذاتی جائیداد کے مالک ہیں چاہے اس جائیداد کی نوعیت کچھ ہی ہو"[2]۔

مسٹر فریڈرک کیوری نے تسلیم کیا کہ ہندوستان کی مالی حالت اطمینان بخش نہیں ہے۔ اس نے کہا کہ اس کو اخراجات میں کمی اور کفایت شعاری کی بڑی دلیل سمجھنا چاہیے[3] "لیکن اس کے

---

1 ۔ سر آرسکین پیری کا اختلافی نوٹ مورخہ 14 مئی 1870ء

2 ۔ مسٹر میکناٹن کا اختلافی نوٹ مورخہ 14 مئی 1870ء

3 ۔ سر فریڈرک کیوری کا اختلافی نوٹ مورخہ 14 مئی 1870ء

معنی یہ نہیں کہ ہم صرف بنگال کے زمینداروں پر ایک خصوصی محصول لگانے میں حق بجانب ہیں جس کے متعلق سر آرسکین پیری نے اپنے مضمون میں بتایا ہے کہ یہ طریق عمل وعدہ خلافی ہوگا اور اُن قانونی معاہدوں کی خلاف ورزی ہوگا جو بندوبست استمراری کے وقت زمینداروں کے ساتھ کیے گئے تھے۔"

سر ہنری منٹگمری نے کہا "میرے خیال میں کسی حکومت کو از خود ایسے حالات نہیں پیدا کرنے چاہئیں کہ اس پر وعدہ خلافی کا الزام لگایا جا سکے۔"[1]

ہنری تھابی پرنسپ نے، جسے ہندوستان کے نظم و نسق کا بڑا تجربہ تھا، لکھا تھا "مجھے کسی فیصلے سے اتنی تکلیف اور مایوسی نہیں ہوئی جیسی کہ اس سے ہوئی جو میری رائے کے خلاف کیا گیا یعنی صدر کے ووٹ کی بنا پر اس مراسلہ کو منظور و روانہ کرنے کا فیصلہ جس کا حوالہ اس مضمون کی سرخی میں دیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ان اصولوں کو غلط سمجھتا ہوں جن کا ذکر اس مراسلے میں کیا گیا ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ احمقانہ ہیں۔ اگر منظور شدہ پالیسی پر عمل کیا گیا اور منظور شدہ اقدامات کیے گئے تو وہ ہندوستان کے تمام لوگوں کو حکومت سے بدظن کر دیں گے اور حکومت کی دیانت داری اور معقولیت پسندی پر اُن کا وہ اعتماد باقی نہیں رہے گا جو ابھی تک عام طور سے پایا جاتا ہے۔"

"کورٹ آف ڈائریکٹرز، شاہ انگلستان کی حکومت اور پارلیمنٹ نے اس تجویز کی تائید کی تھی جس میں طے کیا گیا تھا کہ بنگال کی ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضہ صوبوں میں زمین پر حکومت کے مطالبے کا استمراری تعین کر دیا جائے۔"

"اس زمانے کی روائتیں بھلائی جا رہی ہیں اور ہندوستان کے مالیاتی نظام میں نئے تصورات داخل کیے جا رہے ہیں۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ لوگ اس کو حکومت کی اس تبدیلی کا نتیجہ سمجھیں گے جو بارہ سال پہلے ہوئی تھی۔ لامحدود محاصل کے حق پر زور دینا بہر حال خطرناک بات ہے۔ اس بات کی توقع کون کر سکتا تھا کہ ملکہ کی حکومت اس پالیسی کی وکالت کرے گی اور اس قسم کی مطلق العنانیت کی دعویدار ہوگی۔"[2]

1۔ سر ہنری منٹگمری کا اختلافی نوٹ مورخہ 18 مئی 1870ء

2۔ ایچ۔ ٹی۔ پرنسپ کا اختلافی نوٹ مورخہ 19 مئی 1870

راس منگلس نے بھی جو ایسٹ انڈیا کمپنی کا نہایت زور دار ڈائریکٹر رہ چکا تھا اور اس وقت انڈیا کونسل کے زور دار اراکین میں شمار ہوتا تھا، ایسا اقدام کرنے سے گریز کیا جو وعدہ خلافی اور پیمان شکنی کے مترادف سمجھا جائے۔

اُس نے لکھا[1] "مجھے اس میں بڑا شبہ ہے کہ حکومت ہند حالیہ مراسلے میں دی گئی منظوری سے فائدہ اٹھا کر کس حد تک جانا مناسب سمجھے گی۔ میں ڈرتا ہوں کہ وہ ایسے اقدامات نہ کرے جن کی وجہ سے اُس پر پیمان شکنی کا الزام عاید کیا جا سکے۔ کہیں کوئی غیر محتاط قدم ایک لمحہ میں برطانوی حکومت کی وعدہ کی پختگی کی اُس ساکھ کو ختم نہ کر دے جو قریب قریب ایک صدی کی مسلسل باعزت کوششوں کی بنا پر قائم ہوئی ہے۔ لوگوں کی تعلیم کے اعلا مقصد کے لیے بھی اتنی زیادہ قیمت نہیں ادا کی جا سکتی۔ اگر ہم حق پسندی کا ثبوت نہ دے سکے تو ہندوستان میں ہم صرف تلوار کے سہارے رہ سکیں گے"۔

لیکن بنگال کے مجوزہ محاصل کی مخالفت میں سب سے مستند نوٹ سر فریڈرک ہالی ڈے نے لکھا جو غدر کے دوران اور اُس کے بعد بنگال کا لفٹیننٹ گورنر رہ چکا تھا اور انڈیا بنگال کے دوسرے اراکین کے مقابلے میں بنگال سے زیادہ واقف تھا۔ اُس نے ٹھیک ہی کہا کہ بنگال میں تعلیم وہاں کے تعلیم یافتہ لوگوں کی کوششوں سے فروغ پا رہی ہے اور لارڈ ولیم بینٹنک کی پالیسی کے اس پسندیدہ اور فطری نتیجے کے راستے میں رکاوٹیں حائل کرنا سمجھ داری نہیں ہے۔

اُس نے لکھا تھا "ہر تعلیم یافتہ شخص اپنے پڑوس اور اپنے متعلقین کے لیے مبلغ تعلیم ہو گیا ہے۔ ہر باحیثیت مالک اراضی گانوؤں میں مدرسے قائم کرنے اور انھیں فروغ دینے میں اپنے پڑوسی پر سبقت لے جانا چاہتا ہے۔ صوبے میں دیسی تعلیم پر خرچ ہونے والی مجموعی رقم کا نصف حصہ 1869ء تک اُن لوگوں کے چندوں اور عطیوں پر مشتمل ہوتا تھا جو کچھ سال پہلے تک دوسروں کو تعلیم دینا تو درکنار خود تعلیم حاصل کرنا بھی ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ 1835ء کے اہم اقدامات کے نتائج اب سامنے آنے لگے ہیں۔ اقدامات کرنے والوں کی سمجھ داری اور دور اندیشی کو تسلیم کیا جا چکا ہے اور بنگال کی تعلیمی صورت حال

1۔ راس منگلس کا اختلافی نوٹ مورخہ 25 مئی 1970ء

اپنی خامیوں کے باوجود آج دل خوش کن ہے اور آئندہ کے لیے خوش آئند امکانات کی حامل ہے۔

"ان حالات کے پس منظر میں حکومت ہند نے اچانک اعلان کیا کہ وہ اس طریقے سے مطمئن نہیں ہے۔ . . . . . وہ اس کی تکمیل کا انتظار نہیں کر سکتی اور عام لوگوں کی تعلیم کا فوری انتظام کرنا چاہتی ہے . . . . چونکہ اس اسکیم کے لیے بڑی رقم کی ضرورت ہے اور سرکاری خزانہ اس بار کو اٹھا نہیں سکتا اس لیے اس نے ہدایت جاری کی کہ یہ رقم جو لاکھوں پونڈ سے کم نہیں ہوگی، بنگال کے زمینداروں سے ان کے مجموعی لگانوں پر دو فی صدی محصول لگا کر وصول کی جائے۔"

"زمینداروں نے سخت احتجاج کیا۔ . . . . انھوں نے وہ پیمان یاد دلائے جو 1793ء کے بندوبست استمراری کے وقت اُن سے کیے گئے تھے اور کہا کہ لارڈ کارنوالس نے واضح الفاظ میں اُن سے وعدہ کیا تھا کہ اُن کی زمینوں پر سرکاری مطالبے کی تشخیص "ہمیشہ کے لیے کی گئی ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔" اُن سے یہ وعدہ بھی کیا گیا تھا کہ مستقبل میں اُن سے "لگان، خراج یا کسی اور قسم کی ادائگی کا مطالبہ" نہیں کیا جائے گا۔ ان کا کہنا تھا کہ کارنوالس کے عہد سے کیننگ کے عہد تک ہر مالی دشواری کے زمانے میں اس قومی عہد کی پوری پوری پابندی کی گئی ہے۔ حکومت قومی عہد کو عمداً پس پشت ڈالے بغیر اس قسم کی وعدہ خلافی نہیں کر سکتی ہے۔"

"صوبے کے جن حاکموں سے مشورہ کیا گیا انھوں نے اس احتجاج کی حمایت کی۔ بنگال کے لفیٹیننٹ گورنر نے یہ خیالات حکومت ہند تک پہنچا دیے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس نے زوردار اور مُسکت دلیلیں بھی پیش کیں۔ لیکن حکومت ہند نے کوئی اثر قبول نہیں کیا اور جواب میں کہا کہ وہ اپنے ارادے پر قائم رہنے کا تہیّہ کر چکی ہے۔"

1860ء میں جب پہلی بار انکم ٹیکس لگایا گیا تو بنگال کے زمینداروں نے بجا طور سے اس کو مداخلت سمجھا اور اس پر احتجاج کرنا چاہا۔ لیکن انھوں نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔ سب سے بڑے زمیندار کے مشورے کو تسلیم کیا اور اُس کی پیروی کی۔ بردوان کے راجہ نے لیجسلیٹیو کونسل کے نام ایک اہم خط میں لکھا تھا کہ انکم ٹیکس چونکہ 1857ء کے غدر کے بعد لگایا جا رہا ہے اس لیے وہ اس سلسلے میں دوسروں کے لیے مثال قائم کرے گا۔ . . . اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انکم ٹیکس مساوی طور سے تمام طبقوں پر لگایا جا رہا ہے۔ یہ

اعلان جو بروقت کیا گیا تھا اور حب الوطنی کے جذبات پر مبنی تھا خود اعلان کرنے والے اور دوسرے زمینداروں کے خلاف بندوبست استمراری کی واضح شرائط کی خلاف ورزی کے لیے نظیر نہیں سمجھا جانا چاہیے اور اس کی بنا پر ایسا محصول نہیں لگایا جانا چاہیے جس کا بار اُن لوگوں پر نہ پڑے جو زمیندار نہیں ہیں۔ اس کا نتیجہ اُن کے جذبات کو مجروح کرنے اور انھیں سخت اذیت دینے کے علاوہ کچھ نہیں ہوگا"(1)۔

حکومت بنگال اور زمینداروں کا احتجاج اور انڈیا کونسل کے کچھ قابل ترین اراکین کا اختلاف بے سود نہیں ثابت ہوا بنگال کے لوگوں پر تعلیمی محصول نہیں لگایا جا سکا لیکن 1871ء میں مجموعی لگان پر تین فی صدی سڑک کا محصول لگا دیا گیا۔ ڈیوک آف ارگل کے کہنے کے مطابق یہ محصول بنگال کے لیفٹننٹ گورنر جارج کیمپ بیل کے اشارے پر لگایا گیا تھا۔ بنگال میں کہا جاتا تھا کہ کیمپ بیل کی بنائی ہوئی پالیسی پر عمل کرنے کے لیے ایک کیمپ بیل کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔

ہندوستان کے اُن حصوں میں جہاں بندوبست استمراری نہیں ہوا تھا اس قسم کے مقامی محاصل پہلے ہی لگائے جا چکے تھے۔ سر بارٹل فریرے نے مالیاتی کمیٹی کو اطلاع دی تھی کہ بمبئی میں سڑکوں اور مدرسوں کے لیے مال گذاری پر 6 ¼ فی صدی ابواب لگا دیے گئے ہیں جو نظری اعتبار سے خالص مجموعی لگان کے 3 ⅛ فی صدی کے برابر ہوتے ہیں۔

"کچھ علاقوں میں اس خیال سے مقامی محاصل ملتوی کر دیے گئے کہ بندوبست کی تیس سالہ مدت کے اندر اگر انھیں لگایا گیا تو لوگ اس کو بدعہدی تصور کریں گے۔ جن مقامات پر بندوبست کرتے وقت ابواب کا ذکر نہیں کیا گیا تھا وہاں بھی انھیں ملتوی کر دیا گیا۔ لیکن بندوبستوں کے وقت مقامی محاصل کو اصل بندوبست کا جز قرار دیا جاتا ہے اور اُن کی حیثیت وہی ہوتی ہے جو سرکاری مطالبے کی"(1)

جیسا کہ سر رابرٹ منٹگمری نے مالیاتی کمیٹی کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ پنجاب میں بندوبست کی بنیاد یہ اصول ہے کہ کاشت سے ہونے والے خالص منافع کا

1۔ سر ایف۔ ہالی ڈے کا اختلافی نوٹ مورخہ 25 مئی 1870ء الفاظ پر خط ہم نے لگایا ہے۔
مالیاتی کمیٹی کی رپورٹ برائے 1871ء، سوال نمبر 68

نصف حصہ مالک کا ہوتا ہے اور نصف مال گذاری کے طور پر حکومت کو ادا کیا جاتا ہے۔ زمین کے مطالبے میں ایک فی صدی تعلیم کا محصول اور ایک فی صدی سڑکوں کا محصول شامل کر دیا گیا ہے" اگر اس سے زیادہ رقم وصول کی جائے تو میرا خیال ہے کہ انھیں شکایت پیدا ہو جائے گی[1]"

صوبہ جات متوسط میں مال گزاری کے علاوہ تعلیم اور سڑکوں کے محاصل کو مسٹر مارسن نے حق بجانب قرار دیا تھا " بشرطیکہ اُن سے لوگوں کو کوئی فوری اور راست فائدہ پہنچ سکے[2]"

اودھ میں 1871 کا ایکٹ مالکان اراضی کی " رضامندی" حاصل کرنے کے بعد بنایا گیا تھا جس کی رو سے مال گذاری کے علاوہ زمینداروں سے وصول ہونے والے محصول کی شرح 1¼ فی صدی سے بڑھا کر 2½ فی صدی کر دی گئی تھی۔ لیکن جیسا کہ سر چارلس ون گیٹ نے مالیاتی کمیٹی کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہا تھا "اس قسم کی رضامندی کبھی خوشی سے نہیں دی جاتی ہے۔ اس کو حاصل کرنے کے لیے سرکاری اثرات سے کام لیا جاتا ہے اور وہ لوگ چونکہ بے بس ہوتے ہیں اور جانتے ہیں کہ چیف کمشنر کی درخواست رد کر دی گئی تو انھیں اس کا خمیازہ بھگتنا ہوگا اس لیے وہ رضامندی دے دیتے ہیں۔ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ معاہدہ کرنے والے فریقین میں سے اگر کوئی فریق اور خصوصاً وہ فریق جو زیادہ طاقت ور ہو، کمزور فریق کو معاہدے کی شرائط میں ایسی تبدیلی کرنے پر تیار کرے جو اس کے لیے غیر مفید ہو تو اس کو شرافت نہیں کہا جا سکتا ہے۔ ...... جو لوگ غدر کے زمانے میں میری طرح جائے پناہ کی تلاش میں پھر رہے تھے انھیں ایسی خبریں بھی مل جایا کرتی تھیں جو عام حالات میں اُن تک نہ پہنچتیں۔ مجھے یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ بندوبست کے بعد بالائی صوبہ جات میں رواج پانے والا یہ طریقہ سخت ناپسند کیا جاتا تھا اور معاہدے کی خلاف ورزی سمجھا جاتا تھا کہ تعلیمی محصول یا دوسرے محاصل کے لیے لوگوں کی رضامندی حاصل کی جائے۔"

1- 1871ء کی رپورٹ، سوال نمبر 755

2- ایضاً، سوال نمبر 1368

ہنری فاسٹ۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر حکومت کی مرضی کے مطابق بندوبست کی تیس سالہ مدت کے دوران زمین پر نئے محاصل لگائے جائیں تو تیس سالہ بندوبست ایک بے معنی مذاق سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا ہے۔

سر چارلس ون گیٹ۔ میرا ہمیشہ سے یہی خیال رہا ہے۔

ہنری فاسٹ۔ حکومت کے اس اقدام سے معلوم ہوتا ہے کہ اودھ کے مالکان اراضی محفوظ نہیں ہیں۔ اگر حکومت کی ضرورتیں بڑھتی ہیں تو ان پر ایک کے بعد لاتعداد محاصل عائد کئے جاسکتے ہیں۔

سر چارلس ون گیٹ ـــ واقعی وہ محفوظ نہیں ہیں۔

ہنری فاسٹ ـــ آپ کی بات سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ لامرکزیت کی اسکیم اگر نافذ نہ کی جاتی اور مقامی حکومت کو 3,50,000 پونڈ کی اس رقم سے محروم نہ ہونا پڑتا جو اس کو ملا کرتی تھی تو غالباً اودھ میں نیا محصول لگانے کی ضرورت نہ پڑتی۔ کیا آپ کو اس سے اتفاق ہے؟

سر چارلس ون گیٹ۔ مجھے اس سے اتفاق ہے۔ میرے خیال میں لامرکزیت کی اسکیم سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ اس اسکیم کی وجہ سے اودھ کو ملنے والی رقم میں 15,000 کی کمی ہوئی ہے۔ اگر آپ لامرکزیت کے حکم کو دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس میں خاص طور سے کہا گیا ہے کہ خسارے کو پورا کرنے کی ذمہ داری مقامی حکومت پر ہے۔ اس میں ان مقامی محاصل کا حوالہ دیا گیا ہے جو لگائے جا چکے تھے یا اس وقت لگائے جا رہے تھے۔ اودھ کا ذکر ایسے صوبے کی حیثیت سے کیا گیا جہاں خسارہ پورا کرنے کے لیے مقامی محصول لگایا جا رہا تھا۔

سر چارلس ون گیٹ نے لامرکزیت کی اسکیم کی اصل خرابی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "میں لامرکزیت کی اسکیم کو ناپسند کرتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے مقامی حکومتوں کو لوگوں کا زیادہ سے زیادہ خون نچوڑنے کے لیے محرکات مہیا کر دیے ہیں اور میں ذاتی تجربے کی بنا پر جانتا ہوں کہ مقامی گورنر کتنے من موجی ہوا کرتے ہیں۔"[1]

مسٹر فاسٹ اور مسٹر چارلس ون گیٹ نے جن خطرات کا اظہار کیا تھا اُن کی تصدیق اُن اقدامات سے ہوگئی جو ہندوستان کے شمال مغربی صوبہ جات میں اُس وقت کیے گئے

1۔ مالیاتی کمیٹی کی رپورٹ برائے 1873ء، سوالات نمبر 2050، 2089، 2090، 2098 اور 2073

جس وقت مالیاتی کمیٹی لندن میں تحقیقات کر رہی تھی۔ لامرکزیت کی اسکیم کے تحت جو انتظامات کیے گئے تھے ان کی بنا پر شمال مغربی صوبہ جات میں 30 و48 پونڈ کا خسارہ باقی رہا تھا۔ جس کو مقامی محاصل کے ذریعے پورا کرنا تھا۔ لفٹیننٹ گورنر نے صرف خسارہ پورا کرنا کافی نہیں سمجھا بلکہ اس نے اپنے اختیارات سے کام لے کر مقامی محاصل کے ذریعے رفتہ رفتہ 000و02و1 پونڈ خسارے کی رقم سے زیادہ وصول کیے۔ یہ رقم حاصل کرنے کے لیے اس نے بندوبست پر نظرثانی کے وقت پرانے پانچ فی صدی ابواب کے بجائے مال گذاری پر دس فی صدی ابواب لگائے(1)"

مدراس میں بھی اسی قسم کا واقعہ پیش آیا۔ 1870ء کے لامرکزیت کے حکم کے رو سے وہاں 28 و55 پونڈ کا خسارا چھوڑا گیا تھا جسے مقامی محاصل سے پورا کرنا تھا۔ حکومت مدراس نے اُسی سال ایک ایکٹ بنایا جس کی رو سے مجموعی لگان پر $6\frac{1}{4}$ فی صدی ابواب لگائے گئے۔ ان ابواب کی وجہ سے پرانے ابواب سے حاصل ہونے والی رقم 106و97و1 پونڈ کے بجائے 800و42و3 پاؤنڈ حاصل کیے گئے۔ حالانکہ مرکزی حکومت نے اُس پر 000و55 پونڈ کے خسارے کو پورا کرنے کی ذمہ داری ڈالی تھی لیکن اُس نے اپنے اختیارات سے کام لے کر 000و45و1 پونڈ کی مزید رقم حاصل کر لی(2)"

زمین پر لگنے والے ان نئے محاصل نے اور ان اختیارات نے جن کی رو سے ان میں ایک حد تک اضافہ کیا جا سکتا ہے زمین کے مطالبے کی اُس قطعیت کو ختم کر دیا جو لارڈ ڈلہوزی نے 1855ء میں شمالی ہندوستان کو عطا کی تھی اور سر چارلس وڈ نے 1864ء میں جنوبی ہندوستان کو۔ ہندوستان کی مال گذاری کے دشوار مسئلے کو حل کرنے کی کوشش مدبروں کی کئی نسلوں نے کی تھی اور کئی غلطیوں کے بعد انھوں نے مال گذاری کو حقیقی لگان کے نصف یا مناسب لگان کے نصف تک محدود کر دیا تھا۔ اس مال گذاری کے علاوہ جو مقامی محاصل لگائے جاتے تھے وہ 1864ء تک اتنے کم تھے اور اکثر اس قسم کے مقامی بہبود کی بنیاد پر لگائے جاتے تھے کہ ان کو نظر انداز کیا جا سکتا تھا اور ہندوستان کے لوگ اُنھیں

1- 1873 کی رپورٹ، سوالات نمبر 1964 اور 1965

2- 1873ء کی رپورٹ، ص ص 160 — 188

نصف لگان کے اصول کی خلاف ورزی نہیں سمجھتے تھے۔ ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ نصف صدی سے زیادہ مدت کے انتظامی تجربوں کے بعد مال گزاری پر لگائی جانے والی حد بے سوچے سمجھے ختم کر دی گئی اور مقامی حکومتوں کو اس امر کے اختیارات دے دیے گئے کہ وہ زمین کے محاصل میں لامحدود اضافے کر سکیں۔ دوسروں نے جو تحفظ کا انتظام کیا تھا اسے نئی پالیسی نے قریب قریب ختم کر دیا۔ سرکاری مطالبہ کاشت سے ہونے والے خالص منافع کا پچاس فی صدی مقرر کیا گیا تھا۔ اب دوسرے ناموں سے دوسرے سرکاری مطالبے اس میں شامل کر دیے گئے ہیں۔

باب 12

محاصل درآمد و برآمد کی تاریخ

ادھر ہندوستان کے حاکم زراعت پر نئے محاصل لگا کر ہندوستان کے مالیات میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے ادھر 1874ء میں انگلستان سے حکم صادر ہوا کہ لنکا شائر کے صنعت کاروں کے خواہشات کا احترام کیا جائے اور مناسب محصول درآمد سے حاصل ہونے والی جائز اور دیرینہ آمدنی قربان کر دی جائے۔ حالانکہ گزشتہ ابواب میں ہم 1871ء تک ہندوستان کے محاصل درآمد و برآمد کا ذکر کر چکے ہیں پھر بھی ان کی ایک مربوط اجمالی تاریخ اس نزاع کو سمجھنے میں معاون ثابت ہو گی جو تین سال بعد رونما ہوئی۔

1858ء میں جب ملکہ نے ہندوستان کی سلطنت کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا تو اس وقت سوتی دھاگے اور سوت پر بیجک کی رو سے 3½ فی صدی اور دوسرے برطانوی مصنوعات پر 5 فی صدی محصول درآمد وصول کیا جاتا تھا۔ ان مصنوعات میں برطانیہ کا بنا ہوا سوتی کپڑا بھی شامل تھا۔ دیگر ممالک سے درآمد ہونے والی اشیا پر دگنا محصول لگایا جاتا تھا۔

چونکہ غدر کی وجہ سے ہندوستان پر بڑا مالی بار پڑ گیا تھا اس لیے 1859ء میں تمام امتیازی محاصل درآمد و برآمد منسوخ کر دیے گئے۔ آرائش و آسائش کے سامان پر بہ اعتبار بیجک 20 فی صدی محصول عاید کیا جانے لگا۔ بشمول سوتی کپڑا۔ دوسری اشیا پر محصول کی شرح بڑھا کر 10 فی صدی کر دی گئی اور سوتی دھاگے اور سوت پر 5 فی صدی محصول درآمد وصول کیا جانے لگا۔

ہندوستان کے پہلے وزیر مالیات مسٹر جیمس ولسن نے 1860ء میں آرائش و آسائش کے سامان پر لگنے والے محصول کی شرح 20 فی صدی سے گھٹا کر 10 فی صدی کر دی اور سوتی دھاگے اور سوت کے محصول کی شرح 5 فی صدی سے بڑھا کر 10 فی صدی کر دی۔ چنانچہ بہ اعتبار بیجک محصول

درآمد کی شرح یکساں یعنی 10 فی صدی ہو گئی۔ صرف بیر، شرابوں اور تمباکو کے لیے خصوصی شرحیں مقرر کی گئیں۔

1861ء میں سوتی دھاگے اور سوت پر محصول کی شرح گھٹا کر 5 فی صدی کر دی گئی۔ 1862ء میں سوتی دھاگے اور سوت پر لگنے والے محصول میں مزید تخفیف کرکے اس کی شرح 3½ فی صدی کر دی گئی اور سوتی کپڑے اور دوسرے مصنوعات پر لگنے والے محصول کی شرح 5 فی صدی کر دی گئی۔

1863ء میں درآمد ہونے والے لوہے پر محصول گھٹا کر 1 فی صدی کر دیا گیا۔

1864ء میں عام محاصل درآمد کی شرح 10 فی صدی سے کم کرکے 7½ فی صدی کر دی گئی۔

1867ء میں بہت سی اشیا محصول سے مستثنا کر دی گئیں اور محاصل برآمد وقتاً فوقتاً منسوخ کئے جاتے رہے۔ صرف غلے پر لگنے والے محصول میں 1867ء میں اضافہ کیا گیا۔

1871ء میں ایک نیا ٹیرف ایکٹ منظور کیا گیا جس کا ذکر اس جلد کے باب 18 میں کیا جا چکا ہے۔ قیمتوں پر نظرثانی کی گئی۔ سوتی دھاگے اور سوت پر 3½ فی صدی محصول اور سوتی کپڑے پر 5 فی صدی محصول برقرار رہا۔ تمام دوسرے محاصل کی طرح ان محاصل کو بھی ذرائع آمدنی کے طور پر برقرار رکھا گیا تھا۔ اس کا مقصد ہندوستان کی سوتی کپڑے کی ابھرتی ہوئی صنعت کا تحفظ نہیں تھا۔

لیکن لنکا شائر کے صنعت کار بمبئی میں قائم ہونے والے سوتی کپڑے کے نئے کارخانوں سے حسد کرنے لگے تھے۔ چنانچہ 1874ء میں انھوں نے سوتی دھاگے اور سوتی کپڑے پر لگنے والے مناسب محصول کو حفاظتی محصول سے تعبیر کیا اور اس پر حملے کرنے لگے۔ ان کا یہ اقدام بر وقت تھا۔ مسٹر گلیڈسٹن کی وہ پہلی وزارت ملک میں اپنی ہر دل عزیزی کھو رہی تھی جس نے آئرلینڈ میں اصلاحات کی تھیں انگلستان میں قومی تعلیم کا طریقہ شروع کیا تھا۔ وزیروں کی حالت اس حد تک خراب ہو گئی کہ 1874ء میں انھوں نے پارلیمنٹ کو برخواست کر دیا۔ چنانچہ نئے انتخابات ہونے والے تھے۔ انتخابات میں لنکا شائر کے ووٹ بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ عمل کا وقت آگیا تھا۔ مانچسٹر کے چیمبر آف کامرس نے 31 جنوری 1874ء کو سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کے نام ایک یادداشت روانہ کی۔

سائلوں نے لکھا تھا کہ ہندوستان میں درآمد ہونے والے دھاگے پر 3½ فی صدی اور برطانیہ کے بنے ہوئے سوتی کپڑے پر 5 فی صدی محصول ان شرحوں کے مطابق لگایا گیا تھا جن کا تعین کئی سال پہلے اس وقت کیا گیا تھا جب قیمتیں مقابلتاً بہت زیادہ تھیں۔ چنانچہ یہ محصول دھاگے

کی حقیقی قیمت پر 4 فی صدی کپڑے پر 6 فی صدی ہوتا ہے۔

یہ کہ دھاگے اور کم قیمت معمولی کپڑے کی تجارت کے لیے یہ شرح محصول تباہ کن ہے۔

یہ کہ چیمبر کو معلوم ہوا ہے کہ مصر اور امریکہ سے کپاس درآمد کرنے کی تجویز زیر غور ہے (جس پر کوئی محصول نہیں لگایا جائے گا) تاکہ اس سے نفیس قسم کا دھاگا اور کپڑا تیار کیا جا سکے چنانچہ اس مال کا مقابلہ انگلستان سے درآمد ہونے والے اس مال سے ہوگا جس پر محصول ادا کیا جاتا ہے۔

یہ کہ اس طرح برطانوی ہندوستان میں سوتی کپڑے کی ایسی تجارت ابھر رہی ہے جس کی حفاظت کی جارہی ہے اور جو ہندوستان اور انگلستان دونوں کے لیے مضرت رساں ہے۔

یہ کہ محاصل کی بنا پر دیسی لوگوں کو یا کم سے کم غریب ترین طبقے کو کپڑے کی زیادہ قیمت ادا کرنی پڑتی ہے جس کا مضر اثر ان کی صحت، آسائش اور خوش حالی پر پڑتا ہے۔

چنانچہ سائلوں نے درخواست کی تھی کہ ہندوستان میں درآمد ہونے والے سوت اور سوتی کپڑے پر لگائے جانے والے محصول کی منسوخی پر بلا تاخیر غور فرمایا جائے۔

جب حکومت ہند کو اس یادداشت کی نقل موصول ہوئی تو اس نے جواب دیا کہ 1869ء میں سوتی دھاگے اور سوتی کپڑے کے محصول کے لیے تشخیص کی ہوئی قیمت میں بڑی تخفیف کر دی گئی تھی۔ پھر بھی حکومت نے وعدہ کیا کہ نظر ثانی کرنے کے لیے ایک کمیٹی آئندہ موسم سرما میں مقرر کی جائے گی۔

اس جواب سے مانچسٹر کا چیمبر آف کامرس مطمئن نہیں ہوا۔ اس نے سکریٹری آف اسٹیٹ کو پھر لکھا کہ یادداشت میں تشخیص قیمت کا ذکر ضمناً کیا گیا تھا اس کا اصل مقصد اور اس کی درخواست تو یہ ہے کہ تمام محاصل فوراً منسوخ کر دیے جائیں اس نے مزید لکھا۔

"ہمارے اس بیان کی تصدیق بمبئی سے آنے والی حالیہ خبروں سے ہوتی ہے کہ ان محاصل کا مضر اثر تجارت اور ملک معظم کی ہندوستانی اور انگلستانی رعایا کے مفادات پر پڑ رہا ہے۔ بمبئی کی خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ درآمدات پر محاصل لگا کر سوت کاتنے اور کپڑا بننے کی صنعت کا جو تحفظ کیا جارہا ہے اس کی وجہ سے بمبئی میں کئی نئے کارخانے بنائے جارہے ہیں۔"[1]

---

(1) حکومت ہند کی تجویز نمبر 2636 مورخہ 12 اگست 1875ء میں اس کا اقتباس دیا گیا ہے جو 1875ء کے مراسلہ نمبر 15 کے ساتھ ملفوف کی گئی تھی۔ خط ہم نے لگایا ہے۔

چنانچہ حکومت نے حسب وعدہ نومبر 1874ء میں محاصل کے لیے قیمتوں کی تشخیص پر نظرثانی کرنے کی خاطر ایک کمیٹی مقرر کی۔ اس کا صدر مسٹر الونزو منی۔ سی۔ بی (Mr. Alonzo Money C.B) تھا اور دوسرے تمام اراکین انگریز تاجر یا حکام تھے۔

کچھ چیزوں کے بارے میں کمیٹی کے اراکین میں اختلاف رائے تھا۔ لیکن سب نے بالاتفاق مانچسٹر کا یہ مطالبہ مسترد کر دیا کہ سوتی دھاگے اور کپڑے کو محصول سے مستثنا قرار دیا جائے۔

اُس زمانے میں لارڈ نارتھ برُوک ہندوستان کا وائسرائے تھا جو آزاد تجارت کا بڑا حامی تھا۔ لیکن وہ سخت اور انصاف پسند حاکم تھا اور آمدنی کے ایسے ذریعے کو قربان کرنے کے لیے تیار نہیں تھا جس کا مقصد صنعتوں کا تحفظ نہ تھا۔ کمیٹی کی رپورٹ پر غور کرنے کے بعد وائسرائے بہ اجلاس کونسل نے 1875ء کا نیا ٹیرف ایکٹ منظور کیا۔

نئے ایکٹ نے نیل، چاول اور لاکھ کے علاوہ تمام محاصل برآمد منسوخ کر دئے۔

اس نے سوتی دھاگے اور سوتی کپڑے پر محاصل برآمد برقرار رکھے اور ان کے متعلق کہا "سوتی مال پر بہ اعتبار بیجک 5 فی صدی محصول مقامی صنعتوں کا تحفظ نہیں کر سکتا ہے"[1]۔

محاصل کے لیے تشخیص کی ہوئی قیمتوں میں بڑی کمی کر دی گئی۔ لمبے ریشے والی روئی کی درآمد پر 5 فی صدی محصول لگایا تاکہ ہندوستان کے کارخانے نفیس کپڑے کے مقابلے میں غیر مساوی حیثیت نہ حاصل کر سکیں۔

عام محاصل درآمد کی شرح گھٹا کر 5 فی صدی کر دی گئی

شرابوں پر محصول کی شرح میں اضافہ کر دیا گیا

محصول کے لیے سوتی کپڑے کی قیمت کی تشخیص میں کمی کر دی گئی تھی جس کی وجہ سے ہندوستان کو 88,000 پونڈ کا نقصان ہوا۔ اگر دس روپے کو ایک پونڈ سمجھا جائے تو 1875ء کے ٹیرف ایکٹ کی وجہ سے ہندوستان کو کل 3,08,000 پونڈ کا نقصان ہوا۔ لیکن سوتی دھاگے اور سوتی کپڑے پر محصول برقرار رکھ کر لارڈ نارتھ برُوک نے ہندوستان کو 8,00,000 پونڈ کے مزید نقصان سے بچالیا۔ اس دوران انگلستان کے انتخابات میں کنسرویٹو پارٹی نے اکثریت حاصل کر لی اور لبرل

---

(1) حکومت ہند کی تجویز نمبر 2636 مورخہ 12 / اگست 1875ء میں اس کا اقتباس دیا گیا ہے جو 1875ء کے مراسلہ نمبر 15 کے ساتھ ملفوف کی گئی تھی، پیراگراف 15۔

حکومت نے 1874ء میں استعفیٰ دیدیا۔

کنزرویٹو حکومت کا وزیر اعظم مسٹر ڈزرائیلی تھا اور ڈیوک آف آرگل کی جگہ لارڈ سیلس بری کو سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا مقرر ہوا تھا۔ لارڈ سیلس بری آزاد تجارت کا حامی نہیں تھا۔ لیکن لنکا شائر کی خوشنودی حاصل کرنے کا خواہش مند ضرور تھا۔ اس نے 1875ء میں وائسرائے کو لکھا تھا۔

اگر اس محصول کا مقصد یہ ہے کہ انگلستان کو مقابلے سے ہٹایا جائے اور اس طرح ہندوستان کے صارفین کو ضروریات زندگی کی زیادہ قیمتیں ادا کرنے پر مجبور کیا جائے تو میں آپ کو بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس پر سنجیدہ قسم کے اعتراضات کئے جا سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ کا مقصد یہ نہیں ہے۔ پھر بھی اس کے متعلق جو کچھ کہا جا رہا ہے اس کے سیاسی مضر اثرات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ ان وجوہ کی اہمیت کی بنا پر جناب والا اپنے مالیاتی حالات کے پیش نظر جلد از جلد ان باتوں کو رد کرنے کی پالیسی پر غور کریں گے جن میں خطرناک امکانات مضمر ہیں[1]۔

لارڈ نارتھ بروک نے 5/ اگست 1875ء کو لارڈ سیلس بری کو تار کے ذریعہ مطلع کیا کہ اس کے تجویز کردہ خطوط پر ٹیرف ایکٹ منظور کر لیا گیا ہے۔ ہم اس تار کا پہلا حصہ ذیل میں درج کر رہے ہیں جس میں تبدیلیوں کا ذکر کیا گیا تھا جن کا حوالہ ہم پہلے دے چکے ہیں۔

• محاصل درآمد و برآمد پر نظر ثانی کرنے کے لیے آج ایک ایکٹ منظور کر لیا گیا۔

• نیل، دھان، چاول، اور لاکھ کے علاوہ تمام محاصل برآمد منسوخ کر دیے گئے۔ مندرجہ بالا اشیا کے محاصل میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی ہے۔

محاصل درآمد کی عام شرح $7\frac{1}{2}$ سے کم کر کے 5 فی صدی کر دی گئی۔ محاصل کے لیے تشخیص قیمت پر نظر ثانی کی گئی۔

سوتی کپڑے کے محصول درآمد میں کوئی تبدیلی ضروری نہیں سمجھی گئی لیکن اس کی تشخیص شدہ قیمت کم کر دی گئی جس کی وجہ سے محصول میں بقدر 88,000 پونڈ تخفیف ہو گئی۔

لمبے ریشے کی کپاس پر 5 فی صدی محصول درآمد لگا دیا گیا۔

---

(1) گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کے نام مراسلہ مورخہ 15 جولائی 1875 پیراگراف 5 اور 8۔

لندن کے معیار کے مطابق شرابوں پر محصول 3 روپیہ فی گیلن سے بڑھ کر 4 روپیہ فی گیلن کر دیا گیا۔

تار کے آخر میں بتایا گیا تھا کہ اس ایکٹ کی وجہ سے ہندوستان کو 3,08,000 پونڈ کا خالص نقصان ہوا۔

لیکن لارڈ سیلس بری اس سے مطمئن نہیں ہوا اس نے تار سے جواب دیا، ایکٹ کی دفعات بہت اہم ہیں۔ لیکن کچھ دفعات قابل اعتراض ہیں۔ اس نے پوچھا کہ 1874ء کے مراسلے نمبر کے مطابق جو منزلہ قانون تھا، ایکٹ بنانے سے پہلے سکریٹری آف اسٹیٹ سے اجازت کیوں نہیں حاصل کی گئی۔

اس کے بعد تلخ خط و کتابت ہوئی۔ لارڈ نارتھ بروک اور اس کی کونسل نے اگست 1875ء میں لکھا کہ معاملہ اتنا اہم تھا کہ اس میں تاخیر نہیں کی جا سکتی تھی۔ اگر سکریٹری آف اسٹیٹ سے اجازت حاصل کی جاتی تو حکومت ہند کے ارادے لوگوں کو معلوم ہو جاتے جس کی وجہ سے تجارتی حلقوں کو دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا۔

اس کے باوجود لارڈ سیلس بری مطمئن نہیں ہوا۔ اس نے تجویز پیش کی کہ نومبر 1875ء میں اس کا انڈر سکریٹری سر لوئی میلٹ (Sir Louis Mallet) ہندوستان آئے اور مالیاتی قوانین کے متعلق حکومت سے بات چیت کرے۔ اس نے زور دیا کہ سوتی کپڑے پر لگنے والا محصول درآمد رفتہ رفتہ بالکل ختم کر دیا جائے۔

لارڈ نارتھ بروک اور اس کی کونسل نے فروری 1876ء میں جواب دیا کہ یہ بات مناسب نہیں معلوم ہوتی ہے کہ ایک ایسا محصول منسوخ کر دیا جائے "جس کی بنا پر 8,00,000 پونڈ سے زیادہ کی آمدنی ہوتی ہے۔ اس بات کی کوئی نظیر نہیں ہے کہ حکومت انگلستان کے حکم کی تعمیل میں کوئی اس قسم کا اقدام کیا گیا ہو جس کا ایسا اثر ہندوستانی مالیات پر پڑا ہو جیسا کہ اس محصول کو ختم کرنے کا پڑ گیا جس کی وجہ سے ہر سال 8,00,000 پونڈ کی آمدنی ہوتی ہے۔" لارڈ نارتھ بروک اور اس کی کونسل نے اپنے مراسلے کو ان الفاظ پر ختم کیا " ہمارا فرض ہے کہ اس موضوع پر ہندوستان کے مفادات کے پیش نظر غور کریں۔ ہمارا خیال ہے کہ سوتی کپڑے کے محصول درآمد کی منسوخی ہندوستان کے مفاد میں نہیں ہے۔ ہمارا یہ بھی خیال ہے کہ اس معاملے کے مختلف پہلوؤں کے متعلق جو باتیں مراسلے میں درج کی گئی ہے۔ ان سے اور ہندوستان کے مالی حالات سے اچھی طرح

واضح ہو جاتا ہے کہ اس محصول کا مقصد وہ نہیں ہے جو سمجھا جاتا ہے اور ہندوستانی مالیات کو نقصان پہنچائے بغیر اس کو منسوخ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس کی جگہ اگر دوسرے محاصل عاید کئے گئے تو ان سے بڑی بے چینی پیدا ہو جائے گی

ایک اور مراسلے مورخہ مارچ 1876ء میں لارڈ نارتھ برک نے ان پابندیوں کے خلاف احتجاج کیا جو سکریٹری آف اسٹیٹ کی طرف سے وائسرائے پر عاید کی گئی تھیں "یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم ملک معظم کی حکومت پر واضح کر دیں کہ آئندہ پیش آنے والے اہم موقعوں پر فوری کارروائی کرنے کے اختیارات اگر گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل سے چھین لیے گئے تو ہماری رائے میں اس کی وجہ سے ہندوستان کی انتظامیہ کا اثر بہت کم ہو جائے گا اور اس کے کام میں رکاوٹ پڑے گی"

لارڈ نارتھ برک جو ہندوستان کے بہترین اور قابل ترین وائسرایوں میں سے تھا برطانوی کابینہ کی پالیسی سے بڑی حد تک اختلاف رکھتا تھا۔ وہ نہ اس غیر معقول سرحدی پالیسی پر عمل کر سکا جس کی وکالت کنزرویٹو حکومت کرتی تھی اور نہ لنکا شائر کے اشاروں پر تشکیل ہونے والی مالیاتی پالیسی کو تسلیم کر سکا۔ اس نے وائسرائے کے اعلا عہدے سے استعفےٰ دیدیا اور 1876ء میں ہندوستان سے واپس چلا گیا۔

یہ بات جاننا ہمارے قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگا کہ ہندوستان کے محاصل درآمد کے منسوخی کے سلسلے میں اور اس اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انڈر سکریٹری آف اسٹیٹ کو ہندوستان بھیجنے میں لارڈ سیلس بری کو کس حد تک اپنی کونسل کی حمایت حاصل تھی۔ یہ تجویز 30 ستمبر 1875ء کو تار کے ذریعے ہندوستان بھیجی گئی تھی۔

سر ارسکین پیری نے جس کا شمار انڈیا کونسل کے سب سے زیادہ باہمت اراکین میں ہوتا تھا اس تار پر اعتراض کیا تھا۔ اس نے لکھا تھا "حکومت ہند بلاشبہ ایک مطلق العنان حکومت ہے اور انگلستان کی حکومت سے توقع کی جاتی ہے کہ اس کے تمام اقدامات پر احتیاط کے ساتھ نظر ثانی کرے تاکہ مطلق العنانیت کی خرابیوں یعنی تلوّن، جلد بازی، ناانصافی وغیرہ کو دور کیا جا سکے۔ اگر ہندوستان میں کئے جانے والے اقدامات کے دوران قطعی احکامات تار کے ذریعے جاری کیے گئے تو اس ملک کی حکومت کی دشواریوں میں بہت اضافہ ہو جائے گا اور کوئی اہم مدبر گورنر جنرل کا عہدہ قبول کرنے کے لیے آسانی سے تیار نہیں ہوگا۔"

سر ہنری منٹگمری سترہ سال سے کونسل کا رکن تھا لیکن اس کے علم میں ایسی کوئی نظیر نہیں تھی

جب مالیاتی پالیسی کے متعلق حکومت ہند سے گفتگو کرنے کے لیے کوئی انڈر سکریٹری بھیجا گیا ہو۔ یہ بات بڑی عجیب تھی کہ اسے کونسل کے رکن کی حیثیت سے اس کا موقع نہیں دیا گیا کہ ہندوستان کی مالیاتی پالیسی میں کی جانے والی تبدیلیوں کے متعلق سرکاری خط و کتابت دیکھ سکے۔ اس نے لکھا تھا "مجھے سرکاری یا غیر سرکاری دستاویزات دیکھنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ مجھے ان اعتراضات کے متعلق بھی کچھ نہیں معلوم ہے جو وائسرائے کی مالیاتی پالیسی کے تعلق سے سکریٹری آف اسٹیٹ نے کئے ہیں ...... چونکہ حکومت ہند کی سرکاری کارروائی میں نے نہیں دیکھی ہے، سکریٹری آف اسٹیٹ کے اعتراضات سے میں باخبر نہیں ہوں اور اپنے ساتھیوں سے گفتگو کرنے کا مجھے موقع نہیں ملا ہے اس لیے میں مجبور ہوں کہ کسی ایسی کارروائی میں شریک ہونے سے انکار کر دوں جو میرے خیال میں ایک ایسے بحران کو روکنے کے بجائے اس کے لیے محرک کا کام کرے گی جس کی بنا پر ہندوستان فوری طور سے لارڈ نارتھ بروک کی صلاحیتوں اور تجربے سے محروم ہو جائے گا۔"

حالانکہ جنرل رچرڈ اسٹریچی سوتی کپڑے پر محصول درآمد منسوخ کرنے کے اصول کی حد تک لارڈ سیلس بری سے متفق تھا۔ لیکن اس نے بھی لکھا تھا "کونسل کے سامنے تار کا جو پہلا مسودہ رکھا گیا تھا اس پر میرے اعتراض کی وجہ یہ تھی کہ اس میں ایک ایسے موضوع کے متعلق کونسل کی آمادگی اظہار کیا گیا تھا جس کے متعلق کاغذات اراکین کونسل کے سامنے نہیں پیش کئے گئے تھے۔"

کونسل کے نائب صدر سر رابرٹ منٹگمری نے بتایا کہ کونسل نارتھ بروک کے محاصل کے متعلق عدم پسندیدگی کا اظہار نہیں چاہتی ہے۔ لارڈ سیلس بری نے "جو لنکا شائر کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اتنی جلد بازی سے کام لے رہا تھا کہ خود اپنی کونسل کے اراکین سے مشورہ کرنا بھی بھول گیا تھا" اپنے مخصوص انداز میں وضاحت کی "جس وقت مندرجہ بالا تار کونسل کو بھیجا گیا اس وقت میں لندن سے فاصلے پر تھا۔" "مجھے اس بات کا علم نہیں تھا کہ انھیں کاغذات دیکھنے کا موقعہ نہیں ملا ہے۔"

جب لارڈ نارتھ بروک کی جگہ لارڈ لٹن نے وائسرائے کا عہدہ سنبھال لیا تو لارڈ سیلس کے راستے کی رکاوٹیں دور ہو گئیں۔ اس نے 31 مئی 1876ء کو دو خط ہندوستان بھیجے ان میں سے ایک خط میں اس نے اس امر پر زور دیا کہ سوتی کپڑے پر محصول درآمد ختم کر دیا جائے۔ دوسرے خط میں اس نے سکریٹری آف اسٹیٹ اور حکومت ہند کے باہمی تعلقات کی وضاحت کی۔ ان دونوں خطوں کی حد تک کونسل کے اراکین کی اکثریت نے لارڈ سیلس بری سے اتفاق کیا

لیکن سر فریڈرک ہالی ڈے، سر بارٹل فریئر اور سر آرسکین پیری نے مالیاتی پالیسی کے سوال پر اختلاف کیا اور سر آرسکین پیری اور سر رابرٹ منٹگمری نے سکریٹری آف اسٹیٹ سے حکومت ہند کے تعلقات کی اس وضاحت سے اختلاف کیا جو خط میں کی گئی تھی۔

اختلاف کی جزئیات بیان کرنا ضروری نہیں معلوم ہوتا۔ سر فریڈرک ہالی ڈے نے لکھا تھا کہ جس حد تک محاصل حقیقت میں حفاظتی محاصل ہوں اس حد تک انھیں منسوخ کیا جانا چاہیے اور انھیں اس حد تک منسوخ کیا جائے جس حد تک وہ حفاظتی تصور کئے جائیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ جس محصول کی حفاظتی نوعیت کی بنا پر کوئی اعتراض نہ کیا جا سکے اس کی بیش قیمت اور ضروری آمدنی اس وقت تک اور اس حد تک کیوں ختم کی جائے جب تک اور جس حد تک اس کی نوعیت حفاظتی نہ ہو۔"

سر آرسکین پیری کا خیال تھا کہ انتظامی معاملات میں پہل کرنے کے اختیار حکومت ہند کو حاصل ہونا چاہیے اور نظر ثانی کا سکریٹری آف اسٹیٹ کو "اگر پہل کرنے کا اختیار سکریٹری آف اسٹیٹ کو حاصل ہو گیا تو اس کی نظر ثانی نہیں کی جا سکے گی اور اس لیے غور کرنے کا موقعہ نہیں مل سکے گا۔"

اختلاف کرنے والے اراکین اقلیت میں تھے، محصول درآمد کی منسوخی کے مطالبے میں لارڈ سیلسبری کو اکثریت کی حمایت حاصل تھی اور لارڈ لٹن بخوشی اس کی تعمیل کرنے کو تیار تھا۔ لیکن ہند میں ایک نئی دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ مدراس میں ایسا خوفناک قحط پڑا جس کی مثال پچھلے سو سال میں نہیں ملتی تھی۔ اس نے ہندوستان کے حاکموں کو ہاتھ روکنے پر مجبور کر دیا۔ نئے وزیر مالیات سر جان اسٹریچی نے 15/ مارچ 1877ء کو تقریر کرتے ہوئے کہا۔

چاندی کی قیمت گرنے کی وجہ سے جو مالیاتی دشواریاں پیدا ہو گئی تھیں ان کی بنا پر پچھلے سال اس سلسلے میں کوئی اقدام نہیں کیا جا سکا۔ ان حالات میں آمدنی سے دست بردار ہونا عقل مندی کے منافی سمجھا گیا اور سکریٹری آف اسٹیٹ نے اس فیصلے سے اتفاق کیا۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ پچھلے سال کی طرح کے حالات کی بنا پر ہمیں فیصلہ کرنا پڑا ہے کہ امسال بھی ان محاصل کی تنسیخ کے سلسلے میں کوئی قدم نہیں اٹھایا جا سکے گا۔ قحط کی وجہ سے پیدا ہونے والی مالیاتی دشواریاں اتنی شدید ہیں کہ ہم اپنی آمدنی کی کسی ذریعے کو قربان نہیں کر سکتے ہیں[1]۔

---

(1) سر جان اسٹریچی کا مالیاتی بیان 15/ مارچ 1877ء۔

لیکن لنکا شائر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا جارہا تھا۔ انگلستان کی کوئی سیاسی جماعت لنکاشائر کے ووٹوں کی نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ مسٹر ڈزرائیلی کی حکومت بھی اس کے لیے تیار نہیں تھی۔ حالانکہ انگلستان کے اخباروں میں مدراس کے خوفناک قحط کی خبریں شائع ہورہی تھیں پھر بھی سوتی کپڑے کا محصول منسوخ کرنے کے لیے 11 جولائی 1877ء کو برطانیہ کے ہاؤس آف کامنز میں ایک تجویز منظور کی گئی۔ تجویز مندرجہ ذیل تھی۔

"یہ کہ ایوان کی رائے میں ہندوستان میں درآمد ہونے والے سوتی کپڑے پر لگنے والے محاصل حفاظتی نوعیت کے ہیں اور صحت مند تجارتی پالیسی کے منافی ہیں۔ اس لیے ہندوستان کے مالیاتی حالات جب بھی اجازت دیں انھیں بلا تاخیر منسوخ کر دیا جائے۔"

تجویز کی آخری الفاظ مہمل ہیں۔ غدر کے بعد سے ہندوستان کی مالیاتی حالت کبھی اس قابل نہیں ہوئی کہ حکومت آمدنی کے کسی ذریعے سے دست بردار ہوسکے۔ خسارے کو پورا کرنے کے لیے مقامی محاصل لگانے پڑتے تھے جو انتہائی تکلیف دہ تھے۔ کسی دوسرے ذریعہ آمدنی کو ختم کرنے سے پہلے ان مقامی محاصل کو ختم کیا جانا چاہیے تھا۔ لیکن تجویز کا مقصد یہ نہیں تھا۔ حکومت انگلستان اس کی خواہش مند بھی نہ تھی کہ تجویز کا مقصد یہ سمجھا جائے۔

لارڈ سیلس بری نے ہاؤس آف کامنز کی تجویز حکومت ہند کو بھیجی اور خطرے کی نشاندہی کرتے ہوئے اس کی توجہ اس امر پر دلائی "کہ مزید پانچ کارخانوں میں کام شروع ہونے والا ہے۔ خیال ہے کہ مارچ 1877ء کے آخر تک ہندوستان میں 284، 31، 12 تکلوں پر کام ہونے لگے گا۔"[1]

چنانچہ حکومت ہند نے اگلے سال درآمد ہونے والی کچھ ایسی اشیا کو محصول سے مستثنا کر دیا جن کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ ہندوستانی مصنوعات ان سے مقابلہ کر رہے ہیں اور اس طرح وہ مزید آمدنی سے محروم ہوگئی۔ "ان میں 18 ریڈ (لمبائی کا پیمانہ) سے کم میز پوش، زین دست کاروں کی بنائی ہوئی اشیا، بستر کی چادریں اور ڈرل (ایک قسم کا موٹا کپڑا) شامل ہے ..... حکومت ہند نے ان کو مستثنا قرار دینے کا فیصلہ کرلیا ہے بشرطے کہ مستثنا کیے جانے والے مال میں اس سے بہتر سوت استعمال نہ کیا جائے جس کو 30 ایس کہا جاتا ہے یعنی ایسا

---

(1) مراسلہ بنام گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل مورخہ 30 / اگست 1877ء۔

سوت جس کے 840 گز کی تیس لچھیوں کا وزن ایک پاؤنڈ ہو۔ 77-1876ء کے اعداد و شمار کے مطابق محصول کی رقم کا نقصان 22,227 پونڈ سے زیادہ نہیں ہوگا۔"[1]

مانچسٹر کا چیمبر آف کامرس اس سے بھی مطمئن نہیں ہوا۔ اس نے پھر اصرار کیا کہ بہت سی اور اشیا کو مستثنا ہونا چاہیے۔ یہ کہ قمیصوں کا کپڑا اور لٹھا ابھی مستثنا نہیں کیا گیا ہے جو 30 ایس اور موٹے سوت سے بنایا جاتا ہے۔ یہ کہ سوت کی حد تک مستثنا ہونے والی قسموں کی مقرر کی جانے والی مقدار زیادہ قابل اعتراض ہے۔ یہ کہ بنا بر آں ۔ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ ملکہ معظم کے اعلا سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا سے درخواست کی جائے کہ وہ ہر قسم کے ایسے کپڑے کو جس میں 30 ایس سے بہتر سوت نہ استعمال کیا جائے اور 26 ایس لہر یا کپڑا بنانے والے سوت اور 40 ایس مشین سے بنے ہوئے سوت کے علاوہ ہر قسم کے سوت کو مستثنا قرار دے دے۔"[2]

ہندوستان کا وائسرائے لارڈ لٹن تمام مطالبوں کی بلا کم و کاست تسلیم کرنے کے لیے تیار تھا۔ لیکن ہندوستان کی سول سروس کے لوگوں کی تعریف کرنا پڑتی ہے۔ وائسرائے کی کونسل کے اراکین کی اکثریت نے سپر انداز ہونے اور ایک ایسے زمانے میں آمدنی سے دست بردار ہونے پر مجبور کیے جانے کے خلاف احتجاج کیا جو قحط، جنگ اور محاصل میں اضافے کا زمانہ تھا۔ ان لوگوں کے لکھے ہوئے کچھ اختلافی نوٹ ہندوستان کی سرکاری تحریروں کے بہترین نمونے سمجھے جاتے ہیں۔

مسٹر وہٹبی اسٹاکس (WHITBY STOCKS) نے منسوخی کے خلاف مندرجہ ذیل اعتراض کیے۔ پہلی بات اس نے کہی کہ ہندوستان کی مالیاتی حالت انتہائی خستہ ہے "ہم وہ رقم خرچ کر چکے ہیں جو قحط کے خلاف بیمے کے طور پر جمع کی گئی تھی یا جس کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ قحط کے زمانے میں استعمال کی جائے گی۔ افغانستان کے خلاف جنگ جاری ہے جس پر بے اندازہ دولت صرف ہو رہی ہے۔ برما کے بادشاہ سے جنگ کسی لمحہ شروع ہو سکتی ہے۔ ہمیں پانچ کروڑ روپیہ (پانچ ملین پونڈ) ہندوستان میں قرض لینا پڑ رہا ہے۔ اور دو ملین پونڈ کے لیے ہم انگلستان کے سامنے ہاتھ پھیلا رہے ہیں۔

---

(1) حکومت ہند کا مالیاتی بیان مورخہ 18 مارچ 1878ء پیراگراف 57 اور 58۔

(2) بورڈ آف ڈائریکٹرز کے جلسے میں منظور ہونے والی تجویز 27 مارچ 1878ء۔

دوسری بات یہ کہ ہم نے اگر ان اشیا کو مستثنا قرار دیدیا جن کا مطالبہ کیا جارہا ہے تو ہمیں آخر میں ہر قسم کے سوتی مال پر محاصل منسوخ کرنے پڑیں گے۔ "لنکاشائر کے بارسوخ صنعت کاروں کی ہمت دوسری کامیابی کی بناپر اور بڑھ جائے گی اور وہ ہماری آمدنی پر نئے حملے شروع کردیں گے......

اگر ہم کبھی خسارے کو واقعی بچت میں تبدیل کرسکیں تو میری رائے میں ہمیں معقول و مناسب محاصل درآمد کے بجائے راست محاصل میں کمی کرنی چاہیے۔"

تیسری بات یہ کہ مجوزہ منسوخی کی بنا پر ہمیں ان رقموں سے دست بردار ہونا پڑے گا جو دیسی ریاستیں برطانوی ہند کو ادا کرتی ہے

چوتھی بات یہ کہ مانچسٹر کے صنعت کاروں کے علاوہ کسی نے محاصل کی شکایت نہیں کی ہے ہندوستان کے لوگ ان کی منسوخی کی موافقت میں نہیں ہیں۔

پانچویں بات یہ کہ مجوزہ منسوخی کی بنا پر "مانچسٹر کے صنعت کار ہندوستان کے لوگوں کو اس بات پر مجبور کرسکیں گے کہ وہ ایسا ناقص سوتی کپڑا خریدیں جو موجودہ شرمناک حد تک ناقص کپڑے سے بدتر ہوگا اگر اس سے بدتر کپڑا بنانا ممکن ہوا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ لوگ اپنے کپڑوں پر جو روپیہ خرچ کریں گے اس میں تخفیف کے بجائے اضافہ ہوجائے گا۔"

چھٹی بات یہ کہ ہندوستان کے اخبارات یہ بازار میں مشتہری کریں گے کہ محاصل کی منسوخی۔ "صرف مانچسٹر اور کنزرویٹو پارٹی کو فائدہ پہنچانے کے لیے کی گئی ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آئندہ انتخابات کے موقع پر مانچسٹر کے ووٹ حاصل کرنا چاہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان کے لوگوں کی بات کو صحیح نہیں سمجھا جائے گا۔ جب بھی وہ لوگ حاکم قوم پر خودغرضی کا الزام عاید کریں تو ان کی بات کو صحیح نہیں سمجھنا چاہیے۔"[1]

مسٹر ریورس تھامسن (RIVERS THOMSON) نے' جو بعد میں بنگال کا لفٹننٹ گورنر مقرر ہوا تھا' ہندوستان کی مالیاتی دشواریوں کا ذکر کیا۔ 80-1879ء کے تخمینی بجٹ میں 13,95,000 پونڈ کا خسارہ تھا۔ بارہ مہینے پہلے قحط کے خلاف بیمے کی رقم جمع کرنے کے لیے جو خصوصی محصول لگایا گیا تھا اس کی آمدنی دوسرے کاموں پر خرچ کی جاچکی تھی۔ آئندہ قحطوں کا مقابلہ کرنے کیلیے

---

(1) روداد مورخہ 13/ مارچ 1879ء مندرجہ بالا آخری جملے میں جس گہرے طنز سے کام لیا گیا ہے اس کی مثال ہندوستان کی سرکاری تحریروں میں میری نظر سے نہیں گزری ہے۔

اگر نیا محصول لگایا گیا تو اس سے یہ خطرناک شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ حکومت بد دیانت ہے۔" "میری رائے میں سوتی کپڑے کے محاصل کے کسی حصّے کو منسوخ کرنے کے لیے یہ مناسب موقع نہیں ہے۔ انگلستان کے حالات کے پیش نظر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت ہند کے معقول مطالبے پر برطانوی سیاسی ضروریات کو ترجیح دی جارہی ہے اس لیے میں اس طریقے کو اور بھی ناپسند کرتا ہوں۔"[1]

سر الگزینڈر آربتھ نٹ (SIR ALEXANDER ARBUTHNOT) نے بھی ہندوستانی مالیات کا ذکر کیا۔ اس نے زوردار الفاظ میں کہا کہ ہاؤس آف کامنز کی تجویز نے حکومت ہند کو ہندوستانی مالیات کا توازن برقرار رکھنے کی ذمہ داری سے بری الذّمہ نہیں قرار دیا ہے۔ ہندوستان کے لوگ سمجھتے ہیں کہ ملکہ معظمہ کی حکومت نے اس سلسلہ میں جو اقدام کیا ہے وہ ان اثرات کا نتیجہ ہے جو سوتی کپڑے کے برطانوی تاجروں یعنی لنکاشائر کے صنعت کاروں کی طرف سے اس پر ڈالا گیا ہے۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ اس قسم کے خیالات ہندوستان میں اس وقت سے پائے جاتے ہیں جب چار سال پہلے لارڈ سیلس بری نے مانچسٹر کے صنعت کاروں کے ایک جلسہ میں کہا تھا کہ حکومت ہند کو ہدایت کی جائے گی کہ وہ رفتہ رفتہ سوتی کپڑے کا محصول درآمد ختم کر دے۔

"یہ خیالات صرف دیسی لوگوں تک محدود نہیں ہیں۔ کلکتہ اور مدراس کے چیمبر آف کامرس سے ملنے والی اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان شہروں کے یورپین تاجروں کے سرکردہ نمائندے بھی دیسی لوگوں کے ہم خیال ہیں۔

"ہندوستان کے طبقہ حکّام کی بڑی اکثریت بھی ان کی ہم خیال ہے۔ میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت ہندوستان میں ایک درجن حاکم بھی نہیں ہیں جو اس پالیسی کو' جو اختیار کی گئی ہے' ایسی پالیسی نہیں سمجھتے ہیں جو ہندوستان بلکہ انگلستان کے بھی مفاد میں ہونے کے بجائے ایک ایسی سیاسی جماعت کے مفاد یا مفروضہ مفاد میں ہے جس کے قائد یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ ہر قیمت پر لنکاشائر کے سوتی کپڑے کے صنعت کاروں کی سیاسی حمایت حاصل کی جاتی رہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور حکومت میں کورٹ آف ڈائریکٹرز ہندوستان کے مفادات اور انگلستان کے طاقت ور طبقوں کے دباؤ کے درمیان اکثر ایک موثر حد فاصل بن جایا کرتا تھا جہاں تک کام کی نوعیت کا تعلق ہے کونسل آف انڈیا یعنی سکریٹری آف اسٹیٹ کی کونسل کسی طرح

---

(1) روداد مورخہ 13/ مارچ 1879ء۔

کورٹ آف ڈائریکٹرز کی جگہ نہیں لے پاتی ہے ...... دوسری طرف گورنر جنرل کی کونسل کو قانون کے رو سے بڑے اختیار حاصل ہیں اور اس پر بھاری ذمہ داریاں ہیں .... ہندوستان کی بہت بڑی بدقسمتی ہوگی اگر یہ کونسل اپنے ان فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کرے جو اس کے سپرد کئے گئے ہیں[1]۔"

سر انڈریو کلارک (ANDREW CLARKE) کا بھی خیال تھا کہ اس پالیسی سے روگردانی کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے جس کی بنیاد پر 1875ء کا ٹیرف ایکٹ بنایا گیا تھا۔[2]

لیکن یہ زوردار احتجاج بے سود ثابت ہوئے۔ ہندوستان کے گورنر جنرل کو اختیار حاصل تھا کہ وہ کچھ صورتوں میں کونسل کے اراکین کی اکثریت کی رائے کے خلاف اقدامات کر سکے۔ لارڈ لٹن نے اپنے اختیارات سے کچھ زیادہ ہی کام لیا اور "درآمد ہونے والے ان تمام سوتی کپڑوں کو جن میں 30 ایس سے بہتر سوت نہیں استعمال ہوتا تھا" محصول درآمد سے مستثنٰی قرار دیدیا۔ گر کر حکم کی تعمیل کرنے میں کونسل کے صرف دو اراکین یعنی سر جان اسٹریچی اور سر ایڈون جانسن نے گورنر جنرل کی حمایت کی۔[3]

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ سکریٹری آف اسٹیٹ نے لارڈ لٹن کے اقدامات کو پسند کیا۔[4] جنرل رچرڈ اسٹریچی نے اسی طرح سکریٹری آف اسٹیٹ کی حمایت کی جس طرح اس کے بھائی سر جان اسٹریچی نے وائسرائے کی حمایت کی تھی۔ پانچ دوسرے اراکین نے سکریٹری آف اسٹیٹ کی مخالفت کی جن میں سر فریڈرک ہالی ڈے، سر رابرٹ منٹگمری، سر ولیم میور اور سر ارسکین پیری شامل تھے۔ لارڈ لٹن اپنی کونسل کے اراکین کی اکثریت کے خلاف معمولی سوتی کپڑے کے محصول درآمد سے دست بردار ہوگیا تھا۔ لارڈ سیلس بری نے اپنی کونسل کے اراکین کی اکثریت کی رائے کے خلاف اس کو منظور کر لیا۔

ہم نے 1879ء میں پیش آنے والے واقعات کا حوالہ دے کر کتاب کے اس حصے کی

---

(1) روداد مورخہ 13 / مارچ 1879ء۔

(2) ایضاً۔

(3) سکریٹری آف اسٹیٹ کے نام مراسلہ مورخہ 13 / مارچ 1879ء

(4) مراسلہ مورخہ 7 / جولائی 1879ء۔

حدود سے تجاوز کیا ہے۔ مگر ہمیں ایسا اس مالی بحث جو 1874ء سے 1879ء تک چلتی رہی، کی روداد کو مربوط رکھنے کے لیے کرنا پڑا۔ جن حالات محصول درآمد سے دست بردار ہونا پڑا ان سے ہاؤس آف کامنز کی تجویز کی آخری دفعہ کی عجیب و غریب تشریح ہوتی ہے۔ اس دفعہ میں کہا گیا تھا کہ "جب ہندوستان کی مالیاتی حالت اجازت دے تو بلا تاخیر محصول منسوخ کر دیا جائے۔ لیکن حقیقت میں محصول اس وقت منسوخ کیا گیا جب 1877ء کے قحط مدراس کے اثرات جنوبی ہند میں محسوس کیے جا رہے تھے اشمالی ہند 1878ء کے قحط کا سامنا کر رہا تھا، مال گزاری کے علاوہ زمین پر نئے محاصل لگائے جا رہے تھے، ایک خصوصی محصول کے ذریعے حاصل کی جانے والی قحط کے بیمے کی رقم خرد برد ہو چکی ہے، بجٹ میں خسارہ دکھایا جا رہا تھا اور ایک سائنسی سرحد کی تلاش کی بنا پر افغانستان میں دشواریوں کا سامنا کرنے اور اخراجات میں بے اندازہ اضافہ ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔

اگر ہاؤس آف کامنز نے 1877ء کی تجویز منظور کر کے بیجا باؤ ڈالا تھا تو حکومت ہند نے 1879ء میں اس تجویز کو عملی شکل دیکر کمزوری دکھائی اور ہندوستان کے اعتماد کا خون کر دیا۔ ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ لارڈ لٹن کے علاوہ ہندوستان کا کوئی دوسرا وائسرائے ہندوستان کی آمدنی کو ان حالات میں قربان نہ کرتا اور سر جان اسٹریچی کے علاوہ وزیر مالیات کا عہدہ سنبھالنے والا کوئی ماہر مالیات اس قسم کی قربانی کا مشورہ نہ دیتا۔

جماعتی سیاست کی خاطر یہ رکیک حرکت کی گئی مگر اس سے کنزرویٹو پارٹی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ 1880ء کے انتخابات میں اُسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

حصّة شوم

سنة 1900 سنة 1877م

باب -1

لٹن اور رپن

اب ہم ملکہ وکٹوریہ کے دورِ حکومت کے آخری برسوں کا ذکر کریں گے۔ انسانی جذبات، خیالات اور توقعات میں آہستہ آہستہ ہونے والی اُس تبدیلی کی ابتدا کی کوئی تاریخ اگر مقرر کی جاسکے جس کو انگلستان کے رجعت پسندانہ ردِعمل کا نام دیا گیا ہے تو وہ 1874 ہے جب مسٹر گلیڈسٹن کی پہلی وزارت ختم ہوئی۔ دنیا کی بڑی طاقتوں نے اتنی تیزی سے ترقی کی کہ اُس کی وجہ سے جذبۂ حسد بڑھنے لگا اور نئی نئی توقعات جنم لینے لگیں۔ دنیا کے آدھے حصے میں ایک مغربی جمہوریہ نے اقتدارِ اعلیٰ حاصل کر لیا تھا جو خانہ جنگی کے بعد ایک دفعہ پھر متحد ہو گئی تھی اور اُس نے دنیا کے دوسرے حصے کی سیاست اور تجارت میں بڑھ چڑھ کے حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ سادوَ SADOWN اور سیدان SEDAN کے میدانوں سے ایک متحد جرمنی اُبھرا جس نے بے اندازہ طاقت حاصل کر لی تھی۔ فرانس بھی شکست کے بعد پھر سر اٹھانے لگا تھا اور اپنے نقصانات کی تلافی کے لیے افریقہ اور ایشیا پر حریفانہ نظریں ڈال رہا تھا۔ روس نے معاہدہ بحرِ اسود BLACK SEA پر خطِ نسخ کھینچ دیا تھا اور مشرق کی طرف بلا روک ٹوک بڑھ رہا تھا۔ انگلستان کے لوگ پریشان تھے۔ گھریلو اصلاحات کے بجائے توسیع کی خواہش نے انھیں بے چین کر رکھا تھا۔ ہندوستان کی طرف روس کی پیش قدمی کو وہ ہر قیمت پر روکنا چاہتے تھے۔ افریقہ کے دروازے کھلے ہوئے تھے اور نئے نئے علاقے برطانوی فاتح کے منتظر تھے۔ نو آبادیات سے روابط مستحکم بنا کر برطانوی اثر و اقتدار کی تجویز کی جاسکتی تھی اور اس طرح انگلستان دنیا کے مقابلے میں ایک متحدہ محاذ بنا سکتا تھا۔ ایک موثر عالمگیر خارجہ پالیسی

یعنی توسیع و فتوحات کی پالیسی کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی تاکہ ابھرتی ہوئی قوموں میں انگلستان اپنی حیثیت برقرار رکھ سکے۔ انگریزوں کے احساسات غیر واضح سہی مگر اُن میں شدت تھی۔ جیسا کہ عام طور سے ایسے حالات میں ہوا کرتا ہے اُن کا پہلا قدم ناسمجھی پر مبنی تھا اور انھیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

لارڈ لارنس کی صحت مند سرحدی پالیسی کو اب ناپسند کیا جانے لگا تھا۔ قومی ذہن ہیجان میں مبتلا تھا اور سر بارٹل فریرے کا مسلک اُس کے لیے زیادہ کشش رکھتا تھا۔ لارڈ نارتھ بروک نے اس کو مسترد کر دیا تھا لیکن وہ مستعفی ہو چکا تھا۔ ایک نیا وائسرائے مقرر کیا جا چکا تھا جو نئی پالیسی پر عمل کرنے کے لیے آمادہ تھا۔ لارڈ لٹن کے نام انگلستان کے وزیر اعظم مسٹر ڈزرائیلی نے جو خط روانہ کیا تھا اُس سے اچھی طرح ظاہر ہو گیا تھا کہ وائسرائے سے کیا توقعات وابستہ کی گئی ہیں۔

عزیز من لٹن!

لارڈ نارتھ بروک نے کچھ نجی اسباب کی بنا پر ہندوستان کے وائسرائے کے عہدے سے استعفےٰ دیدیا ہے اور وہ موسم بہار میں انگلستان واپس آجائے گا۔

"اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں اُس کے جانشین کی حیثیت سے آپ کا نام ملکہ کی خدمت میں پیش کردوں۔ وسط ایشیا کے بحرانی حالات کا تقاضہ ہے کہ کسی مدبّر کو وائسرائے مقرر کیا جائے۔ اگر آپ اس ذمّہ داری کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائیں تو مجھے یقین ہے کہ آپ کو نہ صرف وطن کی خدمت کا موقع ملے گا بلکہ آپ دوامی شہرت بھی حاصل کر سکیں گے۔"[1]

اُس وقت لارڈ لٹن کی عمر چالیس سال کی تھی اور وہ لسبن LISBON کے سفارت خانے میں کام کر رہا تھا۔ ہندوستان بھیجے جانے کے متعلق اُسے ملنے والی یہ پہلی اطلاع تھی۔ لارڈ لٹن کا انتخاب اس لیے کیا گیا تھا کہ وہ افغانستان کے تعلق سے اُس پالیسی پر عمل کرے جس پر عمل کرنے سے لارڈ نارتھ بروک نے انکار کر دیا تھا۔ وزیر اعظم کے خط میں حالیہ قحطوں اور لوگوں کی معاشی دشواریوں کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا تھا۔ برطانوی کابینہ کو اُن باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

نئے وائسرائے نے ہندوستان پہنچنے میں دیر نہیں کی۔ اُس نے 12 اپریل 1886 کو لارڈ نارتھ بروک سے عہدے کا چارج لے لیا۔ چارج لینے کے بعد 24 اپریل کو وہ انبالہ پہنچا اور پشاور کے کمشنر کو اُس خط کا مسودہ دیا جو امیر افغانستان کو بھیجا جانے والا تھا۔ برطانوی قاصد کو کابل بھیجنے کے لیے ایک بہانہ تراشا گیا

---

[1] بنجمن ڈزرائیلی کا خط لارڈ لٹن کے نام مورخہ 23 نومبر 1875

امیر کو اطلاع دی گئی" سر لوس پیلی SIR LEWIS PELLY کے ہمراہ ڈاکٹر بیلیو BELLOW اور میجر سینٹ جان بھی ہوں گے تاکہ وہ خوریتا KHUREETA کے مقام پر اعلیٰ حضرت کی خدمت خاص میں وہ خط پیش کر سکیں جس میں وائسرائے کے عہدہ سنبھالنے کی اطلاع دی گئی ہے، اور جناب اعلیٰ کو باضابطہ طور سے اُن شاہی القاب سے مطلع کیا گیا ہے جو ملکہ معظمہ نے سلطنت ہندوستان کے تعلق سے اختیار کیے ہیں۔" [1]

امیر افغانستان بڑا سمجھ دار تھا۔ وہ قاصد کے آنے کا اصل مقصد سمجھ گیا۔ چنانچہ اس نے جواب دیا۔ "خدا کے فضل سے سلطنت خداداد افغانستان کے مراسم سلطنت اعلیٰ منزلت حکومت انگلشیہ سے حسب سابق بحال و برقرار رہیں گے۔ اس موقع پر اگر آپ کے خیال میں اس قسم کے مذاکرات کا محل ہے جس سے سلطنت خداداد افغانستان کو فائدہ پہنچنے کی امید ہو تو اُس کا اشارہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ آپ کے بھی خولہ کا معتمد قاصد اُس مقام پر آکر اور اُن امور سے آگاہی پاکر جو حکومت انگلشیہ کے کشادہ دل میں محفوظ ہیں شاہی محل میں اس طالب کرم کے گوش گزار کر سکے۔" [2] دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ شیر علی نے برطانوی قاصد کابل بھیجنے کی تجویز کے متعلق پس و پیش کا اظہار کیا اور یہ خواہش ظاہر کی کہ اُس کا ایلچی جاکر اُن خیالات سے آگاہی حاصل کرے جو "حکومت انگلشیہ کے کشادہ دل میں" محفوظ ہیں۔

اس پہلی رکاوٹ نے لارڈ لٹن کو برافروختہ کر دیا۔ اُس نے پشاور کے کمشنر کے توسط سے امیر کو متنبہ کیا کہ وہ وائسرائے کے دوستانہ مقاصد کی نفی کر رہا ہے اور افغانستان کو برطانوی حکومت کی حمایت اور دوستی سے عمداً محروم کر رہا ہے۔ [3]

لارڈ لٹن نے جو رویہ اختیار کیا تھا اُس کو اُس کی کونسل کے سمجھدار اراکین نے ناپسند کیا۔ سر ولیم میور، سر ہنری نارمن اور سر آرتھر ہابہاؤس کا کہنا تھا کہ شیر علی کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ برطانوی ایلچی کا خیر مقدم نہ کرے، یہ کہ اُس نے جو وجوہ بیان کی ہیں اُن میں وزن ہے اور یہ کہ برطانوی حکومت کا جواب جنگ کی دھمکی کے مترادف ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ قاصد بھیجنے کا اصل مقصد امیر سے چھپا ہوا نہیں ہے اور یہ امر انصاف سے بعید ہے کہ کابل میں مستقل سفارت خانہ قایم کرنے کے خیال سے اُسے مطلع نہیں

---

[1] پشاور کے کمشنر کا خط امیر افغانستان کے نام مورخہ 6 مئی 1876

[2] امیر کا خط مورخہ 22 مئی 1876

[3] پشاور کے کمشنر کا خط مورخہ 8 جولائی 1876

یعنی توسیع و فتوحات کی پالیسی کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی تاکہ ابھرتی ہوئی قوموں میں انگلستان اپنی حیثیت برقرار رکھ سکے۔ انگریزوں کے احساسات غیر واضح سہی مگر اُن میں شدت تھی۔ جیسا کہ عام طور سے ایسے حالات میں ہوا کرتا ہے اُن کا پہلا قدم ناسمجھی پر مبنی تھا اور انھیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

لارڈ لارنس کی مُہت مند سرحدی پالیسی کو اب ناپسند کیا جانے لگا تھا۔ قومی ذہن ہیجان میں مبتلا تھا اور سر بارٹل فریرے کا مسلک اُس کے لیے زیادہ کشش رکھتا تھا۔ لارڈ نارتھ بروک نے اس کو مسترد کر دیا تھا لیکن وہ مستعفی ہو چکا تھا۔ ایک نیا وائسرائے مقرر کیا جا چکا تھا جو نئی پالیسی پر عمل کرنے کے لیے آمادہ تھا۔ لارڈ لٹن کے نام انگلستان کے وزیر اعظم مسٹر ڈزرائیلی نے جو خط روانہ کیا تھا اُس سے اچھی طرح ظاہر ہو گیا تھا کہ وائسرائے سے کیا توقعات وابستہ کی گئی ہیں۔

عزیز من لٹن!

لارڈ نارتھ بروک نے کچھ نجی اسباب کی بنا پر ہندوستان کے وائسرائے کے عہدے سے استعفے دیدیا ہے اور وہ موسم بہار میں انگلستان واپس آجائے گا۔

"اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں اُس کے جانشین کی حیثیت سے آپ کا نام ملکہ کی خدمت میں پیش کر دوں۔ وسط ایشیا کے بحرانی حالات کا تقاضہ ہے کہ کسی مدبّر کو وائسرائے مقرر کیا جائے۔ اگر آپ اس ذمّہ داری کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائیں تو مجھے یقین ہے کہ آپ کو نہ صرف وطن کی خدمت کا موقع ملے گا بلکہ آپ دوامی شہرت بھی حاصل کر سکیں گے۔" ؎

اُس وقت لارڈ لٹن کی عمر چوالیس سال کی تھی اور وہ لسبن 'LISBON' کے سفارت خانے میں کام کر رہا تھا۔ ہندوستان بھیجے جانے کے متعلق اُسے ملنے والی یہ پہلی اطلاع تھی۔ لارڈ لٹن کا انتخاب اس لیے کیا گیا تھا کہ وہ افغانستان کے تعلق سے اُس پالیسی پر عمل کرے جس پر عمل کرنے سے لارڈ نارتھ بروک نے انکار کر دیا تھا۔ وزیر اعظم کے خط میں حالیہ قحطوں اور لوگوں کی معاشی دشواریوں کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا تھا۔ برطانوی کابینہ کو اُن باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

نئے وائسرائے نے ہندوستان پہنچنے میں دیر نہیں کی۔ اُس نے 12 اپریل 1886 کو لارڈ نارتھ بروک سے عہدے کا چارج لے لیا۔ چارج لینے کے بعد 24 اپریل کو وہ انبالہ پہنچا اور پشاور کے کمشنر کو اُس خط کا مسودہ دیا جو امیر افغانستان کو بھیجا جانے والا تھا۔ برطانوی قاصد کو کابل بھیجنے کے لیے ایک بہانہ تراشا لیا

؎ بنجمن ڈزرائیلی کا خط لارڈ لٹن کے نام مورخہ 23 نومبر 1875

امیر کو اطلاع دی گئی " سر لے وس پیلی SIR LEWIS PELLY کے ہمراہ ڈاکٹر بیلیو BELLOW اور میجر سینٹ جان بھی ہوں گے تاکہ وہ خوریتا KHUREETA کے مقام پر اعلیٰ حضرت کی خدمت خاص میں وہ خط پیش کر سکیں جس میں وائسرائے کے عہدہ سنبھالنے کی اطلاع دی گئی ہے اور جناب اعلیٰ کو باضابطہ طور سے اُن شاہی القاب سے مطلع کیا گیا ہے جو ملکہ معظمہ نے سلطنت ہندوستان کے تعلق سے اختیار کیے ہیں " [1]

امیر افغانستان بڑا سمجھ دار تھا۔ وہ قاصد کے آنے کا اصل مقصد سمجھ گیا۔ چنانچہ اس نے جواب دیا۔ " خدا کے فضل سے سلطنت خداداد افغانستان کے مراسم سلطنت اعلیٰ منزلت حکومت انگلشیہ سے حسب سابق بحال و برقرار رہیں گے۔ اس موقع پر اگر آپ کے خیال میں اس قسم کے مذاکرات کا محل ہے جس سے سلطنت خداداد افغانستان کو فائدہ پہنچنے کی امید ہو تو اُس کا اشارہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ آپ کے بھی خواہ کا معتمد قاصد اُس مقام پر آ کر اور اُن امور سے آگاہی پا کر جو حکومت انگلشیہ کے کشادہ دل میں محفوظ ہیں شاہی محل میں اس طالب کرم کے گوش گزار کر سکے " [2] دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ شیر علی نے برطانوی قاصد کابل بھیجنے کی تجویز کے متعلق پس و پیش کا اظہار کیا اور یہ خواہش ظاہر کی کہ اُس کا ایلچی جا کر اُن خیالات سے آگاہی حاصل کرے جو " حکومت انگلشیہ کے کشادہ دل میں " محفوظ ہیں۔

اس پہلی رکاوٹ نے لارڈ لٹن کو برافروختہ کر دیا۔ اُس نے پشاور کے کمشنر کے توسط سے امیر کو متنبہ کیا کہ وہ وائسرائے کے دوستانہ مقاصد کی نفی کر رہا ہے اور افغانستان کو برطانوی حکومت کی حمایت اور دوستی سے عمداً محروم کر رہا ہے۔ [3]

لارڈ لٹن نے جو رویہ اختیار کیا تھا اُس کو اُس کی کونسل کے سمجھدار اراکین نے ناپسند کیا۔ سر ولیم میور، سر ہنری نارمن اور سر آرتھر ہابہاؤس کا کہنا تھا کہ شیر علی کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ برطانوی ایلچی کا خیر مقدم نہ کرے، یہ کہ اُس نے جو وجوہ بیان کی ہیں اُن میں وزن ہے اور یہ کہ برطانوی حکومت کا جواب جنگ کی دھمکی کے مترادف ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ قاصد بھیجنے کا اصل مقصد امیر سے چھپا ہوا نہیں ہے اور یہ امر انصاف سے بعید ہے کہ کابل میں مستقل سفارت خانہ قایم کرنے کے خیال سے اُسے مطلع نہیں

---

[1] پشاور کے کمشنر کا خط امیر افغانستان کے نام مورخہ ۵ مئی 1876

[2] امیر کا خط مورخہ 22 مئی 1876

[3] پشاور کے کمشنر کا خط مورخہ 8 جولائی 1876

کیا گیا ہے۔

امیر نے پشاور کے کمشنر کو جواب دے دیا[1] اُس نے اپنے جواب میں لکھا کہ برطانوی ایجنٹ مقیم کابل عطا محمد ہندوستان آئے، کابل کے حالات کی وضاحت کرے اور برطانوی حکومت کے ارادوں سے واقفیت حاصل کرے۔ لارڈ لٹن نے یہ مشورہ قبول کر لیا۔

عطا محمد 16 اکتوبر 1876 کو شملہ پہنچا۔ اُس نے سر لے وس پیلی کے سامنے امیر کے خیالات بڑی تفصیل کے ساتھ پیش کیے اور اُس نے کہا کہ امیر ڈرتا ہے کہ عارضی برطانوی سفیر مستقل سفیر بنا دیا جائے گا۔ لارڈ سلسبری اور لارڈ لٹن کے ارادے اسی قسم کے تھے۔ اس نئی رکاوٹ نے لارڈ لٹن کو زیادہ برہم کر دیا اور ایجنٹ کے ساتھ گفتگو کرتے وقت وہ خود کو دھمکیاں دینے سے باز نہ رکھ سکا۔ اُس نے کہا۔ "برطانوی حکومت صرف اُن کی مدد کر سکتی ہے جو اُس کی مدد کی قدر کرتے ہیں۔" "اگر امیر ہم سے بلا تاخیر سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں ہے تو روس اس کے لیے تیار ہے اور امیر کو نقصان پہنچا کر ہم سے سمجھوتا کرنا چاہتا ہے۔" "برطانوی حکومت اتنی فوج افغانستان بھیج سکتی ہے جس کے مقابلے کی وہ تاب نہ لا سکے۔" "اگر امیر ہم سے دوستانہ تعلقات برقرار رکھے گا تو یہ فوج اُس کے چاروں طرف ایک آہنی حصار بنا دے گی۔ اگر وہ دشمنی پر کمر باندھے گا تو اس کو گاجر مولی کی طرح کاٹ ڈالے گی۔" امیر کا خیال ہے کہ وہ "انگلستان اور روس کے درمیان توازن قایم کیے ہوتے ہے۔" لیکن حقیقت میں امیر "دو لوہے کے برتنوں کے درمیان ایک مٹی کی ہانڈی ہے۔" امیر کے لیے ایک خط، خود اُس کے استعمال کے لیے ایک یادداشت، ایک گھڑی اور گھڑی کی زنجیر اور 1000 پاؤنڈ کا تحفہ دے کر عطا محمد کو رخصت کر دیا گیا۔ لیکن شیر علی چونکہ ہوشیار ہو چکا تھا اس لیے یہ کوشش بے سود ثابت ہوئی۔

بلوچستان کی حد تک زیادہ واضح نتائج سامنے آئے۔ لارڈ نارتھ بروک نے میجر سینڈی مین MAJOR SANDEMAN کو بلوچستان بھیجا تھا تاکہ وہ خان قلات اور اُس کے سرداروں کے درمیان ہونے والے جھگڑے نبٹا دے اور درّہ بولان سے گزرنے والا تجارتی راستہ کھول دے جو ان جھگڑوں کی وجہ سے بند ہو گیا تھا۔ میجر سینڈی مین نے، جس سے سرحد کے لوگ واقف تھے اور عزت کرتے تھے، یہ جھگڑے نبٹا دیے اور تجارتی راستہ کھول دیا۔ معاہدے کی شرائط کو خان قلات اور اس کے سرداروں نے قبول کر لیا۔ اور دربار عام میں اُن کی توثیق کر دی۔ اگر لارڈ نارتھ بروک وائسرائے رہتا تو میجر سینڈی مین

---

[1] امیر کا جواب جو 3 ستمبر 1876 کو موصول ہوا۔

اس کارنامے کے بعد بلوچستان سے واپس آجاتا۔ لیکن لارڈ لٹن کی پالیسی یہ تھی کہ برطانوی فوج وہاں مقیم رہے۔ اُس نے اپنے پسندیدہ فوجی مشیر کرنل کولی COLONEL COLLEY کو ایک خفیہ معاہدے کے ساتھ وہاں بھیجا۔ اس معاہدے کی دفعہ 6 میں کہا گیا تھا کہ برطانوی فوج کا ایک دستہ خان کے کچھ علاقے پر مستقلاً قابض رہ سکے گا۔ خان قلات نے معاہدے پر دستخط کر دیے اور کوئٹہ پر برطانوی فوج کا قبضہ ہوگیا۔ لارڈ لٹن نے ملکہ کو لکھا تھا۔" خان قلات میرے ساتھ معاہدہ کرنے پر تیار ہوگیا ہے جس کی شرائط ہمیں قلات کا قریب قریب مالک بنا دیں گی"۔[1] اُس معاہدے پر جیکب آباد میں 8 دسمبر 1876 کو دستخط کیے گئے۔

اس طرح افغانستان کے جنوب میں قدم جمانے کے بعد لارڈ لٹن نے اُس کے مشرق میں تیاریاں شروع کر دیں۔ کرنل لمس ڈن COLONEL LUMISDEN کا خیال تھا کہ انگریز قرم اور خوست کی وادیوں پر قبضہ کر لیں لیکن لارڈ لارنس نے اس تجویز کو مسترد کر دیا تھا۔ لارڈ لٹن کے لیے لمس ڈن کی اسکیم میں کشش تھی۔ راولپنڈی سے کوہاٹ جانے والی سڑک کی مرمت کی گئی، کاوینگناری، CAVAGNARI؛ کو قرم دریا کے ساحل پر بھیجا گیا تاکہ وہ فوج کے پڑاؤ کے لیے کوئی مناسب مقام تلاش کر سکے اور کمانڈر انچیف کو حکم دیا گیا کہ وہ تین توپ بردار دستے، سیپرز اور مائنرز کی دو کمپنیاں، برطانوی رسالوں کی ایک رجمنٹ اور ہندوستانی رسالوں کی دو رجمنٹیں اور برطانوی پیدل فوج کی ایک رجمنٹ اور ہندوستانی پیدل فوج کی چار رجمنٹیں کوہاٹ بھیجنے کی تیاری کرے۔[2]

شمال میں بھی لارڈ لٹن کی سرگرمیاں جاری تھیں۔ اُس نے مہاراجہ کشمیر کو جدید اسلحہ فراہم کیے اور اُسے چترال جانے والے دروں کی طرف بڑھنے پر اُکسایا۔ کشمیر کی مالی حالت انتہائی سقیم تھی۔ برطانوی ہند محاصل کے بوجھ کے نیچے دبا جا رہا تھا اور اُس پر ایسے قحط کے بادل منڈلا رہے تھے جس کی نظیر انیسویں صدی نہیں پیش کر سکتی تھی۔ لیکن اخراجات میں کمی اور انسانی بہبودی کے تصورات وائسرائے کو ایک ایسے خطرے کی خلاف بے اندازہ دولت برباد کرنے سے باز نہ رکھ سکے۔ جس کا کوئی وجود نہیں تھا یا جس کو خود اُس کے اعمال جنم دے رہے تھے۔ اُس نے اپنی دھمکیوں کو عملی جامہ پہنایا اور امیر کی سلطنت کے جنوب، مشرق اور شمال میں ایک آہنی حصار بنا دیا۔

---

[1] لارڈ لٹن کا خط ملکہ کے نام مورخہ 15 نومبر 1876

[2] 28 فروری 1881 کو کاغذات ہاؤس آف لارڈز میں پیش کیے گئے۔

دہلی میں یکم جنوری 1877ء کو ایک دربار کیا گیا اور لارڈ لٹن نے دیسی حکمرانوں اور ہندوستان کے لوگوں کے سامنے اعلان کیا کہ ملکہ نے قیصرِ ہند کا لقب اختیار کر لیا ہے۔ مسٹر ڈزرائیلی نے بس مارک BISMARCK کی تقلید کی تھی اور برطانوی ہندوستان کے تاجدار نے وہ جلیل القدر لقب اختیار کیا تھا جو چھ سال پہلے پروشیا کا بادشاہ اختیار کر چکا تھا۔ انگلستان کے صاحب فہم لوگ یہ جاننا چاہتے تھے کہ اس لقب سے ملکہ کے اختیارات میں کیا واقعی کچھ اضافہ ہوا تھا اور از روئے معاہدہ حاصل ہونے والے دیسی حکمرانوں کے حقوق میں کمی ہو گئی تھی۔

مسٹر لو MR. LOWE نے ہاؤس آف کامنز میں سوال کیا تھا کہ انگلستان اور ہندوستان کے درمیان امتیاز کرنا اور انگلستان کے بادشاہ کو ایسا لقب دینا جس میں قانون کی اطاعت مضمر ہو اور ہندوستان کے تاجدار کو وہ لقب دینا جس سے طاقت کی برتری ظاہر ہو کہاں تک مناسب ہے۔ بل کی دوسری خواندگی کے وقت مسٹر گلیڈسٹن نے حزبِ مخالف کی قیادت کی اور اپنی تقریر میں برطانوی پالیسی کی بہترین روایتوں اور اصولوں کا ذکر کیا۔

" اگر یہ حقیقت ہے اور یقیناً حقیقت ہے کہ ہم ہندوستان پر حکومت کرنے میں صرف اُن قوانین کا پاس کرتے ہیں جو ہم نے بناتے ہیں اور اُن کے علاوہ کوئی قانونی بندش ہم پر نہیں ہے۔ اگر یہ سچ ہے اور یقیناً سچ ہے کہ ہم نے ہندوستان کو آزاد اداروں کی نعمت سے مستفید ہونے کا موقع نہیں دیا ہے تو میرا خیال ہے کہ رائٹ آنریبل بزرگ کو (وزیر اعظم مسٹر ڈزرائیلی کو) ڈینگیں مارنے اور باضابطہ طور سے اس امر کا اعلان کرنے کا حق حاصل ہے کہ قیصرِ ہند کا لقب اختیار کر لیا گیا ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں ایک ایسے واقعے کو اپنی شاندار فتح سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوں جو میری رائے میں ہماری کمزوری اور تباہی کا مظہر ہے۔"

" میں سمجھتا ہوں کہ ابھی تک ہندوستان میں ایسے حکمران اور ریاستیں موجود ہیں جن پر ہم کبھی اقتدار حاصل نہ کر سکے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم اُن سے زیادہ طاقت ور ہیں۔ اب ہم پارلیمنٹ کے ایک ایکٹ کے ذریعے وہ اقتدار حاصل کرنا چاہتے ہیں جس کے آئندہ نتائج کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے۔"

" میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کی کچھ اہم دیسی ریاستوں پر کمپنی کبھی اقتدارِ اعلیٰ حاصل کر سکی تھی یا نہیں۔ بہرحال ہمیں رائٹ آنریبل بزرگ سے یہ دریافت کرنا پڑے گا کہ اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہوا یا نہیں لیکن کیا وہ ذمہ داری کے ساتھ ہمیں یقین دلا سکتے ہیں کہ اس بل کی بنا پر ہندوستان کے

دیسی حکمرانوں کی حیثیتوں میں کوئی سیاسی تبدیلی نہیں ہوگی۔"

یہ بنیادی سوال تھا۔ نئے لقب کے اگر کوئی معنی تھے تو اُس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ہندوستان کا تاجدار اُن دیسی حکمرانوں اور ریاستوں پر اقتدار اعلیٰ حاصل کرنا چاہتا تھا جنھوں نے معاہدوں کی رو سے اُسے یہ حق نہیں دیا تھا۔ جب پروشیا کے بادشاہ نے قیصر جرمنی کا لقب اختیار کیا تھا تو اُس نے جرمنی کی ریاستوں کے تعلق سے کچھ اختیارات حاصل کر لیے تھے۔ لیکن پارلیمنٹ میں پیش ہونے والے بل میں اس قسم کے اختیارات کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا تھا۔ نئے لقب میں کیا اس قسم کے اختیارات مضمر تھے یا نہیں تھے۔

مسٹر گلیڈسٹن اور سر ڈبلیو۔ ہارکوٹ کے سوالات کی بنا پر وزیر اعظم کو واضح الفاظ میں اعلان کرنا پڑا کہ ہندوستان کے دیسی حکمرانوں اور ریاستوں کے تعلق سے کوئی نئے اختیارات حاصل نہیں کئے جائیں گے۔ سر ڈبلیو۔ ہارکوٹ کے سوال کے جواب میں مسٹر ڈزرائیلی نے کہا۔" لقب کی تبدیلی کا کوئی اثر ہندوستان کے دیسی حکمرانوں۔ کے حقوق، وقار اور عزت پر نہیں پڑے گا۔" یہ جواب ہر دور میں اہم سمجھا جاتے گا۔

لیکن لارڈ لٹن کی بیٹی اور سوانح نگار نے وضاحت کرتے ہوتے کہا تھا" وہ معاہدے جو سو سال پہلے کئے گئے تھے اور جن پر اب بھی عمل کیا جاتا ہے اکثر یہ ظاہر کرنے کے لیے استعمال کئے جاتے ہیں کہ دیسی حکمراں، طاقت میں کم ہونے کے باوجود، وقار اور حیثیت میں وائسرائے کے ہمسر ہیں۔ دیسی لوگوں کی نظر میں یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ نظام، گیکواڑ اور وائسرائے کو یکساں سلامی دی جاتی ہے۔ دہلی کے اجتماع کے بعد اکیس توپیں ختم ہوگئیں اور اس کو بادشاہ کے نمائندے سے ہمسری کا ثبوت سمجھا گیا۔" [1]

ہندوستان پر اپنے باپ کی حکومت کی انصاف پسند وقائع نگار نے دو بین امور کو غلط ملط کر دیا۔ نظام اور گیکواڑ کبھی اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں رہے کہ وہ اختیارات کی حد تک وائسرائے کے ہمسر ہیں۔ "دیسی ذہن" کو اس امر کا یقین دلانے کے لیے نئے لقب کی ضرورت نہیں تھی کہ وائسرائے ایشیا کی سب سے بڑی طاقت کی نمائندگی کرتا ہے۔ جس طرح ایک غریب شہری ازروئے قانون حاصل ہونے والے حقوق پر تکیہ کیا کرتا ہے اُسی طرح نظام اور گیکواڑ معاہدوں کی رو سے حاصل ہونے والے حقوق پر

---

[1] ہندوستان پر لارڈ لٹن کی حکومت LORD LYTTON'S INDIAN ADMINISTRATION
از لیڈی بیٹی بال فور، لندن 1899، ص 133

تکیہ کیا کرتے تھے۔ وزیر اعظم وضاحت کے ساتھ اعلان کر چکا تھا کہ نیا لقب اختیار کرنے کی بنا پر وہ حقوق ذرا بھی متاثر نہیں ہوں گے۔ جس طرح نیا لقب اختیار کرنے سے پہلے دیسی ریاستوں کی داخلی خود مختاری میں، جو معاہدوں کی رو سے اُنھیں حاصل تھی، دخل اندازی انصاف سے بعید سمجھی جاتی تھی اُسی طرح نیا لقب اختیار کرنے کے بعد بھی سمجھی جاتے گی۔

ایک طرف تو لارڈ لٹن نہایت شان و شوکت اور غیر ضروری ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ دہلی میں دربار کر رہا تھا اور دوسری طرف ایک شدید قحط کے سائے ملک پر پڑ رہے تھے۔ اگر ہندوستان کے حکمراں کو کوئی چیز 1877 کی احمقانہ سرحدی پالیسی سے باز رکھ سکتی تھی جس پر بے اندازہ روپیہ صرف ہوا اور اخراجات میں کمی اور لوگوں کا بوجھ ہلکا کرنے پر مائل کر سکتی تھی تو وہ اُس سال پڑنے والا ہیبت ناک قحط تھا۔ یہ ایک ایسا حادثہ تھا جس کی تباہی کی نظیر نہیں ملتی۔ ملکہ کی تخت نشینی کے بعد ہندوستان میں 1837، 1860، 1866، 1869، 1874 میں شدید قحط پڑ چکے تھے لیکن بہت بڑے پیمانے پر ہونے والی اتنی زیادہ تباہی کی نظیر انیسویں صدی پیش نہیں کر سکتی۔ غلط مالی نظام کی بنا پر مدراس کے کسانوں کے پاس اُتنے وسائل نہیں تھے جتنے بنگال کے کسانوں کے پاس تھے۔ امدادی اقدامات میں بھی ویسی سوجھ بوجھ سے کام نہیں لیا گیا جیسا کہ 1874 میں قحط بنگال کے موقع پر لیا گیا تھا۔ بڑے بڑے گاؤں ویران ہو گئے، علاقے کے علاقے بنجر ہو گئے اور ایک سال کے اندر پچاس لاکھ انسان موت کے گھاٹ اتر گئے۔ یہ تعداد کسی خاصے بڑے ملک کی پوری آبادی کے برابر تھی۔

لیکن وائسرائے کو نہ دہلی دربار اُس مقصد کے حصول سے باز رکھ سکا جو اُس کے پیش نظر تھا نہ ملک میں پھیلنے والے دکھ۔ فروری 1877 میں امیر کے قاصد نور محمد اور سر لے وس پیلی کی ملاقات پشاور میں ہوئی۔ سر لے وس پیلی نے پہلی شرط یہ پیش کی کہ برطانوی افسر افغانستان کی سرحد پر رہیں گے اُس نے امید دلائی کہ اُس کے بعد برطانوی حکومت امیر کے ساتھ ایک معاہدہ کر سکتی ہے، اُس کے جانشین کو تسلیم کر سکتی ہے اور علاقے میں ہونے والی شورشوں کے خلاف اس کی امداد کر سکتی ہے۔ لیکن باراں دیدہ نور محمد نے امیر کے اس خیال کو ظاہر کیا کہ ملک کے اندر برطانوی افسروں کو رہنے کی اجازت دینے کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے اختیارات سے دست بردار ہو جائے۔ چونکہ مذاکرات کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی اس لیے کانفرنس ناکام رہی۔

لارڈ لٹن کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اُس نے سر لے وس پیلی کو لکھا " برطانوی حکومت اُن لوگوں سے نہ کوئی معاہدہ کرنا چاہتی ہے نہ اُن کا تحفظ کرنے کے لیے بے چین ہے جو اُس کے خواہش مند نہیں ہیں اور

اُس کی قدر کرنا نہیں جانتے ہیں۔ ان حالات میں وائسرائے کے سامنے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں کہ وہ اُس پیش کش کو مسترد کردے جو پچھلے اکتوبر میں امیر کو کی گئی تھی۔"[له] یہ خط موصول ہونے کے تین مہینے بعد معمر نور محمد کا انتقال ہوگیا۔ اُس کے دوسرے ساتھیوں کو مذاکرات جاری رکھنے کا اختیار حاصل نہیں تھا کابل میں مقیم برطانوی ایجنٹ عطا محمد کو واپس بلالیا گیا۔ جنگ کے بادل منڈلانے لگے۔

اس دوران یورپ میں ایک کے بعد ایک اہم واقعات پیش آتے رہے۔ روسیوں نے ایک خوں ریز معرکے میں ترکوں کو شکست دے دی تھی اور وہ قسطنطنیہ کے قریب پہنچ گئے تھے مسٹر ڈزرائیلی نے بحر روم کے بیڑے کو درہ دانیال کی طرف بڑھنے کا حکم دے دیا، ہندوستانی فوج مالٹا میں اُتار دی محفوظ فوج کو تیاری کا حکم دے دیا اور ترکی کی رضامندی حاصل کرنے کے بعد سائپرس پر قبضہ کرلیا۔ روسیوں نے ترکستان میں فوجیں جمع کرنی شروع کردیں اور ایک مشن کابل روانہ کیا۔

لارڈ لٹن غافل نہیں تھا۔ اُس نے مناسب کارروائی شروع کردی۔ اُس نے مہاراجہ کشمیر کو اس پر آمادہ کرلیا کہ ہندوکش کے دامن میں گلگت کے مقام پر ایک برطانوی ایجنسی قایم کی جائے اور کشمیر کی دوالیہ ریاست کو اس پر مجبور کیا کہ گلگت سے برطانوی ہند تک ٹیلی گراف کے تار لگانے کے اخراجات وہ برداشت کرے۔ لارڈ لٹن اپنی چالاکی پر بڑا مسرور و مطمئن تھا "ہم کافرستان کی ریاست پر کشمیر کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کرکے، جو ہمارا باج گزار ہے، ایک پیسہ خرچ کیے بغیر اُس کو اپنے قبضہ و تصرف میں لاسکتے ہیں۔"[شه]

واقعہ یہ ہے کہ کابل کی ریاست ایسی مٹی کی ہانڈی تھی جو لوہے کے برتنوں کے بیچ رکھی تھی۔ روسی مشن کابل آنے پر مصر تھا۔ امیر خائف ہوگیا اور اُس نے جنرل کاف مین (Kaufman) کو لکھا کہ وہ روسی مشن کا خیر مقدم کرنے کو تیار نہیں ہے لیکن روسی واپس جانے پر آمادہ نہیں ہوئے اور 22 جولائی 1878 کو جنرل اسٹول ٹاف GENERAL STALTOFF کابل میں داخل ہوگیا۔ امیر کو مشن کا خیر مقدم کرنا پڑا اور معاہدے کا ایک مسودہ تیار کرلیا گیا۔

اس دوران برلن میں منعقد ہونے والی کانگریس نے یورپ میں امن قایم کردیا تھا۔ روسی حکومت نے جنرل اسٹول ٹاف کو واپس بلالیا۔ اور وہ 24 اگست 1878 کو کابل سے روانہ ہوگیا۔ اب

[له] مراسلہ بنام سر لے وس پیلی مورخہ 3 مارچ 1877

[شه] لارڈ لٹن بنام سکریٹری آف اسٹیٹ، مراسلہ مورخہ 9 اپریل 1878

افغانستان میں مداخلت کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی تھی۔ چونکہ ایک روسی مشن کا خیر مقدم کیا جا چکا تھا اس لیے لارڈ لٹن مصر تھا کہ ایک برطانوی مشن بھی کابل جائے۔ اُس نے لکھا کہ "روسی مشن کی واپسی یا آئندہ کے لیے روسیوں کی یقین دہانی اس واقعہ پر پردہ نہیں ڈال سکتی کہ ایک روسی مشن کا خیر مقدم کابل میں کیا گیا اور روسی افسروں کو اس کا موقع ملا کہ وہ امیر اور اُس کے مشیروں کے ذہنوں میں انگلستان کی طرف سے شکوک اور ناپسندیدگی کے جذبات پیدا کر سکیں، روس کی طاقت اور تابناک مستقبل کا یقین دلا سکیں اور ہمارے مقابلے میں اُس کی امداد کی امید دلا سکیں۔" [1]

برطانوی مشن کی قیادت سر نیویل چیمبر لین کے سپرد کی گئی۔ پشاور سے 12 ستمبر کو برطانوی مشن روانہ ہوا اور 21 ستمبر کو جمرود پہنچا۔ افغان سالار فیض محمد نے اس کو جمرود سے آگے بڑھنے سے روک دیا اُس کے اور کاوا گناری کے درمیان ہونے والے مذاکرات بے سود ثابت ہوئے اور مشن کو پشاور واپس آنا پڑا۔ اس پر لارڈ لٹن نے الزامات کی فرد شائع کرنے، امیر کی فوج کو درہ خیبر سے ہٹانے، وادیٔ قرم پر قبضہ کرنے اور کوئٹہ سے قندھار کی طرف بڑھنے کی تجاویز پیش کیں۔ حکومت انگلستان کی مہر پر 2 اکتوبر کو الٹی میٹم دے دیا گیا۔ چونکہ الٹی میٹم میں معین کی ہوئی تاریخ یعنی 20 نومبر تک کوئی جواب موصول نہیں ہوا اس لیے 21 نومبر کو فوجی کارروائی شروع کر دی گئی۔

اُن حالات کے بیان میں، جن کی بنا پر 1878 کی جنگ افغانستان شروع ہوئی، ضرورت سے زیادہ طوالت سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن اُن کا بیان کرنا ضروری تھا۔ اس جنگ نے کیننگ، لارنس اور نارتھ بروک کی دیرینہ پالیسی کو بدل دیا۔ اس نے ہندوستان کی شمال، مغربی سرحد کی اُس پرامن فضا کو خراب کر دیا جو تقریباً چالیس سال سے قایم تھی۔ یہ جنگ اُس وقت شروع کی گئی جب روس کے ساتھ صلح ہو چکی تھی اور روس کے حملے کا خطرہ ٹل گیا تھا۔ اس نے ہندوستانی مالیات کو تباہ کر دیا جو ابھی 1877 کے قحط مدراس اور 1878 کے قحط شمالی ہند کے مضر اثرات سے پوری طرح پیچھا نہیں چھڑا سکا تھا۔ جہاں دیدہ لارڈ لارنس نے برمحل جنگ کے خلاف آواز بلند کی یعنی الٹی میٹم بھیجنے سے پہلے اُس نے احتجاج کیا۔ اس بزرگ مدبّر نے 27 ستمبر کو جو خط ٹائمس کو لکھا تھا اُس کے کچھ ٹکڑے اس قابل ہیں کہ انھیں کتاب میں پیش کیا جائے۔

"امیر نے جو اقدام کیے ہیں اُن پر ہمیں تعجب نہیں ہونا چاہیئے۔ مرحوم امیر دوست محمد نے

---

[1] روداد مورخہ 4 ستمبر 1878

1857 کے معاہدہ کے بعد ہی ہمیں کابل میں سفارت خانہ قایم کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اُس نے ہمیں ایک عارضی مشن بھیجنے کی اجازت بھی نہیں دی تھی اور یقین دلایا تھا کہ اس قسم کے اقدام سے افغانوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قایم ہونے کے بجائے، اُن میں خلل پڑ جائے گا۔ ہم نے اُس کی بات مان لی تھی۔ موجودہ امیر نے 1869 میں اُس پالیسی کی تصدیق کر دی تھی۔"

" امیر سے جھگڑا مول لے کر ہمیں کیا مل جائے گا؟ کیا ہم اُس کے ہم وطنوں کو اپنا مخالف بنائے بغیر اُسے تخت سے اُتار سکتے ہیں؟ کیا ہم اسی قسم کے نتائج کے بغیر 39-1838 کی پالیسی پر عمل کر سکتے ہیں؟ اگر ہم شیر علی کو کابل سے نکال بھی دیں تو اُس کی جگہ کس کو بادشاہ بنائیں گے؟۔ ملک پر قبضہ کیے بغیر ہم اپنے آدردے کو کس طرح تخت پر برقرار رکھ سکیں گے؟ اگر ہم نے ملک پر قبضہ کر بھی لیا تو کب تک قابض رہیں گے؟

" ان فوجی اور سیاسی سوالات کی بنا پر مجھے اُس پالیسی کے خلاف آواز بلند کرنی پڑ رہی ہے جو امیر شیر علی کے خلاف اختیار کی گئی۔ کیا اس جنگ کے خلاف اہم اخلاقی دلائل نہیں ہیں؟ کیا افغانوں کو اس کا حق حاصل نہیں ہے کہ اُس مشن کی راہ میں مزاحم ہوں جو ہم اُن پر مسلط کرنا چاہتے ہیں؟ خصوصاً اُس صورت میں جبکہ وہ واقف ہیں کہ اس قسم کے مشن کے کیا نتائج ہوتے ہیں اور 1836 کے برنس کے مشن کی وجہ سے اُن پر کیا بیتی؟"

لیکن یہ احتجاج بے سود ثابت ہوا۔ ہندوستان کے غدر کے اُس سورما کو جب ذلیل سمجھا جانے لگا تھا جسے بیس سال پہلے انگلستان میں ہندوستانی سلطنت کے بچانے والے کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ مقررین نے اُس پر گالیوں کی بوچھار کی۔ گمنام اخبار نویسوں اور سرکاری لال بجھکڑوں نے اُس پر لعن طعن کی۔ روحِ عصر بدل چکی تھی۔ امن پسندی کے تصورات کا مذاق اڑایا جاتا تھا نوسامراجیت جنگ کی متقاضی تھی۔

لارڈ بیکنس فیلڈ LORD BEACONFIELD نے الٹی میٹم کا وقت ختم ہونے سے پہلے یعنی 9 نومبر کو وہ حقیقی اسباب بیان کر دیے جن کی بنا پر انگلستان جنگ شروع کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے مینشن ہاؤس میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ جنگ کی حقیقی وجہ یہ نہیں ہے کہ امیر نے روسی مشن کا خیر مقدم کیا یا برطانوی مشن کا خیر مقدم نہیں کیا۔ اس کی اصل وجہ سرحد کی توثیق کرنا اور ایک سائنسی سرحد قایم کرنا ہے۔ سر بارٹل فریرے کو، جو اُس زمانے میں جنوبی افریقہ کا ہائی کمشنر تھا، اس پر بڑی خوشی ہوئی ہوگی کہ وہ پالیسی کامیاب ہوئی جس کی وکالت وہ پچھلے پندرہ

سال سے کر رہا تھا۔ لیکن جنگ ختم ہونے سے پہلے اُسے اُس پالیسی پر افسوس کرنا پڑا۔

اس کتاب میں اُن حادثات کی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں جو جنگ کے دوران پیش آئے۔ انگریزی فوجیں تین راستوں یعنی درّہ خیبر، وادی قرم اور درہ بولان سے داخل ہوئیں۔ شیر علی ترکستان کی طرف بھاگ گیا اور وہاں اُس کا انتقال ہوگیا۔ اُس کے بیٹے یعقوب خاں نے 26 مئی 1879 کو معاہدہ گندامک پر دستخط کر دیے جس کی رو سے پشین، سی بی اور قرم کے اضلاع برطانوی حکومت کے حوالے کر دیے گئے۔ لارڈ لٹن نے لکھا تھا " دفعہ تین کی رو سے افغانستان پر ہمارا اثر قایم ہوگیا ہے اور اس کے خارجہ تعلقات ہمارے زیر اختیار آ گئے ہیں۔"[1] لارڈ بیکنس فیلڈ نے وائسرائے کو لکھا " ہم نے ایک سائنسی اور مناسب سرحد قایم کر دی ہے۔ میرے لیے یہ واقعہ بڑے اطمینان کا باعث ہے کہ میں نے آپ کو مغل اعظم کی گدی پر بٹھا دیا۔"[2]

لیکن مبارکباد پیش کرنے میں جلد بازی سے کام لیا گیا تھا۔ سر لے وس، کاواگ ناری اور برطانوی سفارت خانے کے دوسرے افراد 24 جولائی 1879 کو کابل میں داخل ہوئے۔ افغانوں کے دل غم و غصے سے بھرے ہوتے تھے۔ نیا امیر غیر ہر دل عزیز تھا اور لوگ اُس کو غدّار سمجھتے تھے۔ کاواگ ناری نے 2 ستمبر کو اپنے آخری تار میں اطلاع دی تھی کہ " حالات ٹھیک ہیں " لیکن وہ بہادر افسر اور اُس کے محافظ 3 ستمبر کو قتل کر دیے گئے۔ یعقوب خاں تخت و تاج سے دست بردار ہوگیا اور ہندوستان بھیج دیا گیا۔ ایک نئی جنگ کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔

مسٹر لیپل گریفن MR. LEPEL GRIFFIN کو مارچ 1880 میں کابل بھیجا گیا تاکہ وہ فوجی سالار سر فریڈرک رابرٹس کے مشورے کے ساتھ سفارتی اور فوجی نگہداشت کی ذمہ داری سنبھالے۔ لارڈ لٹن نے اُسے لکھا تھا۔

" میرے خیال میں اس کی کوئی وجہ نہیں کہ آپ کابل پہنچتے ہی اُس جہنم سے ہمیں آزاد کرنے کی تیاری فوراً شروع نہ کر دیں۔"[3] اُس نے سکریٹری آف اسٹیٹ کو لکھا تھا " میں نے اس موسم بہار میں جن فوجی کارروائیوں کی منظوری دی ہے اُن کا اصل مقصد یہ ہے کہ ہم آسانی کے ساتھ

---

[1] مراسلہ مورخہ 7 جولائی 1879

[2] لارڈ بیکنس فیلڈ کا خط وائسرائے کے نام مورخہ 14 اگست 1879

[3] لارڈ لٹن کا خط لیپل گریفن کے نام مورخہ 16 فروری 1880

اُس ملک سے واپس آجائیں؛"[1] نئی پالیسی کے نتائج سامنے آگئے اور اُس کے معمار کو اُن کا اقرار کرنا پڑا۔

کنزرویٹو حکومت اپریل 1880 میں ٹوٹ گئی۔ لارڈ لٹن کی اپنی کوئی پالیسی نہیں تھی وہ کنزرویٹو وزارت کی پالیسی پر عمل کرتا تھا۔ حکومت کے ساتھ اُس نے بھی استعفےٰ دیدیا۔ اُس نے اپنے سب سے سمجھدار پیش رو لارڈ لارنس اور بہترین وزیر مالیات سر ولیم میور کے مشورے ماننے سے انکار کردیا تھا۔[2] وہ کوئی مفید نتائج نہ حاصل کرسکا اور اُس کی وجہ سے ہندوستان کو بیس ملین پاؤنڈ کا نقصان اُٹھانا پڑا۔ وہ رقم آب پاشی کے اُن اہم کاموں کے لیے کافی ہوتی جن کی سفارش سر آرتھر کاٹن نے اُسی سال ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کے سامنے پیش کی تھی جس سال جنگ افغانستان شروع ہوئی۔ اُن کی بنا پر ہندوستان کے لاکھوں کسانوں کو ہمیشہ کے لیے تکلیفوں اور قحطوں سے نجات مل جاتی۔

کنزرویٹو پارٹی کی شکست کے بعد مسٹر گلیڈسٹن نے 1880 میں لبرل حکومت بنائی۔ اُس کا اثر اور طاقت اس سے ظاہر ہوتے ہیں کہ اُس نے وقتی طور سے سامراجیت کے سیلاب پر بند لگادیا اور تھوڑی مدت کے لیے انگلستان میں آزاد خیالی کو فروغ دیدیا۔ اپنی نوجوانی میں بھی اُس جہاں دیدہ مدبّر نے اُس شان خطابت اور اُس عادلانہ جوش کا ثبوت نہیں دیا تھا جس کا مظاہرہ "بلگیریا کے مظالم" کی مذمّت کرنے میں اور اسکاٹ لینڈ میں انتخابی مقابلہ کرتے وقت اُس نے کیا۔ قوم نے اُس کی آواز پر لبیک کہا اور لبرل پارٹی کامیاب ہوگئی۔ مسٹر گلیڈسٹن کی دوسری وزارت نے نیا آئرش لینڈ ایکٹ IRISH LAND ACT اور نیا ریفارم ایکٹ REFORM ACT منظور کرکے ایک امتیازی حیثیت حاصل کی اور لارڈ رپن کی وساطت سے ہندوستان میں مفید اقدامات کیے۔

---

[1] 18 فروری 1880 کا خط

[2] یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ سر آرتھر ہاب ہاؤس اور سر ہنری نارمن کے ساتھ سر ولیم میور نے بھی اُس خط کی مخالفت کی تھی جو جولائی 1876 میں امیر کو لکھا گیا تھا۔ ہندوستان چھوڑنے سے کچھ دن پہلے یعنی اکتوبر 1876 میں سر ولیم میور نے ایک نوٹ اور لکھا تھا جس میں اُس رائے کا اظہار زیادہ زوردار الفاظ میں کیا تھا جو پہلے نوٹ میں ظاہر کی گئی تھی اور درخواست کی تھی کہ وہ دونوں نوٹ سرکاری روداد سمجھے جائیں۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ افغانستان کے متعلق دوسرے کاغذات کے ساتھ وہ نوٹ پارلیمنٹ میں پیش کرنے سے لارڈ کرین بروک نے انکار کردیا۔ چنانچہ افغانستان کے متعلق لارڈ لٹن کی پالیسی سے لاتعلقی ظاہر کرنے کے لیے سر ولیم میور نے مجبوراً انھیں شائع کردیا۔ میور کا جانشین سر جان اسٹریچی ایک زمانے میں لارنس اور (باقی آگے صفحہ پر)

ڈ کرین بروک کی جگہ لارڈ مارکوئس ہارٹنگٹن MARQUIS OF HARTINGTON سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا مقرر کیا گیا اور لارڈ لٹن کی جگہ لارڈ رپن نے 8 جون 1880 کو وائسرائے کا عہدہ سنبھال لیا۔ اُس کے فوراً بعد جنگ افغانستان ختم کر دی گئی۔ افغانوں نے 27 جولائی کو میوانڈ کے مقام پر جو قندھار کے قریب واقع ہے ایک برطانوی فوجی دستے کو شکست دی۔ لیکن سر فریڈرک رابرٹس کابل سے قندھار کی طرف بڑھا اور یکم ستمبر کو اُس افغان فوج کو شکست فاش دی۔ عبدالرحمٰن کو نیا امیر تسلیم کر لیا گیا اور برطانوی فوج کابل اور قندھار سے واپس آ گئی۔

ہندوستان کو ایک دفعہ پھر امن کی نعمت حاصل ہو گئی اور بجٹ میں بچت دکھائی جانے لگی۔ حزب مخالف کے اراکین کی حیثیت سے مسٹر فاسٹ اور گلیڈسٹن نے اس امر کی مذمت کی تھی کہ جنگ افغانستان کے اخراجات کا پورا بار ہندوستان پر ڈالا جائے۔ چنانچہ لبرل حکومت نے فیصلہ کیا کہ جنگی اخراجات کے لیے پانچ ملین پونڈ کی رقم انگلستان کے شاہی خزانے سے ادا کی جائے۔ یہ رقم جنگ پر صرف ہونے والے مجموعی اخراجات کا ایک چھوٹا سا حصہ تھی۔ لیکن یہ واحد مثال ہے جب اس اصول کو تسلیم کیا گیا کہ ہندوستان کی سرحد پار ہونے والی ایسی جنگ کے اخراجات صرف ہندوستان کو برداشت نہیں کرنے چاہئیں جس کا محرک روس کے خلاف جذبہ حسد تھا۔ لبرل حکومت نے ایک اور سمجھداری کا کام کیا۔ لارڈ لٹن کی کنزرویٹو حکومت نے ایک ایکٹ منظور کیا تھا جس کی رو سے ہندوستان کی دیسی زبانوں کے اخبارات پر پابندیاں عاید کی جا سکتی تھیں۔ جب حکومت چند غلطیوں کی مرتکب ہوتی ہے تو معترضین کا منہ بند کرنے کا رجحان پیدا ہو جایا کرتا ہے۔ حکومت انگلستان کی منظوری کے بعد لارڈ رپن نے ورناکلر پریس ایکٹ VERNACULAR PRESS ACT منسوخ کر دیا۔

لارڈ رپن کو ایک اور خوشگوار فرض ادا کرنے کا موقع ملا۔ میسور کی ریاست پر پچاس سال تک انگریز حکومت کرتے رہے تھے۔ لارڈ رپن نے 1881 میں میسور کی گدی پر اُس کے ہندوستانی حکمران کو پھر بٹھا دیا۔ اس منصفانہ اور فیاضانہ کارروائی کے لیے لارڈ رپن یا اُس زمانے کی لبرل حکومت کے بجائے کنزرویٹو حکومت اور سر اسٹیفورڈ نارتھ کوٹ کی تعریف کرنی پڑتی ہے جو اُس وقت سکریٹری

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ: میو کا بکا حامی رہ چکا تھا لیکن اُس نے لارڈ لٹن کی نئی پالیسی کی حمایت شروع کر دی۔

دیکھیے کرنل ہنّا کی "دوسری جنگ افغانستان" SECOND AFGHAN WAR جلد اول، ص 172

آف اسٹیٹ فار انڈیا تھا۔

میسور 1799 میں ٹیپو سلطان سے چھینا گیا تھا۔ انگریزوں اور اُن کے دوست نظام نے مفتوحہ ریاست کے بڑے بڑے حصوں پر قبضہ کر لیا۔ جو علاقہ باقی بچا وہ لارڈ ویلزلی نے پرانے ہندو حکمراں خاندان کے حوالے کر دیا۔ پہلا برطانوی ریذیڈنٹ سر جان مالکم تھا جو ایک بہادر اور دردمند دل رکھنے والا انسان تھا۔ وہ 1804 میں میسور سے واپس آگیا۔ اُس کے ہٹنے کے بعد ہندوستانی وزیر پورنیا نے ریاست کا انتظام اتنی قابلیت اور کامیابی کے ساتھ کیا کہ ڈیوک آف ولنگٹن کو اُس کی تعریف کرنی پڑی۔

لیکن مدراس کے حکام ریاست پر حریفانہ نظریں ڈال رہے تھے اور ریاست کے لوگ عام طور سے سمجھتے تھے کہ راجہ کی اگر مخالفت کی جائے تو ایسٹ انڈیا کمپنی اس کو ناپسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھے گی۔[1] میسور میں ایک شورش پھوٹ پڑی اور کمپنی کی حکومت نے 1832 میں ریاست کا انتظام عارضی طور سے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ لارڈ ولیم بینٹنک مبالغہ آمیز رپورٹوں سے متاثر ہوا تھا اور اُس نے راجہ کے خلاف یہ کارروائی کی تھی۔ بعد میں وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ اُسے دھوکہ دیا گیا۔ انگلستان واپس جانے کے بعد اُس نے بار بار کہا کہ ہندوستان میں اُس کے دورِ حکومت کا واحد افسوسناک حادثہ مہاراجہ میسور پر ہونے والا ظلم تھا۔[2]

راجہ نے بار بار بحالی کی درخواست کی۔ لارڈ ہارڈنگ نے مسئلہ پر احتیاط کے ساتھ غور کرنے کے بعد خیال ظاہر کیا کہ برطانوی قبضہ برقرار نہیں رہ سکتا ہے۔[3] کورٹ آف ڈائرکٹرز نے جواب میں کہا کہ بحالی کی راہ میں بڑی رکاوٹ یہ خطرہ ہے کہ ریاست کی حکومت بدنظمی کا شکار ہو جائے گی۔[4]

لارڈ ہارڈنگ کے جانشین لارڈ ڈلہوزی کا خیال مختلف تھا۔ اُس نے ایک روداد میں لکھا کہ

---

[1] دیکھیے میسور شورش کے متعلق خصوصی کمیٹی کی رپورٹ مورخہ 12 دسمبر 1833 پیراگراف 199

[2] دیکھیے میجر ایونس بیل کی "معینہ مدت کے لیے میسور کے حق ملکیت کا انتقال"
MYSORE REVERSION 1865 ص 20

[3] مراسلہ مورخہ 6 اگست 1846

[4] مراسلہ مورخہ 14 جولائی 1847

گدی سے جس راجہ کو اتارا گیا ہے اُس کی عمر باسٹھ سال ہے اور وہ لاولد ہے. اُس کا خیال تھا کہ راجہ کے مرنے کے بعد میسور کے علاقے کا حق ملکیت برطانوی حکومت کو منتقل ہو جائے گا اور اُس پر قبضہ کر لیا جائے گا. چنانچہ وہ کام مکمل کیا جا سکے گا جس کی ابتدا اتنی اچھی کی گئی ہے.[1]

خوش قسمتی سے ملکہ نے 1858 میں ہندوستان کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی. اُس کے حکومت سنبھالنے کے بعد اُصول الحاق اور اُس کے محرکات ختم ہو گئے. لارڈ کیننگ نے معمر راجہ کی وفاداری اور غدر کے دوران میسور میں اُس کی امن قایم رکھنے کی کوششوں کو سراہا اور اُس سے وعدہ کیا کہ اُس کی خواہشات سکریٹری آف اسٹیٹ کے سامنے پیش کر دی جائیں گی.[2] سر اسٹیفورڈ نارتھ کوٹ 1867 میں جب سکریٹری آف اسٹیٹ ہوا تو اس مسئلے کو حل کرنے کا وقت آ گیا اور کنزرویٹو حکومت نے فیصلہ کیا "مہاراجہ کے پسر متبنیٰ کو اُس صوبے کی گدّی پر بٹھا کر میسور کے مہاراجہ کے خاندان کو برقرار رکھا جائے".[3]

آٹھ سال بعد کنزرویٹو حکومت پھر بنی اور لارڈ سلسبری سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا مقرر کیا گیا. اس نے میسور کے ولی عہد کی تعلیم کے متعلق کرنل میلیسن COLONEL MALLESON کی تجویز پر کچھ ایسی باتیں کیں جن کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے.

"اس سلسلہ میں اصل مقصد ادبی صلاحیت نہیں ہے. ایسی عمر میں جس میں دوسرے لوگ اپنی تعلیم بھی مکمل نہیں کر پاتے ہیں، ہز ہائی نس کو اس قسم کے اختیارات حاصل ہو جائیں گے جن کے مناسب استعمال پر بہت سے لوگوں کے آرام و چین کا انحصار ہوگا. اور اُس پر ایسے فرائض کا بوجھ پڑ جائے گا جو اُس کو طالب علمی کی زندگی گزارنے کا موقع نہیں دیں گے. ضرورت اس امر کی ہے کہ اُس کو ایسی تمام معلومات فراہم کر دی جائیں جو منصبی فرائض کی ادائیگی میں کامیابی حاصل کرنے میں معاون ثابت ہوں. حکومت کے اصول پر اُسے اختیار حاصل ہوگا اور وہ اُس کے نام سے کی جائے گی، وہ خطرے اور غلطیاں جس سے حکومت دوچار ہو سکتی ہے، وہ نعمتیں جو راست روی کی صورت میں میسر آ سکتی ہیں، عبرت حاصل کرنے یا ہمت افزائی کرنے والے وہ واقعات جو اُس کی نسل کے دوسرے دیسی حکمرانوں کی تاریخ پیش کرتی ہے. یہ ایسے واقعات ہیں جو اُس کی نابالغی کی بقیہ مدت میں اچھی طرح ذہن نشین کرا دیے جانے چاہئیں."[4]

---

[1] روداد مورخہ 16 جنوری 1856

[2] مراسلہ مورخہ 28 جون 1860

[3] سکریٹری آف اسٹیٹ کا مراسلہ حکومت ہندوستان کے نام، مورخہ 16 اپریل 1867

باقی اگلے صفحہ پر

لبرل پارٹی نے جب 1880 میں حکومت بنائی تو ریاست کی بحالی کا وقت آ چکا تھا۔ برطانوی حکام نے میسور کا نظم ونسق تو بہتر بنا دیا تھا لیکن مالیات کے میدان میں وہ کامیابی حاصل نہیں کر سکے۔ 1877 کے قحط سے مدراس کی طرح میسور بھی متاثر ہوا تھا۔ اور برطانوی ہند کی طرح ریاست بھی مقروض ہو گئی تھی۔ بنگلور میسور ریلوے کی تعمیر کی بنا پر جو قرض لیا گیا تھا، اس کے علاوہ ریاست بقدر 8,00,000 پاؤنڈ حکومت ہندوستان کی مقروض تھی۔ چنانچہ ریاست کی بحالی کے وقت فیصلہ کیا گیا 245,000 پاؤنڈ سالانہ کی امدادی رقم حسب دستور پانچ سال تک وصول کی جاتی رہے اور اس کو بڑھا کر 350,000 پونڈ کر دینے کی تجویز معرض التوا میں رہے۔ [1]

منتقلی کی دستاویز میں چوبیس دفعات ہیں۔ منتقلی کے متعلق جو 25 مارچ 1881 کو عمل میں آئی تھی، ایک اعلان کے ذریعے میسور کے سرداروں اور تمام لوگوں کو مطلع کیا گیا۔

لارڈ رپن کے دور حکومت کا مفید ترین کام وہ اقدامات تھے جو کسانوں کے مزید تحفظ کے لیے گئے تھے 1859 اور 1868 کے بنگال رینٹ ایکٹوں کو تقویت دینے کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی طویل بحث و مباحثے کے بعد ایک بل تیار کیا گیا جس کو جزوی ترمیموں کے بعد لارڈ رپن کے جانشین نے 1885 میں قانون کی شکل دیدی۔ مدراس اور بمبئی کے رعیت واری علاقوں کے لیے لارڈ رپن نے یہ منصفانہ تجویز پیش کی کہ ان اضلاع میں جہاں بندوبست کیا جا چکا ہے صرف قیمتوں میں اضافے کی بنیاد پر سرکاری مطالبے میں اضافہ کیا جائے۔ ان مالی اصلاحات کا ذکر آئندہ کسی باب میں کیا جائے گا۔

لارڈ رپن نے ہندوستان کے قانون فوجداری میں ایک جزوی ترمیم کرنی چاہی۔ اُس نے تجویز پیش کی ہندوستانی مجسٹریٹوں کو یورپین ملزموں کے مقدمات کی سماعت کے اختیارات دے دیے جائیں۔ لیکن اس کی شدید مخالفت ہوئی۔ بالآخر اس تجویز میں ترمیم کر دی گئی اور تسلیم کر لیا گیا کہ یورپین ملزم جیوری کے ذریعے مقدمات کی سماعت کا مطالبہ کرنے کے مجاز ہیں۔ لیکن لارڈ رپن کا دور حکومت جس کام کے لیے زیادہ مشہور ہوا

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ: [2] گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کے نام مراسلہ مورخہ 17 جون 1875
اگر نابالغ حکمرانوں اور سرداروں کو ان اصولوں کے مطابق ہمیشہ تعلیم دی گئی ہوتی اور اگر انھیں اپنے لوگوں اور اپنی ریاستوں کے نظم ونسق سے ہمیشہ باخبر رکھا گیا ہوتا تو ان میں ناکام ہونے والوں کی اتنی کثیر تعداد نہ ہوتی جتنی تھی۔

[1] سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا لارڈ ہارٹنگٹن کا مراسلہ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کے نام مورخہ 12 اگست 1880

وہ اضلاع اور میونسپلٹی رکھنے والے شہروں میں مقامی خود اختیار حکومت کو رواج دینا تھا۔ محکمہ مالیات[1] کی ایک تجویز میں گورنر جنرل نے اس اصول کو مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا تھا: "بحالت موجودہ مرکز سے امداد پانے والی صوبائی حکومتیں مقامی خود اختیار حکومتوں کو اپنی اُس آمدنی کو قابلِ لحاظ حصہ دے سکتی ہیں جو موجودہ صورت میں اُن کے پاس رہتی ہے۔"

چنانچہ صوبائی حکومتوں کو مراسلے بھیجے گئے، جن میں اخراجات کی اُن مدات کی نشان دہی کی گئی تھی جنھیں مقامی خود اختیار حکومتوں کو منتقل کرنا مناسب معلوم ہوتا تھا۔ صوبائی حکومتوں نے اس اصول کو تسلیم کر لیا اور اُس کے متعلق اپنے مشورے دیے۔ اُس کے بعد گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل نے اس کی تفصیلات کا فیصلہ کیا۔ دوسری تجویز[2] کے کچھ اقتباسات سے اس نئی اسکیم کے مقصد پر روشنی پڑے گی۔

"اس اقدام کی حمایت کا اصل مقصد انتظامات کو بہتر بنانا ہے۔ حقیقت میں اس کا اصل مقصد عام لوگوں کی سیاسی تعلیم ہے۔ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کو اس میں کوئی شک نہیں کہ رفتہ رفتہ اگر مقامی انتظامات میں مقامی معلومات اور مقامی دلچسپی شامل کر لی گئی تو اُس کا نتیجہ بہتر کارکردگی کی صورت میں ظاہر ہوگا۔"

"اس امر کے دلائل پائے جاتے ہیں کہ خود اختیار حکومت کی گزشتہ کوششوں کی ناکامی کی وجہ وہ سرکاری مداخلت تھی جس نے نیک نیتی پر مبنی ہونے کے باوجود اُن کو کچل ڈالا۔ کچھ صورتوں میں جہاں مقامی اداروں پر حقیقی ذمہ داری ڈالی گئی اور انھیں حقیقی اختیارات سونپے گئے وہاں اطمینان بخش نتائج برآمد ہوئے۔"

"گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کی خواہش ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی انتظامی اکائی یعنی تعلقہ یا تحصیل وہ بڑے سے بڑا رقبہ ہو جو کسی لوکل بورڈ کے زیر اختیار آئے۔"

"میونسپلٹیاں اُن علاقوں کے لیے لوکل بورڈ کا کام کریں گی جو شہروں میں شامل ہیں۔"

"چاہے وہ شہری لوکل بورڈ ہوں یا دیہی اُن میں غیر سرکاری اراکین کی بڑی اکثریت ہوگی۔"

"صوبائی حکومتوں کی رائے میں جہاں انتخابات کا طریقہ رائج کرنا ممکن اور عملی دشواریوں سے پاک ہو، وہاں بورڈ کے اراکین کا انتخاب ہوگا۔"

"حکومت مقامی اداروں کے کاموں کی نگہداشت اور اُن پر نظرِ ثانی کر سکتی ہے لیکن اُن پر حکم نہیں

---

[1] تجویز مورخہ 30 ستمبر 1881

[2] تجویز مورخہ 18 مئی 1882

چلاسکتی ہے :

ان اختیارات کے استعمال کرنے کے لیے یہ ضروری نہیں معلوم ہوتا کہ شہر، تحصیل یا ضلع کے خاص انتظامی افسر مقامی اداروں کے صدر بلکہ رکن بھی ہوں۔ اس یقین کی وجوہ پائی جاتی ہیں کہ اُن کی کارروائیوں میں حصہ لینے کے بجائے آسانی اس میں ہوگی کہ اُن کے کاموں کی نگہداشت کی جائے اور اُنھیں حد کے اندر رکھا جائے :

"چنانچہ گورنر جنرل کی خواہش ہے کہ جہاں جہاں ممکن ہو غیر سرکاری لوگ مقامی اداروں کے صدر مقرر کیے جائیں :"

ان اقتباسات سے لارڈ رپن کی اسکیم کے مقصد پر روشنی پڑتی ہے۔ بڑی سرکاری مراسلت و مذاکرات کے بعد اس اسکیم کی بنا پر تین قسم کے بورڈ وجود میں آئے۔

1۔ ہندوستان میں کاؤنٹی کو ضلع کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انگلستان کی کاؤنٹی بکونسل کے جواب میں ڈسٹرکٹ بورڈ یا ضلع بورڈ بنایا گیا۔ اس کے اراکین کی اکثریت کا انتخاب عام لوگ کرتے تھے۔ کچھ اراکین کی نامزدگی کی جاتی تھی اور ان کو حکومت مقرر کرتی تھی۔ ضلع کا انتظامی افسر اُس کا صدر ہوتا تھا سڑکیں، تعلیم، اسپتال اور کچھ گھاٹ ڈسٹرکٹ بورڈ کے اختیار میں دے دیے گئے تھے۔

2۔ ضلع کی تحصیلوں میں لوکل بورڈ قایم کیے گئے تھے جو ڈسٹرکٹ بورڈ کے ماتحت تھے۔ لوکل بورڈ کے زیادہ تر اراکین کا انتخاب ہوتا تھا اور کچھ کی نامزدگی ہوتی تھی اور انھیں حکومت مقرر کرتی تھی۔

3۔ شہروں کی میونسپلٹیوں کے اراکین کی اکثریت کا انتخاب کیا جاتا تھا اور ترقی یافتہ مقامات پر اراکین کو اس امر کی اجازت دی جاتی تھی کہ وہ غیر سرکاری صدر کا انتخاب کرے۔

چنانچہ طریقہ انتخاب کو رواج دینے اور ہندوستان کے لوگوں کو مقامی انتظامات میں شریک کرنے کا کام بہت چھوٹے پیمانے پر شروع کیا گیا۔ ہندوستان کے انگریزی راج کو ہر دلعزیز بنانے، اس کا تحفظ کرنے اور لوگوں کے دلوں میں ایک بدیسی حکومت کے لیے لگاؤ پیدا کرنے میں یہ امر کہ عام لوگوں کو حکومت کی ذمہ داریوں اور فرائض میں شریک کیا گیا معاون ثابت ہوا۔ اُنیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں منرو، الفنسٹن اور بین ٹنک اس پالیسی کی بنا پر ہندوستان کی سلطنت کو مستحکم بنانے میں کامیاب ہوتے تھے۔ اس پالیسی نے لارڈ رپن کے دورِ حکومت کو بھی ہر دلعزیز بنا دیا۔ لارڈ رپن نے ہندوستان چھوڑنے سے پہلے لوگوں میں جس حد تک وفاداری اور تشکر کا جذبہ پیدا کر دیا تھا اُس کی مثال ہمارے زمانے میں دیکھنے میں نہیں آتی۔ جن لوگوں نے وہ زمانہ دیکھا ہے اُن کی نظر سے ہندوستان میں یا دنیا کے کسی گوشے میں ایسے مناظر نہیں گزرے

تھے۔" شملہ سے بمبئی تک کا اُس کا سفر ایک ایسا شاندار کوچ تھا جس کی مثال ہندوستان میں کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ یہ ایسا طویل جلوس تھا جس میں سترلیَن لوگ نعرہ ہائے ستائش کے درمیان اپنے دوست کو رخصت کر رہے تھے۔" [1]

لوگوں کی سیاسی ترقی کے اصول کو تسلیم کر کے اور رفتہ رفتہ خود اختیار حکومت اور نمائندگی کے اصول کو رواج دے کر ایک ہمدرد اور سمجھدار حکومت ہندوستان کے انگریزی راج کو تقویت پہنچا سکتی ہے اور سلطنت کے متعلق لوگوں میں فخر و مباہات کے جذبات پیدا کر سکتی ہے۔ لیکن ایک مطلق العنان اور بدگمان حکومت لوگوں کی جائز توقعات پوری نہ کر کے اور اُنھیں انتظامی امور سے علیحدہ رکھ کے سلطنت کو کمزور بنا سکتی ہے اور لوگوں میں بے اطمینانی کی ایسی لہر دوڑا سکتی ہے جو بڑھ کے اور شدت اختیار کر کے ایک سیاسی طوفان کی شکل اختیار کر لے۔

---

[1] "یورپ اور ایشیا" EUROPE AND ASIA. از میریڈتھ ٹاؤن سینڈ

باب۔ 2

ڈزرائیلی اور گلیڈسٹن

عظیم لبرل قائد محض عارضی طور سے اُس رجعت پرستانہ ردعمل کو روکنے میں کامیاب ہوسکا جو 1874 میں شروع ہوا تھا۔ کوئی مدبر عصری حالات سے جنگ نہیں کرسکتا ہے۔ اپنی دوسری وزارت کی چار سالہ مدت میں مسٹر گلیڈسٹن کو جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا وہ عدیم المثال تھیں۔ وہ جارحانہ کارروائیوں کے سخت خلاف تھا۔ لیکن قوم توسیع پسندی پر تلی ہوئی تھی۔ افغانستان کے معاملے میں اُس نے ہمت سے کام لیا تھا اور ٹرانسوال آمیز بے جا اسراف سے دامن بچا لیا تھا۔ مصر میں اُسے مجبوراً عربی پاشا کے خلاف کارروائی کرنی پڑی۔ فتح طل الکبیر کے بعد اُس نے کارروائی روک دی لیکن آخر میں وہ ملک پر قبضہ کرنے کے لیے مجبور ہو گیا۔ جنوبی افریقہ میں اُس نے جرأت دکھائی اور جمہوریہ ٹرانسوال کی آزادی بحال کردی۔ اُس کے ہم وطنوں نے اس اقدام کو شرمناک ذلت سے تعبیر کیا۔ سوڈان میں فوری طور سے پیچھے ہٹنے یا آگے بڑھنے کے متعلق وہ کوئی فیصلہ نہ کرسکا اور انگلستان کے لوگوں نے خرطوم کی شکست اور جنرل گارڈن GENERAL GARDEN کی موت کا اسے الزام دیا اور اُس کی مذمت کی۔

یہ بات ظاہر ہو چکی تھی کہ اُس وقت کے حالات مسٹر گلیڈسٹن کے لیے سازگار نہیں تھے۔ وہ ہمیشہ سے ایک امن پسند وزیر رہا تھا اور اُس کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ سامراج پسند وزیر میں تبدیل ہو جائے۔ اُس نے دنیا بھر کی چھوٹی قوموں سے دوستانہ مراسم قائم کر لیے تھے۔ اُس کے لیے ممکن نہیں تھا کہ اُن پر قبضہ کرسکے۔ وہ ایسی گھریلو اصلاحات کا خواہش مند تھا جن سے سب مستفید ہوسکیں لیکن قوم ایک ایسے قائد کی تلاش میں تھی جو سلطنت کی توسیع کرسکے۔ اُس کے اعلیٰ کردار، حوصلہ مند شخصیت اور

بے مثال جرأت کی بناپر اب بھی لوگ اُس کا احترام اور اُس کی ستائش کرتے تھے۔ لیکن قوم چونکہ مختلف پالیسی کی خواہش مند تھی اس لیے اُس کا اثر کم ہونے لگا تھا۔ چنانچہ دسمبر 1884 میں تیسرا ریفارم ایکٹ بنانے کے بعد اُس کا کام مکمل ہوگیا۔ لبرل وزارت نے جون 1885 میں استعفٰی دیدیا۔ اُس کے بعد بھی آئرلینڈ کے ووٹوں کی مدد سے مسٹر گلیڈسٹن دو مرتبہ اور وزیر اعظم بن سکا لیکن 1885 کے بعد وہ انگلستان میں کبھی اُس طرح کی ہردلعزیزی نہ حاصل کرسکا جیسی "عوامی ولیم" نے 1884 سے پہلے حاصل کی تھی انگلستان کو اپنی خارجہ پالیسی کے لیے اُس سے مختلف قائد کی ضرورت تھی۔

لارڈ بیکنس فیلڈ کا انتقال 1881 میں ہوگیا تھا اور کنزرویٹو پارٹی کی قیادت لارڈ سیلس بری کے ہاتھ میں آگئی تھی چنانچہ 1885 میں جب کنزرویٹو پارٹی کے ہاتھ میں طاقت آئی تو لارڈ سیلس بری وزیر اعظم ہوگیا۔ وہ 1902 تک اس عہدے پر فائز رہا۔ اس دوران فروری تا جولائی 1886 اور 1892 تا 1895 میں لبرل پارٹی کو اکثریت حاصل تھی اور اُسے وزیر اعظم کے عہدے سے ہٹنا پڑا تھا۔ لارڈ سیلس بری بذات خود سامراج پسند نہیں تھا۔ وہ امن پسند تھا اور اُس کے لیے کوشاں رہا کرتا تھا۔ لیکن جب وہ دھارے کے خلاف تیرنے کی طاقت خود میں نہیں پاتا تھا تو سپر انداز ہوجایا کرتا تھا اور دھارے کے ساتھ تیرنے لگتا تھا۔ وہ ہندوستان میں پیش قدمی کی پالیسی کا مذاق اڑایا کرتا تھا لیکن 1875 میں اُس نے سپر ڈال دی اور اُس پالیسی کی حمایت کرنے لگا۔ اُس نے 1885 میں ہندوستان کی سرحد کا تعین کر کے روس کے خلاف جنگ کا خطرہ ٹال دیا۔ اسی طرح ریاستہائے متحدہ کے خلاف جنگ کا خطرہ اُس نے وینی زولا VENEZUELA کی اُس ثالثی سے ٹال دیا جو 1895 میں ہوئی تھی افریقہ کے مقبوضات کی حدبندی کر کے اُس نے جرمنی کے ساتھ جھگڑے کا امکان ختم کر دیا۔ اُس نے فشودا FASHODA میں اور نائیجر NIGER کے ساحل پر فرانس اور انگلستان کے دعووں کو پرامن طریقہ سے طے کر دیا۔ اور اس میں بڑی کامیابی حاصل کی۔ ایک ایسے وزیر اعظم کی یہ اعلیٰ خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی جو امن کے لیے کوشاں رہا کرتا تھا۔ لیکن انیسویں صدی کے آخری برسوں میں اُس نے ہمت ہار دی اور سپر انداز ہوگیا۔

ہندوستان میں توسیع پسندی کا پہلا نتیجہ بالائی برما کی فتح کی شکل میں نمودار ہوا۔ لارڈ رپن کی جگہ لارڈ ڈفرن ہندوستان کا وائسرائے مقرر ہوا تھا۔ وہ ایک قابل اور باکمال مدبر تھا اور اُسے بہت تجربہ حاصل تھا۔ وہ 1864 سے 1866 تک انڈر سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کے فرائض انجام دے چکا تھا۔ اُس زمانے میں لارنس ہندوستان کا وائسرائے تھا۔ اُس نے 1872 سے 1878 تک

لناڈا میں اتنا اچھا انتظام کیا کہ ایک قابل حاکم کی حیثیت سے اُس نے بڑی شہرت پائی۔ اُس کے بعد اُس نے سینٹ پیٹرز برگ SIR. PETERSBURGH اور قسطنطنیہ میں سفارت کے فرائض انجام دیے۔ مصر کی دوعملی حکومت کو ختم کرنے اور وہاں برطانوی اقتدار قایم کرنے میں بھی اُس کا ہاتھ تھا۔ دسمبر 1884 میں وہ لارڈ رپن کی جگہ وائسرائے بنا یا گیا۔ اُس وقت اُس کی عمر اٹھاون سال کی تھی۔

وقتاً فوقتاً برما کے بادشاہ کے خلاف شکایتیں کی جاتی رہی تھیں۔ آوا AVA سے 1879 میں برطانوی مشن واپس بلالیا گیا تھا۔ لیکن برطانوی کابینہ نے حکومت ہند کو مشورہ دیا تھا کہ " بحران پیدا کرنے میں جلدبازی سے کام نہ لیا جائے "۔ ایک نئے معاہدہ کے متعلق شملہ میں 1882 میں مذاکرات ہوئے لیکن اُن کا کوئی نتیجہ نہ نکل سکا۔ حکومت برما نے اُس حد بندی کو منظور نہیں کیا جو منی پور میں کرنل جانسٹن نے کی تھی۔ رنگون میں رہنے والے برطانوی تاجروں نے اکتوبر 1884 میں ایک جلسہ عام کیا اور بالائی برما کے الحاق کا مطالبہ کیا۔ حسب معمول بادشاہ کی غلطیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا تا کہ رائے عامہ کو مشتعل کیا جا سکے۔ اشتہار نکالے گئے جن میں کہا گیا تھا کہ بادشاہ تھیباو THIBAW شرابی ہے رنگون کے چیمبر آف کامرس نے انگلستان کی مختلف تجارتی انجمنوں کے نام خطوط لکھے جن میں اُن سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ برطانوی کابینہ پر زور ڈالیں۔ یہ بھی مشورہ دیا گیا کہ برطانوی برما کو ہندوستان سے علیحدہ کر کے ایک کراؤن کالونی CROWN COLONY کی حیثیت دیدی جائے۔

بادشاہ تھیباو بھی اپنی حیثیت کو مستحکم بنانے کے لیے یورپ کی مخالف طاقتوں سے مذاکرات کر رہا تھا۔ آوا سے ایک مشن 1883 میں یورپ بھیجا گیا اور اپریل 1885 تک اُس نے فرانس، جرمنی اور اٹلی سے تجارتی معاہدے کر لیے۔ فرانس کا سفیر ایم۔ ہاس M.HASS مئی 1885 میں مانڈلے پہنچا اور کوشش کرنے لگا کہ برما میں فرانس اپنا اقتدار و اثر قایم کر لے۔ ایک فرانسیسی بینک قایم کرنے اور فرانسیسی ریلوے تعمیر کرنے کی کوششیں شروع کر دی گئیں۔ سیلس بری ان کارروائیوں سے غافل نہیں تھا۔ اُس نے لندن میں مقیم فرانسیسی سفیر ایم وڈنگٹن M. WADDINGTON M سے گفتگو کی اور ایم۔ فریسی نٹ M. FREYCIENET کو توجہ دلائی۔ فرانسیسی حکومت نے ایم۔ ہاس کی کارروائیوں کے متعلق اپنی لاعلمی کا اظہار کیا اور ایم ہاس کو واپس بلالیا۔ اس طرح یہ خطرہ ٹل گیا۔

اُس کے بعد ایک معمولی سے جھگڑے کو بہانہ بنا کر برما کی سلطنت کا الحاق کر لیا گیا۔ بہت دن سے ایک برطانوی کمپنی برما کے ساگون کے جنگلوں میں کام کر رہی تھی۔ آوا کے ہائی کورٹ نے کمپنی کے خلاف

فیصلہ دیا کہ اُس نے برما کے بادشاہ کو فریب دیا ہے۔ اور 73,000 پاؤنڈ خرد برد کیے ہیں۔ کمپنی نے اس کے خلاف احتجاج کیا اور لارڈ ڈفرن مزید تحقیقات پر اصرار کرنے لگا۔ آوا کے بادشاہ نے حکومت ہند کے اس حق کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ وہ نزاعی مسئلہ کو اٹھائے۔ اس پر لارڈ ڈفرن نے الٹی میٹم دیدیا جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ بادشاہ ایک مستقل برطانوی ریذیڈنٹ کو اپنے دربار میں رہنے کی اجازت دے، اُس وقت تک کے لیے کمپنی کے خلاف کارروائی ملتوی کر دے جب تک ریذیڈنٹ وہاں نہ پہنچ جائے، حکومت ہند کے مشوروں سے اپنے خارجہ تعلقات قایم کرے اور برطانوی تاجروں کو اس امر کی سہولت مہیا کرے کہ وہ بھامو BHAMO کے راستے چین سے تجارت کر سکیں۔ حکومت برما نے کمپنی کے مقدمے کے بارے میں حکومت ہند سے بات کرنے سے انکار کر دیا، برطانوی ایجنٹ کے سلسلے میں اُس نے جواب دیا کہ حسب دستور اس کو آنے اور واپس جانے کی اجازت دی جائے گی، اس پر اصرار کیا کہ فرانس، اٹلی اور دوسری طاقتوں کے ساتھ برما کے ساتھ دوستانہ مراسم برقرار رکھیں جائیں گے۔ اور کہا کہ چین کے ساتھ برطانوی تجارت کی مدد اُس حد تک کی جاتے گی جس حد تک ملک کے قوانین اجازت دیں گے۔

یہ جواب ملنے کے بعد لارڈ ڈفرن نے جنگ کا اعلان کرنے میں خود کو حق بجانب سمجھا۔ ایک چھوٹی سی طاقت کو کچلنے کے لیے بڑی طاقت کو اس سے زیادہ مضبوط دلائل کی ضرورت نہیں ہوا کرتی ہے۔ جنگ کی ابتدا نومبر 1885 میں ہوئی۔ مقابلے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ بادشاہ تھیباد کو ملک بدر کر کے رتناگیری بھیج دیا گیا جو ساحل بمبئی پر واقع ہے اور یکم جنوری 1886 کو اُس کی سلطنت کا الحاق کر لیا گیا۔ یہ الحاق انگلستان کے ہاتھوں ایک نئے ملک کی فتح کے مصداق تھا۔ لیکن برما کی فتح اور اُس کے بعد مسلح مزاحمت کے خلاف ہونے والی کارروائیوں کے اخراجات ہندوستان کو برداشت کرنے پڑے کچھ مدت بعد ایک ریلوے لائن تعمیر کی گئی جو مانڈلے سے چین کی طرف جاتی ہے۔ اس پر ہونے والے مصارف بھی ہندوستان کو برداشت کرنے پڑے لیکن چین سے تیزی کے ساتھ ہونے والی تجارت کی توقع، جو الحاق کی بڑی وجہ تھی، محض سراب ثابت ہوئی۔

ہندوستان کی مغربی سرحد کے پار پنجدہ کے مقام پر روسیوں نے افغانوں پر حملہ کر دیا جس کی بنا پر کچھ دن کے لیے انگلستان اور روس کے درمیان جنگ کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ لیکن خطرہ ٹل گیا۔ روسیوں کے مشورے کے ساتھ ایک سرحدی کمیشن BOUNDARY COMMISSION مقرر کیا گیا جس نے وسط ایشیا کی طرف دریائے آمو کے ساتھ ساتھ افغانوں کے علاقے کی حد بندی کر دی۔

ہندوستانی لوگ نمائندگی کے لیے اور اپنے ملک کے انتظام میں زیادہ حصہ لینے کے لیے بڑھ چڑھ کے مطالبے کرنے لگے۔ انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں لایا گیا اور اُس کا پہلا اجلاس دسمبر 1885 میں بمبئی میں ہوا۔ سال بہ سال بڑے دن کے موقع پر ہندوستان کے اعتدال پسند اور بہترین تعلیم یافتہ لوگوں کی توقعات و خیالات کا اظہار اس پلیٹ فارم سے ہونے لگا۔ کلکتہ کے مسٹر ڈبلیو۔ سی۔ بنرجی، بمبئی کے ایک سرکردہ شہری مسٹر پی۔ مہتا اور دوسرے ممتاز ہندوستانی رہناؤں نے مسٹر اے۔ او۔ ہیوم کی حمایت اور اپنی قوت، اعتدال پسندی اور حب الوطنی پر مبنی اپنی کوششوں کی بنا پر اس کو کامیاب بنایا۔ ابتدا میں اس نئی تحریک نے حکام میں کچھ بے چینی پیدا کر دی تھی۔ لیکن ہندوستان کے قائدین کی سنجیدگی اور ثابت قدمی نے بے چینی دور کر دی اور کانگریس کو ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقے کا نمائندہ ادارہ بنا دیا۔

لارڈ ڈفرن ترقی کے خلاف نہیں تھا۔ ابتدا میں وہ انڈین نیشنل کانگریس کی قدر کرتا تھا لیکن بعد میں اُسے انڈین نیشنل کانگریس کے اغراض و مقاصد کے متعلق اطلاعات فراہم کی گئیں۔ اُس نے پبلک سروس کمیشن قایم کیا تاکہ اعلیٰ انتظامی عہدوں پر ہندوستانیوں کا تقرر کیا جا سکے۔ لیکن کمیشن کی بہترین سفارشات پر عمل نہیں کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اُس نے ہندوستان کی لیجسلیٹو کونسل کے کچھ اراکین مقرر کرنے کے لیے طریقہ انتخاب کی سفارش کی تھی جس کی بنا پر انڈین کونسلز ایکٹ وجود میں آیا جو 1892 میں پارلیمنٹ نے منظور کیا تھا۔ لیکن اُس کے زمانہ حکومت میں فوج پر اور فوج سے متعلق ہونے والے اخراجات میں بہت اضافہ ہو گیا تھا اور ہندوستان کی شمال مغربی سرحد کے پار ایک دفعہ پھر شر انگیز کارروائیاں کی جانے لگیں تھیں جن پر بہت دولت صرف ہوئی۔

لارڈ ڈفرن کی جگہ 1888 میں لارڈ لینس ڈاؤن ہندوستان کا وائسرائے مقرر ہوا۔ وہ بھی کناڈا کا گورنر جنرل رہ چکا تھا اور اس لیے ایک حاکم کی حیثیت سے بہت تجربہ حاصل کر چکا تھا۔ لیکن، وہ لارڈ ڈفرن کی طرح ہمت والا نہیں تھا اور اُس کی سی سوجھ بوجھ نہیں رکھتا تھا۔ اُس کی کونسل میں احمقانہ سامراج پرستی کے تصورات کا غلبہ تھا اور ہندوستان کی سرحد کے پار تیزی کے ساتھ دولت برباد کی جا رہی تھی۔ ایک اہم حاکم کا کہنا ہے، جو اُس زمانے میں پس پشت رہ کر اُس کا ہاتھ بٹایا کرتا تھا، کہ لارڈ لینس ڈاؤن کی شائستگی اور اعلیٰ صفات اگرچہ ان لوگوں کو متاثر کرتی تھیں جن سے اُس کا واسطہ پڑتا تھا پھر بھی رفتہ رفتہ یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ ہندوستان کے اندرونی نظم و نسق کو سدھارنے کے بجائے وہ شمال مغربی سرحد کے پار پیش آنے والے واقعات میں زیادہ دلچسپی لیا کرتا ہے۔ عام طور سے لوگ اعتراض کیا کرتے تھے کہ وائسرائے اپنے اعلیٰ فوجی

مشیروں کے زیر اثر ہے۔ اُن کے زیر اثر اور غالباً برطانوی کابینہ کی منظوری کے بعد لارڈ لینس ڈاؤن نے لارڈ لٹن کی پالیسی کی تجدید کی۔ اُن جنگوں کی بنیاد، جن کی وجہ سے 1896 کے بعد ہندوستان کو جانی و مالی نقصانات برداشت کرنے پڑے، وہ طریقہ کار تھا جس کو ایک سال پہلے لارڈ لینس ڈاؤن نے اختیار کیا تھا 1838 کے بعد یہ پہلا موقعہ تھا جب شمال دریائے سندھ پار کے علاقوں نے متعلق نئی توقعات و تدابیر کا مرکز بن گیا۔ اب صوبائی گورنر یا تدبیر ریذیڈنٹ مراعات یافتہ ہندوستانی حاکم نہیں سمجھا جاتا تھا۔ یہ امتیاز بلوچستان کے علاقے کے نگراں مسٹر رابرٹ سینڈی مین کو حاصل ہوگیا تھا جس کا عجیب و غریب نصب العین یہ تھا کہ برطانوی اثر سرحد کے پار قایم کیا جائے۔ اور جو قبیلوں کے باہمی جھگڑوں میں حصہ لیتا تھا اور اُن سے فائدہ اٹھایا کرتا تھا "سینڈی مینی خبط" نے ایک چھوت کی بیماری کی حیثیت حاصل کرلی اور اعلا سطح کے حلقوں میں ایک وبا کی طرح پھیل گیا۔" [1]

اس بوالہوسانہ پالیسی کی بنا پر لارڈ لینس ڈاؤن نے ریاست کشمیر کے تعلق سے کچھ ایسی کارروائیاں کیں جنھوں نے ہندوستان کے لوگوں کو خطرے کا احساس دلایا اور ہاؤس آف کامنز میں بحث کا موضوع بن گئیں۔ گلگت کی چوکی کشمیر کے شمال میں سو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں لارڈ لٹن چاہتا تھا کہ ریاست کشمیر کے توسط سے اس دور دراز چوکی پر اپنا قبضہ و دخل رکھے۔ لارڈ لینس ڈاؤن نے اس پالیسی میں ترمیم کی، کچھ مدت کے لیے کشمیر کے حکمران کے اختیارات چھین لیے اور برطانوی ریذیڈنٹ کے ذریعے ریاست کا انتظام کرنے لگا۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ 1885 میں گدی پر بیٹھا۔ اُس وقت لارڈ ڈفرن نے کشمیر میں ایک ریذیڈنٹ مقرر کردیا تھا۔ اگلے سال مسٹر پلاؤڈن MR. PLOWDEN ریذیڈنٹ مقرر کیا گیا اور اس نے اس قسم کے اختیارات سنبھالنے شروع کردیے کہ خود ہندوستان کا دفتر خارجہ خائف ہوگیا۔ امور خارجہ کے سکریٹری نے لارڈ ڈفرن کو لکھا تھا۔ "مجھے مسٹر پلاؤڈن سے اتفاق نہیں ہے۔ اُس میں کشمیر کو نظر انداز کرنے کا رجحان ضرورت سے زیادہ پایا جاتا ہے۔" "اگر ہم گلگت کا الحاق کرلیں یا پڑوس کی جاگیر پر کشمیر کا اقتدار اعلیٰ ختم کردیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم فوری طور سے اگر کشمیر میں برطانوی فوج متعین کردیں تو ہم کشمیر کے دربار کی مخالفت مول لے لیں گے اور اپنی دشواریوں میں اضافہ کرلیں گے۔" "اگر ہم گلگت میں کسی ایسے سلیم الطبع اور سمجھدار افسر کا تقرر کرسکیں جو کشمیر کی فوجوں کو منظم کرسکے اور غیر ضروری مداخلت سے اپنا دامن بچا سکے تو مجھے یقین ہے کہ ہم تھوڑی مدت میں

---

[1] سر آکلینڈ کولون

کسی کے احساسات کو مجروح کیے بغیر، حالات پر قابو پا سکتے ہیں۔"[1] لارڈ ڈفرن ایک محتاط مدبر تھا۔ اُس نے 1888 میں پلاؤڈن کو کشمیر سے منتقل کر دیا اور اُسی سال وہ خود بھی ہندوستان سے واپس چلا گیا۔

اُس کے جانشین لارڈ لینس ڈاؤن نے زیادہ سمجھداری اور دانشمندی سے کام نہیں لیا۔ 1889 کے شروع میں ہندوستان کے نئے وائسرائے نے کشمیر کے حکمران کے تمام اختیارات چھین لیے اور ریاست کی حکومت ایک کونسل کے سپرد کر دی جس کو ہدایت کی گئی کہ وہ برطانوی ریذیڈنٹ کے مشورے سے کام کرے۔ بقول لارڈ لینس ڈاؤن اس اقدام کی وجوہ مندرجہ ذیل تھیں:[2]

1. نظم و نسق کے متعلق ملنے والی غیر تسلی بخش رپورٹیں
2. مالیاتی ابتری
3. اصلاحات کی طرف سے بے توجہی
4. مہاراجہ کے مبینہ باغیانہ خطوط
5. حکومت سے دست بردار ہونے کی راجہ کی پیش کش

پہلے تین الزام عام نوعیت کے تھے اور راجہ پرتاپ سنگھ کی گدی نشینی کے بعد کی قلیل مدت پر اُن کا اطلاق نہیں ہوتا تھا۔ ہر سال سینکڑوں انگریز کشمیر جایا کرتے تھے اور انھوں نے مظالم یا لوگوں کے دکھوں کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ جس سال یہ خط لکھا گیا تھا اُس سال مدراس اور اڑیسہ کے برطانوی صوبوں میں زیادہ دکھ درد دیکھنے میں آتے تھے۔

چوتھا الزام کبھی ثابت نہ کیا جا سکا اور اُس کو اہمیت بھی نہیں دی گئی۔ لارڈ لینس ڈاؤن نے خود سکریٹری آف اسٹیٹ کو لکھا تھا "ہماری رائے میں ان خطوط کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دی جانی چاہیے۔" خطوط کے متعلق کبھی کوئی ثبوت نہیں فراہم کیا جا سکا۔ غالباً مہاراجہ کے دشمنوں نے جعلی خطوط بنائے تھے۔

---

[1] مہاراجہ کے نام خط مورخہ 28 جون 1889 اس کا اقتباس ولیم ڈگبی نے "بلا سماعت فیصلہ جرم" CONDEMNEEL UNHARD میں دیا ہے۔ (لندن 1890)

[2] مراسلہ مورخہ مئی 1888 اس کا اقتباس مسٹر ولیم ڈگبی نے "بلا سماعت فیصلہ جرم" CONDEMNED UNHARD میں دیا ہے۔ (لندن 1890)

پانچویں الزام کی بنیاد ایک خط تھا جو دباؤ میں آکر مہاراجہ نے اپنے بھائی کو لکھا تھا۔ اُس کو دست برداری کی دستاویز نہیں کہا جا سکتا تھا۔

چنانچہ لارڈ لینس ڈاؤن کی کارروائی ناقابل توجیہہ تھی۔ ہندوستان کے لوگ خائف ہو گئے اور سمجھنے لگے کہ گلگت کی پالیسی کے شاخسانے کے طور پر وائسرائے کشمیر کا الحاق کرنا چاہتا ہے۔ پارلیمنٹ کے ممبر مسٹر ایم۔ بریڈلا MR. M. BRADLANGH نے اس خطرے کی نشان دہی کی جو اُس زمانے میں ہندوستان کے معاملات میں بڑی دلچسپی لیا کرتا تھا۔ اُس نے 3 جولائی کو تحریک التوا پیش کی اور اس موضوع پر بحث کا آغاز کیا۔ تحریک التوا نامنظور کر دی گئی لیکن اُس پر ہونے والی بحث نے حکومت ہند کو کارروائی سے باز رکھا اُس کے بعد مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے اختیارات بحال کر دیے گئے اور وہ اطمینان کے ساتھ کشمیر پر حکومت کرتا رہا۔ پھر کبھی مہاراجہ پر بدانتظامی یا بغاوت کا الزام نہیں لگایا گیا۔

اس دوران انگلستان میں ایک کے بعد ایک اہم واقعات پیش آتے رہے۔ اپنی تیسری وزارت کے زمانے میں جو فروری سے جولائی 1886ء تک رہا تھا، مسٹر گلیڈسٹن نے آئرش ہوم رول بل IRISH HOME RULE BILL کو منظور کرانے کی کوشش کی تو وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ لبرل پارٹی کے ترانوے اراکین مسٹر گلیڈسٹن سے علیحدگی اختیار کر کے کنزرویٹو پارٹی میں شامل ہو گئے تھے جو آئرلینڈ کو انگلستان کے ساتھ متحد رکھنے کے حق میں تھی۔ اُس کے بعد ہونے والے عام انتخاب میں کنزرویٹو پارٹی کے اراکین نے اور اتحاد کے حامی لبرل اراکین نے اکثریت حاصل کر لی اور ایک دفعہ پھر لارڈ سیلسبری وزیر اعظم ہو گیا۔

متحدہ حکومت چھ سال یعنی 1886 سے 1892 تک قایم رہی۔ لیکن مسٹر گلیڈسٹن اسی سال کا ہو جانے کے باوجود آئرش ہوم رول کی اسکیم کو کامیاب بنانے پر مصر تھا اور حکومت پر سخت حملے کیا کرتا تھا۔ 1892ء میں عام انتخابات پھر ہوئے۔ اصل مسئلہ ہوم رول کا مطالبہ تھا۔ مقابلہ سخت ہوا۔ مسٹر گلیڈسٹن انتخابات میں کامیاب ہوا۔ اُس نے چالیس اراکین کی اکثریت حاصل کر لی اور چوتھی دفعہ پھر وزیر اعظم بن گیا۔ لارڈ کمبرلے LORD KIMBERLEY کو، جو 1886 میں سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا رہ چکا تھا، ایک دفعہ پھر وہ عہدہ دیا گیا۔ اُس نے کنزرویٹو سکریٹری آف اسٹیٹ لارڈ کراس LORD CROSS کی جگہ لے لی۔ لیکن 1894 میں لارڈ کمبرلے سکریٹری برائے امور خارجہ مقرر کر دیا گیا اور انڈیا آفس میں اس کی جگہ مسٹر فاؤلر نے لے لی جو اب سر ہنری فاؤلر

کے نام سے مشہور ہے۔

ایک دفعہ پھر لبرل حکومت بننے اور مسٹر فاؤلر کے سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا مقرر کیے جانے کی وجہ سے ہندوستانیوں کے دلوں میں بڑی امیدیں پیدا ہو گئیں تھیں۔ اُن کا خیال تھا کہ اپنی صلاحیت اور واقعات کا اچھی طرح جائزہ لینے کی اہلیت کی بنا پر وہ ہندوستان کے مسائل کو پوری طرح سمجھ سکے گا۔

مسٹر فاؤلر آئرش ہوم رول کا پکا حامی تھا اور اُس سے امید کی جاتی تھی کہ وہ ہندوستان میں خود اختیار حکومت کی حمایت و توسیع کرے گا۔ وہ لوکل گورنمنٹ بورڈ۔ LOCAL GOVT. BOARD کا صدر رہ چکا تھا اور خیال تھا کہ ہندوستان میں وہ ڈسٹرکٹ بورڈوں کو عوامی انتظامات کے حقیقی مرکز بنا دے گا۔ وہ عام لوگوں سے دلچسپی رکھتا تھا اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ ہندوستان کے لوگوں کی جائز توقعات کی طرف ہمدردی کا رویہ اختیار کرے گا۔ ہندوستان کے لوگوں نے اُس سے اس قسم کی امیدیں باندھ رکھی تھیں لیکن اُنھیں مایوس ہونا پڑا۔ عصری اثرات اور مسٹر گلیڈسٹن کے جانشین لارڈ روزبری LORD RASBBERY کی سامراجی حکومت کے تحت مسٹر فاؤلر تیزی سے سامراجی تصورات کی طرف مائل ہو گیا۔ خطاب یافتہ پیش روؤں کے مقابلے میں اُس کی حکومت زیادہ مطلق العنان ثابت ہوئی۔ اُس نے ہندوستان کی ایسی مطلق حکومت کے سرکاری تصور کو اختیار کرنے میں شدت سے کام لیا جو رائے عامہ سے متاثر نہ ہو۔ کبھی کبھی اُس نے اتنی ہی شدت کے ساتھ لوگوں کی توقعات و مطالبات کے متعلق ناپسندیدگی کا اظہار بھی کیا۔ اُس نے کوئی تدارک کی تدابیر اختیار نہیں کیں نہ لوگوں کو کوئی مراعات دیں۔ حکمراں طبقے کے لیے وہ باعث اطمینان تھا لیکن ہندوستانیوں کو اُس نے سخت مایوس کیا۔

مسٹر فاؤلر نے سرمایہ قرض لے کر ہندوستان کی ریلوں کی بڑے پیمانے پر توسیع کا کام جاری رکھا حالانکہ ملک کے پاس نہ اتنے وسائل تھے اور نہ اُسے ریلوں کی فوری ضرورت تھی۔ اُس نے ہندوستان کی سرحدوں کے پار حکومت ہند کو شر انگیز کارروائیاں کرنے اور دولت برباد کرنے کی اجازت دی۔ امیر کابل کو ایک مشن بھیجا گیا۔ سرحد کا تعین کیا گیا۔ چترال، سوات اور وزیرستان برطانوی حلقہ اثر میں شامل کر لیے گئے۔ سرحد کے اُس جنگ کے لیے میدان تیار کر دیا گیا جو تین سال بعد چھڑ گئی۔

مسٹر گلیڈسٹن کا ہوم رول بل 1893ء میں ہاؤس آف کامنز نے منظور کر لیا تھا لیکن ہاؤس آف لارڈز نے اُسے مسترد کر دیا۔ 1894ء میں شروع میں معمر وزیر پارلیمانی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو گیا۔ اور 1898ء میں اُس کا انتقال ہو گیا۔ پوری قوم نے اُس کا سوگ منایا۔ اُس کے

اہم سیاسی مخالفین نے بھی، جو اُس کی خارجہ پالیسی اور ہوم رول کی اسکیم کو سخت ناپسند کرتے تھے، اُس کے پیروؤں کے ساتھ مل کر ایک ایسے شخص کو خراج عقیدت پیش کیا جس کے دل میں خوف خدا تھا، جو اعلیٰ صفات کا مالک تھا اور نیک دل تھا۔ اُس کی گہری سنجیدگی نے، اُس کی بے مثال صلاحیتوں نے، اُس کے اعلیٰ کردار نے اور ملک کی خدمت کے جذبے نے، جو مرتے دم تک اُس کے دل میں رہا، عام لوگوں کے ذہنوں کو متاثر کیا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس کے یہاں عظمت اور مسیحی اوصاف کا امتزاج پایا جاتا تھا جس نے پوری قوم کے تصورات کو متاثر کیا۔ اُس کے سیاسی مخالف لارڈ سیلس بری نے کہا تھا "ایک عظیم مسیحی انسان کی عظیم مثال جس کی نظیر پیش کرنے سے تاریخ قاصر ہے" اُس کو ویسٹ منسٹر ایبی WEST MINISTER ABBEY میں سپرد خاک کر دیا گیا جہاں انگلستان کے عظیم ترین اور بہترین لوگ دفن ہیں۔

باب۔ 3

الگن اور کرزن

مسٹر گلیڈسٹن 1894 میں منظرِ عام سے ہٹ گیا۔ اُس کے ہٹنے کے بعد جنگ کے بڑھتے ہوئے رجحان کو قابو میں رکھنے والا کوئی نہیں رہا۔ لارڈ روزبری کی قیادت میں لبرل حکومت ایک سال تک اور برقرار رہی۔ لیکن جون 1895 میں اُسے استعفیٰ دینا پڑا۔ عصری حالات سے واقفیت رکھنے والے ذہین مشاہدین کا خیال تھا کہ دنیا کے کسی نہ کسی گوشے میں ایک بڑی جنگ چھڑنے والی ہے۔ افواہوں نے دنیا میں بے چینی پھیلا دی تھی۔ تفریح گاہوں میں اور عام جلسوں میں جارحانہ گفتگو ہونے لگی تھی۔ اخبارات سلطنت کی توسیع کے راگ الاپنے لگے تھے۔ فتوحات سے تاجروں نے امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ مزدور اُن کی آواز میں آواز ملا رہے تھے۔ انھیں زیادہ منافع بخش روزگار کی امیدیں دلائی گئی تھیں۔ لارڈ سیلس بری نے، جو تیسری دفعہ وزیرِ اعظم ہوا تھا، ایک سے زیادہ بار لوگوں کو خطرے سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔ اُس کے بعد اُس نے کشتی کو لہروں کے حوالے کردیا۔ 1815، 1855، اور 1895 کے حالات کی بنیاد پر کوئی غیر ملکی کہہ سکتا تھا کہ برطانوی قوم مجموعی اعتبار سے ایک امن پسند قوم ہے لیکن امن کی قدر کرنے کے لیے یہ ضروری سمجھتی ہے کہ ہر چالیس سال بعد خون بہہ جائے۔

اُس کے فوراً بعد جنگیں چھڑ گئیں۔ سر ہربرٹ کچنر SIR HERBERT KITCHENER نے جو اب لارڈ کچنر کے نام سے مشہور ہے، 1896 میں ڈنگولا کو فتح کیا اور دریائے نیل کے ساتھ ساتھ بڑھنے لگا۔ اُس نے ستمبر 896؁ میں اُم ڈرمان OMDURMAN کے مقام پر خلیفہ کی فوج کو فاش شکست دی۔ گورڈن کی شکست کا بدلا لے لیا گیا۔ سوڈان کے ریگ زاروں پر برطانوی اقتدار

قایم کر دیا گیا۔ فرانس فشودا سے پیچھے ہٹ گیا۔

جاپان نے 1894 اور 1895 میں چین کو نیچا دکھا دیا تھا۔ اُس خستہ حال سلطنت میں "حلقہ ہائے اثر" قایم کرنے کے لیے یورپ کی طاقتیں دوڑ پڑیں۔ روس نے پورٹ آرتھر پر قبضہ کر لیا۔ اور منچوریا پر اقتدار جما لیا۔ جرمنی نے کئی بندرگاہوں اور علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ انگلستان نے وئی ہائی وئی WEI-HAI پر قبضہ جما لیا۔ اُس کے بعد چینیوں کی ایک خفیہ تنظیم نے وہ شورش شروع کی جو شورش باکسر BOXER RISING کے نام سے مشہور ہے اور متحدہ طاقتوں نے جواباً جنگ شروع کر دی۔ اس جنگ میں یورپی فوجوں نے نہتے اور امن پسند لوگوں کے خلاف انتہائی سفاکانہ کارروائیاں کر کے خود کو دنیا کی نظروں میں ذلیل کر دیا۔

لیکن اس پر آشوب زمانے میں پیش آنے والا بدترین حادثہ جنوبی افریقہ کی جنگ تھی۔ ڈاکٹر جیمسن JAMESON نے ٹرانسوال کے خلاف ایک فوجی دستے کی قیادت کی لیکن 1896 میں اُسے شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ مزید حملوں کے خلاف بوئروں BOERS نے تیاری شروع کر دی "غیر واضح جمہوریتوں" کے ڈھونگ نے انگلستان کے صبر کا پیمانہ لبریز کر دیا۔ جنگ شروع ہو گئی جو دو سال تک جاری رہی۔ اس جنگ میں 20,000 سے زیادہ برطانوی جانیں ضائع ہوئیں اور دو سو ملین پونڈ سے زیادہ دولت برباد ہوئی۔ جنگ کی ہولناک تباہیوں کے دوران جنوری 1901 میں ملکہ وکٹوریہ کا انتقال ہو گیا۔ اُسے افسوس تھا کہ اُس کے خوشحال دورِ حکومت کا اختتام ایسے تباہ کن حالات میں ہوا۔

ان پر آشوب حالات کا اثر ہندوستان پر بھی پڑا۔ لارڈ جارج ہملٹن GEORGE HAMILTON. 1895 سے 1903 تک سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کے عہدے پر فائز رہا۔ وہ 1874 سے 1878 تک انڈر سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کے فرائض ادا کر چکا تھا۔ اس کے علاوہ وہ 1874 میں ہندوستان کی مالیاتی کمیٹی INDIAN FINANCE COMMITTEE. کا رکن رہ چکا تھا اور 1878 میں آب پاشی کی کمیٹی IRRIGATION COMMITTEE کے صدر کے فرائض ادا کر چکا تھا۔ وہ ہندوستان کے مسائل سے واقف تھا اور اُن کے حل کرنے میں جزئیات کے علم سے فائدہ اُٹھاتا تھا۔ لیکن اُس میں وہ جرأت اور قابلیت نہیں تھی جس کا مظاہرہ اُس کے پیش رو نے کیا تھا۔ ہندوستان کے لوگوں سے اور اُن کی جائز توقعات سے اُسے زیادہ ہمدردی بھی نہیں تھی جنگ، وباؤں اور بار بار پڑنے والے قحطوں کی بے مثال تباہیوں کے زمانے میں بھی سکریٹری آف

اسٹیٹ نے نہ کوئی ترقیاتی منصوبہ بنایا نہ مستقل مفاد کی کوئی اسکیم سوچی۔ ایک دکھوں کی ماری قوم کی حالت کو سدھارنے کے لیے کوئی بڑے اقدام نہیں کیے گئے۔ محاصل کا بار کم کرنے کی تدابیر نہیں کی گئیں مقامی تجارت اور صنعت و حرفت کو فروغ دینے کے لیے کوئی مناسب کارروائی نہیں کی گئی۔ کسانوں کے حقوق کے ضروری تحفظ اور مناسب تشخیص مال گزاری کے سلسلے میں کچھ نہیں کیا گیا۔ اس کے برخلاف انتہائی پر آشوب زمانے میں بدترین مظالم اور زیادتیاں کی گئیں۔ اخباروں کی آزادی پر بندشیں عاید کردی گئیں۔ سائنسی ادارے موقوف کردیے گئے۔ اُن انگریز نوجوانوں کو موقع دینے کی خاطر جو مشرق میں روزگار تلاش کیا کرتے تھے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں پر خود اُن کے ملک کے اعلیٰ عہدوں کے دروازے بند کیے جانے لگے۔ ہندوستان میں ملکہ کی حکومت کے گزشتہ سینتیس سال میں اتنی تباہی کبھی نہیں ہوئی تھی، حکومت ہمدردی اور جذبات تلافی سے اس قدر عاری کبھی نہیں رہی تھی اور اتنے ظالمانہ اقدامات کبھی نہیں کیے گئے تھے۔

لارڈ ڈلینس ڈاؤن کی جگہ لارڈ ایلگن 1893 میں ہندوستان کا وائسرائے مقرر ہوا۔ ہندوستان کے لوگوں کے دلوں سے ابھی اُس کے باپ کی یاد محو نہیں ہوئی تھی۔ وہ اُس کی عزت کرتے تھے۔ چنانچہ نیا وائسرائے امن پسندی اور ہندوستان کے لوگوں کے لیے ہمدردی کی روایات لے کر آیا۔ لیکن وہ اُن حالات پر قابو نہ پاسکا جو ملک میں پائے جاتے تھے۔ وہ انتہائی امن پسند تھا۔ لیکن اُسے مغربی سرحد پر کی غیر ضروری اور مضرت رساں جنگ میں کودنا پڑا۔

پشاور کے برطانوی سرحدی ضلعے سے سو میل شمال کی طرف کافرستان کے پہاڑوں کے درمیان چترال واقع ہے۔ ایک چھوٹے سے فوجی دستے کے ساتھ برطانوی ریذیڈنٹ کا محاصرہ 1894 میں کرلیا گیا جو عارضی طور سے وہاں بھیجا گیا تھا۔ لیکن 1895 میں وہ محاصرے سے باہر آگیا۔ انگریزوں کی فتح کے بعد لارڈ روزبری کی لبرل حکومت نے فیصلہ کیا تھا کہ اُس دور دراز، بے مصرف اور الگ تھلگ چوکی کو خالی کردیا جائے۔ لیکن کنزرویٹو حکومت نے، جو 1895 میں قایم ہوئی تھی، قبضہ برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے نے اور اُن کارروائیوں نے جو لارڈ ڈلینس ڈاؤن کے زمانے سے جاری تھیں سرحد کے قبائل کو مشتعل و بدگمان کردیا۔ آفریدیوں اور دوسرے قبیلوں میں شورش پھوٹ پڑی اور اُس کے بعد سرحد کی جنگ شروع ہوگئی۔

برطانوی فوجوں نے حسب معمول بہادری کا ثبوت دیا۔ اسکاٹ لینڈ کے سپاہیوں نے اور گورکھوں نے اکتوبر 1897 میں درگاہ پر قبضہ کرکے بے جگری کا مظاہرہ کیا۔ سکھوں نے جان جوکھوں میں

ڈال کے شاندار کارنامے سرانجام دیے۔ قلعوں اور گاؤں پر قبضہ کر لیا گیا۔ ملک برباد کر دیا گیا اور اس کے بعد برطانوی فوجوں نے اس بے آب و گیاہ ملک کو خالی کر دیا۔ اس فضول اور مہنگی جنگ کے خلاف انگلستان میں بہت چیخ پکار کی گئی لیکن برطانوی خزانے سے ہندوستان کو کوئی امداد نہ مل سکی۔

اس دوران ہندوستان کو بے مثال تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔ شمالی ہندوستان، صوبجات متوسط، مدراس اور بمبئی میں ایسا شدید قحط پڑا جس کی مثال تاریخ نہیں پیش کر سکتی ہے۔ بڑے پیمانے پر امدادی کام شروع کیے گئے جن میں کہیں کم اور کہیں زیادہ کامیابی ہوئی۔ بنگال کے لوگوں کے پاس وسائل ہیں اور وہ کسی نہ کسی حد تک اپنی مدد آپ کر سکتے ہیں۔ اس لیے قحط کی بنا پر وہاں زیادہ جانیں ضائع نہیں ہوئیں۔ بمبئی اور مدراس میں مرنے والوں کی تعداد میں بڑا اضافہ ہو گیا۔ صوبجات متوسط میں تو یہ تعداد دگنی ہو گئی۔ قحط کی وجہ سے ایک سال میں مرنے والوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی۔

اسی سال ملک کو ایک اور تباہی سے دوچار ہونا پڑا۔ مغربی ہندوستان کے اچھے اچھے شہر گلٹی دار طاعون نے تباہ و برباد کر دیے۔ اس کو روکنے کے لیے جو اقدام کیے گئے وہ مفید بھی نہیں ثابت ہوئے۔ اور اُن کی بنا پر لوگوں کو بڑی تکلیفیں بھی اٹھانی پڑیں۔ اس کام کے لیے فوج طلب کی گئی تاکہ وہ سول حکام کی مدد کر سکے۔ لوگ خائف ہو گئے مگر بمبئی کی حکومت پر اُن کی درخواستوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ ان کارروائیوں کے افسوسناک نتائج سامنے آئے۔ پونا کی سڑکوں پر دو برطانوی افسر قتل کر دیے گئے۔ بمبئی میں بلوے پھوٹ پڑے۔ اُن بلووں پر قابو پانے میں جانی نقصان ہوا۔ قاتل گرفتار کر لیا گیا اور مقدمے کے بعد اُس کو پھانسی دیدی گئی۔

لیکن حکومت خائف ہو گئی تھی۔ اخباروں کے خلاف مقدمات چلائے گئے اور کچھ صورتوں میں سخت سزائیں دی گئیں۔ نمایاں حیثیت رکھنے والے اشخاص گرفتار کر لیے گئے اور مقدمہ چلائے بغیر نظربند کر دیے گئے۔ اخباروں کی آزادی پر بندشیں عاید کرنے کے لیے قانون بنائے گئے۔ مجسٹریٹوں کو اختیارات دیے گئے کہ وہ اخباروں کے ایڈیٹروں سے نیک چلنی کی ضمانتیں طلب کر سکیں۔ ضمانتیں نہ دینے کی صورت میں انھیں مقدمہ چلائے بغیر جیل بھیجدیں۔ ہندوستان میں اپنی عمر کا بڑا حصہ گزارنے والے انگریز محسوس کرتے تھے کہ حکومت بلاوجہ خائف ہے اور یہ کہ شک و بے اعتمادی سے سلطنت تقویت نہیں پا سکتی۔ ہندوستان کے لوگوں کے دلوں میں 1897-98 نے قحط، جنگ اور وبا کے علاوہ بھی کچھ ہولناک یادیں چھوڑیں۔

چنانچہ 1898 کے اواخر میں جب یہ اعلان کیا گیا کہ لارڈ ایلگن کی جگہ آنریبل جارج کرزن ہندوستان کا وائسرائے مقرر کیا جائے گا تو اس خبر نے ہندوستان میں مسرت و اطمینان کی لہر دوڑادی۔ لارڈ کرزن کا استقبال جس جوش کے ساتھ کیا گیا وہ دلی جذبات کا مظہر تھا اور اُس میں سب لوگ شامل تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ لوگ محسوس کرنے لگے تھے کہ اُن پر حکومت کرنے والا حاکم باصلاحیت و مضبوط ہے جو ہر کام پر نظر رکھے گا اور اپنی رائے پر عمل کرے گا۔

لارڈ کرزن میں ایک اچھے حاکم کے بہت سے اصاف پائے جاتے تھے۔ اُس میں قوت عمل تھی، وہ جفاکش تھا اور بڑا ذہین تھا۔ اور انگلستان میں نمایاں قومی خدمات سرانجام دے چکا تھا۔ وہ 1859 میں پیدا ہوا تھا اور 92-1891 میں انڈر سکریٹری آف انڈیا فار انڈیا اور 1895 سے 1898 تک اُمور خارجہ کے انڈر سکریٹری کے فرائض انجام دے چکا تھا۔ اُس نے ایشیا کے بہت سے ملکوں کا سفر کیا تھا اور وسط ایشیا، ایران اور مشرق بعید کے متعلق بہت کچھ لکھ چکا تھا وہ بڑا اچھا مقرر تھا اور اُس کی تقریر کا انداز بڑا نفیس ہوا کرتا تھا۔ وہ عام ستائش کی قدر کرتا تھا اور عام اعتراضات کا اثر قبول کیا کرتا تھا۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ وہ مشرقی طرز زندگی کی واقعی قدر کرتا تھا۔ وہ مشرق کے فن و ادب کا قدردان تھا جس نے اُسے ایک عظیم مشرقی قوم پر حکومت کرنے کا اہل بنادیا تھا۔

ان تمام خوبیوں کے باوجود لارڈ کرزن میں ایک کامیاب حاکم کے کچھ اوصاف کی کمی بھی تھی۔ وہ پکا سامراجی تھا اور نہ خود اختیار حکومت کی قدر کرتا تھا نہ عوامی تعاون میں یقین رکھتا تھا۔ وہ ذہین تھا نوجوان تھا اور اولوالعزم تھا۔ مشرق میں برطانیہ کی طاقت، وقار، مفادات و تجارت اُس کے لیے بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ لیکن اُس نے مشرق کی اس عظیم قوم کی خوش حالی اور سیاسی ترقی میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ جس کی قسمت کا مالک وہ بنا دیا گیا تھا۔ اُس کا نصب العین ایک مطلق العنان حکومت تھی۔

لارڈ کرزن کے دور حکومت کے متعلق کوئی قطعی رائے دینا ابھی قبل از وقت ہوگا۔ لیکن اُس کے زمانہ حکومت کے ابتدائی برسوں کا ذکر کیے بغیر وکٹوریہ کے دور حکومت میں ہندوستان کے نظم و نسق کی روداد مکمل نہیں ہوگی۔ ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اُس کی ابتدائی کارروائیوں نے لوگوں کو مایوس اور بددل کردیا۔ حکومت بنگال نے 1876 میں کلکتہ کی میونسپلٹی میں خود اختیار حکومت کو رواج دیا تھا۔ شہر کے محصول دہندگان میونسپلٹی کے پچاس اراکین کا انتخاب کرتے تھے اور پچیس کو

حکومت نامزد کرتی تھی۔ اس کی وجہ سے سرکار میونسپلٹی پر قابو بھی رکھتی تھی اور نمائندگی کے اصول پر عمل بھی ہوتا تھا۔ بہت سی غلطیوں کے باوجود میونسپلٹی کے اراکین نے کچھ مفید کام بھی کیے تھے۔ انھوں نے پانی کے نکاس کو بہتر بنا دیا اور شہر کو صاف پانی مہیا کرنے کی اسکیم کو ترقی دی۔ انھوں نے شہر کے گندے حصوں کو صاف کر دیا اور اسے صحت کی تلاش میں بنگال سے آنے والے لوگوں کا مرجع بنا دیا جہاں ملیریا بہت ہوا کرتا تھا۔ انھوں نے چوڑی چکنی سڑکیں بنائیں اور شہر کو زیادہ خوبصورت بنا دیا۔ انھوں نے کلکتہ کو طاعون کے بڑے حملے سے محفوظ رکھا جو ہندوستان کے دوسرے شہروں میں بری طرح پھیلا ہوا تھا۔ بنگال کے لفٹننٹ گورنر سر انٹنی میک ڈونل ANTONY MACDONENEL کے بقول، جو میونسپلٹی کے اراکین کا کام دیکھ چکا تھا، انھوں نے "اپنے فرائض کی ادائیگی میں جس احتیاط اور توجہ کا ثبوت دیا وہ قابل تعریف ہے۔ کچھ صورتوں میں تو اس توجہ نے لگاؤ کی شکل اختیار کر لی تھی۔"

لیکن انیسویں صدی کے آخری برسوں میں عوامی اداروں کے کام کو معیار نہیں سمجھا جاتا تھا۔ منتخب اراکین کے اختیارات کم کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ بنگال کے لفٹنٹ گورنر سر الیگزینڈر میکنزی نے اس مقصد کے پیش نظر ایک بل پیش کیا۔ کلکتہ کے لوگوں نے احتجاج کیا۔ لارڈ کرزن نے مداخلت کی اور بل کی دفعات کو بدتر بنا دیا۔ اس نے منتخب اراکین کی تعداد گھٹا کر پچیس کر دی - اور اس طرح ان کی تعداد نامزد اراکین کے برابر ہو گئی۔ بشمول سرکاری صدر نامزد اراکین کو اکثریت حاصل ہو گئی۔ حقیقی عوامی حکومت ختم کر دی گئی۔ کلکتہ کے وہ ممتاز و نمایاں شہری منظر عام سے ہٹ گئے جنھوں نے میونسپلٹی کے کاموں میں عمریں بتا دی تھیں۔ اس رجعت پسندانہ اقدام کے بعد کلکتہ کا انتظام خراب ہو گیا ہے۔ ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی میونسپلٹی کی خود اختیار حکومتیں کمزور ہو گئی ہیں۔

گاؤں اور ضلعوں کی خود اختیار حکومتوں میں بھی کوئی سدھار نہیں کیا گیا۔ ہندوستان کے ان نمائندہ اداروں کی ہمت افزائی نہیں کی گئی جس کی 1880 اور 1884 کی درمیانی مدت میں لارڈ رپن کی حکومت نے داغ بیل ڈالی تھی۔ ان تعلیم یافتہ طبقوں کو مایوسی ہوئی ہے جو انگریزی راج میں اپنے ملک کے انتظام میں زیادہ حصہ لینے کی امیدیں لیے بیٹھے تھے۔ ہندوستان کے زراعت پیشہ لوگوں کی حالت بھی کچھ بہتر نہیں ہے۔ لگان داری کے حقوق کو تقویت نہیں پہنچائی گئی۔ واضح قانون کے ذریعہ سرکاری مطالبوں اور سرکاری اضافوں پر حدود عاید نہیں کی گئیں۔ پنجاب اور

بمبئی میں جوت کے حق انتقال پر پابندیاں عاید کردی گئیں۔ مدراس میں پانی کا محصول ادا کرنا ضروری قرار دیدیا گیا۔ ان تبدیلیوں کا تفصیلی ذکر آئندہ ابواب میں کیا جائے گا۔

ایک اور شدید قحط 1900ء میں پڑا اور چار سال تک ملک کو تباہ کرتا رہا۔ ایک دفعہ پھر بڑے پیمانے پر امدادی کام شروع کیے گئے۔ صوبجات متوسط میں تو وہ کامیاب ہوئے لیکن بمبئی میں بدانتظامی کی نذر ہوگئے۔ جب فیمین کمیشن کی رپورٹ شائع ہوئی تو یہ معلوم ہوا کہ کسانوں کی دائمی قرض داری کی وجہ زمین کے محصول کی وصولی میں برتی جانے والی سختی ہے۔ روپیہ کی قیمت بڑھ جانے کی وجہ سے بھی محاصل میں اضافہ ہوگیا تھا۔

1903ء کی ابتدا ایڈورڈ ہفتم کی تاجپوشی کے اعلان سے ہوئی۔ یہ اعلان دہلی کے دربار میں اس وقت کیا گیا جب ہندوستان ایک شدید قحط میں چار سال سے مبتلا تھا۔ اس دربار میں غیر ضروری نمود و نمائش سے کام لیا گیا اور اس پر بڑی رقم صرف کی گئی۔ سال کا اختتام غیر ضروری اور سفاک جنگ تبت پر ہوا

لارڈ کرزن کے دور حکومت کے آخری برسوں میں خصوصیت کے ساتھ رجعت پسندانہ اقدامات کیے گئے۔ ایک یونیورسٹی ایکٹ بنایا گیا جس نے ہندوستان کے لوگوں کے اُن اختیارات کو کم کردیا جو یونیورسٹیوں کے تعلق سے انھیں پچھلے پچاس سال سے حاصل تھے۔ بنگال تقسیم کردیا گیا تاکہ ملک کے نظم و نسق پر اس ترقی یافتہ صوبے کے لوگوں کا اثر کم ہوجائے۔

انگلستان اور ہندوستان میں 1875 کے لگ بھگ شروع ہونے والے سامراج کے تیس سال 1905 میں اُس وقت ختم ہوتے جب ہندوستان میں لارڈ کرزن نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دیدیا اور انگلستان میں کنزرویٹو حکومت ٹوٹ گئی۔ اس زمانے میں ہندوستان کے لیے ہونے والے سب سے زیادہ مفید کاموں میں پہلا تو لارڈ رپن کا خود اختیاری حکومت کا قیام تھا جو 1882ء میں کیا گیا اور دوسرا لارڈ کرزن کا 1892 کا انڈیا کونسلز ایکٹ۔ INDIAN COUNCIL ACT تھا۔ دوسری طرف اُن تیس سالوں میں تین ایکٹ بنائے گئے جس کی بنا پر ہندوستان کے اخباروں کی آزادی کم ہوگئی، ہندوستان کی سرحدوں کے پار غیر ضروری اور مہنگی جنگیں لڑی گئیں اور تین ایسے قحط پڑے جن کی شدت اور وسعت کی مثال تاریخ پیش نہیں کرسکتی۔ ان کے علاوہ طاعون نے شہر کے شہر اور گاؤں کے گاؤں ویران کردیے۔ ہندوستان کی آمدنی سے حکومت دست بردار ہوگئی۔ اور لنکاشائر کے مفاد میں ہندوستان کے کارخانوں پر محصول لگایا گیا، مال گزاری میں 50 فیصدی اضافہ کیا گیا۔ روپیہ کی قیمت میں اضافہ کرکے عام محاصل میں اضافہ کیا گیا اور فوجی اخراجات میں یورپی ملازمین کی تنخواہوں، گھریلو اخراجات اور قومی قرض میں خاصا اضافہ کیا گیا۔ سامراج کا دور ہندوستان کے لیے ترقی اور خوشحالی کا دور ثابت نہ ہوسکا۔

باب - 4

شمالی ہندوستان کا زرعی نظام

ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ حکومت میں بنگال، شمالی ہندوستان اور پنجاب کی تشخیص مال گزاری کے اصول طے کیے جا چکے تھے۔ ملکہ کی حکومت کے ابتدائی برسوں میں مالکان اراضی اور کسانوں کے تعلقات اُستوار کرنے اور کسانوں کا تحفظ کرنے کے اقدامات بھی کیے جا چکے تھے۔ چنانچہ انیسویں صدی کے آخری پچیس برسوں کی تاریخ چھوٹی چھوٹی کارروائیوں اور اُن اُصولوں کو ترقی و توسیع دینے کی تاریخ ہے۔

بنگال میں 1859 کے بنگال رینٹ ایکٹ کے ذریعے کسانوں کے لگان اور حقوق کا تحفظ کر دیا گیا تھا۔ لیکن مغربی اضلاع (بہار) کے کسانوں کو اُن کارروائیوں سے اتنا فائدہ نہیں پہنچا تھا جتنا مشرقی اضلاع میں رہنے والے اُن کے تیز فہم بھائیوں کو ہوا تھا۔ بیس سال کے تجربے نے ظاہر کر دیا تھا کہ مالکان اراضی کے غیر منصفانہ مطالبوں سے انھیں محفوظ رکھنے کے لیے مزید اقدامات کی ضرورت ہے۔ لارڈ رپن کی حکومت نے یہ مفید کام شروع کیا اور اس کا بوجھ انٹنی میکڈانل کو اُٹھانا پڑا جو اُس زمانے میں بنگال کا ریونیو سکریٹری تھا۔

ان طویل مذاکرات کا ذکر کرنے سے کوئی فائدہ نہیں جن کے بعد مجوزہ کارروائی کی گئی۔ حکومت نے مالکان اراضی کے اعتراضات کو بڑے سکون بلکہ ادب کے ساتھ سنا۔ ضلعوں اور کمشنریوں میں جلسے کیے گئے جن میں مجوزہ کارروائیوں پر غور اور نظر ثانی کی گئی۔ کئی دفعہ بل کے مسودے میں ترمیم و تنسیخ کی گئی۔ بالآخر لارڈ رپن کے ہندوستان سے واپس جانے کے بعد ڈفرن نے اُس کو ایکٹ کی شکل دیدی ٹیننسی ایکٹ

نے، جو 1885 میں منظور کیا گیا تھا، مالکان اراضی کے جائز حقوق کو کم کیے بغیر کسانوں کا ضروری تحفظ کر دیا۔ نئے قانون کے دو خاص مقصد تھے۔ پہلا مقصد یہ تھا کہ جن کسانوں کے ساتھ بندوبست کیا جا چکا تھا انھیں حقدار قبضہ مستقل قرار دیا جائے اور دوسرا یہ کہ غیر دخیلکار کسانوں کا مناسب تحفظ کیا جائے۔

آج کل بنگال کے ہر حصے میں 1793 کے بندوبست استمراری کے مفید نتائج، جس نے مالکان اراضی سے وصول ہونے والے مطالبے پر حدود عاید کر دیے، اور 1859 اور 1885 کے رینٹ ایکٹوں کے مفید نتائج، جنھوں نے کسانوں سے وصول ہونے والے مالکان اراضی کے مطالبوں پر حدود عاید کر دیے، دیکھے جا سکتے ہیں۔ مالکان اراضی کا ایک تعلیم یافتہ اور با اثر طبقہ وجود میں آ گیا ہے جو برطانوی حکومت کا حامی ہے اور بہتر انتظامات کی خاطر ہر قسم کی مدد دینے کو تیار رہتا ہے۔ ایک طاقت ور اور با صلاحیت متوسط طبقہ بھی وجود میں آ گیا ہے جو مالکان اراضی کے تحت مختلف نوعیتوں کے حقوق رکھتا ہے اور ایک ترقی پذیر سماج کی مضبوط کڑی سمجھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ باوسیلہ کسان ہیں جو اپنے حقوق کی حفاظت کر سکتے ہیں اور خشک سالی اور فصلوں کی خرابی کے ابتدائی اثرات کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ لگان کی شرح کم ہے، کسان ساہوکاروں کے غلام نہیں ہیں اور برطانوی حکام بجا فخر کے ساتھ اُس صوبے پر نظر ڈال سکتے ہیں جہاں اُن کی اعتدال پسندی ایک قوم کی زرعی خوش حالی کی ضمانت بن گئی۔

مندرجہ ذیل اعداد و شمار، جو ہم نے ایک حالیہ سرکاری دستاویز سے حاصل کیے ہیں ایسے پودہ ضلعوں میں، جو بنگال کے مختلف حصوں سے تعلق رکھتے ہیں، زمین کی پیداوار سے لگان کے تناسب کو ظاہر کرتے ہیں۔ [1]

ضلع (1)	اوسط پیداوار سے لگان کی نسبت (2)
24 پرگنہ	10 فیصدی
نادیا	7 〃
مدناپور	8 〃
ہگلی	14 〃

---

[1] حکومت بنگال کا خط حکومت ہندوستان کے نام مورخہ 24 جون 1901

(1)	(2)	
بیربھوم	15	فیصدی
باقر گنج	9	"
نواکھالی	9	"
تنپیرہ	9	"
راج شاہی	13	"
گیا	14	"
بالاسور	11	"
مظفر نگر	16	"
کٹک	14	"

آپ دیکھ سکتے ہیں کہ کسی ضلع میں لگان کی شرح پیداوار کی ½ نہیں ہے۔ جیسا کہ حکومت بنگال نے کہا تھا۔" اس نقشے میں دیے ہوئے اعداد بڑی وضاحت کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں کہ بنگال میں لگان اوسطاً زمین کی مجموعی پیداوار کا 11 فیصدی سے کچھ زیادہ ہوتا ہے" حکومت بنگال کی اس خوشگوار یقین دہانی کا مقابلہ جب 1900 کے فیمین کمیشن کی اس دریافت سے کیا جائے تو بڑا افسوس ہوتا ہے کہ گجرات کے صوبے میں جو مال گزاری وصول کی جاتی ہے وہ پیداوار کی 20 فیصدی ہوتی ہے۔ 1864 کے قواعد کی رو سے مال گزاری مجموعی لگان کی دگنی ہونے کے بجائے مجموعی لگان کی نصف ہونی چاہیے۔ حکومت کو بھی مالکان اراضی کے مقابلے میں زیادہ سختی برتنے کے بجائے کسانوں کے ساتھ بہتر سلوک کرنا چاہیے۔

شمالی ہندوستان

مال گزاری کی تشخیص کے طریقے میں ایک صحت مند تبدیلی کی گئی۔ جیسا کہ ایک پچھلے باب میں بتایا جا چکا ہے پہلے تشخیص کی بنیاد قیاسی لگان ہوا کرتا تھا یعنی زمین کی پیداوار کا پرتا پھیلا کر تخمینہ لگا لیا جاتا تھا اُس کے بعد حقیقی لگان کی بنیاد پر مال گزاری تشخیص کرنے کا معقول تر طریقہ اختیار کیا گیا۔ بورڈ آف ریونیو نے 1887 میں جو قاعدے بنائے تھے اُن سے یہ بات واضح ہوگئی تھی۔ ہم ان کے مندرجہ ذیل اقتباسات پیش کر رہے ہیں۔

" ہر گاؤں میں تشخیص مال گزاری حتی الوسع اُس حقیقی لگان کی بنیاد پر کی جاتی ہے جو گاؤں کے

کھاتے میں درج ہوتا ہے اور جس کی بشرط ضرورت درستی کر دی جاتی ہے۔"

"کوئی حاکم بندوبست اس امر کا مجاز نہیں ہے کہ لگان میں آئندہ ہونے والے اضافے اور کاشت میں آئندہ ہونے والی توسیع کی بنیاد پر کھاتے میں قیاسی اندراجات کرے۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ زمانے میں حکومت کا واضح مقصد یہ ہے کہ شمالی ہندوستان میں مال گزاری اُس حقیقی لگان کے نصف تک محدود رہے جو مالکان اراضی آسامیوں سے وصول کرتے ہیں۔ لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس واضح ضابطے پر اُس بندوبست میں بھی عمل نہیں کیا گیا جو 1890 کے بعد مکمل ہوا ہے۔

شمالی ہندوستان کے ایک نمایاں اور محب وطن زمیندار رائے بہادر نہال چند نے، جو صوبائی لیجسلیٹو کونسل کا رکن ہے، اپنی کتاب " مالی پالیسی کے متعلق کچھ یادداشتیں " NOTES ON THE LAND REVENUE میں، جو 1903 میں شائع ہوئی، اِس پر توجہ دلا کر ایک قومی خدمت سرانجام دی ہے، اس بات کی وضاحت کرنے کے لیے کہ اس ضابطے کے عمل درآمد میں اصلاحات کی ضرورت ہے اُس کتاب میں دیے گئے کچھ واقعات پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

تشخیص کی بنیاد ـــــــ تشخیص مال گزاری کی بنیاد زمینداروں کے حقیقی مجموعی لگان ہیں۔ لیکن بورڈ آف ریونیو نے 1901ء میں ایک گشتی چٹھی جاری کی ہے جس میں ہدایت کی گئی ہے کہ مناسب لگان نہ ہونے کی صورت میں حاکم بندوبست درج کھاتا لگان کو رد کر دے اور قیاسی لگان کی بنیاد پر تشخیص کرے۔[1] اس قسم کے ضابطے کا جو اثر پڑا ہوگا وہ ظاہر ہے۔ جو مالک اراضی اپنے اسامیوں کے ساتھ نرمی برتنا چاہتے ہیں انھیں یہ ضابطہ زیادہ سے زیادہ لگان وصول کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ جہاں تک بنگال کا تعلق ہے وہاں مال گزاری کا استمراری تعین کر دیا گیا ہے اور حکومت کو اضافہ لگان میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اس لیے وہاں پچھلے پچاس سال میں بننے والے ہر ایکٹ کا مقصد تھا کہ مناسب لگان برقرار رکھا جائے۔ حکومت نرمی برتنے کے سلسلے میں مالکان اراضی کی ہمت افزائی کرتی ہے۔ اس کے برعکس شمالی ہندوستان میں، جہاں حکومت مال گزاری کی بنیاد لگان کو ٹھیراتی ہے، زمیندار کو نرمی برتنے کی سزا دی جاتی ہے اور اُس سے کہا جاتا ہے کہ وہ یا تو زیادہ سے زیادہ لگان وصول کرے یا اپنی یافت کا نصف سے زیادہ حصہ سرکار کو ادا کرے۔

---

[1] ضابطہ جس کا ذکر آنریبل نہال چند کی یادداشتوں میں کیا گیا۔ ص 11

ایسی صورتوں میں کیا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے اس کو ظاہر کرنے کے لیے یاد داشتوں میں کئی مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ 1892 کے بندوبست کے موقع پر ضلع مظفر پور میں 5644 پونڈ اور ضلع میرٹھ میں 11906 پونڈ کے اضافے کیے گئے۔ بدایوں کے ضلع میں 2714 پونڈ کا اضافہ کیا گیا۔[1] لارڈ کرزن کے اس اعلان کے بعد کہ مال گزاری کی تشخیص کی بنیاد حقیقی مجموعی لگان ہے شمالی ہندوستان کے مالکان اراضی اور کسان بجا طور سے یہ مطالبہ کر سکتے ہیں کہ یہ طریقہ عمل اب ترک کر دیا جانا چاہیے۔

غیر دخیلکاری اراضیات ——— شمالی ہندوستان کے مالکان اراضی کی زمینداریوں کے قابل لحاظ حصوں پر وہ اسامی کاشت کرتے ہیں جنھیں حقوق دخیل کاری حاصل نہیں ہوتے ہیں۔ ایک حصہ پر زمیندار خود اپنے مزدوروں کے ذریعے کاشت کرتا ہے۔ ایک حصہ جنسی لگان پر اسامیوں کو اٹھایا جاتا ہے۔ ایک حصہ بغیر کسی لگان کے بھنگیوں، نائیوں، کمہاروں اور لوہاروں کو اٹھا دیا جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں گاؤں میں رکھنا ضروری سمجھا جاتا ہے تاکہ وہ اپنا آبائی کام کرتے رہیں۔ لیکن حاکم بندوبست کی نظر سے یہ زمینیں بھی نہیں بچ پاتی ہیں۔ چونکہ ان زمینوں کے لگان کی کوئی رقم معین نہیں ہوتی ہے جس کو بنیاد بنایا جا سکے اس لیے قیاسی لگان کی بنیاد پر مال گزاری تشخیص کی جاتی ہے جو اکثر صورتوں میں بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ضلع مظفر نگر میں اُس شرح کے مطابق جس سے دخیل کاری اراضیات کا لگان تشخیص کیا جاتا ہے مالکان اراضی کی جوتوں پر 16565 پونڈ مال گزاری تشخیص کی جانی چاہیئے تھی۔ لیکن اُس کی شرح بڑھا دی گئی اور 23970 پونڈ مال گزاری تشخیص کی گئی۔ ایک واقعہ اور بیان کیا گیا ہے۔ ایک حاکم بندوبست نے یہ فرض کر لیا کہ تشخیص کے لیے 8 شلنگ فی ایکٹر مناسب لگان ہے۔ لیکن جب مالک اراضی نے اس اونچی شرح کے مطابق اپنے اسامی کے خلاف ڈگری حاصل کرنا چاہی تو اس کی درخواست خارج کر دی گئی اور 6 شلنگ 6 پنس فی ایکٹر کے حساب سے ڈگری دی گئی۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ حاکم بندوبست نے لگان کی ڈگری ایک شرح سے دی اور مال گزاری تشخیص کرنے کے لیے زیادہ اونچی شرح فرض کی۔ ایسی غیر جانب دار مال کی عدالتیں نہ ہونے کی صورت میں، جو اُن کے کاموں پر نظر رکھ سکیں اور حکومت اور لوگوں کے درمیان پیدا ہونے والے نزاعی امور کا فیصلہ کر سکیں، حکام بندوبست ناانصافی اور بے اصولی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

جہاں تک زمین کے اُن چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کا تعلق ہے جو گاؤں کے اسامیوں کو لگان کے بغیر

---

[1] پونڈ کو پندرہ روپے کے برابر تسلیم کیا گیا جو اس کی موجودہ قیمت ہے۔

اٹھا دیے جاتے ہیں اُن کے سلسلے میں حکام بندوبست کو لوگوں کے رسم ورواج کا پاس کرنا چاہیے اور اُنھیں مال گزاری سے مستثنیٰ کر دینا چاہیے۔ گاؤں کا لوہار اور گاؤں کا کمہار قدیم زمانے سے گاؤں کے رہنے والوں کی خدمت کرتے رہے ہیں۔ چونکہ اُنھیں کام سے زیادہ یافت نہیں ہوتی ہے اس لیے انھیں زمین کے کچھ ٹکڑے معافی کے طور پر دیدیے جاتے ہیں۔ نائی اور بھنگی کی آمدنی تو اور بھی کم ہوتی ہے۔ اگر انھیں چھوٹی موٹی معافیاں نہ دی جائیں تو وہ گاؤں میں رہ نہیں سکتے ہیں۔ یہ نفیس ادارے ہیں جن کی بر قدیم زمانوں سے گاؤں خودکفیل آبادیاں بنے ہوئے ہیں۔ ان معافیوں کی بنا پر گاؤں کے لوگوں کے چھوٹے چھوٹے کام نکلتے ہیں اور مالکان اراضی ان معافی داروں سے کسی لگان کا مطالبہ نہیں کرتے ہیں۔ ان معافیوں کو مال گزاری سے مستثنیٰ کرنے میں حکومت کو صرف تھوڑا سا نقصان ہوگا[1] لیکن وہ "افسردہ کن ذلالت" کے الزام سے اپنا دامن بچا سکے گی۔ سخت ضابطے ہندوستان کے کئی قدیم و نفیس اداروں کا گلا گھونٹ چکے ہیں۔ کم سے کم گاؤں کے قدیم نائی اور قدیم کمہار کا تو یہ حشر نہ ہونا چاہیے۔

اراضی کی حیثیت میں ترقیاں ——— حکومت بار بار اور زوردار الفاظ میں کہہ چکی ہے کہ کسان اور مالکان اراضی اپنی زمینوں کو جو ترقیاں دیں گے اُن پر محصول نہیں لگایا جائے گا۔ لارڈ کرزن نے ایک حالیہ اعلان میں دوبارہ یقین دلایا ہے کہ حکومت ایسی ترقیوں میں حصّے کا مطالبہ کرنے کے حق سے دست بردار ہو چکی ہے جہاں کسان کی محنت یا سرمائے کی بنا پر زمین کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ ہو چکا[2] یہ نہایت منصفانہ اور اچھا اصول ہے۔ لیکن اس پر پوری طرح عمل نہیں کیا جاتا ہے۔ حکام بندوبست پیداوار یا لگان کے اضافے کے اُس حصّے کا تعین نہیں کرتے ہیں جو ترقی کی وجہ سے وجود میں آتا ہے اور اُسے مال گزاری سے مستثنیٰ قرار نہیں دیتے ہیں۔ ہندوستان کے ہر صوبے کا تجربہ، چاہے وہ بمبئی ہو، مدراس ہو، یا شمالی ہندوستان ہو، یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس منصفانہ ضابطے کی خلاف ورزی کی جاتی ہے۔

ضلع مظفر نگر کے حاکم بندوبست نے لکھا ہے: "اُن کنوؤں سے آبپاشی کرنے کی بنا پر زمینداری

---

[1] مثال کے طور پر ضلع مظفر نگر کو لیجیے 1893 میں کل 7,01,431 ایکڑ پر مال گزاری تشخیص کی گئی۔ اس میں 5669 ایکڑ معافی کی زمین شامل تھی جس سے 5669 سے زیادہ پیشہ ور خاندانوں کی پرورش ہوتی تھی۔

[2] تجویز مورخہ 16 جنوری 1902

کی قیمت میں جو اضافہ ہوا ہے اس کو مستثنیٰ کرنا ممکن نہیں ہے۔ یہ توقع غلط ہے کہ ضابطوں میں دیے ہوئے طریقوں کے مطابق چھوٹے چھوٹے زمیندار اپنے دعووں کی حمایت میں ثبوت فراہم کر سکیں گے۔ بڑے زمیندار بھی ایسا نہیں کر سکتے ہیں۔ معاوضے کی درخواست پیش کرتے وقت جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ وہ ثابت کریں کہ اضافہ شدہ لگان ادا کرنے کی وجہ زمین کی ترقیاں ہیں تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ اُن کے مقابلے میں حکام بندوبست اس موضوع کے متعلق زیادہ معلومات رکھتے ہیں۔ چونکہ لگان میں اضافے کئی صورتوں میں کیے جاتے ہیں اور اُن کے متعلق یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے اس لیے اضافے کی بنا پر زمین کی ترقیوں کی قیمت کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ اسی کے ساتھ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ لگان کا اضافہ لازمی طور سے زمین میں ہونے والی ترقی کا نتیجہ نہیں ہوتا ہے۔"[1]

خط ہم نے لگایا ہے ——— بندوبست تیس سال کے بعد کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ اُس مدت میں زمیندار یا اُس کے مرحوم باپ نے اپنی زمینداری میں تیس کنویں تعمیر کیے ہوں، کچھ سڑکیں بنوائی ہوں کچھ جنگل صاف کرایا ہو اور کچھ غرقی کی زمین قابل کاشت بنائی ہو۔ یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ اُسی مدت میں حکومت نے زمینداری کے قریب ریلوے لائن تعمیر کی ہو اور زمینداری سے ایک نیا راج بہا نکالا ہو جس کی بنا پر کچھ کنویں بے کار ہو گئے ہوں۔ اُسی زمانے میں ممکن ہے کہ روپے کی قیمت کم ہو گئی ہو، پھر بڑھ گئی ہو اور پھر کم ہو گئی ہو، اور روپے کی قیمت میں کمی زیادتی ہونے کی بنا پر اور اُس کے بقدر فصلوں کی قیمتیں بھی گھٹی بڑھی ہوں گی۔ اُن تمام باتوں کا اثر لگان پر پڑا ہوگا اور اُس کی وہ رقم ہو گئی ہو گی جو بندوبست کے وقت تھی۔ کوئی مالک اراضی کس طرح ثابت کر سکتا ہے کہ تیس سال کی مدت میں اضافے کا کتنا حصہ اُن ترقیوں کی بنا پر ہوا جو اُس نے یا اُس کے باپ نے کیں اور کتنا دوسری وجوہ کی بنا پر۔ وہ اس کو ثابت نہیں کر سکتا ہے اور حکومت قریب قریب وہ تمام منافعے ہڑپ کر جاتی ہے جو اُن ترقیوں کا نتیجہ ہوتے ہیں جو زمیندار اور کسان اپنی زمینوں کو دیتے ہیں۔ مظفرنگر کے بندوبست میں، جو 1892 میں ہوا تھا، سرکاری مطالبے میں 20,000 پونڈ کا اضافہ کیا گیا اور حاکم بندوبست نے ترقیوں کے لیے 1,074 پونڈ کی حقیر رقم منظور کی۔ مال کی غیر جانب دار عدالتیں قایم کرنے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اُن کی بنا پر کسان اور زمیندار اپنی محنت کے پھل حاصل کر سکیں گے۔ تھوڑی تھوڑی مدت کے بعد بندوبست کرنے کا طریقہ، جس کی بنا پر ریاست اُن ترقیوں کا منافع حاصل کر لیتی ہے جو بھی مالکان اپنی زمینوں کو

---

[1] مظفرپور کے بندوبست کی رپورٹ مورخہ 21 ستمبر 1892 / پیراگراف 158

دیتے ہیں، زمینوں کو ترقی دینے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوگا

بندوبست کی کارروائیوں میں برتی جانے والی رازداری

ٹامس مرٹنس برڈ نے ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کے سامنے بڑی تفصیل کے ساتھ اُس طریقے کو بیان کیا تھا جو اُس نے ان عظیم بندوبستوں میں استعمال کیا تھا جو 1842 اور 1833 کی درمیانی مدت میں شمالی ہندوستان میں کیے گئے تھے۔ اُس کی پالیسی یہ تھی کہ گاؤں کے لوگوں سے ملا جائے۔ اُن سے مشورہ کیا جائے، اُن سے روز تبادلہ خیال کیا جائے اور اُنھیں کی جانے والی تشخیص پر رضامند کر لیا جائے ابھی وہ لوگ زندہ ہیں جنھوں نے مدراس میں اُس کے نفیس طریقہ کار پر اُس وقت عمل کیا جب 1861 کے بعد اُس صوبے کی پیمائش اور بندوبست کیا جا رہا تھا۔ لیکن اب حالات بدل گئے ہیں۔ اب شمالی ہندوستان میں بندوبست کی کارروائیوں کو ریاست کی خفیہ کارروائیوں کی حیثیت حاصل ہے۔ ان کارروائیوں کے ذریعے جن لوگوں کی قسمتوں کا فیصلہ کیا جاتا ہے اُنھیں ان کارروائیوں کے متعلق معلومات حاصل کرنے سے سختی سے باز رکھا جاتا ہے۔ اُن سے مشورہ نہیں کیا جاتا ہے، اُنھیں واقعات پیش کرنے کا موقع نہیں دیا جاتا ہے۔ اور انھیں کی جانے والی کارروائی کے متعلق کچھ بتایا نہیں جاتا ہے۔ لگان کا تعین اور درستی حاکم بندوبست کرتا ہے، تشخیص مال گزاری حاکم بندوبست کرتا ہے اور لوگوں سے مشورہ کیے بغیر رازداری کے ساتھ حاکم بندوبست رپورٹ تیار کرتا ہے اور اعلیٰ حکام کو پیش کرتا ہے۔ رپورٹ منظوری کے لیے کمشنر کو بھیجی جاتی ہے۔ لوگوں کو اس کے متعلق کچھ نہیں معلوم ہوتا ہے۔ وہ نتائج کا انتظار کیا کرتے ہیں جب نئی تشخیص کی منظوری بورڈ سے حاصل کر لی جاتی ہے تو حاکم بندوبست حیران و پریشان زمینداروں کو اُن کی زمینداریوں پر تشخیص ہونے والی اُس مال گزاری سے مطلع کرتا ہے جو اُنھیں آئندہ ادا کرنی ہوگی۔

فرض کیجیے زمیندار نئی تشخیص کے خلاف احتجاج کرنا بھی چاہے تو وہ کس کے سامنے اپنے اعتراضات پیش کرے۔ کیا وہ کمشنر اور بورڈ کا دروازہ کھٹکھٹائے جو پہلے ہی بندوبست کی منظوری دے چکے ہیں

لہ میں ایک ایسے شخص کا نام پیش کر سکتا ہوں جس کی عزت کی جاتی ہے۔ وہ ہے آر۔ کے۔ پکل سی۔ ایس آئی جو ریٹائر ہو کر لندن میں رہتا ہے۔ جس صوبے میں وہ کام کر چکا ہے وہاں ایک ہمدرد حاکم کی حیثیت سے اُس کی شہرت اور ہر دلعزیزی اب بھی تازہ ہے۔

اور بندوبست کی کارروائی میں حاکم بندوبست کے ساتھ خود بھی شریک ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات انصاف سے بعید ہے کہ تشخیص مال گزاری کے خلاف پیش ہونے والی اپیلیں وہ سنیں۔ وہ اُس بندوبست میں کوئی بڑی تبدیلی اپنے فیصلے پر خط نسخ کھینچے بغیر مشکل ہی سے کر سکتے ہیں جس کو وہ غور و خوض کے بعد منظور کر چکے ہیں۔

غیر جانب دار عدالتوں یعنی ایسے ججوں کو جو مال کے کاموں کا تجربہ رکھتے ہوں یہ اعتراضات سننے کا اختیار کیوں نہ دیا جائے؟ شمالی مغربی صوبجات کی حکومت نے اس کے جواب میں کہا کہ اس قسم کی غیر جانب دار عدالتیں یا مال کی عدالتیں اگر قایم کی گئیں تو "اُن کا اثر حکومت کی مالی حالت پر پڑ سکتا ہے۔"[1] یہ دلیل حالانکہ سر انٹنی میکڈانل جیسے اعلیٰ حاکم نے پیش کی ہے پھر بھی ہم اس کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ظاہر ہے کہ اُس کا مفہوم یہ نہیں ہو سکتا کہ مالی بہتری کے پیش نظر حکام مال ضابطوں کا غیر منصفانہ استعمال کرتے ہیں۔ یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ اعلیٰ حیثیت اور اچھی شہرت رکھنے والے انگریز جج مالی فائدے کے لیے ضابطوں کی غلط تشریح کریں گے۔ پھر بھی تشخیص کرنے والے حکام کا اپنی کارروائیوں کے خلاف اپیل سننے کو حق بجانب قرار دینے کے لیے مندرجہ بالا باتوں میں سے کسی نہ کسی کو تسلیم کرنا ناگزیر ہے۔ ہندوستان کے لوگ انصاف چاہتے ہیں منصفانہ کارروائی سے برطانوی حکومت کے وقار کے علاوہ مالیات کو بھی تقویت پہنچے گی۔ لوگوں کا مطالبہ ہے کہ زمینداریوں پر تشخیص ہونے والی مال گزاری کی کارروائی میں شروع سے مال گزاری کا مشورہ شامل ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ تشخیص مال گزاری کے خلاف اپیل سننے کا اختیار تشخیص کنندگان کے بجائے دوسری عدالتوں کو حاصل ہونا چاہیے۔

مقامی محاصل

ہم ایک پچھلے باب میں اُن خصوصی محاصل کا ذکر کر چکے ہیں جو مال گزاری کے علاوہ زمین پر لگائے گئے تھے اور جن کی وجہ سے نصف لگان کا قاعدہ قریب قریب ختم ہو گیا تھا۔ شمالی ہندوستان میں سڑکوں اور اسکولوں کے لیے مال گزاری پر ۹ فیصدی ابواب وصول کیے جاتے ہیں، 2 فیصدی رقم قحط کے خلاف بیمے کے طور پر وصول کی جاتی ہے اور پٹواری اور دوسرے گاؤں کے کارکنوں کے لیے 4 فیصدی رقم اس کے علاوہ وصول کی جاتی ہے۔ یہ رقم مال گزاری کی 16 فیصدی یا مجموعی لگان کی 8 فیصدی ہوتی ہے۔ یہ رقم اُس رقم کے علاوہ ہے جو رواج کے مطابق قدیم زمانے سے گاؤں کے چوکیدار اور مکھیا کو ادا کی جاتی ہے۔ 1872ء تک طریقہ یہ تھا کہ مقامی مقاصد کے لیے مال گزاری کا ایک حصہ مخصوص کر دیا جاتا تھا۔

---

[1] حکومت ہند کے نام خط مورخہ 22 دسمبر 1900

اُس صوبے کے قابل اور ہمدرد حاکم سر ولیم میور نے بڑی وضاحت کے ساتھ یہ اصول بیان کیا تھا کہ " لفٹننٹ گورنر کے خیال میں صحیح اصول وہ ہے جس پر اس صوبے میں عمل کیا جاتا ہے یعنی مال گزاری کا ایک معینہ جز مقامی مقاصد کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔ ہر بندوبست کے موقع پر اس اصول پر عمل کیا جاتا ہے اور مجموعی مطالبے کا گیارھواں حصہ یا مرکزی حکومت کی مال گزاری کا دسواں حصہ محکمہ مال، محکمہ پولیس، ضلع کی سڑکوں، ضلع کی ڈاک، دیہی تعلیم اور حفظان صحت کے کاموں یعنی اُن کاموں کے لیے مخصوص کر دیا جاتا ہے جو ملک کے اعلیٰ مالک اراضی کی حیثیت سے حکومت کے فرائض میں بڑی حد تک شامل ہیں۔" [1]

لیکن ایک واضح حکم کے ذریعے یہ طریقہ 1872ء میں ختم کر دیا گیا۔ " مالکان سے کیے جانے والے ان معاہدوں کا طریقہ ختم کر دیا جائے جن کی رو سے مقامی محاصل مال گزاری کے ایک جُز کی حیثیت سے ادا کیے جاتے ہیں۔" [2] ضابطے میں ہونے والی اس تبدیلی کا جو اثر ہوا ہوگا وہ ظاہر ہے۔ جب تک زمین پر لگنے والے مقامی محاصل " مال گزاری کا جز" سمجھے جاتے تھے اُس وقت تک وہ بجا طور سے نصف لگان کے سرکاری مطالبے میں شامل کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن 1872ء کا ضابطہ بنا کر حکومت نے نصف لگان کے سرکاری مطالبے کے علاوہ مزید محاصل لگانے شروع کر دیے۔ سرکاری مطالبے کی شرح بھی 10 فیصدی سے بڑھا کر 16 فیصدی کر دی گئی۔ روپیہ کی قیمت ایک شلنگ چار پینس مقرر کر کے بہت فائدہ اٹھایا گیا ہے اور لوگ بجا طور سے یہ مطالبہ کر سکتے ہیں کہ دیانت داری کے ساتھ نصف لگان کے ضابطے کی پیروی کی جانی چاہیے اور زمین پر تشخیص ہونے والا مجموعی مطالبہ حقیقی لگان کے نصف سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔

قوانین

شمال مغربی صوبجات کے لیے، جو اب صوبہ آگرہ کہلاتا ہے، 1873 میں ایک رینٹ ایکٹ بنایا گیا تھا جس کی ترمیم و تالیف 1881 میں کی گئی جب لارڈ رپن ہندوستان کا وائسرائے تھا۔ صوبہ اودھ کے لیے ایک رینٹ ایکٹ 1876 میں بنایا گیا۔

---

[1] دستورالعمل مرتبہ اسمتھ، ص 293

[2] ریونیو بورڈ کی گشتی چٹھی مورخہ 13 جولائی 1872

پنجاب

لیکن پنجاب میں اس قسم کی تبدیلیاں ہوئیں جن پر اعتراض کی گنجائش ہے۔ تیس سالہ بندوبست کا مفید ضابطہ منسوخ کر دیا گیا جس کی بنا پر مالکان اراضی اور کسانوں کی ایک پوری نسل کو نظرثانی کے بعد چین کا سانس لینے کا موقع ملا کرتا تھا اور 1895 میں بندوبستوں کی مدت کم کر کے بیس سال کر دی گئی۔ حق انتقال پر بندش عاید کرنے کے لیے 1901 میں ایک ایسا قانون بنایا گیا جس کی افادیت مشکوک ہے۔

اس کتاب کے ایک ابتدائی باب میں ہم بتا چکے ہیں کہ 1849 میں ہونے والے الحاق کے بعد پنجاب کے سرداروں اور لوگوں کے قائدین کے ساتھ منصفانہ برتاؤ نہیں کیا گیا تھا۔ اُس وقت سے وہ صوبہ چھوٹے چھوٹے مالکان اراضی پر مشتمل ہے جو زیادہ تر اپنی زمینیں خود جوتا کرتے ہیں اور کبھی کبھی شکمیوں کو اٹھا دیا کرتے ہیں۔ اس کے بعد 1887 میں ایک نیا ٹیننسی ایکٹ بنایا گیا۔ 1891 میں صوبے کا تقریباً 54 فیصدی رقبہ ان کے زیر کاشت تھا لیکن 1900 میں وہ رقبہ گھٹ کے 45 فیصدی رہ گیا۔ لوگ یہ محسوس کرنے لگے کہ زمینیں صوبے کے قدیم اچھے اچھے خاندانوں اور اُن جفاکش کسانوں کے ہاتھوں سے نکل رہی ہیں جو انھیں پہلے جوتا کرتے تھے۔ پرانے خاندانوں میں بڑے لڑکے کے حق وراثت کو فروغ دینے کے لیے ڈیسنٹ آف جاگیرز ایکٹ DESCENT OF JAGI. ACL بنایا گیا۔ اس کے علاوہ لینڈ ایلی نیشن ایکٹ LAND ALIENATION ACT بنایا گیا تاکہ قدیم قبیلے زمین سے محروم نہ ہو جائیں۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے اس دوسرے ایکٹ کی افادیت مشکوک ہے۔ یہ ایکٹ صوبے کے لفٹنٹ گورنر کی مرضی کے خلاف بنایا گیا تھا۔ اس کا معاشی نتیجہ یہ ہوا کہ زمین کی قیمت فروخت گر گئی اور اُن قبائل کو کوئی فائدہ نہیں ہوا جن کو فائدہ پہنچانے کے لیے اس کو منظور کیا گیا تھا۔

"پنجاب میں محاصل زمین کی سالانہ قیمت (لگان) کی $12\frac{1}{2}$ فیصدی تک محدود ہیں جس کو مال گزاری کا دگنا بتایا جاتا ہے۔ لیکن عام طور سے مال گزاری مالیت (لگان) کی 50 فیصدی سے کم، بہت ہی کم، ہوتی ہے اور زیادہ تر ضلعوں میں محاصل سالانہ قیمت کے 11 فیصدی سے زیادہ نہیں ہوتے ہیں۔"[1] لیکن آگرہ اور اودھ کے مقابلے میں یہ شرح بھی زیادہ ہے اور سرکاری مطالبے کو زمین کے نصف لگان تک محدود رکھنے کے ضابطے کی ضرورت دوسرے صوبے کے مقابلے میں پنجاب میں زیادہ محسوس کی جاتی ہے۔

---

[1] "ہندوستان کی اخلاقی اور مادی کیفیت اور ترقی" MORAL AND MATERIAL PROGRESS AND CONDITIONS OF INDIA 1901,2

باب - 5

صوبجات متوسط کا زرعی نظام

1863 کے عظیم بندوبست نے جن تین اصولوں کو واضح جنم دیا وہ تھے۔

1- صوبے کے مال گزاروں کے حقوق ملکیت کو تسلیم کیا جائے۔

2- سرکاری مطالبہ نصف لگان تک محدود کر دیا جائے۔

3- بندوبست تیس سال کی طویل مدت کے لیے کیا جائے۔

حقوق ملکیت کو قطعی اور غیر مشروط انداز سے تسلیم کیا گیا تھا۔ نئے حقوق کو وجود میں نہیں لایا گیا تھا بلکہ حکومت نے اُس صورت حال کو تسلیم کر لیا تھا جو مدتوں سے پائی جاتی تھی۔ مال گزار قریب قریب مالکان اراضی ہوا کرتے تھے، اُنھیں مالکان اراضی کے تقریباً سب اختیارات حاصل تھے اور حکومت نے 1863 کے بندوبست کے وقت اُن کی اس حیثیت کو تسلیم کر لیا تھا۔ یہ بات اُن اقتباسات سے واضح ہو جائے گی جو ہم قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

مال گزاروں کے حقوق ملکیت

شمال۔مغربی صوبجات کی حکومت کے سکریٹری نے 1853 میں اعلان کیا تھا "جہاں تک بندوبست کے عام اصولوں کا تعلق ہے مجھے یہ بتانے کی ہدایت کی گئی ہے کہ سرکار نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ بندوبست واضح یا تقریباً واضح حق ملکیت کی بنیاد پر کیا جائے گا بشرطیکہ یہ حق بحد یقین و اعتماد ثابت کیا جا سکے۔ اس کا اصل مقصد یہ

ہوگا کہ معینہ حقوق یا مطالبات یا مفادات کو اُس شکل میں تسلیم کیا جائے جس میں اُن کی تشکیل ہوتی ہے اور اُنھیں سرکاری حکام کی من مانی توجیہات اور شر انگیز کارروائیوں سے محفوظ رکھا جائے"۔ [1]

1863 کے ضابطہ بندوبست میں جو خلاصے بطور ضمیمہ شامل کیے گئے تھے اُن میں اس اعلان کو دہرایا گیا تھا: "قطعی حقوق ملکیت کو تسلیم کرنے سے ابھی تک گریز کیا جا رہا تھا۔ لیکن وہ حقوق بہر حال موجود تھے اور انھیں اب تسلیم کیا جانا چاہیئے۔ اصل مقصد یہ ہے کہ معینہ حقوق یا مطالبات یا مفادات کو اُس شکل میں تسلیم کیا جائے جس میں اُن کی تشکیل ہوتی ہے۔

"آئندہ کی نزاع یا مقدمہ بازی سے بچنے کے لیے حکام بندوبست کو باضابطگی اور مصلحت کے پیش نظر اُن حقوق کو تسلیم اور اُن کی تشہیر کرتے وقت "عطا کیے گئے" کے الفاظ استعمال کرنا چاہیں"۔ [2]

افسوس کی بات یہ ہے کہ 1863 کے بندوبست کے موقع پر جو واضح اصول مرتب کیے گئے تھے۔ انھیں بعد میں نظر انداز کر دیا گیا۔ 72-1871 میں جب کرنل کیٹنگس COLONEL KEATINGS صوبجات متوسط کا چیف کمشنر مقرر کیا گیا تو سر رچرڈ ٹیمپل کے زمانے کے جذبات ہمدردی معدوم ہو گئے۔ عام طور سے یہ سمجھا جانے لگا کہ کسانوں سے وصول ہونے والا لگان ریاست کا حق ہے اور مال گزار پاردنیو ہے جس کو حکومت نے یہ حق "عطا کیا ہے" جو منسوخ کیا جا سکتا ہے۔ کرنل کیٹنگس کو رعیت داری کا طریقہ پسند تھا وہ زمینداری کے اُس طریقے کو ناپسند کرتا تھا جو صوبجات متوسط میں نشو و نما پا رہا تھا اور 1863 میں تسلیم کیا جا چکا تھا۔ چنانچہ تجویز پیش کی گئی کہ وجود میں آنے والے زرعی نظام کے ڈھانچے کو توڑ دیا جائے، صوبجات متوسط کے کسانوں کو براہ راست ریاست کے تحت لے آیا جائے اور مال گزاروں کو ایسے سرکاری ملازمین کی حیثیت دے دی جائے جنھیں ریاست اجرت ادا کرے۔

ناگپور کی کمشنری کا کمشنر مسٹر پیڈر MR. PADDAR بھی رعیت داری طریقے کو ترجیح دیتا تھا لیکن اُس نے صوبجات متوسط میں اس قسم کی تبدیلی کرنے کے خلاف آواز بلند کی جو بد عہدی کے مترادف تھی۔ اس موضوع پر اُس نے جو تفصیلی خط لکھا تھا اُس کے کچھ ٹکڑے اس قابل ہیں کہ قارئین کی سامنے پیش کیے جائیں۔

"ہمارا خیال ہے کہ جن لوگوں کے ساتھ بندوبست کیا جا چکا ہے اُنھیں یہ توقع کرنے کا پورا حق حاصل ہے کہ اُس کے عام اصولوں کو منظوری دی جائے گی۔ حکومت نے اس کمشنری میں باضابطہ طور سے مال گزاری

---

[1] ریونیو بورڈ کے نام خط مورخہ 30 نومبر 1853

[2] 1863 کے ضابطہ بندوبست کے گشتی احکام میں بطور ضمیمہ شامل ہونے والے خلاصے، ص۔ ۳۵

کا طریقہ رائج کردیا ہے۔ چیف کمشنر (سر رچرڈ ٹیمپل) نے دربار عام میں اپنی زبان سے اس طریقے کی تشریح کی تھی اور اس کو رائج کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ مختلف دعووں کے متعلق تفتیش و تحقیق کرنے کے بعد انھیں باضابطہ طور سے حقوق ملکیت عطا کیے گئے ہیں۔ اس یقین دہانی کی بنا پر اُن میں سے کچھ نے ذمہ داریاں قبول کرلی ہیں۔ اس لیے ہمارا خیال ہے کہ اب ہم صرف اتنا کرسکتے ہیں کہ موجودہ طریقے کی جزئیات میں کچھ ترمیمیں کردیں۔

"اس دلیل کی بنا پر ہم اُس طریقے کو رائج کرنے کی بھی مخالفت کرسکتے ہیں جس کی سفارش حکومت ہند کے مراسلے کے پیراگراف 20 میں کی گئی ہے۔ اگر ہم اُس تمام واجب الوصول رقم کو حکومت کی آمدنی سمجھیں جو کسان زمانہ بندوبست میں وجود میں آنے والی جوتوں کے لگان کی حیثیت سے ادا کرتے ہیں اور مقدم کو اُس کے ایک جز اور اُن بنجروں پر تشخیص ہونے والے لگان کا حقدار سمجھیں، جو مدت بندوبست میں زیر کاشت لائے گئے، تو اس کے معنی ہوں گے کہ ہم پچھلے طریقے کو پھر رائج کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ طریقہ بہتر ہے۔ لیکن اس سے موجودہ بندوبست کے اصول میں بنیادی تبدیلی ہوجائے گی اور مال گزار اس کو بدعہدی سے تعبیر کریں گے۔ اُن کی حیثیت ایسے مالکان اراضی کے بجائے، جو اپنے گاؤں کی نصف آمدنی مال گزاری کے طور پر حکومت کو ادا کرتے ہیں، ایسے موروثی ملازموں کی ہوجائے گی جنھیں حکومت اجرت ادا کرتی ہے۔" [1]

اس خط نے رعیت واری کے تعلق سے صوبجات متوسط کے چیف کمشنر کرنل کیٹنگس کی خواہشات پر پانی پھیر دیا ہوگا۔ اُس نے یہ خط حکومت ہند کو بھیج دیا۔ مسٹر پیڈر کی تجویز کردہ ترمیمیں اُس نے منظور کرلیں لیکن اُسی کے ساتھ یہ سفارش کی کہ 1863 کے بندوبست کے خاص خاص اصول برقرار رکھے جائیں۔ حکومت ہند جھک گئی اور مال گزاروں کے حقوق ملکیت بحال و برقرار رکھے گئے۔ لیکن مال گزاروں کو اس کا حق دیا گیا کہ وہ اگر چاہیں تو موروثی ملازموں کی حیثیت اختیار کرسکتے ہیں [2] یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ مال گزاروں نے اس حق سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ مکھی نے مکڑی کے گھر میں داخل ہونے سے انکار کردیا۔

سمبل پور کا رعیت واری طریقہ

شورشوں کی بنا پر سمبل پور کا ضلع اُس بندوبست میں شامل نہیں کیا جاسکا جو 1868ء میں شروع ہوا تھا۔

---

[1] مراسلہ مورخہ ' اپریل 1872 پیراگراف 28 اور 29

[2] حکومت ہند کی تجویز مورخہ 21 جون 1875

چنانچہ کرنل کیننگس کو وہاں من مانی کرنے کا موقع مل گیا۔ اس ضلع میں مال گزاری بندوبست کرنے کے متعلق سر رچرڈ ٹیمپل احکامات جاری کر چکا تھا۔ لیکن اُن پر عمل نہیں ہو پایا تھا۔ سر رچرڈ ٹیمپل نے 1863ء میں سمبل پور کے دورے کے موقع پر ایک دربار عام میں مجوزہ بندوبست کے اصولوں کا اعلان کیا تھا لیکن اُس کا جانشین دربار میں کیے جانے والے اعلان کا پابند نہیں تھا۔ کرنل کیننگس کے ہاتھ ایک سادہ صفحہ لگا اور اس نے سادہ صفحے پر رعیت واری بندوبست لکھ دیا۔ حقوق ملکیت سے انکار کیا گیا اور اُنھیں موقوف کر دیا گیا۔ مال گزاروں کو گاؤں کے پٹے داروں کی حیثیت دے دی گئی۔ معاوضے کے طور پر اُنھیں اجازت دی گئی کہ وہ مال گزاری ادا کیے بغیر اپنی جوتوں پر قابض رہ سکتے ہیں۔ اُن کو مزید اجازت دی گئی کہ وہ اُن بنجروں کا لگان اپنے استعمال میں لا سکتے ہیں جنھیں بندوبست کی مدت میں زیر کاشت لایا گیا ہے۔ سر رچرڈ ٹیمپل کے اس دعوے کے پیش نظر کہ انھیں مالک سمجھا جائے گا صرف بھوگرا زمینوں کا انھیں مالک تسلیم کر لیا گیا۔ حالانکہ بندوبست صرف بارہ سال یعنی 1876ء سے 1888ء تک کی مدت کے لیے کیا گیا تھا لیکن سمبل پور کے ضلع میں آج تک رعیت واری طریقہ رائج ہے۔

افسوس کی بات تو یہ ہے کہ غیر سائنسی حکومت میں نہ صرف سیکڑوں اور ہزاروں بلکہ کبھی کبھی لاکھوں انسانوں کی قسمتوں کا فیصلہ ایک حاکم کی رائے پر منحصر ہوتا ہے۔ کئی سال کے غور و خوض کے بعد فیصلہ کیا گیا تھا کہ صوبجات متوسط میں مال گزاری طریقے کو رواج دیا جائے۔ اس کی بنیاد ملک میں پائے جانے والے رسم و رواج پر قایم تھی۔ اس کو لارڈ کیننگ کی حکومت اور سر رچرڈ ٹیمپل کی منظوری حاصل ہو چکی تھی۔ خیال تھا کہ اس کی بنا پر لوگوں کی زرعی دولت میں اضافہ ہوگا۔ صوبجات متوسط کے زیادہ حصّوں میں اس کو رائج کیا جا چکا تھا۔ سمبل پور کے دربار عام میں اس کا وعدہ کیا جا چکا تھا۔ ضلع کے لوگ اس کے خواہش مند تھے اور اس کی مانگ کر رہے تھے۔ لیکن ایک فرد واحد یعنی کرنل کیننگس چاہتا تھا کہ وعدہ خلافی کی جائے اور سمبل پور میں رعیت واری بندوبست کیا جائے۔ لوگوں کو اس کی سفارشات کا علم نہیں تھا۔ اُن سے مشورہ کیے بغیر وائسرائے کی کونسل نے منظوری دے دی اور سمبل پور میں رعیت واری بندوبست کر دیا گیا۔ ہر غیر جانب دار شخص پوچھ سکتا ہے آیا کہ کیا حکومت کا یہ طریقہ سمجھ داری پر مبنی سمجھا جا سکتا ہے اور کیا حکومت اس طرح ہر دلعزیز ہو سکتی ہے۔ کیا اس سے قوم کو خوش حال اور ہندوستان کی برطانوی حکومت کو مستحکم بنایا جا سکتا ہے۔

لگان

ایک ٹیننسی ایکٹ 1883 میں بنایا گیا۔ اس میں مندرجہ ذیل کسانوں کو تسلیم کیا گیا تھا :-

(1) مقدار قبضہ مستقل اسامی جس کو جملہ حقوق انتقال حاصل ہوں اور جس کا لگان حاکم بندوبست دس سال کے لیے معین کردے۔ (2) دخیل کار اسامی جس کو چند حالتوں میں حق انتقال حاصل ہو اور جس کا لگان حاکم بندوبست دس سال کے لیے معین کردے۔ (3) معمولی یا غیر دخیل کار اسامی جو زمیندار کی اجازت سے حق انتقال استعمال کرسکے اور جس کا لگان سات سال کے لیے معین کیا جائے۔ اس ایکٹ کا مقصد وہی تھا جو بنگال اور شمالی ہندوستان کے ٹیننسی ایکٹوں کا تھا یعنی کسانوں کا تحفظ۔ لیکن اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت مال گزاروں کے حقوق ملکیت کو پوری طرح تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ بنگال اور شمالی ہندوستان کے مالکان اراضی قانون کی حدود میں رہتے ہوئے اپنے کسانوں سے تصفیے کیا کرتے تھے۔ لیکن صوبجات متوسط میں حاکم بندوبست مداخلت کرتا تھا اور کسانوں سے مالکان اراضی کو ادا کیے جانے والے لگانوں کا تصفیہ کیا کرتا تھا۔ بنگال اور شمالی ہندوستان کے مالکان اراضی اور کسانوں کو اپنے معاملات طے کرنے کی صحت مند آزادی حاصل تھی۔ لیکن صوبجات متوسط میں مداخلت کا غیر صحت مند طریقہ رواج پا گیا تھا۔ شمالی ہندوستان کے حوالے سے سر انٹنی میکڈانل نے کہا ہے: "سرکاری مال گزاری تشخیص کرنے کی خاطر ہم اپنی طرف سے بنیاد قایم نہیں کرتے ہیں۔ ہم اُن حقیقی واقعات کی بنیاد پر کارروائی کرتے ہیں جو لگان کے عام قانون اور اُن تصفیوں کی بنا پر وجود میں آتے ہیں جو زمیندار اپنے کسانوں کے ساتھ کرتا ہے"[1] لیکن صوبجات متوسط میں لگان کے عام قانون پر عمل نہیں کیا جاتا ہے۔ حاکم بندوبست مداخلت کرتا ہے اور مالکان اراضی اور کسانوں کے درمیان تصفیے کرواتا ہے۔ اس شر انگیز مداخلت کی بنا پر زمیندار کے ہاتھ کمزور ہوتے ہیں اور حق لگان داری مجروح ہوتا ہے۔ چونکہ صوبجات متوسط کے مال گزار کے لگان کا تصفیہ سرکاری افسر کرتا ہے اس لیے وہ زمیندار کے فرائض اور ذمہ داریوں کو محسوس نہیں کرتا ہے۔ وہاں کے کسان اتنے آزاد اور خود اعتماد نہیں ہوتے ہیں جتنے بنگال کے کسان ہوتے ہیں۔ وہ اپنے حقوق سے واقف نہیں ہیں اور اُن کا تحفظ نہیں کر پاتے ہیں۔ صوبجات متوسط میں زمیندار اور کسان دونوں کو ضرورت سے زیادہ مشفقانہ اور بزرگانہ قانون نے کمزور بنا دیا ہے، انھیں وہ تربیت حاصل کرنے کا موقع نہیں دیا ہے جو مالک اپنی جائیداد سے حاصل کرتے ہیں، لوگوں کی قوت مدافعت کو کمزور بنا دیا ہے اور اُن میں قحط یا زمانہ قلت کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں چھوڑی ہے۔ زراعت پیشہ لوگوں میں بددلی پیدا کرنے کا آسان نسخہ یہ ہے کہ حکومت زراعت کے روزمرہ کے کاموں میں غیر ضروری مداخلت کرے۔ صحیح پالیسی وہ ہے جس نے بنگال اور شمالی

---

[1] کرنسی کمیٹی کے سامنے دی جانے والی شہادت، جلد اول، ص 211

ہندوستان میں شاندار کامیابی حاصل کی۔ قانون کے ذریعے کسان کا مناسب و معقول تحفظ کیا جائے اور اُس کے بعد اُس کو ایسا ذمہ دار انسان سمجھا جائے جو اپنے پاؤں پر کھڑا ہو کر زمیندار سے تصفیہ کر سکتا ہے اور اپنے حقوق کے متعلق واقفیت حاصل کر کے اُن کا تحفظ کر سکتا ہے۔

سرکاری افسروں کے ذریعے ہونے والے لگان کے تصفیوں نے حکومت کے لیے ایک نئی مشکل پیدا کر دی۔ 1863 کے بندوبست میں زمینداروں کے حقیقی لگانوں کو نظرانداز کر دیا گیا تھا۔ حکام بندوبست نے مال گزاری کی تشخیص ایسے قیاسی لگانوں کی بنیاد پر کی تھی جو اُن کی رائے میں مناسب تھے۔ لیکن نئے ٹیننسی ایکٹ کے تحت حکام نے خود لگانوں کا تصفیہ کیا تھا۔ اس لیے 1893 کے ہونے والے بندوبست کے موقع پر وہ اُن لگانوں کو نظرانداز نہیں کر سکتے تھے۔ وہ مجبور تھے کہ اپنے تشخیص کردہ لگانوں کو تسلیم کریں اور اُس زمانے کا ضابطہ انھیں مجبور کر رہا تھا کہ وہ سرکاری مال گزاری کو نصف مجموعی لگان تک محدود رکھیں حاکم دہری مشکل میں پھنس گئے۔ وہ تشخیص کردہ لگان سے انکار نہیں کر سکتے تھے۔ دوسری طرف وہ اس ضابطے سے روگردانی نہیں کر سکتے تھے جس کی رو سے سرکاری مال گزاری نصف لگان تک محدود کر دی گئی تھی۔

1893 کا بندوبست

اس مشکل سے بچنے کے لیے 1887 میں جو تجویز پیش کی گئی وہ ہندوستان کی سرکاری دستاویزات میں سب سے عجیب ہے۔ اُس وقت مسٹر میکنزی صوبجات متوسط کا چیف کمشنر تھا۔ جو بعد میں سر الیگزینڈر میکنزی کے نام سے مشہور ہوا۔ وہ بنگال کا ایک قابل سول افسر تھا، سکریٹریٹ کے کاموں کی تربیت پا چکا تھا اور لارڈ رپن کے زمانۂ حکومت میں خود اختیار حکومت کے متعلق اُن اہم تجاویز کے مسودے تیار کر چکا تھا جن کے اقتباسات ایک پچھلے باب میں دیے جا چکے ہیں۔ حالانکہ اُس میں ایک حاکم کے بہت سے اوصاف پائے جاتے تھے پھر بھی وہ لوگوں کے لیے ہمدردی، اُن کی توقعات کے احترام اور اُن کے حقوق کی پاسداری کے جذبوں سے عاری تھا۔ عصری حالات کے مطابق اُس کی پالیسی بدلتی رہتی تھی۔ صوبجات متوسط اور اُس کے بعد بنگال میں اُس کا دورِ حکومت اُنیسویں صدی کے آخری برسوں میں کیے جانے والے کچھ بدترین رجعت پسندانہ اقدامات کے لیے مشہور رہے۔ صوبجات متوسط میں اُس نے ڈھٹائی کے ساتھ تسلیم کیا کہ 1863 میں حکام بندوبست نے زیادہ لگان فرض کر کے نصف لگان کے ضابطے کی خلاف ورزی کی ہے، یہ کہ از روئے قانون چونکہ لگان کی تعریف و تحدید کی جا چکی ہے اس لیے

آئندہ بندوبست کے موقع پر اس ضابطے کی خلاف ورزی نہیں کی جا سکے گی اور یہ کہ ان حالات میں ضابطے کی منسوخی ضروری ہو گئی ہے۔ اس عجیب و غریب دستاویز کے کچھ ٹکڑے پیش کیے جا رہے ہیں۔

"تشخیص کا جو طریقہ اُس وقت (1863 میں) اختیار کیا گیا تھا اُس کی بنا پر صوبے کے کسی حصے کے حاکم کے لیے جو سمجھتا تھا کہ مال گزاری میں اضافہ حق بجانب ہے اور اس پر عمل کرنا چاہتا تھا اس وقت تک یہ ممکن نہیں تھا کہ اُس ضابطے پر عمل کر سکے جس کی رو سے سرکاری مال گزاری کاشت سے ہونے والی آمدنی کے ایک معینہ حصہ تک محدود کر دی گئی تھی، جب تک وہ آمدنی کی اصطلاح کی ڈھیلی ڈھالی اور عام تشریح نہ کرے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر محال کی قیمت یا اُس کے لگان کی مالیت کا تصفیہ کئی قسم کے اعداد و شمار کے تقابلی مطالعے کے بعد کیا جاتا تھا۔ اس کا اصول یہ تھا کہ گاؤں کی مختلف قسم کی زمینوں کا مختلف شرحوں سے پرتا نکالا جاتا تھا اور اُس کی بنا پر زمین کی شرح کے مطابق لگان کا تصفیہ کر دیا جاتا تھا۔ اس لگان کی محال کے حقیقی لگان سے کلی یا جزوی مناسبت کا انحصار اس بات پر ہوتا تھا کہ تشخیص لگان کے بعد لگان میں مناسبت پیدا کرنے کے لیے کی جانے والی کارروائیوں کی بنا پر اُس میں کس حد تک اضافہ ہوا ہے؟

"لیکن ہمیں سمجھنا چاہیے کہ بندوبست کا وہ طریقہ جس کو حکومت نے ازروئے قانون تسلیم کر لیا ہے نصف آمدنی کے ضابطے کی ویسی خلاف ورزی کو ناممکن بنا دے گا جیسی پچھلے بندوبست کے موقع پر کی گئی تھی۔ نصف آمدنی کے ضابطے پر عمل کرنے کے لیے لگان کی وہ قیمت فرض کرنا ممکن نہیں ہوگا جو حقیقی ترمیم شدہ لگان سے زیادہ ہو اور ایسی تشخیص کرنا بھی ممکن نہ ہو سکے گا جو بظاہر نصف آمدنی کے اصول پر مبنی ہوتی ہے مگر حقیقت میں مال گزاروں کی آمدنی کے بہت بڑے حصے پر مشتمل ہوتی ہے۔"

"مسٹر میکنزی کی درخواست ہے کہ باضابطہ اعلان کر دیا جائے کہ نصف آمدنی کے اصول کا اطلاق صوبجات متوسط کے موجودہ بندوبست پر نہیں ہوگا اور مقامی حکومت کو اجازت دی جائے کہ وہ پورے علاقے میں ایک معقول و مناسب بندوبست کر سکے جس کو منظور کرنے اور جس کے متعلق قطعی احکامات جاری کرنے کا اختیار گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کو حاصل ہوگا۔"[1]

لارڈ ڈفرن کی حکومت سرکاری مال گزاری میں اضافے کا پورا بار مال گزار کے حصہ لگان پر نہیں ڈالنا چاہتی تھی اس لیے مشورہ دیا گیا کہ کسانوں کے لگانوں میں اضافے کرنے کے لیے قانون کی دفعات

---

[1] حکومت ہند کے نام خط مورخہ 18 مئی 1887۔ اس پر دستخط جے۔ بی۔ فلر نے کیے تھے جو سکریٹری تھا اور بعد میں مشرقی بنگال کا لفٹننٹ گورنر مقرر ہوا تھا۔

لگان سے باور کھا جاتا تھا۔ لیکن صوبجات متوسط میں حکومت نے عمداً اضافہ لگان کی پالیسی بنائی تھی۔ شمالی ہندوستان میں سرکاری مطالبہ زمیندار کے مقرر کردہ لگان کے نصف تک محدود رکھا جاتا تھا لیکن صوبجات متوسط میں چونکہ نصف لگان کے ضابطے کی خلاف ورزی ممکن نہیں رہی تھی اس لیے ضابطے کو پس پشت ڈال دیا گیا اور حکومت نے اختیار حاصل کر لیا کہ اُس لگان کے 50 فیصدی سے 65 فیصدی تک کا مطالبہ مقرر کیا جائے جس میں سرکاری افسر پہلے ہی اضافہ کر چکے ہوں۔ زرعی دولت اور خوشحالی کو تباہ کرنے اور صوبے کو بھکمری اور قحطوں کے لیے تیار کرنے کی خاطر اس سے بہتر پالیسی ذہن انسانی مشکل ہی سے اختراع کر سکتا تھا۔

سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا،، ڈجارج ہملٹن نے آخری ضرب لگائی۔ اُس نے 1895 میں فیصلہ کیا کہ بندوبست کی مدت بھی تیس سال سے گھٹا کر بیس سال کر دی جائے۔ وہ مفید ضابطہ پنجاب کی طرح صوبجات متوسط میں بھی منسوخ کر دیا گیا جس کی بنا پر بندوبست کے بعد زراعت پیشہ لوگوں کی ایک پوری نسل چین سے زندگی گزارتی تھی اور جس پر اب بھی شمالی ہندوستان ، اِس اور بمبئی میں عمل ہو رہا ہے۔ اُنیسویں صدی کے آخری برسوں میں مال گزاری پر بار بار نظر ثانی کرنے کی نفرت انگیز پالیسی اختیار کی گئی۔

بتیس سال کی مدت میں 1863 کے بندوبست کے تین اہم اصول ایک ایک کر کے ختم کر دیے گئے۔ مال گزاروں کے حقوق ملکیت محدود کر دیے گئے اور اُنھیں اپنی زمینداریوں کے لگانوں کا تصفیہ کرنے سے روک دیا گیا۔ نصف لگان کا ضابطہ منسوخ کر دیا گیا۔ تیس سال کا قاعدہ بھی منسوخ کر دیا گیا۔ لارڈ ڈفرن اور لارڈ لینس ڈاؤن کی حکومتوں نے وہ تمام تحفظات ختم کر دیے جو لارڈ ڈلہنگ اور سر رچرڈ ٹیمپل نے زمینداروں کے ایک خوشحال طبقے اور کسانوں کی خوش حالی کے فروغ کے لیے مہیا کیے تھے۔

اس کے بعد جو بندوبست کیا گیا اُس میں حال میں تشکیل ہونے والے نئے ضابطوں سے کام لیا گیا۔ صوبجات متوسط کی طرف سے آنے والے رکن آنریبل بی۔ کے۔ بوس نے لارڈ کرزن کی کونسل میں 28 مارچ 1900 کو تقریر کرتے ہوئے کچھ اعداد و شمار (مندرجہ ذیل نقشہ دیکھیے) پیش کیے جن سے نئے بندوبست میں مختلف اضلاع کے کسانوں کے لگانوں میں ہونے والے اضافوں کا تناسب ظاہر ہوتا ہے۔

چنانچہ دیکھا جا سکتا ہے کہ لارڈ ڈفرن کی حکومت کی ہدایتوں کے بموجب حکام بندوبست

سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا جائے۔"

"حقیقت میں بندوبست کی کارروائیوں کا اہم ترین حصہ حکام بندوبست کا تعین لگان ہے جو اُن ضابطوں کے تحت کیا جائے گا جو چیف کمشنر دفعہ 82 کی رو سے بنانے کا مجاز ہے۔ آپ کے خط میں اس فرض کی ادائیگی کے طریقے پر روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔ لیکن صوبجات متوسط کی روداد برائے مارچ 1887 سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسٹر فلر MR. FULLER اور مسٹر فٹز پیٹرک MR TZ PATRICK نے لگانوں پر کی جانے والی نظر ثانی کی ایک اسکیم پر غور کیا ہے جس میں مندرجہ ذیل طریقے کی سفارش کی گئی ہے

(۱) ضرورت سے زیادہ کم لگانوں میں اضافہ کر کے اُنھیں مقامی سطح کے برابر کر دیا جائے۔

(2) اگر کسی رقبے کے سب لگان ضرورت سے زیادہ کم ہوں تو ان میں اضافہ کر کے اُن کی سطح اونچی کر دی جائے۔" [1]

مسٹر میکنزی نے جواب میں ایک طویل خط لکھا جس میں اس کی اجازت مانگی گئی تھی کہ وہ لگان کی 50 فیصدی سے 65 فیصدی تک مال گزاری مقرر کر سکے [2] حکومت ہند نے چیف کمشنر کو مطلوبہ اجازت دے کر قطعی فیصلہ صادر کر دیا۔

حکومت ہند کو بہر حال وصولیابی کی 65 فیصدی جیسی بھاری شرح کی اجازت دینے میں کچھ پس و پیش ہے اور وہ اس بات کو پسند کرے گی کہ اس اصول کا استعمال صرف اُن صورتوں میں کیا جائے جن میں پچھلا تناسب کسی طرح 50 فیصدی سے کم نہ تھا۔ جہاں تک دوسری زمینداریوں کا تعلق ہے 50 فیصدی کو زیادہ سے زیادہ قابل قبول شرح سمجھا جائے۔" [3]

ہندوستان کی تمام سرکاری تحریروں میں شاید ہی کوئی ایسی تحریر ہو جس کا پڑھنا افسروں اور عام آدمیوں کے لیے اس مراسلت سے زیادہ تکلیف دہ ہو۔ شمالی ہندوستان میں کسانوں سے لگان کا تصفیہ کرنے کا حق زمیندار کو حاصل تھا۔ لیکن صوبجات متوسط میں 1883 کے ایکٹ کی رو سے عملاً یہ حق ریاست نے حاصل کر لیا تھا۔ شمالی ہندوستان میں قانون کے ذریعے زمینداروں کو اضافہ

---

[1] حکومت ہند کا خط مورخہ 24 اگست 1887

[2] حکومت ہند کے نام خط مورخہ 16 مارچ 1888

[3] حکومت ہند کا خط مورخہ 31 مئی 1888

نے نئے بندوبست کی تیاری کرنے کے لیے پورے صوبے میں 3 فیصدی سے 23 فیصدی تک لگان میں اضافہ کردیا۔ یہ اضافہ اُن اضافوں کے علاوہ تھا جو زمینداروں نے اختیارات چھیننے سے پہلے کیے تھے۔ ہر جگہ لگانوں میں اضافہ کیا گیا تاکہ اُس مال گزاری میں بھی اضافہ ہوسکے جس کی بنیاد لگان پر قایم تھی۔ اگر زمیندار یہ شکایت کرتے تھے کہ مقرر کردہ بھاری لگان وصول نہیں ہوسکتا ہے تو ان کی آواز پر کوئی کان نہیں دھرتا تھا۔ چاہے وہ لگان وصول کرسکیں یا نہ کرسکیں۔ نئے لگان کی بنیاد پر تشخیص ہونے والی مال گزاری اُنھیں ادا کرنی پڑتی تھی۔

ضلع	ضلع میں زمین کی مختلف قسموں کے لگان میں ہونے والے اضافے کا فیصد تناسب
ساگر	9. 8. 10.
داموہ	10. 14
جبل پور	9, 3, 4, 11 (ایک قسم کے لگان میں 5 فیصدی تخفیف کردی گئی)
مانڈلا	(اعداد حاصل نہ کیے جاسکے)
سیونی	10. 8. 12
نرسنگھ پور	6. 4
ہوشنگ آباد	8. 9. 5. 4.
نیمار	23
بتول	14. 18. 17. 14.
چھندواڑہ	12. 9. · 17
واردھا	7. 20.
بھنڈارا	13. 15. 14.
ناگپور	14. 15. 17. 13
بالاگھاٹ	16
رائے پور	12
بلاس پور	7. 13
سمبل پور	(اعداد دستیاب نہ ہوسکے)

صرف ایک نمایاں افسر نے تشخیص میں برتی جانے والی سختی کو کم کرنے کی کوشش کا ذکر کیا ہے۔ الیگزینڈر میکنزی کے بعد اینٹنی میکڈانل صوبہ جات متوسط کا چیف کمشنر مقرر کیا گیا۔ اُس نے کسی ضلع میں بھی مال گزاری کی شرح لگان کی 65 فیصدی نہیں مقرر کی۔ اُس نے زیادہ تر 50 فیصدی سے 60 فیصدی تک مال گزاری کی شرح مقرر کی۔ لیکن خرابی کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ لگانوں میں اضافہ کیا جا چکا تھا۔ چنانچہ اُس مال گزاری کے مقابلہ میں جو 1863 میں مقرر کی گئی تھی نئے لگان کی بنیاد پر تشخیص ہونے والی مال گزاری میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا۔ ہم نے مندرجہ ذیل اعداد و شمار آنریبل مسٹر بوس کی محولہ بالا تقریر سے لیے ہیں۔

ضلع	ضلع میں ہر قسم کی زمین کی مال گزاری میں 1863 کے مقابلے میں ہونے والے اضافے کا فیصد تناسب
ساگر	48. 53. 42. 68.
دموہ	73. 55.
جبل پور	77. 64. 86. 62. 44. 50.
مانڈلا	66. 61
سیونی	50. 92. 55. 197. 95
نرسنگھ پور	46. 57.
ہوشنگ آباد	96. 87. 69
نیمار	56. 58
بتول	.37. 57. 63. 55.
چھندواڑا	25. 47. 55. 45.
واردھا	28. 26.
ناگپور	24. 28. 21. 20
بھنڈارہ	52. 30. 38. 40.
بالاگھاٹ	48.
رائے پور	98. 82.
بلاسپور	105. 102
سمبل پور	34

زمین پر لگنے والے مقامی محاصل، جو 1863 میں بہت کم تھے، مال گزاری کے 12½ فیصدی ہوگئے اور مال گزاری کے علاوہ وصول کیے جاتے تھے۔

1897 اور 1900ء کے قحط

برطانوی حکومت قایم ہونے کے بعد صوبجات متوسط کو کسی شدید قحط کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ لیکن لوگوں کی تباہ حالی قحط کے لیے میدان ہموار کر دیا کرتی ہے۔ ایک زراعت پیشہ ملک کے لیے فصلوں کی خرابی بہرحال تباہ کن ثابت ہوتی ہے۔ لیکن لوگ اگر بے وسیلہ اور پیسے پیسے کو محتاج ہوں تو قحط دس گنا زیادہ تباہ کن ہو جاتا ہے۔ صوبجات متوسط کا سب سے زیادہ تباہ کن قحط 1897 میں پڑا۔ ضلعے کے ضلعے ویران ہوگئے۔ زیر کاشت زمینیں جنگلوں میں تبدیل ہوگئیں۔ لاکھوں انسان موت کے گھاٹ اتر گئے کاشت کے ساتھ آبادی بھی کم ہوگئی۔ اُس وقت پارلیمنٹ کے ممبر مسٹر سیموئل اسمتھ SAMUEL SMITH نے ہاؤس آف کامنز میں سوال کیا کہ حکومت کیا قحط کے دوران نئے بندوبست کی کارروائی ملتوی کرنے پر غور کر رہی ہے۔ لارڈ ہملٹن نے بندوبست کی کارروائی ملتوی کرنے سے انکار کر دیا۔

لیکن فطرت انسان سے قوی تر ہے۔ 1900 میں ایک اور قحط نے اُس بدقسمت صوبے کو ویران تر کر ڈالا اور نئے بندوبست اور اضافہ شدہ مال گزاری کے مطالبے کی وصولی کو ناممکن بنا دیا۔ حکومت کو مجبوراً بندوبست کی کارروائی ملتوی کرنی پڑی۔ ساگر، دموہ، جبل پور، سیونی، نرسنگھ پور ہوشنگ آباد اور نیمار میں شرح مال گزاری میں تخفیف کرنی پڑی 1902 میں بتول، واردھا، بھنڈارا بالاگھاٹ اور رائے پور میں تخفیف مال گزاری کی کارروائی کی جا رہی تھی۔ دو قحطوں کی وجہ سے صوبے کی تباہی کے بعد مال گزاری کے ناقابل وصول مطالبے میں تخفیف ضروری ہوگئی تھی۔

صوبے کے لوگ عارضی تخفیف کے بجائے مستقل اصلاحات کا مطالبہ کرنے لگے ہیں۔ کسی نئی کارروائی کی ضرورت نہیں ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ 1863 کے اصولوں کی تجدید کی جائے۔ ان اصولوں کی خلاف ورزیاں تباہ کن ثابت ہو چکی ہیں۔ اُنھوں نے مالکان کو کمزور اور کسانوں کو تباہ کر دیا ہے۔ شمالی ہندوستان، بمبئی اور مدراس کی طرح تیس سال کی مدت کے لیے بندوبست کیے جانے چاہئیں جس طرح آگرہ، اودھ اور پنجاب کے صوبوں میں مال گزاری حقیقی لگان کے نصف تک محدود ہے اسی طرح وہاں بھی مال گزاری کی تجدید کی جانی چاہیے۔ زمین پر لگنے والے وہ تمام مزید محاصل منسوخ کیے

جانے چاہئیں جو 1871 کے بعد عاید کیے گئے ہیں جس طرح بنگال اور شمالی ہندوستان کے کسانوں کے حقوق کا تحفظ ٹیننسی ایکٹوں کے ذریعے کیا گیا ہے اسی طرح وہاں کے کسانوں کے حقوق لگان داری کا تحفظ کیا جائے اور انھیں اضافوں سے محفوظ رکھا جائے۔ ان تحفظات کے بعد انھیں اس بات کی آزادی حاصل ہونی چاہیئے کہ حکام بندوبست کی مداخلت کے بغیر وہ اپنے لگانوں کا تصفیہ زمینداروں کے ساتھ کرسکیں۔ ہر کھیت کے لگان کا تصفیہ کرنے میں حکومت جو مداخلت کرتی ہے اُس کے نتیجے میں لگان میں اضافہ ہوتا ہے اور کسان تباہ ہوتے ہیں۔

سخت ضابطے اور اُن کا عمل درآمد

ریاست کے شایان شان اس سے بہتر کارروائی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے کہ وہ زمیندار کو ادا کیے جانے والے ہر کسان کے لگان کا تصفیہ کرے۔ لیکن شاید ہی کسی کارروائی میں اس سے زیادہ غلط طریقہ عمل اختیار کیا جاتا ہو۔ لگان مقرر کرنے کے قاعدے اتنے اُلجھے ہوتے ہیں کہ وہ نہ تو پوری طرح سمجھے جا سکتے ہیں نہ اُن پر عمل کیا جا سکتا ہے لہ نیم تربیت یافتہ اور چھوٹی چھوٹی تنخواہیں پانے والے پٹیلوں اور

لہ یہ ضابطے کتنے اُلجھے ہوتے ہیں اس کا اندازہ 1891 میں شائع ہونے والے "صوبجات متوسط کے ضابطہ بندوبست کا تعارف ERODUCTION TO THE CENTRAL PROVINCES SETTLEMENT CODE کے مندرجہ ذیل اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے۔ "اس طریقے پر عمل کرنے کے لیے پہلا قدم یہ ہے کہ زمین کی مختلف قسموں کے متعلق پوری پوری معلومات حاصل کی جائیں..... دوسرا قدم یہ ہے کہ زمین کی ہر قسم کی وہ متناسب قیمت دریافت کی جائے جو فی ایکڑ زمین کی اکائیوں کی تعداد میں ظاہر کی گئی ہو..... جب اُن سب نوعیتوں کی ایسی درجہ بندی کر لی جائے جس میں ہر قسم کی زمین کو دوسری قسموں کی زمین کے مقابلے میں اکائیوں میں ظاہر کیا گیا ہو تو ہر جوت یا گاؤں کی زمین کی اکائیوں کی تعداد نکالنے کے لیے ہر قسم کی زمین کے رقبے کو اُس قسم کی نوعیت سے ضرب دیا جائے مثلاً 150 ایکڑ زمین اگر تین قسموں کی ہو جن کی نوعیتیں 32 برائے الف 16 برائے ب اور 4 برائے ج ہوں اور اُن کے رقبے بالترتیب 50، 175 اور 25 ہوں اکائیوں کی تعداد یہ ہوگی۔

الف 1600 = 22 X 50

ب 1200 = 16 X 75

ج 2900 = 4 X 25 -

پٹواریوں سے توقع کی جاتی ہے، جنھیں 3 شلنگ سے 6 شلنگ تک فی ہفتہ تنخواہ ملتی ہے، کہ وہ ان ناقابلِ فہم استقرائی اور استخراجی قاعدوں کے مطابق عمل کر سکیں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ اُن کے ذہنوں میں ایک غیر واضح خیال جڑ پکڑ گیا ہے۔ کہ حکومت لگان میں اضافے کی خواہش مند ہے اور وہ اضافے کرتے رہتے ہیں۔ ضلع کے دو یا تین نائب حکام بندوبست پٹواریوں اور پٹیلوں کے اُن کاموں کی نگرانی نہیں کر سکتے ہیں جو ہزاروں مربع میل پر محیط ہوتے ہیں۔ چنانچہ لگان کا تعین بربنائے قیاس کیا جاتا ہے اور غلطیوں کا خمیازہ کسان کو بھگتنا ہوتا ہے۔ کسان کسی غیر جانب دار عدالت مال میں اُن حکام کے فیصلوں کے خلاف اپیل بھی نہیں کر سکتا ہے جنھیں تین یا چھ شلنگ فی ہفتہ تنخواہ ملتی ہے۔

صوبجات متوسط میں اُن غلطیوں سے سب لوگ واقف ہیں جو لگان کے مقرر کرنے اور اُن میں اضافے کرنے کے سلسلے میں عام طور سے کی جاتی ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ زمینوں کی درجہ بندی اکثر غلط ہوا کرتی ہے اور پٹیل کمتر قسم کی زمین کو بہتر درجے میں شامل کرنے کے عادی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ فصلوں کے وہ تجربے اکثر گمراہ کن ہوا کرتے ہیں جن کی بنا پر مختلف قسم کی زمینوں کی پیداواری صلاحیتوں کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ فصل کاٹنے اور فصل کے خشک ہونے کی بنا پر جو نقصان ہوتا ہے اُس کا خیال نہیں رکھا جاتا ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ بیج کی کمیابی، بیلوں کی کمی اور کسانوں کی عام بدحالی کی بنا پر بہت سی قابلِ زراعت زمین زیرِ کاشت نہیں لائی جاتی ہے۔ لیکن سرکاری افسر لگان مقرر کرتے وقت اس

---

* "اگر موجودہ لگان 275 روپیہ تھا تو اُس کی شرح فی اراضیاتی اکائی ہوئی $\frac{275}{2900}$ 1/5 آنہ"

* "اب ہم اضافہ لگان کے متعلق دی جانے والی دوسری دلیل کا ذکر کریں گے جس میں قیمتوں کے اضافے کی بنیاد پر استخراجی طریقہ استدلال سے اضافہ لگان کیا جاتا ہے۔ فرض کیجیے کہ قیمتوں کی بنا پر اُس لگان میں 33 فیصدی اضافہ حق بجانب سمجھا جائے جو پچھلے بندوبست کے موقع پر ادا کیا جاتا تھا اور اُس وقت کے اور موجودہ لگان کا مقابلہ، جو دونوں زمانوں کے فی ایکڑ لگان کی شرح کے تقابلی مطالعے سے کیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ لگان، جس پر بحیثیت مجموعی غور کیا جانا چاہیے، صرف بقدر 10 فیصدی بڑھا ہے تو ابتدائی لگان میں مزید 23 فیصدی کا اضافہ یا اُس وقت کے لگان میں 20 فیصدی کا اضافہ حق بجانب سمجھا جائے گا۔ زمین کی اکائیوں کا طریقہ اس اضافے کی منصفانہ تقسیم کا ذریعہ مہیا کرتا ہے۔" "اگر استقرائی طریقہ استدلال استعمال کیا جائے تو اس طریقے سے اضافے کی رقم کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ذریعے اس اضافے کی منصفانہ تقسیم بھی ہو سکتی ہے جو استخراجی طریقہ استدلال کی بنا پر کیا جائے، اس لیے کہ اس کی بنا پر ہر کسان کی جوت اقول کسے ایک نسبتاً میں تبدیل ہو جاتی ہے۔"

قسم کی زمین کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔ اس لیے زمیندار مجبور ہوتا ہے کہ یا تو اُس زمین کا بھی لگان کسانوں سے وصول کرے جس پر کاشت نہیں کی جاتی ہے یا اُن زمینوں کی مال گزاری ادا کرے جن کا لگان اُسے وصول نہیں ہوتا ہے[1] چوتھی بات یہ ہے کہ نابالغوں کی وہ جائدادیں جن کا انتظام نابالغوں کی طرف سے حکومت کرتی ہے اس امر کا ثبوت مہیا کرتی ہیں کہ خود سرکاری افسر اپنے مقرر کردہ لگان کا تقریباً دس فیصدی وصول کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ نجی زمینداروں کو لازمی طور سے زیادہ نقصان برداشت کرنا ہوتا ہے۔ پانچویں بات یہ ہے کہ سرکاری مطالبے کی قسطیں مقرر کرنے میں انصاف سے کام نہیں لیا جاتا ہے۔ مالی سال کے اندر وصولیابی مکمل کرنے کی خاطر مزدوری میں ایک بڑی قسط طلب کی جاتی ہے۔ زمیندار اپنے کسانوں کو جنوری میں لگان ادا کرنے پر مجبور کرتے ہیں تاکہ وہ مزدوری میں مال گزاری ادا کر سکیں۔ فصلیں جنوری میں تیار نہیں ہوتی ہیں اس لیے کسانوں کو استادہ فصلیں اپنی قیمت سے کم رقم میں ساہوکار کے پاس رہن رکھنا پڑتی ہیں تاکہ وہ لگان ادا کر سکیں۔ چھٹی اور آخری بات یہ ہے کہ بنگال کے قانون کی رو سے نادہند زمینداروں کی صرف جائدادیں نیلام کرائی جا سکتی ہیں لیکن صوبجات متوسط کے قانون نے افسران مال کو اختیارات دیے ہیں کہ وہ نادہند زمینداروں کو گرفتار کر کے جیل بھیج سکیں۔ اس قسم کی سختی بنگال کے قوانین مال میں نہیں پائی جاتی ہے اور صوبجات متوسط کی حکومت کے دامن پر ایک بدنما داغ ہے۔

1898 کا ٹیننسی ایکٹ اور ضروری اعلان

اُس جامع اور ترمیمی رینٹ ایکٹ نے کسانوں کی حالت میں کوئی سدھار نہیں کیا جو 1898 میں منظور کیا گیا تھا۔ اس میں کہا گیا ہے کہ حکام بندوبست معمولی کسانوں کے لگان سات سال کے لیے مقرر کریں گے۔ اس میں سیر و خود کاشت کے حق انتقال کے تعلق سے زمینداروں پر اور انتقال حق کے تعلق سے دخیل کار اور معمولی کسانوں پر پابندیاں لگادی گئی ہے۔ اس قسم

---

[1] اُس تفتیش کے دوران جو میں نے مارچ 1903 میں جو بجات متوسط میں کی تھی ایک ضلع میں مجھے بتایا گیا کہ اُس سال تشخیص شدہ زمین کا تقریباً ایک چوتھائی حصہ اُفتادہ پڑا رہا۔ اُن زمینوں میں سے زیادہ تر کا لگان وصول نہ ہو سکا لیکن اُن کی مال گزاری ادا کرنی پڑی۔

پابندیاں بنگال کے قوانین میں نہیں پائی جاتی ہیں اور ان کا معاشی اثر یہ ہوا ہے کہ جا ئداد وں کی قیمت فروخت گر گئی۔ حالیہ تباہ کن اثرات کے بعد صوبجات متوسط اس قسم کے اقدامات کے ذریعے دوبارہ خوشحالی حاصل نہیں کر سکے گا۔ صوبے کے زراعت پیشہ لوگ زیادہ فیاضانہ اقدامات اور 1863 کے صحت مند اصولوں کی تجدید کے بعد ہی طاقت ، دولت ، خود کفالت اور خوشحالی حاصل کر سکیں گے۔

باب ۔ 6

بمبئی اور مدراس کا زرعی نظام

شمالی ہندوستان کی طرح بمبئی اور مدراس کے زرعی نظام بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ حکومت میں وجود میں آتے تھے۔ ونگیٹ نے 1836 میں بمبئی کا پہلا تیس سالہ بندوبست شروع کیا تھا اور کورٹ آف ڈائریکٹرز کے حکم سے 1855 میں مدراس کا تیس سالہ بندوبست کیا گیا تھا۔ ملکہ کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور آنے کے بعد سر چارلس وڈ نے 1864 میں فیصلہ کیا تھا کہ شمالی ہندوستان کی طرح زمین کا سرکاری مطالبہ خالص پیداوار یا مناسب لگان کے نصف تک محدود رکھا جائے۔ لارڈ لٹن کے دور حکومت تک اُن دونوں صوبوں میں اُن اصولوں کے عمل درآمد کے سلسلے میں جو کارروائی کی گئی تھی اُس کا ذکر ایک پچھلے باب میں کیا جا چکا ہے۔ اب ہم صدی کے آخر تک کے واقعات مختصراً بیان کریں گے۔

بمبئی

بمبئی کے بندوبست پر 1866 میں شروع ہونے والی نظر ثانی کے دوران جو غلطیاں کی گئی تھیں اُن کا نتیجہ 1875 کے پونا کے بلوؤں کی صورت میں ظاہر ہوا۔ شورش کی وجوہ معلوم کرنے کے لیے جو کمیشن مقرر کیا گیا تھا اُس کے ایک رکن آکلینڈ کولون "AUCKLAND COLVIN" نے مالگزاری میں ہونے والی فوری اور بھاری اضافے کو اس کی وجہ قرار دیا تھا۔ لیکن اس کی تلافی نہیں کی گئی۔ حکومت بمبئی نے زمین سے متعلق اپنے مطالبوں پر واضح حد نہیں لگائی۔ بندوبست کی کارروائی میں مسٹر چارلس وڈ

کے بتاتے ہوئے اُس ضابطے کو نظر انداز کر دیا گیا جس کی رو سے سرکاری مطالبہ نصف لگان تک محدود کر دیا گیا تھا۔

1876 کے ریونیو جیورسڈکشن ایکٹ : REVENUE JURISDICTION ACT نے مال گزاری سے تعلق رکھنے والے معاملوں کی حد تک عدالتوں کو حق سماعت سے محروم کر دیا اور حکام بندوبست من مانی کرنے لگے۔ 1879 کے ایگریکلچرل ریلیف ایکٹوں AGRICULTURAL RELIEF ACTS نے ساہوکاروں کے خلاف کسانوں کا تحفظ کرنے کی کوشش کی لیکن ان میں مال گزاری پر حدود عاید کرنے کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا تھا۔ 1879 کے لینڈ ریونیو ایکٹ LAND REVENUE ACT میں بھی سرکاری مطالبے کو محدود کرنے کے متعلق کوئی مناسب دفعہ نہیں شامل کی گئی تھی۔ لیکن بمبئی کے کسانوں کو دوسرے تحفظات کے مقابلے میں اس تحفظ کی زیادہ ضرورت تھی۔ جیسا کہ سر ولیم ہنٹر نے 1879 میں صاف صاف اور زوردار الفاظ میں گورنر جنرل کی کونسل میں کہا تھا۔ " دکن کے کسانوں کو سہولت بہم پہنچانے کی راہ میں سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ سرکاری مطالبہ ادا کرنے کے بعد اُن کے پاس اتنی غذائی اجناس نہیں بچتی ہیں کہ وہ پورے سال اپنا اور اپنے خاندان کا پیٹ پال سکیں "

حاکم بندوبست کے اختیار تمیزی کی راہ میں ایک قاعدے نے تھوڑی بہت رکاوٹیں ڈال دی تھیں۔ اُس کی رو سے وہ ایک تعلقے یا گاؤں کے مجموعی کی مال گزاری 33 فیصدی سے زیادہ، ایک گاؤں کی 66 فیصدی سے زیادہ یا ایک جوت کی 100 فیصدی سے زیادہ نہیں بڑھا سکتا تھا۔ اس قاعدے سے فائدے کے بجائے نقصان ہوا کرتا تھا۔

بندوبست پر 1866 میں شروع ہونے والی نظر ثانی کا کام آہستہ آہستہ کیا جاتا رہا اور 1899 تک (یعنی بمبئی کے قحط سے ایک سال پہلے تک) صوبے کے صرف آدھے گاؤں پر نظر ثانی کی جا سکی تھی۔ صوبے کے 27781 گاؤں میں سے صرف ½13,399 گاؤں میں دوبارہ بندوبست کیا جا سکا تھا۔ پچھلے مطالبے اور نظر ثانی شدہ مطالبے کے اعداد[1] سے ظاہر کرتے ہیں کہ بہت زیادہ اضافہ کر دیا گیا تھا۔

مندرجہ ذیل اعداد کے متعلق ایک دو باتیں کہنا ضروری ہے۔ خانہ نمبر 3 اور 4 کے عنوانات

---

[1] بمبئی کے نظم ونسق کی رپورٹ برائے 99-1898، ضمیمہ ا - ایک پونڈ 10 روپے کے برابر تسلیم کیا گیا ہے۔ پاؤنڈ کی کسر کو پونڈ ظاہر کیا گیا ہے یا نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

ظاہر کرتے ہیں کہ ۳۰ فیصدی اضافہ زراعت کی اُس تدریجی توسیع کا نتیجہ نہیں تھا جو تیس سال میں ہوئی۔ یہ نظرثانی کے موقع پر کیا گیا تھا۔

ضلع	اُن گاؤں کی تعداد جن میں دوبارہ بندوبست کیا گیا	نظرثانی سے پہلے کے سال میں وصول ہونے والی مال گزاری	نظرثانی کے نتیجے میں مقرر ہونے والا مطالبہ مال گزاری	فیصد اضافہ
		پونڈ	پونڈ	30
احمد آباد	444	1,31,678	1,09294	25·2
کیرا	525	55,278	1,51,843	15·3
سورت	201	11,043	61,066	10·5
پنچ محل	222	55,772	11,193	1·3
تھانہ	824	2,46,475	84,313	41·1
خاندیش	2272	67,768	3,45,573	30·6
ناسک	959	98,157	93,194	37·5
احمد نگر	1,017½	96,503	1,24,509	26·9
پونا	1,035	83,478	1,270335	32·0
شولاپور	672	1,22,224	1,12,974	35·0
ستارا	962	73,656	1,59,267	30·3
کولابا	1,059	83,749	1,00,148	35·9
بیل گام	892	1,29,868	1,09,847	31·1
دھاروار	1290	81,631	1,87,253	44·2
بیجاپور	995	87,310	1,09,043	33·6
میزان	13,369½	14,46,600	18,86,554	30.4

جیسا کہ آکلینڈ کولون نے 1876 میں کہا تھا بمبئی میں بندوبست کی مدت کے دوران مال گزاری

میں رفتہ رفتہ اضافہ کیا جاتا ہے اور اس کے بعد بندوبست پر نظرثانی کے وقت اچانک مزید اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ اس بات کو دہرانے کی ضرورت نہیں کہ مال گزاری میں کیا جانے والا اچانک اضافہ کسانوں سے مشورہ کیے بغیر عمل میں لایا جاتا ہے۔ سر بارٹل فریرے نے 1872 کی سلیکٹ کمیٹی کے سامنے بیان دیتے ہوئے خواہش ظاہر کی تھی کہ نئے بندوبست کے وقت کسانوں سے مشورہ کیا جانا چاہیے۔ اور انھیں اپنی بات کہنے کا موقع دیا جانا چاہیے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کسانوں سے مشورہ نہیں کیا جاتا ہے۔ اُنھیں نظرثانی شدہ مطالبہ اُس وقت معلوم ہوتا ہے جب اُس کا اعلان کیا جاتا ہے۔ اُن لوگوں سے مشورہ کیے بغیر، جنھیں مال گزاری ادا کرنی ہوتی ہے، نظرثانی شدہ مطالبے کا حساب لگانے اور تعین کرنے میں اتنا فائدہ ضرور ہے کہ تمام کام تیزی کے ساتھ ختم کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس سے مالکانہ حق رکھنے والے کسانوں کے ساتھ ناانصافی ہوتی ہے۔ اُن کو نہ حق حاصل ہوتا ہے نہ موقع کہ وہ مطالبے کو کھیتوں کی خالص پیداوار کے نصف تک محدود رکھنے کی کارروائی کر سکیں۔ وہ اضافے کو اُس شرح تک بھی محدود نہیں رکھ سکتے ہیں جو قیمتوں کے اضافے یا کاشت کی توسیع سے مناسبت رکھتی ہو۔ اُنھیں یہ بات ثابت کرنے کا موقع بھی نہیں دیا جاتا ہے کہ اضافہ شدہ مطالبہ کس حد تک اُن ترقیوں کے فوائد پر حاوی ہے جو اُنھوں نے خود اپنی زمینوں کو دی ہیں۔ تشخیص مال گزاری کے اعلان کے بعد انھیں اس امر کی اجازت نہیں دی جاتی ہے کہ نئی تشخیص کے خلاف وہ کسی غیر جانب دار عدالت میں اپیل دائر کر سکیں۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ بمبئی کی لیجسلیٹو کونسل کے ایک رکن آنریبل گوکل داس پارکھ نے، اُن سرکاری اعداد و شمار کی بنا پر جن میں سرکاری افسروں کے اُن تجربوں کے نتائج ظاہر کیے گئے جو فصلوں کے سلسلے میں کیے گئے تھے، بتایا ہے کہ گجرات کے کسانوں کا ایک بڑا طبقہ، جن کے پاس پانچ ایکڑ یا اُس سے کم رقبے کے کھیت ہیں اور جو اچھا دھان نہیں پیدا کر سکتے ہیں، عام حالات میں بھی اتنا پیدا نہیں کر پاتا ہے جو سرکاری مطالبے، اخراجات کاشت اور بال بچوں اور جانوروں کی گزر بسر کے لیے کافی ہو۔ اُس نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ "اُن کسانوں کی ایک بڑی تعداد بھی، جن کے پاس دس ایکڑ تک کے کھیت ہیں، اتنا پیدا نہیں کر پاتی ہے جو اخراجات کاشت اور اُس کی گزر بسر کے لیے کافی ہو۔"[1]

لیکن آنریبل گوکل داس سے ایک بڑے افسر نے گجرات کے متعلق ایسے اعداد و شمار پیش کیے ہیں جن کو پڑھ کر تکلیف ہوتی ہے۔ 1900 کے فیمن کمیشن کو، جس کا صدر سر اینٹنی میکڈانل تھا، معلوم

---

[1] مدراس کے نٹیسن اینڈ کمپنی کی شائع کردہ "ہندوستان میں زمین کے مسائل" LAND PROBLEM IN INDIA P. 147 ص 147

ہوا تھا کہ گجرات میں سرکاری مال گزاری زمین کی مجموعی پیداوار کی $\frac{1}{5}$ ہوتی ہے۔ مال گزاری کا یہ تناسب اُس تناسب کا تقریباً دگنا ہوا جو بنگال کے نجی زمیندار لگان کے طور پر اپنے اسامیوں سے وصول کرتے ہیں۔ 1864 کے ضابطے کے مطابق سرکاری مال گزاری کو نصف لگان تک محدود رکھنے کے بجائے یہ تناسب گجرات کے تمام مناسب لگان پر حاوی ہوتا ہے۔ ـہ

ـہ میں مارچ 1903 میں گجرات گیا اور کیرا، احمد آباد، سورت اور بھروچ کے ضلعوں میں تحقیقات کی مالکانہ حق رکھنے والے کسانوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی اور اُن میں سے جن کی حالت زیادہ خراب تھی وہ پورے خاندانوں کے ساتھ ایک کمرے میں رہا کرتے تھے جس میں کوئی سامان نہیں ہوتا تھا۔ وہ عام طور سے کرائے کے جانوروں سے کام لیا کرتے تھے۔ اور اُن کے پاس جو تھوڑا بہت مال اسباب ہوتا تھا وہ اکثر رہن رہتا تھا۔ پیداوار کی مناسبت سے جب میں نے گاؤں والوں اور گاؤں کے سرکاری کارکنوں کی موجودگی میں مال گزاری کے مطالبے کا حساب لگایا تو مجھے معلوم ہوا کہ مطالبہ عام حالت میں ہونے والی پیداوار کا 40-30 فیصدی ہوتا ہے۔ مجھے دکن کے ستارا اور پونا کے ضلعوں کے کچھ گاؤوں میں جانے کا موقع بھی ملا جہاں سرکاری مطالبہ کسی قدر کم ہے۔ میں نے جن لوگوں کے بیانات لیے اُن میں ایک پینشن یافتہ سپاہی بھی شامل تھا جو 1878 میں مائش گیا تھا اور اب ایک کسان کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ ان گاؤوں میں سرکاری مطالبہ عام حالات میں ہونے والی پیداوار کا 30-20 فیصدی ہوتا تھا۔ جب سرکاری افسر یہ کہتے ہیں کہ گجرات میں مال گزاری ۲۰ فیصدی اور دکن میں ۱۰ فیصدی ہے تو وہ اپنے حساب کی بنیاد اُس پیداوار کو بتاتے ہیں جو حاصل کی جانی چاہیے نہ کہ وہ پیداوار جو واقعی حاصل ہوتی ہے۔ اگر ہندوستان کے قدیم دستور کے مطابق مال گزاری جنس میں ادا کی جاتی تو اس قسم کی غلطی کا امکان نہ رہتا۔ اگر فصل اچھی ہوتی تو حکومت کا حصہ زیادہ ہوتا۔ فصل خراب ہونے کی صورت میں سرکار کم حصے کا مطالبہ کرتی۔ لوگوں کی خوشحالی سے حکومت کا فائدہ ہوتا۔ اُن کی بدحالی سرکاری نقصان کا باعث ہوتی اور اس طرح کسانوں کی حالت اور مال گزاری کی وصولیابی میں ایک مناسبت پیدا ہو جاتی۔ لیکن برطانوی حکومت نے چونکہ فیصلہ کیا ہے کہ مال گزاری رقم کی شکل میں وصول کی جائے اس لیے یہ ضروری ہے کہ رقم کی شکل میں طلب کی جانے والی مال گزاری کا حساب احتیاط کے ساتھ اُس حقیقی پیداوار کی بنیاد پر لگایا جائے جو عام حالات میں کھیتوں سے حاصل کی جاتی ہے۔ اُس حقیقی پیداوار کا ۱۰ فیصدی غالباً نصف لگان کی نمائندگی کرے گا۔ 40 یا 30 فیصدی پورے کے پورے لگان سے کچھ زیادہ کی نمائندگی کرتا ہے اور کاشت کے اخراجات اور مزدوروں کی اجرتوں پر بھی حاوی ہو سکتا ہے۔

صوبجات متوسط کی طرح بمبئی کے قحط نے کسانوں کو وہ سہولتیں مہیا کر دیں جن کی توقع ایک انصاف پسند اور ہمدرد زرعی نظام سے کی جانی چاہیئے۔ اُن اضافوں کو برقرار نہ رکھا جا سکا جو 66ء میں شروع ہونے والے بندوبست کے دوران کیے گئے تھے۔ اگر آدھا صوبہ بھی بیچ دیا جاتا جب بھی سرکاری مطالبہ وصول نہ ہوتا۔ چنانچہ 1902 اور 1905 میں حکومت بمبئی گجرات میں شرح مال گزاری کم کرنے میں مصروف رہی۔ تخفیف کے متعلق کوئی ضابطے نہیں شائع کیے گئے ہیں۔ مختلف افسروں کے گوناگوں اختیارات تمیزی کے علاوہ لوگوں کو یہ نہیں معلوم ہے کہ سرکاری مطالبے پر کس قسم کے حدود عاید کیے گئے ہیں۔ لوگوں کو یہ بھی نہیں معلوم ہے کہ آئندہ برسوں میں یا اگلے بندوبست کے موقع پر مطالبہ میں کس حد تک اضافہ کیا جائے گا۔ بدحالی یا خوش حالی کی مناسبت سے سرکاری مطالبے کو کم زیادہ کرنے کی متلون پالیسی زرعی خوش حالی کی قاتل ہوا کرتی ہے۔ ملک میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ حکومت زیادہ سے زیادہ وصولیابی کرنا چاہتی ہے تاکہ لوگ ہمیشہ مفلوک الحال اور مقروض رہیں۔ کسانوں میں بڑی بددلی پائی جاتی ہے جو آئندہ ایک سیاسی خطرہ بن سکتی ہے۔

بڑے پیمانے پر تدارک کی تدابیر اختیار کی جانی چاہئیں۔ کیننگ اور لارنس کا زمانہ ہوتا تو مندرجہ ذیل اقدامات کیے جاتے۔ حق لگان داری کی تعریف و توسیع کی جاتی، خاص خاص اور قطعی بنیادوں پر اضافے کیے جاتے اور مال کی عدالتیں قایم کی جاتیں تاکہ کسانوں کو یقین ہوتا کہ وہ اپنے کھیتوں کی نصف خالص پیداوار کے حقدار ہوں گے۔ لیکن 1901ء میں جو اقدامات کیے گئے وہ اُن اقدامات کے مشابہ تھے جو صوبجات متوسط اور پنجاب میں کیے جا چکے تھے۔ حکومت کو نادہندہ مالکان کا وہ حق انتقال چھیننے کا اختیار دینے کے لیے، جو زمین سے وابستہ تھا، ایک بل پیش کیا گیا۔ مرہٹوں کے زمانے سے حق انتقال میراثی لگان داری کا لازمی جز سمجھا جاتا تھا۔ اس کی وجہ سے زمین قابل فروخت سمجھی جاتی تھی اور مالکانہ حق رکھنے والے کسانوں کے وسائل میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ برطانوی حکومت نے دکن میں انگریزی راج شروع ہوتے ہی اس حق کو تسلیم کر لیا تھا۔ 1879 کے لینڈ ریونیو ایکٹ نے اس کی وضاحت کے ساتھ تصدیق کر دی تھی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ مال گزاری ادا نہ ہونے کی وجہ سے نیلام ہونے کی صورت میں لگان داری کے لازمی جز کی حیثیت سے حق انتقال خریدار کو حاصل ہوگا۔ اسی سال برطانوی راج میں بمبئی کے مالکانہ حق رکھنے والے کسان حق انتقال استعمال کرتے رہے تھے۔ بیس سال سے زیادہ مدت سے حق انتقال کو قانونی تحفظ حاصل تھا۔ اب حکومت مال گزاری ادا نہ ہونے کی صورت میں اس حق کو چھین لینے کے اختیارات حاصل کرنا چاہتی تھی۔ بل میں ایسے پس ماندہ علاقوں یا پس ماندہ قبیلوں کا ذکر نہیں کیا گیا تھا۔ جن تک یہ کارروائی

محدود رکھی جاتی۔ تمام صوبے اور مالکانہ حق رکھنے والے تمام کسانوں کے تعلق سے حکومت یہ اختیارات حاصل کرنا چاہتی تھی۔

بمبئی کے لوگوں نے کسی سرکاری کارروائی کے خلاف اتنی شدت کے ساتھ احتجاج نہیں کیا تھا۔ جیسا کہ اُس ایکٹ کے خلاف کیا جس کو وہ ضبطی کا قانون سمجھتے تھے۔ بمبئی کے سبھی حصے اس احتجاج میں شریک تھے۔ مالکانہ حق رکھنے والے زیادہ تر کسان سمجھتے تھے کہ اُن کے مسلّمہ حقوق پر ضرب لگائی جا رہی ہے۔ بمبئی لیجسلیٹو کونسل کے منتخب اراکین نے اس اقدام کے خلاف وقیع اور زوردار دلیلیں پیش کیں۔ جب اُن کا احتجاج نظر انداز کیا گیا تو وہ ایوان سے اُٹھ کر چلے گئے۔ 1879ء کے ایکٹ میں ترمیم کردی گئی جس کی رو سے حکومت کو اختیار حاصل ہوگیا کہ مال گزاری ادا نہ کرنے کی وجہ سے جو کھیت نیلام کیے جائیں اُن کا دوبارہ ایسا بندوبست کیا جائے جس میں حق انتقال شامل نہ ہو۔

اس قسم کے اقدامات ایک زراعت پیشہ قوم کی تقویت کے باعث نہیں ہوتے ہیں۔ اُن سے اُن لوگوں کی جائیدادوں میں اضافہ اور معاشی حالت میں سدھار نہیں ہوتا ہے۔ مالکانہ حقوق رکھنے والے بمبئی کے کسان اب بھی زیادہ مفید اقدامات کے منتظر ہیں جن سے اُن کے حقوق کی حفاظت ہو، سرکاری مطالبہ نصف خالص پیداوار تک محدود رہے اور اضافے واضح اور منصفانہ بنیادوں پر کیے جائیں۔

مدراس

ایک گزشتہ باب میں بتایا جاچکا ہے کہ مدراس میں پیمائش پر مبنی بندوبست 1861ء میں شروع کیا گیا تھا۔ بندوبست تیس سال کے لیے کیا گیا تھا۔ چونکہ یکے بعد دیگرے اضلاع میں بندوبست کیا گیا تھا اس لیے یہ کام کئی سال تک جاری رہا۔ واقعہ یہ ہے کہ بمبئی کی طرح مدراس میں بھی بندوبست کا کام مسلسل جاری رہتا ہے۔ اس سے پہلے کہ آخری ضلعے یا تعلقے کا بندوبست یا نظرثانی مکمل ہو اُن علاقوں میں نئی نظرثانی کا وقت آجاتا ہے جن کا بندوبست تیس سال پہلے کیا گیا تھا۔ یہ انتظام حکام بندوبست کے لیے مفید ہے اور اُن علاقوں کو جہاں بندوبست کیا جاچکا ہے اگر تیس سال اطمینان سے زندگی گزارنے کا موقع دے دیا جائے تو لوگ بھی اس طریقہ کار پر معترض نہیں ہوتے ہیں۔ وہ صرف اتنا چاہتے ہیں کہ نظرثانی کے وقت کیے جانے والے اضافے واضح اور بنیادوں پر کیے جائیں۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ نیا مطالبہ اُن کی خالص پیداوار کے نصف سے تجاوز نہ کرے۔ ایک پچھلے باب میں 1875ء تک کے بندوبستوں کے نتائج

اعداد کی شکل میں دکھائے گئے تھے۔ بعد کے اٹھارہ برسوں یعنی 1898 تک کے بندوبستوں کے متعلق اسی قسم کے اعداد ذیل میں دیے جارہے ہیں جو ایک سرکاری رپورٹ سے حاصل کیے ہیں[1]

سال	مزروعہ علاقہ ایکڑوں میں	اس پر ہونے والی تشخیص پونڈ	کل رعیت واری مطالبہ پونڈ	ابواب وغیرہ پونڈ	مجموعی مطالبہ پونڈ
1876	1,92,00,000	32,40,000	27,70,000	3,80,000	31,50,000
1877	1,92,00,000	32,50,000	35,9 ,000	4,00,000	39,90,000
1878	1,91,00,000	32,60,000	37,20,000	4,10,000	41,30,000
1879	1,84,00,000	32,00,000	36,60,000	4,10,000	40,70,000
1880	1,81,00,000	31,80,000	36,40,000	4,10,000	40,50,000
1881	1,80,00,000	31,70,000	35,70,000	4,10,000	39,80,000
1882	1,83,00,000	32,10,000	36,30,000	4,40,000	40,70,000
1883	1,85,00,000	32,30,000	37,40,000	4,50,000	41,90,000
1884	1,87,00,000	32,40,000	35,00,000	4,60,000	39,60,000
1885	1,91,00,000	32,70,000	37,60,000	4,50,000	42,10,000
1886	1,95,00,000	33,10,000	38,60,000	4,60,000	43,20,000
1887	1,97,00,000	35,50,000	39,00,000	5,90,000	44,90,000
1888	1,98,00,000	35,70,000	39,20,000	5,70,000	44,90,000
1889	2,01,00,000	36,10,000	39,60,000	6,50,000	46,10,000
1890	2,02,00,000	36,30,000	39,00,000	6,40,000	45,40,000

[1] مدراس کے بورڈ آف ریونیو کی تجویز نمبر 542 مورخہ ۶، دسمبر 1900 ضمیمہ ا۔ پاؤنڈ دس روپے کے برابر تسلیم کیا گیا ہے۔ مالابار اور جنوبی کنارا چھوڑ دیے گئے ہیں۔

43,40,000	6,60,000	36,80,000	36,50,000	2,02,00,000	1891
47,10,000	6,80,000	40,30,000	37,10,000	2,07,00,000	1892
47,70,000	3,80,000	43,90,000	38,80,000	2,10,00,000	1893
50,90,000	5,70,000	45,20,000	39,50,000	2,13,00,000	1894
52,70,000	5,90,000	46,80,000	39,30,000	2,15,00,000	1895
49,60,000	5,60,000	44,00,000	40,00,000	2,15,00,000	1896
52,80,000	5,40,000	47,40,000	48,30,000	2,16,00,000	1897
54,00,000	5,50,000	48,50,000	40,50,000	2,16,00,000	1898

ان اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ 1877 کے قحط کے بعد پندرہ لاکھ ایکڑ بنجر ہو گئے تھے اور یہ نقصان تقریباً سات سال تک ہوتا رہا۔ 1885 میں مزروعہ علاقہ 1877 کے علاقے کے برابر ہو سکا۔

لیکن مندرجہ بالا نقشے سے ظاہر ہونے والی سب سے زیادہ حیرت ناک بات وہ اضافہ تھا جو اٹھارہ سال کی مدت میں مجموعی مطالبے میں ہوا تھا۔ زیر کاشت علاقہ 19 ملین ایکڑ سے 21½ ملین ایکڑ ہو گیا یعنی اُس میں 14 فیصدی سے بھی کم اضافہ ہوا۔ لیکن مجموعی مطالبہ 31,50,00 پونڈ سے بڑھ کے 54,00,000 پونڈ ہو گیا یعنی اُس میں 70 فیصدی اضافہ ہوا۔ مگر ہم مزروعہ علاقے کی تشخیص میں ہونے والے اضافے پر غور کریں تو یہ 33,40,000 پونڈ سے بڑھ کر 10,50,00 پونڈ ہو گیا یعنی تقریباً 25 فیصد اضافہ ہوا۔ اس بھاری اور غیر متناسب اضافے کی اصل وجہ کچھ رعیت واری علاقے کو ملنے والی آبپاشی کی سہولت تھی۔ محصول آبپاشی مال گزاری میں شامل کر دیا گیا تھا جس کی وجہ سے کسان یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ زمین کا مطالبہ کتنا ہے اور مہیا کیے جانے والے پانی کا محصول کتنا ہے۔

اس سوال پر کئی سال سے غور کیا جا رہا ہے کہ آبپاشی کا محصول اُن تمام زمینوں کے لیے لازمی قرار دیا جائے جو نہر کے قریب ہیں یا صرف اُن لوگوں سے وصول کیا جائے جو پانی استعمال کریں۔ لارڈ لارنس نے 1873 میں ہاؤس آف کامنز کی کمیٹی کے سامنے کہا تھا "نہر تعمیر کرنے کی انتہائی خواہش کے باوجود میں اُن کو (کسانوں کو) پانی لینے پر مجبور کرنے کے مقابلے میں نہر کی تعمیر کا ارادہ

ترک کردینے کو ترجیح دوں گا ۔[1] ڈیوک آف آرگل نے سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کی حیثیت سے تین سال پہلے یعنی 1870 میں اس خیال کی تائید کی تھی اُس نے لارڈ میو[2] کے نام اپنے خط میں کسانوں کے لیے آبپاشی کے حصول کو لازمی قرار دینے کے خلاف واضح دلائل پیش کیے تھے جس کا اقتباس ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔ " زیر غور دفعہ کا مقصد یہ ہے کہ مالی اعتبار سے اگر نہر ناکام ثابت ہو تو حکومت مالی نقصان سے خود کو محفوظ رکھ سکے۔ اس قسم کی ناکامی کے تین اسباب ہوسکتے ہیں۔ نہر آبپاشی کے لیے متوقع مقدار میں پانی مہیا نہ کر سکے یا متوقع مقدار میں پانی مہیا تو کیا جا سکے لیکن کسان متوقع حد تک اُس سے فائدہ اُٹھانے کو تیار نہ ہوں یا نہر کو منافع بخش بنانے کے لیے اُس کی تعمیر پر بہت زیادہ پیسہ خرچ کرنا پڑے اور اُس کی بنا پر اتنی بھاری شرح لگانی پڑے جو کسانوں کے لیے ناقابل برداشت ہو یا کسان اُسے ادا کرنے کے لیے از خود تیار نہ ہوں۔ پہلی صورت میں مجوزہ قانون کی رو سے حکومت کی ناکامی کا خمیازہ اُس کے بجائے کسانوں کو بھگتنا ہوگا جن کی مایوسی کی ذمہ دار خود حکومت ہوگی۔ دوسری صورت میں کسانوں کو اُس پانی کی قیمت ادا کرنی ہوگی جو اُن کے لیے بے کار ہے یا کم از کم جس کو وہ استعمال کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ وہ آبپاشی کے قواعد سے پوری طرح واقف نہیں۔ لیکن اس کی یہ معقول وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ وہ اپنی تمام زمین کی سینچائی کرنے کے بجائے اُس کا ایک حصہ بارانی فصلوں کے لیے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ جہاں تک تیسری وجہ کا تعلق ہے آپ کی حکومت سے زیادہ کسی اور کو اس امر کی یاد دہانی کرانا ضروری نہیں معلوم ہوتا کہ ضمانت شدہ اخراجات میں بڑی جلدی اضافہ ہو جایا کرتا ہے۔ اس بل کی دفعات کی رو سے سرکاری نہروں پر ہونے والے اخراجات ضمانت شدہ ہوں گے ۔"

" لوگوں کو آبپاشی پر مجبور کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اقدام ناپسند کیا جانے لگے گا جو بصورت دیگر ایک نعمت سے تعبیر کیا جانا چاہیے اور، جیسا کہ تجربہ بتاتا ہے ، اگر کسانوں کو مجبور نہ کیا جائے تو وہ جلد یا بدیر اُس کی قدر کرنے لگیں گے۔ آبپاشی کے ذرائع اُن کو میسر آنے کے بعد پڑنے والی پہلی خشک سالی اُن کو آبپاشی کی قدر کرنا سکھا دے گی ۔"[3]

---

[1] ۱۸۷۳ء کی رپورٹ ، سوال نمبر 4488

[2] مراسلہ مورخہ ۱۱ر جنوری 1870

(باقی اگلے صفحہ پر)

چنانچہ بنگال میں آج تک آبپاشی کا محصول کسانوں کو مرضی پر منحصر ہے وہ بڑے پیمانے پر سینچائی کرتے ہیں اور خوشی سے محصول ادا کرتے ہیں۔ لیکن بنگال کے مقابلے میں مدراس کی حکومت ہمیشہ سے زیادہ سخت اور زیادہ مطلق العنان رہی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ گورنر جنرل باجلاس کونسل اُس کی پوری نگرانی نہیں کرسکتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ رعیت واری علاقوں میں ایسی موثر اور تعلیم یافتہ رائے عامہ کی کمی ہے جو حکومت کو اعتدال پر مائل کرسکے اور لوگوں کی خواہشات سے باخبر رکھ سکے۔ چنانچہ مدراس میں اُس اسکیم کو 1900 میں قانون کی شکل دیدی گئی جس کو ڈیوک آف ارگل 1870 میں مسترد کرچکا تھا۔ کسانوں کو اپنی مرضی کے مطابق پانی استعمال کرنے اور اُس کا محصول ادا کرنے کی اجازت دینے کے بجائے ایک قانون بنایا گیا جس کی رو سے ان تمام کھیتوں کے لیے محصول آب پاشی ادا کرنا ضروری قرار دیا گیا۔ جن کے متعلق سمجھا گیا کہ انہیں نہروں سے فائدہ ہوگا چاہے وہ فائدہ پانی رسنے سے ہی کیوں نہ ہو۔ کسانوں کو اس کا موقع بھی نہیں دیا گیا کہ وہ عدالت میں اپیل کرسکیں اور یہ ثابت کرسکیں کہ اُن کی زمینوں کو نہروں سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا ہے۔

آب پاشی کا محصول زمین کے محصول میں شامل کر دیا گیا ہے۔ کسان یہ بھی نہیں جانتا ہے کہ کتنا محصول کھیت پر تشخیص کیا گیا ہے۔ اور کتنا پانی کا محصول ہے جس کو اُس کے کھیت کے لیے مفید سمجھا جاتا ہے۔ لیکن وہ اتنا جانتا ہے کہ مجموعی محصول اتنا زیادہ ہے کہ اُس کے کھیت کی آمدنی کا آدھا حصہ بھی اس کو نہیں مل پاتا ہے۔ کہیں کہیں تو محصول ادا کرنے کے بعد کسانوں کے پاس اُس کی محنت کی اُجرت اور کاشت کے اخراجات کے علاوہ کچھ نہیں بچتا ہے۔ آبپاشی کی سہولت نے کسے قحطوں سے تو محفوظ کر دیا ہے لیکن

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ: لہ آخری جملے میں جس بات کی طرف اشارہ کیا گیا تھا وہ 1890 میں اُسی وقت اڑیسہ میں پیش آئی جب میں وہاں کا قایم مقام کمشنر تھا۔ کسان 1896 تک خشک سالی تک نہر کے پانی کی طرف بے توجہی برتتے رہے تھے۔ اُس کے بعد انجینیروں کی مقرر کردہ شرح پر پانی لینے کے لیے ہزاروں درخواستیں آنے لگیں۔ کسانوں نے پانچ یا چھ سال تک پانی استعمال کرنے اور اُس کا محصول ادا کرنے کی پابندی بھی قبول کرلی۔ ہندستان کے کسان جاہل سہی لیکن دنیا کے کسی گوشے کے کسان اپنے مفادات اور فوائد کی حد تک اُن سے زیادہ چوکس نہیں ہوتے جہاں جہاں ناسمجھی سے کام نہیں لیا گیا ہے اور محصول ادا کرنے پر اُنھیں مجبور نہیں کیا گیا ہے وہاں کے کسان نہروں کو نعمت سمجھنے لگے ہیں اور پانی کا محصول ادا کرنے کے لیے خوشی سے تیار ہو جاتے ہیں۔

(باقی آگے صفحہ پر)

وہ نہ بچت کرسکتا ہے نہ اپنی حالت سدھار سکتا ہے۔

مندرجہ بالا نقشے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ 1887 کے بعد جب آب پاشی کا محصول زمین کے محصول میں شامل کر دیا گیا تو ابواب میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔ جب تک آبپاشی کا محصول زمین کے محصول سے علیحدہ تھا اُس وقت تک ابواب صرف مال گزاری پر لگائے جاتے تھے۔ لیکن جب آبپاشی کا محصول زمین کے محصول میں شامل کر دیا گیا تو ابواب ایک سال میں 4,60,000 پونڈ سے بڑھ کر 5,90,000 پاؤنڈ ہو گئے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ مدراس میں آب پاشی کا محصول زمین کے محصول سے علیحدہ دیا جائے تاکہ ابواب صرف مال گزاری پر لگائے جاسکیں۔

مدراس کے کسانوں کو سب سے زیادہ شکایت اِس بات کی ہے کہ تشخیص غیر یقینی ہوتی ہے۔ جیسا کہ ہم ایک آئندہ باب میں دیکھیں گے۔ 1882 میں لارڈ رپن نے، جو اُس وقت ہندوستان کا وائسرائے تھا، اس تذبذب کو دور کرنے کی کوشش کی تھی۔ اُس نے ایک واضح ضابطہ بنایا تھا کہ اُن ضلعوں میں، جن کی پیمائش اور بندوبست ہو چکا ہے، مال گزاری میں اضافہ صرف قیمتوں میں اضافے کی واضح بنیاد پر کیا جاسکے گا۔ حکومت مدراس نے اس قاعدے کو مان لیا تھا اور سرکاری مطبوعات میں اس اصول کی صراحت کی گئی تھی۔

1887 میں تیار ہونے والے مدراس ریونیو سٹلمنٹ مینول MADRAS REVENUE SETTLEMENT MANUAL میں کہا گیا تھا۔

"اس طرح معین کی جانے والی غلّوں کی قیمتوں کا اعلان کر دیا جاتے اور اُن میں تبدیلی نہ کی جائے۔"

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ: ؎ جنوری 1903 میں مجھے گوداوری اور کرشنا کے ڈیلٹوں میں واقع اُن گاؤں میں جانے کا اتفاق ہوا جہاں آبپاشی کی سہولتیں حاصل تھیں اور فصلوں پر خشک سالی کا مضر اثر نہیں پڑتا تھا مگر شرح تشخیص بھاری تھی۔ کسان غریب تھے اور عام طور سے مقروض رہا کرتے تھے۔ چونکہ مجموعی محصول ادا کرنے کے بعد کسانوں کے پاس پیداوار کا بہت کم حصہ بچا کرتا تھا اس لیے اُن کے کھیتوں کی قیمتیں بہت کم تھیں۔ گوداوری کے ضلعے میں مجھے ایک اعلیٰ افسر سے اس موضوع پر گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اتنے زرخیز کھیت اتنی کم قیمت کیوں اٹھاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حکومت کا مطالبہ ادا کرنے کے بعد اُن زرخیز کھیتوں کے جوتنے والوں کے پاس پیداوار کا بہت کم حصہ بچا کرتا تھا

"یہ کہ کسانوں کی ادائیگیاں، معیاری فصل کی اُس قابل معمول قیمت کی مناسبت سے بدلتی رہنا چاہئیں، جو ہر تیس سال بعد مقرر کی جاتی ہے۔"

"جہاں تک غلوں کی تعلق ہے نظر ثانی شدہ بندوبست استمراری ہونا چاہیے لیکن ہر تیس سال بعد جنس کی رقم میں تبدیلی کرنے کی شرحوں پر غور کیا جانا چاہیے۔" [1]

مدراس کی زراعتی کمیٹی MADRAS AGRICULTURAL COMMITTY نے 1889 میں اپنی رپورٹ میں لکھا تھا۔ "یہ کہا جاتا ہے، اور ہماری رائے میں ٹھیک ہی کہا جاتا ہے، کہ ہر بار ہونے والی نظر ثانی کے موقعے پر اگر زمینوں کی قیمتوں پر از سر نو غور کیا گیا تو زمین کی ترقی کے لیے یہ زہر قاتل کا کام کرے گا۔ ہمارا خیال ہے کہ فی الوقت حکومت اس خیال کی ہے کہ قیمتوں پر اس قسم کی نظر ثانی نہ کی جائے اور جہاں تک زمینوں کی جنسی قیمتوں کا تعلق ہے وہ بندوبستوں کو استمراری حیثیت دینے پر مائل نظر آتی ہے۔" [2]

مندرجہ بالا رپورٹ کے متعلق حکومت مدراس نے کہا تھا۔ "حکومت زمینوں کی درجہ بندی پر بھی نظر ثانی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی ہے۔ یہ اُصول بار بار بیان کیا جا چکا ہے اور سٹلمنٹ مینول SETTLEMENT MANUAL میں بڑی وضاحت کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔" [3]

یہ یقین دہانی انتہائی واضح تھی۔ مدراس کی لیجسلیٹو کونسل کے رکن وکٹارتنم نے لکھا تھا: "ان اعلانوں کی بنا پر لوگوں نے واقعی زمین میں روپیہ لگایا تھا۔ لیکن جب اُن پر عمل کرنے کا وقت آیا تو حکومت نے اُنھیں بھلا دیا اور اس قسم کے اضافے کرنے لگی جن کا قیمتوں کے اضافے سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ ترچناپلی، گوداوری اور کرشنا کے ضلعوں میں بندوبستوں پر نظر ثانی کرتے وقت ڈیلٹے کے علاقے کی زمینوں کی دوبارہ درجہ بندی کی گئی اور درجہ بندی کرتے وقت کسانوں کو دی ہوئی ترقیوں پر عموماً محصول لگایا گیا۔ درجہ بندی کا اصل کام ایک کم تنخواہ پانے والا کارکن کیا کرتا ہے۔ نجی کھیتوں پر تو اضافے 200، 300 بلکہ اُس سے بھی زیادہ فیصدی کیے گئے۔" [4]

---

[1] باب 2، دفعات 5 اور 6۔ باب 3، دفعہ 8

[2] پیراگراف 31.

[3] حکومت کا حکم مورخہ 4 جولائی 1889 پیراگراف 20

[4] "ہندوستان کے زرعی مسائل" نٹیسن اینڈ کمپنی۔ مدراس۔ ص 104 103
AND PROBLEMS TO INDIA

بمبئی کی طرح مدراس میں بھی یہ غیر یقینی حالات ترقیوں کی راہ میں حائل ہوتے ہیں اور زرعی خوشحالی میں مانع آتے ہیں۔ بمبئی کی طرح مدراس میں بھی اس امر کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے کہ زمین کے محصول کو ہر گاؤں اور ہر کھیت کی خالص پیداوار کے نصف تک محدود رکھنے کے لیے موثر اقدام کیا جائے اور محصول میں اضافہ خصوصی اور واضح بنیادوں پر کیا جائے۔ مثلاً قیمتوں میں اضافہ یا کاشت میں توسیع۔

صوبجات متوسط، پنجاب، بمبئی اور مدراس میں قانون مال کا موجودہ رجحان کچھ مدت پہلے پائے جانے والے رجحان سے افسوس ناک حد تک مختلف ہے۔ ملکہ کی حکومت کے ابتدائی برسوں میں اور کیننگ اور لارنس کے دور میں حکومت کے سامنے ایک بڑا مقصد یہ رہا کرتا تھا کہ وہ کسانوں کی حیثیت کو مستحکم بنائے، اُس کے حق لگان داری کی قدر و قیمت میں اضافہ کرے، اُس میں خود اعتمادی اور تقویت کا احساس پیدا کرے اور اُسے سماج کا خوش حال رکن نہ سہی مگر کارآمد رکن بنا دے۔ لارڈ کیننگ کے بنگال رینٹ ایکٹ، لارڈ لارنس کے پنجاب اور اودھ رینٹ ایکٹ اور 1863ء میں صوبجات متوسط میں ہونے والے بندوبست کا یہ مشترک مقصد تھا کہ کاشت کو ایک منفعت بخش پیشہ بنایا جائے اور حکومت کے مفادات اور زمینداروں اور کسانوں کے مفادات میں اتحاد پیدا کیا جائے۔

مگر مال کے حالیہ نظام کا رجحان مختلف معلوم ہوتا ہے۔ اُس کا مقصد ہے کہ زمین کی پیداوار پر حکومت کی گرفت مضبوط ہو جائے، زمینداروں اور کسانوں کے حقوق رفتہ رفتہ کم ہو جائیں اور ایک زراعت پیشہ قوم ایک انتظامی افسر کی مطلق العنان رائے کے تابع ہو جائے۔

قانون کے ذریعہ حاکم مال اور حاکم بندوبست کے اختیارات میں مزید اضافہ کر دیا گیا ہے۔ پنجاب اور صوبجات متوسط میں مدّت بندوبست تیس سال سے کم کر کے بیس سال کر دی گئی ہے۔ ان صوبوں کے کسانوں کے حق انتقال اراضی کو محدود کر دیا گیا ہے۔ بمبئی میں حکومت نے حق انتقال چھیننے کے اختیارات حاصل کر لیے ہیں۔ صوبجات متوسط میں زمینداروں اور کسانوں کے درمیان لگان کا تصفیہ حکومت کرتی ہے۔ بمبئی اور مدراس میں سرکاری مطالبے کو خالص لگان کے نصف تک محدود رکھنے کے قاعدے پر عمل نہیں کیا جاتا ہے۔ سرکاری اضافوں کو قیمتوں میں اضافے کی واضح بنیاد تک محدود رکھنے کا ضابطہ منسوخ کیا جا چکا ہے۔ مدراس میں پانی کا وہ محصول ضروری قرار دے دیا گیا ہے جس کی مذمت آرگل اور لارنس نے کی تھی اور اُسے مال گزاری کا جز بنا دیا گیا ہے۔

باب۔ 7

اراضی کے متعلق رپن اور کرزن کی تجاویز

مال گزاری کی غیر یقینی تشخیص اور بندوبست کے موقع پر زمینوں کی از سرِ نو مقرر کی جانے والی قیمتوں کی بنا پر ہونے والی پریشانی، ایسی خرابیاں تھیں جن کو دور کرنے کی کوششیں ایک کے بعد ایک کئی وائسرائے کرتے رہے۔ لارڈ میو کا خیال تھا کہ زمینوں کی نوعیت اور پیداوار کی مقدار کا ایک دفعہ تعین کرنے کے بعد اُس میں تبدیلی صرف قیمتوں میں ہونے والی تبدیلیوں کی بنا پر کی جائے۔ لارڈ نارتھ بروک بھی تشخیص کے محکم بالذات طریقے کی موافقت میں تھا اور ہر بندوبست کے موقع پر از سرِ نو قیمتیں مقرر کرنے کے خلاف تھا۔ بالآخر اس مسئلے کو لارڈ رپن نے اٹھایا۔ اپنے مراسلے مورخہ 17 اکتوبر 1882 میں اُس نے خواہش ظاہر کی کہ آئندہ ہونے والے بندوبستوں کو غیر یقینی حالات اور غیر ضروری تفتیش اور تحقیقات سے پاک کر دیا جائے۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک طرف تو کسانوں کو استمرار و تحفظ کا یقین دلایا جائے اور دوسری طرف "قطعی شرائط" پر مال گزاری میں اضافہ کرنے کے حق سے حکومت کو محروم نہ کیا جائے۔ قاری اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ یہ طریقہ اُن دو متضاد اصولوں کے درمیان سمجھوتا تھا جن پر ہندوستان کے حاکم بیس سال سے عمل کر رہے تھے۔

کیننگ اور لارنس جیسے لوگوں کا خیال تھا کہ مال گزاری کا تعین ہمیشہ کے لیے کیا جانا چاہیے اور کاشت میں ہونے والے آئندہ منافعوں سے مستفید ہونے کا حق ملک کے لوگوں کو حاصل ہونا چاہیے دوسرے حکام کی رائے تھی کہ کاشت کے بڑھتے ہوئے منافعوں کی بنا پر مال گزاری میں لامحدود اضافہ

کرنے کا حق حکومت کو حاصل ہونا چاہیے۔ لارڈ رپن کی ماہرانہ اسکیم نے دونوں مکاتیب خیال کی توقعات پوری کر دیں۔ اُس نے بڑھتی ہوئی قیمتوں کی بنا پر مال گزاری میں مسلسل اضافے کے لیے راستہ ہموار کر دیا۔ اسی کے ساتھ اُس نے کسانوں کو ایسی مال گزاری کے قریب قریب استمراری بندوبست کی پیش کش کی جس کی نمائندگی پیداوار کرتی تھی۔

حکام بندوبست سے گویا کہ لارڈ رپن نے کہا۔ ”اگر فصلوں کی قیمتوں میں اضافہ ہو تو آپ مال گزاری میں اضافہ کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔“ کسانوں سے اُس نے کہا ”آپ کو تمام غیر یقینی حالات اور پریشان کن تحقیقات سے نجات مل گئی۔ آپ جو زمین کا محصول ادا کریں گے وہ آپ کی پیداوار کا بڑا حصہ نہیں ہوگا۔“

لارڈ رپن نے مدراس اور بمبئی کی حکومتوں سے سلسلہ مراسلت شروع کیا اور اُن کی منظوری کے لیے اسکیم پیش کی۔ مدراس کی حکومت نے اس تجویز کو منظور کر لیا کہ جن اضلاع میں مال گزاری کی مناسب تشخیص کی جاچکی ہے یعنی اُن اضلاع کی حد تک جہاں پیمائش اور بندوبست کا کام مکمل ہو چکا ہے آئندہ بندوبستوں کے موقعوں پر صرف قیمتوں پر غور کیا جائے گا۔ حکومت بمبئی نے اس تجویز کے متعلق شکوک و شبہات کا اظہار کیا۔

طویل خط و کتابت کے بعد 1885 میں یہ معاملہ قطعی فیصلے کے لیے سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کے سامنے پیش کیا گیا۔ صرف دو سال پہلے وہ ہندوستان کے لیے مال گزاری کے بندوبست استمراری کی اسکیم نامنظور کر چکا تھا۔ خیال تھا کہ لارڈ رپن کی اسکیم منظور ہو گئی تو لوگ کم از کم مال گزاری کے غیر یقینی اور من مانے اضافوں سے نجات پا جائیں گے۔ یہ بھی خیال تھا کہ ربع صدی کے تلخ تجربوں کے بعد ملکہ کی حکومت سرکاری مطالبے کے تعین کے سلسلے میں ہندوستان کے پریشان حال کسانوں سے کوئی وعدہ کرے گی اور کوئی قابل فہم ضابطہ بنائے گی۔ لوگ سمجھتے تھے کہ لارڈ رپن کا ماہرانہ سمجھوتہ اس دشوار مسئلے کے قطعی حل کے طور پر منظور کر لیا جائے گا۔

لیکن سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کے فیصلے نے تمام اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اُس نے ہندوستان کے کسانوں کی خوشحالی کے بجائے ہندوستان کی مال گزاری کے مفادات کا پاس کیا اور واضح قاعدہ بنانے یا کسی قسم کا وعدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اُس نے سر الفریڈ لائل SIR ALFRED LYALL کو جواب دیتے ہوئے لکھا تھا ” ہندوستان میں اس وقت پائی جانے والی کچھ خاص خاص انتظامی دشواریوں کی وجہ کسی نہ کسی حد تک وہ وعدے ہیں جو گزشتہ موقعوں پر

کیے جاتے رہے ہیں۔" اُس کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ ہندوستان میں پائی جانے والی سب سے بڑی "انتظامی دشواری" کسانوں کا انتہائی افلاس ہے۔ وہ یہ بھی نہ سمجھ سکا کہ جب تک لوگوں کے لیے کوئی واضح ضابطہ نہ بنایا جائے یا اُن سے وعدہ نہ کیا جائے اُس وقت تک نہ ترقی ممکن ہے نہ زرعی دولت کی بچت۔

اس اصول کو تسلیم کرتے ہوئے کہ درآمد کے طریقوں کو آسان بنایا جائے اور لوگوں کو غیر ضروری پریشانیوں سے بچایا جائے سکریٹری آف اسٹیٹ نے مندرجہ ذیل قاعدے بنائے۔

1۔ بندوبست استمراری کا خیال ترک کیا جاتا ہے۔

2 ریاست زمین کی قیمت میں ہونے والی بے سعی اضافے میں حصّہ طلب کرنے کی حقدار ہے۔

3۔ بندوبستوں پر ہونے والی آئندہ نظرثانی کے موقع پر من مانے اختیارات، غیر یقینی حالات اور لوگوں کی پریشانیوں میں کمی کی جانی چاہیے۔

4 تشخیص کے ضابطوں میں ضروری ترمیم و تنسیخ کی جائے اور مال گزاری میں اضافہ صرف زمین کی قیمت میں ہونے والے اضافے کی بنیاد پر کیا جائے۔[1]

یہ تفصیلی ہدایتیں حالانکہ بہت نفیس ہیں پھر بھی کوئی ایسا واضح اور قابل فہم قاعدہ نہیں بنایا گیا جو ہندوستان کے کسانوں کو اُن کی ذمہ داریاں سمجھا سکتا اور حکام بندوبست کو اضافوں پر حدود عاید کرنے کے لیے مجبور کر سکتا۔ چنانچہ بندوبست حسب دستور ہوتے رہے۔ اور مال گزاری میں اُن بنیادوں پر اضافے کیے جاتے رہے جو کسانوں کے لیے قابل فہم نہیں تھیں اور جن کے خلاف وہ چارہ جوئی نہیں کر سکتے تھے۔ 1885 کے نئے قاعدوں نے اُن کی خوش حالی اور قوّت مدافعت میں کتنا اضافہ کیا یہ بات 1879 اور 1900 کے قحطوں نے واضح کر دی۔

اُس کے بعد یہ مسئلہ ایک دفعہ پھر اُن لوگوں نے اٹھایا جو ہندوستان کے انتظامی کاموں میں

---

[1] مراسلہ مورخہ 8 جنوری 1885 جس کا حوالہ مدراس کے ریونیو بورڈ کی تجویز مورخہ 6 دسمبر 1900 میں دیا گیا ہے۔ لارڈ رپن کی 1882 کی تجویز اور سکریٹری آف اسٹیٹ کے 1885 کے فیصلے کی اصل دستاویزات کبھی شائع نہیں کی گئیں۔ اُن میں ہندوستان کے مسئلہ اراضی کے متعلق کئی بیش بہا تجاویز شامل ہیں جن میں سر الفریڈ لائل کی تجویزیں بھی ہیں۔ ہندوستان کے زرعی نظام میں اصلاحات کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ انھیں ایک نیلی کتاب BLUE BOOK کی صورت میں جلد شائع کر دیا جائے۔

عمریں بتا چکے تھے۔ وہ ہندوستان کی ملازمت سے سبکدوش ہو چکے تھے لیکن حتی المقدور وہ ہندوستانی بھائیوں کی مدد کرنا چاہتے تھے اور اُن سے دوستانہ مراسم قایم کرنا چاہتے تھے۔ جس وقت ہندوستان 1900 کے قحط کا سامنا کر رہا تھا اُن لوگوں نے لندن میں ایک مجلس مشاورت منعقد کی اور سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کو ایک یادداشت گزرانی جس میں زرعی نظام کے موجودہ قاعدوں کو زیادہ واضح قابل فہم اور ہندوستان کے کسانوں کے لیے مفید بنانے کے متعلق کچھ تجاویز پیش کی گئی تھیں۔[1]

یادداشت میں مندرجہ ذیل پانچ تجویزیں پیش کی گئی تھیں۔

تیس سال کا قاعدہ ——— "کسی صوبے یا اُس کے حصے کے زمین کے محصول پر اس وقت تک نظر ثانی نہیں کی جائے گی جب تک پچھلی نظر ثانی کے بعد تیس سال نہ گزر جائیں۔"

نصف لگان کا قاعدہ ——— "جہاں مال گزاری مالکان اراضی ادا کرتے ہیں وہاں 1855 کے سہارنپور ضابطے کے اصول پر عام طور سے عمل کیا جانا چاہیئے جس کی رو سے مال گزاری کا مطالبہ اُن مالکان اراضی کے حقیقی لگان یا منافع کے نصف تک محدود کر دیا گیا تھا۔"

نصف پیداوار کا قاعدہ ——— "بمبئی اور مدراس کے زیادہ تر حصّوں کی طرح جہاں جہاں کسان براہ راست مال گزاری ادا کرتے ہیں وہاں اخراجات کاشت کی فیاضانہ منہائی کے بعد سرکاری مطالبہ خالص پیداوار کی قیمت کے نصف تک محدود رہنا چاہیئے۔ اور ملک کے اُن حصّوں میں بھی جہاں یہ سمجھا جاتا ہے کہ خالص پیداوار خام پیداوار کے ایک تہائی کے قریب ہوتی ہے اس مطالبے کو خام پیداوار کے ⅙ حصے سے تجاوز نہ کرنا چاہیئے۔"

اضافے کا قاعدہ ——— "ہندوستان کے اُن حصّوں میں جب نظر ثانی کا

---

[1] یادداشت پر 20 دسمبر 1900 کی تاریخ پڑی تھی اس پر دستخط مندرجہ ذیل نے کیے تھے۔ بنگال کے مرحوم چیف جسٹس رائٹ آنریبل سر رچرڈ گارتھ۔ بمبئی ہائی کورٹ کے سابق جج سر جان جارڈن۔ بمبئی کے مرحوم چیف سکریٹری سر ولیم ڈوربرن، مدراس کے مرحوم ریونیو سٹلمنٹ ڈائرکٹر مسٹر آر۔ کے پکل سی۔ ایس۔ آئی مدراس کونسل کے مرحوم رکن مسٹر جے۔ ایس۔ گارسٹن سی۔ ایس۔ آئی۔ مدراس میں واقع تنجور کے مرحوم کلکٹر مسٹر جے۔ بی۔ پیننگٹن۔ بنگال کے مرحوم ریونیو سکریٹری مسٹر ایچ۔ جے۔ رنالڈس۔ بنگال کے مرحوم کمشنر مسٹر جے۔ او۔ ڈانل۔ بمبئی کے مرحوم رکن کونسل مسٹر اے۔ راجرس۔ صوبجات متوسط کے مرحوم حاکم بندوبست مسٹر گڈرج اور اس کتاب کا مصنف۔

موقع آئے جہاں کسان حکومت کو براہِ راست مال گزاری ادا کرتے ہیں تو مال گزاری میں بجز اُس صورت کے کوئی اضافہ نہ کیا جائے کہ زمین کی مالیت میں مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر اضافہ ہوا ہو۔ (۱) سرکاری خرچ سے آبپاشی کے ذرائع کو ترقی دینے کی بنا پر یا (2) نظرثانی سے پہلے کے تیس سال کی اوسط قیمتوں کی بنیاد پر پیداوار کی قیمت میں ہونے والے اضافے کی بنا پر۔"

مقامی محاصل کا قاعدہ ———— " آخر میں ہم سفارش کرتے ہیں کہ ہر صوبے میں ایک حد مقرر کر دی جائے اور مقامی محاصل کی شمولیت کے بعد زمین کے محصول کو اُس حد سے تجاوز کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ ہماری رائے میں بنگال کی 6¼ فیصدی کی شرح منصفانہ ہے۔ اس شرح کو ۱۰ فیصدی سے تجاوز بہرحال نہیں کرنا چاہیئے۔"

ہمارے وہ قاری جو گزشتہ ابواب میں ہندوستان کے نظام مال کی کہانی پڑھتے رہے ہیں بڑی آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ یادداشت پیش کرنے والوں نے کوئی نئے قاعدے بنانے اور بدیسی اصولوں کو اپنانے کی سفارش نہیں کی ہے۔ اُنھوں نے مال کے اُن مختلف نظاموں کو تسلیم کر لیا ہے جو ہندوستان کے مختلف صوبوں میں جڑیں پکڑ چکے ہیں۔ انھوں نے اُن اصولوں کو تسلیم کر لیا ہے جو گزشتہ حکام نے بنائے تھے۔ اُنھوں نے جن قاعدوں کی سفارش کی ہے وہ اُن اصولوں سے مطابقت رکھتے ہیں جو عام طور سے ہندوستان میں تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اُنھوں نے اُس قسم کے بڑے اقدامات کی سفارش نہیں کی ہے جن کی سفارش کیننگ اور لارنس نے کی تھی مثلاً بندوبست استمراری کو توسیع دینے کی کارروائی۔ اُنھوں نے زمین پر لگنے والے مقامی محاصل کی منسوخی کا ویسا مطالبہ بھی نہیں جیسا اس کتاب میں کیا گیا ہے۔ اُن کی خواہش تو صرف اتنی تھی کہ اُن محاصل پر حد لگا دی جائے۔ یہ ضرور ہے کہ اپنے آخری قاعدے میں اُنھوں نے حدود کی سفارش غیر واضح الفاظ میں کی ہے۔ اس قاعدہ میں جو کچھ کہا گیا ہے اُس کا مفہوم یہ ہے کہ بنگال کی طرح جہاں محاصل لگان پر تشخیص کیے جاتے ہیں وہاں اُنھیں لگان کے 6¼ فیصدی سے تجاوز نہیں کرنا چاہیئے۔ لیکن ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی طرح جہاں ابواب مال گزاری پر لگائے جاتے ہیں وہ مال گزاری کے ۱۰ فیصدی سے تجاوز نہ کریں۔

سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا نے یادداشت حکومت ہند کو بھیج دی اور اس طرح اراضی کے سوال پر ایک دفعہ پھر بحث شروع ہو گئی۔ لارڈ کرزن نے اس موضوع کی قومی اہمیت کو سمجھا اور اُس پر خود غور کیا۔ اس کو بدقسمتی کے علاوہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اُس نے کھلی تفتیش کی ضرورت نہیں سمجھی اور لوگوں اور عوامی اداروں کی رائے معلوم کرنا بھی اُس نے ضروری نہیں سمجھا۔ ایک زراعت پیشہ قوم کی

بہبودی سے اس سوال کا اتنا قریبی تعلق ہے کہ رائے عامہ کا اظہار اس کے دونوں پہلوؤں پر غور کرنے کے سلسلے میں وائسرائے کی معاونت کرتا۔ جو لوگ مختلف صوبوں میں پائے جانے والے حقوق اراضی سے واقفیت رکھتے تھے اُن سے گفتگو کر کے بہت سی غلط فہمیاں دور کی جا سکتی تھیں۔ لارڈ کرزن نے صرف مقامی حکومتوں سے مشورہ کیا اور ظاہر ہے کہ مقامی حکومتوں نے اُن طریقوں کی حمایت کی جن پر وہ عمل کر رہی تھیں۔ اس صفائی کی تلخیص ایک سرکاری تجویز کی شکل میں پیش کر دی گئی[1] جو یادداشت کے قطعی جواب کے طور پر شائع ہوئی۔

یادداشت پیش کرنے والوں نے بندوبست استمراری کی توسیع پر زور نہیں دیا تھا۔ اُن میں کئی لوگ اس قسم کی توسیع کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اُنھوں نے صرف اُن اصلاحات کی مانگ کی تھی جن پر سب کو اتفاق تھا اور جن کی وجہ سے موجودہ نظام میں کوئی تبدیلی نہیں کرنی پڑتی۔ پھر بھی لارڈ کرزن نے یادداشت پیش کرنے والوں کی تجاویز کو مسترد کرنا مناسب سمجھا۔ اُس نے بندوبست استمراری کی مذمت بھی ضروری سمجھی جس کا مشورہ یادداشت پیش کرنے والوں نے نہیں دیا تھا۔

تجویز میں کہا گیا ہے "کچھ مدت پہلے اُس مکتب خیال سے تعلق رکھنے والے، جس کی نمائندگی حکومت ہند کے موجودہ معترضین کرتے ہیں، پورے ہندوستان میں بندوبست استمراری کی توسیع کی وکالت کیا کرتے تھے۔" "وہ (حکومت ہند) ایمانداری کے ساتھ اس تجویز کی حمایت نہیں کر سکتی ہے کہ کسانوں کے مفاد میں اُس طریقہ لگان داری کو معیاری نمونہ بنا کر پیش کیا جائے جس کو کسی متمدن ملک کے تجربے کی حمایت حاصل نہیں ہے۔[2]

جس "مکتب خیال" کا حوالہ دیا گیا ہے وہ اس قسم کے لوگوں کے تصورات کی نمائندگی کرتا تھا جیسے لارڈ کارنواس، سر ٹامس منرو، لارڈ ویلیزلی، لارڈ ہیسٹنگز، لارڈ کیننگ، لارڈ لارنس لارڈ ہیلی فیکس اور لارڈ اڈس لے LORD IDDEOLEIGH ان ممتاز اور نمایاں حاکموں کی شہرت کو جدید سامراج مجروح نہیں کر سکتا ہے جنھوں نے لوگوں کی طرف ہمدردانہ رویّہ اختیار کر کے اور اپنی قوّت عمل اور سوجھ بوجھ سے کام لے کر سلطنت ہندوستان کو تعمیر کیا تھا۔ جب لارڈ کرزن یہ کہتا ہے کہ مال گزاری کے بندوبست استمراری کو "کسی متمدن ملک کے تجربے کی حمایت

---

[1] گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کی تجویز مورخہ 16 جنوری 1902

[2] تجویز پیراگراف 5 اور 6

حاصل نہیں ہے۔" تو وہ خود اپنے ملک کی تاریخ کو بھلا رہا ہے جہاں بنگال میں کارنواس کے تعین مال گزاری کے پانچ سال بعد عظیم پٹ نے 1798 میں زمین کے محصول کے استمراری اور قابل انفکاک قرار دیا تھا۔

لیکن انگلستان کے دوامی بندوبست کے مقابلے میں بنگال کا استمراری بندوبست زیادہ حق بجانب تھا۔ انگلستان میں حق ملکیت صرف زمینداروں کو حاصل ہے اس لیے بندوبست سے صرف اُنھیں فائدہ پہنچا۔ بنگال کے بندوبست سے پوری قوم مستفید ہوئی۔ چونکہ وہاں زیادہ تر کسان زمین پر قابض و دخیل ہیں اس لیے زمینداروں سے زیادہ اُنھیں فائدہ پہنچا۔ انگلستان میں بندوبست کے ذریعہ ایک ایسے محصول پر منصفانہ حد قایم کی گئی جو قومی آمدنی کے بہت سے ذرائع میں سے ایک ہے۔ بنگال میں کاشت کا تحفظ کیا گیا جو قومی آمدنی کا قریب قریب واحد ذریعہ ہے۔ انگلستان میں بندوبست کا نتیجہ یہ ہوا کہ مال دار مالدار تر ہو گئے اور غریب غریب تر ہو گئے۔ بنگال میں اس نے مالدار طبقے کے بجائے غریبوں یعنی لاکھوں کسانوں کی مدد کی۔ انگلستان میں اس کی وجہ سے ایک محدود طبقے کی دولت میں اضافہ ہوا۔ بنگال میں اس نے پوری قوم کو خوشحال تر بنا دیا جو اُن قحطوں کا بہتر مقابلہ کرنے کے قابل بن گئی۔ جنھوں نے ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

لیکن جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے یادداشت میں بندوبست استمراری کا سوال اٹھایا ہی نہیں گیا تھا اس لیے ہمیں موجودہ باب میں صرف لارڈ کرزن کے اُن فیصلوں کا ذکر کرنا چاہیے جو اُس نے یادداشت میں پیش کی جانے والی پانچ تجویزوں کے متعلق کیے تھے۔ ہم اُن کا ذکر کرتے وقت پچھلی ترتیب برقرار رکھیں گے۔

تیس سال کا قاعدہ ——————— شمالی ہندوستان، مدراس اور بمبئی میں تیس سال کے لیے بندوبست کیے جاتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم پچھلے باب میں دیکھ چکے ہیں پنجاب اور صوبجات متوسط میں بندوبست کی مدت کم کر کے بیس سال کر دی گئی ہے۔ یادداشت پیش کرنے والوں نے زور دیا تھا کہ تیس سالہ بندوبست کا ہمدردانہ طریقہ تمام صوبوں میں برقرار رکھا جائے۔ لارڈ کرزن نے عمل درآمد کے موجودہ اختلاف کو حق بجانب قرار دیا اور یہ توقع ظاہر کی کہ رفتہ رفتہ یہ فرق ختم ہو جائے گا اُس نے کہا۔

" اس اختلاف کی وجوہ ظاہر ہیں جن سے ہم واقف ہیں۔ جہاں زمین زیر کاشت آ چکی ہے،

لگان مناسب ہیں اور پیداوار میں کوئی بڑی تبدیلی متوقع نہیں ہے وہاں تیس سال میں ایک دفعہ یعنی ہر نسل کی زندگی میں ایک بار سرکاری مطلبے کا تعین کر دینا کافی سمجھا جانا چاہیئے۔ لیکن جہاں حالات اس کے برعکس ہوں یعنی جہاں بہت سی زمین بنجر پڑی ہو، لگان کی شرح کم ہو اور کاشت کے رقبے میں کمی زیادتی ہوتی رہتی ہو یا جہاں سڑکوں، ریلوں یا نہروں کی تعمیر کی بنا پر یا آبادی میں اضافے یا بڑھتی ہوتی قیمتوں کی بنا پر وسائل میں اضافہ ہو رہا ہو وہاں اتنی مدت تک بندوبست کو ملتوی رکھنا عام لوگوں کے لیے بھی مفید نہیں ہے، جو بھاری اضافے کے بار کو برداشت کرنے کی قوت نہیں رکھتے ہیں، اور عام محصول دہندگان کے لیے بھی مضرت رساں ہے جو وقتی طور سے اس مزید آمدنی سے محروم ہو جاتے ہیں جس کے وہ حقدار ہیں۔ آیا کہ اُن قابل لحاظ اُمور کا اطلاق فی الوقت پنجاب اور صوبجات متوسط پر ہوتا ہے جن کی بنا پر تیس سال سے کم مدت کا بندوبست حق بجانب قرار دیا جا سکے اور آیا کہ اُن کی شدت رفتہ رفتہ کم ہوتی جائے گی، یہ ایسے دقیق سوالات ہیں جن پر حکومت ہند کو مناسب موقع پر غور کرنا چاہیئے۔" [1]

اختلاف کی مبینہ وجوہ بہ اعتبار تاریخ غلط ہیں۔ 1895 کے مقابلے میں، جب بیس سالہ بندوبست کیا گیا تھا، زراعت کے معاملے میں زیادہ پس ماندہ تھا، لگان کم تھے اور ریلوں اور سڑکوں کو ترقی دینے کی ضرورت وہاں زیادہ محسوس کی جا رہی تھی۔ 1833 اور 1837 میں جب وہاں تیس سالہ بندوبست کیے گئے تھے، شمالی ہندوستان بمبئی اور موجودہ پنجاب کے مقابلے میں زیادہ پس ماندہ تھا اور وہاں زراعت کی توسیع کم ہوئی تھی۔ اُس زمانے میں سوچا جاتا تھا کہ لوگوں کو طویل المدت بندوبستوں سے مستفید ہونے کا موقع دیا جانا چاہیئے۔ ایک نسل کی زندگی میں ہونے والی ترقی کے پھل انھیں ملنے چاہئیں اور تیس سال تک چین کی زندگی گزارنے کا موقع دے کر کاشت کو ترقی دینے کے عوامل مہیا کرنے چاہئیں بار بار اضافے کرنے کی تنگ دلانہ خواہش نے 1895 کی پالیسی کو جنم دیا اور اپنے نتائج کی بنا پر وہ پالیسی قابل مذمت ٹھہری۔ پنجاب اور صوبجات متوسط کے لوگ توقع کرتے ہیں کہ مندرجہ بالا اقتباسات کے آخری جملے میں جو اُمید دلائی گئی ہے وہ جلد پوری ہو جائے گی اور لارڈ ولیم بینٹنک، لارڈ کیننگ اور لارڈ لارنس کی فیاضانہ پالیسی پر پھر عمل کیا جانے لگے گا۔

---

[1] تجویز، پیراگراف 18

نصف لگان کا قاعدہ ــــــــ اس قاعدہ کے متعلق حکومت کا اعلان مندرجہ ذیل اقتباس میں شامل ہے۔

" حالانکہ 50 فیصدی کا معیار کبھی معینہ اور غیر متغیر اصول کے طور پر پیش نہیں کیا گیا پھر بھی اس امر کی کوشش کی جاتی رہی ہے اور آن زمینداری اضلاع میں، جہاں عارضی بندوبست کئے گئے ہیں، یہ روز افزوں رجحان پایا جاتا ہے کہ شرح قریب قریب اتنی ہی رہے۔ خصوصی حالات میں اس سے بہت کم شرح مقرر کی جاتی ہے۔ حکومت ہند اس کی ضرورت نہیں سمجھتی کہ ایسے امور کے متعلق نئے ضابطے بنائے جائیں جن کے بارے میں اُس کی عام پالیسی واضح ہے اور جن پر بجز اُن صورتوں کے یکساں عمل کیا جاتا ہے کہ مقامی حالات مختلف قسم کی کارروائی کو حق بجانب قرار دیں۔" [1]

1855 کے سہارن پور کے ضابطے اور سر چارلس وڈ کے 1864ء کے مراسلے میں کہا گیا تھا کہ مال گزاری کی تشخیص لگان یا مناسب لگان کے نصف تک محدود رہے گی۔ جیسا کہ پچھلے ابواب میں بتایا جا چکا ہے صوبجات متوسط اور دوسرے صوبوں میں اس حد سے تجاوز کیا گیا تھا۔ غالباً مندرجہ بالا الفاظ کا مقصد یہ یقین دلانا تھا کہ اُس حد کو ملحوظ رکھنے کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ ہندوستان کے لوگ توقع کرتے ہیں آئندہ بندوبستوں کے موقعوں پر کسی صوبے میں نصف لگان کے قاعدے کی خلاف ورزی نہیں کی جائے گی۔

نصف پیداوار کا قاعدہ ــــــــ جہاں تک اس قاعدے کا تعلق ہے حکومت کی تجویز میں یادداشت پیش کرنے والوں کے مقصد کو غلط انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ یادداشت پیش کرنے والوں نے دہری حدود کی سفارش کی تھی۔ (1) یہ کہ مال گزاری خالص پیداوار کے نصف سے تجاوز نہ کرے۔ (2) ہندوستان کے اُن حصوں میں جہاں مال گزاری خالص پیداوار کے نصف سے زیادہ ہوتی ہے وہاں وہ خام پیداوار کے $\frac{1}{5}$ سے تجاوز نہ کرے۔ حکومت کی تجویز میں کہا گیا ہے۔ " اگر خام پیداوار کے اُس اصول پر باضابطہ طور سے عمل کیا جائے، جس کی سفارش یادداشت پیش کرنے والوں نے کی ہے تو اُس کی بنا پر ہر جگہ مال گزاری میں اضافہ ہو جائے گا۔" [2]

---

[1] تجویز، پیراگراف 13

[2] تجویز، پیراگراف 17

یاد داشت پیش کرنے والوں نے باضابطہ عمل درآمد کے لیے کوئی اصول پیش نہیں کیا تھا انھوں نے صرف زیادہ سے زیادہ حد کا تعین کیا تھا۔ گجرات میں جس کو عام طور سے خالص پیداوار کا نصف سمجھا جاتا ہے وہ بہت سے گاؤں اور کھیتوں کی حد تک خام پیداوار کے 1/3 سے زیادہ ہوتا ہے مدراس میں یہ فرض کیا جاتا تھا کہ خام پیداوار کا ایک تہائی حصہ خالص پیداوار کے نصف کے برابر ہوتا ہے اور اس لیے کبھی کبھی خام پیداوار کے ایک تہائی کا مطالبہ مال گزاری کے طور پر کیا جاتا تھا[1] اس قسم کی غلطی کا ازالہ اور ضرورت سے زیادہ تشخیص کی روک تھام کرنے کے لیے یادداشت پیش کرنے والوں نے ایک مزید تجویز رکھی تھی تاکہ خالص پیداوار کا نصف حصہ کسی صورت میں خام پیداوار کے 1/2 سے تجاوز نہ کرسکے حالانکہ وہ نصف خالص لگان کے قاعدے کو تسلیم کرتے تھے۔ اگر حکومت نصف خالص پیداوار کے اُس قاعدے کے ساتھ جو 1864ء میں بنایا گیا تھا یہ دوسری حد بھی تسلیم کرلیتی تو مدراس اور بمبئی کے بہت سے گاؤں اور کھیت ضرورت سے زیادہ بھاری شرح تشخیص سے محفوظ رہتے۔

اضافے کا قاعدہ ______ یادداشت پیش کرنے والوں کا مقصد وہی تھا جو لارڈ رپن کے پیش نظر تھا یعنی اُن بنیادوں کی وضاحت کردی جائے جن پر ریاست مال گزاری کے مطالبے میں اضافہ کرنے میں حق بجانب سمجھی جاسکتی ہے۔ اُنھوں نے لارڈ رپن کے اس قاعدے کو تسلیم کرلیا کہ بڑھتی ہوئی قیمتوں کی بنیاد پر اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ اُنھوں نے تو مزید یہ بھی کہا کہ سرکاری نہروں کی بنا پر ہونے والی ترقی اضافے کی معقول وجہ سمجھی جاسکتی ہے۔ یادداشت پیش کرنے والے چاہتے تھے کہ مالکانہ حق رکھنے والا ہندوستان کا ہر کسان یہ محسوس کرے کہ ریاست صرف مناسب

---

[1] STANDING INFORMATION FOR MADRAS PRESIDENCY

میں، جو 1879 میں شائع ہوئی تھی، ایک قاعدہ درج تھا جس کی رو سے اُن علاقوں میں جہاں سرکاری نہروں کی وجہ سے زمین نے ترقی نہیں پائی تھی مال گزاری کی زیادہ سے زیادہ حد خام پیداوار کا ایک تہائی حصہ مقرر کیا گیا تھا۔ جب اس کی طرف اشارہ کیا گیا تو حکومت مدراس نے اپنی تجویز مورخہ 13 مارچ 1901 میں صراحت کی کہ یہ قاعدہ غلطی سے درج ہوگیا تھا اور "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولف کی غلط فہمی نے اس کو جنم دیا تھا"۔ تعجب اس بات پر ہے کہ بیس سال سے زیادہ مدت یعنی یادداشت کی اشاعت تک اس غلطی کی تصحیح نہیں کی گئی۔ ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اکثر مال گزاری کی تشخیص خام پیداوار کے ایک تہائی کی بنیاد پر کی جاتی تھی۔

اور منصفانہ بنیادوں پر مال گزاری میں اضافہ کرتی ہے اور اُسے بھی اُسی قسم کا تحفظ حاصل ہونا چاہیے جیسا کہ بنگال کے نجی زمینداروں کے کسانوں کا اب کیا جا رہا ہے۔ لیکن لارڈ کرزن کی حکومت نے مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر اُس کا تحفظ کرنے سے انکار کر دیا۔

"جائداد کی بڑھتی ہوئی قیمت کا ایک حصہ پانے کے حق سے ریاست کو محروم کرنا اور یہ کہنا کہ وہ محض قیمتوں کے اُن اعداد و شمار سے اخذ ہونے والے اضافے کے حصہ پانے کی حقدار ہے، جو فی نفسہ غلط اور یک طرفہ ہوتے ہیں، ایسا ہی ہے جیسے کچھ لوگوں کے حق میں اُس اضافے سے دست بردار ہو جایا جائے جو اُن کی محنت کا نتیجہ نہیں ہے اور جو جزوی طور سے مفاد عامہ کے کاموں مثلاً نہروں اور ریلوں پر سرکاری روپیہ خرچ کرنے کا نتیجہ ہے اور جزوی طور سے اُن بڑھتی ہوئی قیمتوں کا نتیجہ ہے جن کی وجہ توسیع پذیر وسائل اور تہذیب کا بلند تر معیار ہے۔" [1]

اس دلیل میں اصل بات کو توڑ مروڑ کے پیش کیا گیا ہے۔ یادداشت پیش کرنے والوں نے حکومت سے کبھی نہیں کہا کہ وہ اپنے جائز حقوق سے دست بردار ہو جائے۔ انھوں نے ریاست کے اس حق کو پوری طرح تسلیم کیا کہ اُن بنیادوں پر مال گزاری میں اضافہ کیا جا سکتا ہے جن کا ذکر سرکاری تجویز میں کیا گیا ہے۔ اگر نہروں کی وجہ سے پیداوار میں اضافہ ہو تو حکومت کو حق حاصل ہے کہ وہ مال گزاری میں اضافہ کرے۔ اگر ریلوں کی وجہ سے قیمتیں بڑھ جائیں تو حکومت اپنا مطالبہ بڑھا سکتی ہے۔ اگر "توسیع پذیر وسائل" اور "تہذیب کے بلند تر معیار" کی بنا پر قیمتوں میں عام طور سے اضافہ ہو جائے تو حکومت اُس کی مناسبت سے مال گزاری میں اضافہ کر سکتی ہے۔ لیکن اگر ان میں سے کوئی سبب نہ پایا جائے تو ریاست کو بار بار ہونے والے بندوبستوں کے موقعوں پر مطالبے میں من مانا اضافہ نہیں کرنا چاہیے۔ یہ یادداشت پیش کرنے والوں کی دلیل تھی۔ اس دلیل کا کوئی جواب نہیں دیا گیا ہے۔

جہاں تک ہندوستان کے کسانوں کا تعلق ہے، "توسیع پذیر وسائل" اور "تہذیب کے بلند تر معیار" سے اُسے جو فوائد حاصل ہوتے ہیں اُن کی نمائندگی پیداوار اور قیمتوں کے اضافے کرتے ہیں۔ اگر نہروں کی وجہ سے اُس کی پیداوار بڑھ جائے اور اگر ریلوں اور سڑکوں کی وجہ سے قیمتوں میں اضافہ ہو جائے تو سرکاری مطالبے میں اضافہ حق بجانب ہوگا۔ اگر پیداوار اور قیمتوں میں کوئی

---

[1] تجویز، پیراگراف 22

اضافہ نہ ہو، اگر اُس کی معاشی حالت جوں کی توں رہے ، تو محض اس بنا پر کہ اُس کا پڑوسی ریل میں سفر کرنے کی استطاعت رکھتا ہے یا اُس کے قرض خواہ کے گھر کے قریب عدالت دیوانی قایم ہوگئی ہے اُس پر حاکم بندوبست کو زیادہ بار نہیں ڈالنا چاہیئے۔ اُس صورت میں زمین کے محصول میں اضافہ کرنا جب زمین زیادہ پیداوار نہ کر سکے اور پیداوار زیادہ قیمت نہ اُٹھا سکے اُن منافعوں پر محصول لگانے کے جو کسان کو حاصل نہیں ہوتے اور تہذیبی ترقی کے ساتھ اُس کو مفلوک تر بنانے کے مترادف ہے۔

مقامی محاصل کا قاعدہ —————— پچھلے ابواب میں جو کہا گیا ہے اُس سے قاری پر یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ مال گزاری کے علاوہ زمین پر لگنے والے خصوصی محاصل ظالمانہ اور غیر منصفانہ ہیں اور اُن سے نصف لگان اور نصف پیداوار کے اُن قاعدوں کی خلاف ورزی ہوتی ہے جو 1855 اور 1864 میں بنائے گئے تھے۔ یادداشت پیش کرنے والوں نے اُن کی تنسیخ کی سفارش نہیں کی تھی۔ وہ تو صرف اتنا چاہتے تھے کہ اُن کو حد کے اندر رکھا جائے۔ اس کے لیے لگان پر 6½ فیصدی اور مال گزاری پر ۱۰ فیصدی کی حد تجویز کی گئی تھی۔ شمالی ہندوستان، پنجاب[2]، صوبجات متوسط اور دوسرے صوبوں میں پائی جانے والی موجودہ شرح اس سے کہیں زیادہ ہے۔ ہندوستان کے لوگوں نے سرکاری تجویز میں ظاہر کی جانے والی مندرجہ ذیل رائے سے بڑی اُمیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔

"یہ شبہ بے بنیاد نہیں کہ تقسیم محاصل غیر منصفانہ ہے اور مالکان اراضی بار کا وہ حصہ بھی کسانوں پر ڈال دیا کرتے ہیں جو از روئے قانون اُن پر نہیں پڑنا چاہیئے۔ لوگوں کی موجودہ پس ماندگی کے پیش نظر اس ناانصافی کا موثر ازالہ ممکن نہیں ہے۔ سوچنا پڑتا ہے کہ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ موقع آنے پر اُس بار میں کمی کی جائے جو زراعت پیشہ طبقے پر اُس حد تک ڈالا جاتا ہے جس حد تک از روئے قانون اُن پر نہیں پڑنا چاہیئے۔ حکومت ہند کسانوں کو سہولت دینے کا موقع تلاش کرے گی۔"[1]

---

[1] لارڈ کرزن کی تجویز کے مطابق پنجاب میں لگنے والے مقامی محاصل "لگان کے 5.2 فیصدی کے برابر ہوتے ہیں" لیکن ایک حالیہ سرکاری کتاب کے مطابق "پنجاب میں لگنے والے محاصل سالانہ قیمت کے 12½ فیصدی سے زیادہ نہیں ہیں"

"اخلاقی اور مادی ترقی اور ہندوستان کی حالت۔ MORAL AND MATERIAL PROGRESS & CONDITION OF INDIA 1901-2

[2] تجویز، پیراگراف 25

اس بات کو تقریباً دو سال ہو چکے ہیں۔ مارچ 1901 اور مارچ 1902ء میں دو بجٹ بنائے جا چکے ہیں جن میں بڑی بچتیں دکھائی گئی ہیں۔ لیکن زمین پر لگنے والے اُن خصوصی محاصل میں سے ایک بھی منسوخ نہیں کیا گیا جو 1871 کی لامرکزیت کی اسکیم کے بعد لگائے گئے تھے۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ بمبئی اور مدراس کے وہ موجودہ مالکان، جو حکومت کو براہِ راست زمین کا محصول ادا کرتے ہیں، آج بھی بنگال کے نجی زمینداروں کے اسامیوں کے مقابلے میں غیر محفوظ ہیں۔ بنگال کا کسان اپنی پیداوار کا 11 فیصدی زمیندار کو ادا کرتا ہے۔ گجرات کا کسان 20 فیصدی حکومت کو ادا کرتا ہے۔ بنگال کا کسان اُن خصوصی حالات سے واقف ہے جن کی بنا پر اُس کا زمیندار اضافے کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ لیکن مدراس اور بمبئی کا کسان اُن حالات سے واقف نہیں ہے جن کی بنا پر حکومت آئندہ بندوبست کے موقع پر اضافہ کر سکتی ہے۔ بنگال کے کسان کو پہلے سے معلوم ہوتا ہے کہ کس حد تک اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن بمبئی اور مدراس کے کسان کو اس کا کوئی علم نہیں ہوتا ہے کہ حاکم بندوبست کتنا اضافہ کرے گا۔ بنگال کا کسان بھاری اضافے کے خلاف عدالت میں چارہ جوئی کر سکتا ہے۔ لیکن بمبئی اور مدراس کا کسان بھاری سے بھاری اضافے کے خلاف بھی کسی عدالت میں اپیل نہیں کر سکتا۔ قطعی اور یقینی لگان کی بنا پر بنگال کا کسان اپنے حق لگان داری کی قدر کرتا ہے اور ساہوکاروں کی غلامی سے آزاد ہو گیا ہے۔ لیکن غیر یقینی اور بدلتے ہوئے سرکاری مطالبے کی بنا پر مدراس اور بمبئی کے کھیت جوتنے والے کسان کے دل میں نہ اُمید ہوتی ہے، نہ ولولہ ہوتا ہے اور نہ روپیہ پس انداز کرنے کی خواہش ہوتی ہے اور وہ سال بہ سال قرض کی دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے۔ لارڈ رپن چاہتا تھا کہ مالکانہ حق رکھنے والے کسانوں کو اُس قسم کا تحفظ حاصل ہو جائے جیسا بنگال کے کسانوں کو حاصل ہے لیکن سکریٹری آف اسٹیٹ نے 1885 میں اس تجویز کو مسترد کر دیا۔ صدی کے آخری دنوں میں ہندوستان کے بے زبان کسانوں کے دوستوں نے ایک دفعہ پھر اُن کے تحفظ کی درخواست کی لیکن لارڈ کرزن نے 1902 میں اُن کی درخواست خارج کر دی۔

باب 8

تجارت اور صنعت

ایسٹ انڈیا کمپنی کی حاسدانہ پالیسی کی بنا پر وہ تمام قدیم صنعتیں رفتہ رفتہ ختم ہو چکی تھیں جن کے لیے ہندوستان مشہور تھا اور 1837 میں ملکہ وکٹوریہ کی تخت نشینی کے وقت ہندوستان کی واحد قومی صنعت زراعت تھی۔ 1858 میں ملک کے زیر نگیں آنے کے بعد بھی ہندوستان میں نئی صنعتیں شروع کرنے کے لیے کوئی اقدام نہیں کیا گیا اور اُنیسویں صدی کی آخری رباعیوں میں بھی ہندوستان کے دست کار غربت و افلاس کے شکار رہے۔ وقتاً فوقتاً کچھ تجربے کیے بھی گئے تو وہ چھوٹے پیمانے پر کیے گئے اور ہندوستان کے عظیم مفادات کا خیال نہیں رکھا گیا۔

کپاس ——— انیسویں صدی کی ابتدا تک سوت کاتنا اور کپڑا بننا ہندوستان کی قومی صنعتوں میں شمار ہوتا تھا۔ چرخے اور ہتھ کرگھے کا رواج عام تھا اور بلا مبالغہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کی نصف بالغ عورتیں اپنے شوہروں اور باپوں کی آمدنی میں اپنے خون پسینے کی کمائی سے اضافہ کیا کرتی تھیں۔ یہ صنعت ہندوستان کے دیہات کے لیے خاص طور سے موزوں تھی۔ اُس زمانے میں کارخانے تو تھے نہیں۔ گاؤں کی عورتیں دیہات کے بازار ہاٹ سے روئی خریدا کرتی تھیں اور گاؤں کے بنکروں کے ہاتھ سوت بیچا کرتی تھیں جو کپڑا تیار کرکے تاجروں کو مہیا کیا کرتے تھے۔ اس طرح تیار ہونے والے کپڑے کے لاکھوں تھان عرب، ولندیزی اور پرتگال کے لوگ برآمد کیا کرتے تھے اور یورپ کی قومیں ہندوستان سے کپڑے کی منافع بخش تجارت کرنے کے لیے ایک دوسرے کا مقابلہ کیا کرتی

تھیں۔ لیکن جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں قدم جما لیے تو اس پالیسی میں بنیادی فرق آگیا۔ انگریز ہندوستان اور یورپ کے درمیان مال لانے لے جانے کے کاروبار سے مطمئن نہیں تھے بلکہ برطانوی صنعت کار چاہتے تھے کہ ہندوستان کی صنعتوں کو ختم کر دیا جائے تاکہ برطانوی صنعتیں فروغ پا سکیں۔ اُن کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان صرف خام مال پیدا کرے اور انگلستان کی صنعتوں کے تابع رہے۔ اس پالیسی پر کس طرح عمل کیا گیا اور اُس میں کس طرح کامیابی حاصل کی گئی، اس کی داستان جلد اول میں بیان کی جا چکی ہے۔

کچھ مدت بعد جب یورپ میں ہتھ کرگھے کی جگہ توانائی سے چلنے والے کرگھوں نے لے لی تو ہندوستان کے سرمایہ داروں نے اپنے ملک میں کپڑے کے کارخانے قائم کرنے شروع کیے۔ اس نے ایک دفعہ پھر لنکاشائر کے صنعت کاروں کو رقابت پر آمادہ کر دیا۔ حکومت ہند نے 1874 سے 1879 تک جس مالی پالیسی پر عمل کیا اُس کا تذکرہ پچھلے ابواب میں کیا جا چکا ہے۔ صدی کے آخر تک کی دردناک داستان اگلے ابواب میں بیان کی جائے گی۔

لیکن توانائی سے چلنے والے کرگھوں کے باوجود ہندوستان میں تھوڑے بہت ہتھ کرگھے باقی رہ گئے۔ اس کی وجوہ دریافت کرنا مشکل نہیں ہے۔ ہندوستان چھوٹی چھوٹی صنعتوں اور چھوٹے پیمانے پر کی جانے والی کاشت کا ملک ہے۔ انگلستان میں زمین بڑے بڑے مالکان اراضی کی ملکیت ہے اور کسان صرف کھیت جوتتے ہیں اور اُن میں کام کرتے ہیں۔ لیکن ہندوستان میں زمین کے مالک وہ چھوٹے چھوٹے کسان ہیں جنھیں کھیتوں پر موروثی حقوق حاصل ہیں۔ جہاں جہاں مالکان اراضی پائے جاتے ہیں وہ بھی انھیں اُس وقت تک بے دخل نہیں کر سکتے جب تک کسان لگان ادا کرتے رہیں۔ اسی طرح چھوٹے چھوٹے دستکار اپنے گاؤں اور گھروں میں اپنے اپنے کام کیا کرتے تھے۔ ہندوستانیوں کے لیے ایسے بڑے بڑے کارخانوں کا تصور بڑا عجیب سا تھا جو سرمایہ داروں کی ملکیت ہوں اور جہاں اُجرت پانے والے کارکن کام کرتے ہوں۔ اس کے باوجود کہ سرمائے نے بڑے کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جہاں تک فنکار، ذہانت، دانش اور حریت افکار کا تعلق ہے انسان کے جوہر اُسی وقت کھلتے ہیں جب وہ کسی بڑے زمیندار کے کھیت کے مزدور یا بڑے کارخانے کے اجرت پانے والے کارکن کے بجائے خود اپنے چھوٹے سے کھیت میں یا اپنے کرگھے پر کام کرے۔ ہر سچا ہندوستانی چاہتا ہے کہ چھوٹے پیمانے پر کی جانے والی کاشت کی جگہ جاگیرداری نہ لے سکے اور سرمایہ داری کا سیلاب تمام

گھریلو صنعتوں کو بہا نہ لے جائے۔

ہتھ کرگھوں پر کام کرنے والے اُن بنکروں کی دست گیری کی کوششیں کی جا رہی ہیں جو اپنے آبائی پیشے کو ترک کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اُن کے کام کے طریقوں میں ترقی کی گنجائش ہے۔ بہتر کرگھوں کو رواج دے کر اُن کی پیداوار میں بڑا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ مختلف مقامات پر اور خاص طور سے مدراس میں نئے نئے تجربے کیے جا رہے ہیں۔ اُن کے نتائج کے متعلق کچھ کہنا ابھی قبل از وقت ہوگا۔ لیکن اس امر کے یقین کی وجوہ پائی جاتی ہیں کہ ضروری سدھار کے بعد کم از کم کپڑے کی کچھ قسموں کی حد تک ہتھ کرگھے زیادہ کار آمد بنائے جا سکتے ہیں۔ اس قسم کے سدھار سے اُن لاکھوں ہندو اور مسلمان بنکروں کا بھلا ہوگا جو افلاس کی آخری حدوں کو پہنچ چکے ہیں اور قحطوں کے پہلے شکار ہوا کرتے ہیں۔ کسی بھی متمدن حکومت کا مقدس ترین فرض یہ سمجھا جائے گا کہ اُن پسماندہ طبقوں کی دست گیری کرے اور ہندوستان کی ایک قدیم ترین صنعت کی تجدید کرے۔

ریشم ـــــ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے سے ریشم کی صنعت کم ہو رہی ہے اور اُس کی برآمد نہ ہونے کے برابر ہے۔ ہندوستان کے زیادہ تر حصوں میں ٹسر ریشم پیدا کیا جاتا ہے اور گھریلو ضرورتوں اور دوسرے ملکوں کے لیے بڑی مقدار میں ریشمی کپڑا تیار کیا جاتا ہے۔ آسام میں اب بھی ریشم عورتوں کا قومی لباس سمجھا جاتا ہے۔ وہاں اس صنعت کا مقصد محض گھریلو ضرورت کو پورا کرنا ہے۔ ہر خاندان کے لوگ اپنے استعمال کے لیے ساڑھیاں تیار کیا کرتے ہیں۔ بنگال کے اضلاع میں زیادہ نفیس ریشم پایا جاتا ہے جو شہتوت کے پتے کھانے والے کیڑے پیدا کرتے ہیں۔

"انڈوں کی پرکھ اور کیڑوں کی دیکھ بھال کے سائنسی طریقے اختیار کر کے ریشم کی صنعت میں کچھ سدھار پیدا کیا گیا ہے۔ لیکن پنجاب میں ریشم کے کیڑے پالنے کا کام دوبارہ شروع کرنے کی کوششیں کامیاب نہ ہو سکیں۔ کشمیر کی یہ مقامی صنعت ہے اور ریاست یورپ سے بہتر "انڈے" درآمد کر کے اس کو ترقی دینے کی کوشش کر رہی ہے۔" ریشمی کپڑا بنانے والے ہندوستان کے بنکر اپنے کام میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ اگر انھیں ماہرانہ ہدایت اور سرمائے کی مدد نصیب ہو تو غالباً اس صنعت کی تجدید و توسیع کی جا سکتی ہے۔"[1]

---

[1] اخلاقی اور مادی ترقی اور ہندوستان کی حالت، 2-1901 ص 227

اُون ـــــــ ہندوستان کے بہت سے حصّوں میں ادنیٰ قسم کے کمبل بنائے جاتے ہیں جنھیں غریب طبقہ استعمال کرتا ہے۔ جہاں تک دیدہ ریزی اور فن کاری کا تعلق ہے کشمیر کے دو شالوں کی صنعت قریب قریب ختم ہوگئی ہے۔ اس قسم کے دوشالے بہت کم اور عام طور سے لوگوں کی خواہش پر تیار کیے جاتے ہیں۔ لیکن پنجاب میں اب بھی اُون اور خاص طور سے اُونی قالینوں کی صنعت بڑے پیمانے پر پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ مدراس کی قالین سازی کی صنعت بھی خاصی اہمیت رکھتی ہے۔

انیسویں صدی کی آخری دہائی میں اُونی کپڑوں کے اُن کارخانوں نے اپنی پیداوار دگنی کرلی ہے جو یورپین سرمائے سے بنائے گئے ہیں اور یورپی لوگوں کے زیر انتظام ہیں۔ 1901 میں اُن کارخانوں میں 594 کرگھے اور 22,986 تکلے تھے۔ ان میں بننے والا کپڑا زیادہ تر فوج اور پولیس کے کام آتا ہے۔

پٹ سن ـــــــ پٹ سن کی قریب قریب پوری کاشت بنگال میں ہوتی ہے۔ اس کی سالانہ اوسط پیداوار تقریباً بیس ملین ہنڈرڈ ویٹ ہے۔ آدھی پیداوار یورپ کو برآمد کی جاتی ہے اور بقیہ نصف سے خانہ ساز کپڑے یا تھیلے بنائے جاتے ہیں یا پٹ سن کے کارخانوں میں استعمال ہوتی ہے۔ 1901 میں پٹ سن کے 35 کارخانے، 8218 کرگھے اور 1,71,148 تکلے تھے۔ اُس کے دوسرے سال کرگھوں اور تکلوں کی تعداد تقریباً دگنی ہوگئی۔

کام کرنے والے مزدور ـــــــ لیکن ہندوستان میں ابھی کارخانوں کی نشوونما ابتدائی مرحلے سے گزر رہی ہے اور صنعتوں میں روزگار پانے والوں کی تعداد بہت کم ہے 1901 میں ہندوستان کے سوتی کپڑے کے کارخانوں میں 1,73,708 مزدور کام کرتے تھے اور پٹ سن کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی تعداد 64,700 تھی۔ مقامی گھریلو صنعتوں کے علاوہ کوئی اور ایسی صنعت موجود نہیں تھی جس میں 20,000 مزدوروں کی کھپت بھی ہوسکے۔

منڈیوں کے لیے دساوری پیداوار کا جہاں تک تعلق تھا تیل کے کارخانوں میں 1,73,00 مزدور کام سے لگے ہوتے تھے، پٹ سن کی کلوں میں 20,000 مزدور، کپاس اوٹنے، صاف کرنے اور گانٹھیں باندھنے کے کارخانوں میں تقریباً 52,000 مزدور، لکڑی کے کارخانوں میں 8,000 کانی کے کارخانوں میں 5000 اور تیل نکالنے کے کارخانوں میں 4,000 مزدور کام کرتے تھے۔

لوہے اور پیتل کے کارخانوں میں 18,000، کھپریل بنانے کے کارخانوں میں ۱۵,۰۰۰، مطبع خانوں میں 13,000، لاکھ کے کارخانوں میں تقریباً ۵,۰۰۰ مزدور کام کرتے تھے۔ اُونی کپڑے کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی تعداد میں 1901 میں ختم ہونے والی دھائی میں صرف 16 فیصدی اضافہ ہوا تھا۔

کاغذ ـــــــ 1901 میں کاغذ کے نو کارخانے تھے اور انھوں نے 47 ملین پاؤنڈ کاغذ بنایا تھا۔ حکومت ہند اُن کارخانوں سے ضرورت کے مطابق فل اسکیپ کاغذ، جاذب اور روزانہ کے استعمال کا کاغذ حاصل کرتی ہے اور تقریباً 15,000 پونڈ کی مالیت کا کاغذ یورپ سے درآمد کرتی ہے۔

پیتل اور تانبا ـــــــ ہندوؤں کے روزمرہ کے استعمال کے برتن عام طور سے پیتل کے ہوتے ہیں حالانکہ مسلمان تانبے کے برتن استعمال کرتے ہیں۔ پیتل کی وہ واحد مقامی صنعت ہے جس میں باہر کے ملکوں سے مقابلہ نہیں کرنا پڑتا ہے حالانکہ یورپ سے آنے والے قلعی کئے ہوئے لوہے کے برتن بھی اب ہندو گھروں میں استعمال کیے جانے لگے ہیں۔ ہندوستانی صنعتوں کے سرکاری مورخ کے اس بیان سے اطمینان ہوتا ہے کہ "یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ پیتل اور تانبے کی گھریلو مانگ برقرار رہے گی اور اس کام میں دست کاروں نے اس درجہ مہارت حاصل کر لی ہے کہ مناسب دیکھ بھال اور ترقی کی صورت میں اُن کو بڑی مقدار میں یورپ برآمد کیا جا سکتا ہے۔" [1]

لکڑی پر مرصع کاری ـــــــ بڑھئی کے کام کے علاوہ جو ہندوستان کے ہر گاؤں اور قصبے میں پایا جاتا ہے یورپ کے ساتھ کھلونوں اور صندوقوں وغیرہ کی بھی بہت تجارت کی جاتی ہے جو بڑی فن کارانہ مہارت سے بنائے جاتے ہیں۔ ہندوستان کی مرصع کاری بھی بہت مشہور ہے۔

چائے کے زیر کاشت رقبے میں جس کا ۹/۱۰ حصہ آسام اور شمالی بنگال میں واقع ہے 1901 میں ختم ہونے والی دہائی میں 45 فیصدی اضافہ ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ چائے کی پیداوار ہونے لگی تھی اس لیے زیر کاشت رقبے میں کمی کرنے اور پودے حاصل کیے جانے والے پتوں کی مقدار گھٹانے کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ 1900 میں ہونے والی مجموعی پیداوار ½۱۹۲ ملین

---

[1] "اخلاق اور مادی ترقی اور ہندوستان کی حالت" ء۔ ۱۹۰۱ء ص 227

پونڈ تھی جب کہ 1901 کی پیداوار 191¼ ملین پونڈ تھی۔ 2-1901 میں سمندر کے راستے برطانوی ہند سے ہونے والی برآمد مندرجہ ذیل اعداد کے ذریعے دکھائی گئی ہے۔

ملک جس کو چائے برآمد کی گئی	مقدار ملین پونڈ میں
سلطنت متحدہ	159
آسٹریلیا	
ایران	8½
ایشیائی ترکی	2½
روس	2½
چین	1½
ریاستہائے متحدہ	1½
کناڈا	1
دوسرے ممالک	2
کل مقدار	179½

اس سے یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ برطانوی سلطنت کے باہر کے ممالک ہندوستان کی چائے کو پسند نہیں کرتے ہیں۔

ہندوستان کا " غلامی کا قانون " آج بھی اُس صوبے کی چائے کی صنعت کے دامن پر ایک بدنما دھبا ہے جس کی رو سے آسام لائے جانے والے مزدور فوجداری دفعات کے تحت معاہدے کی شرائط پوری کرنے پر مجبور کیے جاتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً مظالم کی داستانیں اور دل ہلا دینے والے واقعات سننے میں آتے ہیں۔ لیکن حکومت ہند اس کے لیے تیار نہیں ہے کہ اُن فوجداری دفعات کو منسوخ کر کے سرمایہ داروں کے غصے کا مقابلہ کرے اور دوسری صنعتوں کی طرح اس صنعت میں بھی مزدوروں کو کام کرنے یا نہ کرنے کی آزادی دے۔ باغوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی حالت عام طور سے نہایت خراب و خستہ ہوتی ہے۔ آسام کے مرحوم چیف کمشنر سر ہنری کاٹن نے کوشش کی تھی کہ مزدوروں کی اجرتوں میں ایک روپیہ ماہوار کا اضافہ کر دیا جائے۔ لیکن باغ داروں نے اس کی مخالفت کی اور لارڈ کرزن نے اُس کی مناسب حمایت نہیں کی۔ ایک سمجھوتا کیا

گیا۔ مجوزہ اضافہ گھٹا کر آٹھ آنے کر دیا گیا۔ طے کیا گیا کہ اضافہ کرنے کے فیصلے پر دو سال بعد عمل کیا جائے گا۔ دوسری طرف باغ داروں نے تجویز پیش کی کہ برآمد ہونے والی چائے پر ایک محصول لگایا جائے جس کی آمدنی چائے کی کھپت کو بڑھانے کے لیے استعمال کی جائے۔ حکومتِ ہند نے اس تجویز کو منظور کر کے خود کو گرا دیا اور اس طرح چائے کی فروخت کے سلسلے میں باغداروں کی ایجنٹ بن گئی۔

1901 میں 6,06,835 مستقل اور 90,946 عارضی مزدور چائے کے باغوں میں کام کرتے تھے۔

نیل ——— مصنوعی نیل سے مقابلے کی بنا پر اس صنعت کے ختم ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو چلا ہے۔ اس سے ہندوستان کو لازمی طور سے معاشی نقصان ہوگا۔ لیکن نیل کی کاشت اور تیاری کے سلسلے میں باغداروں نے اتنے ظلم و جبر سے کام لیا ہے کہ ہندوستان کے لوگ اس کے ختم ہو جانے کے امکان کی بنا پر فکرمند نہیں ہیں۔ بلکہ وہ اس دن کے منتظر ہیں۔ 91-1890 میں 35,69,700 پونڈ کی مالیت کا نیل برآمد کیا گیا تھا۔ لیکن 92-1891 میں یہ گھٹ کے 12,34,800 پونڈ رہ گئی تھی۔

1901 میں پائی جانے والی نیل کی کوٹھیوں کی تعداد 898 بتائی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ تقریباً 3000 نیل کے حوض مدراس میں واقع تھے۔ کام کرنے والے مزدوروں کی تعداد 1,73,000 بتائی جاتی ہے لیکن اس کے متعلق مکمل معلومات حاصل نہیں کی جا سکیں۔

شکر ——— جرمنی اور آسٹریا سے بڑی مقدار میں درآمد ہونے والی چقندر کی اُس شکر نے جس کو سرکار کی طرف سے مالی امداد ملتی تھی حکومت ہند کو 1899 میں قیمتوں کا توازن برقرار رکھنے کے لیے محصول لگانے پر آمادہ کر دیا۔ یہ محصول اصل میں ماریشس اور دوسرے برطانوی مقبوضات سے آنے والی شکر کے مفاد میں لگایا گیا تھا۔ اس کی وجہ سے سرکار سے مالی امداد پانے والی شکر کی درآمد میں وقتی طور سے رکاوٹ پڑ گئی۔ لیکن جیسا کہ مندرجہ ذیل اعداد سے ظاہر ہوتا ہے یہ رکاوٹ محض عارضی تھی۔

	1897-98	1898-99	1899-1900	1901-02
جرمنی و آسٹریا سے درآمد ہونے والی چقندر کی شکر	22,06,064	15,26,291	17,92,590	29,36,196
ماریشس وغیرہ سے درآمد ہونے والی گنے کی شکر	20,29,330	20,63,477	80 49 046	24,91,907

مندرجہ بالا اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ آخری سال یعنی ۱۹۰۰-۱۹۰۱ میں درآمد ہونے والی چقندر کی شکر کی مقدار ماریشس اور دوسرے مقامات سے آنے والے گنے کی شکر کے مقابلے میں زیادہ تھی۔ اس کی وجہ یورپ کی شکر کی تجارت میں ہونے والی ترقی اور "کارخانہ داروں کی انجمن باہمی" کا فروغ تھا۔ چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ "کارخانہ داروں کی انجمن باہمی" سے ملنے والی مالی امداد کا اثر زائل کرنے کے لیے مزید قانون بنائے جائیں۔ اس کے نتائج کے متعلق ابھی وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے۔

افیم اور نمک ——— ان اشیا پر حکومت کی اجارہ داری قایم رہی۔ انیسویں صدی کے آخری دس برسوں میں افیم کی آمدنی میں کمی ہوگئی لیکن نمک کی آمدنی میں کسی قدر اضافہ ہوگیا۔

روپیوں میں خالص آمدنی [1]

سال	افیم	نمک
۱۸۹۰-۹۱	۵,۶۹,۸۳,۸۵۰	۸,۰۹,۴۳,۵۵۰
۱۸۹۱-۹۲	۶,۱۵,۰۵,۶۷۰	۸,۱۷,۷۱,۴۸۰
۱۸۹۲-۹۳	۶,۲۹,۰۶,۸۴۰	۸,۱۹,۷۲,۹۷۰
۱۸۹۳-۹۴	۴,۷۵,۰۹,۶۴۰	۸,۷۵,۴۴,۷۱۰
۱۸۹۴-۹۵	۵,۷۰,۷۶,۵۲۰	۸,۱۶,۷۳,۳۴۰
۱۸۹۵-۹۶	۵,۰۵,۴۹,۸۱۰	۸,۳۶,۰۸,۰۱۰
۱۸۹۶-۹۷	۳,۹۲,۲۵,۴۶۰	۷,۸۹,۸۳,۵۳۰
۱۸۹۷-۹۸	۲,۷۵,۰۶,۵۵۰	۸,۱۲,۰۴,۷۸۰
۱۸۹۸-۹۹	۳,۳۵,۲۰,۴۰۰	۸,۶۲,۴۱,۶۹۱
۱۸۹۹-۱۹۰۰	۴,۰۱,۲۲,۴۳۰	۸,۲۷,۸۰,۶۰۵

[1] خالص آمدنی نکالنے کے لیے آمدنی میں سے وہ تمام اخراجات منہا کر دیے گئے جو اس سلسلے میں ہوتے تھے۔ تقریباً پندرہ روپے ایک پونڈ کے برابر سمجھے جائیں۔

تیزی سے ہونے والی ترقی اور برسوں میں ہونے والی سالانہ پیداوار مندرجہ ذیل اعداد سے ظاہر ہوتی ہے۔

صوبہ	پیداوار ٹن میں 1892	1901
بنگال	19,20,50	57,03,876
آسام	164,050	2,53,162
برما	3,670	12,466
راجپوتانہ		12,094
وسط ہند	88,623	164,415
پنجاب	66,352	67,730
بلوچستان	13,284	22,772
صوبہ جات متوسط	1,32,005	1,91,516
نظام کا علاقہ	1,49,601	4,21,218
مدراس	61	
کل میزان	25,37,696	68,49,249

اُس سرکاری وقائع نگار نے لکھا تھا جس کا اقتباس ہم پہلے پیش کر چکے ہیں۔" جب ہم ان اعداد کا مقابلہ 219 ملین ٹن کی مقدار سے کرتے ہیں جو ۱۹۰۱ میں انگلستان میں پیدا ہوئی تھی تو یہ بہت کم معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ مقدار ہندوستان میں کوئلے کی موجودہ مانگ کو پورا کرنے کے لیے کافی ہے۔"[1] ہندوستان کی ریلوں میں استعمال ہونے والا قریب قریب پورا کا پورا کوئلہ ہندوستان کا ہوتا ہے۔ 1902 میں استعمال ہونے والے کوئلے کا ایک فیصدی سے کم حصہ باہر کے ملکوں سے آیا تھا۔ لوہے اور فولاد کی صنعت بڑی حد تک ہندوستان کا

---

[1] "اخلاقی اور مادی ترقی 1901-2 ص 235

ایک گزشتہ باب میں بتایا جا چکا ہے کہ نمک کی آمدنی کا ایک ذریعہ تو وہ محصول ہے جو برطانوی ہند میں بنائے جانے والے نمک پر لگایا جاتا ہے اور دوسرا ذریعہ وہ محصول درآمد ہے جو انگلستان یا ہندوستان کی دیسی ریاستوں سے آنے والے نمک پر دینا ہوتا ہے۔ سمندر کے ذریعے آنے والے نمک پر محصول لگانا آسان تھا۔ لیکن دیسی ریاستوں سے آنے والے نمک پر محصول وصول کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ داخلی چنگیوں کا ایک سلسلہ قایم کیا جائے 1870 میں پنجاب کے شمال مغرب میں واقع ایک مقام سے مدراس کی شمالی سرحد تک پورے برطانوی ہند میں داخلی چنگیوں کا ایک سلسلہ قایم تھا۔ یہ ایک 2,500 میل لمبی روک تھی جو خاردار درختوں اور پودوں، پتھر کی دیواروں اور خندقوں پر مشتمل تھی اور اس کی نگرانی 12,000 افسروں کی فوج کیا کرتی تھی۔

لارڈ میو کی حکومت نے اس طریقے کو ختم کرنے کے سلسلے میں پہلا قدم اٹھایا۔ مسٹر اے۔ او۔ ہیوم (Mr. A.O. Hume) نے جے پور اور جودھپور کی دیسی ریاستوں کے ساتھ باہمی سمجھوتا کر لیا جس کی رو سے سانبھر جھیل میں نمک بنانے کا قطعی حق حکومت ہند کو حاصل ہو گیا۔ اس کے بعد لارڈ نارتھ بروک کی حکومت نے جودھ پور کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے ریاست میں واقع نمک بنانے کے اہم مراکز انگریزوں کے زیر اہتمام آ گئے۔ لارڈ لٹن کی حکومت نے داخلی چنگیوں کے سلسلے کو موقوف کرنے کے لیے مزید اقدامات کیے۔ پہلے تو اس نے ہندوستان کے مختلف حصوں میں وصول کیے جانے والے محصول کی شرح میں قریب قریب یکسانیت پیدا کر دی۔ اس کے بعد راجپوتانہ اور وسط ہند کی دیسی ریاستوں سے معاہدے کیے جن کی رو سے نمک بنانے کے تمام اہم مراکز کے پٹے برطانوی حکومت کو حاصل ہو گئے اور ان پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ بالآخر اس کام کی تکمیل لارڈ رپن کی حکومت نے کی جس نے پورے ہندوستان میں نمک کا محصول دو روپیہ فی من یعنی دو شلنگ آٹھ پینس فی 82 پاؤنڈ کی تخفیف شدہ شرح سے وصول کرنا شروع کر دیا۔ بد قسمتی سے نمک کے محصول کی شرح 1888 میں بڑھا کر 2½ فی من کر دی گئی اور یہ بھاری شرح پندرہ سال برقرار رہی مارچ 1903ء میں شرح میں تخفیف کر کے پھر دو روپیہ کر دی گئی۔

کوئلہ ـــــ ہندوستان کے بڑے علاقے میں کوئلہ پایا جاتا ہے۔ ملک کے مختلف حصوں میں کوئلے کی کانیں ہیں جن میں زیادہ تر یورپین سرمایہ لگایا ہوا ہے۔ اس صنعت میں

کوئلہ استعمال کرتی ہے اور پورے ملک کے کارخانوں کا انحصار اسی پر ہے۔ شہروں میں ایندھن کے طور پر بھی کوئلہ استعمال ہوتا ہے۔ کوئلے کی اُن کانوں میں جن پر مائنس ایکٹ کا نفاذ ہوتا ہے یعنی ایسی کانوں میں جن کی گہرائی 20 فٹ سے کم نہیں ہے، 1901ء میں 85,361 مزدور کام کرتے تھے۔

سونا ـــــ ہندوستان میں سونے کی پیداوار میسور تک محدود ہے۔ وہاں 1901 میں 5,29,782 اونس سونا پیدا ہوتا تھا۔ یہ مقدار اُس سال ہندوستان میں پیدا ہونے والے کل سونے کی ۹۹ فیصدی ہے۔ سونے کی کانوں میں 21,000 مزدور کام کرتے ہیں۔ برما اور شمالی ہندوستان میں ریت کو دھوکر سونے کی تھوڑی سی مقدار حاصل کی جاتی ہے۔ مدراس میں واقع وائی ناڈ کی کان سے سونا حاصل نہیں کیا جا سکا۔ نظام کے علاقے میں بھی بہت کم سونا پیدا ہوتا ہے۔

لوہا ـــــ خام لوہا حاصل کرنے کے خاص خاص مرکز، مدراس میں سالم کی کانیں، صوبجات متوسط میں چندا کی کانیں اور بنگال میں باراکر کی کانیں ہیں۔ نجی اور سرکاری تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ سالم کی کانیں بڑی مقدار میں اچھا لوہا پیدا کر سکتی ہیں لیکن ابھی وہاں بڑے پیمانے پر کام شروع کیا گیا ہے۔ باراکر ورکس کا آغاز 1965 میں ہوا تھا۔ دو کمپنیوں کی ناکامی کے بعد حکومت نے خسارے کا سودا شروع کیا اور اُس کے بعد کانیں موجودہ کمپنی کے سپرد کر دیں۔ حالات امید افزا ہیں۔ زیادہ مقدار میں خام لوہا نکالا جانے لگا ہے اور لوہے کا ایک کارخانہ قایم ہو گیا ہے۔ چندا کی کانوں کو ترقی دینے کے لیے مذاکرات جاری ہیں۔ 1901 میں 63,000 ٹن لوہا ہندوستان میں پیدا کیا گیا تھا جس میں 57,000 ٹن بنگال میں پیدا ہوا تھا۔

پیٹرول ـــــ ہندوستان میں پیدا ہونے والے معدنی تیل کا 98 فیصدی برما میں پیدا ہوتا ہے اور بقیہ آسام سے حاصل کیا جاتا ہے۔ 1892 میں ہونے والی مجموعی پیداوار صرف ۵۰۰۰۰ گیلن تھی جبکہ 1901 میں یہ مقدار بڑھ کے 6,33,000 گیلن ہو گئی تھی پھر بھی ہندوستان میں بدیسی تیل کی بڑی مانگ ہے۔ اور روسی تیل نے ہندوستان کی منڈیوں میں امریکی تیل کی جگہ لے لی ہے جو زیادہ مہنگا ہے۔ 2-1901 میں ۹۹ ملین گیلن تیل درآمد کیا گیا تھا جس کی قیمت 12½ ملین پاونڈ تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ برما میں پیدا ہونے والا تیل ہندوستان کی مجموعی ضرورت کا سواں حصہ بھی پورا نہیں کر سکتا ہے۔

لعل ـــــــ برما کی شہرہ آفاق لعل کی کانوں سے ابھی زیادہ مالی فائدہ نہیں ہوا ہے۔ 1901 میں روبی مائنس کمپنی نے 104,500 پاؤنڈ کی مجموعی مالیت کے جواہر، لعل، نیلم اور مختلف رنگ کے قیمتی پتھر حاصل کیے 2-1901 میں 29,000 پاؤنڈ کی مالیت کے بیش بہا سفید اور نیلے پتھر برآمد کیے جو جیڈ JADE کہلاتے ہیں۔

میگنیز، برق اور ٹین ـــــــ 2-1901 میں 1000,000 پونڈ کی مالیت کی میگنیز اور 70,000 پاؤنڈ کی مالیت کی ابرق برآمد کی گئی۔ ٹین زیریں برما کے ٹیوائے TAVAY اور مرگوئی MERGVI مقامات پر پایا جاتا ہے اور بالائی برما کی ریاستہائے شان (SHAN) میں بھی ملتا ہے۔

چونکہ ہندوستان میں یورپین سرمایہ زیادہ تر کارخانہ دارانہ صنعتوں، چائے، نیل، کافی اور معدنی صنعتوں میں لگا ہوا ہے اس لیے ان کی طرف زیادہ توجہ کی جاتی ہے۔ لیکن مندرجہ بالا اعداد سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان صنعتوں میں کام سے لگے ہوتے مزدوروں کی تعداد ہندوستان کی آبادی سے کوئی خاص مناسبت نہیں رکھتی ہے۔ ہندوستان کے اندر برطانوی کمپنیوں کی جو ہمت افزائی کی گئی یا نقل وطن کے جو طریقے استعمال کیے گئے اُن سے مزدوروں کی حالت سدھارنے کا مسئلہ حل نہ ہو پایا۔ دنیا کا کون سا ملک آئندہ دس یا بیس سال میں ہندوستان کے تین سو ملین لوگوں کے دسویں حصے کے لیے بھی جگہ نکال سکتا ہے۔ ہندوستان کے معاشی مسئلے کو حل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ زراعت کو بھاری اور غیر یقینی محاصل سے نجات دلائی جائے، اُن مقامی صنعتوں کو فروغ دیا جائے جس کی بنا پر لاکھوں ہندوستانی دست کار اپنے گاؤں ہی میں رہ کر روزی روٹی حاصل کر سکیں اور اُن ابھرتی ہوئی کارخانہ دارانہ صنعتوں کی اعانت کی جاتے جو لوگ خود اپنے سرمائے سے شہروں میں شروع کر رہے ہیں۔ ہندوستان کے معدنیاتی وسائل اور نئی صنعتوں کو ترقی دینے کے لیے ہندوستان کے لوگ برطانوی سرمائے کے استعمال کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ لیکن جب برطانوی مدبروں کی آنکھیں زراعت کے مفادات اور اُن چھوٹی چھوٹی صنعتوں کے بجائے برطانوی سرمائے پر جم جاتی ہیں، جن پر ہندوستانی قوم کے قومی وجود کا انحصار ہے، تو وہ ہر چیز کو غلط پس منظر میں دیکھتے ہیں۔

اب ہم ہندوستان کی بیرونی تجارت کے موضوع پر آتے ہیں۔ اگلے صفحے پر جو نقشہ دیا ہوا ہے وہ "برطانوی ہند کے متعلق اعداد و شمار کے خلاصے"

کی بنیاد پر تیار کیا گیا ہے۔ اس میں انیسویں صدی کے آخری چوبیس سال میں ہونے والی مجموعی درآمدات و برآمدات دکھائی گئی ہیں۔

مجموعی درآمدات اور مجموعی برآمدات کا فرق ہندوستان کو تجارت کے تکلیف دہ تضاد کو ظاہر کرتا ہے۔ 1891-92 اور 1896-97 کی درمیانی مدت میں۔ فرق دس روپے کی اکائی میں تیس ملین ہو گیا جو بیس ملین پاؤنڈ کے برابر ہوا۔ یہ رقم ہندوستان سے ہر سال ہونے والے دولت کے نکاس کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ وہ رقم تھی جو ہندوستان کی مہیا کی ہوئی غذائی اجناس کی قیمت کی شکل میں ادا کی جاتی تھی اور جس کے عوض اُسے کوئی تجارتی مال نہیں ملا کرتا تھا۔ اُنیسویں صدی کے آخری برسوں میں پڑنے والے قحطوں نے اور اُس رقم نے جو جنوبی افریقہ میں ہندوستانی فوج استعمال کرنے کے سلسلے میں انگلستان نے ادا کی دولت کے اس نکاس میں کچھ کمی کر دی۔ پھر بھی انیسویں صدی کے آخری چار برسوں میں ہندوستان سے ہونے والا اوسط سالانہ دولت کا نکاس تقریباً دس روپے کی اکائی میں بیس ملین تھا جو تیرہ ملین پاؤنڈ کے برابر ہوا۔

تمام ملکوں کے ساتھ ہندوستان کی تجارت دس روپے کی اکائی میں[ا]

سال مختتمہ	مال کی درآمد	چاندی سونے کی درآمد	مجموعی درآمدات	مجموعی برآمدات
1878	1,14,64,185	1,73,55,459	5,88,19,644	6,72,33,324
1879	3,78,00,594	70,56,749	4,48,57,343	6,49,19,741
1880	4,11,66,003	1,16,55,395	5,28,21,398	6,92,47,511
1881	5,31,16,770	89,88,214	6,21,04,984	7,60,21,043
1882	4,91,13,374	1,13,22,781	6,04,36,155	8,39,68,198
1883	5,20,95,711	1,34,53,157	6,55,48,868	8,45,27,182

[ا] 1878 اور 1885 کی درمیانی مدت میں 10 روپے تقریباً 16 شلنگ کے برابر تھے
1885 اور 1897 " " " " 10 " " 14 " " "
1890 اور 1897 " " " " 10 " " 12 " " "
1890 کے بعد دس روپے 13⅓ شلنگ کے برابر تھے۔

1884	5,52,79,348	1,28,77,923	6,81,57,311	8,91,86,397
1885	5,57,03,072	1,38,88,197	6,95,91,269	8,52,25,962
1886	5,56,55,909	1,54,77,801	7,11,33,710	8,49,89,502
1887	6,17,77,351	1,10,53,319	7,28,30,670	9,01,90,633
1888	6,50,04,612	1,38,25,856	7,88,30,468	9,21,48,779
1889	6,94,40,467	1,38,44,940	8,32,58,427	9,88,33,879
1890	6,91,97,489	1,74,59,501	8,66,56,990	10,55,66,720
1891	7,19,75,370	2,19,34,484	9,39,09,856	10,23,50,536
1892	6,94,32,383	1,47,22,462	8,41,55,045	11,14,60,278
1893	6,62,52,277	1,70,09,810	8,32,75,087	11,35,54,399
1894	7,70,21,433	1,84,61,256	9,54,82,688	11,06,03,561
1895	7,35,27,993	95,81,207	8,31,10,200	11,71,39,850
1896	7,29,36,753	1,33,67,986	8,63,04,739	11,85,94,549
1897	7,61,17,373	1,30,84,563	8,92,01,936	11,89,21,592
1898	7,36,47,35	2,05,30,617	9,41,77,652	10,47,81,427
1899	7,21,01,528	1,78,95,613	8,99,97,141	12,02,21,146
1900	8,53,04,470	2,09,73,616	9,62,78,166	11,70,39,710
1901	8,08,94,589	2,45,76,762	10,54,71,352	12,19,54,960

اگر ہندوستان کی خاص خاص درآمدات و برآمدات کا جائزہ لیا جائے تو اس سے دنیا کے ساتھ ہندوستان کی تجارت کی نوعیت واضح ہو جائے گی۔ اگلے صفحے پر جو نقشہ دیا ہوا ہے وہ خاص خاص برآمدات کو ظاہر کرتا ہے۔ اس نقشے پر غور کرتے وقت 1885 اور 1897 کی درمیانی مدت میں روپے کی بدلی ہوئی قیمت کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ 1885 سے پہلے دس روپے تقریباً 16 شلنگ کے برابر تھے لیکن 1895 اور 1897 میں ان کی قیمت 12 شلنگ سے بھی کم ہو گئی تھی۔ چنانچہ 1885 اور 1897 کی درمیانی مدت میں سوتی کپڑے کی برآمد میں ہونے والا

بڑا اضافہ، جو دس روپے کی اکائیوں میں دکھایا گیا ہے، مناسب حقیقی اضافے کی نمائندگی نہیں کرتا ہے۔ لیکن 1898 کے بعد دس روپے کی قیمت 13 شلنگ 4 پینس مقرر کردی گئی تھی اس لیے اُس کے بعد سوتی کپڑے کی برآمدات میں ہونے والا اضافہ اور مشینوں اور کارخانوں کے کل پرزوں میں ہونے والی تخفیف حقیقی ہے۔ اس سے ہندوستان کے کارخانوں کے مصنوعات پر اکسائز ڈیوٹی لگانے کے مضر اثرات ظاہر ہوتے ہیں جس کا تفصیلی ذکر اگلے باب میں کیا جائے گا۔ جب کہ دنیا کی ہر متمدن حکومت اپنے ملک کی صنعتوں کی مدد کرنے کی کوشش کر رہی ہے حکومت ہند لنکا شائر کے حکم کی تعمیل میں ہندوستان کی کارخانہ دارانہ صنعتوں کو کچلنے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہ رجحان موٹے جھوٹے سوتی کپڑے کے بارے میں بھی پایا جاتا ہے حالانکہ لنکا شائر سے اُس کا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ اس کے نتائج مندرجہ ذیل ہیں۔ سوتی کپڑے کی پیداوار میں کمی ہو رہی ہے۔ مشینوں اور کارخانوں کے کل پرزوں کی مانگ گھٹ رہی ہے اور تین سال میں سوتی کپڑے کی درآمد دس روپے کی اکائی میں 23 ملین سے بڑھ کر 27 ملین سے زیادہ ہو گئی ہے۔

اُن تجربوں کے باوجود جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے ہندوستان میں ریشمی کپڑا بننا کم ہوتا گیا اور 1898 اور 1901 کی درمیانی مدت میں ریشمی کپڑے کی درآمد دس روپے کی اکائی میں ایک ملین سے بڑھ کے 1½ ملین ہو گئی۔ اس دوران اونی کپڑے کی درآمد تقریباً دگنی ہو گئی۔

مالی امداد پانے والی شکر کی درآمد کو روکنے کے لیے جو قانون بنائے گئے تھے اُن کا حوالہ مندرجہ بالا سطور میں دیا جا چکا ہے۔ 99-1898 اور 1900-1899 میں ہونے والی شکر کی درآمد میں جو کمی ہوئی اس سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ قانون اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔ لیکن بالآخر یہ قانون بے سود ثابت ہوئے اور 1900 اور 1901 میں ہونے والی شکر کی درآمد میں اتنا اتنا اضافہ ہو گیا جتنا اُس سے پہلے ہندوستان کی تاریخ میں کبھی نہیں ہوا تھا۔

لوہے کے سامان، چھری کانٹے اور قلعی کیے ہوئے سامان کی درآمد میں بڑا بڑا اضافہ ہوتا رہا۔ لیکن ہندوستان خام دھاتیں اُس سے زیادہ مقدار میں درآمد کرتا ہے۔ 1901-1900 میں ہندوستان نے تین ملین پاؤنڈ سے زیادہ کی مالیت کا لوہا اور فولاد اور چھ لاکھ پاؤنڈ سے زیادہ کی مالیت کا پیتل درآمد کیا۔[1] 1901-1900 میں بڑی مقدار میں درآمد ہونے والی دوسری چیز

---

[1] لوہا اور فولاد 30,48,421 پاؤنڈ۔ پیتل 6,11,422 پاؤنڈ

معدنی تیل تھا جس کی قیمت دو ملین پاؤنڈ سے زیادہ تھی۔ اور جو زیادہ تر روس سے آیا تھا۔ درآمد ہونے والی شرابوں کی قیمت ایک ملین پاؤنڈ سے زیادہ تھی۔ [1]

اب ہم ہندوستان کی برآمدات کا جائزہ لیں گے۔ اگلے صفحے پر دیا ہوا نقشہ برآمد ہونے والی خاص خاص اشیا کو ظاہر کرتا ہے۔

اس نقشے میں دیے ہوئے اعداد پر غور کرتے وقت ایک دفعہ پھر ضروری ہے کہ ہم روپے کی بدلتی ہوئی قیمت کو ملحوظ رکھیں۔ انیسویں صدی کی آخری دہائی کے شروع میں روئی، سوتی کپڑے، غلوں، تلہن اور دوسری اشیا کی برآمدات میں جو اضافہ نظر آتا ہے اُس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ روپے کی قیمت گر گئی تھی۔ 1898 میں دس روپے کی قیمت بڑھا کے 13 شلنگ 4 پنیس کردی گئی تھی اور بالآخر اس کو مستقل قیمت تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اس کے بعد ہم زیادہ یقین کے ساتھ بات کرسکتے ہیں۔ نقشے کے آخری چار برسوں میں جو اضافہ دکھایا گیا وہ حقیقی اضافہ ہے۔

سوتی کپڑے میں بہت کم اضافہ ہوا۔ سوتی کپڑے کی فطری ترقی کی رفتار اُس غیر منصفانہ اکسائز ڈیوٹی نے کم کردی جو ہندوستان کی ابھرتی ہوئی کارخانہ دارانہ صنعتوں پر لگائی گئی تھی۔ انیسویں صدی کے آخری تین برسوں میں خام پٹ سن کی درآمد میں برابر اضافہ ہوتا رہا اور وہ دس روپے کی اکائی میں سات ملین سے بڑھ کے تقریباً گیارہ ملین ہوگئی۔ پٹ سن کے مصنوعات کی درآمد میں بھی اضافہ ہوا اور وہ دس روپے کی اکائی میں $5\frac{3}{4}$ ملین سے بڑھ کے $7\frac{1}{2}$ ملین ہوگئی۔

یورپ میں مصنوعی نیل کی ایجاد کے بعد نیل کی برآمد میں برابر کمی ہوتی رہی تھی۔ چائے کی برآمد میں اضافہ ہوتا رہا اور وہ تقریباً دس روپے کی اکائی میں دس ملین یا $6\frac{1}{2}$ ملین پاؤنڈ تک پہنچ گئی۔

ریشم اور اُون کی کوئی بڑی اہمیت نہیں ہے اس لیے اُنھیں نقشے میں نہیں دکھایا گیا ہے۔ مارچ 1901 میں ختم ہونے والے سال میں صرف ۱۰۲،۵۴،۳ پاؤنڈ کا خام ریشم اور 1,19,203 پاؤنڈ کا ریشمی کپڑا برآمد کیا گیا۔ 1900-1901 میں 8,19,478 پاؤنڈ کی مالیت کا خام اُون اور 2,27,681 پاؤنڈ کی مالیت کا اونی مال برآمد کیا گیا۔

اُنیسویں صدی کے آخری چار سال میں چاول، گیہوں اور دوسرے غلوں کی برآمد میں بڑی تبدیلیاں ہوئیں۔ 1897-98 میں دس روپے کی اکائی میں 14 ملین یا دس ملین پاؤنڈ کی

---

[1] معدنی تیل 23,05,235 پاؤنڈ۔ شرابیں 10,77,939 پاؤنڈ

مالیت کا مال برآمد ہوا۔ اور 99-1898 میں یہ بڑھ کر دس روپے کی اکائی میں 27 ملین یا 28 ملین پاؤنڈ کا ہوگیا۔ ہمارے اُن قارئین کے لیے اس کو سمجھنا مشکل نہ ہونا چاہیے جو تجارت اور صنعت کی روداد اس کتاب کے پچھلے باب میں پڑھ چکے ہیں۔ ہندوستان کی تجارت فطری نہیں ہے بلکہ اُس پر تھوپی گئی ہے۔ بھاری سرکاری مطالبہ ادا کرنے کے لیے مجبوراً غذائی اجناس برآمد کرنی پڑتی ہیں۔ 98-1897 بڑے پیمانے پر پڑنے والے قحط کا سال تھا اور لاکھوں انسان فاقوں کا شکار ہو گئے تھے۔ پھر بھی بقدر 17 ملین پاؤنڈ مال گزاری وصول کی گئی تھی۔ لوگوں نے مال گزاری ادا کرنے کے لیے بڑی مقدار میں غذائی اجناس فروخت کر دیں جو بقدر 10 ملین پاؤنڈ اُس تباہی کے سال میں برآمد کی گئیں۔ دوسرے سال فصلیں اچھی ہوئیں۔ کسانوں نے جتائی کے جانور بدلنے اور پچھلے سال کے قحط میں ہونے والے نقصانات کی تلافی کرنے کے لیے اپنی پیداوار بڑی مقدار میں فروخت کی۔ بدقسمتی سے حکومت نے بقایا مال گزاری وصول کرنے میں نہایت سختی اور ناسمجھی سے کام لیا اور مال گزاری کے شدید مطالبے کو پورا کرنے کے لیے کسانوں کو بڑی مقدار میں اپنے کھیتوں کی پیداوار بیچنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ان دونوں اسباب کی بنا پر غذائی اجناس کی برآمد میں اتنا اضافہ ہوگیا جتنا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ جن لوگوں کے نزدیک ہندوستان کی خوش حالی کا پیمانہ مال گزاری کی وصولی تھا وہ خوشیاں منانے لگے۔ اٹھارہ ملین پونڈ سے زیادہ مال گزاری کی وصولیابی نے انھیں وہ ثبوت فراہم کر دیا جس پر اعتماد کیا جا سکتا تھا۔ ہندوستان اور ہاؤس آف کامنز میں ہندوستان کی قوت کی بحالی اور تلافی مافات کے متعلق حسبِ معمول گمراہ کُن بیانات دیے گئے۔ کسی نے اس تفتیش کی ضرورت نہیں سمجھی کہ بھاری برآمدات اور بہت زیادہ وصول ہونے والی مال گزاری نے لوگوں کے پاس گزر بسر کے لیے کچھ چھوڑا بھی ہے یا نہیں۔

اس کے مضر اثرات جلد سامنے آ گئے۔ اس کے بعد کے برسوں میں پیداوار کم ہوئی۔ بمبئی اور صوبجات متوسط غذائی وسائل سے محروم کیے جا چکے تھے۔ اور اُن صوبوں میں لگاتار تین سال تک ایسا قحط پڑا جس کی مثال عہدِ جدید کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی ہے۔

جو حد حکمرانوں کی اعتدال پسندی قایم نہ کر سکی تھی وہ فطرت نے قایم کر دی۔ بمبئی کی آبادی گھٹنے لگی اور صوبجات متوسط کی آبادی میں اور زیادہ کمی ہونے لگی۔ میلوں تک پھیلا ہوا مزروعہ علاقہ بنجر ہوگیا۔ گھر، گیہوں کے کھیت اور دھان پیدا کرنے والی زمینیں جنگل میں تبدیل ہو گئیں سرکاری مطالبے کی وصولی کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ اُس کے بعد بادلِ نخواستہ غلطی کو تسلیم

کیا گیا[1] اور سرکاری مطالبے پر نظر ثانی کی گئی۔ بمبئی اور صوبجات متوسط دونوں میں ایک کے بعد ایک ضلع کی مال گزاری کی رقم کم ہوتی چلی گئی۔ پھر کبھی ۱۵ بلین پاؤنڈ کی مالیت کی غذائی اجناس برآمد نہ کی جا سکیں۔

لیکن یہ سہولت عارضی ہے۔ ایسا کوئی ضابطہ نہیں بنایا گیا ہے جو حکام بندوبست کو خوشحالی کے آثار نظر آتے ہی مال گزاری میں اضافہ کرنے سے روک سکے۔ کوئی ایسا ضابطہ بھی نہیں بنایا گیا ہے جس کی بنا پر لوگوں کو یقین ہو کہ اُن کے کھیتوں کی پیداوار کا کتنا حصّہ سرکاری مطالبے کے طور پر دینا پڑے گا۔ ایسا طریقہ جس میں سرکاری مطالبے کا تعین کسانوں کی زیادہ سے زیادہ ادا کرنے کی استطاعت کی مناسبت سے کیا جائے قوم کی مایوسی کا سبب بنتا ہے اور اُن کی حالت میں ہونے والے مستقل سدھار کو ناممکن بنا دیتا ہے۔ لوگ چاہتے ہیں کہ ایسا ضابطہ بنایا جائے جس کی رُو سے مال گزاری میں اضافے واضح بنیادوں پر کیے جا سکیں۔ لارڈ رپن نے اس قسم کا ضابطہ بنایا تھا لیکن اُس کی ہندوستان سے واپسی کے بعد ایک مہینے کے اندر وہ منسوخ کر دیا گیا۔ جیسا کہ ہم پچھلے باب میں دیکھ چکے ہیں۔ لارڈ کرزن نے اس قسم کا ضابطہ بنانے سے انکار کر دیا تھا۔

مندرجہ بالا واقعات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کی بدیسی تجارت کے حجم کی بنا پر وہاں کے لوگوں کی حالت کے متعلق کوئی فیصلہ کرنا نا سمجھی ہے۔ جہاں تک اُن کے ملک کا تعلق ہے انگریز اس پیمانے کو بڑی حد تک درست پاتے ہیں اور ہندوستان پر اس کا اطلاق کرنے کی فطری غلطی کرتے ہیں۔ انگریز بڑی حد تک اپنی تجارت اور صنعت کی بنا پر زندہ رہتے ہیں۔ مصنوعات کی فروخت انھیں اس قابل بناتی ہے کہ وہ بدیسی منڈیوں سے غذائی اجناس خرید سکیں۔ تجارت اور مال لے جانے کے کام میں ہونے والا منافع اُن کی دولت میں اضافہ کرتا ہے۔ تجارت کا حجم بڑی حد تک

---

[1] "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر دت کے خیال میں حکومت ہند صوبجات متوسط میں بہت زیادہ مال گزاری وصول کر رہی ہے۔ وہ (لارڈ جارج ہملٹن) کوئی ایسا کلیہ بنانے کو تیار نہیں ہے جس کی بنا پر یہ طے کیا جا سکے کہ مناسب مال گزاری کتنی ہونی چاہیے اور کتنی نہیں ہونی چاہیے اور اُسے افسوس کے ساتھ اقرار کرنا پڑا کہ وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ گزشتہ زمانے میں کہیں کہیں مال گزاری کی بہت بھاری شرح تشخیص نہیں مقرر کی گئی" ہاؤس آف کامنز میں کی جانے والی لارڈ جارج ہملٹن کی تقریر کی رپورٹ دی ٹائمس 4 اپریل 1900

اُن کی قومی آمدنی کی صحیح نمائندگی کرتا ہے۔

لیکن ہندوستان کی صورتِ حال اس سے مختلف ہے۔ بدیسی تجارت غیر ملکی تاجروں کے ہاتھوں میں ہے اور اس میں غیر ملکی سرمایہ لگا ہوا ہے۔ اُس تجارت کا منافع ہندوستان میں رہنے کے بجائے یورپ چلا جاتا ہے۔ بدیسی تجارت کی آمدنی لوگوں کی آمدنی نہیں ہے۔ بدیسی تجارت کا حجم اُن کی قومی آمدنی کی نمائندگی نہیں کرتا ہے۔ 82-1881 میں، یعنی لارڈ رپن کے پُرامن اور مقابلتاً خوش حال زمانۂ حکومت میں، ہندوستان کی مجموعی درآمدات و برآمدات 83 ملین پاؤنڈ کے بقدر تھیں۔ لیکن 1901-1900 میں، جو قحط اور دکھوں کا سال تھا، مجموعی درآمدات و برآمدات 122 ملین پاؤنڈ کی تھیں۔ جو شخص ہندوستان سے واقف ہے یا جس نے ہندوستان کے متعلق تھوڑا بہت بھی سن رکھا ہے، وہ کیسے یقین کر سکتا ہے کہ 82-1881 کے مقابلے میں 1901-1900 زیادہ خوش حالی کا سال تھا یا اُس میں ہندوستان کو زیادہ آمدنی ہوئی اور وہاں کے لوگوں کو بہتر غذا نصیب ہوئی۔

تجارت سے ایک ملک کو اس وقت بھی فائدہ ہوتا ہے جب اس میں غیر ملکی سرمایہ لگا ہو اور وہ غیر ملکی تاجروں کے ہاتھوں میں ہو۔ تجارت کی وجہ سے اشیا اُن قیمتوں پر مل جاتی ہیں جتنے میں وہ ملک کے اندر پیدا نہیں کی جا سکتیں۔ اس کے علاوہ ملک کے اندر ملنے والی قیمتوں کے مقابلے میں باہر کی منڈیوں میں ملکی مصنوعات زیادہ قیمتیں اُٹھا سکتی ہیں۔ ان دونوں اسباب کی بنا پر تجارت مفید ہے چاہے اُس کا منافع دوسرے ملکوں ہی کو کیوں نہ جائے۔ لیکن چونکہ ہندوستان کی بدیسی تجارت قدرتی نہیں ہے بلکہ اُس پر تھوپی گئی ہے اس لیے اس کو اس قسم کا فائدہ بھی زیادہ حاصل نہیں ہوتا ہے۔ سوتی کپڑے پر جو اکسائز ڈیوٹی لگائی جاتی ہے اُس کی بنا پر ہندوستان میں وہ اشیا بھی کم بن پاتی ہیں جنھیں ملک بنا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی مال گزاری کا طریقہ اور گھریلو اخراجات وہ غذائی اجناس برآمد کرنے پر مجبور کرتے ہیں جن کے بڑے حصے کی ضرورت خود ہندوستان کو ہے تاکہ وہاں کے رہنے والوں کو غذا میسّر آ سکے۔ چنانچہ ہندوستان کی صنعت پر پابندیاں عاید کر کے وہاں سوتی کپڑے کی درآمد بڑے پیمانے پر کی جاتی ہے اور بھاری مال گزاری اور بھاری خراج کی بنا پر غذائی اجناس بڑے پیمانے پر برآمد کرنی پڑتی ہیں۔

باب - 9

محاصل درآمد و برآمد کی تاریخ

ایک پچھلے باب میں ہم نے 1879 تک ہندوستان کے محاصل درآمد و برآمد کی تاریخ بیان
کی تھی جب لارڈ لٹن جنگ، قحط اور خسارے کے حال میں ہندوستان کی آمدنی کے ایک اہم
ذریعے سے دست بردار ہوگیا تھا۔ اُس کے جانشین لارڈ رپن نے افغانستان کے خلاف جنگ
ختم کی، امن قایم کیا اور بچت دکھائی۔ اُس کے وزیر مالیات سر ایولن بارنگ (SIR
EVELYN BARING) نے، جو اب لارڈ کرومر (LORD CROMER) کے نام سے مشہور ہے،
مارچ 1882 میں نمک اور شرابوں کے علاوہ بقیہ تمام محاصل درآمد منسوخ کردیے۔

1882 اور 1894 کی درمیانی بارہ سالہ مدت میں کوئی نئے محاصل درآمد نہیں لگائے گئے
صرف پٹرول پر ۱۸۸۸ میں تھوڑا سا محصول لگایا گیا تھا۔ لیکن لارڈ رپن کے ہندوستان سے
واپس جانے کے بعد فوجی اخراجات میں ہونے والے مسلسل اضافے نے، لارڈ ڈفرن کے حکم سے
فوج کی ہونے والی توسیع نے اور اُن شر آمیز کارروائیوں نے جو لارڈ ڈفرن کی حکومت نے سرحدوں
کے پار کیں۔ ہندوستان کے مالیاتی توازن کو بگاڑ دیا۔ روپیہ کی قیمت گر جانے کی وجہ سے بڑھتے ہوئے
گھریلو اخراجات کے لیے انگلستان کو ضروری رقم بھیجنے میں دشواریاں ہونے لگیں۔ یہ رقم پاؤنڈ کی
شکل میں ادا کی جاتی تھی۔ اس پر تعجب ہوتا ہے کہ 1884 اور 1894 کی درمیانی مدت میں
ہندوستان کے اخراجات میں ہونے والے اضافے کا کتنا کم حصہ ملک کے نظم و نسق کو بہتر بنانے کی

بنا پر ہُوا اور کتنا زیادہ حصّہ فوج پر ہونے والے اصرف بے جا اور تباہ کن گھریلو اخراجات کی بنا پر ہوا
1894 میں حکومتِ ہند کو دو ملین پاؤنڈ سے زیادہ کے خسارے کا سامنا کرنا پڑا۔
ہندوستان میں مزید محاصل لگانے کے احکامات کے متعلق تحقیق و تفتیش کرنے کے لیے
لارڈ ہرسچیل LORD HERSCHELL کی کمیٹی مقرر کی گئی تھی۔ کمیٹی اس نتیجے پر پہنچی کہ ہمارے سامنے پیش ہونے والی شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ آمدنی میں اضافہ کرنے کے تمام مجوزہ طریقوں میں سب سے کم مخالفت محاصل درآمد کی تجدید ہوگی۔ لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اُن کو پسند کیا جائے گا۔" لیکن کمیٹی نے بہ نظرِ احتیاط مزید کہا کہ سوتی کپڑے پر دوبارہ محاصل لگانے کی کوشش کی سخت مخالفت کی جائے گی۔

چنانچہ سر ایولن بارنگ کی محاصل درآمد کی منسوخی کے بارہ سال بعد یعنی مارچ 1894 میں سوتی کپڑے کے علاوہ ہندوستان میں درآمد ہونے والی تمام اشیا پر دوبارہ محاصل درآمد لگا دیے گئے۔ کچھ مستثنیات کے علاوہ عام طور سے تمام اشیا پر بحیک کی رو سے 5 فیصدی محصول لگا دیا گیا۔ لوہے اور فولاد پر ایک فیصدی محصول لگا دیا گیا تھا۔ پٹرول پر ایک پینس فی گیلن ادا کرنا پڑتا تھا۔ ریلوے کا سامان، صنعتی اور زراعتی مشینیں، کوئلہ، خام مال، غلہ، کتابیں اور متفرق اشیا محصول سے مستثنیٰ تھیں۔ لیجسلیٹو کونسل میں اس بل کی سخت مخالفت کی گئی۔ اس مخالفت کی بڑی وجہ یہ تھی کہ روئی کو اس فہرست میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔ لارڈ ایلگن نے مارچ 1894 میں ٹیرف ایکٹ TRIFF ACT کو منظور کرتے وقت اشارہ کیا تھا کہ یہ قطعی فیصلہ نہیں ہے۔

واقعی یہ انتظام عارضی ثابت ہوا۔ دسمبر 1894 میں ایک اور ٹیرف ایکٹ منظور کیا گیا جس میں سوتی کپڑا اور سوت بھی شامل تھے۔ اور اُن پر بحیک کی رو سے 5 فیصدی محصول لگایا گیا تھا لیکن حکومتِ ہندوستان نے لنکاشائر کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہندوستان کے کارخانوں میں تیار ہونے والے اُس سوت پر قیمتوں میں توازن پیدا کرنے کے لیے 5 فیصدی اکسائز ڈیوٹی لگا دی جو لنکاشائر کے سوت کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ ہندوستان میں درآمد ہونے والے لنکاشائر کے مصنوعات عام طور سے نفیس قسم کے ہوتے ہیں اور ہندوستان کے کارخانوں میں تیار ہونے والا مال ادنیٰ قسم کا ہوتا ہے۔ لیکن کچھ قسموں کے متوسط قسم کے سوت کی حد تک لنکاشائر اور ہندوستان کا بنا ہُوا مال یکساں ہوتا ہے۔ چنانچہ سوت کے اُن "نمبروں" پر 5 فیصدی اکسائز ڈیوٹی لگائی گئی

جن میں مقابلہ کی گنجائش تھی۔ ہندوستان کے سوت " بیس سے زیادہ " پر اکسائز ڈیوٹی لگائی گئی " بیس سے زیادہ " اُس سوت کو کہا جاتا تھا جس کی ایک مقررہ لمبائی کے بیس لچھوں پر مشتمل بیس سے زیادہ گھنڈے ایک پاؤنڈ پر چڑھیں۔

لیکن برطانوی صنعت کار اس سے مطمئن نہیں ہوئے۔ ہاؤس آف کامنز میں اس موضوع پر 21 جنوری 1895 کو بحث ہوئی اور سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا سر ہنری فاؤلر نے ایک اہم بیان دیا" حکومت ہند کے مشورے کے ساتھ ملکۂ معظمہ کی حکومت اس پر غور کرے گی تاکہ تحفظی ناانصافی کو دُور کرنے کے اعلان پر صدق دل سے عمل کیا جا سکے۔"

اس کے چھ دن بعد اسکاٹ لینڈ کے صنعت کاروں اور رنگا ہُوا سوتی کپڑا ہندوستان برآمد کرنے والوں کا ایک وفد اُس سے ملا۔ اس وفد نے خصوصیت کے ساتھ دو باتوں پر زور دیا۔

(۱) وہ کم نمبر کا سوت برما بھیجتے ہیں تو اُس پر 5 فیصدی محصول ادا کرنا پڑتا ہے لیکن بمبئی اور کلکتے سے جانے والا بیس اور بیس سے کم نمبر کا سوت محصول سے مستثنیٰ ہے۔

(۲) ہندوستان میں بننے والے سوتی کپڑے میں جو خاکستری سوت استعمال ہوتا ہے صرف اُس پر 5 فیصدی محصول ادا کیا جاتا ہے لیکن کیمیاوی طریقے سے رنگ اُڑائے ہوئے، رنگے ہوئے بُنے ہوئے اور چھپے ہوئے برطانوی کپڑے پر 5 فیصدی محصول ادا کرنا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے کیمیاوی طریقے سے رنگ اڑائے ہوئے، رنگے ہوئے، بُنے ہوئے اور چھپے ہوئے ہندوستانی کپڑے کو مالی فائدہ پہنچتا ہے۔

لنکا شائر کے صنعت کاروں اور سوتی کپڑے ہندوستان برآمد کرنے والوں کا ایک اور وفد 27 مئی 1895 کو سر ہنری فاؤلر سے ملا۔ وفد کے اراکین سے کہا گیا کہ وہ واقعات و دلائل پر مشتمل ایک بیان داخل کریں۔ یہ بیان پیش کر دیا گیا۔ لیکن جون 1895 میں لبرل حکومت مستعفی ہو گئی اور کنزرویٹو حکومت بننے کے بعد لارڈ جارج ہملٹن سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا مقرر کر دیا گیا۔

لنکا شائر کے رائے دہندگان سے کنزرویٹو پارٹی نے کئی پیمان و نیم پیمان کر رکھے تھے اور اُنھوں نے لبرل حکومت کے مقابلے میں لنکا شائر کو زیادہ مراعات دینا چاہیں۔ لارڈ جارج ہملٹن نے ستمبر 1895 میں حکومتِ ہند کو ایک خط لکھا جس کے مندرجہ ذیل اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں۔

"لنکاشائر کے وفد نے اس بات پر زور دیا کہ جیس نمبر یا کسی اور نمبر پر اگر خطِ فاصل کھینچ دیا جائے تو اُس سے نہ ہندوستانی صنعت کاروں کو فائدہ ہوگا نہ برطانوی صنعت کاروں کو۔"

یہ بات ہندوستان اور انگلستان دونوں کے لیے مفید ہوگی اگر ہندوستان کی بندرگاہوں کو محاصل سے مستثنیٰ قرار دے دیا جائے جس طرح 1882 اور 1894 کی درمیانی مدت میں وہ قریب قریب مستثنیٰ تھیں۔ لیکن اگر مالیاتی دشواریوں کی بنا پر حکومت محاصل درآمد برقرار رکھنے پر مجبور ہو تو یہ ضروری ہے کہ اُن کا نفاذ اس طرح کیا جائے کہ اُن سے وعدوں کی خلاف ورزی نہ ہو اور کسی کو شکایتوں اور حملوں کا موقع نہ ملے۔" [1]

رفتہ رفتہ حکام نے ہندوستان کے بنے ہوئے سوتی کپڑے پر اکسائز ڈیوٹی لگانے کی مہلک پالیسی اختیار کرلی۔ جیس نمبر پر جو خطِ فاصل لگایا گیا تھا اس کو ہٹا دینے، سوت کو محصول سے مستثنیٰ کر دینے اور ہر قسم کے تیار شدہ کپڑے پر محصول لگا دینے کی تیاری ہونے لگی جس میں وہ ادنیٰ ترین ہندوستانی کپڑا بھی شامل تھا جس کا لنکاشائر سے کوئی مقابلہ نہیں تھا۔

لارڈ ایلگن نے 16 جنوری 1896 کو سکریٹری آف اسٹیٹ کو ایک تار بھیجا جس میں ہر قسم کے تیار شدہ کپڑے پر ½3 فیصدی محصول لگانے اور ہر قسم کے سوت کو محصول سے مستثنیٰ قرار دینے کے نئے اقدام کی منظوری طلب کی گئی تھی۔ لارڈ جارج ہملٹن نے دوسرے دن تار کے ذریعے اپنی منظوری دیدی اور گورنر جنرل کی کونسل میں ٹیرف امینڈمنٹ بل TARIFF AMENDMENT BILL اور کاٹن ڈیوٹیز بل COTTON DUTIES BILL پیش کر دیے گئے۔

اس بات کو بڑی آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک سال پہلے منظور ہونے والے ٹیرف بل پر نظرثانی کرنے اور ہندوستان کے بنے ہوئے ایسے ادنیٰ کپڑے پر نامنصفانہ محصول لگانے کا تہیہ، جس کا کوئی مقابلہ یورپین کپڑے سے نہیں تھا، گورنر جنرل کی کاؤنسل کے اراکین کے شدید احتجاج کا باعث بنا، جن میں سرکاری اور غیر سرکاری، ہندوستانی اور انگریز، سبھی اراکین شامل تھے۔ اس پر ۳ فروری کو بحث ہوئی جس کی روداد بڑی تقطیع کے 36 صفحات پر [2]

---

[1] مراسلہ مورخہ 5 ستمبر 1895

[2] انڈین ٹیرف ایکٹ 1896 اور کاٹن ڈیوٹیز ایکٹ 1896 کے کاغذات جو پارلیمنٹ میں پیش کیے گئے۔

پھیلی ہوئی ہے۔ ہم اُس کے کچھ مختصر اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ انڈین ٹیرف ایکٹ 1896 کاٹن ڈیوٹیز ایکٹ کے کاغذات جو پارلیمنٹ میں مسٹر پلے فیر PLAY FAIR نے جو کلکتے کے یورپی تاجروں کا نمائندہ تھا، کہا ”عزت مآب اراکین کے اس خیال کو غلط ثابت کرنے کے لیے کوئی ثبوت نہیں پیش کیا گیا ہے کہ لنکاشائر کے کارخانوں کا کوئی مقابلہ اُس ادنیٰ قسم کے کپڑے سے نہیں ہے جو ہندوستانی سوت سے ہندوستان کے کارخانوں میں تیار کیا جاتا ہے۔ بلکہ ہندوستان میں مزید کی جانے والی تفتیش نے ثابت کر دیا ہے کہ اُس کپڑے سے حقیقت میں کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ چوبیس نمبر کے کم کے سوت سے بُنا جاتا ہے۔“

”اور حقیقت میں یہ ہندوستان کی تجارت ہے کیا جو بدقسمتی سے اتنی نزاع کا باعث بن گئی ہے؟ اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ توانائی سے چلنے والے ہندوستان کے تکلے دنیا میں پائے جانے والے تکلوں کے 1/25 اور توانائی سے چلنے والے ہندوستان کے کرگوں کے 1/60 ہیں۔ انگلستان میں پائے جانے والے ساز و سامان کی مناسبت سے اگر دیکھا جائے جہاں دنیا کے آدھے تکلے اور ایک تہائی کرگے موجود ہیں، تو انگلستان کے تکلوں کے 1/12 تکلے اور انگلستان کے کرگوں کے 1/19 کرگھے ہندوستان میں ہیں۔ کیا ہندوستان یہ چھوٹا سا بھیڑ کا بچہ پالنے کا حق بھی نہیں رکھتا ہے؟ خدا جانتا ہے کہ مجھے لنکاشائر کی تجارتی بدحالی سے پوری ہمدردی ہے لیکن میں انگلستان کی طرح ہندوستان کی خوش حالی کا بھی خواہاں ہوں۔ سہولت پہنچانے کے لیے ہر جائز قدم اُٹھایا جانا چاہیے۔ لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ لنکاشائر کے مالکان اپنے بگڑے ہوئے حالات سے خائف و پریشان ہوکر ہندوستان کی اُس صنعت پر غیر منصفانہ حملہ کیوں کرتے ہیں جس کا اُن سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس بل کی مجوزہ دفعات کے معنی ہوں گے کہ لنکاشائر کے مال پر 51½ لاکھ (یا 37 فیصدی) محصول کم کر دیا جائے اور ہندوستان کے مال پر لگنے والے محصول میں 11 لاکھ (300 فیصدی) کا اضافہ کر دیا جائے۔“

ہندوستانی صنعت کاروں کی طرف سے راؤ صاحب بلونت راؤ نے تقریر کی۔ ”ابھرتی ہوئی اور بڑھتی ہوئی صنعتوں کے عارضی تحفظ کی وکالت مسٹر مل جیسے عالم نے کی ہے ..... لیکن آزاد تجارت کے نقطۂ نظر سے بھی یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ اب تک جس انداز سے محاصل لگائے گئے ہیں اُن سے ہندوستان کو کسی قسم کا تحفظ حاصل ہو سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ صرف 30 نمبر اور 40 نمبر سے تیار ہونے والا ہندوستانی کپڑا مانچسٹر سے براہ راست مقابلہ کر سکتا ہے:

30 نمبر یا اُس سے کم نمبر سے ہندوستان میں تیار ہونے والے کپڑے پر اگر محصول لگایا جائے

تو اُس سے کسی غیرملکی تاجر کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن لاکھوں انسانوں کو اپنے استعمال کے لیے موٹا جھوٹا کپڑا زیادہ قیمت پر خریدنا پڑے گا جس کی وجہ سے اُن کی بدحالی میں اور اضافہ ہو جائے گا۔ جو لوگ محصول ادا کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں اور زیادہ آسایش کی مناسبت سے زیادہ محصول ادا کر سکتے ہیں، اُن پر محصول کا بار کم ہو جائے گا اور اس خسارے کو پورا کرنے کی ذمہ داری غریبوں پر ہوگی۔"

مدراس کے نمائندے مسٹر آنند چارلو نے بھی کہا کہ ہندوستان کے ادنیٰ قسم کے کپڑے کا کسی سے کوئی مقابلہ نہیں ہے اور ہندوستان میں ادنیٰ قسم کے کپڑے پر محصول لگانا لنکا شائر سے کیے ہوئے وعدوں سے تجاوز کرلے کے مترادف ہے۔ اُس نے مزید کہا۔

"میں ذمہ دار وزیروں سے درخواست کرتا ہوں، جو بشرطِ خواہش اختیار رکھتے ہیں، کہ ہمارے مفادات کو بے رحمی کے ساتھ خطرے میں نہ ڈالیں۔ اُن سے میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ وہ نادانستہ طور سے اُن وعدوں سے تجاوز کر رہے ہیں جو سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا نجیکے تھے اُس حاکم نے صرف ناانصافی اور تحفظ کے تدارک کا وعدہ کیا تھا۔"

بنگال کی نمائندگی کرلے والے مسٹر اسٹیونس MR.SELVENS نے، جو بعد میں سر چارلس اسٹیونس کے نام سے مشہور ہوا، کہا

"میرا خیال ہے کہ اس بات کو تسلیم کر لینا چاہیئے کہ مجموعی طور سے اس اقدام کو لوگوں کی حمایت حاصل نہیں ہے۔ اس کے دو خاص اسباب ہیں۔ پہلا سبب یہ ہے کہ کچھ لوگوں کے دلوں میں یہ شک گھر کر چکا ہے کہ اس کا محرک ہندوستان کی ضروریات کے بجائے انگلستان کی سیاسی جماعتوں کی مصلحتیں ہیں۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ تجارت میں بدنظمی پیدا ہوگی جس کا مضر اثر اس ملک کی اہم صنعتوں اور غریب صارفوں پر پڑے گا۔"

یہ تمام احتجاج بے سود ثابت ہوئے۔ ہندوستان کی لیجسلیٹو کاؤنسل ایک آزاد ادارہ نہیں ہے۔ لارڈ ایلگن کے وزیر مالیات سر جیمس ویسٹ لینڈ نے ان بلوں کو پیش کیا اور انھیں منظور کرانے میں اُسے کوئی بڑی دشواری نہیں ہوئی۔

1896 کے کاٹن ڈیوٹی ایکٹ کی دفعہ 6 ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

"برطانوی ہند کے تمام کارخانوں میں، ایسے سوتی مال پر جو اُن کارخانوں میں پیدا کیا جائے اُس مال کی قیمت پر $3\frac{1}{2}$ فیصدی کی شرح سے ایک محصول لگایا اور وصول کیا جائے گا۔"

ہمارا قاری اس بات کو محسوس کرے گا کہ یہ قانون اُن تمام پچھلے مالیاتی قوانین سے مختلف ہے جو ہندوستان میں بنائے گئے تھے۔ ۱۸۷۹ میں سوتی مال کے محاصل سے حکومت دست بردار ہو گئی تھی۔ 1882 میں نمک اور شرابوں کے علاوہ تمام محاصل درآمد فسوخ کر دیے گئے تھے: 1894 میں محاصل درآمد دوبارہ لگا دیے گئے تھے اور ہندوستان کے ایسے مال پر اکسائیز ڈیوٹی لگادی گئی تھی جو لنکاشائر کے مال سے مقابلہ کرسکتا تھا۔ لیکن 1896 میں سپر ڈالتے وقت تو حکومت حد سے تجاوز کر گئی۔ اُس نے ہندوستان میں بنائے جانے والے تمام سوتی مال پر اکسائز ڈیوٹی لگادی۔ اُس نے ادنیٰ قسم کے اُس ہندوستانی سوت پر محصول لگادیا جس کا مقابلہ لنکاشائر سے نہ کبھی ہوا تھا نہ ہوسکتا تھا۔ اُس نے اُن ہندوستانی کارخانوں پر بوجھ ڈال دیا جن کا یورپ کے کسی کارخانے سے مقابلہ نہیں تھا۔ اُس نے لنکاشائر کے غریبوں کو سہولت پہنچانے کا بہانہ بھی نہیں بنایا اور ہندوستان کے غریب لوگوں کے کپڑوں کی قیمتوں میں اضافہ کر دیا۔

مالیاتی ناانصافی کی مثال کے طور پر 1896 کے ہندوستانی ایکٹ کا جواب زمانۂ جدید کا کوئی متمدن ملک نہیں پیش کرسکتا ہے۔ دنیا کے زیادہ تر متمدن ممالک بدیسی مال پر امتناعی محاصل لگا کر اپنے ملک کی صنعتوں کا تحفظ کرتے ہیں۔ آزاد تجارت کی بڑی سے بڑی حکومتیں اپنے ملک کی صنعتوں پر محاصل نہیں لگاتی ہیں جب کہ آمدنی کے لیے درآمد ہونے والے مال پر تھوڑا بہت محصول لگایا جاتا ہے۔ لیکن ہندوستان میں صنعتوں کا تحفظ نہیں کیا گیا حالانکہ جان اسٹورٹ مل کے اصولوں کے مطابق بھی ابھرتی ہوئی صنعت کا تحفظ کیا جانا چاہیے۔ آمدنی کے لیے لگائے جانے والے تھوڑے بہت محاصل سے بھی حکومت 1879 اور 1882 میں دست بردار ہو گئی تھی۔ ہندوستان کے بنے ہوئے اُس سوتی مال پر 1894 میں محصول لگایا گیا تھا جس کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ درآمد ہونے والے مال سے مقابلہ کرسکتا ہے۔ ہندوستان کے بنے ہوئے اس مال پر بھی 1896 میں محصول لگا دیا گیا جس کا بدیسی مال سے کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ یہ وہ طریقے ہیں جن سے ایک نمائندگی نہ رکھنے والی قوم کے مفادات قربان کیے جاتے ہیں۔

اس غیر منصفانہ قانون کا نتیجہ، جس کی شدت میں مالیہ قحطوں اور کرنسی کے متعلق بننے والے قانون نے اضافہ کر دیا ہے، ملک کے لیے تباہ کن ثابت ہوا۔ مندرجہ ذیل اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے آخری برسوں میں صنعت میں کتنی رکاوٹیں پڑیں۔

سال	کارخانوں کی تعداد	کرگھے	تکلے	سوت دس لاکھ پونڈ میں	کپڑا دس لاکھ گزوں میں
1898-99	175	37,288	44,55,038	512	101
1899-1900	186	38,520	47, 29,570	513	98
1900-1901	190	43,542	49,32,602	353	98

ہر رکاوٹ کے باوجود نئے کارخانے وجود میں آرہے ہیں لیکن سوت اور کپڑے کی پیداوار میں افسوسناک حد تک کمی ہوگئی ہے۔

اس وقت (1903) انگلستان میں جو مالیاتی بحث ہو رہی ہے اُس میں تحفّظ کے حامی، انتقامی کارروائی کے حامی اور آزاد تجارت کے حامی غرض کے سب لوگ انگلستان کے لوگوں کی بھلائی کو کامیابی کا پیمانہ سمجھتے ہیں۔ تحفّظ کے حامیوں کا خیال ہے کہ لوگوں کے مفادات تحفُّظ کی بنا پر برقرار رکھے جا سکتے ہیں۔ انتقامی کارروائی کے حامیوں کا خیال ہے کہ لوگوں کے ساتھ انصاف کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ غیر ملکی کو شکنجے کی زد پر رکھا جائے۔ آزاد تجارت کے حامیوں کا کہنا ہے کہ آزاد تجارت ہی وہ واحد پالیسی ہے جو انگلستان کی ضرورت سے زیادہ بڑھی ہوئی آبادی کو مہنگی روٹی، تنگ دستی اور فاقہ کشی سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔ سب جماعتوں کو اس پر اتفاق ہے کہ مالیاتی قانون کا مقصد لوگوں کی بھلائی ہونا چاہیئے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے طریقوں کے متعلق اُن میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ کیا وہ ایمانداری کے ساتھ ہندوستان پر بھی اس پیمانے کا اطلاق کرنے کو تیار ہیں؟ کیا وہ ہندوستان کے صنعت کار کے ساتھ انصاف کر سکتے ہیں اور ہندوستان کی صنعتوں اور ہندوستانی قوم کے مفاد میں قانون سازی کر سکتے ہیں؟

باب 10

ریلیں اور آب رسانی کے ذرائع

ایک سرکاری وقائع نگار نے 1873 میں لکھا تھا "ریلوں کی تعمیر قریب قریب مکمل ہو چکی ہے۔ تعمیر پر ہونے والے بھاری اخراجات کے ختم ہو جانے کی وجہ سے اب ملک کی مالی حالت کے سدھرنے کی توقع کی جا سکتی ہے۔"[1]

اُس سلیکٹ کمیٹی نے 1878 میں لکھا تھا جس کا صدر لارڈ جارج ہملٹن تھا۔

"سر آرتھر کاٹن کی تجویز ہے کہ ریلوں کی تمام اسکیمیں اور اُن کے متعلق ہونے والے کام فوری طور سے غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کر دیے جائیں۔ لیکن وہ چاہتا ہے کہ آئندہ دس یا بیس سال تک دس ملین کی رقم ہر سال آب رسانی کے ذرائع پر خرچ کی جاتے۔"[2]

قحط کمیشن نے 1880 میں لکھا تھا۔ "ہندوستان کو خشک سالی کی بنا پر پڑنے والے قحط سے محفوظ رکھنے کے لیے جو تدبیریں کی جانی چاہئیں اُن میں یقینی طور سے اولیت سینچائی کے کاموں کو دی جاتی ہے"[3]

---

[1] "اخلاقی اور مادی ترقی اور ہندوستان کی حالت" 1872-73
(MORAL AND MATERIAL PROGRESS & CONDITION OF INDIA)

[2] سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ

[3] قحط کمیشن کی رپورٹ 1880 حصہ دوم، ص 150

ان سفارشات کو نظر انداز کر دیا گیا۔ ریلوں کی تعمیر پر ہونے والا "بھاری خرچ رد کا نہیں گیا" نئی ریلوں کی اسکیم اور تعمیر کو "ملتوی" نہیں کیا گیا۔ قحط سے بچنے کے کاموں میں "اوّلیت" آب رسانی کے ذرائع کو نہیں دی گئی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان کی حکومت ہندوستان کے لوگوں کی رائے کے بجائے انگلستان کی رائے عامہ کا زیادہ اثر قبول کرتی ہے۔ انگلستان کے لوگ ریلوں سے واقف ہیں لیکن ہندوستان کے لیے آب پاشی کی اہمیت سے وہ واقف نہیں ہیں۔ انگلستان کے صنعت کار سمجھتے ہیں کہ ریلوں کی توسیع کی بنا پر اُن کا مال دُور دراز منڈیوں تک پہنچ سکے گا۔ انگلستان کے تاجر چاہتے ہیں کہ رسل و رسائل کے نئے ذرائع کھول کر انھیں اور سہولتیں مہیا کی جائیں۔ برطانوی تجارتی ادارے پارلیمنٹ کے ذریعے اور انڈیا ہاؤس سے راست مراسلت کر کے حکومتِ ہند پر اثر ڈالا کرتے ہیں۔ پارلیمنٹ کے اراکین ہاؤس آف کامنز میں بار بار سوال کر کے نئی ریلوں کی تعمیر پر اصرار کیا کرتے ہیں۔ آب رسانی کے ذرائع کی کسی کو پروا نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس بات کو کوئی نہیں سمجھتا کہ ہندوستان کے لیے اس کی کتنی اہمیت ہے۔ نئی ریلوں پر روپیہ نہ خرچ کرنے کی اُس نیک خواہش کو جلد بھلا دیا گیا جس کا ذکر 1873 کی سرکاری رپورٹ میں کیا گیا تھا۔ سر آرتھر کاٹن کو ایک پرجوش انسان اور خیال پرست کہہ کر اُس کا مذاق اڑایا گیا۔ سرکاری محافظ خانوں میں فیمن کمیشن کی رپورٹ پر گرد جمتی رہی۔ نئی ریلوں کی تعمیر کا کام جوش و خروش سے کیا جاتا رہا حالانکہ نہ ہندوستان کو اُن کی فوری ضرورت تھی اور نہ اُس کے پاس اتنے وسائل تھے۔

لیکن ایک ایسے ملک میں جہاں کے لوگ غریب تھے اور ریلیں منافع بخش نہیں تھیں اُن کی تعمیر میں ایک دشواری بھی تھی۔ نجی کمپنیوں کو ہندوستان کی آمدنی میں سے منافع دینے کی ضمانت کرنے کی پالیسی کی بنا پر اصراف بے جا کیے گئے اور مسافروں کے آرام کا خیال نہیں رکھا گیا۔ یہ واقعات 1871، 1872، 1873 اور 1874 کی مالیاتی ... پر اچھی طرح واضح ہو گئے تھے۔ اس کے بعد فیصلہ کیا گیا تھا کہ ریاست سرمایہ قرض لے کر خود ریلیں تعمیر کرے۔ اس پالیسی پر کچھ برسوں تک عمل کیا گیا۔ لیکن 1877 کے قحط اور افغانوں کے خلاف 1878 کی جنگ نے ہندوستانی مالیات کا توازن بگاڑ دیا جس کی وجہ سے سرکاری ریلوں کی مزید تعمیر روک دی گئی۔

اس کے بعد کوششیں کی گئیں کہ نجی کمپنیوں کو نئی ریلیں تعمیر کرنے پر آمادہ کیا جائے۔ ان کوششوں میں کامیابی نہ ہو سکی۔ اور مجبوراً حکومتِ ہند کو ضمانت کے شر آمیز طریقے کی تجدید کرنی پڑی۔ ایک

دفعہ پھر اُس پالیسی کو ترک کر دیا گیا اور سرکاری ریلوں کی تعمیر شروع کر دی گئی۔ لیکن روپے کی قیمت کم ہو جانے کی بنا پر حکومت کے لیے ضروری ہو گیا کہ وہ سونے کے متعلق اپنی ذمہ داریاں کم کرے۔ چنانچہ سرکاری ریلوں کی تعمیر پھر روک دی گئی۔

ایک دفعہ پھر حکومت نے نجی کمپنیوں کا دامن پکڑا اور 1893 میں ایک تجویز منظور کی گئی جس میں اُن شرائط کی وضاحت کی گئی تھی جن کی بنا پر حکومت نجی کمپنیوں کو مراعات دینے کو تیار تھی۔ یہ تجویز سرمایہ لگانے والوں کو آمادہ نہ کر سکی 1896 میں نئی شرطیں پیش کی گئیں۔ ان نئی شرائط کے مطابق کچھ ریلیں تعمیر کی گئیں۔ اُس کے بعد اُن کے مطابق کام نہیں کیا جا سکا۔ سرمایہ دار ہندوستان کی آمدنی میں سے منافع ادا کرنے کی واضح ضمانت کے بغیر سرمایہ لگانے کو تیار نہیں تھے۔" اس وقت کسی نہ کسی قسم کی ضمانت کے بغیر ریل کی اسکیموں کو عملی جامہ پہنانا حکومت کے لیے بہت مشکل ہو گیا ہے اور یہ کہنا پڑتا ہے کہ نئی ریلوں کے لیے یا تو اُسے ضمانت دینی پڑے گی یا کہیں سے سرمایہ فراہم کرنا ہوگا۔"[1]

کیا کوئی تیسرا راستہ نہیں ہے؟ اب جب کہ خاص خاص ریلیں تعمیر کی جا چکی ہیں کیا ریلوں کی توسیع کا کام بغیر ضمانت کے نجی کاروبار پر نہیں چھوڑا جا سکتا ہے؟ ہندوستان کے لوگ یہ نہیں چاہتے ہیں کہ اُن کے ادا کیے ہوئے محاصل کی رقم سے مزید ریلیں تعمیر کی جائیں 1897 کے فیمن کمیشن کے خیال میں قحط سے چھٹکارا پانے کے لیے مزید ریلوں کی ضرورت نہیں ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ "آب پاشی کے کاموں کی توسیع سے قحط کے خلاف زیادہ تحفظ کیا جا سکتا ہے"[2]۔ 1900 کے فیمن کمیشن نے انجنوں اور ڈبوں میں اضافہ کرنے کی سفارش کی تھی۔ لیکن ریلوں کی مزید توسیع پر زور نہیں دیا تھا[3] ریلوں کے متعلق تحقیقات کرنے کے لیے جو خصوصی کمشنر حال میں ہندوستان بھیجا گیا تھا اُس نے تسلیم کیا ہے کہ "جہاں تک فی مربع میل بچھائی جانے والی ریل کی پٹریوں کا تعلق ہے یورپ کے باہر کے دوسرے ملکوں کے مقابلے میں ہندوستان کی حالت بہتر ہے" ہندوستان کی حالت بحر خضر کے پار کے روس یا سائبریا سے، مصر یا ٹال سے

---

[1] ہندوستانی ریلوں کے کام اور انتظام کے متعلق رابرٹسن کی رپورٹ ۔ 1903 ص 30

[2] فیمن کمیشن کی رپورٹ ۔ 1898 ص 330

[3] 〃 〃 〃 1898 ۔ ص 79

ٹرانسوال یا آرنج ریور کالونی سے ، نیوزی لینڈ یا وکٹوریا سے ، نیو ساؤتھ ویلز یا کوئنس لینڈ سے، ورنی زولا سے ، برزیل یا جمہوریہ ارجنٹائن سے بہتر ہے۔ صرف جاپان میں اس کے رقبے کی مناسبت سے ریلیں زیادہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُس کا رقبہ کم ہے۔ لیکن جہاں تک آبادی کا تعلق ہے ہندوستان کے 231 ,12 لوگوں کے حصے میں ایک میل ریل آتی ہے جبکہ جاپان میں 12713 لوگوں کے حصے میں ایک میل ریل آتی ہے۔ ایسے واقعات بھی جن پر ہمیں غور کرنا چاہیئے۔ ایسی صورت میں جبکہ ہندوستان کے لوگوں کی فی کس سالانہ آمدنی 2 پاؤنڈ ہے اور انگلستان کی فی کس سالانہ آمدنی 42 پاونڈ ہے ہم یورپ کے رہنے والوں کی طرح سفر کرنے کی آسایش کا خیال بھی نہیں کرسکتے ہیں۔ جہاں تک سفر کی سہولتوں کا تعلق ہے ہمارے لیے اتنا کافی ہے کہ ہم یورپ کے باہر کی قوموں میں سب سے آگے ہیں۔ ہم اس وقت کا انتظار کرسکتے ہیں جب نجی کمپنیاں نئی ریلیں تعمیر کرنے کے کام کو منافع بخش سمجھنے لگیں۔ اور ہمارے محاصل کی ضمانت نہ طلب کریں۔ ہمیں اس پر اعتراض ہے کہ ہندوستان کی آمدنی نئی ریلوں پر خرچ کی جائے یا نئی ریلوں کے لیے ضمانت دی جائے۔ اگر سرکاری ریلوں یا ضمانت شدہ ریلوں کی مزید توسیع کی گئی تو یہ سمجھا جائے گا کہ دوسروں کے دباؤ میں آکر ہندوستان کے مفادات کے ساتھ غداری کی جارہی ہے۔

پچھلے کچھ برسوں میں ریلوں کی تعمیر میں تیزی کے ساتھ ہونے والی ترقی مندرجہ ذیل نقشے سے ظاہر ہوتی ہے جس میں ہندوستان میں ریلوں کی تعمیر کی ابتدا سے میلوں میں اُن کی لمبائی دکھائی گئی ہے۔

1901 میں 25373 میل پٹری بچھائی جاچکی تھی۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اُس وقت کے 28 سال بعد جب سرکاری وقائع نگار نے لکھا تھا۔" اب ریلوں کی تعمیر قریب قریب مکمل ہوچکی ہے " ریل کی پٹری کی لمبائی پانچ ہزار میل سے بڑھ کے پچیس ہزار میل ہوگئی ہے۔

ان ریلوں کی تعمیر پر ہونے والا مجموعی خرچ مندرجہ ذیل نقشوں میں دکھایا گیا ہے، جو اخلاقی اور مادی ترقی اور ہندوستان کی حالت کے متعلق دس سالہ رپورٹ کی بنیاد پر تیار کیے گئے ہیں۔

لے رابرٹسن کی رپورٹ 1903، ص 35

ہندوستان کی ریلیں

سال	میل	سال	میل	سال	میل	سال	میل
1853	۲۰	1871	5077	1885-86	12375	1893	18510
1856	۲۰۲	1873	5694	1886-87	13387	1894	18906
1857	۲۸۸	1875	4518	1887-88	14376	1895	19555
1861	۱۵۸۸	1877	7322	1888-89	15241	1896	20262
1862	۲۳۲۶	1881	9891	1889-90	16096	1897	21133
1863	۲۵۵۰	1882	10144	1890-91	16977	1898	22048
1865	۳۳۰۳	1883-84	10828	1891-92	17564	1899	23528
1867	۲۹۳۶	1884-85	12000	1892	17894	1900	24660

دسمبر 1891 تک ہونے والے اخراجات

دس روپے میں

سرکاری ریلیں جن کی سرکار نے تعمیر کی	13,35,46,074
سرکاری ریلیں جن کی تعمیر کمپنیوں نے کی	2,81,13,763
ضمانت شدہ کمپنیاں	4,92,05,868
امداد پانے والی کمپنیاں	56,07,036
دیسی ریاستوں کی ریلیں	86,00,251
پرتگالی اور فرانسیسی ریلیں	16.89,068
ریلوں کی پیمائش اور کوئلے کی کانیں وغیرہ	9,07,705
کل میزان	22,76,69,765

دسمبر ۱۹۰۱ تک سال بہ سال لگنے والا سرمایہ

سال	پاؤنڈ	سال	پاؤنڈ
1892	3,240,000	1897	7,307,000
1893	3,666,000	1898	6,993,000
1894	35,26,000	1899	8,926,000
1895	4,373,000	1900	7,106,000
1896	5,213,500	1901	6,773,000

1901 کے اختتام تک لگنے والے مجموعی سرمائے کا کل میزان 34,01,59,800 ۔ دس روپے کی اکائی میں ہوا جو 22,67,73,200 پاؤنڈ کے برابر ہے۔[1]

اب صرف یہ بتانا باقی ہے کہ حکومت نے ضمانت شدہ ریلوں کی خرید کا حق محفوظ رکھا تھا اور پچھلے بیس سال میں یہ حق آزادی کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے جو ہماری رائے میں حق بجانب ہے۔ ایسٹ انڈیا ریلوے 1880 میں حاصل کر لی گئی۔ ایسٹرن بنگال ریلوے 1884 میں، سندھ پنجاب اور دہلی کی کمپنیوں کی ریلیں 86-1885 میں، اودھ، روہیلکھنڈ ریلوے 1888 میں، ساؤتھ انڈین ریلوے 1890 میں اور گریٹ انڈین پنینشلر ریلوے 1900 میں حاصل کر لی گئیں۔ لیکن ایک طرف تو پرانی ضمانت شدہ ریلیں حکومت نے خرید لیں دوسری طرف پچھلے کچھ برسوں میں نئی ریلوں کے لیے مزید ضمانتیں دی گئی ہیں۔ آسام، بنگال ریلوے کو جو 1892 میں تعمیر ہوئی تھی، آسام کو چٹاگانگ کے بندرگاہ سے ملانے کے لیے 3 فیصدی کی ضمانت دی گئی ہے۔ ظاہر ہے یہ توسیع آسام کے چائے کے باغات کے مفاد میں کی گئی ہے۔ برما ریلوے کمپنی کو، جو 1897 میں بنی تھی، برما کی سرکاری ریلوں کو اپنے انتظام میں لینے کے لیے اور مانڈلے سے چین کی طرف پٹری بچھانے کے لیے $2\frac{1}{2}$ فیصدی کی ضمانت دی گئی ہے۔ یتھاؤ

---

[1] برطانوی ہند کے متعلق اعداد و شمار کا خلاصہ ۔ 92-1891 لغایت ۱۹۰۰ - ۱

STATISTICAL ABSTRACT NALATINGTA BRITISH INDIA

LATHIO تک پٹڑی بچھادی گئی ہے۔ لیکن اس پر بہت کم ریلیں چلتی ہیں۔ اس طرح ہندوستان کا روپیہ اُن اسکیموں پر برباد کیا گیا ہے جن سے ہندوستان کے محصول دہندگان کو کوئی فائدہ نہیں

جب ہم ریلوے کے موضوع سے آب پاشی کے موضوع پر آتے ہیں تو یہ احمقانہ اسراف سے احمقانہ بخالت کے موضوع کی طرف آنے کے مترادف ہے۔ سر آرتھر کاٹن کی تجویز کردہ عظیم اسکیموں پر کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا گیا اور مارچ 1902 تک ہندوستان میں آب رسانی کے کاموں پر خرچ ہونے والی مجموعی رقم 24 ملین پونڈ کے لگ بھگ تھی جبکہ ریلوں پر 226 ملین پاؤنڈ خرچ کیے گئے تھے

صوبہ	نہریں		زیر آبپاشی ایکڑ
بنگال	اڑیسہ نہر		2,01,498
	مدنا پور نہر		82,134
	سون نہر		7,57,494
آگرہ اور اودھ	مشرقی جمنا کی نہر دو گنگا کی نہریں اور دوسرے ذرائع		27,41,400
پنجاب	جمنا کی مغربی نہر		5,89,955
	باری دوآب نہریں		8,56,041
	سرہند کی برطانوی نہر		3,41,553
	سرہند کی دیسی ریاست کی نہریں		17,48,129
	چناب کی نہر		65,339
	جہلم کی نہر		1,61,885
	سوہاگ، پارا اور سدھنائی کی نہریں		1,39,040
بمبئی	نیرا، موتھا اور دوسری نہریں	تقریباً	25,00,000
مدراس	کاویری، کرشنا اور گوداوری کی نہریں		1,54,000
	پریار کی نہریں		8,43,000
	روشی کولیا کی نہریں		رقبہ درج نہیں ہے
	پنیار اور دوسری نہریں		

یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ مدراس میں پانی کا محصول زمین کے محصول میں شامل کر دیا گیا ہے اور رعیت واری علاقے کے کسانوں کو ایک معینہ مشترک محصول سال بہ سال ادا کرنا ہوتا ہے۔

ہندوستان کے کچھ صوبوں میں جس سال زیادہ بارش ہوتی ہے اُس سال نہر کا پانی زیادہ استعمال کیا جاتا ہے لیکن سندھ میں زیادہ بارش ہونے کی صورت میں زیر آبپاشی رقبہ کم ہو جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کو سینچائی کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے۔ اُڑیسہ میں، جہاں عام طور سے بارش اچھی ہوتی ہے، 1896 کی خشک سالی تک زیادہ مقدار میں نہر کا پانی استعمال کرنے سے بچا کرتے تھے۔ اُس کے بعد درخواستوں کی بھرمار ہو گئی اور کسانوں نے معاہدے کر لیے کہ وہ کئی سال تک پانی استعمال کرتے رہیں گے اور اُس کا محصول ادا کرتے رہیں گے اس کی وجہ سے ہندوستان کے زیر آبپاشی رقبے میں سال بہ سال تبدیلی ہوتی رہی۔

لیکن ملک میں ایسے بڑے بڑے علاقے موجود ہیں جہاں نہریں یا آب پاشی کے دوسرے ذرائع تعمیر نہیں کیے گئے ہیں اور 1897 اور 1900 کے قحطوں نے حکومت کی توجہ اُن فرائض کی طرف مبذول کرا دی ہے جو ابھی تک تشنۂ تکمیل ہیں۔ بالآخر ۱۹۰۱ میں وہ اقدامات کیے گئے جو بیس سال پہلے کیے جانے چاہیے تھے اور ایک کمیشن مقرر کیا گیا جس کے سپرد اس امر کی تحقیقات کی گئی کہ ہندوستان میں آبپاشی کے ذرائع کو کس حد تک توسیع دی جا سکتی ہے سر کولن اسکاٹ مان کریف SIR COLIN SCOTT MONCRIEFF اس کمیشن کا صدر بنایا گیا جو ہندوستان کے محکمہ آبپاشی میں کام کر چکا تھا اور مصر میں نہایت کامیابی کے ساتھ آبپاشی کے اہم ذرائع تعمیر کر کے نمایاں حیثیت حاصل کر چکا تھا۔ اُس کی محنت کا نتیجہ کچھ دن پہلے چار خاصی ضخیم نیلی کتابوں BLUE BOOKS کی صورت میں ظاہر ہو چکا ہے۔

دوسری جلد میں ہندوستان میں تعمیر ہونے والے آبپاشی کے ذرائع کا خلاصہ اور آئندہ کیے جانے والے کاموں کے متعلق کمیشن کی سفارشات درج ہیں۔ کمیشن نے سفارش کی ہے کہ پنجاب میں زیریں باری دوآب اسکیم ملتوی کر دی جائے اور چناب سے نکالے جانے والی ایک نہر کو وادی راوی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لے جانے کی اہم تر اسکیم کی تجویز پیش کی ہے۔

سندھ کی موجودہ سیلابی نہروں کو مزید توسیع دینے کی تجویز پیش کی گئی ہے۔ گجرات کے لیے کمیشن نے یہ اہم تجویز پیش کی ہے کہ سابرمتی، ماہی اور نربدا دریاؤں پر بند باندھے

"پانی کا ذخیرہ جمع کرنے کے لیے مناسب جگہیں تلاش کی جائیں اور احمد آباد اور کیرا میں سینچائی کی سہولتیں مہیا کرنے کے لیے ان ذخیروں سے نہریں نکالی جائیں۔ دکن کے لیے بھی اسی قسم کی لیکن زیادہ جرأتمندانہ تجویزیں پیش کی ہیں۔ کمیشن نے سفارش کی ہے کہ پانی کے ذخیرے تعمیر کرنے کے لیے مغربی گھاٹوں کے اُن علاقوں کا معائنہ کیا جائے جہاں ہمیشہ بارش ہونے کی وجہ سے دریاؤں کو پانی ملتا رہتا ہے اور اُن ذخیروں سے نہریں نکال کر ایسے علاقوں میں لے جائی جائیں جن کا تحفظ ضروری ہو۔

مدراس کے لیے سفارش کی ہے کہ کرنول کڈپا نہر کی توسیع کی جائے اور تنگ بھدرا کے منصوبے کی مکمل تفتیش کی جائے۔ اس کے علاوہ یہ سفارش بھی کی ہے کہ کاویری اور کرشنا پر بند باندھے جائیں اور پانی کے بڑے بڑے ذخیرے بنائے جائیں۔

بنگال کے لیے کمیشن نے تجویز پیش کی ہے کہ شاہ آباد اور مظفرپور کے اضلاع کی آبپاشی کے لیے نہریں اور پانی کے ذخیرے تعمیر کیے جائیں۔ آگرہ اور اودھ کے لیے اُس نے زوردار سفارش کی ہے کہ یاندا اور بندیل کھنڈ کے تحفظ کے لیے کین نہر تعمیر کی جائے اور ساردا کو گنگا سے ملا دیا جائے تاکہ اُس کے پانی کے ایک حصے سے بجنور اور بدایوں میں سینچائی کی جا سکے۔

ان بڑے بڑے کاموں کے علاوہ بہت سے چھوٹے چھوٹے کام بھی تجویز کیے ہیں جن میں زیادہ تر ایسے ہیں جن پر 60,000 پونڈ سے زیادہ خرچ نہیں ہوگا۔ کچھ تو ایسے ہیں جن پر 6,000 پاؤنڈ سے بھی کم رقم صرف ہوگی۔ " ان چھوٹے چھوٹے کاموں کی حمایت میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ اُن سے اس قسم کے بہت سے علاقوں کو تحفظ کیا جا سکتا ہے جو بڑی بڑی اسکیموں کے تحت نہیں آتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر کاموں میں مالی نقصان کا خطرہ بھی نہیں ہے۔ اس قسم کے اکثر کاموں کو مزدوروں کو سہولت مہیا کرنے کے مقصد کے پیش نظر شروع کیا جا سکتا ہے اور انھیں یقین دلایا جا سکتا ہے کہ یہ کام حتی الوسع مکمل کیے جائیں گے۔"

چھوٹے اور بڑے دونوں قسم کے ذرائع آبپاشی کے لیے کمیشن نے زوردار سفارش کی کہ چاہے وہ منافع بخش نہ ہوں پھر بھی زراعت کے تحفظ کے لیے اُن کو تعمیر کیا جانا چاہیے۔ " کچھ دوسرے چھوٹے چھوٹے کام ہیں جن سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی ہے کہ وہ منافع بخش ثابت ہوں گے پھر بھی جس طرح ہم نے بڑے بڑے کاموں کی سفارش کی ہے ویسے ہی ہم اُن کی سفارش بھی کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ذریعہ خشک سالی کے خلاف اُن علاقوں کا تحفظ کیا جا سکتا

ہے جنھیں تحفظ کی ضرورت ہے۔ ان میں ہم اوّلیت اُن کاموں کو دینا چاہتے ہیں جو صوبجات متوسط کے دھان پیدا کرنے والے اضلاع کے لیے تجویز کیے گئے ہیں۔ لیکن ہمیں امید ہے کہ اس قسم کے بہت سے کام اُن دوسرے علاقوں میں کیے جاسکیں گے جو گجرات، برار، چھوٹا ناگپور اور بندیل کھنڈ میں پائے جاتے ہیں۔" حکومتِ ہند اور صوبائی حکومتیں، جنھیں حالیہ قحطوں کی پھیلائی ہوئی تباہی کے بعد اکثر مالگزاری میں چھوٹ دینا پڑی ہے، بلاشبہ یہ محسوس کریں گی کہ مالیاتی نقطۂ نظر سے بھی یہ پالیسی دانش مندی پر مبنی ہے کہ چھوٹے بڑے ذرائع آبپاشی تعمیر کیے جائیں چاہے وہ "براہ راست منافع بخش ثابت نہ ہوں۔"

کمیشن نے ایک دانش مندانہ سفارش یہ کی ہے کہ ایک مرکزی بورڈ مقرر کیا جائے جس پر آبپاشی کے ذرائع میں آئندہ ہونے والی ترقی پر برابر نظر رکھنے اور اُس کے متعلق رپورٹ پیش کرنے کی ذمہ داری ڈالی جائے۔ اس سفارش کو قدرے وسیع کر دیا جائے۔ بشمول ریلوے مفادِ عام کے تمام کاموں کے لیے ایک مرکزی بورڈ مقرر کیا جائے اور کچھ ایسے ہندوستانی اراکین اس بورڈ میں شامل کیے جائیں جو انتظامی تجربے اور اپنے ہم وطنوں کی ضروریات سے واقفیت کی بنا پر اس کے اہل ہوں۔ ہندوستان کے مفادِ عامہ کے کاموں کی نمائندگی وائسرائے کی کاونسل کا ایک رکن کرتا ہے جو عام طور سے انجنیر ہوا کرتا ہے۔ وہ اس مسئلے پر ایک انجنیر کے نقطۂ نظر سے غور کرتا ہے اور زراعت کی ضروریات سے واقف نہیں ہوتا۔ وہ دباؤ پڑنے پر ریلوں کی توسیع کے لیے تیار ہو جاتا ہے لیکن ہندوستان کے لوگوں کی خواہشات و ضروریات کا اسے کوئی علم نہیں ہوتا۔

پچھلے پچاس سال میں بہت سے ایسے کام ہوئے ہیں جن کی ملک کو فوری ضرورت نہیں تھی اور بہت سے ایسے کام نظر انداز کر دیے گئے جو زراعت کے تحفظ کے لیے انتہائی ضروری تھے۔ پچھلے تجربوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حکومت کو چاہیے کہ کچھ عوامی عناصر بھی مفادِ عامہ کے کاموں کے بورڈ میں شامل کرے۔ بورڈ کا فرض ہوگا کہ آئندہ ہونے والے مفادِ عامہ کے کاموں کی نگہداشت کرے، سرکاری ریلوں اور ضمانت شدہ ریلوں دونوں میں مسافروں کی ضروریات کی نمائندگی کرے، کسانوں پر لگنے والے پانی کے محصول میں توازن پیدا کرے تاکہ لوگوں کے ساتھ ناانصافی کیے بغیر مالگزاری کا تحفظ کیا جاسکے اور ایک ایسے سرکاری شعبے کی حد تک حکومتِ ہند کی مدد کرے جس میں لوگوں کے اشتراک و امداد کی خاص طور سے ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔

باب ۔11

اخراجات کا جائزہ لینے کے لیے رائل کمیشن کا تقرر

ہندوستان کے قرض اور اخراجات میں مسلسل ہونے والے اضافے نے لوگوں میں بے چینی پیدا کردی تھی۔ لوگ شکایت کرتے تھے کہ انگلستان اور ہندوستان کے درمیان اخراجات کی تقسیم نہ منصفانہ ہے نہ مصلحت آمیز۔

قابل اور محتاط ماہرین مالیات نے کریمیا کی جنگ کے بعد انگلستان کا قرض ایک سو پچاس ملین سے زیادہ رقم کی حد تک کم کر دیا تھا۔ لیکن ہندوستان کے قرض میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ حبشہ کی جنگ اور دوسری جنگوں کے اخراجات ہندوستان پر ڈالے گئے اور افغانوں کے خلاف لڑی جانے والی ایک غیر ضروری جنگ نے ہندوستان کے قرض میں اضافہ کر دیا۔ مسٹر گلیڈسٹن نے اس بڑھتی ہوئی خرابی کو بڑے دکھ اور تشویش کے ساتھ دیکھا تھا اُس نے ہندوستانی مالیات کی خرابیاں دور کرنے کے لیے ایک سلیکٹ کمیٹی مقرر کی مگر اس کمیٹی نے بغیر کسی نتیجے پر پہنچے ہوئے 1874 کے بعد کام ترک کر دیا۔ مسٹر گلیڈسٹن نے ہندوستانی خزانے کو پانچ ملین پاؤنڈ کے نقصان سے بھی بچا دیا۔ افغانوں کے خلاف 1878 میں لڑی جانے والی جنگ کے اخراجات کے ایک حصے کے طور پر یہ رقم شہنشاہی خزانے سے ادا کر دی گئی تھی۔ لیکن تقریباً اٹھارہ ملین پاؤنڈ کی بقیہ رقم کا بار ہندوستان کو اٹھانا پڑا۔ لارڈ سیلس بری کے طویل زمانہ حکومت میں جو 1886 سے 1892 تک پھیلا ہوا تھا، ہندوستان کی مالیات کی حالت بد سے بدتر ہو گئی۔

لارڈ ڈفرن اور لارڈ لینس ڈاؤن کے ادوار حکومت میں ہندوستان کے اخراجات میں اور اضافہ ہوگیا جب مسٹر گلیڈسٹن نے 1892 میں چوتھی اور آخری بار حکومت بنائی تو ہندوستان کے لوگ تلافی کی توقع کرنے لگے۔

برطانوی پارلیمنٹ کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک ہندوستانی اُس کا رکن منتخب ہوا۔ مسٹر دادا بھائی نوروجی نے، جو 1825 میں پیدا ہوئے تھے۔ آغاز جوانی ہی سے اپنے ملک میں سماجی اور سیاسی اصلاحات کی کوششیں شروع کردی تھیں۔ 1854 میں وہ بمبئی کے الفنسٹن کالج میں ریاضی اور نیچرل فلسفے کے پروفیسر تھے۔ 1855 میں وہ انگلستان گئے اور لندن کے یونی ورسٹی کالج میں گجراتی زبان کے پروفیسر مقرر کیے گئے۔ جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں انھوں نے 1874 کی مالیاتی کمیٹی کے سامنے شہادت دی تھی۔ اگلے سال انھوں نے ریاست بڑودا کے وزیراعظم کا عہدہ سنبھال لیا۔ اُس وقت ریاست میں بڑی بد انتظامی تھی اور اصلاحات کی فوری ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ کچھ برسوں بعد وہ انگلستان واپس آگئے اور ایک دفعہ پھر اپنے ملک کی انتھک وکالت کرنے لگے۔ 1892 میں، جب وہ 66 سال کی پختہ عمر کو پہنچ چکے تھے، سنٹرل فنس بری CENTRAL FINS BURY کے حلقۂ انتخاب سے وہ منتخب ہوئے اور ہاؤس آف کامنز میں جگہ پائی۔

کام کرنے کے اُس جوش اور صلاحیت کے ساتھ جس پر ماہ و سال کی گرد نہیں جم سکی تھی اور اُس صادق جذبہ حب الوطنی کے ساتھ جس کی تعریف اُن کے وہ مخالفین بھی کرتے تھے، جو اُن کی رائے سے اتفاق نہیں رکھتے تھے اور اُن کے جوش و خروش کو ناپسند کرتے تھے، مسٹر نوروجی تین سال تک ہاؤس آف کامنز میں اپنے فرائض ادا کرتے رہے۔ ایسے محب وطن کی شہرت اور اثر میں اگر کوئی چیز اضافہ کرسکتی تھی تو وہ تھا اُن کے عقائد کا خلوص، ان کے مقاصد کی انتہائی بے لوث بچوں کی طرح اُن کی طبیعت کی سادگی اور اُن کی نجی زندگی کی پاکیزگی۔ عظیم گلیڈسٹن کی طرح مسٹر دادا بھائی نوروجی نے بھی عمر بھر کے سیاسی کام کے ساتھ اعلیٰ اور پاکیزہ کردار کی بنا پر اپنے ہم وطنوں کے دل جیت لیے تھے اور ہندوستان کے تمام طبقوں اور پیشوں سے تعلق رکھنے والے اپنے اس عظیم بزرگ پر فخر کیا کرتے تھے۔

تین سال تک مسٹر نوروجی ہاؤس آف کامنز میں ہندوستان کے ساتھ مالیاتی انصاف کرنے پر زور دیتے رہے اور اُن کی کوششیں مشکور ہوئیں۔ مئی 1895 میں ایک رائل کمیشن مقرر کیا

گیا" تاکہ سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا یہ اجلاس کاؤنسل یا ہندوستان کے گورنر کے زیر اختیار
ہونے والے فوجی اور سول معارف کے انصرام و انتظام کے متعلق اور ایسے مقاصد پر ہونے والے
اخراجات کو، جن میں انگلستان اور ہندوستان دونوں دلچسپی رکھتے ہوں، حصہ رسدی تقسیم
کرنے کے متعلق تحقیقات کرسکے۔ اس کمیشن کا صدر لارڈ ویلبی تھا اور لیونرڈ کورٹنی LEONARD
COUNTNEY جارج نتھینیل GEORG NATHANIEL CURZON سر ولیم ویڈربرن
SIR WILIAM WEDDERBURN سر ڈونلڈ اسٹورٹ SIR DONALD STEUORT
ٹامس۔ آر۔ بکانم THOMS R.BUCHANAM ولیم۔ ایس۔ کین WILLIAN S.CAINE
اور دادا بھائی نوروجی ممبر تھے۔ چونکہ مسٹر کرزن اگلے سال انڈر سکریٹری آف اسٹیٹ برائے امور
خارجہ مقرر کردیا گیا تھا اس لیے اس نے کمیشن کی رکنیت سے استعفیٰ دیدیا۔

کمیشن نے اپنا کام بڑے اچھے ڈھنگ سے شروع کیا اور بیش بہا شہادتیں قلمبند کیں جو
ایسے گواہوں کے بیانات پر مشتمل تھیں جیسے کہ چارلس برنارڈ SIR CHARLES BERNARD
سر ڈیوڈ باربور SIR DAUIRD BAREOUR سر آکلینڈ کولون SIR AUCKLAND COLVIN
لارڈ کرومر LORD CROMIR لارڈ ویلزلی LORD WOLSELEY
لارڈ نارتھ بروک، لارڈ رابرٹس، لارڈ لینس ڈاؤن، لارڈ رپن اور کئی دوسرے ممتاز
نمایاں حیثیتیں رکھنے والے لوگ۔ یہ شہادتیں نومبر 1895 سے جولائی 1897 کی دو سالہ
مدت میں قلمبند کی گئی تھیں۔ اس کے بعد کمیشن نے تین سال کے لیے خاموشی اختیار کرلی۔
1900 میں جب کمیشن نے اپنی آخری رپورٹ پیش کی تو ہندوستان اور انگلستان کے
لوگوں کو مایوسی ہوئی۔ سر ہنری فاؤلر نے ہاؤس آف کامنز میں خود اس مایوسی کا اظہار کیا۔ کمیشن
نے بیش بہا شہادت اکٹھا کرلی تھی لیکن اراکین کی اکثریت کو بدیہی نتیجہ اخذ کرنے میں پس و پیش
تھا۔ وہ ہندوستان اور انگلستان کے درمیان پائے جانے والے مالیاتی رشتوں کو سرتاسر
تبدیل کرنے کو تیار نہیں تھے۔ وہ اس کے لیے تیار نہیں تھے کہ ہندوستان کے محصول دہندگان
پر ان اخراجات کا بار نہ ڈالا جائے جن کے لیے صرف ہندوستان کو بجا طور سے ذمہ دار نہیں ٹھہرایا
جاسکتا تھا۔ انیسویں صدی کے آخری برسوں میں جب ہندوستان زمانہ جدید کی تاریخ کے
بدترین قحط سے دوچار تھا اس کے فاقہ کش لوگوں کو برطانوی پارلیمنٹ اور برطانوی رائل کمیشن
سے وہ مالیاتی انصاف نہ مل سکا جس کی وہ توقع کرتے تھے۔

کمیشن کے اراکین کی اکثریت نے رپورٹ پیش کی جو بشمول ملفوظات ، بڑی تقطیع کے 160 صفحات پر مشتمل تھی۔ اخراجات کی حصہ رسدی تقسیم کے متعلق جو سفارشیں کی گئی تھیں ان میں سے کچھ پیش کرنے کے قابل ہیں۔

سول اخراجات : کمیشن کے اراکین کی اکثریت نے سفارش کی کہ انڈیا آفس کے اخراجات کے لیے انگلستان 50,000 پاؤنڈ ادا کرے اور عدن اور ایران میں ہونے والے اخراجات کا نصف ادا کرے۔

ہندوستان کے باہر ہندوستانی فوج کا استعمال : انھوں نے طے کیا کہ ہندوستان کے مفاد کا تقاضہ ہے کہ نہر سویز کھلی رہے اور سیام ، ایران اور ساحلِ عرب کے مسائل سے اور افغانستان اور وسط ایشیا کو متاثر کرنے والے حالات سے ہندوستان کا مفاد وابستہ ہے۔ انھوں نے یہ بھی طے کیا کہ سرحد کی تقریری مہموں کا تعلق صرف ہندوستان سے ہے اور زنجبار تک پھیلے ہوئے افریقہ کے مشرقی ساحل کے مسائل میں جزوی تبدیلی کے ساتھ ہندوستان کی دلچسپی برقرار رکھی جا سکتی ہے۔ یہ کہ ان اصولوں کی بنیاد پر انگلستان اور ہندوستان کے درمیان اخراجات کی حصہ رسدی تقسیم کے سوال فیصلوں کے لیے ایک ثالث کے سپرد کیے جا سکتے ہیں۔

بحری اخراجات : وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ہندوستان ایک مقامی بحری فوج رکھتا ہے ، اپنے ساحلوں کے تحفظ کی ذمہ داری اُس پر ہے اور اُس عام بحری تحفظ کے لیے 100,000 پاؤنڈ ادا کرتا ہے جو بحری فوج کا محکمہ کیا کرتا ہے۔ وہ اس نتیجے پر بھی پہنچا کہ ہندوستان کی طرف سے ادا کی جانے والی رقم بہت زیادہ نہیں ہے۔

فوجی اخراجات : اُس نے طے کیا کہ ہندوستان بھیجے جانے والے ہر برطانوی سپاہی پر ، 7 پاؤنڈ 10 شلنگ فی کس ہونے والا خرچ برقرار رکھا جائے۔ لیکن اُس نے سفارش کی کہ انگلستان سے ہندوستان جانے اور انگلستان واپس آنے پر ہونے والے اخراجات کا نصف ادا کرے۔ کہا جاتا تھا کہ ہندوستانی فوج بڑی حد تک انگلستان کے سامراجی مقاصد کے لیے رکھی جاتی ہے۔ اس کے متعلق اُس نے کہا۔ " موجودہ انتظامات پر نظرِ ثانی کرنے کا جب وقت آئے تو فوجی اخراجات کے تعلق سے ہندوستان کی خصوصی حیثیت پر غور کیا جانا چاہیے۔ اگر ایک طرف وہ اُن خدمات کے سلسلے میں جن کے اخراجات وہ بجا طور سے ادا کرتا ہے شہنشاہی وسائل پر کچھ

مارڈالتا ہے تو دوسری طرف وہ حکومت انگلستان کی ایسی خدمات بھی سرانجام دیتا ہے جن کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیئے۔"

چنانچہ کمیشن نے شہنشاہی خزانے سے ہندوستان کو دی جانے والی جس واحد سہولت کی سفارش کی وہ تھی۔

انڈیا آفس کے اخراجات کے لیے دی جانے والی امداد	50,000 پاؤنڈ
عدن کے فوجی اخراجات کا نصف	1,08,000 پاؤنڈ
ایران کے سفارتخانے کے اخراجات کے لیے دی جانے والی امداد	50,000 پاؤنڈ
فوج کے ہندوستان جانے اور وہاں سے واپس آنے پر خرچ ہونے والی رقم کا نصف	1,30,000 پاؤنڈ
کل میزان	2,93,000 پاؤنڈ

کمیشن کے اراکین کی اقلیت نے، جو سر ولیم وڈربرن، مسٹر کین اور مسٹر نوروجی پر مشتمل تھی، ایک اور رپورٹ پیش کی جو چالیس چھپے ہوئے صفحوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس میں ہندوستان کے ساتھ کی جانے والی مالیاتی ناانصافی کی زیادہ تفصیل کے ساتھ نشان دہی کی گئی تھی اور اس کو دور کرنے کے لیے ضروری تدابیر کی سفارش کی گئی تھی۔

لارڈ سیلس بری کی حکومت نے اکثریت کی رپورٹ پر کچھ ترمیموں کے بعد عمل کیا۔ انڈیا آفس کے اخراجات کے لیے شہنشاہی خزانے سے 50,000 پاؤنڈ کی مالی امداد دینے کی معنی یہ تھے کہ پارلیمنٹ کے اراکین کو اس کا موقع دیا جائے کہ وہ کٹوتی کی تجویزیں پیش کر کے ہندوستان کے متعلق بحث شروع کر سکیں۔ انڈیا آفس ہندوستان کے انتظامی معاملات کے متعلق اس قسم کے مباحثہ کو پسند نہیں کرتا ہے اس لیے اس کی وجہ سے مجوزہ مالی امداد نہیں دی جا سکی۔

لیکن ہندوستان کے قرض، گھریلو اخراجات اور محاصل میں کمی اور فوجی اخراجات میں تخفیف کے اصل بڑے بڑے سوال جوں کے توں رہے۔ ہندوستان کے محصول دہندگان کو بھاری محاصل سے نجات دلانے کا فرض پورا نہیں کیا گیا۔ ہندوستان کی دو سو ملین برطانوی رعایا کو وہ آسائش اور خوش حالی بہم پہنچانے کا مسئلہ حل نہ کیا جا سکا جو دنیا کے دوسرے حصوں میں رہنے والی برطانوی رعایا کی میراث ہے۔

ہم اس باب کو اس بیش بہا شہادت کے کچھ اقتباسات پر ختم کر رہے ہیں جو کمیشن نے

قلبند کی تھی۔ ضمیموں کے ساتھ یہ شہادت بڑی تقطیع کے تقریباً 500 ر ا صفحات پر پھیلی ہوئی ہے جن میں دو کالم ہیں اور خفی ٹائپ استعمال کیا گیا ہے۔ اس لیے ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے اقتباسات اُس ضخیم شہادت کی تلخیص ہیں لیکن اُن سے قارئین کو اہم انتظامی سوالوں کے متعلق ممتاز و نمایاں حیثیتیں رکھنے والے گواہوں کی رائیں معلوم ہو جائیں گی۔

ثالثی عدالت کے متعلق لارڈ کرومر کی رائے

13,642 ۔ ہم اس کے متعلق آپ کی رائے سننا چاہتے ہیں۔

گھریلو اخراجات کے سوال کے متعلق میرا خیال یہ ہے کہ اس ملک میں، پارلیمنٹ میں اور وزیروں میں، اُن کا تعلق کسی بھی پارٹی سے کیوں نہ ہو، یہ خواہش پائی جاتی ہے کہ ہندوستان کے ساتھ نہ صرف منصفانہ بلکہ فیاضی کا برتاؤ کیا جائے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان معاملات کو طے کرنے کے لیے کسی طرح کی ثالثی عدالت کا انتظام کیا جا سکے تو اس سے بہت فائدہ ہوگا۔ صرف اتنا کافی نہیں ہے کہ باہمی تصفیہ انصاف پر مبنی ہو۔ اس بات کو بڑی اہمیت حاصل ہے کہ ہندوستان میں ہر شخص اس کو انصاف پر مبنی سمجھے۔ اس کا اطلاق صرف دیسی لوگوں پر نہیں ہوتا ہے بلکہ یورپی لوگوں پر جن کا لحاظ کیا جانا چاہیے، اور خود حکومت ہند پر بھی ہوتا ہے۔ حالانکہ میں کسی خاص کی طرف اشارہ نہیں کر رہا ہوں اور نہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تقسیم غیر منصفانہ ہے پھر بھی موجودہ طریقے میں کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جس سے ہندوستان کے لوگوں کو محسوس کرایا جا سکے کہ باہمی تصفیہ انصاف پر مبنی ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کی تفصیلات مختلف محکموں اور انڈیا آفس کے مابین طے ہو جاتی ہیں اور غلط یا صحیح عام خیال یہ ہے کہ ہندوستان کے تصورات کے بجائے انگریزی تصورات کی وکالت زیادہ شدت اور زیادہ کامیابی کے ساتھ کی جاتی ہے۔ یہ بات غلط ہو یا صحیح لیکن یہ واقعہ بذات خود ایک شر کی حیثیت رکھتا ہے کہ اس قسم کا خیال پایا جاتا ہے۔ اس لیے مجھے بڑی خوشی ہوگی اگر ان معاملات کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک ثالثی عدالت قایم کرنے کے سلسلے میں کوئی قدم اُٹھایا جا سکے۔ اس کی ضرورت اس امر کی وجہ سے اور بڑھ جاتی ہے کہ بہت سے معاملات میں کوئی اور کارروائی کرنے کے بجائے ایک منصفانہ سمجھوتا کیا جا سکتا ہے۔ عدن کا معاملہ لیجیے جس کی طرف ان مباحث کے دوران کسی نے اشارہ کیا تھا۔ یہ بات کسی طرح ممکن نہیں کہ کوئی شخص ٹھیک ٹھیک حساب لگا کر یہ بتا سکے کہ عدن کے لیے ہندوستان کو

کتنی رقم ادا کرنی چاہیئے۔ ہندوستان کو عدن میں بڑی دلچسپی ہے۔ لیکن اسی حد تک دلچسپی لنکا، ہانگ کانگ، آبنائے ملاکا کی نوآبادیوں اور برطانوی تجارتی طبقے کو بھی ہے۔ اس کا فیصلہ کیا جائے کہ ہندوستان کو کتنی رقم ادا کرنی چاہیئے۔ اگر ان معاملات کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک ثالثی عدالت قایم کردی جائے تو اس سے ہندوستان کی رائے عامہ مطمئن ہوجائے گی اور اس کی وجہ سے بہت فائدہ ہوگا۔

13,650 ۔۔ کیا آپ دونوں فریقوں کو یہ اختیار دینا چاہتے ہیں کہ ہر ایسے مسئلے کو ثالث کے سامنے پیش کرسکیں جس میں تقسیم اخراجات کی نزاع ہو؟

جی ہاں! اختیار دیا جانا چاہیئے۔ میں چاہتا ہوں کہ ثالث کی حیثیت عدالتِ اپیل کی ہو۔ درحقیقت میرا خیال ہے کہ ثالثی عدالت کو پارلیمنٹ کے ایک ایکٹ کے ذریعے قایم ہونا چاہیئے اور اس کے ضروری اختیارات کا خاص طور سے ایکٹ میں ذکر کیا جانا چاہیئے۔

13,651 ۔ آپ کی رائے کو اس کو پریوی کاؤنسل کی جوڈیشل کمیٹی JUDICIAL COMMITTEE کی طرح ہونا چاہیئے؟

جی ہاں اُس سے ملتی جلتی۔

13,652 ۔ اگر حکومتِ انگلستان کے محکموں اور حکومتِ ہند کے درمیان اخراجات کی تقسیم کا کوئی سوال اٹھے تو آپ دونوں میں سے کسی فریق کو اس امر کا اختیار دیں گے کہ وہ اُس مسئلے کو ثالثی عدالت میں پیش کردے یا آپ کی رائے میں اس سوال کو بہر حال عدالت کے سامنے جانا چاہیئے؟

جی نہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہر دو فریقین کو عدالت میں رجوع کرنے کا اختیار حاصل ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ اختیار مالیاتی مسائل تک محدود ہونا چاہیئے۔ صرف مالیاتی مسائل تک۔

13,653 ۔ اور جہاں تک اُن اخراجات کا تعلق ہے جو ہندوستان اور انگلستان کے درمیان ہمیشہ تقسیم ہوتے رہتے ہیں مثلاً فوجی اخراجات اور بحری امداد۔ کیا آپ اُن کے متعلق کہیں گے کہ پانچ سال یا دس سال کی مدت کے بعد یہ بھی ثالثی عدالت کے سامنے پیش کیے جائیں۔

جی میرا تو یہی خیال ہے۔ میری کوشش یہ ہوگی کہ ہندوستان کے محصول دہندگان اور ہندوستان کے عام لوگوں کو زیادہ سے زیادہ یقین دلاؤں کہ ان سوالوں کا فیصلہ

لوگوں کی ایک ایسی جماعت کرتی ہے جو بالکل آزاد ہے اور جن کے دل اُن کے خلاف ہر قسم کے تعصب سے پاک ہیں۔

ہندوستان کے باہر ہونے والی جنگوں کے متعلق لارڈ نارتھ بروک کی رائے

14,108 ۔ کیا آپ نے اُن انتظامات پر غور کیا ہے جو ملک کے باہر استعمال ہونے والی ہندوستان کی فوج کے سلسلے میں رقم کی ادائیگی کرنے کے لیے کیے گئے ہیں ؟

جی ہاں۔ مجھے اس معاملہ پر پورا پورا غور کرنے کا موقع ملا ہے۔

14,109 ۔ کیا آپ کی رائے میں اُن اخراجات کی تقسیم کے سلسلے میں ہندوستان کے ساتھ منصفانہ سلوک کیا گیا ہے ؟

میرے خیال میں ہندوستان کے ساتھ سختی کا برتاؤ کیا گیا ہے۔

14,110 ۔ کیا آپ مختلف واقعات بیان کرسکتے ہیں اور اپنی دلیلیں پیش کرسکتے ہیں ؟

سر ہنری واٹرفیلڈ SIR HENRY WATERFIELD کی یادداشت کے ضمیمہ ، صفحہ 364 میں وہ واقعات درج ہیں۔ میرا خیال ہے کہ انھیں اُسی ترتیب میں بیان کرنا مناسب ہوگا جس ترتیب میں اُس نے درج کیے ہیں۔

14,111-2- ۔۔ میرا خیال ہے کہ آپ سولھویں پیراگراف سے شروع کرنا چاہتے ہیں۔ کیا یہ درست ہے ؟

انیسویں پیراگراف سے

14,113-4- ۔۔ ٹھیک ہے میرے سامنے 19 ہے۔

میں حبشہ کی مہم سے پہلے کے واقعات بیان نہیں کروں گا۔ جہاں تک حبشہ کی جنگ کا تعلق ہے میرے خیال میں اُس مہم پر ہونے والے عام اخراجات کا بار ہندوستان پر ڈالنا ٹھیک نہیں تھا۔

14,119 ۔۔ کیا آپ کو یاد ہے کہ حکومت نے اس وقت کس بنیاد پر یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہندوستان کو حبشہ میں دلچسپی ہے ؟

جی نہیں۔ میں اُسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے کبھی اُس کے متعلق کچھ سنا بھی نہیں ، میرا خیال ہے اُس وقت احتجاج کیا گیا تھا۔

120, 14- میں صرف یاد داشت کی بنا پر بات کر رہا ہوں۔ کیا یہ نہیں کہا گیا تھا کہ اس بارے میں حکومت ہند فکر مند ہے اور اُس کی یہ وجہ بتائی تھی کہ حبشہ اور ہندوستان چونکہ ایک ہی صف میں ہیں اس لیے انگریزی رعایا کو گرفتار کر کے انگریز کے نام کی عزت کو خطرے میں ڈالنے کی اجازت نہ دی جائے ؟

ہو سکتا ہے کہ یہ بات کہی گئی ہو لیکن میری رائے میں کوئی غیر جانب دار شخص اس پر ذرا بھی توجہ نہ دیتا۔

121, 14 — مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک فرانسیسی معترض نے اُس زمانے میں جنگ کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس کا مقصد انگریزی فوجوں کے لیے ایک صحت گاہ دریافت کرنا ہے۔

میرے خیال میں عزت کے تعلق سے جو دلیل پیش کی گئی ہے یہ دلیل اُس سے بہتر ہے۔ اس کے بعد میں پیراک کی مہم کے واقعے کی طرف آتا ہوں۔ یہ چھوٹا سا معاملہ تھا لیکن جہاں تک اس واقعہ کا تعلق ہے ایک شخص بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہندوستان کے ساتھ سختی کا برتاؤ نہیں کیا گیا۔ یہ فوجی کارروائی ہندوستان کی سرحد کے پار کی گئی تھی اور اس پر ہونے والے اخراجات کے کسی حصے کا بار ہندوستان پر ڈالنے کے لیے ازروئے قانون ضروری تھا کہ پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کی طرف سے ملکہ کی خدمت میں ایک عرضداشت پیش کی جائے۔ میں اُس زمانے میں گورنر جنرل تھا اور میں نے ہندوستان پر بار ڈالنے کے خلاف احتجاج کیا تھا۔ صرف اتنا ہی نہیں ہُوا کہ حکومت ہند کے احتجاج پر کوئی غور نہیں کیا گیا بلکہ دونوں ایوانوں کی طرف سے وہ عرضداشت بھی نہیں پیش کی گئی جو ازروئے قانون انھیں پیش کرنی چاہیے تھی اور اس طرح قانون کی خلاف ورزی کی گئی اور ہندوستان سے جو رقم وصول کی گئی تھی وہ کبھی ادا نہیں کی گئی۔ حکومت ہند کے احتجاج کے باوجود اور قانون کی منشا کے خلاف اُن اخراجات کا بار ابھی تک ہندوستان پر ہے۔ یہ ہے پیرک کا واقعہ یہ دوسرا واقعہ ہے جس پر میں روشنی ڈالنا چاہتا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ میری رائے میں اس کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک مالٹا بھیجی جانے والی فوج کا تعلق ہے اُس کے تمام معمولی اور غیر معمولی اخراجات بجا طور سے حکومت انگلستان نے برداشت کیے۔

124, 14 — کیا آپ نے مصر میں کی جانے والی 1882 کی فوجی کارروائی کا ذکر کیا ہے ؟

اب میں اُس کی طرف آرہا ہوں۔ دوسرا واقعہ مصر کی 1882 کی جنگ ہے۔ یہ ایسا واقعہ تھا جس کے سلسلے میں مجھے ذاتی طور سے بہت کچھ کرنا پڑا۔ اس لیے میں اس کے تصفیے کے بارے میں کوئی سخت بات کہنے سے گریز کروں گا۔ اُس میں کوئی شک نہیں کہ نہر سوئز کو کھلا رکھنے میں ہندوستان کو بڑی دلچسپی تھی۔ واقعی اُس کو دلچسپی تھی۔ سوال یہ تھا کہ اُس کو کسی قسم کی دلچسپی ہے اور کتنی دلچسپی ہے۔ پہلے یہ سوچا گیا تھا کہ بھیجی جانے والی مہم کے پورے اخراجات ہندوستان ادا کرے۔ یہ خیال اس وقت تھا جب سمجھا جاتا تھا کہ تھوڑی سی فوج کافی ہوگی۔ یہ وجہ تھی کہ اس وقت حکومت کا خیال تھا کہ ہندوستان تمام اخراجات ادا کرے۔ حکومتِ انگلستان بہت زیادہ اخراجات برداشت کر چکی تھی اور ہم سمجھتے تھے کہ ہندوستان کو بہت کم اخراجات برداشت کرنے پڑیں گے اور ہم یہ بھی سمجھتے تھے کہ ازروئے انصاف ہندوستان کو سوئز بھیجی جانے والی فوج کے تھوڑے سے اخراجات برداشت کرنے چاہئیں۔ لیکن فوجی کارروائی بڑھتی چلی گئی اور آخر میں ہندوستان سے بھیجی جانے والی فوج بہت بڑھ گئی۔ میرے خیال میں اِس پر کل 17,00,000 پاؤنڈ خرچ ہوئے اور بالآخر دونوں حکومتوں یعنی حکومت ہند اور حکومت انگلستان کے درمیان تصفیہ ہوا کہ ہندوستان 12,00,000 پاؤنڈ ادا کرے اور 5,00,000 پاؤنڈ کا بار انگلستان برداشت کرے۔ یہ تھا باہمی تصفیہ جس کو حکومتِ ہند نے تسلیم تو کر لیا لیکن بادل ناخواستہ تسلیم کیا۔ حکومتِ ہند کا خیال تھا کہ اس معاملے میں اس کے ساتھ سختی کا برتاؤ کیا گیا ہے۔ اس پر اب میں غور کرتا ہوں تو مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ بہتر ہوتا اگر ہندوستان پر ہم نصف اخراجات کا بار ڈالتے۔ ہندوستان کو 8,50,000 پاؤنڈ ادا کرنے چاہیئے تھے بقیہ 850,000 پاؤنڈ کا بار انگلستان کو برداشت کرنا چاہیے تھا۔ چونکہ میں خود اس وقت حکومت میں شامل تھا اس لیے میں اس پر اصرار نہیں کرنا چاہتا اور میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا ہوں کہ اُس وقت میں نے اس کو منصفانہ تصفیہ نہیں سمجھا تھا۔

14,127 (جنگ سوڈان) کیا آپ کے خیال میں اگر ابتدائی منصوبے پر عمل کیا جاتا تو ہندوستان کو اس مہم میں اتنی دلچسپی ہوتی کہ اُس سے مالی امداد طلب کرنا حق بجانب ہوتا؟

اگر آپ میری رائے معلوم کرنا چاہتے ہیں تو میں کہوں گا " جی نہیں۔ بالکل نہیں" میرے خیال میں سوڈان کی کسی مہم میں ہندوستان کو بڑی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن میری دلیل کی بنیاد یہ ہے کہ ازروئے قانون حکومت ہند کی آمدنی اُس وقت تک استعمال نہیں کی جا سکتی ہے جب تک

پارلیمنٹ کے دونوں ایوان عرضداشتیں نہ پیش کریں یہ لازمی ہے کہ اُس قانون کی شرائط کی پوری پابندی کی جائے اور میری رائے میں سوکم SOW KIM میں بطور محافظ دستے کے رکھے جانے والے ہندوستانی سپاہیوں کی مسلسل خدمات کا ذکر عرضداشت میں نہیں کیا گیا تھا۔ میرا کہنا یہ ہے کہ روپیہ خرچ کرنے کا اختیار صرف اس کی بنا پر حاصل ہو سکتا ہے۔ جہاں تک پچھلے سال سوکم کو فوج بھیجنے کا تعلق ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ اُس کے اخراجات کا بار ہندوستان پر ہرگز نہیں ڈالا جانا چاہیئے تھا۔

14,165 — آپ نے دونوں حکومتوں کے درمیان اختلافِ رائے کے اسباب پر روشنی ڈال دی ہے اور ہمارے سامنے بیان کر دیے ہیں۔

اس سے پہلے کہ آپ دوسرا سوال کریں مجھے اجازت دیجئے کہ میں ان کا خلاصہ آپ کے سامنے بیان کر دوں۔

14,166 — جی ہاں اگر آپ کو زحمت نہ ہو۔

ہندوستان سے بھیجی جانے والی فوجوں کے متعلق میں نے کمیشن کے سامنے جو بیان دیا ہے اُس کو چند لفظوں میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اگر حبشہ کی جنگ پر ہونے والے معمولی اخراجات 6,00,000 پاؤنڈ کے بقدر تھے تو میرے خیال میں از روئے انصاف ہندوستان کو اس رقم کا مطالبہ کرنے کا حق حاصل ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ پیراک کے سلسلے میں ہونے والے تمام معمولی اخراجات ادا کیے جانے چاہئیں۔ بالفرض سوکم کے سلسلہ میں ہونے والے اخراجات تقریباً 2,00,000 پاؤنڈ کے بقدر تھے۔ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ اُس پر کتنی رقم خرچ ہوئی تھی۔ پھر بھی سوکم کے سلسلے میں ہونے والے اخراجات جتنے بھی ہوں میرا خیال ہے کہ سوکم میں رکھے جانے والے محافظ دستے کے تمام اخراجات ہندوستان کو واپس ملنے چاہئیں۔ 1882 کی مصر کی مہم کے سلسلے میں میرا خیال ہے کہ انصاف کی رو سے 3,50,000 پاؤنڈ ہندوستان کو ادا کیے جانے چاہئیں تاکہ اخراجات دونوں حکومتوں پر تقسیم ہو جائیں۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ یہ رقم براہِ راست یا کسی دوسرے منصفانہ طریقے سے اب ہندوستان کو واپس مل جانی چاہیئے۔ اس خیال کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہندوستان کے ساتھ چونکہ مدتوں غیر منصفانہ اور' میری رائے میں کچھ صورتوں میں غیر قانونی برتاؤ کیا جاتا رہا ہے اس لیے اب کسی طریقے سے اس کی تلافی نہیں کی جانی چاہیئے۔ اس موضوع پر مجھے صرف اتنا ہی کہنا ہے۔

ہندوستانی فوج کے متعلق لارڈ لینس ڈاؤن کی رائے

15,996 — لارڈ لینس ڈاؤن کیا آپ نے خود ہندوستان کے نقطہ نظر سے اس پر غور کیا ہے کہ بالفرض وہ انگلستان سے علیحدہ بھی ہو جائے تو اس کو ایسی فوج رکھنے کی ضرورت محسوس ہو گی یا نہیں جیسی کہ وہ انگلستان سے عاریتاً حاصل کر لیتا ہے اور اس کو کیا اسی حد تک تیار نہیں رکھنا پڑے گا؟

میں اس کا جواب نفی میں دوں گا۔ ہندوستانی فوج کی تنظیم اس نقطہ نظر سے کی جاتی ہے کہ اس کو ایسی فوجی کارروائیوں کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے جن کا کوئی تعلق ملک کی داخلی پالیسی اور سرحد کے قبائل کی شورشوں کو فرو کرنے سے نہ ہو۔

15,997 — ایسی صورت میں کیا آپ اس کو منصفانہ تجویز خیال کریں گے کہ عاریتاً حاصل کی جانے والی فوج کو ہندوستانی مقاصد کے لیے تربیت دینے پر جو رقم خرچ کی جائے اور برطانوی مقاصد اور سامراجی مقاصد کے لیے اُس کا معیار برقرار رکھنے پر جو رقم خرچ کی جائے اُن کا فرق انگلستان کے خزانے کو برداشت کرنا چاہیئے۔

اِن امور کو رقم کی شکل میں پوری طرح ظاہر کرنا بہت مشکل ہے۔ لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ آپ کا سوال اُس اصول کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کے متعلق میں صدر کو دیے جانے والے جوابوں میں یہ کہنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اُس کا عمل درآمد کیا جانا چاہیئے۔

15,998 — آپ کا خیال ہے کہ ہم برطانوی مقاصد اور سامراجی مقاصد کے پیش نظر فوج کی کارکردگی کا اتنا اونچا معیار برقرار رکھنا چاہتے ہیں جس کی ہندوستان کو اپنے لیے ضرورت نہیں اور دونوں ملکوں کے درمیان اخراجات کے متعلق تصفیہ کرتے وقت ہمیں اس پر بھی غور کرنا چاہیئے ہمیں ضرور غور کرنا چاہیئے۔

15,999 — اس کو رقموں میں ظاہر نہیں کیا جا سکتا ہے پھر بھی یہ اُس جذبے کا ایک اہم جز ہے جس کے تحت تصفیہ کیا جانا چاہیئے۔ میں اس خیال کا ہوں۔

ہندوستانی فوج کے متعلق سر ہنری بریکن بری کی رائے

14782 — جنگی آفس یا کوئی اور شخص کسی رقم کا بار ہندوستان پر نہیں ڈالنا چاہتا

میں اس کو اچھی طرح سمجھتا ہوں لیکن جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اس ادائیگی کی بنیاد عام طور سے یہ سمجھی جاتی ہے کہ ہندوستان وہ رقم انگلستان کو واپس کرے جس کے متعلق ثابت کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی فوجی ضرورتوں کا تقاضہ نہ ہوتا تو انگلستان خرچ نہ کرتا اس میں سے کچھ رقم منہا کر لی جاتی ہے جس کو میرے خیال میں کسی قسم کی کٹوتی کے نام سے پکارا جاتا ہے میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اس قسم کا نظریہ سراسر غلط ہے اور اس رائے کے لیے اگر مجھے دلیل پیش کرنے کی اجازت دی جائے تو پہلی بات میں کہوں گا کہ ہندوستان میں اُس سے کہیں زیادہ فوج ہے جتنی کہ داخلی امن برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہونی چاہیئے۔ ہندوستان میں فوج کی تعداد کا حساب اس بنیاد پر لگایا جاتا ہے کہ ایک طاقتور اسلحہ سے لیس فوج ہندوستان کی سرحد یا سرحد کے پار بھیجی جا سکے اور اُس کے علاوہ محافظ دستے فراہم کر سکے۔ جو ہندوستان میں امن برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہیں۔ ہندوستان میں ضروری محافظ دستوں کے علاوہ اتنی طاقتور اور اسلحہ سے لیس فوج برقرار رکھنے کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی ہے کہ ایک بڑی فوجی طاقت ایک ایسے مقام تک آگئی ہے کہ افغانستان کے لیے، جس کے تحفظ کی ذمہ داری معاہدے کی رو سے ہم پر ہے، راست خطرہ پیدا ہو گیا ہے اور ہندوستان کے لیے بالواسطہ خطرے کا باعث بن گئی ہے۔ ہندوستان کی خارجہ پالیسی کے سلسلے میں تمام ہدایتیں ملکۂ معظمہ کی حکومت انگلستان بھیجتی ہے اور اس کو عام طور سے برطانوی خارجہ پالیسی کا جُز سمجھا جاتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ برطانوی خارجہ پالیسی کا مقصد یہ ہے کہ برطانوی سلطنت پر برطانوی حکومت برقرار رہے۔ اگر مقصد یہ ہوتا کہ ہندوستان کی خاطر صرف ہندوستان پر برطانوی حکومت برقرار رہے تو میرے خیال میں یہ انصاف کے عین مطابق ہوتا کہ ہندوستان پر حکومت کرنے کی بنا پر برطانیہ کی جو واجب الوصول رقم ہو اُس کا پیسہ پیسہ ہندوستان سے وصول کیا جائے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کو برطانیہ کے زیرِ حکومت رکھنے سے انگلستان کا بہت بڑا مفاد وابستہ ہے ہندوستان میں ہزاروں انگریز روزگار سے لگے ہیں، وہاں لاکھوں پونڈ کا برطانوی سرمایہ لگا ہُوا ہے اور ہندوستان کی تجارت سے انگلستان کو بہت فائدہ پہنچتا ہے۔ چونکہ انگلستان صرف ہندوستان کی خاطر ہندوستان پر قابض نہیں ہے بلکہ اس میں انگلستان کی غرض بھی شامل ہے اس لیے میرا خیال ہے کہ اس پر ہونے والے اخراجات کا ایک حصّہ انگلستان ادا کرے۔ اخراجات کے اُس حصّے کا تخمینہ لگانے میں انگلستان کو فراخ دلی سے کام لینا چاہیئے۔ اس لیے کہ اولاً انگلستان دولت مند ملک ہے اور ہندوستان غریب ملک ہے۔ اُن کی دولت اور افلاس کا تقابل کرنے کی

یہ منصفانہ بنیاد نہ سہی پھر بھی اُس پر غور کیا جانا چاہیئے اور وہ ہے اس ملک کے انکم ٹیکس کے مقابلے میں ہندوستان کا انکم ٹیکس۔ ہندوستان میں انکم ٹیکس کی شرح 2½ فیصدی یا تقریباً 6 پینس فی پاؤنڈ ہے۔ میں یہ تو نہیں بتا سکتا ہوں کہ اُس انکم ٹیکس سے واقعی کتنی آمدنی ہوتی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ 6 پینس فی پاؤنڈ کے حساب سے 10,00000 پاؤنڈ سے کم حاصل ہوتے ہیں۔ انگلستان میں ہر پنی (Penny) کی بنیاد پر 20,00,000 پاؤنڈ سے کہیں زیادہ رقم حاصل ہوتی ہے۔

وائسرائے کی کونسل کے متعلق سر آکلینڈ کولون کی رائے

3,216 — مجھے ایک سوال پوچھ کر خوشی ہوگی چاہے میرا اندازِ استفسار ناقص ہی کیوں نہ ہو۔ اس کا تعلق وائسرائے کی کونسل کی ساخت سے ہے۔ کیا میرا یہ خیال درست ہے کہ کاؤنسل کی تعداد، جس کو میری دانست میں ایگزیکٹیو کاؤنسل کہا جاتا ہے، آٹھ ہے۔

اتنی تعداد نہیں ہے۔

3217 — سات

وائسرائے، کمانڈر انچیف، ممبر برائے فوج، ممبر برائے امورِ داخلہ، ممبر برائے امورِ مفادِ عامہ، ممبر برائے مالیات اور ممبر برائے قانون — کل سات ممبر۔ تعداد بدلتی رہتی ہے۔ ہمیشہ لازمی طور سے یکساں تعداد نہیں ہوتی ہے۔ ممبر برائے امورِ مفادِ عامہ ہمیشہ اُس میں شامل نہیں ہوتا ہے۔

3,218 — ہم کہہ سکتے ہیں کہ خود وائسرائے اور ممبر برائے مالیات کے علاوہ وہ سب کے سب ایسے محکموں کی نمائندگی کرتے ہیں جہاں خرچ ہُوا کرتا ہے۔

میں تو کسی کو بھی مستثنیٰ نہیں قرار دے سکتا۔ میں کسی کو مستثنیٰ نہیں قرار دوں گا۔ محکمۂ داخلہ وائسرائے کے ہاتھ میں ہے جس کا ایک بڑا سیاسی حلقہ دریائے سندھ کے پار واقع ہے اور اُس پر بہت زیادہ رقم خرچ کی جاتی ہے۔

3,219 — اگر وائسرائے اخراجات میں کمی کی حمایت نہ کرے تو ممبر برائے مالیات تنہا رہ جاتا ہے۔

جی ہاں!

مالیاتی روک کی کمزوری کے متعلق سر ڈیوڈ باربور کی رائے

2,224 — میرے خیال میں یہ کہنا درست ہے کہ ممبر برائے مالیات کاؤنسل کے تمام دوسرے اراکین کے مقابلے میں اس بنا پر تنہا ہوتا ہے کہ اُس کو رقمیں فراہم کرنی ہوتی ہیں اور دوسرے اُن رقموں کو خرچ کرنا چاہتے ہیں۔

جی ہاں صورتِ حال کچھ ایسی ہی ہے۔ یقیناً صورتِ حال کچھ ایسی ہی ہے۔ مختلف محکمے رقم چاہتے ہیں اور اُسے حتی الوسیع اُن پر روک لگانی پڑتی ہے۔

2,225 - چنانچہ وہ اپنے محکمہ کی حد تک کسی خاص محکمے کے خلاف انفرادی طور سے چاہے طاقت ور ثابت ہو لیکن وہ اتنا طاقت ور نہیں ہوتا ہے کہ پوری کاونسل کا مقابلہ کرسکے۔

وہ اکثریت کا مقابلہ نہیں کرسکتا ہے۔

2,226 — عام خیال یہ ہے کہ اُسے دوسروں کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے رقمیں مہیا کرنی چاہیئیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے اُسے کونسل کے عام جذبات و احساسات کی مخالفت کرنی پڑتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اخراجات کی مختلف مدات کے تعلق سے اُسے ہمیشہ بحث ومباحثہ کرنا پڑتا ہے۔ یہ ناگزیر ہے۔

2,227 — چنانچہ فرض کیجئے کہ وائسرائے کوئی فوجی کارروائی کرنے کی موافقت میں ہے اور کاونسل کا ممبر برائے فوج کمانڈر انچیف کی عملی مخالفت نہیں کرنا چاہتا ہے۔ تو ممبر برائے مالیات کے خلاف ایک بڑی اکثریت ہو جائے گی۔

جی - بلاشبہ

2,301 — اور بجٹ کی تیاری اور اخراجات میں خود ہندوستانیوں کی کسی قسم کی کوئی آواز نہیں ہے۔

بلاشبہ اُن کی کوئی راست اور فوری آواز نہیں ہے۔ پھر بھی اس میں کوئی شک نہیں کہ حکومتِ ہند کسی نہ کسی حد تک ہندوستان کی رائے عامہ پر توجہ دیتی ہے۔ ہر حکومت ایسا کرتی ہے۔

2,302 — لیکن ان معاملات اُن کی کوئی راست آواز نہیں ہوتی ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اُن کی کوئی راست آواز نہیں ہے۔

اخراجات میں اضافے کے متعلق مسٹر ڈی۔ای۔واچا کی رائے

17,743۔ آپ نے اخراجات میں ہونے والے عام اضافے کے متعلق جو شہادت دی ہے اُس کے پیش نظر کیا میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں کہ اپنے بیان کردہ واقعات کی بنا پر کیا آپ کچھ نتیجوں پر پہنچے ہیں اور کیا آپ انھیں ہمارے سامنے پیش کرنا چاہیں گے۔؟

اخراجات میں زیادتی کے متعلق مندرجہ بالا بیان سے کمیشن پر یہ روشن ہو گیا ہوگا۔

(۱) یہ کہ پچھلے دس سال کے مالیاتی عدم توازن کی بنیادی وجہ بڑی حد تک فوج کے اخراجات میں ہونے والا بے اندازہ اضافہ تھا جس کی بنا پر مزید محاصل لگائے گئے۔ اُن کی مجموعی رقم تقریباً 6 کروڑ ہے (چار ملین پاونڈ) اس میں سوتی کپڑے پر لگنے والا محصول درآمد بھی شامل ہے۔

(2) یہ کہ سول اخراجات میں ہونے والا اضافہ بھی بہت زیادہ ہے لیکن جہاں تک اس کا تعلق ہے صرف ایک صورت کے علاوہ زیادہ شکایت کی گنجایش نہیں ہے۔ وہ صورت یہ ہے کہ بڑی بڑی تنخواہیں پانے والے غیر ملکی حاکموں پر آمدنی کا بڑا حصہ صرف ہوتا ہے۔ اگر زیادہ تعداد میں ہندوستانیوں کو حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر مقرر کیا جاتا تو خرچ میں بڑی کمی ہو جاتی۔ اس کو نہ بھولنا چاہیے کہ پیدا آور نوعیت کے سول اخراجات کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ میرا مقصد اُن اخراجات سے ہے جن کا معاوضہ محصول دہندگان کو مل جاتا ہے مثلاً عام تعلیم، عدالتوں کا بہتر انتظام، گاؤں اور شہروں میں حفظانِ صحت کا بہتر انتظام اور مفادِ عامہ کے دوسرے کام جن کی وجہ سے صوبائی وسائل اور عام لوگوں کی خوش حالی میں اضافہ ہوتا ہے۔

(3) یہ کہ اگر فوجی اخراجات کی وہ سطح برقرار رکھی جاتی جو 85-1884 میں تھی تو شرح تبادلہ کا بار آسانی سے برداشت کر لیا جاتا اور نہ نئے محصول لگانے پڑتے نہ اُن میں اضافہ کرنا پڑتا۔

(4) یہ کہ اگر آئندہ اس قسم کے اضافے پر روک نہ لگائی گئی تو اس کی وجہ سے حکومت نئی اُلجھنوں میں مبتلا ہو جائے گی اور مزید محاصل لگانے پڑیں گے جو نہ ایک مستحکم اور اچھی حکومت کے مفاد میں ہوگا اور نہ لوگوں کے مفاد میں۔ چونکہ مزید بار اُٹھانے کی اُن کی طاقت بہت کم ہو گئی ہے اس لیے اُن میں برہمی اور بے چینی پائی جاتی ہے۔ سکریٹری آف اسٹیٹ اخراجات میں سختی کے ساتھ کمی کرنے اور سرکاری اخراجات کے سلسلے میں بڑی احتیاط برتنے کے لیے اہم مراسلے بھیجتا رہتا ہے اس لیے کہ محاصل کے بوجھ میں اضافہ کرنے کے خطرے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے (دیکھیے مراسلہ مورخہ 12 اپریل 6

مورخہ 12 اپریل 1888 ، جلد دوم ، ضمیمہ ، ص 141۔ مراسلہ مورخہ 3 نومبر 1892 ، جلد دوم ، ضمیمہ ، ص 154

خطرے کی اطلاعات پر دھیان نہیں دیا جاتا ہے ، سکریٹری آف اسٹیٹ جو حکم دیتا ہے اُس کا عمل درآمد نہیں ہوتا ہے اور اُس کے مراسلے صرف نیک خواہشات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بہرحال کمیشن نے اتنا تو دیکھا ہوگا کہ اُس کے باوجود اخراجات بڑھتے رہے۔ 1892 کے بعد محاصل میں بقدر 3 کروڑ (3 ملین پاؤنڈ) اضافہ ہوگیا ہے۔ اس کے علاوہ گلگت پر قبضہ کرنے کی وجہ سے سرحد کے پار کی جانے والی فوجی کارروائی میں اضافہ ہوگیا جس کی بنا پر بالآخر چترال پر قبضہ کرنا پڑا) اور اُس پر 1½ کروڑ (ایک ملین پاؤنڈ) خرچ کرنے پڑے اور 25 لاکھ (166,000 پاؤنڈ) سالانہ کا مستقل خرچ بڑھ گیا۔ اسٹیٹ سکریٹری اس معاملے میں خاموش ہے یا اس خرچ کو شروع کرنے والوں میں شامل ہے۔ چنانچہ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ واقعی مراسلوں کا کوئی اثر نہیں ہوا اور اُس خرچ کی ذمہ داری سکریٹری آف اسٹیٹ اور حکومتِ ہند دونوں پر یکساں طور سے عاید ہوتی ہے۔

یہ بات سب کو معلوم ہے کہ ہندوستان میں قابلِ لحاظ حقیقی بچت نہیں ہوا کرتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُسے روز پانی پینے کے لیے کنواں کھودنا پڑتا ہے اور اکثر وہ دشواریوں میں مبتلا رہتا ہے جس سے چھٹکارا پانے کے لیے غیر متوقع آمدنی یا قرض کا سہارا لینا پڑتا ہے یا محاصل میں اضافہ کرنا پڑتا ہے۔ ہر اضافہ اُن محصول دہندگان کی استطاعت میں کمی کا باعث بن جاتا ہے جن کی فی کس آمدنی 27 روپیہ (36 شلنگ) سالانہ سے زیادہ نہیں ہے۔

1849-50 سے 1894-95 تک 37.62 ملین روپیہ (25 ملین پاؤنڈ) کا خالص خسارہ ہو چکا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس چھیالیس سال میں ہندوستان کو ہر سال 800,000 روپے (533,000 پاؤنڈ) کا اوسط خسارہ ہوتا رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس اہم ترین امر کو ہمیشہ نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ ہندوستان کا جو "خون نچوڑا" گیا ہے اُس نے اُسے ایک غریب ملک بنا دیا ہے اور اس لیے اُس کی آمدنی زیادہ نہیں ہو سکتی ہے۔ ایک ایسا نظامِ حکومت ، چاہیئے۔ اُس میں کتنی ہی نیک نیتی سے کام لیا جائے ، جو اس ضروری امر کو نظر انداز کرتا ہے اور مغربی طریقۂ حکومت برابر اختیار کرتا جاتا ہے یعنی ایک غیر ملکی حکومت کا ایسا طریقہ اختیار کرتا جاتا ہے جس میں لوگوں کی آواز نہ ہو اور اس کے علاوہ وہ مہنگا بھی ہو ، تو بالآخر وہ ناکام

تباہی کا پیش خیمہ بن جایا کرتا ہے چاہے اُس تباہی کے آنے میں کتنا ہی وقت کیوں نہ لگے۔ میں تو یہی کہہ سکتا ہوں کہ یہ طریقہ غیر فطری ہے اور ناکامی اُس کا مقدر ہے۔ ان حالات میں ہندوستانی مجبور ہیں کہ اخراجات میں ہونے والے ہر اضافے کو تشویش کی نظر سے دیکھیں۔

ہندوستان کے لوگوں کو اعلیٰ عہدوں سے علیحدہ رکھنے کے متعلق مسٹر بی۔ کے گوکھلے کی رائے

18,331 — میرا خیال ہے کہ آپ ملازمتوں کے متعلق اظہار خیال کرنے والے تھے۔

جی ہاں۔ ہندوستان کے اخراجات کے شعبے میں یہ سوال بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ اُس کا انتظام کس کے ہاتھ میں ہے۔ مئی 1892 میں پارلیمنٹ میں دیے جانے والے ایک جواب کے مطابق ہندوستان کے سول اور فوجی محکموں کے اعلیٰ شعبوں میں کل 2388 ایسے افسر ہیں جن کی سالانہ یافت 10,000 روپے یا اس سے زیادہ ہے۔ ان میں سے صرف ساٹھ ہندوستانی ہیں اور کچھ ججوں کو چھوڑ کر یہ بھی نسبتاً نیچی سطح پر رک جاتے ہیں اور اس طرح اُن میں تفریق پیدا کر دی گئی ہے۔ (دیکھیے مندرجہ ذیل نقشہ)

ان کے علاوہ ریلوے کمپنیوں کی ملازمت میں 105 افسر ہیں جن کی سالانہ یافت 10,000 روپے یا اُس سے زیادہ ہے۔ وہ سب یورپین ہیں اور اُن کی تنخواہوں کا کل میزان ۱۹ لاکھ 28 ہزار روپے ہوتا ہے۔ اب اگر ہم اُن افسروں پر آئیں جو سالانہ 5000 روپے اور 10,000 روپے کے درمیان کوئی رقم پاتے ہیں تو محکمہ سول میں 1207 یورپینوں اور 96 یوریشینوں کے مقابلے میں 421 ہندوستانی پائے جاتے ہیں۔ فوجی محکمے میں 1699 یورپینوں اور 22 یوریشینوں کے مقابلے میں 25 ہندوستانی ہیں۔ مفاد عامہ کے محکمے میں 549 یورپینوں اور 39 یوریشینوں کے مقابلے میں 85 ہندوستانی ہیں۔ اجتماعی لوکل فنڈس INCORPORATED LOCAL FUNDS میں 22 یورپینوں اور 3 یوریشینوں کے مقابلے میں 4 ہندوستانی ہیں۔ اس طبقے کے افسروں کی مجموعی تنخواہیں اس طرح بٹی ہوئی ہیں۔

	ہندوستانی	یوریشین	یورپین	ہزاروں روپے میں		
				ہندوستانیوں کی تنخواہوں کا میزان	یوریشینوں کی تنخواہوں کا میزان	یورپینوں کی تنخواہوں کا میزان
محکمہ سول	55	10	1211	947	151	25,774
محکمہ فوج	1	1	854	12	11	13,268
محکمہ مفادِ عامہ	3	4	239	33	45	3,415
اجتماعی لوکل فنڈس	1		9	10		113
	60	15	2,313	1,002	207	42,070

محکمہ سول میں ہندوستانی 29,05,000 روپے ، یوریشین 650,000 روپے اور یورپین 88,30,000 روپے۔

محکمہ فوج میں — ہندوستانی 164,000 روپے ، یوریشین 139,000 روپے اور یورپین 136,98,000 روپے۔ محکمہ مفادِ عامہ میں ہندوستانی 5,37,000 روپے یوریشین 2,78,000 روپے اور یورپین 39,62,000 روپے۔ اور اجتماعی لوکل فنڈس میں ہندوستانی 2,5000 روپے ، یوریشین 17,000 روپے اور یورپین 146,000 روپے۔ ان کے علاوہ ریلوے کمپنیوں کے تحت اس طبقے کے ۲۵۸ افسر ہیں جن میں صرف دو ہندوستانی ہیں ، 8 یوریشین ہیں اور 248 یورپین ہیں۔ اُن کی تنخواہیں اس طرح بٹی ہوئی ہیں ہندوستانی 12,000 روپے ، یوریشین 50,000 روپے اور یورپین 17,000 روپے۔ انگلستان میں حکومت ہند تنخواہوں کے طور پر 125,360 پاؤنڈ اور ریلوے کمپنیاں 54522 پاؤنڈ ادا کرتی ہیں۔ یہ تمام رقمیں یورپینوں کو ادا کی جاتی ہیں۔ ہندوستان کی ملازمتوں میں اعلیٰ عہدوں پر یورپینوں نے جو اجارہ حاصل کر لیا ہے اُس کی وجہ سے ہونے والے مالیاتی نقصان کی نمائندگی محض تنخواہیں نہیں کرتی ہیں۔ تنخواہوں کے علاوہ انھیں بڑی بڑی پنشنیں اور چھٹیوں کے اخراجات ملتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے 1890 میں انگلستان میں یورپینوں کو

ساڑھے تین ملین پاؤنڈ سے زیادہ رقم ادا کی گئی تھی۔ لیکن غیر ملکی کارکنوں کو صرف اتنی ہی خرابی نہیں ہے کہ اُن پر بڑی بڑی رقمیں خرچ کی جاتی ہیں۔ اُن کی وجہ سے ایک اخلاقی خرابی پیدا ہوگئی ہے جو اور بھی بری ہے۔ موجودہ طریقے نے ہندوستانی نسل کی نشو و نما روک دی ہے اور وہ بونوں کی نسل بنتی جا رہی ہے۔ وہ دن رات ایک قسم کے احساس کمتری کے شکار رہا کرتے ہیں اور موجودہ طریقے کی مصلحتوں کے پیشِ نظر ہم میں سب سے قد آور شخص بھی جھکنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

مالیات کی نگرانی کے متعلق مسٹر جی۔ سبرامنیا ائیر کی رائے

18,767 ـــــ غالباً آپ انھیں چند لفظوں میں بیان کرنا پسند کریں گے۔

جی ہاں۔ اس سے پہلے کہ میں صوبائی مالیاتی طریقے کے موضوع پر اپنے خیالات ظاہر کروں، جو ہمارے مالیاتی نظام کا ایک اہم جز ہے، میں تدارک کی تدابیر کی نشان دہی کروں گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کی مالیاتی حالت کو تقویت پہنچانے کا ایک طریقہ بقول سر آکلینڈ کولون یہ ہے "حکومتِ ہند کے اختیارات میں بے غیر ضروری مداخلت کیے بغیر پارلیمنٹ نگرانی کا کوئی طریقہ اختراع کرے جو اس وقت نظری اعتبار سے آخری عدالت اپیل سمجھی جاتی ہے۔ جیسا کہ سر ولیم وڈربرن نے کہا ہے اگر مالیاتی بیان پر بحث شروع کرنے سے پہلے پارلیمنٹ کے اراکین کی ایک کمیٹی اُس کا جائزہ لے اور اُس کے متعلق ہاؤس آف کامنز میں ایک رپورٹ پیش کرے تو اس سے کسی نہ کسی حد تک یہ مقصد پورا ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کمیٹی اُن خیالات پر بھی غور کرے گی جو وائسرائے کی لیجسلیٹو کاؤنسل میں غیر سرکاری اراکین کی طرف سے ظاہر کیے جائیں گے۔" کمیشن کے سامنے پیش ہونے والی شہادت نے یہ اچھی طرح ظاہر کر دیا ہے کہ موجودہ طریقہ ختم کر دیا جانا چاہیئے جس کی بنا پر دونوں حکومتوں کے درمیان اخراجات کی تقسیم کے نزاعی مسائل برسوں تک حل نہیں ہوتے ہیں اور آخر میں اس طرح حل ہوتے ہیں کہ ہر دو فریق غیر مطمئن رہتے ہیں۔ یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ خزانے کی ایک رُوداد میں وہ اصول بیان کر دیے جائیں جن کی بنا پر اخراجات تقسیم ہونے چاہئیں اور اُن صورتوں میں جب دونوں حکومتیں ان اصولوں کے اطلاق کے تعلق سے کسی تصفیہ پر نہ پہنچ سکیں، اس کا تصفیہ ایک ثالث یا کئی ثالثوں پر چھوڑ دیا جائے جن کا انتخاب دونوں حکومتیں کریں۔ لارڈ رپن اور لارڈ لینس ڈاؤن نے اس تجویز کو پسند کیا تھا۔ میرے خیال میں بہتر ہوگا اگر آخری فیصلے کا

اختیار پریوی کاؤنسل کی عدالتی کمیٹی JUDICIAL COMMITTEE کے سپرد کر دیا جائے۔ پریوی کاؤنسل ایک ایسی عدالت ہے جس سے ہندوستان کے لوگ اچھی طرح واقف ہیں اور وقتاً فوقتاً مقرر کیے جانے والے ثالثوں کے مقابلے میں ہندوستان کے لوگ اس پر زیادہ اعتماد کریں گے۔ میں اس امر کی اہمیت پر پہلے ہی روشنی ڈال چکا ہوں کہ سکریٹری آف اسٹیٹ کی کاؤنسل کے اراکین کو ہندوستان کے موجودہ حقیقی مالیاتی حالات سے واقف ہونا چاہیئے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ موجودہ طریقہ ختم کر دیا جائے جس کے تحت اراکین دس سال کے لیے مقرر کیے جاتے ہیں اور سکریٹری آف اسٹیٹ اگر چاہے تو ان کی مدتِ کار میں توسیع کی جاسکتی ہے۔ حکومتِ ہند کے اراکین اور صوبائی گورنروں کی طرح ان کی مدتِ کار بھی پانچ سال ہونی چاہیئے اور انھیں دوبارہ مقرر نہیں کیا جانا چاہیئے۔ کاؤنسل کے اراکین میں ہمیشہ کئی ایسے ہندوستانی شامل ہونے چاہئیں جو اس کام کے اہل ہوں اور لازمی طور سے حکام نہ ہوں۔ اُن کا تقرر لیجسلیٹو کاؤنسلوں کے منتخب اراکین کی سفارش پر کیا جانا چاہیئے۔ وہ سکریٹری آف اسٹیٹ کے سامنے ہندوستان کا نقطۂ نگاہ پیش کر سکیں گے جو موجودہ طریقے میں کسی طرح اُس کے سامنے نہیں لایا جا سکتا ہے۔ جہاں تک ہندوستان میں حکومتِ ہند کی ساخت کا تعلق ہے میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ بہتر ہوگا کہ گورنر جنرل کے سپرد کسی خاص محکمے کی نگرانی نہ کی جائے تاکہ ملک کے داخلی معاملات پر توجہ دینے کے لیے اُس کو نسبتاً زیادہ وقت مل سکے جن پر بدقسمتی سے اتنی توجہ نہیں دی جاتی ہے۔ جتنی 1885ء سے پہلے دی جاتی تھی۔ گورنر جنرل کی کاؤنسل کے اراکین کو بجٹ پر ووٹ دینے کا اختیار حاصل ہونا چاہیئے۔ صدر کو یہ اختیار حاصل ہونا چاہیئے کہ حکومتِ ہند کے خلاف ہونے والے فیصلے کو رد کر سکے۔ سوالات کرنے کے زیادہ موقعے فراہم کیے جانے چاہئیں اور جب مالیات کے تعلق سے کوئی قانون بنایا جائے تو حتی الوسع عوامی اداروں کی رائیں قانون بنانے سے پہلے معلوم کر لی جائیں۔

ہندوستانیوں کو زیادہ ملازمتیں دینے کے متعلق مسٹر سریندر ناتھ بنرجی کی رائے

19,320 ——— بڑھتے ہوئے اخراجات کے متعلق آپ اپنی رائے ہمارے سامنے پیش کریں گے۔

جی ہاں، اپنے ملک کی سرکاری ملازمتوں میں ہندوستانیوں کو روزگار کے مواقع

دینے کا مسئلہ بھی کسی نہ کسی حد تک مالیاتی مسئلہ ہے۔ اخراجات بڑھتے ہی جاتے ہیں۔ اس کا اطلاق خاص طور سے محکمۂ فوج پر ہوتا ہے۔ فوجی اخراجات میں ہونے والے اضافے کو ہندوستان کے لوگ اپنے ملک کے لیے قطعی ناقابلِ برداشت سمجھتے ہیں۔ اور ان کا خیال ہے کہ ضروری گھریلو ترقیوں پر ہونے والے جائز اخراجات میں مداخلت کی جا رہی ہے۔ وہ ہندوستان کے لوگ جو اس موضوع پر رائے رکھنے کے اہل ہیں سر ایچ۔ برکین بری کے اس خیال سے اتفاق کرتے ہیں کہ ہندوستان کی فوج کے اُس حصّے کے اخراجات برطانوی خزانے کو برداشت کرنے چاہئیں جو ملک میں داخلی امن برقرار رکھنے کی ضرورت سے زیادہ ہے اور یورپی فوج کے اخراجات اور تنخواہوں کی منصفانہ تقسیم انگلستان اور ہندوستان کے درمیان کی جانی چاہیئے۔ جب تک یہ نہیں کیا جائے گا ہندوستان کے وسائل ایک اچھی اور ترقی پذیر حکومت کے مقاصد پورے کرنے کے قابل نہیں ہو سکیں گے۔ اور عام لوگوں کی حالت میں کوئی سدھار ممکن نہیں ہو سکے گا۔ سرکاری ملازمتوں میں ہندوستان کے لوگوں کو روزگار کے زیادہ مواقع دے کر اخراجات میں کمی بھی کی جا سکتی ہے اور ذہنی اور اخلاقی ترقّی کے محرکات بھی فراہم کیے جا سکتے ہیں۔ دس سال پہلے پبلک سروس کمیشن نے، جس کا صدر پنجاب کا لیفٹننٹ گورنر مرحوم سر چارلس اکیسن CHARLES ATCKISON تھا اور جس میں اُس زمانے کے نمایاں حکام اور غیر سرکاری نمائندے شامل تھے، ہندوستان کی سرکاری ملازمتوں کے سوال پر ایک رپورٹ پیش کی تھی۔ اُن سفارشات کا خلاصہ مندرجہ ذیل الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ کہ سرکاری ملازمتوں میں مقامی لوگوں کو زیادہ مواقع دیے جانے چاہئیں۔ یہ کہ انگلستان میں بھرتی کیے جانے والے سرکاری ملازموں میں کمی کی جانی چاہیئے۔ اور ہندوستان میں میسّر آنے والے با اہلیت لوگوں سے فائدہ اُٹھایا جانا چاہیئے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں بھرتی کیے جانے والے صوبائی ملازمین پر نظم و نسق کی پوری ذمہ داری ہونی چاہیئے۔ جن کی نگرانی اور نگہداشت یورپی حکام کریں۔ کمیشن نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا "پالیسی اور اخراجات میں کمی دونوں کا یکساں تقاضہ ہے کہ اچھی حکومت کے مقاصد جس حد تک اجازت دیں اُس حد تک انگلستان میں بھرتی کیے جانے والے ملازمین میں کمی کی جائے اور ہندوستان میں میسّر آنے والے با صلاحیت لوگوں سے فائدہ اُٹھایا جائے" لیکن حقیقت یہ ہے کہ سرکاری ملازمتوں کے تمام شعبوں میں اعلیٰ عہدے یورپی لوگوں کے پاس ہیں حالانکہ کمیشن کی پیش کردہ رپورٹ کو دس سال گزر چکے ہیں۔

باب 12

ہندوستان کی کرنسی کی کمیٹی

1870ء کے بعد چاندی کی گرتی ہوئی قیمت نے حکومت ہند کو پریشان کر رکھا تھا۔ گرتی ہوئی قیمت کی بنا پر ہندوستان کے لوگوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ جوں جوں روپے کی قیمت گرتی گئی ویسے ویسے روپے میں لگائی جانے والی ملک کی پیداوار کی قیمتیں بڑھتی گئیں اور چاندی کی قیمت گرنے کی وجہ سے ہندوستان کی برآمدات میں فائدہ ہونے لگا۔ روپے کی قیمت گری تو روپے میں حاصل ہونے والے سرکاری آمدنی میں ازخود اضافہ ہو گیا۔ جب حاکم بندوبست نے دیکھا کہ روپے کے حساب سے چاول اور گیہوں کی قیمت فروخت میں اضافہ ہو گیا ہے تو اُس نے مال گزاری کا مطالبہ بھی بڑھا دیا۔ لگان اور مال گزاری میں اضافہ ہوا تو اُن مقامی محاصل میں بھی اضافہ ہو گیا جو لگان یا مال گزاری پر تشخیص کیے جاتے ہیں۔ انکم ٹیکس تشخیص کرنے والے نے جب تاجروں اور خردہ فروشوں کی آمدنی زیادہ روپے تجویز کی تو زیادہ محصول بھی تشخیص کیا۔ جب روپے کی قیمت گری تو حکام روپے میں ملنے والی تنخواہوں میں کچھ اضافے کا مطالبہ کرنے لگے۔ ہندوستان کے یورپین حاکموں کو بالآخر اس قسم کا معاوضہ مل گیا۔ جو غیر منصفانہ اور قابلِ اعتراض تھا۔ ہندوستانی حکام کی چھوٹی چھوٹی تنخواہوں میں کوئی مناسب اضافہ نہیں کیا گیا۔ جہاں تک مالیاتی نظام اور ہندوستان میں ہونے والے روپے کے لین دین کا تعلق تھا سونے کے مقابلے میں چاندی کی قیمت کم ہو جانے کی وجہ سے کوئی دشواری یا ناگواری پیدا نہیں ہوئی۔

لیکن حکومت ہند کو گھریلو اخراجات کے لیے ہر سال بڑی بڑی رقمیں سونے کی شکل میں انگلستان بھیجنا پڑتی تھیں اور جوں جوں چاندی کی قیمت گرتی گئی سونے کی شکل میں بھیجی جانے والی اس رقم کے لیے زیادہ چاندی درکار ہونے لگی۔ حکومت ہند اس کو ہندوستان پر لگنے والا ایک مزید محصول سمجھتی تھی۔ گھریلو اخراجات میں کمی کی سفارش کرنے کے بجائے اُس نے یہ تجویز پیش کی کہ روپے کی قیمت میں مصنوعی اضافہ کر دیا جائے جس کے معنی یہ ہوئے کہ ہندوستان کے محاصل میں حقیقی اور یکساں اضافہ کر دیا جائے۔

جیسا کہ مندرجہ ذیل اعداد میں دکھایا گیا ہے۔ 1870 کے بعد کے پہلے آٹھ سال میں روپے کی قیمت میں $3\frac{1}{2}$ پنس کی تخفیف ہوئی۔

	روپے کی قیمت
	پنیس
1871-72	$23\frac{1}{2}$
1872-73	$22\frac{3}{4}$
1873-74	$22\frac{3}{8}$
1874-75	$22\frac{1}{8}$
1875-76	$21\frac{5}{8}$
1876-77	$20\frac{1}{2}$
1877-78	$20\frac{3}{4}$
1878-79	$19\frac{3}{4}$

کلکتہ کے چیمبر آف کامرس نے 1976 میں حکومت ہند پر زور دیا کہ روپے کی گرتی ہوئی قیمت کو روکنے کے لیے چاندی کی سکہ سازی ملتوی کر دی جائے۔ لیکن حکومت ہند نے جواب دیا کہ حالات اس کی اجازت نہیں دیتے ہیں کہ ہندوستان کی کرنسی کے تعلق سے کوئی قدم اٹھایا جائے۔ [1]

نومبر ۱۸۷۸ء میں، جب لارڈ لٹن افغانستان کے خلاف جنگ شروع کرنے والا تھا

---

[1] سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کے نام مالیاتی مراسلہ، مورخہ ۱۹ اکتوبر 1876

اُس نے اس موضوع پر ایک دفعہ پھر سکریٹری آف اسٹیٹ کو خط لکھا اور یہ تجویز پیش کی کہ روپے سکہ سازی میں کمی کرکے اُس کی قیمت میں اضافہ کرنے کی تدبیر کی جائے۔ اُس نے ایک بل کا مسودہ پیش کیا اور کوائنیج ایکٹ COINEGE ACT میں ترمیم کرنے کی سفارش کی۔

سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا لارڈ کرین بروک نے وہ مراسلہ چانسلر آف اکسچیکر CHANCELLOR OF EXCHEQUER سر اسٹیفورڈ نارتھ کوٹ کو بھیجدیا۔ بالآخر وہ مراسلہ ایک کمیٹی کے سپرد کردیا گیا جو سر لوئی میلٹ ، سر اسٹیفن ہوپ ممبر پارلیمنٹ ، سر ٹامس سیکامب مسٹر فرر ، مسٹر ولبی ، مسٹر گریفن اور مسٹر آرتھر بال فور ممبر پارلیمنٹ پر مشتمل تھی۔ ان حضرات نے اپنی رپورٹ 30 اپریل 1879 کو پیش کی کہ " تجاویز مشمولہ مراسلہ پر غور کرنے کے بعد اُن کی بالاتفاق رائے ہے کہ وہ ملکہ معظمہ کی حکومت کی منظوری کے لیے اُن تجاویز کی سفارش نہیں کرسکتے ہیں "

بعدازیں [1] 2 نومبر 1879 کو لارڈز آف دی ٹریژری LORDS OF THE TREASURY نے لارڈ لٹن کی تجاویز کا مفصل جواب دیا۔ اس فاضلانہ اور مفصل جواب کے کچھ حصے پیش کیے جاتے ہیں " یہ بات ابھی تک پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچ سکی ہے کہ سونے اور چاندی کے تناسب میں ہونے والی تبدیلی اوّل الذکر دھات کی قیمت میں اضافے کی بنا پر ہوئی ہے یا آخرالذکر کی قیمت میں تخفیف کی بنا پر یا اس میں دونوں کو دخل ہے "

یہ سمجھا جاتا ہے کہ حکومتِ ہند نے موجودہ تجویز پیش کرکے خود اپنے متعلق اس قسم کے اعتراضات کا موقع فراہم کردیا ہے جس قسم کے اُن حکومتوں پر کیے جاتے ہیں جو اپنی کرنسی کی قیمت کم کردیتے ہیں۔ عام طور سے ایسی حکومتوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قرض خواہوں کو ادا کی جانے والی رقم میں کمی ہوجائے۔ لیکن موجودہ صورت میں حکومتِ ہند کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ محصول دہندگان سے وصول ہونے والی رقم میں اضافہ ہوجائے۔ دونوں طریقوں کی نوعیت میں کوئی حقیقی فرق نہیں معلوم ہوتا ہے "

" اس کے برعکس اگر صورتِ حال یہ ہے کہ ہندوستان میں روپے کی قیمت گر گئی ہے اور مجوزہ منصوبے پر عمل کرکے اُس کو بڑھایا جائے تو اس منصوبے پر یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ اس کی

---

[1] مراسلہ ، مورخہ 9 نومبر 1876

وجہ سے ہر معاہدہ اور ہندوستان کی ہر مقررہ رقم بدل جائے گی"۔

"اگر تبادلۂ زر کی موجودہ صورت حال چاندی کی قیمت کم ہو جانے کی وجہ سے ہے تو سرکاری اسکیم کی کامیابی کی صورت میں مندرجہ ذیل سہولتیں مل سکتی ہیں۔

(1) "انگلستان جانے والی رقموں میں تبادلے کی وجہ سے ہونے والے نقصانات کو پورا کرنے کے لیے حکومتِ ہند محاصل میں تھوڑی بہت کمی بیشی کرنے کی زحمت سے بچ جائے گی"۔

(2) "اُن سول ملازمین اور دوسرے انگریزوں کو کچھ سہولت مل جائے گی جو ہندوستان میں ملازمت یا کام کرتے ہیں اور انگلستان روپیہ بھیجنا چاہتے ہیں"۔

(3) "اُن انگریزوں کو کچھ مزید سہولت مل جائے گی جن کا سرمایہ ہندوستان میں ہے یا وہاں کاروبار میں لگا ہوا ہے اور جس کو وہ انگلستان بھیجنا چاہتے ہیں"۔ "لیکن مندرجہ بالا سہولتوں کی قیمت ہندوستان کے محصول دہندگان کو ادا کرنی پڑے گی اور اس کا اثر یہ ہوگا کہ ہندوستان کے ہر قرض یا معینہ ادائیگی میں، بشمول اُن رقموں کے، اضافہ ہو جائے گا جو کسانوں کی طرف سے ساہوکاروں کو واجب الادا ہیں۔ جہاں تک حکومتِ ہند کا تعلق ہے اس کا اہم اثر یہ ہوگا کہ ہندوستان کی اُن سرکاری ذمہ داریوں میں اضافہ ہو جائے گا جن کے معاہدے چاندی کی بنیاد پر کیے گئے ہیں"۔

حکومتِ ہند کی تجاویز کے جواب میں خزانے سے آنے والے اس خط نے وقتی طور سے اس مسئلہ کا فیصلہ کر دیا اور آئندہ چھ سال تک یہ مسئلہ نہیں اٹھایا گیا۔ ان چھ برسوں میں روپے کی قیمت بہت کم گری اور اُسے مندرجہ ذیل اعداد میں دکھایا گیا ہے۔

روپے کی قیمت

	پنیس
1897-80ء	20
1880-81ء	20
1881-82ء	$19\frac{7}{8}$
1882-83ء	$19\frac{1}{2}$
1883-84ء	$19\frac{1}{2}$
1884-85ء	$19\frac{5}{16}$

یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ 79-1878ء اور 85-1884ء کی درمیانی مدت میں جو لارڈ لٹن کی حکومت کے آخری دو سال اور لارڈ رپن کے تمام دورِ حکومت پر حاوی تھی، روپے کی قیمت $19\frac{3}{4}$ پنس سے کم ہو کر صرف $19\frac{5}{16}$ ہو گئی تھی۔ لیکن 1886ء کے شروع میں چاندی کی قیمت گرنا شروع ہو گئی اور لارڈ ڈفرن نے، جو اُس وقت ہندوستان کا وائسرائے تھا، سکریٹری آف اسٹیٹ کو خطرے سے آگاہ کرنے کے لیے ایک تار بھیجا "ہم نے سرحدی ریلوں، دفاع اور اضافہ شدہ فوجی اخراجات کے لیے جو قرض لیے تھے اُن کے سود کی ادائیگی کے لیے مالیاتی انتظامات اس مفروضے کی بنا پر کیے گئے تھے کہ روپے کی قیمت اٹھارہ پنس سے کم نہیں ہوگی۔ چاندی کی قیمت میں ہونے والی حالیہ کمی نے اور امریکہ کی ریاستہائے متحدہ کی غیر یقینی پالیسی نے ہمیں تشویش میں مبتلا کر دیا ہے..... ہم زور دار درخواست کرتے ہیں کہ ملکہ معظمہ کی حکومت بلا تاخیر اس سوال پر غور کرے۔ تجربے نے مسلم طور سے ظاہر کر دیا ہے کہ تاخیر کی بنا پر فیصلے کی دشواریوں میں بڑا اضافہ ہو جاتا ہے۔" [1]

اس کے بعد ایک خط روانہ کیا گیا [2] جس میں لارڈ ڈفرن اور اُس کی کاؤنسل کے اراکین نے لکھا تھا کہ روپے کی قیمت میں ہونے والی کمی کی وجہ یہ ہے کہ امریکہ میں بلینڈ ایکٹ BLAND ACT کی ترمیم یا تنسیخ کے متعلق قیاس آرائیاں کی جا رہی ہیں، یہ کہ روپے اور سونے کے درمیان ایک مستحکم نسبت قایم کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ اور یہ کہ "پورے مسئلے پر دوبارہ غور کرنے کے لیے موجودہ وقت مناسب معلوم ہوتا ہے۔" حکومتِ ہند نے اس بات کی تحقیق و تفتیش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ اس نے اپنے تار میں جس مزید فوجی خرچ کا ذکر کیا تھا اُس کے نتیجے میں ہندوستان سے انگلستان جانے والی رقموں کے اضافوں نے کس حد تک تبادلے کو ہندوستان کے خلاف متاثر کیا۔ اُس میں اتنی جرأت بھی نہیں تھی کہ وہ کہہ سکتی کہ اس بڑھتی ہوئی خرابی کا سیدھا سادا علاج یہ ہے کہ گھریلو اخراجات

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) [1] خط ہم نے لگایا ہے "محاصل کا فطری توازن" جس کا ذکر اقتباس کے آخری ٹکڑے میں کیا گیا ہے ضروری نہ ہوتا اس لیے کہ جیسے پہلے کہا جا چکا ہے محاصل میں مال گزاری اور آمدنی کے دوسرے ذرائع کے تعلق سے از خود توازن پیدا ہو جاتا ہے۔

[1] تار مورخہ 12 جنوری 1886

[2] مورخہ 6 فروری 1886

کی رقم میں سختی کے ساتھ کمی کی جائے جو سونے کی شکل میں ادا کرنی پڑتی تھی۔

لارڈ رین ڈالف چرچل LORD RAN DELPH CHURCHILL نے، جو اُس وقت سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کے عہدے پر فائز تھا، خط اور تار دونوں خزانے کو بھیجدیے اور لارڈز آف ٹریژری نے ایک دفعہ پھر حکومت ہند کی تجویز مسترد کردی۔ انھوں نے 1878ء کی بین الاقوامی کانفرنس برائے زر INTERNATIONAL MONETARY CONFRENCE میں ملکہ معظمہ کی حکومت کے نمائندوں کی حیثیت سے شرکت کرنے والے مسٹر گوشن MR. GOSCHEN مسٹر گبس MR. GIBBS اور سر ٹامس سی کومب SIR THOMES SECCOMBE کے بیان کا حوالہ دیا جس میں کہا گیا تھا کہ "سونے اور چاندی کے درمیان ایک معینہ تناسب قایم کرنا قطعی ناممکن العمل ہے" انھوں نے مزید کہا کہ حکومت ہند کی تجاویز سے ہندوستان کے انگریز افسروں کو فائدہ پہنچے گا اور محصول دہندگان کو نقصان ہوگا۔ جس کی طرف سر اسٹیفورڈ نارتھ کورٹ چھ سال پہلے اشارہ کرچکا ہے۔

"امسال حکومتِ ہند کی طرف سے آنے والے مراسلے میں خزانے کو کوئی ایسی دلیل نظر نہیں آئی جو اُسے سونے کے تناسب سے چاندی کی قیمت میں مصنوعی اضافے کی کوشش کے نتائج کے متعلق اُن فیصلوں سے انحراف کرنے پر آمادہ کرسکے جو سر اسٹیفورڈ نارتھ کوٹ نے اپنے اختیارات کی بنا پر اُس سے حاصل کیے تھے۔"

"حالانکہ تسلیم کیا گیا تھا کہ مجوزہ اقدامات سے ہماری حکومت کے یورپی افسروں کو کچھ فائدہ ہوسکتا ہے پھر بھی یہ بات واضح کردی گئی تھی کہ اس کا کتنا مضر اثر ہندوستان کے محصول دہندگان پر پڑے گا۔ اُس کے بعد چاندی کی قیمت کم ہوجانے کی بنا پر ہندوستان کی تجارت برآمد کو جو فروغ ہوا ہے اور لوگوں کی کاروباری دولت اور صنعتوں میں جو بڑا اضافہ ہوا ہے اس نے اس وقت ظاہر کیے جانے والے اس خیال کو تقویت پہنچائی ہے کہ اُن حالات میں بلا سوچے سمجھے مداخلت نہ کی جائے جن سے ہندوستان کے لوگوں کو نقصان کے بجائے فائدے پہنچ سکتے ہیں۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ اس سوال پر محض ہندوستانی خزانے یا انگلو انڈین حکام کے نقطۂ نظر سے غور کیا جائے اور اس پر غور نہ کیا جائے کہ سونے کی مناسبت سے چاندی کی قیمت میں ہونے والی کمی کا کتنا خوشگوار اثر عام لوگوں کی خوشحالی اور تجارت پر پڑے گا۔" [1]

---

[1] خزانے کا خط انڈیا آفس کو مورخہ 31 مئی 1886 خط ہم نے لگایا ہے۔ (باقی آگے صفحہ پر)

خزانے کے اس جواب۔ کے بعد کئی سال تک حکومت ہند نے کوئی مزید اقدام نہیں کیا۔لیکن روپے کی قیمت تیزی کے ساتھ گرتی رہی اور یہ بات معلوم کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی گئی کہ قیمت میں ہونے والی تخفیف کس حد تک لارڈ ڈفرن لینس ڈاؤن اور لارڈ ایلگن کے دورِ حکومت میں مسلسل بڑھتے ہوئے فوجی اخراجات اور اُن کے نتیجے میں سالانہ ہونے والے دولت کے نکاس کی بنا پر ہوئی ہے۔ 1885-86 اور 993-94 کی آٹھ سالہ درمیانی مدت میں روپے کی قیمت میں جو کمی ہوئی اُسے مندرجہ ذیل اعداد ظاہر کرتے ہیں۔

روپے کی قیمت

پینس	
18·3	ء 1885-86
17·4	ء 1886-87
16·8	ء 1887-88
16·3	ء 1888-89
16·5	ء 1889-90
18	ء 1890-91
16·7	ء 1891-92
14·9	ء 1892-93
14·5	ء 1893-94

روپے کی مسلسل گرتی ہوئی قیمت نے برطانوی حکومت کو اُس پالیسی سے انحراف کرنے پر آمادہ کر دیا جس کو ہندوستان کے محصول دہندگان اور ہندوستان کی صنعتوں کے حق میں اتنے دن تک اور اتنے انصاف کے ساتھ برقرار رکھا گیا تھا۔ 1892 میں منعقد ہونے والی بروسلز BRUSSELS کی بین الاقوامی کانفرنس حالت میں کوئی تبدیلی نہ لا سکی۔ سمجھا جاتا تھا کہ ریاستہائے متحدہ شرمن ایکٹ SHERMAN ACT کی کچھ دفعات منسوخ کر دے گا جن کی رو سے ہر سال چون ملین آونس چاندی خریدی جاتی تھی۔ چنانچہ ہندوستانی کرنسی کا سوال ایک کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا جس کا صدر

۱۰

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ: خزانے نے عام طور سے سمجھی جانے والی اس بات کو تسلیم کیا تھا کہ روپے کی قیمت میں ہونے والی کمی سے ہندوستان کی صنعتوں کو فائدہ پہنچے گا۔

لارڈ ہرسچیل LORD HERSCHELL تھا جو اُس وقت لارڈ چانسلر کے عہدے پر فائز تھا
لارڈ ہرسچیل کی کمیٹی نے مئی 1893 میں ہندوستانی ٹکسالیں بند کرنے کی موافقت میں رپورٹ پیش کردی۔ ایک شرط بھی رکھی گئی تھی کہ حکومت ہند سونے کے بدلے میں 16 پنس فی روپیہ کی شرح سے روپیہ ادا کرنے کا وعدہ کرے اور حکومت کے مطالبے کی ادائیگی میں برطانوی ساورن قبول کرے۔

چنانچہ جون 1893 میں ہندوستان میں ایک ایکٹ منظور کیا گیا اور اعلان جاری کیا گیا۔ اُس کے بعد کے برسوں میں روپے کی قیمت بڑھنے لگی جیسا کہ مندرجہ ذیل اعداد سے ظاہر ہوتا ہے۔

روپے کی قیمت

	پنس
1894-95ء	13.1
1895-96ء	13.6
1896-97ء	14.4۲
1897-98ء	15.3۳
1898-99ء	16

جب روپے کی قیمت قریب قریب اتنی ہوگئی جتنی ہرسچیل کمیٹی نے تجویز کی تھی تو حکومتِ ہند نے سکریٹری آف اسٹیٹ لارڈ جارج ہملٹن سے درخواست کی کہ روپے کی اُس قیمت کو مستقل کرنے کے اقدامات کیے جائیں۔

لارڈ جارج ہملٹن نے 1898 میں ایک کمیٹی بنائی اور سر ہنری فاؤلر کو اس کا صدر مقرر کیا۔
کمیٹی کا یہ مقصد نہیں تھا کہ وہ روپے کی قیمت کو 16 پنس تک بڑھانے کی پالیسی پر تبادلۂ خیال کرے۔ اُس پالیسی کو تو پہلے ہی تسلیم کیا جا چکا تھا اور اُس پر عمل شروع کر دیا گیا تھا۔ سر ہنری فاولر 1894 اور 1895 میں خود سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا تھا۔ جب ہندوستان کی ٹکسالیں بند کی گئی تھیں اور روپے کی قیمت میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ وہ اب اُس پالیسی کے متعلق شک وشبہ کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ اور اُس کی کمیٹی کو اُس پالیسی پر دوبارہ تبادلۂ خیال کرنے کی ہدایتیں بھی نہیں دی گئی تھیں بلکہ اُس سے کہا گیا تھا کہ اس امر کے بارے میں رپورٹ پیش کرے کہ ” حکومتِ ہند کے پیشِ نظر جو مقصد ہے کیا وہ ان اقدامات کی بنا پر حاصل کیا جا سکتا ہے جو اُس نے تجویز کیے ہیں“ [1]

---

[1] سکریٹری آف اسٹیٹ کا خط سر ہنری فاؤلر کے نام مورخہ 29 اپریل 1895

اس کے باوجود سر ہنری فاؤلر کی کمیٹی نے اس بارے میں بہت سی شہادتیں قلمبند کیں کہ روپے کی اضافہ شدہ قیمت کا تعین 16 پینس کرنا ہندوستان کے لوگوں کے مفاد کے نقطۂ نظر سے مناسب ہوگا یا نہیں۔ ہم آگے چل کر قلمبند کی جانے والی شہادت کے کچھ حصّوں کا حوالہ دیں گے۔ سر ہنری فاؤلر اور اُس کی کمیٹی نے 1899 میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ انھوں نے سفارش کی کہ ایک شلنگ چار پینس فی روپیہ کی شرح سے برطانوی ساورن کو زرِ قانونی قرار دیا جائے۔ اُنھوں نے یہ سفارش بھی کی کہ حکومتِ ہند اُس شرح سے روپے کے بدلے سونا دینے کا وعدہ کیے بغیر سونے کا ذخیرہ جمع کرے تاکہ شرحِ تبادلہ کے گرنے کی صورت میں جب امداد کی ضرورت محسوس ہو تو باہر رقمیں بھیجنے کے لیے اُس سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ چنانچہ برطانوی ساورن کو زرِ قانونی کی حیثیت دینے کے لیے 1899 میں ایک ایکٹ منظور کیا گیا۔ اُس وقت سے ہندوستانی خزانے اور کرنسی کے ذخیرے میں برابر سونا آرہا ہے۔ اپریل 1899 میں دو ملین پاؤنڈ کی مالیت کا سونا جمع ہو چکا تھا اور مارچ 1900 میں اُس کی مالیت بڑھ کے سات ملین پاؤنڈ ہو چکی تھی۔ ان اقدامات کا ہندوستان کی مال گزاری اور محاصل پر جو اثر پڑا اُس پر اگلے باب میں بحث کی جائے گی۔

سر ہنری فاؤلر کی کمیٹی نے جو شہادتیں 1898 اور 1899 میں قلمبند کیں وہ بڑی تقطیع کے دو کالم والے تقریباً چھ سو صفحات پر مشتمل ہیں۔ نمایاں حیثیتیں اور بڑے انتظامی تجربے رکھنے والے اینگلو انڈین افسروں نے بڑی وضاحت کے ساتھ اور زوردار الفاظ میں اپنی رائیں ظاہر کیں۔ لیکن انھوں نے گھریلو اخراجات میں کمی کرنے کے امکان پر کوئی بات نہیں کی جس کی وجہ سے یہ تمام مشکلیں پیدا ہوئی تھیں۔ انھوں نے ان اخراجات کو قطعی ناگزیر اخراجات تسلیم کر لیا۔ وہ ہندوستان میں محاصل کے صریح اضافے کے سخت مخالف تھے۔ چنانچہ انھوں نے یہ سفارش پیش کی کہ روپے کی اضافہ شدہ قیمت برقرار رکھی جائے۔ سر اینٹنی میکڈانل کی شہادت بڑی حد تک اس خیال کی نمائندگی کرتی ہے اور مندرجہ ذیل اقتباس اُس کے خیالات کو ظاہر کرے گا۔

سر اینٹنی میکڈانل کا بیان

5,778 فرض کیجیے کہ اب ٹکسالیں کھول دی جائیں اور روپیہ کی قیمتِ تبادلہ کم ہو کر مثلاً ایک شلنگ ہو جائے تو کیا اس کا اثر آپ کی آمدنی پر پڑے گا؟

جی ہاں ۰ اس کا یہ اثر پڑے گا کہ گھریلو اخراجات پورے کرنے کے لیے ہمیں مزید آمدنی کے

ذرائع تلاش کرنے پڑیں گے۔

5,779 ـــــ آپ کا مقصد ہے کہ آپ کو محاصل میں اضافہ کرنا ہوگا؟

جی ہاں!

5,780 ـــــ ہندوستان میں محاصل میں اضافہ کرنے کے معاشی اثر کے متعلق کیا آپ اظہار خیال کرنا چاہیں گے؟

میرا خیال ہے کہ روپے کی قیمت کم ہو کر اگر ایک شلنگ ہو جائے تو ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے آپ کو دس بارہ کروڑ کے قریب روپیہ حاصل کرنا ہوگا۔ میرا یہ کہنا ہے کہ آپ کے لیے یہ ممکن نہ ہوگا کہ ایسی سیاسی بے چینی پیدا کیے بغیر آپ مزید روپیہ حاصل کر سکیں جو ایک شدید خطرے کا سبب بن سکتی ہے۔

اس کے برخلاف سر رابرٹ گفن کی شہادت برطانیہ کے ماہرین معاشیات کے خیالات کی نمائندگی کرتی ہے۔ اُس نے ہندوستان کے لیے ایک مصنوعی کرنسی کی مذمت کی اور کسی ملک کے لیے ایسی کرنسی کو قابلِ اطمینان تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جو از خود وجود میں نہ آئے۔ اُس نے گھریلو اخراجات کی دشواریوں سے نپٹنے کی کوشش کی اور بڑی جرأت کے ساتھ مشورہ دیا کہ اُن اخراجات میں کمی کی جانی چاہیئے۔

سر رابرٹ گفن کی شہادت

10,082 ـــــ اس مالیاتی مسئلے کے متعلق جو آخری بات میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اُن حالات میں اس بات کی سفارش کرنے کی وجہ پائی جاتی ہے کہ ہندوستان کے اخراجات کے پورے سال کا از سرِ نو جائزہ لیا جانا چاہیئے۔ جو بیانات میں نے دیکھے ہیں اُن میں صرف یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ ہندوستان میں مزید محاصل لگائے جا سکتے ہیں یا نہیں۔ لیکن مالیاتی سوالوں میں مقابلے کے دوسرے پہلو پر بھی نظر ڈالنی چاہیئے۔ یہ ہو سکتا ہے' اور میرا خیال ہے کہ یہ واقعہ ہے، کہ شہنشاہی حکومت بڑے بڑے اخراجات کا غیر منصفانہ بار ہندوستان پر ڈالتی ہے جو حقیقت میں پوری سلطنت پر ڈالا جانا چاہیئے۔ ہندوستان میں جو فوج رکھی جاتی ہے وہ محض ہندوستان کے لوگوں کے مفاد میں نہیں بلکہ اُس سے پوری برطانوی سلطنت کو فائدہ ہوتا ہے۔ اس صورت میں ہندوستان کے خسارے کا انصرام اُس سے بہتر انداز سے ممکن ہونا چاہیئے۔ جیسا کہ ظاہر کیا گیا ہے اور ہندوستان کے زر میں تبدیلی

کرنے کی مبینہ ضرورت سے دامن بچایا جا سکتا ہے۔ غالباً یہ بات سیاست کی حد تک پہنچتی ہے اور جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں لارڈ ویلبی کی صدارت میں ایک رائل کمیشن کچھ دن سے کام کر رہا ہے۔ وہ اس مسئلے پر غور کر رہا ہے کہ فوجی اور دوسرے قسم کے اخراجات کے سلسلے میں کتنا بار ہندوستان پر پڑنا چاہیئے۔ اور کتنا نہیں پڑنا چاہیئے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ اُس خیال کو زوردار الفاظ میں پیش کروں جو میں نے اس بارے میں قایم کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس معاملے میں بڑی حد تک ہندوستان کے ساتھ منصفانہ برتاؤ نہیں کیا جا رہا ہے اور اُس فائدے کے لیے کچھ رعایت دی جانی چاہیئے، جو پوری سلطنت ہندوستان میں مقیم یورپین فوج سے اٹھاتی ہے، جو صرف ہندوستان کے لوگوں کے فائدے کے لیے نہیں رکھی جاتی ہے۔ میں یہ کہنا چاہوں گا کہ میری رائے میں وہ رقم تین یا چار ملین پاؤنڈ کے بقدر ہوتی ہے جو ہندوستان پر پڑنے والے مستقل بار میں سے منہا کی جانی چاہیئے۔ چنانچہ اصل بات یہ ہے کہ خسارے کا ثبوت نہیں پیش کیا جا سکتا ہے جس کی بنا پر مجھے ہندوستان کے زرمیں کی جانے والی تبدیلی پر اعتراض ہے۔ اس کے علاوہ اُس تبدیلی کی نوعیت پر جو اعتراض ہیں وہ بحال و برقرار رہتے ہیں۔

صرف دو ہندوستانی گواہوں کے بیان لیے گئے تھے یعنی مروان جی رستم جی، جو بمبئی کی اکسچینج بروکرز ایسوسی ایشن EXCHANGE BROKER'S ASSOCIATION کا نمائندہ تھا اور راقم الحروف جس نے بنگال کی نمائندگی کی۔ یہ دونوں گواہ اس کے خلاف تھے کہ روپے کی اضافہ شدہ قیمت 16 پنیس مقرر کی جائے۔ مسٹر رستم جی نے سفارش کی روپیہ کی قیمت 14 پنیس مقرر کی جائے۔ جو ٹکسالیں بند ہونے سے پہلے 1893 میں اُس کی تخمینی قیمت تھی۔ راقم الحروف نے سفارش کی کہ روپے کی کوئی مصنوعی قیمت مقرر نہ کی جائے۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے قارئین ہمیں اُن بیانوں کے اقتباسات پیش کرنے کے لیے معاف کریں گے جو ہندوستان کی رائے عامہ کی نمائندگی کرتے ہیں

مسٹر مروان جی رستم جی کی شہادت

9764 ـــــــ آپ ایک شلنگ چار پنیس کی شرح کے بجائے ایک شلنگ دو پنیس کی وکالت کیوں کرتے ہیں؟

میں اس کی وکالت اس اصول کی بنا پر کر رہا ہوں کہ آپ سونے کا معیار قایم کرنا چاہتے ہیں اور میں آپ پر ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ کئی نقاط نظر سے یہ مناسب ہے۔ سب سے پہلے آپ کارخانہ دارانہ

صنعت کو لیجیے جو نہایت اہم ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے کاروبار کو لیجیے جن میں ہندوستان کو چین سے مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔

9747 ——— آپ کی اصل دلیل یہ ہے کہ آپ کی رائے میں ایک شلنگ دو پنیس ہندوستان کی تجارت کے لیے بہتر ہوگا۔

میرے پیش نظر ہندوستان کے کارخانے اور وہ تجارت ہے جس میں چین سے مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔

9748 ——— اگر چین واقعی ریلیں وغیرہ تعمیر کرنا شروع کردے تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ایک شلنگ دو پنیس چین سے ہونے والے مقابلے میں معتد بہ کمی کر سکے گا۔

میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہم اپنا سوت اُس سے کم قیمت پر فروخت کر سکیں گے جس پر اس وقت کر رہے ہیں۔

9748 ——— آپ مستقل طور سے کم قیمت پر فروخت کر سکیں گے یا صرف کچھ مدت تک !

ایک شلنگ چار پنیس فی روپیہ کے مقابلے میں ہم ہمیشہ کم قیمت پر فروخت کر سکیں گے۔

مسٹر رمیش۔ سی۔ دت کی شہادت

10,643 ——— روپیہ کی قیمت میں ہونے والی تخفیف کو روکنے کے لیے حکومت کی پیش کردہ تجاویز نے کیا اُس کی قیمت میں اضافہ کر دیا ؟

جی ہاں۔ اگر میں بھولتا نہیں ہوں تو 1893 میں روپے کی قیمت ایک شلنگ دو پنیس تھی اور اب تقریباً ایک شلنگ چار پنیس ہے۔ چنانچہ پچھلے پانچ سال میں سونے کی مناسبت سے روپے کی قیمت میں 3 شلنگ کا اضافہ ہوگیا ہے۔ جہاں تک 18.71 اور 1893 کی درمیانی مدت میں ہونے والی تخفیف کا تعلق ہے مجھے اس کی وضاحت میں یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ اس تخفیف کے نتیجے میں حکومت ہند اور صوبائی حکومتوں کی آمدنیوں میں قدرتی طور سے اضافہ ہوگیا اور اس طرح مال گزاری اور دوسری آمدنیاں بڑھ گئیں۔ روپے میں جملہ قیمتیں بڑھ گئیں۔ غلوں کی قیمتوں میں اضافہ ہوگیا اور چونکہ حکومت نے بار بار ہونے والے بندوبستوں میں اس کو مطالبے میں اضافے کی بنیاد ٹھہرایا تھا اس لیے قدرتی طور پر مال گزاری میں اضافہ ہوگیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حکومت (اعلیٰ) مالک اراضی

کی حیثیت سے حق رکھتی ہے کہ پیداوار کی قیمت میں اضافہ ہونے کی صورت میں مطالبہ بڑھا دے۔ اس کے بعد آپ انکم ٹیکس کو لیجیے۔ جوں جوں روپے میں لگائی جانے والی آمدنیاں بڑھتی گئیں حکومت کا انکم ٹیکس بھی بڑھتا گیا۔ چنانچہ 1871 سے 1893 تک حالانکہ روپے کی قیمت گرتی رہی لیکن حکومت کی روپے میں لگائی جانے والی آمدنیوں میں راست اور قدرتی طور پر اضافہ ہوتا رہا۔

10,661 ——— (روپے کی قیمت میں مصنوعی اضافہ کرنے کے تعلق سے) آپ کا پہلا اعتراض یہ ہے کہ عملاً اس کی بنا پر محاصل میں بڑا اضافہ ہو جائے گا۔

جی ہاں قدرتی طور پر ہونے والے اضافے کے علاوہ مزید اضافہ ہوگا۔

۱۰,۶۷۴ ——— اس کے بعد آپ کہتے ہیں کہ اس تجویز پر ایک مزید اعتراض ہے جو زیادہ اہم ہے۔ کیا آپ اُس کی وضاحت کریں گے۔؟

ہندوستان کے لاکھوں کسان اور مزدور ساہوکاروں اور مہاجنوں کے مقروض ہیں اور زیادہ تر صورتوں میں قرض کا حساب غلے کے بجائے روپے میں کیا جاتاہے۔ روپے کی قیمت میں مصنوعی اضافہ کرنے یا اُس شرح سے اُس کی قیمت مقرر کرنے کے، جس میں پہلے ہی مصنوعی اضافہ کیا جا چکا ہے، یہ معنی ہوں گے کہ کسانوں اور مزدوروں پر ساہوکاروں اور مہاجنوں کے قرض کا بوجھ بڑھا دیا جائے۔ اس اقدام سے اُس مالدار طبقے کی آمدنی میں اضافہ ہو جائے گا۔ جو غریبوں کا خون چوستے ہیں اور اُس طوق کا بوجھ بڑھ جائے گا جو غریبوں اور قرض داروں کی گردنوں میں پڑا ہوا ہے۔ ہندوستان کے تمام بازاروں اور صرافوں میں روپے کی قیمت بڑھانے کا یہ اثر ہوگا کہ دولت مند سود خوروں کی آمدنیاں بڑھ جائیں گی اور غریب قرض دار کسانوں کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہو جائے گا۔

10,692 ——— کیا اب آپ چھوٹے موٹے زیورات کے متعلق کچھ کہنا پسند کریں گے؟

اچھی فصلوں کے زمانے میں ہندوستان کے مفلوک الحال لوگ جو تھوڑا بہت بچا پاتے ہیں وہ سیونگ بینک میں رکھنے کے بجائے، جو غریب لوگوں کے لیے ہندوستان میں وجود نہیں رکھتے ہیں، عورتوں کے لیے چاندی کے گہنے اور چھوٹے موٹے زیور کی شکل میں بچاتے ہیں۔ ہندوستان کے کسانوں اور مزدوروں کی قریب قریب تمام پس انداز کی ہوئی دولت اس شکل میں پائی جاتی ہے! قلت یا قحط کے زمانے میں متاثرہ اضلاع میں یہ تمام چاندی یا اس کا بڑا حصہ فروخت کر دیا جاتا ہے تاکہ پیٹ بھرنے کے لیے غلہ حاصل کیا جا سکے۔ حکومت کی اس تجویز کے معنی ہیں کہ ہندوستان کے غریب لوگوں کی پس انداز کی ہوئی دولت کا ایک تہائی حصہ ضبط کر لیا جائے۔ روپے کی قیمت میں مصنوعی اضافہ ہو جانے کی

بنا پر وہ چاندی کی چوڑی یا کڑا، جو کسان کی عمر بھر کی کمائی ہوتا ہے، اُس سے کم قیمت پر فروخت ہوگا جس پر خریدا گیا تھا۔ اس طرح حکومت ہند ایک جنبش قلم سے ہندوستان کے غریبوں کی حقیقی قومی دولت کو کم کر دے گی۔ تاکہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو نسبتاً آسانی سے پورا کر سکے۔

10,710 ــــــ کیا اب آپ ہمیں یہ بتائیں گے آپ کی رائے میں اُن تجاویز کا ہندوستان کی صنعتوں پر کیا اثر پڑے گا؟

جہاں تک صنعتوں کا تعلق ہے میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں ذاتی علم سے کچھ نہیں کہہ سکوں گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تجارت اور صنعت سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ لیکن میں نے ان لوگوں سے مشورہ کیا ہے جو تجارت کرتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ روپے کی قیمت میں مصنوعی اضافہ کرنے کی بنا پر تجارت درہم برہم ہو جاتی ہے اور صنعت کو نقصان پہنچتا ہے۔ میں نے اُن تاجروں سے سنا ہے جو بمبئی میں سوتی کپڑے کی صنعت میں مصروف ہیں کہ اس وقت سوتی کپڑے کی صنعت کی حالت بڑی سقیم ہے خاص طور سے اس کا اطلاق اُس صنعت پر ہوتا ہے جس کا مقابلہ چین اور جاپان کی پیداوار سے ہے۔ وہ ٹکسالوں کی تالا بندی کو بلا واسطہ یا بالواسطہ طور سے اس کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ چاندی کی کرنسی رکھنے والے دوسرے ایشیائی ممالک کے ساتھ برطانوی تجارت فروغ پا رہی ہے۔ ہندوستان کے معاملے میں برطانوی تاجر یہ مطالبہ کیوں کرتے ہیں کہ سونے اور چاندی کا تناسب معین کر دیا جائے جس کا مطالبہ وہ دوسرے ایشیائی ممالک سے نہیں کر سکتے ہیں۔ ہندوستان کے لوگ اس کے خواہش مند نہیں ہیں۔ ہندوستان کے لوگوں کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے روپے کی قیمت میں مصنوعی اضافہ ہونے کی صورت میں ہندوستان کے لوگوں کو کئی طرح سے نقصان پہنچے گا۔ حکومتِ ہند کو، جو قدرتی طور سے ہندوستان کے لوگوں کی نمائندگی کرتی ہے اور اُن کی خوشحالی کی محافظ ہے، وہ اسکیم مسترد کر دینی چاہیئے جس کو ہندوستان کے لوگ پسند نہیں کرتے ہیں اور جو اُن کے لیے مفید نہیں ہے۔

10,707 ــــــ آپ کا کہنا ہے "حکومتِ ہند کی تجویز اُس بڑھتے ہوئے دولت کے نکاس کا فطری اور مناسب علاج نہیں ہے جو ہر سال تنخواہ، پنشن اور بھتے کی شکل میں ہندوستان سے انگلستان کو ہوتا ہے"۔

ــــ انگلستان میں بھتے سونے میں ادا کیے جاتے ہیں اور حکومت اپنے سونے کی ذمہ داریوں کو کم کرنے کے بجائے، جو اُس کا فطری اور مناسب علاج ہے، یہ غیر فطری، ناقابلِ عمل اور خطرناک

تدار کی تدابیر اختیار کرنے کی کوشش کر رہی ہے کہ ہندوستان میں پائی جانے والی تمام تلافیوں کو سونے میں تبدیل کر دے۔ ہم ہندوستان کے ایک ایسے مالک آراضی کو فرض کریں جو اپنی جائداد کے لگان روپے کی شکل میں وصول کرتا ہے اور اُسے لندن کے ایک ایجنٹ کو سونے میں ادائیگی کرنی ہوتی ہے۔ اگر وہ مالک آراضی اس بنیاد پر کہ اُسے لندن کے ایجنٹ کو سونے میں ادائیگی کرنی پڑتی ہے ہندوستانی لگان سونے میں وصول کرنے کے لیے مقدمات دائر کرے تو عدالتیں کیا سوچیں گی؟

باب۔ 13

مالیات اور ہندوستان کا قرض

ہندوستانی مالیات کے متعلق ایک سلیکٹ کمیٹی کے سامنے 1873 میں شہادت دیتے ہوئے سر چارلس ٹریولین نے کہا تھا "ہندوستان میں دو متضاد پالیسیاں رائج ہیں۔ ایک پالیسی جس کی میں وکالت کرتا ہوں اخراجات میں کمی کی ہے اور دوسری جسے کلکتہ اور انگلستان میں بہ نظرِ استحسان دیکھا جاتا ہے محاصل میں اضافے کی ہے۔"

لارڈ نارتھ بروک اور اُس کے قابل اور ہمدرد وزیر مالیات سر ولیم میور کے 1876 میں ہندوستان سے واپس جانے کے بعد محاصل میں اضافے کی پالیسی پر بلا روک ٹوک عمل کیا جانے لگا۔ 1877 کا مدراس کا قحط بھی لارڈ لٹن کو اخراجات اور محاصل میں کمی کرنے پر آمادہ نہ کر سکا۔ اس کے برعکس اس نے اپنے نئے وزیر مالیات سر جان اسٹریچی کے مشورے سے نئے محاصل لگائے تاکہ قحط کے دوران سہولت پہنچانے اور بیمے کے لیے ایک رقم جمع کی جا سکے۔

FINANCE RELIEF & INSURANCE FUND حقیقت میں اس کا سیدھا سادا مقصد یہ تھا کہ حتی الوسع ہر سال ڈیڑھ کروڑ کی بچت کی جائے تاکہ قحط کے بیمے کی رقم خرچ کر کے قحط کے دوران سہولت فراہم کی جائے۔ کسی سال جس قدر رقم سہولت پہنچانے کے لیے خرچ نہیں کی جاتی تھی تو وہ صرف قرض کم کرنے یا مزید قرض سے بچنے پر صرف کی جاتی تھی۔ قرض کم کرنے یا مزید قرض سے بچنے میں کوئی فرق نہیں ہے۔"[1] ہندوستان کے لوگوں سے وعدہ کیا گیا تھا کہ محاصل کی آمدنی

اُس مقصد کے علاوہ ، جس کے لیے وہ لگائے گئے ہیں ، کسی اور مقصد کے لیے صرف نہیں کی جائے گی۔

یہ وعدہ کرنے کے چند دن بعد ہی وعدہ خلافی کی گئی۔ 79-1878 کے بجٹ میں اس مد میں رقم دکھائی گئی۔ لیکن 80-1879 کے بجٹ میں وہ ملتوی کردی گئی۔ قحط کے بیمے کے محاصل لگتے رہے لیکن قحط میں سہولت بہم پہنچانے اور اُس کے خلاف بیمے کی رقم غائب ہوگئی۔ ہندوستان کے لوگوں نے سخت احتجاج کیا۔ وزیر مالیات سرجان اسٹریچی نے یہ دلیل پیش کی کہ بجٹ میں چاہے بچت ہو، توازن ہو یا خسارہ ہو لیکن محاصل سے حاصل ہونے والی رقم قرضوں سے محفوظ رکھتی ہے اور اس طرح وہ شرائط پورے ہو جاتے ہیں جن کے تحت یہ محاصل لگائے گئے تھے۔ ہندوستان کی رائے عامہ نے اس دلیل کو ایک واضح پیمان کی ایسی خلاف ورزی سمجھا جو بدنیتی پر مبنی تھی۔ سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا نے بھی سرجان اسٹریچی کی دلیل پر شک و شبہ کا اظہار کیا۔ 1881 میں فیصلہ کیا گیا کہ 1½ کروڑ روپے کی پوری رقم آئندہ قحط کے دوران سہولت پہنچانے اور قحط کے خلاف بیمے کی مد کے تحت بجٹ میں شامل کی جائے۔ اور اس کو تین ذیلی اقدامات میں تقسیم کیا جائے۔ (1) سہولت (2) حفاظتی کام (3) قرض کی تخفیف۔

چنانچہ "قحط کے دوران سہولت پہنچانے کے سلسلے میں ہونے والے حقیقی اخراجات کی منہائی کے بعد پوری رقم قرض کم کرنے یا قرض سے بچنے پر خرچ کرنے کی ابتدائی پالیسی کی جگہ یہ اصول تسلیم کرلیا گیا ہے کہ اس رقم کا بڑا حصہ اُن کاموں پر خرچ کیا جائے جنھیں پیدا آور کاموں سے ممتاز کرنے کے لیے قحط سے محفوظ رکھنے والے مفادِ عامہ کے کام کہتے ہیں۔"[1]

لیکن قحط کی رقم کے اس نئے اور ترمیم شدہ مقصد کی بھی پوری پوری پابندی نہیں کی گئی۔ اُس پندرہ سال کی مدت میں جو 96-1895ء میں ختم ہوئی قحط کی 1½ کروڑ روپے یا ایک ملین پاؤنڈ سالانہ کی مجموعی رقم پندرہ ملین پاؤنڈ ہوگئی۔ لیکن جیسا کہ مندرجہ ذیل اعداد سے ظاہر ہوتا ہے قحط کے دوران سہولت پہنچانے، حفاظتی کام کرنے اور قرض کم کرنے پر دس ملین پاؤنڈ سے کم رقم خرچ کی گئی تھی۔

---

[1] 1898 کے فیمین کمیشن کی رپورٹ۔ ص 325

1881-82 تا 1895-96	پاؤنڈ
قحط کے دوران سہولت پہنچانے پر	2,13,571
حفاظتی کاموں پر	43,67,287
آبپاشی کے حفاظتی کاموں پر	12,09,207
قرض کم کرنے یا قرض سے بچنے پر	35,51,533
کل میزان	93,41,598

"قرض سے بچنے کی اصطلاح غیر واضح ہے۔ آخری مد کے تحت صرف وہ رقمیں دکھائی جانی چاہئیں جن سے حقیقت میں" قرض کم ہو۔" پھر بھی رقموں کو جوں کا توں تسلیم کر لینے کے بعد بھی مجموعی خرچ قحط کی مجوزہ رقم سے بقدر ساڑھے پانچ ملین پاؤنڈ کم ہے۔ بقیہ رقم ہندوستان کا قرض کم کرنے پر خرچ کی جانی چاہیئے تھی۔ اس کے بجائے کیا یہ گیا کہ بنگال ناگپور ریلوے اور مڈلینڈ ریلوے میں پندرہ سال کی مدت میں بقدر 23,89,397 پاؤنڈ جو خسارہ ہوا تھا اُس کو بجٹ میں قحط کے دوران پہنچائی جانے والی سہولت اور قحط کے خلاف بیمے کی رقم میں سے ہونے والے اخراجات کے طور پر دکھایا گیا۔

اُس کے بعد چھ سال تک قریب قریب برابر قحط پڑتے رہے اور قحط کے دوران سہولت پہنچانے کے اخراجات میں بڑا اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ 1881-82 اور 1901-2 کی درمیانی اکیس سالہ مدت کے اخراجات مجوزہ رقم سے بقدر ایک ملین پاؤنڈ زیادہ تھے؛ جیسا کہ مندرجہ ذیل اعداد سے ظاہر ہوتا ہے۔

1881-82 تا 1901-2	پاؤنڈ
قحط کے دوران سہولت پہنچانے پر	1,19,06,358
حفاظتی ریلوں پر	48,27,522
آبپاشی کے حفاظتی کاموں پر	13,98,955
قرض کم کرنے یا قرض سے بچنے پر	41,32,996
کل میزان	222,65,831

ہم نے اس میں بنگال ناگپور ریلوے اور مڈلینڈ ریلوے کے خسارے شامل نہیں کیے ہیں جو

اس اکیس سال میں بقدر 32,80,334 پاؤنڈ تھے۔ اس بات کو دھیان میں رکھنا چاہیئے کہ حالیہ قحطوں کے دوران پہنچائی جانے والی سہولت پر جو اخراجات ہوئے اُن کی بنا پر ہندوستان کی مالی ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں۔ قحط کے دوران سہولت پہنچانے کے لیے جو محاصل لگائے گئے تھے اُن کا یہ مقصد پورا نہ ہو سکا کہ عام حالات میں قرض گھٹا کر ہندوستان کی مالی ذمہ داریاں کم کی جائیں۔

اس اکیس سال میں ہونے والی ہندوستان کی کل آمدنی، جس میں مالگزاری بھی شامل ہے، اور کل اخراجات، جن میں گھریلو اخراجات بھی شامل ہے، مندرجہ ذیل نقشے میں دکھائے گئے ہیں جو اعداد و شمار کے خلاصے سے تیار کیا گیا ہے۔

سال	مالگزاری ۱۰ روپے میں	مختلف ریاستوں کی مجموعی آمدنی	انگلستان میں اخراجات	ہندوستان پر مجموعی اخراجات کا بار
1877-78	19891154	61972481	16,202,016	66,234,521
1879-80	22323668	65194020	16,794,424	63,059,922
1880-81	21861150	68433157	17,486,144	69,661,050
1881-82	21112995	74,290,112	17,340,712	77,921,506
1882-83	21948022	75,684,987	17,369,631	72,089,536
1883-84	21876047	70,278,337	17,335,995	69,603,500
1884-85	22361899	71,841,790	18,464,752	69,692,313
1885-86	21832211	70,690,681	17,527,406	71,077,127
1886-87	22592371	74,464,197	18,426,170	77,265,923
1887-88	23055724	77,337,134	19,829,035	77,158,707
1888-89	23189292	78,759,744	21,855,698	80,788,576
1889-90	23016404	81,696,678	21,954,657	81,659,660
1890-91	93981399	85,085,203	21,512,365	82,473,170
1891-92	24045209	85,741,649	20,656,019	82,053,478
1892-93	23965774	89,143,283	22,911,912	88,765,748
1893-94	24905328	90,172,438	26,161,815	91,005,850
1894-95	25589609	90565,214	26,112,111	92,112,212
1895-96	25408242	95,187,429	28,775,648	94,494,319
1896-97	26,200455	98,370,167	27,458,338	96,836,196
1897-98	23,974,489	94,129,741	26,234,255	95,834,763
1898-99	25,653,642	96,442,004	25,319,824	101,801,215
1899-1900	27,459,313	101,426,693	24,487,765	97,465,383
1900-01	25,607,584	102,955,748	24,587,269	98,793,811
1901-02	26,254,546	112,908,436	25,801,495	110,403,130
1902-03	27432,027	114,516,788	26,052,983	107,091,493

روپے کی قیمت میں مصنوعی اضافہ کرنے کے حقیقی نتائج کا جائزہ لینے کے لیے ہم صرف آخری پانچ سال کے اعداد کا مطالعہ کریں گے۔ روپے کی قیمت 98-1897ء میں 15 پینس سے کچھ زیادہ تھی اور 99-1898 میں 16 پینس ہوگئی تھی۔ اُس کے بعد اُس کی قیمت 16 پینس مقرر کردی گئی تھی۔ برطانوی قارئین کی سہولت کے لیے ہم ان پانچ برسوں کی مجموعی آمدنیاں اور مجموعی اخراجات پاؤنڈ میں دکھا رہے ہیں۔

	1897-98	1898-99	1899-1900	1900-1	1901-2
	پاؤنڈ	پاؤنڈ	پاؤنڈ	پاؤنڈ	پاؤنڈ
مجموعی آمدنی	6,42,57,207	6,75,95,815	6,86,37,164	7,52,72,291	7,69,44,525
مجموعی اخراجات	6,78,30,014	6,49,54,942	6,58,62,541	7,36,080 87	7,13,94,282

ان اعداد سے یہ حیران کن بات ظاہر ہوتی ہے کہ روپے کی قیمت میں مصنوعی اضافہ ہونے کی بنا پر پانچ سال میں ہندوستان کے محاصل بقدر بارہ ملین پاؤنڈ بڑھ گئے تھے۔ خزانے نے 1879 میں اُس وقت ان نتائج کی طرف اشارہ کردیا تھا جب لارڈز آف ٹریژری نے حکومت ہند کے مقصد کی مذمت ان واضح الفاظ میں کی تھی کہ وہ روپے کی قیمت میں اضافہ کرکے "اُس رقم میں اضافہ کرنا چاہتی ہے جو محصول دہندگان سے وصول کی جاتی ہے"۔ خزانے نے 1886 میں ایک دفعہ پھر ان نتائج کو سمجھ لیا تھا اور یہ کہہ کر اُن کی مذمت کی تھی کہ اُن سے "انگریز افسروں کو ایسا فائدہ ہوگا جس کی قیمت ہندوستان کے محصول دہندگان کو ادا کرنی ہوگی"۔ ان نتائج کو بہت سے لوگوں نے بھی سمجھ لیا تھا اور اُن کی مذمت کی تھی جو 1899 کی کرنسی کمیٹی کے سامنے بطور گواہ پیش ہوئے تھے۔ اُن میں راقم الحروف بھی شامل تھا جس نے کہا تھا کہ روپے کی قیمت میں مصنوعی اضافہ کرنے کے "معنی یہ ہوں گے کہ محاصل میں اضافہ کردیا جائے"۔ اس نتیجے کے متعلق آنریبل مسٹر گوکھلے نے مارچ 1902 میں اُس وقت تشویش کا اظہار کیا تھا جب وہ گورنر جنرل کی کاؤنسل کے رکن تھے۔ انھوں نے ایک فاضلانہ اور بصیرت افروز تقریر میں اُس وقت آمدنی میں ہونے والے مسلسل اضافے کی مذمت کی تھی جب ملک اتنی طویل مدت تک ایسے قحطوں اور دکھوں کا شکار رہ چکا تھا جن کی نظیر برطانوی ہند کی گزشتہ تاریخ نہیں پیش کرسکتی تھی۔

روپے کی قیمت 16 پینس مقرر کرنے کی پالیسی ہمیشہ کے لیے تسلیم کرلی گئی ہے۔ اب اس میں کسی تبدیلی کا امکان نہیں ہے۔ لیکن ہندوستان کے لوگ از روئے انصاف اُن مزید محاصل سے نجات پانے کا مطالبہ کرسکتے ہیں جو روپے کی قیمت میں اضافہ ہونے سے پہلے اُن پر لگائے گئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ دُہرے فائدے نہیں اُٹھائے جا سکتے ہیں۔ چونکہ حکومت ہند نے فیصلہ کرلیا ہے کہ روپے کی قیمت بڑھا کے ملک کے محاصل میں اضافہ کرے گی۔ اس لیے یہ بات قرین انصاف نہیں کہ اُن مزید محاصل کو بحال و برقرار رکھا جائے جو قیمت میں اضافے سے پہلے لگائے گئے تھے۔ ہندوستان کے لوگوں کے انتہائی افلاس کے باوجود اب ہر سال بجٹ میں بچت دکھائی جاتی ہے۔ غریبوں کو تھوڑا سا سہارا دینے کے لیے یہ ممکن ہونا چاہیے کہ وہ محاصل موقوف کر دیے جائیں جن کا مضر اثر ملک کی پس انداز کی ہوئی دولت پر پڑتا ہے۔

ایک زراعت پیشہ قوم کے لیے سب سے بڑا بوجھ وہ متعدد ابواب ہیں جو 1871ء کے بعد مال گزاری کے علاوہ زمین پر لگائے گئے ہیں۔ اب ان کو منسوخ کرنے کا وقت اور موقع آگیا ہے۔ لارڈ کرزن نے خود کہا ہے "سوال یہ ہے کہ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ موقع آنے پر اُن محاصل میں کمی کی جائے جن کی بنا پر قانون کی منشا سے زیادہ بوجھ زراعت پیشہ طبقوں پر ڈالا جا رہا ہے۔"[1] مدتوں تک قحطوں اور دکھوں میں مبتلا رہنے کے بعد ہندوستانی کسانوں کی ضروری اور حقیقی امداد اس طرح کی جاسکتی ہیں کہ یہ ابواب منسوخ کر دیے جائیں۔ اور مال گزاری کو سختی کے ساتھ اُن حدود میں رکھا جائے جو 1853 میں لارڈ ڈلہوزی نے اور 1854 میں سر چارلس نے قایم کی تھیں یعنی مناسب لگان کی نصف۔

قحط کے دوران سہولت پہنچانے اور بیمے کے محاصل نے بھی زمین پر لگنے والے مزید محاصل کی شکل اختیار کرلی ہے۔ ان محاصل کو بحال رکھنا لوگوں کے افلاس اور قحطوں کی شدت میں اضافہ کرنے کے مترادف ہے۔ اُن کی تنسیخ سے زراعت پیشہ لوگوں کو کچھ سہولت ملے گی۔ واقعہ یہ ہے کہ قحطوں کو روکنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ کسانوں کی حالت میں مستقل سدھار کیا جائے اور اُنھیں اُس زمین پر لگنے والے متعدد ابواب سے نجات دلائی جائے جس پر بھاری مال گزاری ادا کرنی ہوتی ہے۔

آخر میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ نمک کے محصول میں اور کمی کی جانی چاہیے۔ سوتی کپڑوں کے کارخانوں کے مصنوعات پر جو اکسائز محصول لگایا جاتا ہے وہ پکار پکار کر منسوخی کا مطالبہ کر رہا ہے۔ اس صورت

---

[1] مال گزاری کے تعلق سے حکومت ہند کی پالیسی کے متعلق تجویز مورخہ 16 جنوری 1902

میں جب کہ حکومتِ انگلستان ہر امکانی کوشش کر رہی ہے کہ غیر ملکی صنعتوں کے مقابلے میں انگلستان کی صنعتوں کی پوری پوری امداد اور ہمت افزائی کرے ہندوستان میں برطانوی حکومت ہندوستان کے مصنوعات پر اس محصول کو برقرار رکھنے میں حق بجانب نہیں قرار دی جاسکتی ہے۔

ہندوستان میں عام طور سے دیکھنے میں آیا ہے کہ بجٹ میں جب معقول بچت دکھائی گئی ہے تو اُس کے بعد سرحدوں پر فضول اور مہنگی جنگ بھی ہوئی ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ اس بچت کو شہنشاہی خزانے یا برطانوی صنعت کار کے بڑھتے ہوئے مطالبوں نے ختم کر دیا ہے۔ کرنسی کی نئی پالیسی کے تحت بجٹ میں جب بھی بچت دکھائی گئی اس قسم کے مطالبے کیے جانے لگے۔ لارڈ کرزن کے احتجاج کے باوصف برطانوی فوج بھرتی کرلے پر ہونے والے مزید اخراجات کے لیے 786,000 پاؤنڈ کی رقم ہتھیالی گئی ہے۔ جنوبی افریقہ میں ایک فوج رکھنے کے لیے 4,00,000 پاؤنڈ کا ایک اور مطالبہ کیا گیا تھا اور اُس کو صرف اُس وقت ترک کیا گیا جب انگلستان اور ہندوستان میں حکام اور عام لوگوں نے مشترکہ طور سے شدید احتجاج کیا۔ صنعت کاروں نے ایک دفعہ پھر ہندوستان کی بچت کا حوالہ دیا ہے اور مطالبہ کیا ہے کہ سوتی کپڑے پر لگنے والا 3½ فیصدی محصول درآمد منسوخ کر دیا جائے۔ تبت میں جنگ شروع ہو گئی ہے۔ جس نے کرنل ہیرڈ اسمتھ کے اس قول کی تصدیق کر دی ہے کہ ہندوستان میں ہونے والی بچت ہمیشہ غیر ضروری اور بڑے پیمانے پر کی جانے والی فوجی کارروائیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے دور اُفق پر خلیج فارس کا مسئلہ بھی نظر آنے لگا ہے۔

حکومتِ ہند کی موجودہ ساخت کے پیش نظر اس بات کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہونی چاہیے کہ صرف ہندوستان کے لوگوں کے علاوہ برطانوی رعایا کا ہر مفاد، اُس کا ہر طبقہ، حکومتِ ہند پر زور ڈال سکتا ہے اور اُسے مجبور کر سکتا ہے۔ برطانوی کابینہ اپنے مطالبے سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کے ذریعے پیش کر سکتی ہے جو اُس کا جینہ کا رکن ہوتا ہے۔ برطانوی صنعت کار اپنے ووٹ استعمال کر سکتے ہیں اور ہاؤس آف کامنز میں اپنے نمائندوں کے ذریعے مطالبے پیش کر سکتے ہیں اور مراعات حاصل کر سکتے ہیں فوجیوں کا ایسا اثر وائسرائے کی کونسل میں ہے جو کبھی ختم نہیں ہو سکتا ہے۔ یہ قسمت کی ستم ظریفی ہے کہ وہ واحد طبقہ ہندوستان کے لوگ ہیں جس کو کوئی نمائندگی حاصل نہیں ہے اور جس کی کوئی آواز یا اثر حکومتِ ہند میں نہیں ہے۔ چنانچہ ہندوستان کے بجٹ میں دکھائی جانے والی بچت، جو محاصل میں اضافہ کر کے حاصل کی جاتی ہے، ہندوستان کے لوگوں کو کوئی فائدہ پہنچائے بغیر بار بار خُرد بُرد ہو جاتی ہے۔ اس وقت (1903) زیادہ بڑا خطرہ درپیش ہے۔ بڑی بچت زیادہ دن تک نہیں دکھائی جاسکے گی۔

ہندوستانی قوم یہ توقع رکھتی ہے کہ یہ بجٹ ہندوستان کے قحط زدہ اور سنامَندگی نذر رکھنے والے کسانوں کو کوئی حقیقی، مرئی اور معقول سہولت بہم پہنچائے بغیر نظروں سے اوجھل نہیں ہونی چاہیئے۔

پچھلے پچیس سال کا ہندوستان کا مجموعی قرض مندرجہ ذیل دو نقشوں میں دکھایا گیا ہے۔ پہلے نقشے میں ہندوستان کا قرض دس روپے کی اکائی میں دکھایا گیا ہے۔ دوسرے نقشے میں اس کو پاؤنڈ میں تبدیل کر دیا گیا جیسا کہ اعداد و شمار کے خلاصے کے حالیہ شمارے میں دکھایا گیا ہے۔

سال	منتقل اور قابلِ واپسی ہندوستانی قرض (دس روپے کی اکائی میں)	انگلستان میں لیے جانے والا قرض (پاؤنڈ میں)
1877-78	82,783,277	59,677,033
1878-79	86,877,821	59,029,117
1879-80	91,506,846	68,855,556
1880-81	95,782,357	71,429,133
1881-82	98,784,414	68,141,947
1882-83	100,651,862	68,585,694
1883-84	103,503,456	68,108,837
1884-85	104,450,406	69,271,088
1885-86	100,717,480	73,806,621
1886-87	101,442,979	84,228,177
1887-88	107,806,795	84,140,148
1888-89	111,585,949	95,033,610
1889-90	113,437,052	98,192,391

سال	مستقل اور قابلِ واپسی ہندوستانی قرض پاونڈ	انگلستان میں لیا جانے والا قرض (پاونڈ)	میزان (پاونڈ)
1890-91	78,416,801	104,408,208	182,825,009
1891-92	79,229,246	107,404,143	186,633,389
1892-93	80,214,413	106,683,767	186,898,180
1893-94	82,545,514	114,113,792	196,659,308
1894-95	81,836,145	116,005,826	197,841,971
1895-96	82,076,049	115,903,732	197,979,781
1896-97	85,158,840	114,883,233	200,042,073
1897-98	86,766,193	123,274,680	210,040,873
1898-99	87,828,906	124,268,605	212,097,511
1899-1900	88,023,665	124,144,401	212,168,066
1900-01	90,407,865	133,435,379	223,843,244
1901-02	91,925,015	134,307,090	226,232,105

اس قرض کو زمانۂ امن میں کم کرنے کے لیے ایک ذخیرہ ادائی بنانے کی ضرورت ہے۔ اس کی بھی ضرورت ہے کہ قرض اور اخراجات کو کم کرنے میں نمائندہ حیثیت رکھنے والے ہندوستانی تعاون کریں۔ یہ ضروری ہوگیا ہے کہ ہندوستان کے مالیاتی انتظام میں عوامی عناصر شریک کیے جائیں۔ گورنر جنرل کی کاؤنسل قابل تجربہ کار اور باضمیر اشخاص پر مشتمل ہے لیکن وہ قریب قریب اُن میں سے ہر ایک، خرچ کرنے والے محکموں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ وہ اپنے محکموں کی ضروریات کو محسوس کرتے ہیں اور مزید اخراجات پر اصرار کرتے ہیں۔ توازن برقرار رکھنے والے ایسے کوئی عناصر نہیں ہیں جو اخراجات کی کمی پر زور دیں۔ دنیا کے کسی دوسرے ملک کی طرح ہندوستان میں بھی اُس وقت تک اخراجات میں کمی نہیں ہوسکتی ہے جب تک محصول دہندگان کی کوئی آواز قومی اخراجات میں نہ ہو۔ حکومت ہند کے کسی دوسرے محکمے کے مقابلے میں نمائندہ حیثیت رکھنے والے ہندوستانی مالیات کے محکمے میں حصّہ لینے کی زیادہ اہلیت رکھتے ہیں۔ زمین اور دیگر ہر

محصول کا نفاذ اُن کی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے اور وہ اُسے محسوس کرتے ہیں۔ وہ اپنے زراعت پیشہ ہم وطنوں کے درمیان رہتے ہیں، اُن کے دکھوں اور تکلیفوں سے واقف ہیں اور اُن کی خواہشات و تصوّرات پیش کرسکتے ہیں۔ اخراجات کی کمی میں اُنھیں زبردست اور قریب قریب ذاتی دلچسپی ہے جتنا کتاب اور مالیات کی طرف وہ ایسا موروثی اور روایتی میلانِ طبع رکھتے ہیں جس سے زیادہ دنیا کی کوئی اور قوم نہیں رکھتی ہے۔ حکومت کی نگرانی سے اُن کو یکسر محروم رکھنے کے بہت زیادہ خوشگوار نتائج سامنے نہیں آئے ہیں۔ عوامی اثرات کو بروئے کار نہ آنے دینے کی بنا پر حکومتِ ہند کا کوئی محکمہ اتنی کم کامیابی نہیں حاصل کرسکا جتنی مال گزاری اور مالیات کے محکمے نے حاصل کی ہے۔

ایک مالیات اور مال گزاری کا بورڈ، جس میں بڑے بڑے صوبوں کے لیجسلیٹو کاؤنسلوں کے چنے ہوئے ہندوستانی اراکین شامل ہوں، گورنر جنرل کی کاؤنسل کے ممبر اُمورِ داخلہ اور ممبر مالیات کے محنت طلب اور دشوار کام میں بڑا معاون ثابت ہوسکتا ہے۔ اگر حکومت کچھ اہلیت رکھنے والے ہندوستانیوں کو سکریٹری آف اسٹیٹ اور گورنر جنرل کی کاؤنسلوں میں شریک کرلے تو اُن کی وجہ سے وہ زیادہ باخبر رہے گی اور لوگوں کے مفادات سے اُس کا رابطہ قایم ہوسکے گا۔ تمام برطانوی مفادات، برطانوی قوم کے تمام طبقے، حکومتِ ہند پر اثر رکھتے ہیں۔ یہ بات قرینِ انصاف بھی ہے اور قرینِ مصلحت بھی کہ اُس حکومت میں ہندوستان کے لوگوں کی آواز ہو اور وہ اُس میں تھوڑا بہت حصّہ لے سکیں جس کا تعلّق دوسرے لوگوں کے مقابلے میں اُن سے زیادہ ہے۔ ہندوستان کی حکومت میں عوامی عناصر کی عدم موجودگی کی بنا پر وہاں کام کرنے والے تمام اثرات محاصل اور اخراجات میں اضافے کی حمایت کرتے ہیں اور اس بات کی حمایت کرتے ہیں کہ ہندوستان کی آمدنی اُن مقاصد کے لیے قربان کردی جائے جن کو ہندوستانی مقاصد نہیں کہا جاسکتا ہے۔ ایسے کوئی اثرات کام نہیں کررہے ہیں جو براہِ راست اخراجات و محاصل میں تخفیف کی حمایت کریں اور ہندوستان کے اُن لوگوں کے دکھ کم کریں جنھیں نمائندگی حاصل نہیں ہے۔ اخراجات کے کمیشن EXPENDITURE COMMISSION کے سامنے دی جانے والی نمایاں حیثیت رکھنے والے انگریزوں کی شہادتوں نے، جس کا ذکر ایک گزشتہ باب میں کیا جاچکا ہے، یہ ثابت کردیا ہے کہ ہندوستان کا روپیہ اکثر اوقات کس طرح خرچ کیا جاتا تھا۔ اگلے باب میں ہم اپنے قارئین کے سامنے جو واقعات پیش کریں گے اُن سے ظاہر ہوگا کہ اس قسم کے اخراجات کا لوگوں کی مادی حالت پر کیا اثر پڑتا ہے۔

باب 14

بیسویں صدی کا ہندوستان

اس آخری باب میں ہم اپنے قارئین کے سامنے نئی صدی کی ابتدا میں ہندوستان سے تعلق رکھنے والے کچھ اعداد پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اعداد و شمار کے خلاصے کے آخری شمارے سے جو سال رواں یعنی 1903 میں شائع کیا گیا ہے یہ اعداد اخذ کیے گئے ہیں۔

برطانوی ہند

	صوبے	رقبہ مربع میل میں	آبادی
1	اجمیر مارواڑا	2,711	476,912
2	انڈمان اور نکوبار	3,188	24,649
3	آسام	56,243	6,126,343
4	بلوچستان	45,804	308,246
5	بنگال	151,185	44,774,866
6	برار اور صوبجات متوسط	104,169	12,630,622
7	بمبئی (بشمول عدن)	123,064	18,559,561
8	برما	1,582	10,490,624
9	کورگ	236,738	180,607

10	مدراس	141,726	38,209,436
11	شمالی مغربی سرحدی صوبہ	16,466	20,125,480
12	پنجاب	97,209	20,330,339
13	آگرہ اور اودھ	107,164	47,691,782
	میزان	1087,249	231,899507

آمدنی اور اخراجات۔ 1902 میں برطانوی ہند کی مجموعی آمدنی 7,63,44,526 پاؤنڈ تھی۔ ریلوے اور آبپاشی سے ہونے والی آمدنی کی منہائی کے بعد برطانوی ہند کی خالص آمدنی 5,35,80,985 پاؤنڈ یا تقریباً $53\frac{1}{2}$ ملین پاؤنڈ تھی۔ چونکہ ہندوستان کی آبادی 252 ملین سے کم تھی اس لیے فی کس محصول تقریباً 4 شلنگ آٹھ پنس آتا تھا۔ لارڈ کرومر اور سر ڈیوڈ باربور کے 1882 کے تخمینے کے مطابق ہندوستان کے لوگوں کی فی کس آمدنی 27 روپے تھی۔ لارڈ کرزن کے تخمینے کے مطابق اُن کی موجودہ فی کس آمدنی ۳۰ روپیہ ہے۔ ان دونوں تخمینوں کو متعلق سمجھا جاتا تھا کہ وہ بہت زیادہ ہیں لیکن اس وقت حساب لگانے کے لیے ہم اُنھیں تسلیم کیے لیتے ہیں۔ تیس روپے 40 شلنگ کے برابر ہوتے ہیں۔ ملک کی معاشی حالت کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ تمام طبقوں کی اوسط آمدنی جن میں مالدار ترین طبقہ بھی شامل ہے، 40 شلنگ سالانہ ہے جب کہ انگلستان میں یہ آمدنی 42 پاؤنڈ سالانہ ہے۔ چالیس شلنگ پر 4 شلنگ 8 پنس محصول ایک پاؤنڈ پر 2 شلنگ 4 پنس محصول کے برابر ہوا۔ یہ بوجھ ایک ایسی قوم کو کچلنے کے لیے کافی ہے جو محض اتنا پیدا کر پاتی ہے کہ اُس کی غذائی ضرورتیں پوری ہوسکیں۔

ہندوستان کی دیسی ریاستیں

	ریاستیں اور ایجنسیاں	رقبہ مربع میل میں	آبادی
1	بلوچستان کی ایجنسی	86,511	502,500
2	بڑودا کی ریاست	8099	1952,692
3	بنگال کی ریاستیں	38,652	3748,544
4	بمبئی کی ریاستیں	65,761	6908,648

5 [illegible] ایجنسی	78,772	8628,781
6 صوبجات متوسط کی ریاستیں	29,435	1,996,383
7 حیدرآباد کی ریاست	82,698	11,141,142
8 کشمیر کی ریاست	80,900	2,905578
9 مدراس کی ریاستیں	9,969	4,188,086
10 میسور کی ریاست	29,444	5,539,399
11 پنجاب کی ریاستیں	36,532	4,423,398
12 راجپوتانہ کی ایجنسی	127,541	9,723,301
13 آگرہ اور اودھ کی ریاستیں	5,079	802,097
میزان	679,393	62,641,549

انگلستان میں جہاں محاصل کی شکل میں 14,40,00000 پاؤنڈ کی بھاری رقم وصول کی جاتی ہے (اس میں مالیہ جنگ کے اخراجات بھی شامل ہیں) وہاں کی 42½ ملین آبادی پر فی کس 3 پاؤنڈ 10 شلنگ سے کم محصول لگتا ہے۔ وہاں کے رہنے والے ہر مرد کی یافت سے (42 پاؤنڈ) اس محصول کا تناسب صرف ایک شلنگ 8 پنیس فی پاؤنڈ کا ہے۔ ہندوستان کے اُن محصول دہندگان سے، جو اپنی غذائی ضرورت سے کچھ ہی زیادہ پیدا کرتے ہیں، انگلستان اور آئرلینڈ کے محصول دہندگان کے مقابلے میں 40 فیصدی زیادہ محصول وصول کیا جاتا ہے۔

1901-2 میں ہونے والے مجموعی اخراجات، جن کا بار آمدنی پر پڑا، 7,13,94,282 پاؤنڈ تھے۔ اگر اُن میں سے ریلوں اور آبپاشی کے اخراجات منہا کر دیے جائیں تو خالص اخراجات 4,96,50,229 پاؤنڈ تھے۔ اُن میں سے سول ڈپارٹمنٹ پر ہونے والے اخراجات 152,86,181 پاؤنڈ تھے۔ فوجی خدمات پر 1,57,63,931 پاؤنڈ خرچ ہوئے۔

گھریلو اخراجات۔ ایک دفعہ پھر 7,13,94,282 پاؤنڈ کے مجموعی اخراجات پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان اخراجات میں سے 173,68,655 پاؤنڈ کی رقم گھریلو اخراجات کے لیے انگلستان بھیجی گئی تھی۔ اس میں ہندوستان کے یورپین افسروں کی تنخواہیں

اور اُن کی وہ پس انداز کی ہوئی وہ دولت شامل نہیں تھی جو انگلستان بھیجی گئی۔ گھریلو اخراجات کو آسانی کے ساتھ مندرجہ ذیل مدات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

1۔ قرض اور انصرام قرض پر ادا کیا جانے والا سود	30,52,410	پاؤنڈ
2۔ ڈاک کی خدمات اور ٹیلیگراف کے تار وغیرہ پر ہونے والا خرچ جس کا بار ہندوستان پر پڑا	2,27,268	〃
3۔ ریلیں، سرکاری اور ضمانت شدہ (سود اور سالانہ نقد دی جانے والی رقم)	64,16,373	〃
4۔ مفاد عامہ کے کام (غیر حاضر فریقین کے بھتے وغیرہ)	51,214	〃
5۔ بحری اخراجات (جن میں ہندوستان کے سمندروں میں رہنے والے ملکہ معظمہ کے جہاز شامل ہیں)	1,73,502	〃
6۔ فوجی اخراجات (جن میں پنشنیں شامل ہیں)	29,45,614	〃
7۔ سول اخراجات (جن میں سکریٹری آف اسٹیٹ کا عملہ کوپرز ہل کالج، پنشنیں وغیرہ شامل ہیں)	24,35,370	〃
8۔ سامان (جن میں رفاہی سامان شامل ہے)	20,57,934	〃
میزان	173,68,655	〃

سب سے بڑی مدات میں قرض کا سود، ریلیں اور سول اور فوجی اخراجات۔ گزشتہ ابواب میں بتایا جا چکا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے خراج کا نامنصفانہ مطالبہ کر کے کس طرح ہندوستان کے قرض کی ابتدا کی اور افغانوں اور چینیوں کے خلاف ہونے والی جنگوں، غدر کی جنگوں اور حبشہ اور سوڈان سے لڑی جانے والی جنگوں کے اخراجات کا بار ہندوستان پر ڈال کر کس طرح اس میں اضافہ کیا۔ ہم موجودہ باب میں ان سوالوں پر ایک دفعہ پھر بحث نہیں کرنا چاہتے ہیں کہ انصاف اور اخلاق کی رُو سے یہ قرض کس حد تک ہندوستان پر واجب ہے اور کس حد تک ہندوستان شہنشاہی ضمانت کا حقدار ہے جس سے قرض کی شرح میں کمی ہو جائے گی۔

ریلوں کے متعلق بھی ہم گزشتہ ابواب میں بہت کچھ کہہ چکے ہیں۔ نصف صدی تک ہندوستان کا ریلوں میں گھاٹا ہوتا رہا اس کے باوجود انھیں برابر توسیع دی جاتی رہی۔ اُن کے کاروبار

5۔ وسطی ہند کی ایجنسی	78,772	8,628,781
6 صوبجات متوسط کی ریاستیں	29,435	1,996,383
7 حیدرآباد کی ریاست	82,698	11,141,142
8 کشمیر کی ریاست	80,900	2,905,578
9 مدراس کی ریاستیں	9,969	4,188,086
10 میسور کی ریاست	29,444	5,539,399
11 پنجاب کی ریاستیں	36,532	4,423,398
12 راجپوتانہ کی ایجنسی	127,541	9,723,301
13۔ آگرہ اور اودھ کی ریاستیں	5,079	802,097
میزان	679,393	62,641,549

انگلستان میں جہاں محاصل کی شکل میں 14,40,00000 پاؤنڈ کی بھاری رقم وصول کی جاتی ہے (اس میں حالیہ جنگ کے اخراجات بھی شامل ہیں) وہاں کی 41½ ملین آبادی پر فی کس 3 پاؤنڈ 10 شلنگ سے کم محصول لگتا ہے۔ وہاں کے رہنے والے ہر مرد کی یافت کے (42 پاؤنڈ) اس محصول کا تناسب صرف ایک شلنگ 8 پینس فی پاؤنڈ کا ہے۔ ہندوستان کے اُن محصول دہندگان سے، جو اپنی غذائی ضرورت سے کچھ ہی زیادہ پیدا کرتے ہیں، انگلستان اور آئرلینڈ کے محصول دہندگان کے مقابلے میں 40 فیصدی زیادہ محصول وصول کیا جاتا ہے۔

1901-2 میں ہونے والے مجموعی اخراجات، جن کا بار آمدنی پر پڑا، 7,13,94,282 پاؤنڈ تھے۔ اگر اُن میں سے ریلوں اور آبپاشی کے اخراجات منہا کر دیے جائیں تو خالص اخراجات 4,96,50,229 پاؤنڈ تھے۔ اُن میں سے سول ڈپارٹمنٹ پر ہونے والے اخراجات 1,52,86,181 پاؤنڈ تھے۔ فوجی خدمات پر 1,57,63,931 پاؤنڈ خرچ ہوئے۔

گھریلو اخراجات۔ ایک دفعہ پھر 7,13,94,282 پاؤنڈ کے مجموعی اخراجات پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان اخراجات میں سے 1,73,68,655 پاؤنڈ کی رقم گھریلو اخراجات کے لیے انگلستان بھیجی گئی تھی۔ اس میں ہندوستان کے یورپین افسروں کی تنخواہیں

اور اُن کی وہ پس انداز کی ہوئی وہ دولت شامل نہیں تھی جو انگلستان بھیجی گئی۔ گھریلو اخراجات کو آسانی کے ساتھ مندرجہ ذیل مدات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ قرض اور انصرام قرض پر ادا کیا جانے والا سود	30,52,410	پاؤنڈ
2۔ ڈاک کی خدمات اور ٹیلیگراف کے تار وغیرہ پر ہونے والا خرچ جس کا بار ہندوستان پر پڑا	2,27,268	"
3۔ ریلیں، سرکاری اور ضمانت شدہ (سود اور سالانہ نقد دی جانے والی رقم)	64,16,373	"
4۔ مفاد عامہ کے کام (غیر حاضر فریقین کے بھتے وغیرہ)	51,214	"
5۔ بحری اخراجات (جن میں ہندوستان کے سمندروں میں رہنے والے ملکہ معظمہ کے جہاز شامل ہیں)	1,73,502	"
6۔ فوجی اخراجات (جن میں پنشنیں شامل ہیں)	29,45,614	"
7۔ سول اخراجات (جن میں سکریٹری آف اسٹیٹ کا عملہ کوپرز ہل کالج، پنشنیں وغیرہ شامل ہیں)	24,35,370	"
8۔ سامان (جن میں دفاعی سامان شامل ہے)	20,57,934	"
میزان	173,68,655	"

سب سے بڑی مدات میں قرض کا سود، ریلیں اور سول اور فوجی اخراجات۔ گزشتہ ابواب میں بتایا جا چکا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے خراج کا نامنصفانہ مطالبہ کر کے کس طرح ہندوستان کے قرض کی ابتدا کی اور افغانوں اور چینیوں کے خلاف ہونے والی جنگوں، غدر کی جنگوں اور حبشہ اور سوڈان سے لڑی جانے والی جنگوں کے اخراجات کا بار ہندوستان پر ڈال کر کس طرح اس میں اضافہ کیا۔ ہم موجودہ باب میں ان سوالوں پر ایک دفعہ پھر بحث نہیں کرنا چاہتے ہیں کہ انصاف اور اخلاق کی رُو سے یہ قرض کس حد تک ہندوستان پر واجب ہے اور کس حد تک ہندوستان شہنشاہی ضمانت کا حقدار ہے جس سے قرض کی شرح میں کمی ہو جائے گی۔

ریلوں کے متعلق بھی ہم گزشتہ ابواب میں بہت کچھ کہہ چکے ہیں۔ نصف صدی تک ہندوستانی ریلوں میں گھاٹا ہوتا رہا اس کے باوجود انھیں برابر توسیع دی جاتی رہی۔ اُن کے کاروبار

اُن میں لگنے والے سرمائے کے سود اور نجی کمپنیوں کے ضمانت شدہ منافعے کی مجموعی رقم اُن کے ذریعے حاصل ہونے والی رقم سے تقریباً بقدر 50 ملین پاؤنڈز زیادہ تھی۔ یہ ہندوستان کے محصول دہندگان کا کھلا ہُوا نقصان تھا۔ ادھر کچھ برسوں سے ریلیں منافع دکھا رہی ہیں لیکن ہم کہہ نہیں سکتے کہ کب تک یہ صورتِ حال برقرار رہے گی۔ ہندوستان کا ایک مزید نقصان یہ ہے کہ وہاں کی ریلوں سے جو یافت ہوتی ہے۔ اُس میں سے سرمائے کا سود اور سالانہ نقدری جانے والی رقمیں کاٹ لی جاتی ہیں اور ½6 ملین کے بقدر ہر سال انگلستان میں ادائیگی کی جاتی ہے۔ یہ رقمیں ہندوستان واپس نہیں جاتی ہیں، وہاں کے لوگوں میں خرچ نہیں کی جاتی ہیں اور اُن کی بنا پر ہندوستان کی تجارت وصنعت بارآور نہیں ہوتی ہے۔

آخر میں سول اور فوجی اخراجات ہیں جن میں شہنشاہی خزانے کو ادا کی جانے والی وہ رقمیں شامل ہیں جو سکریٹری آف اسٹیٹ کے عملے کی تنخواہوں کے علاوہ ریٹائر ہونے والے سول اور فوجی حکام کی پنشنوں کے لیے ادا کی جاتی ہیں۔ ہندوستان کے لوگ اپنے برطانوی بھائیوں سے یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ ایسی سلطنت کے اخراجات کا ایک حصّہ انھیں برداشت کرنا چاہیے جو انگلستان اور ہندوستان دونوں کے لیے یکساں طور سے مفید ہے۔ یہ رکیک پالیسی ہے کہ ہندوستان کو ایک ایسے ادارے کا خرچ تنہا برداشت کرنا پڑے جس سے صرف اُس کو فائدہ نہیں پہنچتا ہے۔ اس امر کی فوری ضرورت محسوس کی جا رہی ہے کہ اُن خطوط پر سول اور فوجی اخراجات کی تقسیم نو کی جائے جو سر جارج ونگیٹ نے تقریباً 40 سال پہلے تجویز کیے تھے۔

اُجرتیں اور قیمتیں۔ 1902 کے آخری چھ مہینوں میں ہندوستان کے مختلف حصوں میں محنت مند کھیت مزدوروں کو ملنے والی اوسط ماہوار اُجرتیں سرکاری اعداد و شمار کی بنا پر ذیل میں دکھائی جا رہی ہیں۔

صوبہ	ضلع	ماہوار اجرت
بنگال	پٹنہ	6 شلنگ 8 پنس تا 8 شلنگ
	باقر گنج	8 پنس
آگرہ و اودھ	کانپور	5 شلنگ تا 6 شلنگ 8 پنس
	فیض آباد	2 〃 6 پنس تا 5 شلنگ 4 پنس
جات پنجاب	دہلی	10 〃 8 〃
	احمد آباد	9 〃 4 〃

مدراس	بلیری	6 شلنگ	4 پنس
	سالم	4 〃	8 〃
صوبجات متوسط	جبل پور	5 〃	4 〃
	رائے پور	5 〃	4 〃

باقر گنج، دہلی اور احمدآباد کی طرح کے غیر معمولی طور سے دولت مند اضلاع کو چھوڑ کے اور فیض آباد جیسے غریب ضلع کے علاوہ صحت مند کھیت مزدوروں کی اجرتیں 4 شلنگ 8 پنس سے 6 شلنگ 8 پنس ماہوار تک ہیں۔ چنانچہ بہت دولت مند اضلاع کے علاوہ کھیت مزدور کو ۳ پنس یومیہ اجرت بھی نہیں ملتی ہے۔ اُس کی اوسط اُجرت مشکل سے $2\frac{1}{2}$ پنس یومیہ ہوتی ہے۔ چوں کہ سال کے بارہ مہینے وہ کام سے نہیں لگا رہتا ہے اس لیے اس میں سے کچھ کم کرنا ہوگا۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ پورے بارہ مہینے 2 پنس یومیہ سے زیادہ کی اُمید نہیں کر سکتا ہے۔ ان حالات میں اُس کی انتہائی غربت اور بے مزہ زندگی کا اندازہ بھی مشکل سے لگایا جا سکتا ہے۔ اُس کی جھونپڑی زیادہ تر چھپر سے بے گانہ رہتی ہے اور اُسے بارش اور سردی سے بہت کم بچا سکتی ہے۔ اُس کی بیوی چیتھڑے پہنے رہتی ہے۔ اُس کے ننھے ننھے بچے کپڑوں کو ترسا کرتے ہیں۔ اُس کے گھر میں کوئی سامان نہیں ہوتا ہے۔ سردیوں میں ایک پھٹا پرانا کمبل نعمت کا حکم رکھتا ہے۔ اگر اُس کے بچے جانوروں کی دیکھ بھال کر سکیں یا اُس کی بیوی ہاتھ پیر مار کے اُس کی آمدنی میں اضافہ کر سکے تو وہ اپنے کو خوش قسمت سمجھتا ہے۔ یہ حسن بیان نہیں ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان میں کھیت مزدور اور اُن کے خاندان کے لوگ سال کے ایک سرے سے دوسرے تک آدھے پیٹ روٹی کھایا کرتے ہیں۔ بچپن سے اُن کو اس سے بھی کم غذا نصیب ہوتی ہے جو گرم ممالک کے لیے بھی ضروری سمجھی جاتی ہے اور بڑے ہو کر وہ ایسی قوم بنتے ہیں جو جسمانی طور سے کمزور ہوتی ہے، مکمل نشو ونما سے محروم ہوتی ہے اور آسانی سے بیماری، طاعون اور قحط کا شکار ہو جاتی ہے۔

اُن کسانوں کی حالت نسبتاً بہتر ہے جن کے پاس زمینیں ہیں۔ اُن کے پاس بہتر گھر ہوتے ہیں، بہتر کپڑے ہوتے ہیں اور اُنھیں زیادہ غذا میسّر ہوتی ہے۔ لیکن زمین کا بھاری محصول یا لگان اُن کی آمدنی کے بڑے حصّے پر مشتمل ہوتا ہے اور کھیت مزدوروں پر بھی اُس کا بوجھ پڑتا ہے۔ وجہ ظاہر ہے۔ جب کسان کو کم محصول ادا کرنا پڑتا ہے تو اس کی بچت زیادہ ہوتی ہے۔ وہ زیادہ مزدوروں کو کام اور بہتر اُجرتیں دے سکتا ہے۔ باقر گنج میں، جہاں زمین کا لگان کم ہے اور کسا

حال ہیں

مزدور کو دس شلنگ آٹھ پینس ماہوار اُجرت ملتی ہے۔ سالم میں، جہاں زمین پر بھاری محصول لگایا جاتا ہے اور کسان غریب ہیں، مزدور کو 4 شلنگ، 8 پینس ماہوار اجرت ملتی ہے۔ یہ واقعہ ہندوستان کے اُن ماہرین معاشیات کو بہت متاثر کرتا ہے جو دیہات کے لوگوں کو حالات کا علم رکھتے ہیں لیکن حاکمِ بندوبست زمین کے محصول میں اضافہ کرتے وقت اس واقعہ کو نظرانداز کر دیتا ہے۔ زمین کے محصول میں اگر اعتدال سے کام لیا جائے تو اُس سے زمین نہ رکھنے والے گاؤں کے مزدور کو بھی اُتنا ہی فائدہ ہوتا ہے جتنا کسان کو۔ زمین کے بھاری محصول کا بوجھ آخر میں کھیت مزدور پر پڑتا ہے۔ اُس کا کام چھن جاتا ہے، اجرت کم ہو جاتی ہے اور قحط کا حملہ ہوتے ہی وہ اُس کا شکار ہو جایا کرتا ہے۔ ہم نے اس کتاب میں بار بار زور دیا ہے کہ زمین کے محصول کو محدود کر دیا جائے اور اُس پر قطعی حد لگانے میں اعتدال سے کام لیا جائے اس لیے کہ اعتدال پر مبنی اور قطعی زمین کے محصول سے برطانوی ہند کی تمام دیہی آبادی کی حالت سدھرنے کا امکان ہے یعنی اُن دو سو ملین لوگوں کی حالت سدھرنے کا امکان ہے جن کا زمینوں پر قبضہ و دخل ہے اور جو اُن پر کام کرتے ہیں۔ جس طرح انتظام کی دوسری جزئیات میں وہ برطانوی حکومت کی پیروی کرتی ہیں اس معاملے میں بھی دیسی ریاستیں جلد اُس کی پیروی کرنے لگیں گی۔

وہ سرکاری تالیف، جس سے ہم نے مندرجہ بالا اعداد اخذ کیے ہیں، شہروں میں پائے جانے والے بے مہارت مزدوروں کی اجرتوں کے متعلق کوئی معلومات بہم نہیں پہنچاتی ہے۔ ذاتی علم کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ کلکتہ اور بمبئی کی طرح کے بڑے شہروں میں ایک صحت مند بے مہارت مزدور 4 پینس یومیہ یا 10 شلنگ ماہوار کماتا ہے۔ راج، بڑھئی، یا لوہار کی طرح کا ایک با مہارت مزدور شہر میں 20 شلنگ سے 30 شلنگ ماہوار تک کماتا ہے۔

کلکتہ سے جنوری 1903 میں برآمد کیے جانے والے چاول کی قیمت تقریباً 4 شلنگ 8 پینس فی من تھی۔ ایک من 82 پاؤنڈ کے برابر ہوتا ہے۔ دہلی کے اچھے قسم کے گیہوں کی قیمت 40 شلنگ فی کینڈی تھی۔ لیکن ہندوستان کے زیادہ تر حصوں میں مزدور ادنیٰ قسم کی غذا پر زندہ رہتے ہیں۔ یعنی باجرا، جوار اور دوسرے موٹے اناج پر۔

بدیسی تجارت۔ 1902-2 کے دوران ہندوستان میں درآمد ہونے والا تجارتی مال اور سونا چاندی (اس میں سرکاری سامان اور خزانہ شامل نہیں ہے) 6,74,12,798 پاؤنڈ کا تھا۔ اُس سال کے دوران ہندوستان سے ہونے والی مجموعی برآمدات 8,86,18,297

پاؤنڈ کی تھیں۔ اس طرح ہندوستان سے 21 ملین پاؤنڈ کی فاضل برآمدات ہوئیں تھی۔ انگلستان نے 43 ملین کی مالیت کا یا ہندوستان میں ہونے والی مجموعی درآمدات کا $\frac{1}{2}$ مال بھیجا، آسٹریا نے $2\frac{1}{2}$ ملین، جرمنی نے 2 ملین، بلجیم نے 2 ملین، روس نے $2\frac{1}{2}$ ملین، آسٹریلیا نے $2\frac{1}{2}$ ملین کا مال بھیجا۔ فرانس نے ہندوستان کو 9,00,000 پاؤنڈ سے زیادہ کا مال برآمد کیا۔ اور ریاستہائے متحدہ نے تقریباً 8,00,000 پاؤنڈ کا مال برآمد کیا۔ ہندوستان میں ہونے والی مجموعی درآمدات میں کم سے کم 22 ملین کا سوت اور سوتی کپڑا شامل تھا جس کا زیادہ حصہ لنکاشائر سے آیا تھا۔ اس کے علاوہ بڑی مدات میں شکر تقریباً 4 ملین، لوہا اور فولاد 3 ملین سے زیادہ، مشینیں اور کارخانوں کے کل پرزے 2 ملین اور معدنی تیل $2\frac{1}{2}$ ملین شامل تھے۔

ہندوستان سے ہونے والی برآمدات میں انگلستان نے 23 ملین کا یا مجموعی برآمدات کا چوتھائی مال لیا۔ جرمنی نے $6\frac{3}{4}$ ملین، فرانس نے 6 ملین، بلجیم نے 3 ملین، آسٹریا نے $1\frac{1}{2}$ ملین؛ اٹلی نے 2 ملین ریاستہائے متحدہ نے $5\frac{1}{2}$ ملین، مصر نے $3\frac{1}{2}$ ملین، چین نے $11\frac{3}{4}$ ملین، آبنائے ملاکا کی نوآبادیوں نے 7 ملین اور جاپان نے $4\frac{1}{2}$ ملین کا مال لیا۔ برآمدات کی بڑی بڑی مدات تھیں۔ چاول اور گیہوں $11\frac{1}{2}$ ملین، کپاس $9\frac{1}{2}$ ملین، سوت اور سوتی کپڑا 8 ملین، کھالیں $5\frac{1}{2}$ ملین، پٹ سن اور پٹ کے مصنوعات $13\frac{1}{2}$ ملین، تلہن 11 ملین، افیم $5\frac{1}{2}$ ملین اور چائے $5\frac{1}{2}$ ملین پاؤنڈ۔

لوگوں کی معاشی حالت — حالیہ قحطوں کے بعد ہندوستان کے لوگوں کی معاشی حالت کے متعلق تحقیقات کرنے کے لیے انگلستان میں بڑے اصرار کے ساتھ مطالبہ کیا گیا تھا لیکن سکریٹری آف اسٹیٹ نے اس مطالبے کو تسلیم نہیں کیا اور تحقیقات کروانے سے انکار کر دیا۔ اس قسم کی آخری تحقیقات پندرہ سال پہلے 1888 میں ہوئی تھی جب لارڈ ڈفرن ہندوستان کا وائسرائے تھا۔ لیکن اس کے نتائج شائع نہیں کیے گئے تھے اور اُن کو خفیہ سمجھا گیا تھا ہماری رائے میں اس طرح واقعات کو چھپانا کوئی سمجھداری کا کام نہیں ہے۔ ہندوستان کے لوگوں کا پریشان کن افلاس اور وسائل کی نایابی کوئی راز نہیں ہے۔ چونکا دینے والے واقعات کو آنکھوں سے اوجھل رکھ کر شر کی تلافی نہیں کی جا سکتی ہے۔ بہرحال 1888 کی خفیہ رپورٹ کے بڑے بڑے حصے عام لوگوں تک پہنچ چکے ہیں[1] اس لیے اس میں کوئی حرج نہیں ہے اگر ہم ا[illegible]رے اُن کا

---

[1] "خوش حال" برطانوی ہند PROSPEROUS BRITISH INDIA میں، از ڈ؟

ذکر موجودہ باب میں کر دیں۔

صوبہ بمبئی میں اس بات سے انکار کیا گیا ہے کہ زیادہ تر لوگوں کو کافی غذا میسّر نہیں آتی ہے۔ لیکن پورے صوبے میں "پس ماندہ طبقے" موجود ہیں اور اُن میں سے کچھ کا معیارِ زندگی ہندوستانی مزدور کی زندگی اور یافت کے پست معیار سے بھی کم ہے۔ رتنا گیری کے ضلع میں جہاں زمین ناقص اور زمین کا مطالبہ بھاری ہے۔ "کوئی ایسا موسم نہیں ہوتا ہے جس میں یہ لوگ خاموشی کے ساتھ دکن کے قحط کے دکھ نہ برداشت کرتے ہوں" گجرات کے مقابلے میں دکن کی زمین کم زرخیز ہے اور "حکام کی متفقہ رائے ہے کہ کسان اپنی زمینوں سے سال کی رسد حاصل نہیں کر سکتے ہیں" کرناٹک میں بھی "رپورٹ کرنے والے حکام کو اس پر اتفاق ہے کہ کسانوں کی بڑی تعداد ایسی ہے جو اپنی زمینوں سے پورے سال کی رسد حاصل نہیں کر سکتی ہے" گجرات کی مراعات یافتہ کمشنری میں بھی کسان صرف اپنی زمینوں سے صرف چھ یا نو مہینوں کی رسد حاصل کر پاتے ہیں اور فصل کٹنے کے بعد اُس کا زیادہ حصّہ ساہوکار لے جاتا ہے۔ اور "ایسی بہت سی موتیں جن کی وجہ بخار بتایا جاتا ہے اصل میں ناکافی کپڑے، غذا اور سر چھپانے کی جگہ کی بنا پر واقع ہوتی ہیں"

پنجاب میں کسانوں اور مزدوروں کی حالت کچھ بہتر نہیں ہے۔ دہلی کی کمشنری میں "ملک کے نسبتاً کم معیار کے مقابلے میں بھی غذا ادنیٰ قسم کی ہوتی ہے" گڑگاؤں کے ضلع میں معیارِ زندگی خطرناک حد تک پست ہے۔ بہتر غذا میسّر نہ آنے کی وجہ سے لوگ جڑی بوٹیوں اور جنگلی پھلوں پر گزارا کرتے ہیں اور غذا کی کمی کی بنا پر وہ مارے مارے پھرا کرتے ہیں۔ فیروز پور کے اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ بہت سے گاؤں کے لوگوں کو چوبیس گھنٹے میں دو وقت روٹی نصیب نہیں ہوتی ہے۔ راولپنڈی کمشنری کے دو مسلمان افسروں نے اس سے بھی زیادہ دردناک کہانی سنائی۔ اُن میں سے ایک نے کہا کہ ۱۰ فیصدی ہندو اور ۲۰ فیصدی مسلمان کافی غذا نہ ملنے کی وجہ سے کمزور ہو گئے ہیں۔ اور اپنی صحتیں کھو چکے ہیں۔ دوسرے کا کہنا ہے کہ کسانوں کے نچلے طبقے کے زیادہ تر لوگوں کا شمار اُن میں ہوتا ہے۔ کرنل واٹر فیلڈ COLONAL WATER FIELD سی۔ ایس۔ آئی کا کہنا ہے "ہزارہ کی پہاڑیوں کے رہنے والے، چاہے وہ کسان ہوں یا چرواہے میرے خیال میں سب کو مفلوک الحال، غیر صحت مند اور بھک مروں کی قوم کہا جا سکتا ہے"

صوبجات متوسط میں ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ساگر، دموہ، نرسنگھ پور، ہوشنگ آباد بیتار اور بجات نہ اضلاع میں "تین چوتھائی کسانوں کے لیے کہا جاتا ہے کہ وہ مقروض ہیں اور

دی جانے والی تفصیلات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اُن میں سے زیادہ تر کی حالت انتہائی خراب ہے اور وہ پیسے پیسے کو محتاج ہیں۔"

'آگرہ اور اودھ کا صوبہ'۔ اس صوبے کی رپورٹوں میں زیادہ تفصیل اور زیادہ وضاحت سے کام لیا گیا ہے۔

اٹاوہ کے کلکٹر نے لکھا ہے۔ "زمین نہ رکھنے والے مزدوروں کی حالت اب بھی ایسی ہے کہ اُس کو تسلی بخش نہیں کہا جا سکتا۔ ایک مرد، اُس کی بیوی اور دو بچوں کی مجموعی یافت کسی طرح 3 روپے (4 شلنگ) سے زیادہ نہیں ہوتی ہے۔ اگر غذائی اجناس کی قیمتیں کم یا مناسب ہوں، کام برابر ملتا رہے اور گھر والوں کی صحتیں اچھی رہیں تو اس آمدنی میں خاندان کے لوگ دن میں ایک دفعہ پیٹ بھر کے روٹی کھا سکتے ہیں، سر چھپانے کے لیے ایک چھپر ڈال سکتے ہیں اور سستے کپڑے اور کبھی کبھی ایک ہلکا سا کمبل خرید سکتے ہیں۔"

باندا کے کلکٹر نے لکھا ہے۔ "آبادی کے نچلے طبقوں کی ایک بڑی تعداد کی صحت کی خرابی ظاہر کرتی ہے کہ وہ آدھے پیٹ روٹی کھانے کے عادی ہیں یا بچپن میں قحط کی شدتوں اور آزمائشوں سے گزر چکے ہیں۔ اس کو دھیان میں رکھنا چاہیئے کہ ایک نوجوان کو اگر بڑھوتری کی عمر میں فاقے کرنے پڑیں بعد میں ملنے والی بہتر سے بہتر غذا بھی اُس کا ازالہ نہیں کر سکتی ہے۔"

غازی پور کے کلکٹر نے لکھا ہے "عام طور سے گاؤں کے زیادہ تر کسان مقروض ہُوا کرتے ہیں۔"

فیض آباد کے کمشنر مسٹر بنیٹ کا قول دہرایا ہے "جب تک اس موضوع کے جزئیات کا مطالعہ نہ کیا جائے کوئی شخص اس بات کو پوری طرح سمجھ ہی نہیں سکتا ہے کہ وہ خط کتنا باریک ہے جو عام لوگوں اور قطعی برہنگی اور فاقہ کشی کے درمیان لگا ہُوا ہے۔" کمشنر نے مزید کہا ہے "مجھے یقین ہے کہ یہ بات اودھ کے ہر ضلع پر صادق آتی ہے۔ صرف فرق اُن لوگوں کی کمی بیشی کا ہو سکتا ہے جن کی تعداد ہمیشہ زیادہ ہُوا کرتی ہے اور جو ہمیشہ اس پست اور خطرناک حالت میں رہا کرتے ہیں۔"

اُسی کمشنر نے پائنیر میں لکھا تھا۔ "لوگوں کے تخمینے کے مطابق دیسی لوگوں کی آبادی کا ۶۰ فیصدی حصہ اتنا زیادہ غریب ہے کہ اُس مجموعی یافت میں، جس سے خاندان کی گزر بسر ہوتی ہے، اگر بچوں کی تھوڑی بہت کمائی شامل نہ ہو تو خاندان کے کچھ افراد کو فاقے کرنے پڑیں۔

اس تاثر کے تعلق سے کہ ہندوستان کے زیادہ تر لوگوں کو روزانہ ناکافی [illegible] سے سابقہ پڑتا ہے اُس نے لکھا "ہندوستان کے زیادہ تر حصوں کی حد تک اور مدت کی [illegible] کہ

صوبہ وار صوبوں میں حکومت کیا کرتے تھے۔ زمیندار، پولی گر اور سردار اپنی اپنی جاگیروں میں قریب قریب حکمراں کی حیثیت رکھتے تھے۔ گاؤں والے گاؤں سماج پر حکومت کرتے تھے۔ کسان سے لے کر اوپر تک پوری آبادی ملک کے انتظام میں حصّہ لیا کرتی تھی۔ یہ واقعہ ہے کہ قرون وسطیٰ کی حکومت کے مقابلے میں جدید حکومت میں لازمی طور سے زیادہ مرکزیت ہونی چاہیئے۔ اُسے جزئیات کی نگہداشت میں زیادہ وقتِ نظر سے کام لینا چاہیئے اور اُن کی تنظیم میں زیادہ یکسانی پیدا کرنی چاہیئے۔ اگر یہ درست ہے تو اس جدید حکومت میں کچھ عوامی عناصر لازمی طور سے شامل کیے جانے چاہئیں اور اضلاع اور کمشنریوں میں عوامی اداروں کی امداد و تعاون اس کو حاصل ہونا چاہیئے۔ موجودہ حکومت میں مرکزیت پیدا کرنے کے ساتھ اگر عوامی عناصر کو اس سے دُور رکھا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ حکومت خود اختیاری کے اُن فوائد کے بغیر قرونِ وسطیٰ کی مطلق العنانیت کو برقرار رکھا جائے جو اُس زمانے میں لوگوں کو حاصل تھے۔

اس اہم سوال پر ہم کسی نقطۂ نظر سے غور کریں بالآخر ہم اس حقیقت تک پہنچ جاتے ہیں، جس سے دنیا کی کسی دوسری قوم کے مقابلے میں انگریز زیادہ واقف ہیں۔ کہ جب تک ہندوستان کے لوگوں کو اس کی اجازت نہ دی جائے کہ وہ اپنے معاملات کی دیکھ بھال میں کچھ حصّہ لے سکیں اُس وقت تک نہ حکومتِ ہند کامیاب ہو سکتی ہے نہ ہندوستان کے لوگ خوش حال ہو سکتے ہیں۔ جان اسٹورٹ مل نے کہا ہے " ان معاملات کی یہ لازمی شرط ہے کہ دوسروں کے مفادات کا تحفظ کرنے کی کسی خواہش کی بنا پر، چاہے وہ کتنی ہی ایماندارانہ کیوں نہ ہو، اُن کے ہاتھ باندھنے کے عمل کو محفوظ یا مفید نہیں سمجھا جا سکتا۔ اپنے حالاتِ زندگی میں کوئی پائدار اور مثبت سدھار وہ صرف اپنے ہاتھوں سے کر سکتے ہیں" ہندوستانیوں کے ہاتھ بڑی مدت تک بندھے رہے ہیں اور اُس کے ناخوشگوار نتائج سامنے آچکے ہیں۔ اب ہندوستانیوں کو اس کا موقع دیا جانا چاہیئے کہ وہ برطانوی حکام کے شانوں سے شانے ملا کر کھڑے ہوں اور اُن کے ساتھ مل کر اپنے ملک اور اپنی بدبخت زندگیوں کو سدھارنے کی کوشش کریں۔

ہندوستان میں آئینی حکومت قائم ہونے کی صورت میں خود انگلستان کو نقصان کے بجائے فائدہ ہوگا۔ علیحدگی پسندی سے سلطنت تقویت حاصل نہیں کر رہی ہے۔ اس نے آبادی کے بڑے حصّے میں اس قسم کی بے چینی پھیلا رکھی ہے جو لازمی طور سے ایک بڑھتے ہوئے سیاسی خطرے کی شکل اختیار کرے گی۔ ایک [illegible] حکومت اس شر کا سدِّباب کر دے گی۔ اور سلطنت کو تقویت پہنچائے گی۔

نشو و نما پاتا رہا ہے۔ ہم حکومت میں تجربوں کو پسند نہیں کرتے ہیں۔ ہمیں نئے اور مثالی دستوروں پر اعتماد نہیں ہے۔ ہم تو اُن خطوط پر ترقی دیکھنے کے خواہش مند ہیں جو پہلے ہی لگائے جا چکے ہیں۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ حکومت کا وہ طریقہ جو وجود میں آچکا ہے لوگوں کی زندگیوں اور اُن کے مفادات سے زیادہ باخبر رہے۔

واقعہ یہ ہے کہ حکومتِ ہند کا موجودہ دستور لوگوں کی زندگیوں سے رابطہ نہیں رکھتا ہے، اُن کے مفادات کا تحفّظ نہیں کرتا ہے اور اُنھیں مادی خوش حالی مہیا نہیں کر سکا ہے۔ انگلستان کی جمہوریت جو مجموعی اعتبار سے معقول اور انصاف پسند ہے، ہندوستان کی حکومت کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں دلچسپی نہیں لے سکتی اور اُسے لازمی طور سے اپنے مفادات پر نظر رکھنی پڑتی ہے۔ انگلستان کی پارلیمنٹ ہندوستان کے معاملات پر پوری توجہ نہیں دے سکتی ہے۔ سکریٹری آف اسٹیٹ، جو برطانوی کابینہ کا رکن ہوتا ہے، کاؤنسل کے اُن اراکین کے بشمول جن کا انتخاب وہ خود کرتا ہے، ہندوستان کے لوگوں کی نمائندگی نہیں کرتا ہے، اُن کی ضروریات کا علم نہیں رکھتا ہے اور اُن کے مفادات کا تحفظ نہیں کرتا ہے۔ ہندوستان میں گورنر جنرل اور اُس کی کاؤنسل کے اراکین، جن کا انتخاب وہ خود کرتا ہے، سکریٹری آف اسٹیٹ کے تابع ہیں اور لوگوں سے اُن کا کوئی رابطہ نہیں ہے۔ ہندوستان کی حکومت کی پالیسی کی تمام اہم جزئیات کی تشکیل، نگہداشت اور انضباط کی تمام تر ذمہ داری وائٹ ہال کے چند لوگوں اور شملے کے چند لوگوں پر ہے۔ ملک کے انتظامی طریقوں میں اس کی کوئی گنجائش نہیں کہ لوگوں کے خیالات کی نمائندگی ہو سکے یا محصول دہندگان کے مفادات کا تحفّظ کیا جا سکے۔ انسانی ذہن اور قوتِ اختراع متمدن لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد کے لیے ایسا طریقۂ حکومت ایجاد کرنے سے قاصر ہے جس میں لوگوں کو اتنی سختی کے ساتھ قطعی اور مکمل طور سے خود اپنے معاملات کے انتظام میں ہر قسم کا حصّہ لینے سے باز رکھا گیا ہے۔ اس میں کوئی تعجب نہ ہونا چاہیے کہ وہ حکومت یعنی وائٹ ہال کے کچھ لوگ اور شملے کے کچھ لوگ، اُن سامراجی اثرات کے تحت، جن میں وہ گھرے ہوتے ہیں، کبھی کبھی ضرورت سے زیادہ مطالبہ ادا کرنے والے ہندوستانی کسان، بے روزگار ہندوستانی صنعت کار اور فاقوں کے مارے ہندوستانی مزدور کو بھول جاتے ہیں۔

ہندوستان کا ماضی اس سے مختلف تھا۔ ہندو اور مسلمان حکمراں ہمیشہ مطلق اور اکثر مطلق العنان بادشاہ ہوا کرتے تھے لیکن وہ علیحدگی پسند نہیں تھے۔ اُن کا نظم و نسق بے ڈھنگا اور پرانے قسم کا ہوا کرتا تھا لیکن لوگوں کے تعاون کی بنیاد پر وہ قائم ہوتا تھا۔ شہنشاہ دہلی ... کومت کرتا تھا اس کے

صنعتوں، اس کی تجارتی مستعدی اور اس کی جنگی صلاحیت کو دھکا پہنچایا۔ مشرق کے سونے کے مضر اثرات کی بنا پر انگلستان ایک صحت مند، جفاکش اور کاروباری طاقت کی حیثیت سے اُسی طرح انحطاط پذیر ہے جس طرح ایک آزاد ملک کی حیثیت سے مشرق میں قایم ہونے والی اپنی مطلق العنان حکومت کی بنا پر وہ گر رہا ہے۔ اگر ہندوستان کے ساتھ مالیاتی انصاف کیا جائے تو اس سے انگلستان کو پہلا اور راست فائدہ یہ ہوگا کہ ہندوستان کے خوش حال لوگوں میں برطانوی مال کی مانگ بڑھ جائے گی جس سے برطانوی صنعتیں منافع حاصل کرسکیں گی۔ دوسرا اور بالواسطہ فائدہ یہ ہوگا کہ بغیر کاروباری معاوضے کے آنے والا وہ سونا رک جائے گا جس سے اُس کی صنعتی صلاحیت کمزور اور تباہ ہو رہی ہے۔

ہمارا تجویز کردہ دوسرا علاج نمائندگی ہے۔ ہم ہندوستان میں پارلیمنٹ قایم کرنا نہیں چاہتے ہیں لیکن نظم ونسق میں اس وقت تک کامیابی حاصل نہیں کی جاسکتی ہے جب تک لوگوں کو اُس کی نگہداشت میں تھوڑا بہت حصّہ لینے کی اجازت نہ دی جائے۔ اس مستحسن کام کی ابتدا کی جاچکی ہے۔ تمام بڑے صوبوں کی کاؤنسلوں میں کچھ ایسے اراکین کو شرکت کا موقع دیا جاتا ہے جنھیں لوگ منتخب کرتے ہیں۔ اس اصول کو توسیع دی جانی چاہیئے۔ اور صوبے کے ہر ضلع کو اس کا موقع دیا جانا چاہیئے کہ وہ اپنا نمائندہ بھیج سکے۔ مدراس اور بمبئی میں ایگزیکیٹو کاؤنسلیں بھی ہیں۔ ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں بھی اس قسم کی ایگزیکیٹو کاؤنسلیں قایم کی جانی چاہئیں اور اُن میں ہندوستانی اراکین کو شامل کیا جانا چاہیئے۔ گورنر جنرل کی ایگزیکیٹو کاؤنسل کئی قابل اور تجربہ کار انگریزوں پر مشتمل ہے جن میں سے تقریباً سب خرچ کرنے والے محکموں کے سربراہ ہیں۔ اگر اس کاؤنسل میں لوگوں یعنی محصول دہندگان کو کچھ نمائندگی حاصل ہوجائے تو اس سے حکومت تقویت پائے گی اور زیادہ باخبر اور لوگوں کی خوشحالی کو فروغ دینے کی زیادہ اہل ہوجائے گی۔ لندن میں سکریٹری آف اسٹیٹ کی کونسل میں اگر کچھ ہندستانیوں کو شامل کرلیا جائے تو باصلاحیت اراکین کے اُن مشوروں اور اطلاعوں سے سکریٹری آف اسٹیٹ مستفید ہوگا جو حکومت کے سنجیدہ معاملات کے متعلق وہ اُس کو دیں گے۔ پینتالیس سال تک سکریٹری آف اسٹیٹ ہندوستان پر اس طرح حکومت کرتا رہا ہے کہ وائٹ ہال کے ایوان کاؤنسل میں کسی ہندوستانی رکن کی آواز یا رائے سننے میں نہیں آئی ہے۔ اس قسم کی حکومت جس میں علیحدگی پسندی اور اعتماد کی کمی کا مظاہرہ کیا جائے نہ ہر دلعزیز ہوسکتی ہے نہ کامیاب۔

مندرجہ بالا تجاویز نئی نہیں ہیں۔ وہ اس طریقے کے لازمی نتائج ہیں جو پچھلے پچاس سال میں

سب سے زیادہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہندوستان کے قومی اخراجات میں کمی کی جائے۔ فوجی اخراجات ہندوستان کی ضرورتوں تک محدود رہیں اور سامراجی مقاصد کے لیے ہونے والے مزید اخراجات کے لیے شہنشاہی خزانے سے رقم حاصل کی جانی چاہیے۔ سر رابرٹ گفن کا خیال ہے کہ تین یا چار ملین پاؤنڈ مناسب رقم ہے۔ ہندوستان کا قرض برابر کم ہوتا رہنا چاہیے اور اُس کے لیے شہنشاہی ضمانت دی جانی چاہیے۔ ہندوستان کی ملازمتوں کے اعلیٰ عہدوں پر اہلیت رکھنے والے زیادہ ہندوستانیوں کا تقرر کیا جانا چاہیے اور انھیں اُن انگریز نوجوانوں کے لیے محفوظ نہیں رکھنا چاہیے جو مشرق میں روزگار تلاش کرنے آتے ہیں۔ لندن میں خرچ ہونے والی ہندوستان کی سترہ ملین پاؤنڈ کی اُس رقم میں رفتہ رفتہ کمی ہو جانی چاہیے جس کو گھریلو اخراجات کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ہندوستان کی غذائی رسد سے سال بہ سال ہونے والے دولت کے اس نکاس نے ہندوستان کے لوگوں کو جتنا تباہ کیا ہے اتنی تباہی کسی اور سبب سے نہیں ہوتی ہے۔

اُس سامراجی پالیسی کو نہ قرینِ انصاف کہا جا سکتا ہے نہ قرینِ عقل جس کی رُو سے انگلستان کی ہندوستانی سلطنت کے لیے لندن میں خرچ ہونے والے پیسے پیسے کا بار ہندوستان کے محصول دہندگان پر ڈالا جاتا ہے۔ سلطنت سے انگلستان اور ہندوستان دونوں کو یکساں فائدہ پہنچتا ہے اور اُس کو ریکیک محاسبی کے طریقۂ کار کے نام سے یاد کیا جائے گا کہ ہندوستان کے معاملات کی نگرانی کرنے کے لیے لندن میں جو عملہ رکھا جاتا ہے اُس کے اخراجات کا بار ہندوستان پر ڈالا جائے۔ گھریلو اخراجات کے لیے ہر سال بھیجی جانے والی ۱۷ ملین کی رقم اور مزید برآں وہ رقمیں جو ہندوستان میں کام کرنے والے یورپی حکام بھیجتے رہے ہیں ہندوستان کی خالص آمدنی کے تقریباً نصف کے برابر ہوتی ہیں۔ کسی محکوم قوم کی حالت نہیں سدھر سکتی ہے اگر حکمراں طاقت اُس کی آمدنی کا تقریباً نصف حصہ ملک کے باہر لے جائے۔ اور کسی حکمراں قوم کو اس دولت سے آخر میں فائدہ نہیں پہنچتا ہے جس کا کوئی راست تجارتی معاوضہ نہ دیا جائے۔ اس معاملے میں افراد اور اقوام میں کوئی فرق نہیں۔ جو روٹی پسینہ بہا کر کمائی جاتی ہے اُس سے جسم نشو و نما پاتا ہے اور طاقت حاصل کرتا ہے لیکن جو روٹی بغیر محنت کے مل جاتی ہے وہ نظامِ جسمانی کے لیے زہر بن جاتی ہے۔ قدیم روم کی عیاشی، پستی اور انحطاط کی وجہ وہ سونا تھا جو کسی تجارتی معاوضے کے بغیر آتا رہتا تھا۔ جدید اسپین میں سیاسی کمزوری تجارتی کمزوری میں الجھ کر رہ گئی۔ اس بات کو ہمارے مقابلے میں آئندہ آنے والے مؤرخ زیادہ صاف صاف دیکھ سکیں گے کہ مغربی قوموں کی رقابت کی بجائے مشرق سے آنے والے سونے نے ا[illegible]ستان کی

بڑے حصّے کی حد تک یہ تاثر بالکل درست ہے۔"

رائے بریلی کے ڈپٹی کمشنر نے لکھا ہے "جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے بھوک کا تعلق بڑی حد تک عادت سے ہے اور وہ لوگ جو قحط کی تکلیفیں برداشت کر چکے ہیں — قریب قریب ہر غریب خاندان اس دُکھ میں مبتلا رہ چکا ہے — اتنی کم غذا کے عادی ہو گئے ہیں جو اُن کے خاندانوں کی بہبودی کے لیے کافی نہیں ہے۔"

الٰہ آباد کے کمشنر نے لکھا ہے "میرے خیال میں لوگوں کے غریب طبقوں اور نیم فاقہ کشی میں بہت کم (فرق) ہے۔ لیکن اس کا علاج کیا ہے؟"

کیا یہ صرف مایوسی ہندوستان کی برطانوی حکومت طرف سے کہا جانے والا حرفِ آخر ہے؟ جب ہندوستان کی زمین زرخیز ہے، لوگ امن پسند، با مہارت اور جفاکش ہیں اور ایک متمدّن حکومت کی بیا سیانداراانہ خواہش ہے کہ وہ خوش حال ہوں تو اس کا کوئی علاج بھی ہونا چاہیئے۔ ایک — ایسی مطلق العنان حکومت کی ہیئت اور اس کے طریقہ کار پر، جو لوگوں سے رابطہ نہیں قایم کر سکتی ہے اور اُن کی حالت میں سدھار کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی ہے، نظم و نسق کے اعلیٰ ترین اغراض و مقاصد میں ناکام ہونے کی ذمہ داری آتی ہے۔

اس کا علاج دو لفظوں میں پوشیدہ ہے — تخفیف اور سائندگی۔ اخراجات میں تخفیف کی بنا پر زمین پر لگنے والے محاصل میں کمی کی جا سکے گی۔ زراعت میں سہولت دی جانی چاہیئے جو قریب قریب ہندوستان کی واحد قومی صنعت ہے۔ مال گزاری کے علاوہ زمین پر لگنے والے دوسرے محاصل منسوخ کیے جانے چاہئیں۔ جہاں زمین کے محصول کا استمراری تعین نہیں کیا گیا ہے وہاں غیر جانب دار عدالتوں کے ذریعے نظری بنیادوں پر اُس پر حد لگانی چاہیئے، یعنی نصف حقیقی لگان یا نصف مناسب لگان، جو ہر اعتبار سے کافی ہے اور قانون کی تسلیم کردہ قطعی بنیادوں کے علاوہ کسی اور بنیاد پر زمین کے محصول میں اضافہ نہیں کیا جانا چاہیئے۔

دوسری صنعتوں کو بھی امداد کی حاجت ہے۔ حکومت ہند کو مانچسٹر کے احکام کی تعمیل سے انکار کر دینا چاہیئے۔ ہندوستان کی کارخانہ دارانہ صنعت پر لگنے والی اکسائز ڈیوٹی منسوخ کی جانی چاہیئے۔ وہ معتدل محاصل درآمد برقرار رکھے جانے چاہئیں جن کا مقصد تحفّظ کے بجائے آمدنی ہے۔ اُن چھوٹی موٹی گھریلو صنعتوں کو ہر امکانی امداد اور ہدایت دی جانی چاہیئے جن کی بنا پر لاکھوں انسان اب بھی گاؤں میں گزر بسر کر پاتے ہیں۔

یہ سلطنت سے لیے لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرے گی۔ اس کی وجہ سے وہ سلطنت کو اپنا سمجھیں گے اور اُس پر فخر کریں گے۔ سب سے بڑھ کے یہ بات ہے کہ اس کی بنا پر وہ خرابیاں دُور ہو جائیں گی جو ایک مطلق العنان قسم کی حکومت جس قدر ہندوستان میں پیدا کر سکتی ہے اسی قدر انگلستان میں بھی پیدا کر سکتی ہے۔ اس کی وجہ سے وہ مضر اثر دُور ہو جائے گا جو انگلستان کی مشرقی مطلق العنانیت کی بنا پر خود اُس کے اداروں اور لوگوں میں سال بہ سال زہر بن کر سرایت کرتا جا رہا ہے۔

فرانس کے بادشاہ لوئی چہاردہم کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ اُس نے اپنے نجومی کو پھانسی دینے کا فیصلہ کیا لیکن جب اس سے کہا گیا کہ خود اس کی زندگی کا انحصار نجومی کی زندگی پر ہے تو اُس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ یہ واقعہ ہے کہ برتر مفہوم میں انگلستان کی قسمت ہندوستان کی قسمت سے وابستہ ہے۔ ایک خوش حال ہندوستان سے انگلستان کی تجارت کو فائدہ ہوگا اور ایک آئینی ہندوستان سلطنتِ انگلستان کو تقویت پہنچائے گا۔ ہندوستان کی تباہ حالی انگلستان کی تجارت کو تباہ کرے گی اور ہندوستان کی مطلق العنان حکومت انگلستان کے انحطاط کا باعث ہو گی۔

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کی چند مطبوعات

نوٹ: طلبہ و اساتذہ کے لیے خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

اُصول معاشیات

آندھرا پردیش کے انٹرمیڈیٹ نصاب کے بموجب
مصنف: سید علی
قیمت: 47/-
صفحات: 192

شماریات اور کاروبار میں ان کا استعمال

مصنف: اے۔ایل۔باؤلگن
مترجم: پروفیسر مجم الحسن
قیمت: 150/-
صفحات: 392

کھاتہ نویسی اور کھاتہ داری

مصنف: کیو۔ایچ۔فاروقی
قیمت: 76/-
صفحات: 333

صنعتی تنظیم اور انتظام

مصنف: محمد احترام اللہ
قیمت: 149/-
صفحات: 606

اجارہ

مصنف: ای۔اے۔جی۔رابنسن
مترجم: ایم۔اے۔گیلانی
قیمت: 131/-
صفحات: 351

اُجرتیں

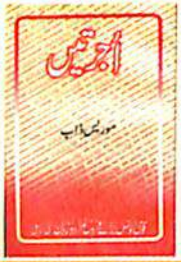

مصنف: موریس ڈاب
مترجم: عبدالرشید
قیمت: 95/-
صفحات: 224

क़ौमी काउन्सिल बराए फ़रोग़-ए-उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Languag
West Block-1, R.K. Puram, New Delhi-110066